مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

فضیلتِ صیام وقیامِ رمضان

بزبانِ صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیمَانًا وَاِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ

وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیمَانًا وَاِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ

وَمَنْ قَامَ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ اِیمَانًا وَاِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ

(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے۔ اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لئے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیئے گئے۔ اور جو لیلۃ القدر میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لئے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کی بھی سابقہ تمام خطائیں بخش دی گئیں!"

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور مانا

جلد :
شمارہ : ۱
رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ
جنوری ۱۹۹۸ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زر تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت : 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون : 03۔02۔5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون ۔ 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع : رشید احمد چودھری، مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

صاحب تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی ایک طویل علالت کے بعد گزشتہ ماہ کی ۱۵ تاریخ کو ۹۴ سال کی عمر میں رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت اختیار کر گئے۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون، اللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہٗ وادخلہٗ فی رحمتک

مولانا مرحوم کے بارے میں یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ وہ غلبہ و اقامتِ دین کے لئے وجود میں آنے والی تحریک ـــــ جماعت اسلامی ـــــ کے ساتھ مسلسل سولہ سترہ برس تک نہایت فعال انداز میں وابستہ رہے۔ انہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے بعد جماعت کی صفِ دوم کی نمایاں ترین شخصیت شمار کیا جاتا تھا اور یہ بھی کہ وہ ایک بلند پایہ عالم ہی نہیں مفسرِ قرآن بھی تھے ـــــ لیکن یہ بات شاید اکثر قارئین کے علم میں نہ ہوگی کہ ماہنامہ "میثاق" کا اجراء بھی ابتداءً مولانا اصلاحی مرحوم نے ۱۹۵۹ء میں کیا تھا ـــــ ۱۹۵۸ء میں جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد مولانا نے، جن کا مستقل قیام لاہور میں تھا، ایک جانب تفسیر تدبر قرآن کی تحریر و تسوید کی طرف اپنی توجہات کو مرکوز کیا اور دوسری جانب "میثاق" کے نام سے ایک ماہانہ جریدے کا اجراء کیا۔ وسائل اور معاونین کی کمی کے باعث "میثاق" کی اشاعت کا سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا اور اغلباً ۱۹۶۲ء میں مولانا نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۶۵ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی لاہور منتقلی کے بعد جب اپنے طور پر دعوت رجوع الی القرآن کے مبارک و مسعود کام کا آغاز کیا اور لاہور کی مختلف آبادیوں میں ہفتہ وار دروسِ قرآن کے حلقے قائم کئے تو ساتھ ہی غلبہ و اقامت دین کے لئے ایک اصولی انقلابی جماعت کی تشکیل کی خاطر "تنظیم اسلامی" کے قیام کی کوشش کا آغاز بھی کر دیا۔ اس موقع پر ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم خیال لوگوں سے رابطے اور اپنی دعوت اور افکار کی اشاعت کے لئے ایک ماہانہ جریدے کا اجراء ناگزیر ہے۔ چنانچہ محترم ڈاکٹر صاحب نے "الرسالہ" کے نام سے ایک ماہانہ جریدے کا ڈکلریشن حاصل کر لیا۔ مولانا اصلاحی مرحوم کو، جن سے اس زمانے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے روابط نہایت گہرے تھے اور ایک ہی شہر میں رہائش پذیر ہونے اور گہری فکری و نظری ہم آہنگی کے باعث مسلسل رابطہ رہتا تھا، جب "الرسالہ" کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کوئی نیا جریدہ نکالنے کی بجائے "میثاق" ہی کا از سرِ نو اجراء کریں جس کا ڈکلریشن ابھی تک مولانا کے نام سے محفوظ تھا۔ یوں اگست ۶۶ء سے میثاق کے دورِ

ثانی کا آغاز ہوا اور مولانا اصلاحی کی سرپرستی میں یہ جریدہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے زیرادارت شائع ہونے لگا۔

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کے ساتھ امیر تنظیم اسلامی کے قریبی ربط و تعلق کی داستان کم وبیش رُبع صدی پر محیط ہے۔ مولانا مرحوم سے اپنے اولین تعارف کا ذکر کرتے ہوئے امیر تنظیم اپنی کتاب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں لکھتے ہیں :

"مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ تعلق کا آغاز تو مولانا مودودی کی طرح ۴۷ء ہی میں ہو گیا تھا۔ (بلکہ راقم نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کو پہلی بار ۱۹۴۶ء میں دارالاسلام پٹھانکوٹ میں دیکھا تھا جہاں وہ اپنے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی معیت میں حاضر ہوا تھا) لیکن ۱۹۵۱ء تک یہ تعلق کلیتاً یک طرفہ تھا یعنی صرف ان کی تقریریں اور درس سن لینے تک محدود تھا۔ تاآنکہ نومبر ۱۹۵۱ء کی ایک شام کو وائی ' ایم ' سی ' اے ہال لاہور میں راقم نے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقع پر مولانا کے زیرصدارت اپنی وہ پہلی عوامی تقریر کی جو اَب تک جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا اہم جزو ہے اور "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار" کے عنوان سے طبع ہوتی ہے۔ راقم کی اس تقریر کی تعریف و تحسین مولانا نے دل کھول کر فرمائی ـــــ اور یہیں سے وہ "یک طرفہ تعلق" باقاعدہ "دو طرفہ تعلقات" میں تبدیل ہو گیا ـــــ دسمبر ۱۹۵۱ء اور جولائی ۱۹۵۲ء میں جمعیت طلبہ کی دو تربیت گاہوں میں راقم ناظم کی حیثیت سے شریک رہا اور مولانا معلم و مربّی کی حیثیت سے' اس سے ان تعلقات کی گہرائی و گیرائی میں نمایاں اضافہ ہوا ـــــ بعد کے چار سالوں کے دوران بے تکلف ملاقاتوں سے یہ تعلق مزید استوار ہوا ـــــ ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مولانا نے راقم کے متذکرہ بالا اختلافی بیان کی نہایت شاندار الفاظ میں تصویب و تائید کی۔ اس طرح جماعت میں پالیسی کے بارے میں جو اختلاف رائے ہوا اس کے ضمن میں بھی ع "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" کے مصداق مولانا اور راقم ایک ہی صف میں شامل ہو گئے ـــــ ۱۹۵۸ء میں جب مولانا نے بھی جماعت کو خیرباد کہہ دیا اور کسی نئی تعمیر کی فکر میں "مشاورتوں" کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی مسلسل ساتھ رہا"۔

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

تذکرہ و تبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

حالیہ سیاسی بحران کا خاتمہ
میاں محمد نواز شریف کیلئے مہلت یا آزمائش؟

امیر تنظیم اسلامی کا ۱۲/ دسمبر ۹۷ء کا خطاب جمعہ

خطبہ مسنونہ ' سورۃ الانبیاء کی آیات (۱۰۵ تا ۱۱۲) کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ کے بعد :

شکر در شکر کا مقام

تقریباً پانچ ہفتے کی غیر حاضری کے بعد اس مسجد میں حاضری ہوئی ہے۔ اس عرصے میں جو قیامت پاکستان میں دستوری ' آئینی اور عدالتی سطح پر گزری ہے ' سب سے پہلے میں اس کے ضمن میں "شکر در شکر" کے عنوان سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بہت ہی معروف مصرعہ ہے ع شکر صد شکر کہ جمازہ بمنزل رسید ' یعنی "شکر بلکہ سو مرتبہ شکر کہ بالآخر اونٹنی اپنی منزل پر پہنچ گئی"۔ لیکن یہاں "شکر صد شکر" والا مرحلہ تو نہیں ہے ' وہ بات تو ابھی بہت دور ہے ' تاہم "شکر در شکر" والی بات ہے۔ اور وہ اس اعتبار سے کہ بحمد اللہ ' اللہ کا خصوصی فضل و کرم ہوا ہے کہ ملک میں جو بھی بحران تھا وہ کم سے کم ظاہری طور پر ختم ہو گیا ہے۔ یہ "ظاہری" کا لفظ بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ یہ بحران حقیقتاً ابھی ختم نہیں ہوا ' لیکن اس کے اندر جو شدید فوری خطرات مضمر تھے وہ الحمد للہ ٹل گئے ہیں۔

ذاتی طور پر میرے لئے "شکر در شکر" والا معاملہ یہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے میں اس عرصے کے دوران ملک میں موجود نہیں تھا ' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ بحرانی دوران حساس لوگوں کے لئے ' جو ملک و قوم کے ماضی و حال کے ساتھ ساتھ اس کے مستقبل کے بارے میں بھی سوچتے ہیں ' نہایت اعصاب شکن دور تھا۔ دس بارہ ہزار میل کے فاصلے پر

جن میں سے ۴۳ ہزار ہماری مسلح افواج سے متعلق تھے' جرنیل سے لے کر سپاہی تک۔ اس قیامت کو گزرے اب ۲۵ برس سے کچھ زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ سانحہ سقوط مشرقی پاکستان کے ۲۵ برس پورے ہونے کے بعد' یعنی قمری اعتبار سے پاکستان کی عمر ۵۰ برس پوری ہو چکنے کے بعد سے اب جو دور گزر رہا ہے میں اسے وقت کے اعتبار سے "danger zone" کہتا ہوں' جس میں یہ حالیہ بحران اس ملک کے لئے بڑا ہی نازک مسئلہ تھا۔ اب اگر بحران کے بادل چھٹے ہیں تو میرے نزدیک یہ شاید آخری موقع ہو۔

شریف برادران کے لئے آزمائش کا مقام

دوسرے درجے پر اس بحران کا ٹل جانا نہ صرف میاں محمد نواز شریف صاحب کے لئے بلکہ پوری شریف فیملی کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ تاریخ میں آپ نے بہت سے نام سنے ہوں گے۔ سید برادران' علی برادران وغیرہ کی طرح بہت سے "برادران" کا مختلف حوالوں سے تاریخ میں تذکرہ آتا ہے۔ اسی طرح اس وقت اس ملک کی قسمت سب سے بڑھ کر دو "شریف برادران" کے ہاتھ میں آگئی ہے اور یہ دونوں برادران اس سے جس طرح کا معاملہ کر رہے ہیں اس کے دو پہلو بالکل نمایاں ہو چکے ہیں' جن میں اولین اسلام سے اغماض اور اعراض ہے۔ انہوں نے دو مرتبہ میرے ہاں آکر اور ایک مرتبہ جب میں ان کے ہاں گیا تو انہوں نے جو کچھ تاثر دیا تھا اس کی طرف تاحال ایک ذرہ برابر اقدام نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں ہے۔ دوسری طرف اس سے بھی خطرناک معاملہ ذاتی استکبار اور استبداد کا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں یعنی ایک طرف اللہ سے بغاوت اور دوسری طرف خلق خدا سے بغی و طغیان ظلم کے دو پہلو ہیں۔ قرآن مجید میں عدل و قسط کی جو اہمیت ہے' اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ از روئے قرآن اقامت دین کا اصل مقصد ہی عدل و انصاف کا قیام ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں "ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ" کا حکم دینے کے بعد آیت ۱۵ میں فرمایا : "وامرت لاعدل بینکم" یعنی "(کہہ دیجئے اے محمدؐ کہ) مجھے حکم ہوا ہے تمہارے مابین عدل قائم کرنے کا"۔ بنیادی طور پر یہ دو ہی چیزیں مطلوب ہیں۔ اللہ کا دین قائم کرو

اور خلق خدا میں عدل قائم کرو۔ اسی اعتبار سے شریعت کی تقسیم "حقوق اللہ" اور "حقوق العباد" کی صورت میں کی جاتی ہے۔ اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی حاکمیت کو تسلیم کرو۔ (ان الحکم الا للہ) اور خود خلافت پر قانع رہو۔ خود اس کبریائی کی چادر کو اس کے شانے سے کھینچنے کی کوشش مت کرو۔ یہ الفاظ ایک حدیث قدسی کے ہیں کہ "الکبر ردائی"۔ یعنی "تکبر میری چادر ہے" یہ جامہ صرف مجھ ہی کو راس آتا ہے۔ اور فرمایا کہ جو کوئی اس کو کھینچنے کی کوشش کرتا ہے، تکبر کرتا ہے، وہ گویا میرے شانے سے میری چادر کو گھسیٹ رہا ہے، اس کے خلاف میرا اعلان جنگ ہے۔ کسی کے شانے سے اس کی چادر کو گھسیٹ لینا عرب میں انتہائی تذلیل و توہین کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اسی سورۃ الشوریٰ کے آخری حصے میں بہت ہی جامع آیت آئی ہے: ﴿انما السبیل علی الذین یظلمون الناس ویبغون فی الارض بغیر الحق، اولئک لھم عذاب الیم ۝﴾ یعنی "اصل ملامت کے قابل تو وہ ہیں جو لوگوں کے حق غصب کرتے ہیں اور زمین میں ناحق بغاوت کرتے ہیں (اللہ کے محکوم بننے کے بجائے خود حاکم بن بیٹھتے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک ترین عذاب ہے"۔

حالیہ بحران کے بارے میں مجموعی تاثر

میرا خیال تھا کہ میں پاکستان واپس آکر اس بحرانی دور سے متعلق اخبارات دیکھوں گا۔ ہمارے ہاں شعبہ نشرو اشاعت میں اہم خبروں کی فائل بھی تیار ہو جاتی ہے، لیکن میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ تفاصیل میں جا کر سوائے اس کے کہ دل اور روئے اور صدمہ مزید گہرا ہو اور کیا حاصل؟ تو میں اس بحران کے بارے میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ یوں سمجھئے کہ اس پوری صورتحال کا ایک مجموعی تاثر ہے جو میرے سامنے آیا ہے۔ میرے لئے جزئیات میں جانا ممکن نہیں ہے۔ کس پر کتنا الزام آتا ہے، کس کی کتنی ذمہ داری ہے اور کون کتنا بڑا مجرم ہے، اس کی تعیین کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے تو کوئی بہت بڑا بااختیار کمیشن تحقیقات کے لئے بیٹھے، جو سب کے بیانات بھی لے سکے اور سب اس کے سامنے حاضر بھی ہوں، تب کہیں جا کر شاید یہ معین کیا جا سکے کہ اس معاملہ

میں کس کی ذمہ داری سب سے زیادہ تھی۔ جیسا کہ سورۂ نور میں واقعہ افک کے ضمن میں "والذی تولی کبرہ منھم" کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جو تہمت لگائی گئی تھی اس میں اگرچہ بعض مخلص مومنین صادقین بھی اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے منافقین کی آواز میں اپنی آواز ملا رہے تھے' لیکن اس سارے معاملے میں جس شخص نے اپنے اوپر سب سے بڑا بوجھ اٹھایا وہ عبداللہ بن ابی تھا۔ تو ایسے ہی کوئی نہ کوئی عبداللہ بن ابی یہاں پر بھی ہے اور اس کے ساتھ دوسرے لوگوں کا بھی حصہ رسدی پہنچتا ہے' لیکن نہ تو میں اس کی واضح تعیین کی ضرورت محسوس کرتا ہوں اور نہ ہی میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میرے لئے ممکن ہے۔

میرے نزدیک یہ بحران اصل میں انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین محاذ آرائی پر مشتمل تھا۔ اگرچہ اس میں نام مقننہ کا آتا رہا ہے اور بار بار پارلیمنٹ کا ذکر کیا جاتا رہا ہے لیکن درحقیقت یہ پارلیمنٹ کا جھگڑا نہیں تھا۔ پارلیمانی نظام میں سب سے بڑی حماقت یہ کی گئی ہے کہ مقننہ اور انتظامیہ دونوں کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے' حالانکہ مقننہ (Legislature) اور انتظامیہ (Administration) دو علیحدہ شعبے ہیں۔ اور دنیا میں عمرانی ارتقاء کا عمل اپنی انتہا تک پہنچا ہے تو اس نے صدارتی نظام کی صورت اختیار کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم یہ بات چھ سات سال سے کہہ رہے ہیں کہ یہاں صدارتی نظام نافذ کیا جائے اور پارلیمانی نظام کی لعنت کو ختم کیا جائے۔ بہرحال عدلیہ کے ساتھ محاذ آرائی کا معاملہ پارلیمنٹ یا مقننہ (Legislature) کا نہیں' انتظامیہ کا تھا۔ یہ وزیراعظم کے اقتدار اور اختیار کا معاملہ تھا۔ دوسری طرف عدلیہ تھی۔ مقننہ کو تو چودھویں ترمیم کے نتیجے میں non-entity بنا دیا گیا تھا۔ حالانکہ فلور کراسنگ پر تو پابندی لگنی چاہئے تھی لیکن اظہار خیال پر پابندی لگا دینا کہ تنقید بھی نہیں ہو سکتی' یہ تو بدترین قسم کی آمریت ہے۔ اس حوالے سے تو پارلیمنٹ کی حیثیت ربڑ سٹمپ کے سوا کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اس کا تو صرف نام لیا گیا ہے۔ جہاں تک صدر صاحب کا تعلق ہے وہ بے دست و پا تھے' اس لئے کہ تیرھویں ترمیم کے ذریعے ان کا "ڈنگ" نکال دیا گیا تھا اور اب وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ ایک موقع آیا تھا کہ جب جسٹس سجاد حسین صاحب نے تیرھویں ترمیم معطل

کردی تھی تو وہ فوری طور پر ایکشن کر کے اسمبلی توڑ سکتے تھے لیکن اس طرح کے تعطل کی حالت میں اس دفعہ کو استعمال کرنا ایک مختلف چیز تھی۔ اس میں اور تیرھویں ترمیم کی منظوری سے پہلے ان کے اختیار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس بحران میں صدر صاحب بھی خواہ مخواہ عدلیہ کے ساتھ نتھی ہو گئے۔ چنانچہ صورتحال یہ بن گئی کہ انتظامیہ اور مقننہ ایک طرف' جس میں کہ مقننہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی' اصل فریق انتظامیہ تھی' جبکہ عدلیہ اور صدارت دوسری طرف' جس میں اصل فریق عدلیہ تھی اور صدر اس کے ساتھ محض نتھی تھا۔

اس محاذ آرائی میں جہاں تک عدلیہ کا معاملہ ہے تو اگرچہ میرے نزدیک ابتدا میں اس کا طرزِ عمل بہت شاندار' باوقار اور باعزت تھا لیکن پھر جب دوبدو جنگ شروع ہو گئی اور بات "تم نہیں یا ہم نہیں" تک پہنچ گئی تو اس کے بعد سے اس کا طرزِ عمل قابلِ رشک نہیں رہا۔ اور اس محاذ آرائی سے سب سے بڑھ کر جو زخم لگا ہے وہ عدلیہ ہی کو لگا ہے' جس کا وقار' حیثیت اور مقام و مرتبہ مجروح ہوا ہے۔ عدلیہ کی تقسیم سے بڑی مضحکہ خیز شکل سامنے آئی ہے' لیکن اس کے پیدا کرنے میں خود عدلیہ کے آخری دور کے بعض اقدامات بھی ذریعہ بنے ہیں' جو محسوس ہوتا ہے کہ بہت ہی افراتفری میں کیے گئے' جیسے کہ کسی کی جان پر بن جاتی ہے تو وہ (by hook or by crook) ہر ذریعہ استعمال کرتا ہے۔ دوسری طرف حکومت کی طرف سے بھی ناتجربہ کاری اور غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا گیا۔ بات سپریم کورٹ پر حملے تک جا پہنچی جو میرے نزدیک انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے۔ دنیا میں پہلے ہی ہماری کون سی عزت و آبرو تھی کہ اب اس حرکت کے ذریعے اپنا وقار خاک میں ملایا گیا ؎

پہلے ہی اپنی کونسی ایسی تھی آبرو
پر شب کی منتوں نے تو کھو دی رہی سہی

بہرحال یہ صورتحال نہایت افسوسناک' نہایت تشویشناک اور نہایت غور و فکر کے قابل ہے۔ شکر در شکر تو اس بات کا ہے کہ یہ معاملہ ٹل گیا' جس میں بڑے بڑے خطرناک اور گھمبیر امکانات موجود تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ فوج عدلیہ اور صدارت کا ساتھ دیتی

اور پولیس حکومت کا' تو ہماری فوج اور پولیس کا مقابلہ شروع ہو جاتا۔ اس کی جھلک لاہور میں پہلے ایک مرتبہ انہی نواز شریف صاحب کی وزارت علیا کے دوران سامنے آ چکی ہے۔ اس وقت بھی اللہ نے تصادم کو روک لیا تھا اور اب بھی۔ فللہ الحمد

دوسرا امکان یہ بھی تھا کہ انقلاب فرانس جیسے خونی انقلاب کا نقشہ سامنے آجاتا اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ اس لئے کہ جیسے سپریم کورٹ پر حملہ ہوا تھا ایسے ہی ایوان صدر پر بھی حملہ ہو سکتا تھا۔ پولیس تو حکومت کے اختیار میں تھی' اس نے اگر سپریم کورٹ پر حملے کو نہیں روکا تو ایوان صدر پر بھی حملے کو کون روکتا' لیکن اگر فوج اپنی ذمہ داری ادا کرتی تو ذرا سوچئے کہ کیا ہوتا؟ پھر انقلاب فرانس کی طرح گلی گلی جنگ ہوتی۔ میرے نزدیک انقلاب فرانس جیسا ہولناک خونی انقلاب تاریخ انسانی میں نہیں آیا۔

تیسرا امکان یہ بھی تھا کہ فوج میں بھی تقسیم ہو جاتی اور میں ۱۲ ہزار میل دور بیٹھا اسی چیز سے سب سے زیادہ خائف تھا۔ اس لئے کہ بعض واقفان راز حضرات جو اسرار درون پردہ سے واقف ہیں ان کا کہنا ہے کہ اندر تو تقسیم موجود ہے۔ آخر وہ بھی انسان ہیں' ان کے بھی جذبات و احساسات ہیں' ان کے اندر بھی مکاتب فکر ہیں اور ان میں ہر طرح کی آراء رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ٹھیک ہے' اگر انہیں بولنے کا اختیار نہیں ہے تو آپ انہیں "گونگے" کہہ لیجئے لیکن بہرحال وہ بہرے تو نہیں ہیں جو سنتے بھی نہ ہوں' اندھے تو نہیں ہیں جو دیکھتے بھی نہ ہوں اور پڑھتے بھی نہ ہوں۔ اس اعتبار سے ہمارا یہ ایک ادارہ بچا ہوا ہے کہ اس میں تقسیم نہیں ہوئی' یا یوں کہنا چاہئے کہ تقسیم ظاہر نہیں ہوئی' ورنہ دیگر سیاسی اور قومی اداروں کا حشر تو آپ کے سامنے ہے۔ عدلیہ میں جو تقسیم ہوئی ہے اس نے کس قدر مضحکہ خیز صورت اختیار کی ہے' اور وہ تقسیم ابھی برقرار ہے' ختم نہیں ہوئی۔ اس حوالے سے تو بحران ابھی جاری ہے۔ اس کے بعد' جیسا کہ میں نے عرض کیا' لے دے کر ایک فوج ہی رہ گئی ہے۔ اللہ کرے کہ اس میں کوئی ایسی نوبت نہ آئے کہ فوج میں بھی کوئی تقسیم اور اندرونی خلفشار کی صورت بن جائے۔

حالیہ بحران کا ڈراپ سین صدر فاروق احمد خان لغاری کے استعفے پر ہوا ہے۔ یہاں آکر میں نے جو مختلف لوگوں کی گفتگو سنی ہے اور بعض حضرات کے اخباری کالم نظر سے

گزرے ہیں تو یہ بات سامنے آئی ہے کہ کچھ لوگ تو لغاری صاحب کی بے گناہی بلکہ ان کے ایثار و قربانی، بے نفسی اور علو ہمت کے راگ الاپ رہے ہیں اور کچھ لوگ اس کے برعکس کہتے ہیں، اور ظاہربات ہے کہ حتمی فیصلہ بہت مشکل ہے۔ وجدانی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ لغاری صاحب نے تقریباً اسی طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے جو صدر ایوب کا تھا۔ اور تقریباً ۳۰ سال کے وقفے سے ہماری تاریخ میں اس طرح کی مثال سامنے آئی ہے۔ فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان جیسے بھی تھے اللہ کے حضور پہنچ چکے ہیں ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ﴾ لیکن ان کے بعض اقدامات لائق تحسین ہیں۔ مثلاً انہوں نے اس ملک کو صنعتی ترقی کی راہ پر ڈالا۔ پھر یہ کہ انہوں نے مارشل لاء بہت تھوڑا عرصہ رکھا۔ اس طرح بہت سی چیزیں ان کے کریڈٹ میں جاتی ہیں۔ اگرچہ اقتدار سے ان کا نکلنا "بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" کا مصداق تھا۔ ان کے خلاف جس طرح جلوس نکالے گئے اور جس طرح کتوں کو ہار پہنا کر ایوب بنایا گیا وہ ہمارے عوام کی گری ہوئی سطح کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ظاہربات ہے کہ وہ دینی آدمی نہیں تھے، بلکہ وہ "عائلی قوانین" کے ذریعے اس ملک میں دین کے اندر بہت بڑا رخنہ پیدا کر کے گئے ہیں، جو شریعت کے بالکل خلاف قوانین تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان میں ایک عنصر شرافت کا بھی تھا۔ جب ہمارے ہاں کے سیاست دانوں نے انہیں مجبور کر دیا کہ شیخ مجیب الرحمن کے خلاف قائم اگرتلہ سازش کیس واپس لیا جائے تو اس وقت اس شخص کے الفاظ یہ تھے :

I am not ready to preside over the disintegration of Pakistan

یعنی تمہارے اس مطالبے کے پورا ہونے کے نتیجے میں پاکستان ٹوٹ جائے گا اور میں ایسے پاکستان کا صدر نہیں رہنا چاہتا۔ لہٰذا انہوں نے استعفاء دے دیا۔ اس مرحلے پر بھی انہوں نے بہت بڑی غلطی اور بہت بڑا جرم کیا کہ اقتدار سینٹ کے چیئرمین کے حوالے کرنے کے بجائے انہوں نے جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ لیکن میں اس وقت صرف ان کی شرافت کے عنصر کا ذکر کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک صدر لغاری صاحب کا رول بھی لگ

بھگ ایسا ہی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بزدلی دکھائی' انہیں ڈٹ جانا چاہئے تھا' ان کے لئے کام کرنے کا موقع تھا للذا انہیں کام کرنا چاہئے تھا۔ اور دوسری طرف ان کے طرز عمل کو تحمل پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اور بزدلی اور تحمل میں ع "مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد" کے مصداق فرق تو بہرحال ہوتا ہے' خواہ باریک سہی۔ تو کہنے کو اسے بزدلی کہئے' کم ہمتی کہئے' لیکن اگر کوئی اسے قربانی اور ایثار سے تعبیر کرنا چاہئے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے بھی مواد موجود ہے۔

اسی طرح جہاں تک فوج کے کردار کا تعلق ہے' یہ تو اللہ ہی جانتا ہے یا خود فوج جانتی ہے کہ اس نے یہ کردار از خود اختیار کیا یا کسی داخلی دباؤ یا کسی خارجی اشارے پر کیا۔ یہ تینوں امکانات موجود ہیں۔ اگر از خود کیا تو بہت بڑی بات ہے' بہت اعلیٰ بات ہے۔ اگر اس میں کوئی داخلی عوامل کارفرما ہوئے ہیں یا کوئی خارجی اشارہ ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لئے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن نتیجہ بہرحال یہ نکلا ہے کہ ہم اس بحران سے نکل آئے ہیں۔

حالیہ سیاسی بحران سے اخذ کردہ دو نتائج

اب اس ساری صورت حال سے دو بڑے بڑے نتائج اخذ کئے جانے چاہئیں۔ پہلا نتیجہ جسے میں ڈنکے کی چوٹ بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ نہ صرف نواز شریف صاحب میں بلکہ پوری شریف فیملی میں شدید ترین آمریت کے بدترین اور مہلک ترین (Most Virulent) جراثیم موجود ہیں اور بدقسمتی سے ان کے بار آور ہونے کے لئے یہاں مواقع بھی موجود ہیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ دنیا میں بدترین آمریتیں فوجی آمریتیں نہیں رہیں بلکہ بدترین آمریتیں وہ ہیں جو سیاسی میدان سے اٹھی ہوں۔ ہٹلر کون تھا؟ وہ کوئی جرنیل تو نہیں تھا۔ اسی طرح مسولینی بھی کوئی جرنیل نہیں تھا۔ کسی وقت کوئی پارٹی کسی وجہ سے اتنی طاقتور ہو جائے کہ اس کے لیڈر کے دماغ میں خناس بھر جائے تو وہ اصل آمر بن کر سامنے آ جاتا ہے اور اس بدترین آمریت کے لئے پاکستان میں اب فضا موجود ہے۔ اگرچہ ہمارے لئے شکر در شکر بلکہ شکر صد شکر کا مقام ہے کہ ہم اس پوری

صورتحال سے اس طرح نکل آئے ہیں جیسے کسی وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی خوفناک حادثے سے بال بال بچ گئے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی گاڑی زنانے کے ساتھ آپ کو چھوتی ہوئی ایسے گزر گئی کہ بال برابر بھی فرق ہوتا تو آپ نہیں تھے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے ہاتھ دے کر بچالیا ہو اور ہاتھ دینے والے واقعتاً موجود ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا : "یرسل علیکم حفظۃ" کہ اللہ تم پر نگران اور محافظ (فرشتے) بھیجتا رہتا ہے۔ چنانچہ سب سے بڑے باڈی گارڈ تو اللہ کے فرشتے ہیں' جب تک موت کا وقت نہیں آتا اس وقت تک موت نہیں آسکتی اور کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے بالفعل ہاتھ دے کر بچالیا ہے ورنہ بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ اسی طرح کی صورتحال سے ہم بچ نکلے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ایک تو آمریت کا شدید خطرہ موجود ہے جس کو پوری طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پارلیمنٹ کے نام سے جس جبر و استبداد' ظلم اور Repression کا آغاز ہو رہا ہے اگر اس کو بروقت چیک نہ کیا گیا تو وہ بہت خوفناک ہوگا۔ اور میں یہ بات پھر دہرا رہا ہوں کہ اس کے لئے طاقتور جراثیم ایک شخص کے اندر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر جب آپ کا گلا وغیرہ خراب ہو جاتا ہے جو در حقیقت ہوتا یہ ہے کہ بیماری کے جراثیم جسم میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں' لیکن جسم کی قوت مدافعت ان کو دبائے رکھتی ہے۔ یہ قوت مدافعت جب ذرا کمزور پڑتی ہے تو یہ جراثیم آپ پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اور یہی بات اب اس ملک میں ہو چکی ہے کہ یہاں اب اپوزیشن کمزور ہے' بلکہ اس حوالے سے تو اپوزیشن کا وجود ہی نہیں۔ پہلے کبھی یہ ہوتا تھا کہ اپوزیشن ادھر نہیں تھی اور اب اپوزیشن ادھر نہیں رہی اور یہ چیز خطرناک ہے۔ اپوزیشن سیاسی سطح پر قوت مدافعت (Resistance) کا کردار ادا کرتی ہے اور وہ یہاں پر اس درجے غیر موثر ہو چکی ہے کہ بدترین آمریت کے مواقع موجود ہیں۔

تاہم میں اس اجتماع جمعہ کی وساطت سے نواز شریف صاحب بلکہ ان کی پوری شریف فیملی' بشمول میاں محمد شریف صاحب تک دو باتیں پہنچانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو اس شعر کے حوالے سے ہے کہ ؎

یہی انجام کا مارا ہوا دل
ہلاک عشرت آغاز بھی ہے!

کوئی شے شروع میں بڑی اچھی، بڑی حسین لگتی ہے۔ خاص طور پر حکومت اور اقتدار میں تو جو شان و شوکت اور کروفر ہوتا ہے وہ بڑا سرور آور ہوتا ہے۔ لیکن اس کا انجام عبرتناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے سابقہ حکمرانوں میں سے دو مثالیں ہمارے سامنے رہنی چاہئیں۔ ہمارے ملک میں جو شخص سب سے پہلے عوامی آمریت کی راہ پر چلا اس کا نام ذوالفقار علی بھٹو تھا اور جان لینا چاہئے کہ اس کا عوامی Base نواز شریف کے Base سے زیادہ مضبوط تھا۔ وہ کہیں زیادہ طلسماتی شخصیت کا مالک تھا۔ بین الاقوامی سطح کے معاملات اور خارجہ پالیسی میں تو آج تک پاکستان میں کوئی شخص اس کی ٹکر کا پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس میں واقعتاً بڑی صلاحیتیں تھیں۔ پورے عالم اسلام میں وہ واحد شخص تھا جو جان فوسٹر ڈلس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ ڈلس نے کسی اجتماع میں یہ کہا تھا کہ انڈیا اور پاکستان کی مثال دو چھوٹے کتوں کی سی ہے 'ایک ہمارے دائیں ٹخنے پر پڑتا ہے تو دوسرا بائیں ٹخنے پر۔ ایک کو ذرا کچھ کھانے کو دیتے ہیں تو دوسرا کاٹتا ہے' دوسرے کو دیتے ہیں تو پہلا کاٹتا ہے۔ اس پر بھٹو نے اسے مخاطب کر کے کہا تھا :

"Mr Secretary!
This time we are going to bite a little higher up"

یعنی اس دفعہ ہمارا کاٹنا آپ کے ٹخنے پر نہیں بلکہ کچھ اوپر ہوگا۔ اس شخص کا جو انجام ہوا ہے اس کو سامنے رکھئے! ٹی بی کے ابتدائی مریض کو اگر ٹی بی کا وہ مریض دکھا دیا جائے جو اس کی تھرڈ سٹیج کو پہنچ چکا ہو تو اس کے لئے بڑی سبق آموزی کا باعث بن سکتا ہے۔ ورنہ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی بات نہیں، تھوڑا سا بخار چل رہا ہے، کھانسی ہے۔ اب میں کہاں اس کا علاج کراتا پھروں۔ لیکن اسے اگر اسی بیماری کی تھرڈ سٹیج دکھا دی جائے تو اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ اسی طرح ایک نیم اسلامی آمر ضیاء الحق کا جو حشر ہوا وہ بھی عبرت کے لئے کافی ہے۔ بسا اوقات وہی بیرونی آقا ہی پھر گردن ناپتے ہیں جن کے کھونٹے پر بندھے رہیں۔ افغان جہاد میں جن کی امداد سے ہمارے جرنیلوں نے ارب ہا ارب روپیہ کمایا وہ

پھر انہی کے ہاتھوں ختم ہوئے۔ تو یہ دو مثالیں نواز شریف صاحب کی عبرت آموزی کے لئے کافی ہیں۔

دوسری بات بھی اسی غزل کے ایک شعر کے حوالے سے کہنا چاہتا ہوں۔ یہ غالباً جگر مراد آبادی کی غزل ہے ؎

سکوتِ لالہ و گل پر نہ جانا
اسی میں شعلہ آواز بھی ہے

یہ پھول خاموش ہیں' بولتے نہیں' لیکن ان کی خاموشی پر مت جایئے۔ عوام کی خاموشی' ان کی طرف سے کسی ردِ عمل کا نہ ہونا' آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کردے۔ برداشت کی آخر حد ہوتی ہے۔ سکوتِ لالہ و گل جب پھٹتا ہے تو بہت خوفناک نتائج پیدا کرتا ہے۔

اس ضمن میں خاص طور پر یہ بات توجہ طلب ہے کہ میرا تجزیہ تو وہ ہے جو میں ہمیشہ سے کرتا رہا ہوں اور وہ آپ کے سامنے آتا رہا ہے۔ یعنی پاکستان کا باپ اسلام لیکن ماں جمہوریت ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ میرے ۳۰' ۴۰ برس کے سیاسی غور و فکر کے نتائج کا نچوڑ ہے۔ میں اگرچہ معروف معانی میں سیاست میں نہیں ہوں لیکن میں سیاست کا طالب علم ہوں' مبصر ہوں۔ میرے نزدیک پاکستان کا باپ اسلام ہے۔ جیسے حضرت سلمان فارسیؓ سے جب پوچھا جاتا تھا کہ ان کا نام کیا ہے؟ تو وہ کہتے "سلمان"۔ جب پوچھا جاتا "سلمان ابن؟" اس لئے کہ عربوں کے نزدیک تو نام مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ باپ کا نام نہ آئے۔ تو وہ جواب میں کہتے تھے "سلمان بن اسلام"۔ تو پاکستان ابن اسلام ہے' لیکن ماں اس کی جمہوریت ہے۔ وقتی طور پر چاہے کسی آمر کی آمریت کچھ عرصے کے لئے چل جائے' لیکن اس کے اندر جمہوریت کی دبی ہوئی آگ کہیں نہ کہیں ضرور بھڑکے گی اور وہ کوئی نتائج لازماً پیدا کرے گی۔

ان دونوں حوالوں سے میں جو نتائج اخذ کر رہا ہوں اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ملک میں پارلیمان کے نام پر بدترین ذاتی آمریت کا جو امکان پیدا کیا جا رہا ہے اس کے لئے ہر سوچنے سمجھنے والے آدمی کو تیار ہونا چاہئے کہ وہ ہر ممکن سطح پر اس کے خلاف آواز اٹھائے اور اسے روکنے کے لئے جو ذریعہ بھی ممکن ہو استعمال کرے۔ اس لئے کہ یہ

بیماری "Nip the evil in the bud" کے درجے میں ختم ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ بہت خطرناک ہو جائے گی۔

دوسری بات جو بالکل واضح ہو کر آگئی ہے وہ یہ ہے کہ دستور پاکستان کے بارے میں یہ بات میں بہت کھل کر اور بار بار کہہ چکا ہوں کہ یہ منافقت کی پوٹ ہے۔ اس میں ایک طرف سے پورا اسلام داخل کیا گیا اور دوسری طرف سے پورے کا پورا نکال لیا گیا ہے اور اسی کا نام منافقت ہے۔ منافق "ذُوالْوَجْھَیْن" ہوتا ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم "لَا اِلٰی ھٰٓؤُلَاءِ وَلَا اِلٰی ھٰٓؤُلَاءِ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہی حال ہمارے دستور کا ہے کہ نہ سیکولر ہے نہ اسلامی۔ اسلامی دستور کا نام لیجئے تو دفعات دکھادی جائیں گی کہ اس میں قرارداد مقاصد ہے، دفعہ ۲۲۷ ہے، فلاں ہے، فیڈرل شریعت کورٹ ہے، جبکہ ذرا گہرائی میں جاکر دیکھئے تو کچھ بھی نہیں۔ ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے ؂

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

اس کے علاوہ یہ ہر اعتبار سے نہایت نامعقول، غیر منطقی اور نہایت بھونڈا دستور ہے جس کو درست کرنے کی اب اولین کوشش کرنی چاہئے۔

میاں نواز شریف اور انکے ساتھیوں کیلئے چند نصائح اور مشورے

اس ضمن میں ہمارا کام یہ ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کو پیش نظر رکھیں کہ "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ"۔ یعنی دین تو نام ہے نصیحت کا، خیر خواہی کا، بھلائی کا۔ پوچھا گیا "لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟" (اے اللہ کے رسول! کس کے لئے نصیحت اور خیر خواہی؟) تو آپؐ نے فرمایا: "لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ" یعنی اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ وفاداری، اخلاص، خلوص اور مسلمانوں کے اماموں کے ساتھ خیر خواہی، اور عوام کے ساتھ بھی خیر خواہی۔ یہاں ائمہ کو عوام سے مقدم کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ان کے ہاتھ میں اختیارات ہوتے ہیں، خواہ کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو۔ ان اختیارات کا اگر صحیح استعمال ہو

جائے تو پورے ملک اور پوری قوم کا بھلا ہو جائے گا اور اگر غلط استعمال ہو جائیں تو سب کی تباہی آجائے گی۔ اس موقع پر مجھے ایک بڑا پیارا شعر یاد آیا ہے کہ ؎

رنگِ گل کا ہے سلیقہ' نہ بہاروں کا شعور
ہائے کن ہاتھوں میں تقدیرِ حنا ٹھہری ہے!

ہمارے ملک و قوم کی تقدیر کبھی بے نظیر اور زرداری کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کبھی شریف برادران کے ہاتھ میں۔ اب اختیارات بالفعل (defacto) جن ہاتھوں میں ہیں ہمیں انہیں قبول کئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ لیکن اگر ان سے خیر کی بات کہی جا سکتی ہو تو وہ ضرور کہنی چاہئے' یہ دیکھے بغیر کہ انہیں پسند آئے گی یا نہیں۔ صرف یہ دیکھنا ہو گا کہ بات صحیح ہو' اس پر اپنا دل مطمئن ہو اور اس کے بارے میں اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کا احساس ہو' یہ سمجھتے ہوئے کہ ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

ہمارے لئے تو ہر لمحہ محشر کا ہے۔ تو بات کہی جائے تو صحیح اور سچی' نہ کسی کے حلیف ہو کر نہ کسی کے حریف ہو کر' نہ کسی کے مخالف ہو کر نہ کسی کے ایجنٹ بن کر (معاذ اللہ) اللہ ہمیں اس سے بچائے۔ اب میں وہ نصیحتیں پیش کرتا ہوں جو میرے پیش نظر ہیں :

(۱) اولین اور اہم ترین بات تو یہی ہے کہ اس ملک کا قبلہ درست کریں۔ یہ بات میں بتکرار و اعادہ کہہ رہا ہوں کہ دستور میں سے منافقت کی جڑ کو نکالا جائے اور دستور کو اسلامی بنایا جائے۔ اس ضمن میں ہم نے سارا کام کر دیا تھا اور "ندائے خلافت" کی ایک خصوصی اشاعت اس پر شائع کی تھی۔ خود جنرل عبد المجید ملک صاحب نے کہا کہ انہوں نے تو سارا کام کر دیا ہے۔ اس اشاعت کی حیثیت ایک دستاویز کی ہے جس میں وہ ۲۲ نکات بھی موجود ہیں جو مختلف مکاتب فکر کے ۳۱ علماء نے متفقہ طور پر پیش کئے تھے۔ مزید برآں یہ وضاحتیں بھی موجود ہیں کہ قرارداد مقاصد کیا ہے' دستور میں کیا کیا خباثتیں کہاں کہاں بھری ہوئی ہیں' کہاں کہاں چور دروازے رکھے گئے ہیں اور اب انہیں کس طریقے سے بند کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ پرچہ اس ملک کے ہر باشعور شہری تک پہنچنا چاہئے۔ تو

کرنے کا پہلا کام تو یہی ہے۔ پاکستان آ کر دو تین دنوں میں جو اخبارات دیکھے ہیں تو اس ضمن میں مجھے خوشی ہوئی ہے کہ اس ملک میں کم سے کم ایک آدمی تو اور ہے جس نے کہا ہے کہ "یہ بحران اس وقت تک آتے رہیں گے جب تک اسلام نافذ نہ کیا جائے"۔ یہ بات مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے کہی ہے۔ اس پر مجھے جتنی خوشی ہوئی اس سے کہیں زیادہ صدمہ مجھے اس پر ہوا ہے کہ جماعت اسلامی' جو اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی علمبردار رہی ہے اس کے امیر قاضی حسین احمد صاحب کو یہ بات کہنے کی بھی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ حالیہ سیاسی بحران میں قاضی صاحب کا کردار نہایت مضحکہ خیز رہا ہے' اور میرے نزدیک یہ انتہائی افسوسناک صورتحال ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی جماعت اور تحریک کی باگ ڈور آج جن ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اس پر بھی یہی شعر صادق آتا ہے کہ ؎

رنگِ گل کا ہے سلیقہ' نہ بہاروں کا شعور
ہائے کن ہاتھوں میں تقدیرِ حنا ٹھہری ہے!

قاضی حسین احمد اور ان کے حواریوں کو ذرا سوچنا چاہئے کہ وہ کونسا ماضی ہے' کونسی عزتیں اور عظمتیں ہیں کہ جن کی حرمت کے پردے وہ چاک کر رہے ہیں۔[1]

بہرحال پہلی بات یہی ہے کہ دستور میں سے منافقت کو ختم کیا جائے۔ یہ اولین بات ہے' باقی ساری باتیں اس کے تابع ہیں۔

(۲) ملک میں صدارتی نظام نافذ کیا جائے۔ میں یہ بات بڑے عرصے سے کہہ رہا ہوں کہ پارلیمانی نظام نہایت غیر منطقی ہے اور اسے ہم نے صرف انگریز پرستی کی وجہ سے جاری رکھا ہوا ہے۔ یہ انگریزوں کی روایت ہے جسے ہم نبھا رہے ہیں۔ اب اگر اعجاز الحق صاحب بھی یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تو ٹھیک کہہ رہے ہیں اب تو صدر کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی' لہٰذا صدر کا عہدہ ہی ختم کر دینا چاہئے۔ میرے نزدیک یہ ریاستی سطح پر اختیارات کا "شرک" ہے کہ ایک سربراہ ریاست ہے اور ایک سربراہ حکومت۔ اب ذرا ان کے اختیارات میں توازن پیدا کر کے دکھایئے۔ توازن کیسے ممکن ہے؟ یا ایک تابع ہو گا یا دوسرا تابع ہو گا' دونوں برابر تو نہیں ہو سکتے۔ پھر اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو گی

کہ دو سربراہوں کو رکھ لینا۔ پھر حماقت در حماقت یہ کہ ہماری تمام افواج کا سپریم کمانڈر تو صدر ہے، لیکن کمانڈر انچیف صاحب ڈیفنس سیکرٹری کے تابع ہیں اور ڈیفنس سیکرٹری ڈیفنس منسٹر کے تابع ہے، اور اگر ڈیفنس منسٹر علیحدہ ہو تو وہ وزیر اعظم کے تابع ہے۔ اب اگر کوئی جھگڑا کھڑا ہو جائے تو کیا ہو گا؟ آرمی چیف اس کا حکم مانے گا یا اس کا؟ میں تو یہی کہہ رہا تھا کہ اگر ایوان صدر پر حملہ ہو جاتا اور صدر کی حمایت میں فوج آ جاتی تو فوج اور پولیس کا جھگڑا ہوتا۔ اگر صدر صاحب اڑے رہتے اور استعفاء نہ دیتے تو یہ بعید از امکان نہیں تھا۔ پھر انقلاب فرانس کا نقشہ آتا یا پھر فوج آپس میں لڑتی۔ مجھے اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

ہوئی ہستی جہاں محدود ' لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے ' عقل ' فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اس شعر میں تین چیزوں کا تذکرہ ہے، عقیدہ، عقل اور فطرت۔ اور ہمارے ہاں بھی تین ہی قوتیں ہیں، جن میں باہم تصادم کا امکان تھا۔ یعنی فوج، وزیر اعظم اور صدر۔ صدر اور عدلیہ چونکہ ایک ہو چکے تھے لہٰذا وہی تکڈم برقرار تھی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس سے بچایا ہے۔ اب یہ ہونا چاہئے کہ دستور میں موجود اسلامیت کو محض برقرار رکھنے کی بجائے اسے بھرپور طور پر مکمل کرنے کے بعد دوسرا کام یہ کیا جائے کہ اس ملک میں حقیقی صدارتی نظام نافذ کیا جائے، جس میں قوم کے افراد براہ راست صدر کو منتخب کر سکیں۔ واضح رہے کہ میری مراد صدر ایوب والا صدارتی نظام قطعاً نہیں ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ موجودہ صوبوں کو تقسیم کر کے چھوٹے صوبے بنائے جائیں اور پورے ملک میں کم از کم بارہ صوبے بنا دیئے جائیں۔ تقریباً ایک کروڑ کی آبادی کا ایک صوبہ ہونا چاہئے۔ اس سے صوبائی عصبیت کی لعنت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ صوبائی تقسیم انگریزوں کی بنائی ہوئی ہے اور انگریز سے پہلے ان صوبوں کا وجود نہیں تھا۔ ہمارے ہاں جو چیزیں انگریز پرستی کا مظہر ہیں ان میں سے ایک یہ صوبہ پرستی بھی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ پارلیمانی نظام کا برقرار رکھنا بھی انگریز پرستی کا مظہر ہے۔ اسی طرح کرکٹ کا کھیل بھی ہمارے انگریز آقا کی وراثت ہے۔ یہ صوبے بھی انگریز نے ہی بنائے تھے

اور اسی نے ان کے نام رکھے تھے۔ ہمارے ہاں آزاد قبائل اب بھی جوں کے توں آزاد قبائل کہلاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم تو پھر ابھی محکوم ہی ہیں' آزاد تو وہ ہیں جو وزیرستان وغیرہ میں رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسی بہت بڑی بڑی غیر منطقی چیزیں موجود ہیں۔ اب حالات کا تقاضا ہے کہ صوبائی تقسیم از سر نو کی جائے' نئے صوبے وجود میں آئیں' جنہیں زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری دی جائے اور ہر صوبے کو اپنا نام رکھنے کی اجازت دی جائے۔ اگر صوبے چھوٹے ہو جائیں گے تو کئی نام بن جائیں گے۔ ٹھیک ہے' کوئی حرج نہیں کہ سب اپنا نیا نام رکھ لیں۔ پنجاب تقسیم ہوتا ہے تو سرائیکی صوبہ بھی بن سکتا ہے' اس میں کیا حرج ہے۔ اگر "پنجابی" کفر نہیں ہے تو "سرائیکی" کیسے کفر ہو گیا۔ بعض چیزیں بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہوتی ہیں لیکن خواہ مخواہ ہوا بنا دی جاتی ہیں۔

چھوٹے صوبے بنانے اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دیئے جانے کے ضمن میں ہمارے سامنے دنیا میں ماڈل موجود ہیں' اور دنیا میرے نزدیک اس کے لئے بہترین ماڈل امریکہ ہے۔ وہاں وفاقی سطح پر فیڈرل گورنمنٹ ہے اور ریاستوں کی سطح پر سٹیٹ گورنمنٹ۔ اور ان کے مابین انہوں نے مثالی Relationship اور توازن رکھا ہوا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کاؤنٹی لیول پر میئر (Mayor) اور مقامی تھانیدار تک منتخب ہوتے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ اگر کسی کی مرمت کرانی ہو تو وہاں فلاں DSP کو بھیج دو اور اگر کسی کی عزت کا دھیلا کرانا ہو تو فلاں تھانیدار کو تعینات کر دو' جس کے نام سے ہی دہشت ٹپکتی ہو۔ دنیا نے اگر کوئی خیر' کوئی بھلائی سیکھی ہے تو ہمیں تو حکم یہ ہے کہ "الحکمۃُ ضالّۃ المومنِ فھو احقُّ بھا حیثُ وجدھا" یعنی حکمت تو مومن کی گمشدہ متاع کی مانند ہے' اسے جہاں بھی پائے وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے' لہٰذا جہاں سے بھی ملے اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑے۔

(۴) صدر مملکت لازماً سندھ سے ہونا چاہئے۔ بصورتِ دیگر مجھے اندیشہ ہے کہ پاکستان کے شمالی اور جنوبی حصوں میں تقسیم کے لئے ابھی سے بہت بڑے پیمانے پر بیج پڑ

جائے گا۔ اس کے جراثیم بھی اس پورے بحران میں سامنے آئے ہیں۔ سجاد علی شاہ سندھی ہیں' جسٹس جونیجو سندھی ہیں' فوج پنجاب کی کہلاتی ہے' کم سے کم جنرل کرامت صاحب تو پنجاب کے ہیں اور وزیراعظم بھی پنجابی ہیں۔ دوسری طرف صدر لغاری صاحب بلوچ ہیں۔ اگرچہ انہیں پنجابی کہا جاتا ہے اس لئے کہ ان کی جاگیر پنجاب میں شمار ہوتی ہے' لیکن وہ معروف معنوں میں پنجابی نہیں ہیں۔ ان کا باپ بلوچ اور ماں پختون ہے۔ بہرحال میرے نزدیک صدر بھی پنجاب سے لیا گیا تو بہت خطرناک صورتحال پیدا ہو جائے گی۔ اس ضمن میں اگرچہ میری کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن ایک رائے دے رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت یہ ملک جس جگہ پہنچ چکا ہے اور ہم جس خطرناک صورت حال سے دوچار ہو چکے ہیں اس میں صدر کا منصب کسی خالص غیر سیاسی شخصیت کو دیا جائے اور میرے نزدیک حکیم محمد سعید صاحب اس کے لئے موزوں ترین فرد ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کے بڑے دوررس اثرات ہوں گے۔ ان کی کوئی سیاسی پارٹی نہیں' کوئی سیاسی امنگیں نہیں' انہوں نے زندگی بھر اپنے تصورات کے مطابق طب اور علم کی خدمت کی ہے۔ سندھ کے اندر ایک بہت بڑا طبقہ مہاجرین کا ہے' اس سے ان کی بھی اشک شوئی ہو گی کہ اس ملک میں ہماری بھی کوئی حیثیت ہے اور اس سے تحریک پاکستان کی یاد بھی تازہ ہو گی۔ اگرچہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے' میں نے نہ تنظیم اسلامی کی شوریٰ میں اس پر کوئی گفتگو کی ہے نہ یہ ہمارا موضوع ہے' لیکن میں اپنی ذاتی حیثیت میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جس شے میں بھی ملک و قوم کی کوئی خیر' کوئی بھلائی' کوئی اچھائی دیکھوں اسے بیان کروں۔ فرض کیجئے اگر حکیم سعید صاحب منظور نہیں تو پھر بھی کوئی سندھی ضرور ہونا چاہئے' کوئی پرانا سندھی لے آیئے۔ اس لئے کہ آپ مسئلہ سندھ کو نظرانداز نہ کیجئے کہ ع" آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ " ظاہر بات ہے کہ سندھ میں جو صوبائی حکومت بنے گی اس میں تو پرانے سندھیوں کا غلبہ ہی ہو گا۔ صدر کی حیثیت تو اب بس علامتی (Symbolic) ہی ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ اب تو صدر کے پاس اتنے اختیارات بھی نہیں ہیں جتنے ملکہ برطانیہ کے پاس ہیں۔ جب تک آپ مکمل طور پر صدارتی نظام نہیں لاتے اس وقت تک کی صورتحال میں اس کی حیثیت محض علامتی

ہے۔ تو اچھا ہے کہ اس نشست پر ایک ایسا آدمی بیٹھا ہو جو اپنی علمی اور سماجی خدمات کے حوالے سے پہچانا جاتا ہو۔ اور اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سعید صاحب مناسب ترین رہیں گے۔

(۵) "Last but not the Least" کے درجے میں آخری بات خالص نواز شریف صاحب سے مشورے کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت دوراہے پر کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک راستہ بھٹو اور ضیاء الحق کا ہے اور ان دونوں کے درمیان جو قدر مشترک ہے اس کے بارے میں آپ حضرات میرے تجزیئے سے بخوبی واقف ہیں۔ میں ان دونوں انسانوں کو اس اعتبار سے خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں کہ انہیں تاریخ نے' قدرت نے' اللہ تعالیٰ نے بہترین مواقع عطا کیئے' لیکن اس اعتبار سے بدنصیب ترین انسان سمجھتا ہوں کہ وہ بری طرح ناکام ہوئے اور اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر سکے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو تاریخ نے یہ موقع دیا تھا کہ وہ اس ملک سے جاگیرداری کی لعنت کو ختم کر کے پاکستان کا ماؤزے تنگ بن سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں سے جاگیرداری کی لعنت صاف کر دیتا تو اس ملک میں کوئی نہیں تھا جو اس کے مقابل آسکتا۔ جو عوامی مینڈیٹ اسے ملا تھا وہ آج تک کسی کو نہیں ملا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس ملک میں عوامی لیڈر پیدا ہی ایک ہوا ہے۔ اور اس کو چاروں صوبوں سے جس وسیع پیانے پر عوامی حمایت حاصل تھی وہ نواز شریف صاحب کو حاصل نہیں ہے۔ سندھی ہونے کے باوجود اس نے سب سے زیادہ نشستیں پنجاب سے حاصل کیں۔ اسے یہ موقع ملا تھا کہ وہ اس ملک کا ماؤزے تنگ بن سکتا تھا لیکن وہ اپنی جاگیردارانہ کھلڑی سے باہر نہیں آسکا' للذا محروم اور بدنصیب رہا۔ دوسری طرف ضیاء الحق مرحوم کو اللہ نے موقع دیا تھا کہ وہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا مرتبہ حاصل کر سکتا تھا۔ نظام مصطفیٰؐ تحریک نے ملک کے عوام میں جو جوش و خروش پیدا کر دیا تھا وہ قیام پاکستان کی تحریک سے بھی دس گنا زیادہ تھا۔ لیکن اسے اس کی بدبختی' بدنصیبی اور محرومی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے گیارہ سال یونہی ضائع کر دیئے۔ نتیجہ کیا نکلا؟ جو بھی ہوا آپ کو معلوم ہے۔

اب تاریخ نے نواز شریف صاحب کو اسی دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ وہ عمر بن

عبدالعزیزؒ کا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ضیاء الحق ناکام ہو گئے تو یہ ان کے سیاسی جانشین اور سیاسی متبنٰی ہیں۔ ان کی سیاسی وراثت کا بڑا حصہ (Lion's share) انہی کے پاس ہے اور انہیں اب اللہ تعالیٰ نے موقع عطا کیا ہے۔ لیکن اس کے لئے انہیں دو کام کرنے ہوں گے۔ پہلا کام یہ کہ دستور میں موجود تضادات ختم کئے جائیں اور پورے دستور میں جہاں بھی کوئی شے دستور کی دفعہ ۲ الف یعنی قرارداد مقاصد کے منافی ہے اسے یا خارج کر دیا جائے یا صراحت کے ساتھ قرارداد مقاصد کے تابع کیا جائے۔ دفعہ ۲۲۷ اے کو لا کر اس کے ساتھ نتھی کر دیا جائے کہ یہاں کوئی قانون کتاب و سنت کے منافی نہیں بنایا جا سکتا۔ شریعت کورٹ پر جو پابندیاں عائد ہیں وہ ختم کر دی جائیں۔ شریعت کورٹ میں شریعت کے جاننے والے لوگ ہوں اور وہ ہر قسم کے دباؤ سے مکمل طور پر آزاد ہوں۔ اس طرح ہمارے ہاں قانون سازی کی گاڑی اسلام کی پٹڑی پر چلنا شروع ہو جائے گی۔ لوگ شریعت کورٹ میں آکر قوانین کے بارے میں دلائل دیں کہ کیا حلال ہے کیا حرام ہے' کیا صحیح ہے کیا غلط ہے' کیا جائز ہے کیا ناجائز ہے۔ کورٹ ان کا جائزہ لے کر فیصلے کرتی رہے گی' لیکن قانون سازی مقننہ کرے گی۔ قانون سازی میں عدالت کا کردار "منفی" ہوتا ہے۔ وہ صرف یہ طے کر سکتی ہے کہ آپ نے جو قانون بنایا ہے اس کا فلاں حصہ شریعت سے متصادم ہے' لہٰذا اس کی جگہ متبادل قانون سازی کر لیجئے۔ عدلیہ کا کام قانون سازی نہیں ہوتا۔ دستور میں مجوزہ ترامیم کے بارے میں ہم اتمام حجت کر چکے ہیں۔ اس بارے میں اب مزید تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔

دوسرا کام' جو اصل میں بہت کڑوی گولی ہے' لیکن اصل ٹیسٹ یہی ہے کہ ان کے خلاف جو پلاٹس کے مقدمات ہیں' جن کی FIR سالہا سال سے کٹی ہوئی ہے' اس ضمن میں اپنے آپ کو احتساب کے لئے پیش کریں۔ نواز شریف صاحب نے احتساب کے لئے جس دور کا تعین کیا تھا اس میں اپنے سابقہ دور کو شامل نہیں کیا۔ اس سے احتساب کا سارا عمل مشکوک ہو کر رہ گیا ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے انہوں نے ان پلاٹس کے ذریعے کوئی ذاتی مفاد نہیں اٹھایا تھا بلکہ انہیں سیاسی رشوت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ یہ جو چمٹے ہوئے لوگ ہیں' انہیں چپکائے رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی گوند تو آخر

چاہئے۔ اور ہمارے ہاں اصول، دیانت و شرافت اور نیکی کا گوند تو عنقا ہو چکا ہے۔ یہاں بھی مجھے اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر یاد آگیا ؎

چپکوں دنیا سے کس طرح میں
عورت نے کہا کہ گوند ہوں میں!

یعنی انسان کو دنیا سے چپکانے والی شے عورت ہے۔ عورت سے محبت انسان کو دنیا پر فریفتہ کرتی ہے۔ عورت سے اولاد ہوتی ہے، اولاد کی محبت بھی دنیا سے چپک جانے پر مجبور کرتی ہے۔ بہرحال انہوں نے بھی پلاٹس وغیرہ کو گوند کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن آج یہ قوم سے معافی مانگیں اور اس سب کی تلافی کر دیں، خواہ اس کے لئے انہیں اپنے سارے مل بیچنا پڑیں۔ اس طرح وہ عمر بن عبدالعزیز کا مقام و مرتبہ حاصل کر سکتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز بڑے خوش باش اور خوش پوشاک انسان تھے۔ وہ آخر اموی شہزادے تھے۔ ان کے لیل و نہار ہمیشہ سے وہ نہیں تھے جو خلافت کے بعد ہوئے ہیں، بلکہ جیسے شہزادے ہوتے ہیں ایسے رہتے تھے۔ بنو امیہ کی حکومت اس وقت دنیا کی طاقتور ترین حکومت تھی اور وہ اس حکومت کے شہزادے تھے۔ لیکن جب ان پر خلافت کی ذمہ داری آگئی تو زندگی میں انقلاب آگیا۔ تب اپنے ہی رشتہ داروں کی جاگیرداریوں کے وثیقے منگوا کر قینچی اٹھا کر کاٹنے شروع کر دیئے۔ پھر تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ دیئے میں اگر بیت المال کا تیل جل رہا ہے تو اپنا ذاتی کام کرتے وقت وہ دیا نہیں جلے گا، بلکہ بجھا دیا جائے گا۔ وہ صحابہ کرامؓ میں سے نہیں تھے۔ غور کیجئے کہ کسی کے لئے عمر بن الخطاب بننا ممکن نہیں ہے۔ ابوبکر صدیق، عثمان غنی یا علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہم) بننا ممکن نہیں ہے، لیکن عمر بن عبدالعزیز بنا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے تاریخ نے ضیاء الحق کو موقع دیا تھا لیکن یہ ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ اب یہ موقع ان کے ہاتھ میں ہے۔ تو بجائے بھٹو اور ضیاء الحق کے نقش قدم پر چلنے کے انہیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ انہیں اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے قوم سے معافی مانگ لینی چاہئے اور اس کی تلافی کر دینی چاہئے۔ ان کا یہ ایک قدم انہیں قعر مذلت سے اٹھا کر اوج ثریا پر لے جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ پر "The Message" کے نام سے جو

انگریزی فلم بنی تھی اس میں ایک سین یہ ہے کہ ابو طالب بستر مرگ پر ہیں۔ اس وقت ایک وفد آتا ہے جس میں ابو جہل اور ابو سفیان بھی ہیں۔ ابو طالب ان سے کہتے ہیں :
"میرا بھتیجا تم سے کچھ نہیں مانگ رہا' کوئی بادشاہی نہیں مانگ رہا' ایک لفظ (one word) ہی تو مانگ رہا ہے۔ یعنی لا الٰہ الا اللہ ہی تو مانگ رہا ہے۔ اس پر ابو سفیان کا جواب یہ ہے :

"We can give him thousand words, but the one word that he demands, demolishes all the gods"

یعنی وہ ہم سے ہزار لفظ لے لے' لیکن وہ جو ایک لفظ مانگ رہا ہے اس سے تو ہمارے سارے معبودوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ تو یہ ایک قدم انہیں کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

چنانچہ اگر یہ دو کام کرلیں تو یہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے مقام تک پہنچ سکتے ہیں' ورنہ تاریخ جس رخ پر چل رہی ہے وہ انہیں ہولناک انجام سے دوچار کر سکتی ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَار ـــــ ؏ فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم! یہ فیکٹریاں' یہ صنعتیں' یہ سارا کروفر "شکم" ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ ؏ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں!!

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

{۱} جماعت اسلامی اور اس کی قیادت کے سیاسی موقف میں جو اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے وہ سب کے علم میں ہے' جماعت کی اندرونی صورتحال جس درجے مخدوش ہو چکی ہے اس کا کسی قدر اندازہ جماعت کے ایک مخلص دیرینہ کارکن کی تحریروں سے ہو سکتا ہے جو آئندہ کسی اشاعت میں سامنے لائی جائیں گی۔

انقلابی جدّوجہد کے لوازم و مراحل — اور انقلابِ نبویؐ کے پہلے دو مرحلے : دعوت اور تنظیم

(گزشتہ سے پیوستہ)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد
(مرتّب : شیخ جمیل الرحمٰن)

اسلامی انقلابی تنظیم کی اساس اور اس کا مزاج

انقلابی جدّوجہد کے مراحل و لوازم میں سے دوسرا مرحلہ انقلابی جماعت کی تشکیل و تنظیم کا ہے۔ یعنی جو لوگ انقلابی دعوت کے اساسی نظریہ کو ذہناً تسلیم کر لیں اور اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے داعی کے گرد جمع ہو جائیں انہیں ایک جماعت کی صورت میں منظم کرنا۔ اس کیلئے قرآن مجید کی تین اصطلاحات ہیں۔ پہلی قرآنی اصطلاح "بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ" ہے' یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ——— جب تک یہ کیفیت نہ ہو تنظیم وجود میں نہیں آ سکتی۔ اس کیلئے بنیاد کیا ہے؟ سمع و طاعت! سنو اور اطاعت کرو۔ "وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا" (Listen and Obey)۔ یہ دوسری قرآنی اصطلاح ہے۔ اب اس میں تیسرا عنصر شامل کریں تو وہ ہے "اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ" جو لوگ ہم سفر ہیں' ساتھی ہیں' ان کیلئے نہایت مہربان' نہایت نرم' نہایت ہمدرد و دمساز' لیکن کفّار جو مقابل ہیں ان کیلئے نہایت سخت' Uncompromising۔

محسوس ہو جائے کہ ان کے اندر کسی قسم کی لچک کا امکان نہیں ۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

تنظیمی اعتبار سے جب تک ایک ایسی مضبوط جماعت موجود نہ ہو انقلاب کا عمل شروع نہیں ہو سکے گا۔

ایسی جماعت کے وجود میں آنے کی اساسات کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں ہمیں دو چیزیں نظر آتی ہیں ـــــ اصل بنیاد تو یہ ہے کہ حضورؐ نے دعویٰ کیا کہ میں نبی ہوں، رسول ہوں، بالفاظِ قرآنی ۔ "اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا" (اے نبی ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشیر اور نذیر بنا کر!) چنانچہ جس نے مان لیا اور جو ایمان لے آیا گویا وہ ہمہ تن، ہمہ وجود مطیع ہو گیا۔ یہ اتنی منطقی بات ہے کہ جب تسلیم کر لیا کہ حضورؐ اللہ کے رسول ہیں اور "وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) تو اس کے بعد کسی مسلمان کا کچھ کہنے اور حضورؐ کے فرمان اور رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے دینے کا حق باقی کب رہ گیا۔ اب وہ چون و چرا نہیں کر سکتا۔ دنیا کے کسی اور قائد، کسی اور رہنما اور کسی اور لیڈر کی بات سے اختلاف ممکن ہے، لیکن رسول ﷺ کی کسی بات سے بھی اختلاف ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں تو یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ آپؐ کے پاس علم کا وہ ذریعہ ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا : ﴿يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَاۗءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا﴾ "ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تھا، پس میری پیروی کیجئے، میں آپ کو بتاؤں گا سیدھا راستہ کونسا ہے" ـــــ بظاہر یہ الٹی گنگا بہہ رہی ہے کہ بیٹا باپ سے یہ کہے۔ لیکن دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو وحی الٰہی کے ذریعے سے علم حقائق حاصل ہو رہا ہے جو باپ کو حاصل نہیں ہے۔ باقی رہا تجرباتی علم، وہ والد کو زیادہ ہو تو ہو۔

رسول اور اُمتی کے تعلق کی تفہیم کے لئے اس مجلس مشاورت کی روداد بڑی

تابناک مثال ہے جو حضور ﷺ نے غزوۂ بدر سے پہلے مہاجرین و انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کی منعقد فرمائی تھی۔ اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہ انصاری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رئیسِ خزرج نے اس تعلق کے لبِّ لباب کو چند جملوں میں بیان کر دیا تھا۔ انہوں نے عرض کیا تھا : "اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ...." یعنی حضورؐ آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں! آپؐ بھول جایئے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں کیا طے ہوا تھا اور کیا نہیں۔ ہم آپؐ پر ایمان لا چکے' ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے' ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے' اب ہمارے پاس کون سا اختیار باقی رہ گیا۔ اللہ کی قسم' آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ حکم دیں گے تو ہم برک الغماد تک جا پہنچیں گے چاہے ہماری اونٹنیاں دبلی اور لاغر ہو جائیں یا ختم ہو جائیں۔

اس تنظیم کے متعلق یوں سمجھئے کہ دنیا میں اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور کر ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ معاملہ ہے رسول اور اُمتی کا۔ لیکن چونکہ یہ کام آگے بھی ہونا تھا' اب تا قیامِ قیامت کسی نبی اور رسول کو نہیں آنا تھا' سوائے جھوٹے مدّعیوں کے۔ "ثَلَاثُوْنَ كَذَّابُوْنَ" اور دجّال کا معاملہ علیحدہ رکھئے۔ سچا نبی تو حضورؐ کے بعد آنا نہیں' حضورؐ کا ارشاد ہے : "لَا نَبِيَّ بَعْدِي" ـــــ تو آئندہ یہ تنظیم کس بنیاد پر ہو گی! اس کے لئے نبی اکرم ﷺ نے امت کی رہنمائی کے لئے بیعت کی سُنّت جاری فرما دی۔ یعنی حضور ﷺ کے بعد اعلاءِ کلمۃ اللہ' اقامتِ دین اور اظہار دین الحق علی الدین کلّہ کے لئے جو تنظیم بنے وہ بیعتِ سمع و طاعت کے اصول پر بنے۔

البتہ انتظامی امور کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے ادب و احترام کے ساتھ دریافت کر لیا کرتے تھے کہ آپؐ نے یہ جو تدبیر فرمائی ہے تو یہ آپؐ کا ذاتی اجتہاد ہے یا بذریعہ وحی اللہ کے حکم سے فرمائی ہے؟ اگر حضورؐ فرماتے کہ یہ فعل وحی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ذاتی اجتہاد پر مبنی ہے' تب تو وہ اپنی رائے دینے کی جرأت کرتے تھے کہ حضورؐ! پھر اپنے تجربے اور فہم کی بنیاد پر ہم عرض کریں گے کہ فلاں معاملے کی تدبیر اس طرح کی جائے تو مناسب ہو گا ـــــ اس کی متعدد مثالیں سیرتِ مطہرہ میں موجود ہیں۔ مثلاً غزوۂ بدر کے لئے حضورؐ نے مسلمانوں کے کیمپ کے لئے جو مقام معین فرمایا تھا اس کے بارے

میں صحابہؓ نے بڑی لجاجت سے عرض کیا تھا کہ حضورؐ اگر یہ انتخاب وحی کی بنیاد پر ہے تو سر تسلیم خم ہے' لیکن اگر یہ اجتہاد کا معاملہ ہے تو ہم عرض کریں گے کہ جنگ کی حکمت عملی (War Strategy) کے اعتبار سے یہ جگہ مناسب نہیں ہے بلکہ فلاں جگہ مناسب ہے۔ تو حضورؐ نے وہاں کیمپ لگوا دیا ـــــ یہی معاملہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا تھا۔ اس موقع پر تین اطراف سے مدینہ منورہ کی چھوٹی سی بستی پر کفار نے یورش کی تھی۔ جنوب سے قریش آ گئے' شمال سے یہودی آ گئے اور مشرق سے بنو غطفان کے قبائل آ گئے۔ حضورؐ کو بڑا دکھ تھا کہ میری وجہ سے آج مدینہ کی بستی گھیراؤ میں آ رہی ہے۔ اہل مدینہ نے مجھے اور میرے صحابہؓ کو اپنے یہاں پناہ دی اور میرا ساتھ دیا جس کی وجہ سے ان پر یہ قیامت ٹوٹ پڑنے والی ہے۔ تو انصارؓ پر نرمی کے خیال سے حضورؐ نے یہ تجویز پیش فرمائی کہ اگر آپ لوگ چاہیں تو بنو غطفان کے ساتھ ہم یہ معاملہ کر لیں کہ مدینہ کی پیداوار کا کوئی حصہ ان کو بطور خراج دینے کی پیش کش کریں' اور وہ اگر واپس چلے جائیں تو ہم پھر ان دو دشمنوں سے نمٹ لیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے انصارؓ کے حوصلہ کی پختگی (Morale) کا جائزہ لینے کے لئے یہ بات بطور تجویز پیش فرمائی ہو۔ واللہ اعلم! اس پر انصارؓ نے عرض کیا : حضورؐ! اگر یہ تجویز وحی کی بنیاد پر ہے تو سر تسلیم خم ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ قبائل ہم سے کبھی جاہلیت میں بھی خراج نہ لے سکے' آج ہم اسلام میں آ کر ان کو خراج دیں! ایسا نہیں ہو سکتا ـــــ حضورؐ نے انہیں شاباش دی۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کے ساتھ اُمتی کا تعلق یہ ہوتا ہے کہ جہاں حکم آ جائے اور ساتھ ساتھ یہ صراحت ہو کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو اس کے بعد سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں مشورہ کی گنجائش ہو تو مشورہ دیا جائے۔ حضور ﷺ کو حکم ہوا : ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ "اے نبی آپ ان سے مشورہ کرتے رہا کریں"۔ ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ "لیکن جب آپ فیصلہ کر لیں تو پھر اللہ پر توکل کریں"۔ وہاں گنتی کی بنیاد پر کبھی فیصلے نہیں ہوئے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ حضورؐ نے اپنی ذاتی رائے کے مقابلے میں صحابہ کرامؓ کی رائے قبول فرمائی۔ رسول اور امتی کا تعلق ہی

وہ ہے کہ اس سے زیادہ مضبوط اور Disciplined جماعت کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔
سوچنے کا مقام ہے اگر یہ کام صرف حضورؐ کے دست مبارک سے ہونا ہوتا تو تنظیم کے لئے کسی دوسری بنیاد اور اساس کو واضح کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن اگر یہ ایک جاری و ساری عمل ہے' اسے آگے بھی چلنا ہے' جیسے اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ ارادہ عطا فرما دے کہ ہمیں خالص اسی نہج پر انقلاب برپا کرنا ہے جس پر حضورؐ نے برپا فرمایا تھا' تو پھر سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد نبی تو کوئی نہیں' تو پھر کس بنیاد پر لوگ جڑ کر ایک تنظیم بنیں گے؟ وہ تعلق کس اساس پر قائم ہو گا؟ آیا وہ کوئی جمہوری تنظیم ہو گی! دستوری تنظیم ہو گی! گنتی کی اساس پر فیصلے ہوا کریں گے!! کیا ہو گا؟ اس کے لئے حضورؐ نے یہ طریق کار اختیار فرما کر جسے ہم لفظ بیعت کے نام سے جانتے ہیں اپنے اسوۂ حسنہ سے ہمیشہ ہمیش کے لئے راہنمائی چھوڑی ہے۔ یعنی اللہ کا کوئی بندہ کھڑا ہو ـــــ ظاہر ہے وہ نبی نہیں ہو گا' وہ رسول نہیں ہو گا ـــــ لیکن وہ اللہ کی توفیق سے کھڑا ہو اور پکارے کہ میں اسلامی انقلاب کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا ہوں' کون ہے جو میرا ساتھ دے! مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ! ـــــ لوگ اسے ٹھونک بجا کر دیکھیں' جائزہ لیں' اس کی سیرت و کردار کو پرکھیں' اس کی پوری تاریخ کو دیکھیں۔ اپنی حد تک اطمینان کی کوشش کریں کہ یہ شخص بہروپیا تو نہیں' واقعتاً کوئی کام کرنا چاہتا ہے' اور اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو اس کام سے متضاد اور متناقض ہو جس کا بیڑا اٹھا کر یہ کھڑا ہوا ہے' فی الجملہ اس کے فکر اور اس کے خلوص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں ـــــ یہ ہے بیعتِ سمع و طاعت۔ جس کے لئے جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے تفصیلی ہدایات چھوڑی ہیں۔ حضورؐ نے کئی مواقع پر بیعت لی تھی۔ دو مواقع کا تو ابھی ذکر ہوا' بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ ـــــ ایک بیعت وہ ہے جس کا تذکرہ ابد الاباد تک ہوتا رہے گا' جب تک کہ قرآن حکیم کی تلاوت ہوتی رہے گی۔ وہ ہے بیعتِ رضوان' جس کا ذکر قرآن حکیم میں بایں الفاظ ہوا۔

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ﴾

ـــــ غور کیجئے کہ اس موقع پر اگر حضورؐ جنگ کا فیصلہ فرماتے تو کیا ان چودہ سو اصحابِ

رسول اللہ ﷺ میں سے کوئی ایک بھی پیچھے ہٹ سکتا تھا جو مدینہ منورہ سے چل کر حدیبیہ تک گئے تھے؟ ــــــ پھر حضورؐ نے بیعت کیوں لی؟ صرف اس لئے کہ اصل میں یہ بعد والوں کے لیے سنّت اور اسوہ ہے جو نبی اکرم ﷺ نے چھوڑا ہے۔

پس یہ بنیاد ہے تنظیم کی جو ہمیں سُنّتِ نبویؐ سے ملتی ہے۔ اور اس تنظیم میں ہر قسم کے نسلی اور قبائلی امتیازات کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ اب یہ نہیں ہے کہ کوئی قرشی ہے تو اس کا اونچا مقام ہے اور اگر کوئی حبشی ہے تو اس کا نیچا مقام ہے۔ یہ تقسیم تو جاہلیت کی تقسیم ہے' یہ اسلام کی تقسیم نہیں ہے۔ سہیل بن عمرو وہ صاحب ہیں جو حدیبیہ میں قریش کے نمائندے کی حیثیت سے صلح کی شرائط طے کرنے آئے تھے۔ قریش میں ان کا کتنا اونچا مقام ہوگا کہ وہ صلح کی شرائط کی گفت و شنید کے لئے قریش کی طرف سے بااختیار نمائندہ بن کر آئے تھے۔ وہ بڑے ذہین تھے۔ جب نبی اکرم ﷺ نے صلح نامہ تحریر کرانا شروع کیا کہ "یہ معاہدہ ہے محمد رسول اللہ اور قریش کے مابین" تو انہوں نے فوراً اعتراض کر دیا کہ نہیں' یہاں "محمد رسول اللہ" کے الفاظ نہیں آئیں گے۔ اس لئے کہ اگر وہ حضورؐ کو "رسول اللہ" مان لیتے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔ نیچے دستخط تو دونوں فریقوں کے ہونے تھے۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ یہ لکھا جائے گا کہ "یہ معاہدہ ہے محمد بن عبداللہ اور قریش کے مابین" ــــــ حضورؐ مسکرائے کہ کوئی مانے نہ مانے میں اللہ کا رسول ہوں۔ لیکن آپؐ نے اس اعتراض کو تسلیم فرمالیا۔ یہ ہیں سہیل بن عمرو۔ فتح مکہ کے بعد وہ بھی ایمان لے آئے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کا ایک واقعہ ہے کہ قریش کے یہ چوٹی کے فرد سہیل بن عمروؓ فاروق اعظمؓ کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آنجنابؓ نے ان کو اپنے پاس بٹھالیا۔ ان کے بعد چند اور اصحابؓ آگئے جو السابقون الاولون میں سے تھے' یا اصحابِ بدر و احد میں سے تھے' یا اصحابِ بیعتِ رضوان یعنی اصحابِ شجرہ میں سے تھے تو آپؓ نے حضرت سہیلؓ کو کچھ پیچھے ہٹ جانے کے لئے فرمایا اور ان حضراتؓ کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ پھر چند اور اصحاب آگئے تو ان کو اور پیچھے ہٹایا اور ان حضرات کو قریب بٹھایا۔ لوگ آتے رہے اور حضرت عمرؓ سہیلؓ کو پیچھے ہٹاتے رہے۔ ہوتے ہوتے سہیلؓ

جوتیوں تک پہنچ گئے۔ تب ان کی قرشیت کی حمیت ذرا جاگی اور انہوں نے شکوہ کیا کہ کیا آپ ؓ کی مجلس میں ہمارا مقام یہ جوتیوں والا رہ گیا ہے؟ حضرت عمرؓ نے زبان سے کوئی جواب نہیں دیا' اشارہ کر دیا کہ سرحدوں پر کفار سے جنگیں ہو رہی ہیں —— تم نے وہ تمام مواقع کھو دیئے جو اسلام میں آگے آنے کے مواقع تھے۔ تاہم اب بھی موقع ہے' وہاں سرحدوں پر جاؤ اور اسلام کے لئے قربانیاں دو' سرفروشیاں کرو' تب تو شاید تمہیں یہ مقام حاصل ہو جائے' لیکن نسلی اور قبائلی بنیاد پر جو مراتب تھے' وہ ختم ہو چکے۔ چنانچہ کسی جماعت میں اگر اس نسلی امتیاز کا خاتمہ نہ ہو تو وہ انقلابی جماعت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بلالِ حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مقام تک پہنچ گئے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہیں ہمیشہ "سیّدنا بلال" (ہمارے آقا بلال) کہا کرتے تھے۔ عمرؓ! —— اور وہ حضور ﷺ کے سوا کسی اور کو "سیّدنا" کہہ دیں! ان کے مزاج اور ان کے مقام سے کون واقف نہیں۔ انؓ کی شخصیت کا ایک اپنا رنگ تھا۔ ہر شخص کی اپنی افتادِ طبع ہوتی ہے' چنانچہ حضرت عمرؓ کی اپنی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا۔ لیکن آپؓ حضرت بلالؓ کا نام "سیّدنا" کہے بغیر نہیں لیتے تھے۔ آپؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے لئے بھی کہا کرتے تھے کہ "ابوبکر سَیّدُنا وأعتقَ سَیّدَنا" یعنی ابو بکرؓ خود بھی ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار (بلالؓ) کو آزاد کیا تھا —— اسلام میں آکر اب یہ فرق و تفاوت رونما ہو چکا تھا کہ کہاں وہ حبشی' وہ آزاد کردہ غلام اور کہاں وہ بلند مرتبہ مقام جو انہیں حاصل ہو گیا۔ عرب کے معاشرے میں غلام آزاد ہو کر بھی نیم غلام تو رہتا ہی تھا' اسے "مولیٰ" کہا جاتا تھا اور اسے ایک آزاد شخص کی طرح معاشرے میں برابری کا مقام پھر بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اسی امتیاز کو ختم کرنے کے لئے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے یہ عملی سبق دیا تھا کہ جنگِ موتہ میں لشکر کی کمان زیدؓ بن حارثہ کے سپرد فرمائی جو ایک آزاد کردہ غلام تھے' اور ان کی کمان کے تحت جعفر طیارؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) خالدؓ بن ولید' عبد اللہؓ بن رواحہ اور نہ معلوم کیسے کیسے جلیل القدر اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم تھے۔ پھر عین مرضِ وفات میں آپ ﷺ نے جو لشکر شام کی سرحدوں کی طرف بھیجنے کیلئے تیار فرمایا تھا' اس کی کمان انہی زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ کو سونپی تھی' جن کی عمر بھی اس وقت

تیئس چوبیس برس کی ہو گی اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جیسے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے زیر کمان تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ اس لئے کیا کہ پچھلے نسلی اور قبائلی افکار کے بت اگر ابھی ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہوں تو وہ سب پاش پاش ہو جائیں۔ یہ بالکل نیا نظام ہے جو قائم ہوا۔ یہ اس انقلابی پارٹی کے لئے نئے Cadres اور نئی درجہ بندی ہے۔

پھر اس انقلابی جماعت میں سمع و طاعت کا معاملہ کس نوعیت کا تھا! اس کے لئے دو واقعات کافی ہیں۔ پورے مکی دور میں تمام صحابہ کرامؓ کے لئے حکم یہ رہا کہ چاہے مشرکین تمہیں کتنا ہی ماریں' کتنی ہی ایذائیں دیں' حتیٰ کہ تمہیں ہلاک کر دیں لیکن تم ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی ـــــ اور تاریخ میں اس کی شہادت موجود نہیں ہے کہ کسی نے حضور ﷺ کے اس حکم کی خلاف ورزی کی ہو۔ یاد رہے کہ قرآن مجید میں ایسا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ جو بدنصیب لوگ سنت کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں' ان کے لئے یہ بات خاص طور پر غور کرنے کی ہے کہ مکی دور میں صحابہ کرامؓ کس حکم پر اس شدت اور سختی سے عمل پیرا تھے؟ قرآن حکیم میں تو کہیں جا کر ۵ھ یا ۶ھ میں سورۂ نساء میں یہ الفاظ آئے ہیں : ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ...﴾ "(اے نبیؐ) کیا آپؐ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جن کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو..." لیکن پورے مکی قرآن میں یہ حکم موجود نہیں ہے۔ دراصل یہ حکم اللہ کا نہیں تھا بلکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ اللہ نے سورۂ نساء کے اندر اس کی توثیق فرمائی ہے۔ سورۂ نساء کی اس آیت سے اس بات کی وضاحت ہو گئی ہے کہ اے مسلمانو! ایک دور وہ تھا جب حکم یہ تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو' اس وقت تو تم کہا کرتے تھے کہ ہمیں جنگ کی اجازت ہونی چاہئے۔ اور آج جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو گھبرا رہے ہو۔ تو قرآن حکیم میں سورۂ نساء کی آیت نمبر ۷۷ میں "كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ" کے الفاظ آئے ہیں ورنہ پوری مکی سورتوں میں کہیں یہ الفاظ نہیں ہیں ـــــ دراصل وہ حکم جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم حضورؐ کو وحی خفی کے ذریعے سے دیا۔ وحی جلی میں یہ حکم بہرحال موجود نہیں ہے ـــــ کسی جماعت کے اس درجہ منظم ہونے اور اپنے رہنما' قائد اور لیڈر کے حکم کی

پابندی کی ایسی مثال پوری انسانی تاریخ میں آپ کو نہیں ملے گی۔

دوسری مثال اس کے برعکس ہے۔ ایک موقع پر نظم کی عدم پابندی اور حکم عدولی ہوئی۔ وہاں ڈسپلن توڑا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی جو سزا دی گئی اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ اس ڈسپلن کا کیا مقام ہے جو مطلوب ہے ـــــ غزوۂ احد میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ اہلِ ایمان کی مدد ہو گی اور واقعتاً نصرتِ الٰہی آئی۔ پہلے ہی مقابلے کے اندر کفار کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں نے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ لیکن اس موقع پر ان تیراندازوں کی غلطی سے میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا جو حضورؐ کی طرف سے جبلِ احد کے ایک درے پر معین کئے گئے تھے اور جنہیں حضورؐ نے حکم دیا تھا کہ چاہے ہم سب کے سب شہید ہو جائیں، ہم میں سے کوئی نہ بچے اور تم دیکھو کہ پرندے ہمارے جسموں سے ہمارا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی یہاں سے نہ ہٹنا ـــــ یہ پچاس تیرانداز تھے جن کے کمانڈر حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ درّے پر معیّن ان صحابہ کرامؓ کی اکثریت سے اس موقع پر یہ اجتہادی غلطی ہوئی کہ انہوں نے سمجھا کہ حضورؐ کا حکم شکست کی صورت سے متعلق تھا، جبکہ اب تو برعکس صورت سامنے ہے، فتح ہو گئی ہے اور کفار میدانِ جنگ سے فرار ہو رہے ہیں، لہٰذا اب یہ جگہ چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اب ہمیں بھی نیچے میدان میں چلنا چاہئے ـــــ لیکن ان کے کمانڈر حضرت جبیرؓ ان کو روکتے رہے کہ حضورؐ کے حکم کو سامنے رکھو، ہمیں کسی حال میں بھی حضورؐ کے حکم کے بغیر یہاں سے نہیں ہٹنا۔ لیکن پچاس میں سے پینتیس افراد نے حکم عدولی کی ـــــ حضور ﷺ کے حکم کی جو نافرمانی ہوئی اس کے متعلق تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی یہ تاویل کی گئی کہ حضورؐ نے تو شکست کی صورت میں اس درے کو چھوڑنے سے منع فرمایا تھا، فتح کی حالت کے لئے تو نہیں فرمایا تھا ـــــ لیکن اس دستہ کا جو کمانڈر ہے فیصلے کا اختیار تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ فوج میں دستے کے کمانڈر کی بات کو ماننا ڈسپلن کا عین تقاضا ہے بلکہ فرض ہے۔ دستہ کے سپاہیوں کو کسی بالائی حکم کی تاویل کرنے کا قطعی حق نہیں ہے، یہ حق صرف اس کمانڈر کا ہے۔ چنانچہ اس دستہ کے کمانڈر حضرت جبیرؓ تو اپنے دستہ کو روک رہے تھے۔ ان پینتیس افراد نے اپنے کمانڈر کے حکم کی خلاف

ورزی کی اور درہ چھوڑ کر میدان میں جا اترے ـــــ خالد بن ولید جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور جن کا شمار جنگی حکمت عملی کے ماہرین میں ہوتا تھا' انہوں نے جب اس درّے کو خالی دیکھا تو گھڑ سواروں کے ایک دستے کے ساتھ جبلِ احد کے عقب کا چکر لگا کر درے کے دوسرے سرے سے حملہ کر دیا۔ پندرہ صحابہ ؓ جو وہاں رک گئے تھے' جن میں حضرت جبیر ؓ بھی شامل تھے' سب کے سب شہید ہو گئے۔ اب خالد بن ولید نے مسلمانوں پر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا۔ فرار ہونے والے کفار نے بھی پلٹ کر ایک زوردار حملہ کیا۔ اس طرح ان پینتیس صحابہ ؓ کی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی وجہ سے فتح شکست سے بدل گئی اور پینتیس مسلمانوں کی حکم عدولی کی سزا ستر صحابہ کرام ؓ کی شہادت کی صورت میں سامنے آئی۔ ان میں حمزہ ؓ "اسد اللہ واسد رسولہ" بھی تھے' جو ہزار افراد کے مقابلہ کا ایک فرد تھا' مصعب بن عمیر ؓ جیسی جان نثار شخصیت بھی تھی جن کی تبلیغ و دعوت کو اللہ نے یہ شرف قبولیت عطا فرمایا کہ یثرب دار الہجرت اور مدینۃ النبی ؐ بن گیا۔ پھر ان کے علاوہ دوسرے جان نثار انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم نے جام شہادت نوش کیا۔ کل ستر صحابہ کرام ؓ شہید ہوئے۔ اور تو اور خود حضور ؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ خود کی کڑیاں رخسارِ مبارک میں گڑ گئیں' آپ ؐ پر غشی طاری ہوئی ـــــ مسلمانوں میں سراسیمگی پھیلی' حضور ؐ کی شہادت کی خبر اڑی' بہت سے صحابہ دل گرفتہ اور مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ اہل ایمان کے لشکر میں بھگدڑ بھی مچی ـــــ وہ تو جب حضور ؐ کی طبیعت ذرا سنبھلی اور آپ ؐ صحابہ کرام ؓ کو لے کر جبلِ احد پر چڑھ گئے اور لوگوں نے آپ ؐ کو زندہ سلامت دیکھ لیا تو پراگندہ جمعیت دامن کوہ میں جمع ہوئی ـــــ بہرحال شکست تو ہو گئی۔ اتنا بڑا چرکہ لگ گیا۔

بعد میں سورۂ آل عمران (آیت ۱۵۲) میں اس صورت حال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان الفاظ میں تبصرہ نازل ہوا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰٮكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ ـــــ اے مسلمانو! اللہ کا وعدہ جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔ اللہ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب تم اس کی اجازت سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ

سے تھے۔ لیکن جب تم ڈھیلے پڑے' تمہارا نظم ٹوٹا اور تم نے جب وہ چیز دیکھی جو تمہیں محبوب ہے اور اس کے بعد تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تب ہم نے یہ سزا دی ــــــ یہاں "تُحِبُّوْنَ" سے بعض مفسرین نے "مالِ غنیمت" کے بجائے سورۂ صف کی آیت ۱۳ کے الفاظ ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ﴾ سے استشہاد کرتے ہوئے وہ فتح مراد لی ہے جو بالکل ابتدا ہی میں مسلمانوں کو حاصل ہوتی نظر آ رہی تھی ــــــ البتہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی انقلاب کے لئے کیسی تنظیم مطلوب ہے اور اس میں امیر کی اطاعت کی کیا اہمیت ہے' چاہے وہ پچاس افراد کے دستہ پر ہی کیوں نہ مقرر کیا گیا ہو!

(جاری ہے)

بقیہ : امت مسلمہ کی عمر

{۳۲} احمد' مسلم' ترمذی اور ابن ماجہ نے نواسؓ بن سمعان سے روایت لیا ہے۔

{۳۳} مسلم نے ابو ہریرہؓ سے اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

{۳۴} صحیح حدیث ہے جسے ترمذی نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے

{۳۵} مسلم اور احمد نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ بخاری کے الفاظ اور ہیں۔

{۳۶} احمد' مسلم' ترمذی اور ابن حبان نے انسؓ سے روایت کیا ہے۔

{۳۷} احمد' بخاری اور نسائی نے انسؓ سے روایت کیا ہے۔

{۳۸} احمد اور مسلم نے حذیفہؓ بن اسید سے روایت کیا ہے۔

{۳۹} الصور۔ بہت بڑا بگل ہے جس میں اسرافیلؑ تین دفعہ پھونک ماریں گے۔

{۴۰} بخاری' مسلم اور ابن ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

{۴۱} رحمان کا عرش اٹھانے والے فرشتے چار ہیں۔ جب قیامت آئے گی ان کے ساتھ چار اور مل جائیں گے' چنانچہ ان کی تعداد آٹھ ہو جائے گی۔

{۴۲} بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اَبَیْتُ . یعنی مجھے علم نہیں۔ میں جواب نہیں دے سکتا۔

{۴۳} جلالین پر صاوی کا حاشیہ دیکھیں (۳ ۳۲۸) اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں "پس وہ زور کی آواز ہو گی جس سے یکایک سب جمع ہو کر ہمارے پاس حاضر کر دیئے جائیں گے"

تنظیم اسلامی کی دعوت

از قلم : مختار حسین فاروقی، امیر تنظیم اسلامی حلقہ جنوبی پنجاب

۱۔ تنظیم سے کیا مراد ہے؟ تنظیم اسلامی کے خد و خال کیا ہیں؟ یہ کس لئے وجود میں آئی ہے؟ اور یہ دوسری جماعتوں اور تنظیموں سے کیسے اور کس حد تک مختلف ہے؟ اس قسم کے کئی اور سوالات بھی ہیں جو آج کسی جماعت یا تنظیم کا نام سنتے ہی ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے کچھ باتیں بطور تمہید ضروری ہیں تاکہ تنظیم اسلامی کو صحیح Context اور پس منظر میں دیکھا جا سکے، اور اگر یہ ہماری کوئی حقیقی ضرورت ہے تو پھر ہم میں اس کی طرف پیش قدمی کا ایسا جذبہ بیدار ہو سکے جو منفعت اور کامیابی کے ہر موقع سے بھرپور استفادے کے لئے ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اس اجمال کی تفصیل کیا ہے؟

۲۔ تنظیم اسلامی ایک ہیئت اجتماعیہ ہے جو امت مسلمہ کے بعض باشعور افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ ادارے، جماعتیں اور تنظیمیں افراد نسل انسانی کی ایک بنیادی ضرورت ہیں کہ اس کے لئے کسی طویل مدلل مقدمے کی بجائے تاریخ انسانی کی ایک اٹل اور ناقابل تردید حقیقت کی طرف اشارہ کافی ہے کہ فرد اور جماعت کی تاریخ دراصل انسان کی تاریخ ہی کی طرح قدیم ہے اور ماضی میں کسی ایسے دور کا حوالہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی فرد نسل آدم جماعت کے بغیر زندگی گزارتا رہا ہو، یہاں تک کہ قرآن مجید میں حضرت آدمؑ کی تخلیق کے واقعہ میں بھی سورۃ اعراف میں جمع کے صیغہ میں خطاب کیا گیا ہے اور دوسری جگہ کان الناس امۃً واحدۃً کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ فرد اور جماعت کا تعلق ایسا لاینفک (inseparable) ہے کہ فرد کا تصور جماعت کے بغیر ممکن نہیں اور جماعت کا تصور افراد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جماعت ہر فرد کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ آج بھی دنیا میں زندگی کے ہر شعبے اور ہر علاقے میں ہر شخص اس کی

ضرورت و اہمیت کا ایسا احساس اور تجربہ رکھتا ہے کہ اس پر دو را میں ممکن نہیں ہیں۔

۳۔ فرد اور جماعت کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ہر جماعت فرد کی کسی نہ کسی ضرورت کی تکمیل اور جذبے کی تسکین کے لئے وجود میں آتی ہے اور یوں انسان اپنے فکر و نقطہ نظر، ذاتی رجحانات، ماحول، پیشہ اور دیگر عوامل کے زیر اثر مختلف جماعتوں میں سے کسی نہ کسی کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

بعض جماعتیں جو جزوی مقاصد رکھتی ہیں وہ انسان سے جزوقتی توجہات چاہتی ہیں لیکن بعض جماعتیں جو گھمبیر مقاصد اور کثیرالاطراف سرگرمیاں رکھتی ہیں انسان کو پوری طرح اپنے اندر جذب کرلیتی ہیں، اور یوں ایک مقام "فنافی الجماعت" سامنے آتا ہے جہاں فرد کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فرد انسانی ذاتی حیثیت میں ایک آزاد، خود مختار اور باشعور مخلوق شمار ہوتا ہے۔ یہ اگر ایک انتہا ہے تو کسی بڑی جماعت میں گم ہو کر یہی اوصاف (کسی اعلیٰ تر جماعتی مقاصد کے لئے) گھٹ کر برائے نام رہ جاتے ہیں۔ تاریخ میں فرد اور جماعت کے تعلق اور دائرہ کار کے بارے میں افراط و تفریط کی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس ضمن میں اعتدال اور توازن کا حصول جو دراصل فرد و جماعت دونوں کے لئے آگے بڑھنے کی ضمانت ہے بہت ناپید ہے۔

حقیقتاً ایسی جماعت ہی مقصود ہونی چاہئے جو اپنے افراد کے ذاتی کردار کی تعمیر کر سکے، اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے اور جماعت میں شامل تمام افراد کی ذاتی صلاحیتوں کو ایسے اعلیٰ طریقے (Optimum Path) پر استعمال کر سکے جس سے جماعتی اہداف اور مقاصد کا حصول ممکن اور آسان ہو سکے۔ اس کے لئے ہر فرد کو اپنی جماعت کے مقاصد پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے اور طریقہ کار پر بھی۔ اس لئے کہ اس میں ذرا سی غفلت فرد اور جماعت دونوں کے لئے مہلک ثابت ہو سکتی ہے یعنی ع یک لحظہ غافل بودن و صد سالہ راہم دور شد

۴۔ جماعتیں اور تنظیمیں اگر فرد کی کسی ضرورت کی تکمیل، جذبوں کی تسکین اور احساسات کو جلا بخشنے کے لئے وجود میں لائی جاتی ہیں تو اس سے پہلے کہ جماعتوں اور تنظیموں کے مقاصد اور دائرہ کار پر نظر ڈالی جائے مناسب یہی ہے کہ پہلے انسان کی مادی،

نفسیاتی اور دیگر حقیقی ضرورتوں کا [illegible] ہے تاکہ یہ بات [illegible] کر سامنے آجائے کہ کونسی جماعت فرد نوع بشر کے لئے کونسی خدمت سرانجام دے رہی ہے۔

دنیا میں حیات (Life) کی کئی شکلیں (Forms) اور مدارج (Stages) ہیں مگر حتمی طور پر انسان اشرف المخلوقات ہے جس پر سائنس بھی قرآن کے ساتھ متفق ہے۔ انسان دو "وجود" رکھتا ہے اور دونوں اعتبارات سے اللہ تعالیٰ نے اسے تمام مخلوقات سے "مکرم" کر کے "احسن تقویم" کے مقام پر رکھا ہے۔ انسان کا ایک وجود مادی اور جسمانی ہے جبکہ دوسرا غیر مرئی اور روحانی ہے۔ لہذا انسان کے جسمانی تقاضے بھی ہیں اور روحانی بھی۔

انسان کے جسمانی تقاضوں میں خوراک 'لباس' رہائش' علاج' تعلیم اور شادی ہیں' جبکہ نفسیاتی اور روحانی تقاضوں میں تلاش حقیقت' انسان کی حقیقت کا صحیح علم' ذرائع علم کا صحیح ادراک اور انسانی زندگی کی ابتداء اور انتہاء کی کھوج کرید اور سب سے اوپر اپنے خالق و مالک کی معرفت اور اس کی رضاجوئی کی تلاش شامل ہیں۔ ان تقاضوں میں سے ایک یا ایک سے زائد کئی تقاضوں کی فراہمی و آبیاری کے لئے مختلف ادارے' انجمنیں اور جماعتیں وجود میں آتی ہیں۔

مختلف ادارے اور انجمنیں کسی خاص گوشے میں انسانی ضرورت کی تکمیل کرتی ہیں۔ کئی ادارے اور انجمنیں مل کر ایک جماعت کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ جماعت (Party) کا کام اداروں اور انجمنوں سے بہت وسیع اور کثیر الجہت ہوتا ہے۔ پھر انہی جماعتوں میں سے جو جماعت مقاصد کے اعتبار سے برتر اور اعلیٰ ہوتی ہے وہ انسانوں کو اس حد تک متاثر کرتی ہے اور اتنی پھیل جاتی ہے کہ ہم خیال و ہم مقصد انسانوں کی ایک کثیر تعداد اس کے زیر اثر آجاتی ہے' تا آنکہ وہ کسی خاص علاقے اور خطے میں حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے' تاکہ وہ جماعت اپنے زیر اثر افراد کے لئے اپنے فکر و فلسفہ' دین و مذہب اور پسند و ناپسند کے عین مطابق اجتماعی نظام تشکیل دے جس میں فرد کی تعلیم اور نشوونما کا ایسا اعلیٰ اور معیاری اہتمام ہو کہ اس نظریہ اجتماعی کا بول بالا ہو جائے اور اس کے اندر مضمر ہر طرح کے خیر و شر کو پھلنے پھولنے کا موقع میسر آجائے۔ ایسی

جماعتیں انسانی تاریخ کی میزان میں اعلیٰ ترین اور موثر ترین اجتماعیت کے ذیل میں شمار کی جاتی ہیں۔ یہ درجہ اب تک کی انسانی تاریخ کی معراج (Climax) ہے۔

فرد ـــــ جماعت ـــــ اور اجتماعیت کے اس سفر میں اب ایک ہی ممکنہ جست (Development) کا امکان باقی ہے جس کی طرف انسان کی دبی ہوئی خواہش اسے صدیوں سے محو سفر رکھے ہوئے ہے اور جس کے لئے انسانیت بے قرار ہے۔ وہ ایک ایسی اجتماعیت یا حکومت کا قیام ہے جو عالمی ہو اور پورے کرۂ ارضی کو محیط ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی اجتماعیت جس جماعت کے ذریعے وجود میں آئے گی پہلے خود اس جماعت کے نظریات ایسے اعلیٰ ہوں گے جو تمام زمینی اور پست علائق سے پاک ہوں گے، پھر اس کے پاس اہداف و مقاصد بھی ایسے پاکیزہ اور مقدس ہوں گے جو کسی خاص علاقے، نسل، زبان، رنگ، پیشے اور انسانی طبقے سے متعلق نہ ہوں' بلکہ اس کی دعوت بلاامتیاز رنگ و نسل و مذہب و جنس ہر انسان سے ہو۔ ایسی جماعت کا وجود نوع انسانی کے لئے سب سے بڑی رحمت ہے اور اس کے سابقون الاولون یقیناً زمین کا نمک اور خیر الخلائق کہلانے کے مستحق ہیں۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو تمام انسانوں کی ضروریات ایک جیسی ہی ہیں مگر ہم انسانوں کی کم فہمی، کم علمی اور غلط تربیت کی وجہ سے ہماری باطنی شخصیات صحیح نشو و نما نہیں پا سکتیں جس کی وجہ سے انسان بے شمار گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں جو اپنے طرز فکر، ذہنی سطح، غلط ماحول' غلط تربیت' نامناسب موروثی حالات اور معاشی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے نامکمل شخصیات (Incomplete or Retarded Personalities) رہ جاتی ہیں یا مادی اور روحانی تقاضوں کے درمیان کشاکش کا صحیح حل نہ پانے کی وجہ سے منقسم شخصیات (Divided Personalities) بن کر عملاً عضو معطل بن جاتے ہیں جو اجتماعیت کے کسی مفید کام نہیں آسکتے۔ یا کسی وجہ سے ان کی باطنی شخصیات صحیح راہ نمائی نہ ہونے کی وجہ سے مسخ شدہ (Perverted) رہ جاتی ہیں۔

نتیجتاً عملی اعتبار سے انسانوں کی ضروریات کے بے شمار مدارج (Levels) شمار کئے جا سکتے ہیں۔ کچھ انسان صرف مادی ضروریات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور گزشتہ زمانے

کے اپنے ہم خیال لوگوں کے نظریات کو حق سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں اور انہی کے پرچار میں لگ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض جو ذرا آگے بڑھ جاتے ہیں وہ ضمیر انسانی کے زیر اثر کچھ اخلاق و کردار پر متوجہ ہوتے ہیں۔ بعض ذرا اور آگے بڑھ کر مذہب کے میدان میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ عملی اعتبار سے مذہب ہی اخلاق و کردار کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ کچھ باہمت لوگ مزید پیش رفت کر کے نفسیاتی اور روحانی تقاضوں کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں اور اس طرح انسانیت اور نسل آدم کا "حاصل" کہلانے کے مستحق پاتے ہیں۔

۶۔ نبی اکرم ﷺ کے ایک فرمان میں یوں کہا گیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو تمام ناگزیر ذہنی، فکری اور اخلاقی صلاحیتیں لے کر آتا ہے، مگر ماحول کے اثرات اسے عملاً مختلف مذاہب اور نظریات کے تابع بنا دیتے ہیں یا فلسفیانہ اعتبار سے یوں کہا گیا ہے کہ انسان حاصل ضرب ہے موروثی عوامل اور ماحول (تربیت) کے اثرات کا۔ نظری طور پر انسان اس نقطہ نگاہ سے بے شمار درجات پر کھڑے ہیں یا بے شمار دائروں میں منقسم ہیں۔ لہٰذا ـــــ نتیجتاً اتنے ہی بے شمار ادارے، انجمنیں اور جماعتیں ہیں جو ان انسانوں کو اپنے اندر جگہ دیئے ہوئے ہیں۔ کچھ ادارے، انجمنیں اور جماعتیں واضح اور اعلان شدہ (Declared) اور بعض غیر واضح (Undefined) اور غیر اعلان شدہ ہوتی ہیں۔ ان موخر الذکر قسم کی اجتماعیتوں کو ابن خلدون نے عصبیتوں کا نام دیا ہے۔

۷۔ آج پوری دنیا پر مغرب کے مادی تصورات اور نظریات کی یلغار ہے جس سے عملاً انسانوں کی ایک عظیم اکثریت اس دجالی فتنے کے زیر اثر آ چکی ہے۔ اس فتنے میں محسوس اور مادی اشیاء کی اہمیت پر زیادہ زور ہے جبکہ غیر مرئی حقائق (Unseen World) کا اگرچہ نہ اقرار ہے نہ انکار، تاہم عملی اعتبارات سے انکار ہی کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور عالمی سطح پر فساد پھیلا رہے ہیں۔ مادہ (Matter) کی اہمیت زیادہ ہے جبکہ روح (Soul) زیر بحث نہیں۔ کائنات اور موجودہ زندگی (Universe and Life Herein) پر توجہ مرکوز ہے اور نت نئی جہتیں دریافت ہو رہی ہیں جبکہ حیات بعد الممات (Life Hereafter) کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ موت تک کا

تذکرہ بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے' حالانکہ وہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اور کائنات کے مقابل خالق کائنات کا ذکر تو اکثر لوگوں کے نزدیک اور اکثر حالات میں بے ہی فضول' جس کا کچھ حاصل نہیں۔

اس دور میں مذہب' اخلاق اور روحانی قدروں کا تذکرہ اور ان کے لئے جدوجہد کرنے والے لوگ نہایت قلیل ہیں۔ مادہ پرستی کے اس دجالی فتنہ کے زیر اثر مسلمانوں کا حال بھی مجموعی طور پر عام انسانوں جیسا ہی ہے۔ اگرچہ مادی ضروریات سے اوپر اٹھ کر اخلاق اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انفرادی سطح پر مسلمانوں میں فی ہزار اچھے لوگوں کی تعداد دیگر تمام مذاہب کے مجموعی افراد سے بھی کہیں زیادہ ہے اور ایسے لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہوں گے جن کی امانت و دیانت کی قسم کھائی جا سکتی ہے تاہم ایسے باہمت افراد کی شدید کمی ہے جو ایسی ہیئت اجتماعیہ میں شریک ہوں جو اجتماعیت کی اعلیٰ ترین سطح پر بھی ہو' نیز جو مادی اور روحانی ضرورتوں سے آگاہ بھی ہوں اور اس کے لئے مقدور بھر کوشش بھی کر رہے ہوں تاکہ مذکورہ اجتماعیت دنیا کے کسی خطے میں اللہ کے آخری نبی ﷺ کے لائے ہوئے دین کو غالب کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ آج ایسے افراد بھی ڈھونڈے سے مشکل ہی ملیں گے اور ایسی اجتماعیت بھی جہاں کہیں بھی ہے کسی ابتدائی مرحلے میں ہی ہے۔ خود آگاہی کے اس مقام کے ساتھ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کرنے والے لوگوں کو آج کی اصطلاح میں بنیاد پرست (Fundamentalists) کہا جاتا ہے۔

۸۔ تنظیم اسلامی ایک ایسی ہی جماعت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے قرآنی نظام سیاست و معیشت و معاشرت کو پہلے ایک خطہ پاکستان میں غالب و نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے جو دوسرے مرحلہ پر تمام کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کو اپنے اندر سمولے گا۔ یعنی تنظیم اسلامی قرآن مجید کے بیان کردہ نظام سیاست و معاشرت و معیشت (Politico-Socio-Economic System) کی علمبردار ہے جو ہر قسم کی ملاقیت سے پاک اور رنگ و نسل و مذہب و جنس کے امتیازات سے بالاتر ہو کر صرف اللہ کے قانون کو اللہ تعالیٰ کے بندوں پر نافذ کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

۹۔ تنظیم اسلامی ــــــ انفرادی تربیت و پرداخت پر بھی بھرپور توجہ دینے کی حامی

ہے تاکہ فرد کی صلاحیتوں کو جلا حاصل ہو۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کی قرار داد تاسیس (67ء) کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"آج ہم اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے' اسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات' دین کا اصل موضوع ہے۔ اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے"۔

اسی قرار داد میں مزید یہ درج ہے کہ

"اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو' ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے' ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو' عبادات اور اتباع سنت سے ان کا شغف بڑھتا چلا جائے' عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے"۔

فرد کی اصلاح و تکمیل کے اس منشور کے ساتھ ساتھ اجتماعی سطح پر تنظیم کیا پروگرام رکھتی ہے اس کا فیصلہ تنظیم کے سالانہ خصوصی اجتماع ۵ تا ۱۱/ اگست ۷۷ء منعقدہ لاہور کی کارروائی میں ہے' جس میں چھ دن کی طویل نشستوں کے فیصلوں کا ذکر ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(i) "اقامت دین' شہادت علی الناس اور غلبہ و اظہار دین کی سعی و جہد' نفلی عبادت یا اضافی نیکیاں نہیں بلکہ از روئے قرآن و حدیث بنیادی فرائض میں شامل ہیں۔"

(ii) ان فرائض کی ادائیگی کے لئے التزام جماعت لازم ہے۔

(iii) "آئندہ تنظیم اسلامی کا نظام........ قرآن و سنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہوگا.. ."

فرد کی تربیت اور اجتماعی اعلیٰ مقاصد وہ خصوصیات ہیں جو (ممکنہ حد تک) تنظیم اسلامی اپنے جلو میں رکھتی ہے اور ان کے حصول کے لئے گزشتہ ۲۳ سال سے

کوشاں ہے۔

۱۰۔ تنظیم اسلامی افراد کی تربیت کا کیا ہدف رکھتی ہے اور ان کو اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے کس طرح استعمال کرنا چاہتی ہے یہ نہایت بنیادی سوال ہے۔ علامہ اقبال نے اسے ایک شعر میں سمو دیا ہے۔

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

افراد کی تعمیر سیرت، کردار سازی، خودی کی تعمیر یا شاہین اور قرآن کا مرد مومن بنانے کے لئے قرآن کریم کے بتائے ہوئے دینی فرائض کا ایک صحیح تصور (Concept) ناگزیر ہے۔ افراد کے کرنے کے کام کیا ہیں؟ ان کا دائرہ کار کیا ہے؟ اور جماعت کی حیثیت سے کرنے کے کیا کام ہیں؟ اس کا ایک واضح نقشہ ہے جو ہمارے پیش رہنا ضروری ہے۔

تنظیم اسلامی کے لٹریچر میں دینی ذمہ داریوں کا ایک تصور موجود ہے جو ایک سہ منزلہ عمارت کی شکل میں ہے۔ ایک حصہ بنیاد پر مشتمل ہے اور تین منزلیں اوپر۔

الف۔ اس سہ منزلہ عمارت کی مثال میں بنیادی حصہ اس کی بنیاد ہے، جو کرسی (Plinth Level) سے نیچے ہے۔ اس کے لئے قرآن و حدیث کی اصطلاح "ایمان" ہے، لیکن بنیاد کی طرح اس ایمان کے بھی دو حصے ہیں ایک حصہ نظر آتا ہے جبکہ دوسرا زیر زمین ہوتا ہے۔ ایک قانونی ایمان یعنی اسلام، جو کلمہ شہادت پر مبنی ہے اور جس کا اعلان و اظہار لازمی ہے، جبکہ دوسرا حصہ ایمان حقیقی ہے جو از روئے قرآن دل میں مخفی ہوتا ہے۔ اس حقیقی ایمان کی کیفیات بدلتی رہتی ہیں۔ اعلیٰ ایمان کی کیفیت کو ایک حدیث پاک میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جسے عرف عام میں تصوف بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس مثال میں عمارت کی مضبوطی عموماً بنیادوں کی گہرائی پر منحصر ہوتی ہے لہٰذا بنیادوں کی مضبوطی، ایمان حقیقی اور گہرائی کا تصور احسان کی اصطلاح سے واضح کیا گیا ہے۔

ب۔ اب کرسی (فرش) سے اوپر پہلی منزل شروع ہوتی ہے۔ مروجہ طرز تعمیر میں کنکریٹ کے چار ستونوں اور تین چھتوں پر مشتمل یہ عمارت ہے۔ پہلی منزل پر چار ستون

—— اسلام کے چار ارکان (فرائض) ہیں۔ یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ یوں بنیاد کا ظاہری حصہ ملا کر یہ چار ستون مل کر فرمان رسالت ﷺ "بُنِیَ الاسلامُ علٰی خمسٍ" کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ ان چار ستونوں پر ایک چھت ہے۔ اس چھت کو نام دیا گیا ہے " ہر مسلمان کا اپنی ذاتی زندگی میں اللہ کا بندہ بننا" اور یہ ہر شریک تنظیم کی پہلی ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے قرآن و حدیث کی اصطلاحات ہیں۔(i) اسلام (ii) عبادت (iii) اطاعت اور (iv) تقویٰ

ج۔ اب پہلی چھت سے چار ستون مزید بلند ہوتے ہیں یہ فرائض تو جوں کے توں رہیں گے اب دوسری چھت کا مرحلہ ہے اس چھت کو موسوم کر سکتے ہیں۔

د۔ دوسری چھت کے بعد تیسری منزل کا مرحلہ ہے۔ وہی فرائض و ارکان اسلام کے چار ستون علی حالیہ اوپر اٹھیں گے اور اس پر تیسری چھت آئے گی۔ اس چھت کو نام دے سکتے ہیں "اجتماعی سطح پر دین کے غلبے کے لئے کوشش اور جدوجہد کرنا۔" اگر تعمیر سیرت و کردار صحیح رخ پر ہے تو یہ مرحلہ بھی فطری اور لازمی ہے۔ اس کے لئے قرآن و حدیث کی اصطلاحات ہیں : (i) کُل دین اللہ کے لئے ہو جائے (ii) غلبۂ دین (iii) اظہار دین حق (iv) اعلاءِ کلمۃ اللہ (v) تکبیرِ رب —— مزید مروجہ اصطلاحات ہیں (vi) حکومتِ الٰہیہ (vii) اسلامی انقلاب (viii) نظام مصطفیٰ (ix) آسمانی بادشاہت —— اور مناسب ترین اصطلاح از روئے حدیث (x) خلافت علیٰ منہاج النبوۃ۔

ھ۔ اب اس عمارت کے در و دیوار اور نقش و نگار ہیں، جو عام اخلاقی قدریں اور حسن سلوک اور حسن معاشرت کے علاوہ آداب پر بھی مشتمل ہیں۔ جیسے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے : مِن حسنِ اسلامِ المرءِ ترکہٗ مالا یعنیہ یعنی کسی شخص کے اسلام کی خوبصورتی اور حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی امور کو ترک کردے۔

و۔ اس عمارت کی مثال سے فرائض دینی کا جامع تصور سامنے آتا ہے۔ اس کے تین ہی لوازم (Corollaries) ہیں۔

پہلا —— اس تعمیر کے لئے محنت اور کوشش درکار ہے، یعنی جدوجہد اور جہاد۔

دوسرا ـــــ جماعت۔ ان فرائض کی ادائیگی کسی جماعت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔
تیسرا ـــــ بیعت۔ ایسی جماعت جو دین کے تصورات کے عین مطابق ہو وہ جماعت بیعت سمع و طاعت پر ہی قائم ہونی چاہئے تاکہ وہ منظم ہو اور حقیقی معنوں میں تنظیم کہلا سکے۔

۱۱۔ تنظیم اسلامی افراد کے لئے تربیت کا جو پروگرام رکھتی ہے' وہ اوپر بیان کردہ سہ منزلہ عمارت کے حوالے سے فرائض دینی کے تصور پر مبنی ہے۔ اس مثال میں بنیاد اور تین منزلوں کی باہمی اہمیت و افادیت بھی نہایت اہم ہے۔

لہٰذا یہ بات قابل تو بہ ہے کہ کسی عمارت کی نمایاں ترین اور دور سے نظر آنے والی منزل تو اگرچہ سب سے اوپر والی یعنی تیسری ہی ہوگی مگر اہمیت کے اعتبار سے صاف ظاہر ہے کہ اہم ترین منزل پہلی ہی ہے۔ اس لئے کہ پہلی منزل تعمیر ہوگی تو دوسری اور تیسری کا مرحلہ آئے گا۔ اس لئے پہلی منزل سے صرف نظر کرکے اوپر کے فرائض کی ادائیگی ممکن نہیں۔ اسی طرح اگر کسی عمارت کی تعمیر میں بنیاد اور پہلی منزل میں اوپر کی منزلوں کی گنجائش نہ رکھی جائے تو اس صورت میں بھی اوپر کی تعمیر ممکن نہیں یعنی ان ہمہ جہتی اور مکمل فرائض دینی کی ادائیگی کے لئے اسی نوعیت کا یقین والا ایمان اور اسی خاص نوعیت کی پہلی منزل درکار ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ جس آدمی کی زندگی میں فرائض دینی کی دوسری اور تیسری منزل کا تصور نہیں ہے اس کے ایمان اور ذاتی زندگی میں بندگی رب کے تصور میں اور ـــــ ایک دوسرے شخص جو تنظیم اسلامی کا فعال اور منتظم رفیق ہے اس کے ایمان اور ذاتی زندگی میں پہلی منزل پر بندگی رب کے تصور میں کیفیت و کمیت (Quality and Quantity) کا واضح فرق ہوگا۔

ذاتی اور اجتماعی اہداف کے حصول کے لئے تنظیم اسلامی اپنے طریق تربیت میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اور وہ ہے آلہ تربیت کے طور پر قرآن مجید کے تعلیم و تعلّم کو اختیار کرنا۔ یہ چیز آج کے دور کی جماعتوں سے تنظیم اسلامی کو بہت نمایاں کرنے والی ہے اور دور نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام سے گہری مشابہت پیدا کرنے والی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تنظیم اسلامی نے تو جنم ہی "تحریک دعوت رجوع الی القرآن" کی کوکھ سے

لیا ہے اور "انجمن خدام القرآن" کی نوعیت کی انجمنوں کے ملک گیر بلکہ عالمگیر Network کی آبیاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ ایسا اعزاز ہے جو اسلام کی احیائی تحریکوں کے Scenirio میں آج شاید مشکل ہی سے تلاش کیا جا سکے۔ چنانچہ امیر تنظیم کے خطابات ہوں یا رفقاء کے اسروں کے چھوٹے اجتماعات' تحریکی لٹریچر ہو یا عام دعوتی اجتماعات (Corner Meetings) تمام گفتگو کا مرکز و محور قرآن ہی ہوتا ہے۔

اس نگاہ سے دیکھیئے تو ایمان کی بات ہو تو قرآن کے حوالے سے ہے' ذاتی تربیت کا مرحلہ ہو تو قرآن ہی کی بیان کردہ اساسات پر اس کی اٹھان ہے' دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مساعی ہوں تو قرآن ہی کی رہنمائی میں اور اجتماعی سطح پر نظام خلافت کے قیام کا ذکر ہو تو بھی یقیناً قرآن کی تعلیمات کے عین مطابق جہاد کے مراحل سامنے لائے گئے ہیں۔ بات جماعتی نظم کی ہو تو قرآن و سنت کی اصطلاح "بیعت" کا التزام ہے اور ضرورت شرکائے تنظیم کو متحرک (Motivate) کرنے کی ہو تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق سمع و طاعت کے نظام پر زور دیا جاتا ہے۔

اسی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تنظیم اسلامی فکر و فلسفہ اور طریق کار کے اعتبار سے نہایت گہری مشابہت رکھتی ہے قرن اول کے مسلمانوں سے۔ اس دور میں ایک سچے مسلمان کا جو نقشہ ذہنوں میں ابھرتا ہے بلکہ آج تک دشمنوں کے ذہنوں میں راسخ ہے وہ ہے قرآن اور جہاد کے ساتھ' یعنی ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار۔ تنظیم اسلامی اسی کو اپنا Motto سمجھتی ہے۔ اور دنیا میں انقلاب لانے کے لئے اس راہ کے اولین مسافروں یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی زندگیوں اور قربانیوں کی داستان کو نشان راہ بنائے ہوئے ہے۔ صحابہ کرامؓ بلاشبہ انقلاب کے داعی اول و اعظم حضرت محمد ﷺ کے ساتھی بنے اور اس کام میں بے شمار قربانیاں دیں' جانیں نچھاور کیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس جماعت کو شاباش دی' Well Done کہا اور رضی اللہ عنہم کا خطاب بخشا۔

اس انقلابی جدوجہد اور انقلاب کے موثر ہونے کی تفصیلات جس کا مجموعی خوبصورت نام سیرت النبی ﷺ ہے آج ہمارے لئے مشعل راہ ہے اور خاکِ بدر و

تبوک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ اسی مہرہدایت (سراجامنیرا) کی کرنوں نے منور کیا تھا عرب کے شتربانوں کے سیرت و کردار کو اور آج اسی ماہ منیرﷺ کی سیرت مطہرہ سے ماخوذ' منہج انقلاب نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام' کی کرنیں رفقاء تنظیم اسلامی کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال رہی ہیں۔

۱۲۔ دنیا کے مسلمان ممالک میں ہر مسلمان کے ذمہ اگرچہ وہی فرائض دینی ہیں جو اوپر درج کئے گئے ہیں اور ان فرائض کی انجام دہی کے لئے کسی جماعت میں شریک ہونا بھی لازمی ہے مگر تاریخ کے بہاؤ کا جو رخ گزشتہ دو تین صدیوں سے چلا آرہا ہے اور اس میں پہلے سے جو مساعی اس راستے میں ہمارے اسلاف کر چکے ہیں' وہ ایک کردار اور عامل کی حیثیت رکھتی ہیں اور یوں برعظیم پاک و ہند میں "پاکستان" کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے اور اس کی حیثیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس خطہ میں قائم ہونے والی اس احیائی جماعت کی مثال ہمارے لئے وہی ہے جو کہ زمانہ ماسبق میں رسولوں اور نبیوں کے بارے میں "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" کی تھی کہ ہمارے لئے اس میں زبان' علاقہ اور تہذیبی و ثقافتی مغائرت کا کوئی پردہ حائل نہیں ہے اور اسی خطہ پاک کے فرزندان توحید کی مساعی کا انقلابی تسلسل ہے جسے قرآن میں "مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اور اس تنظیم اسلامی کا وجود اس خطے کے مسلمانوں پر یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے "وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ" کے مصداق اتمام حجت کی ایک شکل ہے۔

آج جو لوگ زمانے میں رائج عزت کے جھوٹے معیارات کو ٹھوکر مار کر اور معاشرے سے کٹ کر تنظیم اسلامی کی دعوت پر لبیک کہہ کر آگے بڑھ رہے ہیں' قرآن مجید نے انہیں اس عزت کے خطاب سے نوازا ہے یعنی "ھُوَ اجْتَبٰکُمْ" کہہ کر پکارا ہے۔ یہ اعزاز رفقاء سے اعلیٰ کارکردگی کی توقع رکھتا ہے اور اس راستے میں ہمت و عزیمت کی مثالیں قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ بقول شاعر ع اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسا اللہ تعالیٰ "اجتبائیت" کے اس مقام پر پہنچنے والوں کو آخرت میں جن مقامات بلند تک "عروج" عطا فرمانا چاہتا ہے اس کی حقیقی جھلک تو آخرت ہی میں ملے گی تاہم اس کٹھن اور مشکل راستے کے تقاضے کے طور پر اللہ تعالیٰ ہم سے "وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ

جِهـادِہ" کا تقاضا ضرور کرتا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ جس راہ پر قدم رکھا ہے اس کا حق ادا نہ کر سکیں اور یوں منزل سے ہم کنار نہ ہو سکیں۔ اگر یہ بازی ہم کھیل سکیں تو فلاح کا وعدہ بھی ہے اور "فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْر" کی نوید جانفزا بھی' ــــ جو راستہ کی سختیوں کو آسان کرنے والی ہے۔

۱۳۔ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا مالک بھی ہے اور خالق بھی' اسی نے انسان کو پیدا بھی کیا ہے' اس کے اندر بے پناہ صلاحیتیں رکھی ہیں' خیر و شر کی تمیز بخشی ہے' ہدایت کے لئے سامان مہیا کیا ہے' اپنی محبت کی لو ہر دل میں روشن کی ہے' وحی اور انزال کتب کے ذریعے مخلوق کا خالق سے مضبوط رشتہ قائم کر دیا ہے اور اب انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس سے کچھ تقاضے ہیں جو انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔

بے شمار تنظیمیں' ادارے اور جماعتیں اپنے اپنے مقاصد کے لئے کوشاں ہیں۔ ان میں رفاہی ادارے بھی ہیں' قبائلی' قومی اور مذہبی روایات کے تحفظ کی انجمنیں بھی۔ مسلمانوں میں بھی اصلاحی کام کے لئے اجتماعی کوششیں اور تبلیغی مقاصد کی حامل جماعتیں بھی مصروف کار ہیں۔ اور سب سے اوپر اسلام کے احیاء کے لئے کام کرنے والی جماعتیں بھی ہیں جو اسی میدان میں ہیں۔

میرے اور آپ کے لئے "یہ گھڑی محشر کی ہے" کہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالیں اور سوچیں کہ میں کہاں کھڑا ہوں؟ میری ترجیحات کیا ہیں؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور اس مقصد کے حصول کے لئے میں کیا راست سمت کوشش کر رہا ہوں؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو مبارک باد ہے۔ بس ذرا یہ مزید غور کر لیجئے کہ تنظیم اسلامی کی دعوت اور طریق کار کہیں دعوت اور اس کا طریق کار کے اعتبار سے آپ کی اختیار کردہ اجتماعیت سے بہتر تو نہیں ہے۔ اگر بہتر محسوس ہو تو پھر دیکھنا کوئی سابقہ تعلق اور دوستی اس بہتر Option کو اختیار کرنے میں آڑے نہ آنے پائے۔

اور ــــ اگر جواب نفی میں ہے کہ میں تو اب تک بھولا رہا ــــ یا ــــ سبق تو یاد ہے مگر عملاً کوشش نہیں کر رہا ــــ یا ــــ سبق بھی یاد ہے عملاً کوشش بھی کر رہا ہوں مگر وہ اس اعلیٰ مقصد کے لئے نہیں ہے جو قرآن و حدیث سے ہر مسلمان کا

ہونا چاہئے تو ـــــ پھر یقیناً یہ موقع ہے، سوچئے ـــــ خوب سوچئے ـــــ سوچ کر اس اجتماعی کوشش جس کا نام تنظیم اسلامی ہے ـــــ جو مروجہ مفہوم کے اعتبار سے نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ بلکہ ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے، جو اولاً پاکستان میں اور بالآخر ساری دنیا میں دین حق یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر نظام خلافت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس میں شامل ہو جائیے۔ اس لئے کہ صبح کا بھولا دوپہر یا بعد دوپہر کیا شام کو بھی گھر آ جائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ کتنی دل لگتی بات فرمائی ہے رسول ﷺ نے "التّائبُ منَ الذنبِ کمَن لا ذنبَ لَه" ابن ماجہ (گناہ سے توبہ کرنے والا شخص ایسا ہے جس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں) کیا آپ واقعی یہ نہیں چاہتے کہ آپ کے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں۔

۱۴۔ اب جو ہمت ور آگے بڑھ کر تنظیم اسلامی کی اس دعوت پر لبیک کہہ کر اس میں شمولیت اختیار کرلے، اگرچہ حقیقتاً اس کے لئے تفصیلی طریقہ کار کے بارے میں وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جو حضرت حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غالباً ۴ھ میں مکہ میں سولی پر چڑھنے سے پہلے فرمائے تھے کہ "جب میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دے رہا ہوں تو مجھے پرواہ نہیں ہے کہ میرا لاشہ دائیں پہلو گرتا ہے یا بائیں"۔

تاہم کسی جماعت کے مرکزی رہنماؤں کے سامنے تو یقیناً قرآن و سنت سے ماخوذ واضح لائحہ عمل ہونا چاہئے اور اس پر مسلسل نگاہ بھی رکھنی چاہئے۔ رفقائے تنظیم کو بھی گاہے گاہے اس پر تنقیدی نگاہ ڈالتے رہنا چاہئے۔ تنظیم اسلامی کے پیش نظر اسلامی انقلاب یا نظام خلافت کے قیام کا طریق کار یہ ہے کہ ـــــ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہوں وہ ۔

☆ سب سے پہلے خود پوری طرح مسلمان اور حقیقی معنی میں اللہ تعالیٰ کے بندے بنیں اور اپنی ذات اور اپنے دائرہ اختیار میں شریعت اسلامی کو نافذ کریں اور اس کے لئے اپنے نفس کے خلاف جہاد بھی کریں اور بگڑے ہوئے ماحول سے بھی مردانہ وار کشمکش کریں اور دوسروں کو بھی مقدور بھر اس کی دعوت دیں۔

☆ باہم دینی اخوت اور ایمانی رشتوں میں بندھ کر آپس میں نہایت رحیم و شفیق اور دین

کے باغیوں اور مخالفوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

☆ امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر ہجرت و جہاد اور سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت کر کے اس تنظیمی نظم سے منسلک ہو جائیں۔

☆ اور اس طرح جو اجتماعی قوت وجود میں آئے وہ —— جب تک یہ قوت مناسب مقدار میں جمع نہ ہو جائے تن من دھن کے ساتھ اسی دعوت و تربیت اور تنظیم کی توسیع اور مضبوطی کی کوشش میں لگے رہیں اور سب سے زیادہ توجہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اصلاح اور تزکیہ پر مرکوز رکھیں۔

☆ اس دوران میں تحریر و تقریر کے ذریعے بھلائی کی دعوت دیتے رہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں، لیکن نہ ملکی انتخابات میں حصہ لیں اور نہ ہی کسی سیاسی ہنگامے میں فریق بنیں۔

☆ اس پورے عرصے میں کسی نکتہ چینی اور تمسخر سے بددل ہوں نہ کسی جبر و تشدد سے خوف کھائیں بلکہ کامل صبر و تحمل سے کام لیں اور ہرگز کوئی جوابی کارروائی نہ کریں۔

☆ اور جب مناسب قوت فراہم ہو جائے تو راست اقدام کے طور پر —— اسلام نے جن برائیوں کی نشان دہی کی ہے ان کا قلع قمع کرنے کے لئے کمر کس لیں۔

☆ اس کے لئے جلسوں جلوسوں، مظاہروں اور ناکہ بندیوں کی شکل میں اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے تمام جدید ذرائع استعمال کریں، اس شرط کے ساتھ کہ یہ سب کچھ پرامن ہو اور اس میں ان کی جانب سے کوئی تشدد نہ ہو۔

☆ اور اگر ان پر تشدد کیا جائے تو کمال صبر و استقلال کا مظاہرہ کریں حتیٰ کہ اس راہ میں جان دینے کو اپنے لئے سب سے بڑی کامیابی سمجھیں، تا آنکہ اس پیہم کشمکش اور جہاد فی سبیل اللہ میں حق کا بول بالا ہو جائے یا شہادت کی موت نصیب ہو جائے۔

۱۵۔ آخرت پر ایمان کے بعد اگرچہ آدمی ہر کوشش نتائج سے بے نیاز ہو کر کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے انہوں نے اپنی امت کے "آخرین منھم" کے لئے ہمت بندھانے کے لئے ایسی خبریں دی ہیں جن کی رو سے

دورِ نبوت کے بعد دور خلافت ہو گا' پھر ظالمانہ بادشاہتوں کا سلسلہ چلے گا تا آنکہ مسلمانوں پر غیروں کی غلامی مسلط ہو جائے گی۔ اس کے بعد اسلام کے غلبہ کا دور آئے گا اور اب یہ غلبہ کسی علاقے سے آغاز ہو کر بالآخر عالمگیر ہو جائے گا۔

اب گزشتہ نصف صدی سے غلامی کا دور آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے اور اب تمام دنیا میں مسلمانوں میں بیداری اور اسلام کے عالمی غلبہ کی خواہش زور پکڑ رہی ہے اور سب سے بڑھ کر علمی اور فکری کام برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کا ہے جس کے نتیجے میں پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور آہستہ آہستہ ڈگمگاتی اور ہچکولے کھاتی کشتی کی طرح یہ ملک منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

اسی سرزمین میں یہ تنظیم اسلامی علامہ اقبال کی شاعری کی صدائے بازگشت' ابوالکلام کی دعوت قرآنی کا مصداق' سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی دعوتی سرگرمیوں اور فکر کی نقیب' شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی امین بن کر سرگرم عمل ہے۔

زمانہ ماضی کی چار صد سالہ تجدیدی مساعی اور ماضی قریب کے مجددانہ فعالیت اور مسلمان پاک و ہند و بنگلہ دیش کی قربانیوں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ خیر القرون کے بعد اسلام کے گہوارے میں آنے والا "آحر س مسبب" کا یہ خطہ جو جغرافیائی نقشہ میں عین قلزم کے سامنے ہے' شاید عالمی خلافت کا نقطہ آغاز ثابت ہو جائے۔

اللہ کرے ایسا ہی ہو ـــــ مگر اس کے لئے اس کے شایان شان محنت و عزم و استقلال کی ضرورت ہے جس کی پکار لگا رہا ہے ایک تہائی صدی سے ایک داعی قرآن ـــــ مقری قرآن ـــــ اور ـــــ مفسر منہج انقلاب نبویؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام یعنی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی۔

الا ہل من مسمع ؟ والا ہل من مجیب ؟

امتِ مسلمہ کی عمر (۸)

اور

مستقبل قریب میں مہدی کے ظہور کا امکان

امین محمد جمال الدین
شعبۂ دعوت و ثقافت، دعوت اسلامی کالج، جامعہ الازہر

کی معرکۃ الآراء کتاب "عمر امۃ الاسلام وقرب ظہور المہدی" کا

پانچواں باب

قیامت کی بڑی نشانیاں

مترجم: پروفیسر خورشید عالم، قرآن کالج لاہور

دوسری فصل

وہ علامات جن کو مومن دیکھ نہ سکیں گے

یہ چار ہیں۔ تین خسوف (زمین کا دھنس جانا)، مشرق، مغرب اور جزیرۃ العرب میں، چوتھی آگ ہے جو عدن کی گہرائی یا مشرق سے نکل کر لوگوں کو ہانک کر محشر کے میدان میں لے جائے گی۔

خسف سے مراد زمین کا پھٹ کر لوگوں کو نگل لینا ہے۔ وہ ایک قسم کا عذاب اور انتقام ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِس اُمّت میں تین طرح کے عذاب ہوں گے۔ زمین کے دھنسنے سے، صورت کے مسخ کرنے سے اور سنگ باری سے۔ یہ اس وقت آئیں گے جب گانے والیوں اور آلاتِ طرب کا چرچا ہو گا اور جب میخوری

عام ہو جائے گی۔" {۳۴}

لیکن حسف (زمین کا دھنسنا)' قذف (سنگباری) اور مسخ (صورت کا بگڑنا) عام نہیں ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ان عذابوں سے بچار کھا ہے۔ یہ عذاب خاص خاص جماعتوں پر نازل ہوں گے۔

اسی بناء پر' اللہ تعالیٰ مومن لوگوں کو وفات دے دے گا تاکہ وہ نہ تو قیامت کے زلزلہ کو دیکھ سکیں اور نہ ہی مشرق 'مغرب اور جزیرۃ العرب میں ظاہر ہونے والے تین عذابوں کو دیکھ پائیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کا قول ہے کہ "قیامت تو بدکاروں پر آئے گی"۔ {۳۵}

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ "قیامت اس وقت قائم ہو گی جب روئے زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا"۔ {۳۶}

ان تین خسوف کے بعد آخری بڑی علامت نمودار ہو گی اور یہ کائنات کے ہولناک حقیقی انقلاب کی پہلی نشانی بھی ہو گی۔ یمن سے یا عدن کی گہرائی سے یا مشرق سے ایک آگ نکل کر لوگوں کو ہانک کر سرزمین شام کے میدان حشر میں لے جائے گی۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "جہاں تک قیامت کی پہلی نشانی کا تعلق ہے وہ آگ ہے جو مشرق سے ظاہر ہو کر لوگوں کو حشر کے لئے مغرب میں جمع کر دے گی"۔ {۳۷}

مسلم کی اس روایت میں جو پہلے باب میں حذیفہؓ بن اسید سے مذکور ہے' آیا ہے۔

"۔۔ اور آخری نشانی وہ آگ ہے جو یمن سے نکل کر لوگوں کو میدان محشر میں نکال کر لے جائے گی"۔

ایک روایت میں ہے "۔۔ آگ عدن کی گہرائی سے نکل کر لوگوں کو میدان محشر میں دھکیل دے گی' جہاں وہ رات بسر کریں گے وہ رات بسر کرے گی' جہاں وہ قیلولہ کریں گے وہ قیلولہ کرے گی"۔ {۳۸}

یہ آگ کسی کافر کو پیچھے نہیں رہنے دے گی بلکہ ان سب کو اپنے آگے اچھی طرح ہانک کر لے جائے گی۔ جو ان میں سے پیچھے رہا اسے کھا جائے گی۔ یہاں تک کہ ان کو شام میں بپا میدان حشر کی طرف جانے پر مجبور کر دے گی۔

تیسری فصل

کائنات کا انقلاب اور اس کا خاتمہ

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس دنیا کی انتہا اور حیاتِ ابدی کی ابتداء کے بارے میں تھوڑا سا تذکرہ کر دیں۔ کیونکہ یہ موضوع ان بڑی علامات سے متعلق ہے جن کا ابھی ابھی ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ پھر آخرت پر ایمان کے حوالے سے اس کا علم ہمارے عقیدہ کا لازمی جزو ہے۔ اللہ عزّ و جلّ جب دنیا کے خاتمے اور بربادی کی اجازت دے گا تو فرشتے اسرافیل کو جس کا کام صور [۳۹] پھونکنا ہے' صور پھونکنے کا حکم دے گا۔

پہلا نفخہ (پھونک)' گھبراہٹ کا نفخہ

یہ نفخہ خاصا طویل ہو گا جس کو سن کر آسمان و زمین پر رہنے والے سب ڈر جائیں گے سوائے ان کے جن کو اللہ بچالے اور وہ انبیاء اور شہداء ہیں۔ یہ پھونک سن کر سب زندہ لوگ خوفزدہ ہوں گے کیونکہ انبیاء اور شہداء بھی اپنے رب کے یہاں زندہ ہیں اس لئے اللہ انہیں اس چیخ کے ڈر سے بچالے گا۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے

> "اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچالے گا۔ اور سب کان دبائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے"۔
>
> (النمل ۸۷)

یہ وہی نفخہ ہے جس کی وجہ سے پوری کائنات بری طرح حرکت کرنے لگے گی اور ایک زبردست زلزلہ آئے گا جس کی وجہ سے سب جوڑ کھل جائیں گے اور وہ سب بند ڈھیلے پڑ جائیں گے جو اس ہم آہنگ کائنات کو مربوط رکھے ہوئے ہیں۔ زمین لرز جائے گی' اس کو جھٹکے لگیں گے۔ پہاڑ گر کر زمین کے ساتھ برابر ہو جائیں گے اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر ذروں کی مانند بکھر جائیں گے۔ سمندر پھٹ کر ایک دوسرے میں گر جائیں گے اور

بھڑکتی ہوئی آگ میں تبدیل ہو جائیں گے۔ آسمان میں ایک بہت بڑا شگاف پڑ جائے گا جس کی وجہ سے اس کی جاذبیت (Gravitation) جاتی رہے گی۔ سیارے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ستارے پے بہ پے گرنے لگیں گے۔ سورج اور چاند کو جمع کر کے پھینک دیا جائے گا۔ ہر ایک کی روشنی جاتی رہے گی۔ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ کائنات اسی طرح کہر اور بخار میں بدل جائے گی جیسے تخلیق سے پہلے تھی۔

یہ وہی لمحہ ہے جو اس چھوٹے سے مغرور انسان کی عقل غارت کر دے گا جو اپنے خالق سے بھی بڑا بننے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس کی عقل زائل ہو جائے گی' اس کے ہوش و حواس اڑ جائیں گے۔ وہ اپنی کم عقلی' ذہنی اضطراب و ہیجان کے ساتھ روئے زمین پر یوں آوارہ گھومے گا جیسے جل مرنے والے پروانے گھومتے ہیں۔ جو بھی اس لمحہ کو سنے گا وہ گردن موڑ کر اس کی طرف توجہ دے گا۔ ایک کان کو اوپر اٹھا کر اور دوسرے کان کو نیچا کر کے اس خوفناک چیخ کے مرکز کی طرف دھیان دے گا۔

یہ وہی لمحہ ہے جو اچانک اس وقت آئے گا جب وہ غفلت میں مدہوش اور کفر میں غرق ہوں گے۔ ان کی حالت کو اللہ کے رسول ﷺ نے یہ کہہ کر واضح کیا ہے:

"قیامت اس وقت آئے گی جب دو آدمیوں نے اپنا کپڑا بچھا رکھا ہو گا' نہ ان کو باہمی خرید و فروخت کو ختم کرنے کی مہلت ملے گی اور نہ کپڑا لپیٹنے کی اجازت۔ قیامت اس وقت آئے گی جب اونٹنی کا دودھ لے جانے والے کو پینے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ قیامت اس وقت آئے گی جب آدمی پانی کا حوض تیار کرے گا مگر اسے جانوروں کو پانی پلانے کی مہلت نہ ملے گی۔ اور قیامت اس وقت آئے گی جب کسی نے اپنا لقمہ منہ تک اٹھایا ہو گا اور اسے اتنی مہلت نہ ملے گی کہ وہ اس کو منہ میں ڈال لے"۔ [۴۰]

اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

"لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے حال یہ ہو گا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی اور ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ

ایسا سخت ہو گا"۔ (الحج : ۱،۲)

دوسرا نفخہ، بے ہوشی اور موت کا نفخہ

پھر اللہ تعالیٰ اسرافیل کو دوسری مرتبہ صور پھونکنے کا حکم دیں گے۔ یہ بے ہوشی کا نفخہ ہو گا۔ انبیاء اور شہداء سمیت زمین و آسمان کی ساری مخلوق بے ہوش ہو کر مر جائے گی، سوائے ان کو جن کو اللہ بچانا چاہے گا۔ وہ آٹھ فرشتے ہیں۔ جبریل، میکائیل، اسرافیل، موت کا فرشتہ اور عرش اٹھانے والے چار فرشتے۔[۳۱]

اللہ تعالیٰ کا قول ہے :

> "اور صور میں پھونک ماری جائے گی، سو تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے سوائے ان کے جن کو اللہ تعالیٰ بچانا چاہے۔ پھر اس میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو دفعتاً سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے اور (چاروں طرف) دیکھنے لگیں گے"۔ (الزمر: ۶۸)

پھر اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ جبریل، میکائیل، اسرافیل اور عرش اٹھانے والے چار فرشتوں کی روح قبض کر لی جائے۔ صرف اللہ تعالیٰ اور موت کا فرشتہ باقی رہ جائیں گے۔ پھر اللہ اس فرشتے سے کہے گا کہ تو میری مخلوق ہے، جب میں نے ارادہ کیا تجھے پیدا کر دیا، اب مر جاؤ۔ چنانچہ ملک الموت مر جائے گا اور سوائے الجبّار تبارک و تعالیٰ کے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ وہ زندہ ہے، اسے موت نہیں آئے گی۔ وہ اول ہے جس سے پہلے کوئی چیز نہیں، وہ آخر ہے جس کے بعد کوئی چیز نہیں۔ وہ زمین و آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر حرکت دے گا اور فرمائے گا : میں بادشاہ ہوں، میں جبار ہوں۔ زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟ کہاں ہیں جبر کرنے والے؟ کہاں ہیں فخر کرنے والے؟ آج کے دن کس کی بادشاہی ہے؟ آج کے دن کس کی مہمانداری ہے؟ آج کے دن کس کی بادشاہت ہے؟ ذاتِ الٰہی خود جواب دے گی : بادشاہی صرف اللہ کی ہے جو ایک ہے، جو قہار ہے۔

بخاری اور مسلم کی حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث کے مطابق کائنات چالیس (سال یا ماہ یا دن) تک اس عالم میں رہے گی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "دو نفخوں کے درمیان چالیس کا وقفہ ہو گا"۔ لوگوں نے پوچھا : "اے ابو ہریرہؓ کیا

چالیس روز؟ انہوں نے کہا: مجھے پتہ نہیں۔ چنانچہ میں جواب سے انکار کرتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا: چالیس ماہ؟ انہوں نے کہا. مجھے علم نہیں۔ انہوں نے پوچھا: کیا چالیس برس؟ انہوں نے کہا مجھے علم نہیں۔ {۴۲}

پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے شبنم یا سائے کی مانند بارش اتارے گا' جس کے باعث مخلوقات کے جسم ایسے اگ آئیں گے جیسے سبزیاں اگتی ہیں۔ انسان کی دمچی (کمر کے نچلے حصے میں ابھری ہوئی ہڈی) کے سوا سب بوسیدہ ہو چکا ہو گا۔ قیامت کے روز مخلوق اسی ہڈی سے ترکیب پائے گی۔ اے عقل والو عبرت پکڑو!

جب تخلیق مکمل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اسرافیل کو زندہ کرکے اسے چیخ مارنے کا حکم دیں گے۔ یعنی وہ یہ کہیں گے. اے گلی سڑی ہڈیو! اے ٹوٹے ہوئے جوڑو! اے متفرق اعضاء! اے پارہ پارہ بالو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم سب فیصلے کے لئے اکٹھے ہو جاؤ۔ {۴۳} پھر وہ صور پھونکیں گے۔

تیسرا نفخہ' مر کر اٹھنے اور حشر نشر کا نفخہ

صور میں اتنے سوراخ ہیں جتنی مخلوقات کی ارواح ہیں۔ اسرافیل صور پھونکیں گے تو روحیں اڑ کر جسموں میں چلی جائیں گی۔ مومنوں کی روحیں روشنی میں دمکتی ہوئی اور کافروں کی روحیں اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی اڑ کر جائیں گی۔ اللہ عزّوجلّ فرمائے گا: "مجھے میری عزت و جلال کی قسم یہ روح اسی جسم میں داخل ہو گی جو دنیا میں اس سے آباد تھا" چنانچہ روحیں جسموں میں سرایت کر جائیں گی۔ جسم قبروں سے اپنے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اٹھیں گے۔ کافر کہیں گے: یہ دن تو بڑا سخت ہے۔ اور مومن کہیں گے: شکر ہے اس اللہ کا جس نے غم کو ہم سے دور کر دیا۔

حواشی

{۲۹} ابن جریر نے اسے نقل کیا ہے اور طبرانی نے ابو مالک اشعریؓ سے روایت کیا ہے۔

{۳۰} دیکھئے ابن کثیر کی تفسیر قرآن' سورۃ الدخان

{۳۱} ابن کثیر کا قول ہے کہ حبرامت ابن عباسؓ کی طرف اس کی سند درست ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

(باقی حواشی صفحہ 38 پر)

فکرِ عجم

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور سلطنتِ فارس

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۸)

ڈاکٹر ابو معاذ

ایرانی مقبوضات میں اسلام کی اشاعت کا آغاز

آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری چار برسوں میں اسلام کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ یمن ان دنوں ایران (سلطنتِ فارس) کا اہم صوبہ تھا جو آنحضورؐ کی زندگی کے پہلے برس سے مسلسل ایرانیوں کے قبضے میں تھا۔ یہاں پر ان کا ایک مستقل گورنر مقیم ہوتا تھا۔ مزید برآں ایرانی فوج اور عمائدین کی ایک معقول تعداد بھی وہاں موجود رہتی تھی۔ وہاں کے مقامی باشندے زیادہ تر یہودی اور عیسائی تھے مگر "اَلنَّاسُ علٰی دِینِ مُلُوکِہِم" (لوگ اپنے بادشاہوں کے مذہب پر ہوتے ہیں) کے مصداق ساٹھ سالہ غلبہ کے باعث وہاں پر ایرانی اثرات معاشرے میں گہرے ہو چکے تھے اور وہاں پر آتش کدے بھی روشن تھے۔ ایرانی عمائدین کو وہاں ابناء کہا جاتا تھا۔ آنحضور ﷺ نے ۱۰ھ میں وبر بن یُحنّس ؓ کو ان کے پاس دعوتِ اسلام دے کر بھجوایا۔ وہ نعمان پسر بزرگ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوئے۔ وہیں سے دیگر ایرانی عمائدین فیروز دیلمی، مرکبود، وہب پسر منبہؒ کے پاس دعوتِ اسلام کے مراسلے بھجوائے۔ یہ لوگ زردشتی عقائد کے باعث توحید کے نظریہ سے کسی حد تک آشنا تھے، بت پرستی سے دور تھے اور خداوند کریم نے انہیں فہم و فراست سے بھی نوازا تھا۔ لٰہذا یہ لوگ فوراً مسلمان ہو گئے۔ صنعاء میں سب سے پہلے حافظ قرآن حضرت مرکبود کے صاحبزادے عطا اور وہب بن منبہؒ تھے جو ایرانی نوجوان تھے۔ یہ ایرانی عمائدین جب اسلام کے دائرے میں آ گئے تو انہوں نے مرکز فارس یعنی مدائن سے اپنا ناطہ یکسر توڑ لیا اور آنحضورؐ کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔ گویا یہ ایرانی بادشاہت اور قومیت سے پہلی علیحدگی تھی جو عقیدے میں

تبدیلی کے باعث ممکن ہوئی۔

نواحی صوبہ نجران ہرچند عیسائی آبادی کا مسکن تھا مگر پھر بھی جغرافیائی اعتبار سے ایرانی حدود میں موجود ہونے کے باعث ایرانی اثرات سے پاک نہیں تھا۔ ان لوگوں تک بھی آپؐ کا پیغام پہنچا اور ۱۰ھ میں یہ لوگ حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں مسلمان ہو گئے۔

بحرین بھی ایرانی صوبہ تھا اور وہاں کی غالب اکثریت فارسی باشندوں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے عرب قبیلہ عبد القیس نے مدینہ کے تجارتی سفر میں آنحضورؐ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا' پھر ان لوگوں نے وہاں پر مسجد تعمیر کی۔ مسجد نبوی کے بعد بحرین کی مسجد وہ دوسرا مقام تھی جہاں پھر باقاعدہ طور پر جمعہ کا خطبہ پڑھا گیا۔ آنحضورؐ نے حضرت علاء حضرمیؓ کو ۸ھ میں بحرین بھجوایا۔ وہ وہاں کے مسلمانوں کے ہاں مقیم ہوئے اور ایرانی عمائدین کو دعوتِ اسلام دی۔ یہاں پر اُن دنوں ایرانیوں کی جانب سے مقررہ کردہ گورنر منذر پسر ساوئی تھا۔ انہوں نے دعوت اسلام پر لبیک کہا اور بڑی تعداد میں ایرانیوں نے زردشتی دین چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ بحرین کے علاقہ ہجر میں ایران کی جانب سے سیجبت حکمران مقرر تھا' اسے آنحضورؐ کا مراسلہ موصول ہوا تو اس نے اپنے ایرانی ہم وطنوں کے ہمراہ دعوتِ اسلام پر لبیک کہا اور یہ لوگ اسلام کے علمبردار بن گئے۔

آنحضورؐ نے ایرانی عمائدین کو اہم سرکاری ذمہ داریوں سے بھی نوازا اور ان پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا۔ حضرت باذانؓ بن ساسان ایران کے شاہی خاندان (اہل ساسان) کے فرزند تھے اور مشہور شہنشاہ بہرام گور کی اولاد میں سے تھے۔ شاہی خاندان کے اسلام قبول کرنے والے وہ پہلے فرد تھے۔ آپؐ نے ان کی خاندانی نجابت اور فہم و فراست کے مدنظر انہیں یمن کا گورنر مقرر کیا۔ پھر ان کے صاحبزادے شہرؓ بن باذان کو اپنے باپ کے بعد یہ ذمہ داری تفویض فرمائی۔

ایرانی اشیاء کا استعمال

آپؐ نے نوشیروانی قبا بھی زیب تن فرمائی جو مشہور ایرانی لباس تھا۔ اس پر جیب

اور آستینوں کی جگہوں پر دیبا کی سنجاف تھی۔ پاجامہ ایرانی لباس تھا' آپؐ نے اپنے لئے منیٰ کے بازار سے خریدا تھا۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ جب تم عجم فتح کرو گے تو وہاں تمہیں حمام ملیں گے' ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایرانی حمام کے وجود سے باخبر تھے۔ اسی طرح آپؐ کی خدمت میں جو تحائف عمائدینِ ایران نے یمن اور بحرین سے روانہ فرمائے وہ بھی آپؐ کے استعمال میں رہے۔

استخراج نتائج

اس مختصر مضمون سے چند نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

الف) آنحضور ﷺ نے کسی بھی موقع پر عرب و عجم کا امتیاز ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔

ب) ایرانی عمائدین نے دعوت اسلام کے فوراً بعد اسلام قبول کرلیا۔

ج) آنحضور ﷺ نے ایرانی عمائدین کو بطور گورنر نامزد فرما کر ان کے فہم و فراست اور نجابت کا احترام فرمایا۔

د) آپؐ نے ایرانی فنونِ جنگ سے استفادہ فرمایا اور دیگر اہم معاملات میں حضرت سلمان فارسیؓ سے مشاورت طلب فرمائی۔

ر) آپؐ نے ایرانی اشیاء کا استعمال بھی فرمایا۔

س) آپؐ کو مراکزِ ایران کے چشم دید مشاہدات بھی حاصل تھے۔

ص) آپؐ نے اہل عجم کے اسلام قبول کرنے کی بشارت بھی فرمائی تھی اور آپؐ کی آرزو بھی یہی تھی۔

اہل ایران سے وابستہ توقعات

آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میری حدیث چاند پر بھی پہنچ جائے تو اہل فارس میں سے ایک شخص اسے وہاں سے بھی لے آئے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ماہرین علم حدیث نے اس کی سند کو مقطوع قرار دیا ہے۔

اسی طرح آنحضور ﷺ نے بشارت فرمائی تھی کہ اسلام کے عہدِ ابتلاء میں خراسان سے لشکرِ اسلام روانہ ہوگا۔ خراسان ایران کا شمال مشرقی صوبہ ہے اور یہ ہمیشہ

زمانہ قدیم سے ایرانی سلطنت میں شامل رہا ہے۔ اس علاقہ میں فارسی بولی جاتی ہے اور اس میں افغانستان کے کچھ حصے' تاجکستان' واخان' چین کے صوبہ زنجیانگ کے کچھ حصے اور پاکستان میں مالاکنڈ ڈویژن کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ یہ لشکر ایلیاء (یعنی بیت المقدس) پہنچ جائے گا اور اس کا راستہ کوئی بھی روک نہیں سکے گا۔ اس طرح اہل خراسان کا لشکر مہدیٔ موعود کا مددگار بن جائے گا۔ یہ لوگ کالے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ بنوامیّہ کے انقراض کے وقت اور سلطنت بنوعباس کی تاسیس کے موقع پر ابومسلم خراسانی بھی اپنے لشکر کو سیاہ علم اٹھوائے ہوئے لایا تھا مگر یہ لشکر یروشلم تک پہنچ نہیں پایا تھا۔

اس طرح آنحضور ﷺ نے اہل فارس کے علم و فراست اور جذبہ جہاد اور قربانی کی پیشین گوئی بھی فرمائی تھی۔ آنحضورؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا

((اَیّھا النّاس اَلاَ اِنّ ربّکم واحدٌ واِنّ اباکم واحدٌ اَلا لاَ فضلَ لعربیٍّ علٰی عجمیٍّ وَلا لعجمیٍّ علٰی عَربیٍّ وَلَا لاَحمَرَ علٰی اَسودَ وَلَا لِاسودَ علٰی احمَرَ اِلَّا بِالتَّقوٰی))

(مسند احمد)

"لوگو! درحقیقت تمہارا پروردگار ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی بھی صورت میں عربی کو عجمی پر' عجمی کو عربی پر' سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فوقیت نہیں ہے' اگر کسی وجہ سے فضیلت ہے تو وہ فقط تقویٰ کی بنا پر ہے۔"

اس عظیم اعلان کی وجہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں سب لوگ برابر ہیں مگر مختلف اقوامِ اسلام اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث اسلام کی خدمت کے مختلف فرائض سرانجام دینے کی اہلیت کی حامل ہیں۔ اس طرح مسلمانانِ عرب و عجم میں نفرت یا ناپسندیدگی کے جذبات کی بیخ کنی کی اشد ضرورت ہے۔ بقول اقبال ؒ "عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے"

نہ ایرانیم و نے ترک و تاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

(نہ ہم ایرانی ہیں اور نہ ہی تاتار کے ترک۔ ہم گلستان اسلام کے برگ و بار ہیں اور ایک شاخ سے وابستہ ہیں۔ ہم پر رنگ و نسل کی تفریق حرام ہے کیونکہ ہمیں ایک مشترک نوبہار نے پال پوس کر بڑا کیا ہے)

آنحضورؐ کے زمانہ کا ایران اور پایۂ تختِ ایران

آنحضور ﷺ کے زمانہ میں سلطنت فارس موجودہ ایران' افغانستان' تاجکستان' زنجیانگ' ازبکستان' ترکمانستان' کوہستان قفقاز' وچینیا' آذربائیجان' آرمینیا' جارجیا اور موجودہ پاکستان کے بیشتر خطوں کے علاوہ جزیرہ نمائے عرب بشمول یمن و حجاز' عراق اور کچھ عرصہ کے لئے بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں (شام و فلسطین و مصر) پر محیط تھی۔ اس طرح یہ ایشیا کی سب سے بڑی بادشاہت تھی اور کئی موقعوں پر مغرب کی بازنطینی رومی شہنشاہیت کی افواج کو اہل فارس نے بری طرح مات دی تھی۔ ان کی طویل عرصہ تک مسلسل جنگ لڑنے کی استعداد' فہم و فراست' ہیبت و دبدبہ' ملی جذبہ' شہنشاہی نظام کی گرفت اور مذہبی کلیسائی نظام کا استحکام انہیں دنیائے معلوم میں ایک منفرد مقام عطا کرتا تھا۔ معاشی اور انسانی ذرائع اور ان کے ریزرو (Reserve) انہیں کسی انتظامی اور دفاعی مشکل سے عہدہ برآ ہونے میں مددگار تھے۔ تاہم سلطنت کی وسعت' محلاتی سازشیں اور عمائدینِ سلطنت کی ریشہ دوانیاں بتدریج پنپ رہی تھیں۔

جیسے کہ عرض کیا جاچکا ہے ان کا پایۂ تخت موجودہ بغداد سے بیس میل کے فاصلہ پر تھا اور یہ دجلہ کے کناروں پر آباد بستیوں کا ایک شاندار مجموعہ تھا۔ ایک بستی سلوکیہ کے نام سے موسوم تھی اور اسے سکندر اعظم کے جانشینوں (سلوکیوں) نے آباد کیا تھا۔ ایک شہر طیسفون تھا جو اب بھی عراق میں ایک گاؤں کی صورت میں موجود ہے۔ طیسفون کے تینوں اطراف پر ہلال کی صورت میں ایک فصیل تھی جس پر برج بنے ہوئے تھے۔ اس دیوار کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ عربوں نے ان بستیوں کے مجموعے کو مدائن (مدینہ کی جمع) کہا۔ طیسفون کے گاؤں کے عینِ مرکز میں سیدنا سلمان فارسیؓ کا مدفن اب بھی موجود ہے جہاں

وہ حضرت عمر فاروق ؓ کی جانب سے انتظام و انصرام کے لئے تعینات فرمائے گئے تھے۔
بقول اقبال ؎

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند
مثلِ سلماں در مدائن بودہ اند

(وہ مسلمان جو حکومت کرنے کے لئے منتخب ہوئے۔ انہوں نے بادشاہت میں بھی فقر کے اسلوب اپنائے رکھے تھے۔ انہوں نے اولوالامر ہوتے ہوئے بھی امارت اور فقر کا امتزاج پیش کیا تھا اور اس کی سب سے نمایاں مثال مدائن میں حضرت سلمان فارسی ؓ کی تھی۔)

مدائن کو خسرو نوشیروان نے اپنا دارالحکومت بنایا تھا جسے ایوانِ مدائن، قصرِ مدائن اور طاقِ کسریٰ کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ایک عرب شاعر بحتری کے بقول ؎

وکاں الإیواں مں عحب الصنعة
حوب فی حنب ارعن حس
مشمخر نعلو له شرفات
رفعت فی رؤوس رصوی وقدس
لیس یدری صنع انس لجنّ
سکنوه أم صنع جنّ لإنس

(اس کاخ شاہی کی تعمیر دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گویا اسے کسی پہاڑ کی بلند چوٹی سے تراشا گیا ہے۔ اس کی رفعت و بلندی سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس کی دیواروں کے کنگرے کوہِ رضوی اور کوہ قدس پہ اٹھائے گئے ہیں۔ نہ جانے اسے انسانوں نے جنّوں کی رہائش کے لئے تعمیر کیا ہے یا جنّوں نے انسانوں کے لئے۔)

آج تک طیسفون کے گاؤں کے جنوب میں ایوان مدائن کے آثار موجود ہیں جو کبھی نادرِ روزگار تھے اور اب بھی کھنڈرات کی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دنیا کی بلند ترین محراب بھی ہے۔ اس کے پہلوؤں میں چھ منزلہ عمارات کی دیواریں قائم ہیں

جن کی چوٹی کا حصہ محراب کی چوٹی سے متصل ہے۔ یہی طاق کسریٰ خسرو نوشیروان کا محل تھا۔

خسرو پرویز (۵۹۰۔۶۳۱ء) نے اس ایوان کی مرمت بھی کروائی تھی اور اس میں کئی ایک اضافے بھی کئے تھے۔ اس نے ہیروں اور جواہرات سے مزیّن ایک تہہ خانہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ پھر فرش بہار نامی ابریشمی فرش (جو زمرد اور جواہرات سے مرصّع تھا) ایوان میں ڈالا تھا۔ یہ فرش بعد میں حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں مال غنیمت کے طور پر مدینہ منورہ لایا گیا تھا۔ حضرت علیؓ کے مشورہ سے اسے ٹکرے ٹکرے کر کے تقسیم کیا گیا تھا۔

مسلمانوں کی ایک سیلاب کی طرح بڑھتی ہوئی افواج نے اس ایوان کا گھیراؤ کیا اور ۱۶ مارچ ۶۳۷ء کو اس پر قبضہ کیا۔ محل میں داخل ہوتے ہی مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے وہاں باجماعت نماز شکرانہ ادا فرمائی اور سورۂ دخان کی تلاوت فرمائی جس میں آل فرعون کے محلّات اور مال و متاع کا ذکر کرتے ہوئے خداوندِ قدوس نے اہل حق کو اس کی ملکیت عطا کرنے کا اعلان فرمایا ہے' جس پر نہ آسمان رویا نہ زمین نے ماتم کیا اور نہ ہی ان کو مہلت دی گئی۔ شیخ سعدی شیرازیؒ (متوفی ۱۲۹۱ء) نے کیا خوب فرمایا تھا ؂

چو صیتش در افواہِ دنیا فتاد
تزلزل در ایوانِ کسریٰ فتاد

(جب آنحضورؐ کی ولادت کی خبر لوگوں تک پہنچی تو ایوان کسریٰ میں زلزلہ آ گیا)

اہلی شیرازی (متوفی ۱۵۳۵ء) نے کہا تھا ؂

کسریٰ کہ چوں ہلال بود طاقِ کسریش
از طاقِ ابروی چو ہلالِ محمدؐ است

(خسرو نوشیروان یا خسرو پرویز جن کے لئے طاق کسریٰ کا محراب ایک ماہِ نو (ہلال) کا مظہر تھا وہ آج آنحضورؐ کے ابرو کے محراب کا نشان بن چکا ہے)

بالآخر ابھرتی ہوئی اسلامی عظمت کے سامنے یہ آثار بھی ماند پڑ گئے اور ان میں بسنے والے تاریخ کے صفحات میں گم ہو کے رہ گئے۔ مشہور ایرانی شاعر افضل الدین خاقانی (۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء) حج کی غرض سے جب ان کھنڈرات میں سے گزرا تو اس نے کیا خوب

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں
ایوانِ مداین را آئینۂ عبرت داں
(اے عبرت آموز دل اپنی آنکھیں کھول اور ایوان مدائن کو عبرت کا آئینہ سمجھ)
گفتی کہ کجا رفتند آں تاجورانِ اینک
زایشان شکم خاکست آبستن جاویدان
(تو نے کہا ہے کہ وہ شہنشاہ کہاں چلے گئے؟ وہ مٹی کے پیٹ میں ہمیشہ کے لئے گم ہو کر اس کو حاملہ کر گئے)

اسلام کی عظمت' آنحضور ﷺ کی بعثت' تہذیبوں کا زوال' خدا کے ابدی پیغام کے حقانیت کی منہ بولتی ہوئی تصویر کے روپ میں آج مرکزِ عراق میں ایوان کسریٰ واقعی عبرت کا مقام بن چکا ہے۔ ہمیں قرآن حکیم بار بار حکم دیتا ہے کہ ہم ماضی کے آثار میں گھوم پھر کر دیکھیں کہ ہم سے پہلی کتنی طاقتور قومیں خاک میں مٹ گئیں۔ ان اقوام میں سے جنہوں نے حق کی آواز پہ لبیک کہا وہ آج بھی اپنے عظیم اسلامی تشخص کے ساتھ زندہ ہیں۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!!

آمد بہار کی ہے . . . .

رحمت اللہ بٹر، مرکزی ناظم تربیت تنظیم اسلامی

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے اور یہ مبارک مہینہ ہم پر سایہ فگن ہونے والا ہے۔ اس موقع کی مناسبت سے ہمیں یاد کرلینا چاہئے کہ اس مہینے کی عظمت کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے روح اور جسم پر مشتمل مرکب وجود دیا ہے اور رب ہونے کے ناطے اس نے دونوں وجودوں کے لئے پرورش کا بندوبست کیا ہے۔ خاکی جسم کے لئے اس نے فرمایا: "هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" اور روحانی جسم کے لئے نورِ مبین بھیجا کیونکہ یہی روح انسانی کی اصل غذا ہے۔ رمضان المبارک کا قرآن مجید سے خصوصی تعلق ہے اور اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے روزوں کو انسانوں کے لئے فرض قرار دیا، وگرنہ روزے اگر کسی بھی مہینہ میں فرض کر دیئے جاتے تو روزہ کا مقصد تو حاصل ہو جاتا، لیکن پھر اس مقصد میں مزید افزونی ممکن نہ ہوتی۔ یعنی روزہ جو تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس تقویٰ کے ذریعے اس ہدایت ربانی یا نور ہدایت سے استفادہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" بنا کر نازل کیا ہے۔ اگرچہ قرآن مجید تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور ایسی ہدایت ہے جو ہر چیز کو واضح کر دینے والی ہے، لیکن وہ ہدایت حاصل اسے ہوگی جس میں طلب پیدا ہو اور یہ طلب پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔ جیسے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝﴾

اگر دیکھا جائے تو رمضان المبارک میں جو برکت رکھی گئی ہے وہ قرآن مجید ہی کی نسبت سے ہے کیونکہ قرآن وہ پارس ہے کہ جس سے بھی چھو جاتا ہے اس میں برکت پیدا کر دیتا ہے۔ دنوں میں سے جس دن میں قرآن مجید کے ذریعہ تذکر کا بندوبست کیا گیا وہ جمعۃ المبارک

بن گیا۔ جس رات میں قرآن مجید کا نزول ہوا وہ رات برکت میں ہزار مہینوں سے بڑھ گئی۔
جس مہینے میں وہ رات ہے اس کی برکت یہ ہے کہ

۱) اس میں ہر نیکی کم از کم ستر گنا اجر کی حامل ہو جاتی ہے۔
۲) یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا حاصل جنت ہے۔
۳) یہ باہم مسلمانوں میں اخوت و موانست پیدا کرتا ہے۔ اپنی بھوک پیاس سے دوسروں کی بھوک پیاس کا احساس پیدا ہوتا ہے اور سحری و افطاری اور صدقہ فطر کے ذریعہ دوسروں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔
۴) مومن کے رزق میں اللہ تعالیٰ فراوانی پیدا کر دیتا ہے اور روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار جتنا ہی اجر مل جاتا ہے، خواہ لسی کے ایک گھونٹ سے ہو۔
۵) جو کسی روزہ دار کو پوری افطاری کرواتا ہے اس کو روز قیامت حوض کوثر سے اس طرح سیراب کیا جائے گا کہ پھر اسے پورا دن پیاس نہ لگے گی۔
۶) اس میں کسی مزدور و غلام کے کام میں آسانی کرنا ہی آقا و اجیر کے لئے مغفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

چنانچہ یہ اللہ کی رحمت و برکت کو لوٹنے کا موقع ہے جس کا اگر انسان کو احساس پیدا ہو جائے تو پھر وہ اس کا شکر ادا کرے گا اور اس کی کبریائی کے گن گائے گا۔

رمضان المبارک کی اس برکت کے ساتھ ساتھ اب قرآن مجید کے بارے میں چند غور طلب باتیں ذہن نشین کر لیجئے۔

۱) یہ اس لئے نازل ہوا ہے کہ حصول برکت کے ساتھ ساتھ اس کی آیات پر تدبر کیا جائے اور اس سے نصیحت حاصل کی جائے، کیونکہ عقلمندوں کے لئے اس کی طرف خود قرآن مجید نے توجہ دلائی ہے۔ "كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ"
۲) انسان کی سب سے بڑی ضرورت اور احتیاج راہ مستقیم کی بازیابی ہے کیونکہ یہی سب سے مشکل معاملہ ہے جو انسان اپنی عقل سے معین نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہ اپنی نماز کی ہر رکعت میں اس کے لئے اللہ سے ملتجی ہوتا ہے کہ اسے راہ مستقیم دکھائے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی راہنمائی عطا کرے۔ اور قرآن مجید فرماتا ہے کہ قرآن مجید ہی وہ

کتاب ہے جس نے وہ راہ مستقیم انسان کو دکھائی ہے۔ اور یہی انسانوں کے لئے بہترین نعمت اور اس کی انسانی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔

۴) یہی ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے اور یہی بہترین خیر اور کامل نعمت ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ○﴾

۵) یہ سب سے اقوم (سیدھی ترین) راہ ہے اور اس راہ پر چلنے والوں کے لئے بشارت ہے کہ ان کی محنت کا اجر کبیر ملے گا۔ "اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ . ."

۶) قرآن مجید شریعت کے ساتھ ساتھ ایمان کا ذریعہ ہے "وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا . . وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ"

اب ذرا غور کیجئے مہبطِ وحی اور حاملِ قرآن ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں قرآن مجید کی عظمت :

۱) آپ ؐ نے فرمایا : ہر چیز کے لئے ایک شرف ہوتا ہے جس پر کوئی فخر کرتا ہے اور میری امت کا شرف قرآن مجید ہے۔

۲) ہر نبی اور رسول اپنی امت کے لئے وراثت چھوڑ کر جاتا ہے اور وہ وراثت ان کو ملتی ہے جو ان کے ساتھ تعلق والے ہوں۔

۳) قرآن مجید میں مشغول رہنے والے کو اللہ تعالیٰ اتنا فضل عطا کرتا ہے جتنا وہ اپنے سائلوں اور ذکر کرنے والوں کو بھی نہیں دیتا۔ "من شغله القرآن عن ذكری ومسئلتی اعطيته افضل ما اعطی السائلين وفضل كلام الله علی سائر الكلام كفضل الله علی خلقه" (ترمذی)

اب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خاص تعلق جو آپ کو رمضان اور پھر اس میں قرآن مجید سے تھا وہ بھی سمجھ لیجئے' تاکہ ہمارے اندر بھی اتباع کا جذبہ پیدا ہو اور ہم بھی اس ماہ میں کسی حد تک آپ کی اقتداء کرنے کی محنت کر سکیں۔

((كان النبی ﷺ اجود الناس بالخير وكان اجود ما يكون رمضان' كان جبريل يلقاه كل ليلة فی رمضان يعرض عليه النبی القرآن' فاذا لقيه جبريل

کان اجود بالخیر من الریح المرسلۃ))

اور دوسری حدیث میں ہے

((حین یلقاہ جبریل فیدارسہ القرآن))

دیکھئے یہ جبرائیل کے ساتھ دورۂ قرآن اور تدارسِ قرآن رات کے اوقات میں ہوتا تھا اور یہ قیامِ رمضان کے علاوہ ہے جو آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ان کی تو زبان بھی عربی تھی' پھر بھی وہ دورہ فرماتے' لیکن ہمیں تو لازماً اہتمام کرنا چاہئے کہ قیام کے علاوہ اس دورۂ قرآن کا بندوبست کریں تاکہ قرآن مجید کی ہدایت سے فائدہ اٹھائیں۔

اور آخری عشرہ میں تو یہ کیفیت ہوتی تھی کہ آپ ﷺ خود بھی ساری رات جاگتے تھے اور گھر والوں کو بھی جگاتے تھے۔

((اذا دخل العشر شدّ میزرہ واحی اللیل وایقظ اھلہ))

(متفق علیہ)

اس روزے اور قیام کے بارے میں فرمایا کہ یہ دونوں قیامت کے دن سفارش بنیں گے۔ قیامت کے دن روزہ کہے گا : اے رب' میں نے اسے دن میں کھانے اور شہوات سے روکا۔ قرآن کہے گا : میں نے اسے رات کو نیند سے روکا۔ اس لئے ہماری سفارش قبول فرمائیں۔ تو سوچئے کیا ہماری تراویح بھی ہمیں نیند سے روکتی ہے؟ وہ تو ہمارے معمول سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے اور کہاں قرآن کے ساتھ قیام کا معاملہ ہے!! تو وہ اس صورت میں ممکن ہے کہ جب رات کا اکثر حصہ اس کو سمجھنے اور پھر سننے میں گزرے تو وہ سفارش کا ذریعہ بن سکے گا۔ تو یہ ہے وہ رمضان کا روزہ کہ دن میں اپنی خواہشات نفسانی پر قابو پایا جائے اور رات کو روح کو نور قرآن سے غذا مہیا کی جائے تاکہ اس روح میں اللہ کا قرب پیدا ہو اور وہ کیفیت ہو جائے کہ "وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ" اور "اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ" یعنی روزہ کا اصل حاصل میرا قرب ہے' اور میں ہی اس کی جزا ہوں کہ انسان مجھے پالیتا ہے اور اس کا تعلق میرے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جیسے آپؐ نے فرمایا کہ "یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے اور اس پر شہادت حاصل کرو کہ اس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے"۔ اور یہ ہے اعتصام باللہ اور قربتِ رب جو اس سے حاصل ہوتا ہے۔

حضرت امام شاملؒ (۴)

امام شاملؒ کے حالات زندگی پر انگریزی زبان میں شائع ہونے والی کرنل محمد حامد کی کتاب کا ترجمہ و تلخیص

ترتیب و ترجمہ : اظہار احمد قریشی

ماہنامہ "میثاق" دسمبر ۷۹ء میں میرے مضمون کی قسط شائع ہوئی تو مجھے جناب میجر محمد اسماعیل نے کھاریاں چھاونی سے خط لکھا ہے کہ ان کے پاس لیسے بلانچ کی کتاب The Sabres of Paradise موجود ہے جو وہ مجھے تحفے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب میرے پاس پہلے ہی موجود ہے۔ چنانچہ میں نے اس کتاب سے استفادہ کا فیصلہ کر لیا ہے تاکہ کرنل محمد حامد صاحب کی کتاب میں جو کچھ نہ مل سکے اس کی تلافی کر لی جائے۔

میجر اسماعیل صاحب نے میری کتابوں کے سیٹ "اہل پاکستان کے لئے راہ عمل" کی بھی خواہش کی تھی۔ چنانچہ میں نے ان کو تین کتابوں کا سیٹ ارسال کر دیا ہے۔ حال ہی میں خبر تھی کہ چیچنیا والے ایک بڑا وفد حضرت امام شامل کی برسی کے موقع پر داغستان بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن روسی حکومت نے اجازت دینے سے انکار کر دیا جس پر خاصی تلخی ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام شامل کا مقام و مرتبہ اس سارے علاقے کے لوگوں کے دلوں میں ہے اور روسی حکومت بھی اس حقیقت سے کس قدر خائف ہے۔

شہنشاہ روس

جب شہنشاہ کو اس علاقے کے دورے میں حضرت امام شامل کا خط ملا تو وہ بہت ناخوش ہوا۔ فوجی مہمات کی پوزیشن اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ یہ جنگ ہر سال لمبی ہی ہو

رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سپاہیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسلحہ اور سامان جنگ کی ضرورت زیادہ ہی ہوتی جا رہی تھی۔ روسیو کے نزدیک ایشیائی لوگوں یعنی چیچنیا اور داغستان کے لوگوں میں غرور بڑھ رہا تھا۔ شہنشاہ نے ملاقے کے کمانڈر انچیف کو برخواست کردیا اور چند سینئر افسروں کے عہدے بھی گرا دیئے۔

شہنشاہ کی آمد کے موقع کی تقریبات جو کہ جشن کی مانند تھیں۔ ان کے دوران شہنشاہ نے یہ کہا کہ : "میرا تو کل دھیان اپنی فوج اور اس کے معاملات پر ہے۔"

شہنشاہ کو زنون ڈالی کے علاقے میں خوبصورت باغ بھی دکھلائے گئے۔ اس جگہ پندرہ سال بعد صرف سیاہ کھنڈرات ہی رہ گئے تھے۔ یہاں کا ملازم قتل کر دیا گیا تھا اور یہاں سے شہزادی اینا اور اس کا خاندان اغوا کر کے امام شامل ؒ کے گاؤں میں قید کر لیا گیا تھا۔ لیکن زار روس کی طبیعت متفکر ہی رہی اور وہ سیر و تفریح سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ شہنشاہ کو یہ تو احساس ہوا کہ اس علاقے کی فوج اور فوجی کارروائیاں روس کے دارالحکومت سینٹ پیٹرز برگ سے کنٹرول نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ مقامی فوجی انچارج کو پہلے سے زیادہ اختیارات دیئے گئے۔ اس ملاقے میں تین فوجی مہمات متعین کر دی گئیں جن میں سب سے بڑی وہ مہم تھی جو حضرت امام شامل کے خلاف حرکت میں لائی گئی۔ جنرل گراب اس مہم کا انچارج بنا۔ شہنشاہ روس نے رخصت ہوتے وقت مذہبی کتب کا یہ فقرہ دہرایا اور کہا کہ میں اس کا مطلب جانتا ہوں "روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی" (گویا اس کے حکم پر اس طرح عمل ہونا چاہیے)۔

معرکہ اکھلگو

۱۸۳۹ء کا اکھلگو کا محاصرہ اور روسیوں کی اس جگہ فتح، مریدوں کی جنگوں کا ایک اہم موڑ تھا۔ جو کچھ یہاں ہوا اس سے امام شامل ؒ کا عزم اس قدر پختہ ہو گیا کہ انہیں انتقام لینے کے ارادے سے کوئی چیز بھی نہیں روک سکتی تھی۔ اس کے بعد امام صاحب کی جنگ اس انتقامی جذبے کی وجہ سے تیز ہو گئی۔

مئی ۱۸۳۹ء میں امام صاحب اکھلگو میں مقیم ہو گئے اور وہاں قسمت پر بھروسہ کر

کے ناگز پر روسی حملہ کا انتظار کرنے لگے۔ امام صاحب کے لئے تو معاملہ خدا کے ہاتھ میں تھا۔ امام صاحب نے قلعہ بندی کے لئے جو کچھ کیا جا سکتا تھا کر دیا تھا۔ یہ جگہ قدرتی طور پر ناقابل تسخیر تھی۔ اس کے تین طرف بہت گہرائی میں دریائے اینڈی کوسو بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا اور یہ جگہ عمودی پہاڑوں کی چوٹیوں کے درمیان تھی۔ بلندی پر دو میدان تھے جن میں سے ایک پر اکھلگو قدیم تھا اور دوسرے پر اکھلگو جدید تھا۔ ان میدانوں کے اطراف میں عمودی بلند پہاڑ تھے جو جگہ جگہ نیچے دریا کی جانب جھکے ہوئے تھے۔ اس گاؤں کے دونوں حصوں یعنی اکھلگو قدیم اور اکھلگو جدید کے درمیان ایک انتہائی ڈراؤنا اور گہرا کھڈ تھا جس میں سے ایک چھوٹا دریا اشلہ بہتا تھا جو دریائے کوسو میں گرتا تھا۔ گاؤں کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک جانے کا راستہ ایک تنگ لکڑی کا پل تھا جو کہ دریا سے ستر فٹ اونچا تھا۔ بڑی توپوں کی ایجاد سے پہلے ایسی قلعہ بندی پر بڑا حملہ ناممکن تھا۔ چنانچہ امام صاحب نے اس جگہ کو مقابلہ کے لئے منتخب کیا۔ وہ اگرچہ پوری طرح مطمئن نہیں تھے تاہم راضی برضائے مولا کے اصول پر قانع تھے۔

امام صاحب کی کل فیملی ان کے گرد جمع تھی۔ ان کی والدہ، ہمشیرہ، ان کی بیوی فاطمہ اور بیٹا جمال الدین، ایک اور بیوی جاورت اور اس کا دو مہینے کا بیٹا سعید۔ جاورت کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے۔ وہ امام صاحب کی دوسری بعد کی بیویوں کی مانند نہیں تھی، جن میں سے زیدت سے شادی سیاسی بنیاد پر ہوئی تھی اور شوآنیٹ ایک جنگی قیدی تھی۔ امام صاحب کو اپنی بیوی فاطمہ سے بہت زیادہ محبت تھی اور وہ ایک نہایت درجہ تنگی اور عسرت میں گزر بسر کرنے والے تھے۔ چنانچہ جاورت سے شادی ان کی بیٹوں کی ضرورت کی بنا پر ہی ہو سکتی تھی جو جنگجو بنیں اور جنگ جاری رکھیں۔

روسی فوج کی پیش قدمی کی وجہ سے بہت سے علاقے کے لوگ، عورتیں اور بچے غیر متوقع طور پر اکھلگو میں جمع ہو گئے۔ امام صاحب کے نائبین نے کہا کہ اس غیر متوقع آمد کی وجہ سے ایک ہزار کے لگ بھگ مزید انسانوں کو خوراک دینی ہو گی تو امام صاحب گھبرائے نہیں۔ ان کے مطابق تو ہر چیز خدا کے ہاتھ میں ہے۔ امام صاحب نے مدافعانہ انتظامات کا معائنہ کیا اور ذکر و فکر کی خاطر مسجد میں چلے گئے۔ شام کے دھندلکے کے وقت

امام صاحب مسجد کی چھت پر چڑھ جاتے تھے اور مجمع کو ساتھ لے کر اپنا بنایا ہوا ایک ترانہ گاتے تھے۔ یہ ترانہ روایتی داغستانی ترانوں کی جگہ لینے کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ ایک سنجیدہ ترانہ تھا اور اس کا مقصد لڑنے والوں کے جذبات ابھارنا نہیں تھا۔

اے خدا ہمیں پیچھے ہٹنے سے بچا لے

ہمیں ہماری منزل مقصود تک پہنچا!

۲۹/ جون علی الصبح روسیوں نے حملہ کر دیا۔ دو تین گھنٹے میں دو روسی توپوں کو بلند چٹان کے پیروں تلے نصب کر دیا گیا۔ روسی کمانڈروں نے رضاکار سپاہی مانگ لئے جو بلندیوں پر جا کر اکھلگو کی دیواریں توڑ ڈالیں۔ یہ حکم روسی سپاہیوں کے لئے ناممکن تھا کیونکہ وہ اوپر سے آتی پتھروں اور جلتی ہوئی لکڑی کی بارش سے نہیں بچ سکتے تھے جو کہ مجاہدین ان پر برسا رہے تھے۔ جب بھی روسی سپاہی کچھ اوپر کی جانب بڑھتے تھے تو ان پر امام صاحب کے واچ ٹاور سے فائر آتا تھا۔ بلکہ ایسے موقعوں پر مجاہدین اپنا بارودی اسلحہ بچاتے تھے اور نہایت ہوشیاری اور کاریگری سے خنجر اور نیزے کمال نشانہ بازی سے پھینکتے تھے۔ رات ہونے تک ۳۵۰ روسی مر چکے تھے اور پہاڑی چٹان کا عمودی حصہ خون سے لال ہو گیا تھا۔ روسیوں کی جانب سے انتہائی بہادری سے بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ چنانچہ روسیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

قلعہ بندی کے اندر امام صاحب کے چند بہترین لڑاکا مجاہد شہید ہو گئے تھے۔ چار دن بعد روسیوں نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ انہیں کمک مل گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک نئی توپ ایسی پوزیشن میں نصب کر دی جو مجاہدین کی بندوقوں کی زد میں نہیں تھی۔ اس توپ کو بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کر اوپر چڑھایا گیا۔ اس توپ نے اکھلگو کی بیرونی دیوار کے پرخچے اڑا دیئے اور یہ ملبہ کا ڈھیر بن گئی جس کے نیچے بہت سے مجاہدین زندہ دب گئے۔ لیکن اکھلگو کی جانب سے مدافعت جاری رہی اور اس کوشش میں کوئی کمی نہ آئی۔ جب بھی روسی جرنیل یہ خیال کرتے تھے کہ فتح ہو گئی ہے اور اپنے آدمی بھیجتے کہ جا کر کھنڈرات پر قبضہ کر لیں تو انہیں نزدیک پہنچ کر زبردست مقابلہ درپیش ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ

نتیجہ نکالا گیا کہ قلعہ بندیوں کی صرف بیرونی دیوار کو نقصان پہنچا ہے' اندر تمام کچھ محفوظ ہے' اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ قلعہ بندیوں میں وافر خوراک تھی۔ اندر پانی کے کنوئیں تھے۔ چنانچہ مجاہدین بہت لمبے عرصہ تک محاصرہ برداشت کر سکتے تھے اور جو روسی عمودی چٹانوں پر چڑھ کر آتے تھے ان سے ایک ایک کر کے نمٹ سکتے تھے۔

۱۲/ جولائی کو روسی فوجوں کو مزید کمک پہنچ گئی۔ لیکن پوزیشن یہ تھی کہ حملہ کے لئے چاہے کتنی بھی فوج تھی اور کتنی بھی تعداد میں نشانہ باز اندھیرے میں بھیجے جاتے تھے ان میں سے بہت کم لوٹتے تھے اور یہ قلعہ نما چٹان ناقابل تسخیر تھی۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ کوئی تازہ حملہ کرنے سے پہلے اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں اور رسے ہونے چاہئیں جن کی مدد سے سپاہی اور توپیں اس مشکل علاقہ سے گزر سکیں۔ یہ انتظام کر کے روسی گولیوں کی بارش میں چلے تا کہ ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں سے وہ ایک مرتبہ پھر امام صاحب کی مضبوط قلعہ بندیوں میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔ روسیوں کا بہت زیادہ نقصان ہوا لیکن ایک ہفتہ کی دن رات کی مسلسل بمباری کے بعد جنرل گراب کو جاسوسوں کی رپورٹوں پر یقین آنے لگا جو کہتے تھے کہ لڑائی بس ختم ہونے والی ہے' اس لئے کہ امام صاحب کا نقصان جتنا سمجھا جا رہا تھا اس سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ جاسوس آوارہ قبائل کے لوگ تھے۔

قلعہ بندیوں کی بیرونی اور اندرونی دیواریں تباہ ہو چکی تھیں۔ اندر خوراک کی سپلائی کم ہو رہی تھی کیونکہ گودام کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ ضرورت کے وقت کام آنے کے لئے مویشی بھی موجود نہیں تھے کیونکہ ان کے لئے چارہ نہیں تھا۔ مجاہدین مسلسل بمباری کی وجہ سے تھک رہے تھے۔ اس کے علاوہ اب ان کے چاروں طرف غیر مدفون لاشیں تھیں۔ یہ بہت اہم تھا' کیونکہ لاشوں کی بدبو نے مجاہدین کو بہت پریشان کیا ہوا تھا' بلکہ یہ بدبو کبھی کبھی ہوا کے مناسب رخ ہونے پر نیچے دور روسی فوج کو بھی پہنچ جاتی تھی۔ اس گرمی کا سورج لاشوں اور زخمیوں پر چمکتا تھا اور مکھیاں زندہ لوگوں کو پریشان کرتی تھیں۔ دور دور سے گدھ بھی جمع ہو گئے تھے جو کھنڈرات پر غور و فکر کے انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پانی خراب ہو چکا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مُردوں کو دفنانے کے لئے کوئی

جگہ نہیں تھی۔

لیسلے بلانچ تعجب کا اظہار کرتی ہے کہ مسلمان قبائل موت کو اتنی معمولی چیز سمجھتے تھے لیکن یہ لوگ اپنے مردوں کو لڑائی کے میدان میں دفنائے بغیر نہیں چھوڑتے تھے اور اس حالت میں جبکہ وہ خود تو پہاڑوں پر سے چھلانگ لگا سکتے تھے لیکن وہ اپنے مردوں کو اس طرح پہاڑ سے نیچے نہیں پھینکتے تھے۔ چنانچہ لاشیں ڈھیر کی شکل میں جن پر کچھ چھوٹے پتھر پڑے ہوئے تھے بد نظمی کی حالت میں پڑی تھیں۔

جب جنرل گراب کو یہ غلط اطلاع ملی کہ امام صاحب فرار ہونے کے تیاریاں کر رہے ہیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ آخری حملہ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ فوج کے تین دستے روانہ کئے گئے۔ پہلا دستہ ایک سنگل قطار کی شکل میں ایک بہت تنگ راستہ پر چلا جس کے دونوں جانب گہرے کھڈ تھے۔ اس دستہ کے پاس سیڑھیاں اور دوسرا سامان تھا اور ان کی حفاظت کے لئے مقابل کی پہاڑیوں پر توپیں تھیں۔ لیکن سامنے کی عمودی چٹان جو بالکل بے ضرر محسوس ہوتی تھی وہاں سے ایک بڑا نقصان کرنے والا فائر اس دستہ پر آیا۔ اس فائر کے ہوتے ہی اس دستہ نے ایک چوڑے پلیٹ فارم کی سی جگہ پر پہنچنے کی کوشش کی۔ انہیں امید تھی کہ یہاں سے وہ قلعہ بندی کی اوپر کی دیواروں پر پہنچ جائیں گے۔ سٹاف آفیسرز کی دوربینیں جو نیچے سے دیکھ رہی تھیں ان کے مطابق یہ پلیٹ فارم حملہ کرنے کے لئے بہترین جگہ تھی۔ لیکن جب فوجی دستہ وہاں پہنچا بلکہ دستہ کے وہ لوگ پہنچے جو مجاہدین کی گولیوں سے بچ نکلے تھے تو وہاں یہ دستہ دو جانب سے مجاہدین کی گولیوں کی زد میں آگیا۔ مجاہدین کے مورچے چھپے ہوئے تھے اور روسی پوزیشن سے نظر نہیں آتے تھے۔

اب چھ سو روسی سپاہی جن میں سے نصف زخمی یا قریب المرگ تھے اس پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ دو طرف گہرے کھڈ تھے۔ ایک جانب عمودی پہاڑ تھا اور ان کا واپسی کا واحد راستہ گولیوں کی بوچھاڑ میں تھا۔ یہ جگہ مقتل بن گئی۔ مجاہدین نہایت آسانی سے نشانہ لے کر افسروں کو مار رہے تھے۔ سپاہیوں پر مجاہدین اپنا بارود ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے کہ یہ تو صبح تک تھکن اور موسم کی وجہ سے خود ہی ختم ہو جائیں گے۔

دوسرا فوجی دستہ دوسرے راستے سے آ رہا تھا۔ اس پر بہت سارے بڑے بڑے پتھر

اوپر سے لڑھکا دیئے گئے جن کے نیچے وہ کچلے گئے اور یہ پتھر اور مردہ فوجی راستہ میں ہی پڑے رہے بلکہ راستہ روک کر پڑے رہے۔

تیسرا دستہ جو ایک اور طرف سے آ رہا تھا اس نے کوشش کی کہ قلعہ بندیوں کے بیرونی استحکامات تک بغیر کسی مدافعت کو سر کئے پہنچ جائے۔ لیکن ایک جگہ ان پر اچانک عورتوں اور بچوں کے ایک ہجوم نے حملہ کر دیا جو کہ اوپر کے کھنڈرات میں سے نکلے تھے۔ عورتوں نے مردوں کے لباس پہنے ہوئے تھے تاکہ روسیوں کو یہ خیال نہ ہو کہ ان کے پاس مرد کم ہیں۔ یہ عورتیں تلواریں سونت کر دشمن پر پل پڑیں جبکہ بچے دونوں ہاتھوں میں خنجر تھامے روسیوں کی سنگینوں تلے چلے گئے تاکہ وہ روسی سپاہیوں کے پیٹ پھاڑ سکیں۔ جب یہ بچے گر جاتے تھے تو ان کی مائیں ان کے جسموں کو اٹھا کر نیچے آنے والے دشمن پر پھینکتی تھیں اور پھر خود بھی دشمن پر چھلانگ لگا دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ مزید روسی کمانڈروں کو پیچھے ہٹنا پڑا تاکہ وہ مزید تیاری کے بعد اگلا حملہ کریں۔

قلعہ بندیوں کے اندر حالات اتنے خراب نہیں تھے جتنے تاتاری جاسوسوں نے بیان کئے تھے۔ امام صاحب نے اپنے زخمیوں کو رات کے وقت دریائے کوسو کے پار پہنچا دیا تھا اور باہر سے امداد لینے کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ یہ امداد روسی نشانچیوں کی نظروں کے سامنے آ رہی تھی۔ امام صاحب کے آدمی رات کو رسوں کی مدد سے دور بہت گہرائی میں دریا ت کر پانی لے آتے تھے تاکہ کنوئیں کے خراب پانی کی جگہ اسے پی سکیں۔ ایسے حالات میں تو محاصرہ ساری سردی کے موسم میں جاری رہ سکتا تھا۔ یہ ظالم سردی اس علاقے میں برفانی ہوتی ہے جو روسیوں کے لئے سخت ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ (جاری ہے)

بقیہ : عرضِ احوال

بعد میں ۱۹۷۲ء سے بعض وجوہات کی بنا پر، جن کی تفصیل یہاں درج کرنا غیر ضروری بھی ہے اور نامناسب بھی، محترم ڈاکٹر صاحب اور مولانا مرحوم کے تعلقات میں وہ گرم جوشی نہ رہی اور باہمی فاصلہ بتدریج بڑھنے لگا۔ [1] یوں ۱۹۷۴ء میں ماہنامہ "میثاق" مولانا مرحوم کی سرپرستی سے محروم

[1] "وصل و فصل" کی یہ مکمل داستان محترم ڈاکٹر صاحب کی تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" کے حصہ دوم کے باب چہارم میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

ہو گیا ـــــ مولانا مرحوم نے اس جریدے کا نام "میثاق" کیوں تجویز کیا تھا' اس سوال کا جواب مولانا مرحوم کی ایک وقیع تحریر میں موجود ہے جسے افادہ عام کے لئے آئندہ اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

تفسیر قرآن کے ضمن میں مولانا مرحوم کی خدمات نہایت قابل قدر ہیں۔ اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ کے طرز تفسیر کو آگے بڑھاتے ہوئے' خصوصاً نظم قرآن کے حوالے سے مولانا نے تفسیر قرآن کے ضمن میں ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد ڈالی ہے۔ ان کی تفسیر "تدبر قرآن" قرآن حکیم کے طالب علموں کے لئے ایک قیمتی اثاثے کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک دو مقامات کے استثناء کے ساتھ کہ جہاں مولانا نے اسلاف کی متفقہ رائے سے ہٹ کر اپنی الگ رائے اور اپنا موقف پیش کیا ہے' بحیثیت مجموعی "تدبر قرآن" اردو تفاسیر میں ایک ممتاز مقام کی حامل ہے۔

مولانا کو عربی زبان و ادب پر عبور حاصل تھا۔ وہ ایک جید عالم ہی نہیں' صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ ان کی تحریریں نہایت مدلل اور انداز نگارش نہایت جاندار اور پر تاثیر تھا۔ ان کی دیگر تصانیف میں "دعوت دین اور اس کا طریق کار" بلاشبہ ایک معرکہ الآراء کتاب ہے جو مسلمانوں کے تحریکی لٹریچر میں ایک خصوصی امتیازی مقام رکھتی ہے ـــــ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی خطاؤں سے درگزر فرماتے ہوئے خدمت قرآنی کے ضمن میں ان کی کاوشوں کو شرف قبول عطا فرمائے' ان پر رحمتوں کی بارش نازل فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین یا رب العالمین OO

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد : ۴۷

شمارہ : ۲

شوال المکرم ۱۴۱۸ھ

فروری ۱۹۹۸ء

فی شمارہ -/۱۰

سالانہ زرتعاون -/۱۰۰

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت : 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون : 03۔02۔5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون : 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے اولاً اپنے خطاب عید میں اور بعد ازاں ۶ فروری کے خطاب جمعہ میں اس بات پر خصوصی زور دیا کہ حالات کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ ہر درد مند مسلمان پاکستان کو بچانے کی خاطر غلبہ و اقامت دین کے لئے میدان عمل میں نکل آئے۔ اس لئے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود اگر ہم نے اللہ کے ساتھ عہد شکنی اور اس کے دین کے ساتھ غداری کی روش برقرار رکھی تو شدید اندیشہ ہے کہ مملکت خداداد پاکستان کی سالمیت سنگین خطرات سے دوچار ہو جائے گی۔ انہوں نے ملکی حالات' بالخصوص خارجی حالات کے حوالے سے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانان پاکستان کو دعوت دی کہ وہ بے عملی کی موجودہ روش کو ترک کرتے ہوئے بلا تاخیر کسی بھی ایسی دینی جماعت میں ضرور شامل ہو جائیں کہ جو غلبہ و نفاذ اسلام کے لئے سرگرم عمل ہو۔ امیر تنظیم کے خیالات کا جامع خلاصہ' جن میں ملکی سیاسی صورتحال اور داخلی اور خارجی حالات کے حوالے سے بھرپور تبصرہ بھی شامل ہے' ان کے مذکورہ بالا خطابات کے "پریس ریلیز" کے ذریعے بخوبی سامنے آتا ہے۔

خطاب عید کا خلاصہ

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے مسلمانان پاکستان سے پرزور اپیل کی ہے کہ وہ ملکی و ملی معاملات کے ضمن میں لاتعلقی کا موجودہ رویہ ترک کر کے میدان عمل میں آئیں اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہو کر پاکستان کو بچانے میں اپنا کردار ادا کریں' کیونکہ اگر خدانخواستہ وہ بنیاد ہی نہ رہی جس پر پاکستان قائم ہوا تھا تو ہم بتدریج ملکی سالمیت اور خود مختاری سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ مسجد دارالسلام میں عید الفطر کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ملک اس وقت گوناگوں مسائل میں گھر چکا ہے۔ ایک جانب عالمی سیاست کا دباؤ ہے جو پاکستان کو بھارت کے سامنے سر جھکانے اور بھارت کا تابع مہمل بنانے کے درپے ہے۔ دوسری طرف بھارت میں بی جے پی اب ایک بہت بڑی سیاسی قوت کے طور پر ابھر رہی ہے جس کی پاکستان دشمنی کسی سے مخفی نہیں۔ چنانچہ وہ تقسیم ہند کے خاتمے کا کھلا ایجنڈا لئے سامنے آ چکی ہے۔ ادھر اندرونی طور پر پہلے ہی ہمیں بدترین معاشی بدحالی کا سامنا ہے جس کے باعث ملک پورے طور پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے رحم و کرم پر ہے۔ مزید تشویش ناک بات یہ ہے کہ

اس کے باوجود کہ موجودہ حکومت بھاری مینڈیٹ کی حامل ہے، ملکی سیاسی فضا بدستور دھندلاہٹ کا شکار ہے۔ اے این پی اور ایم کیو ایم جیسی قومیت پرست جماعتوں کے ساتھ موجودہ حکومت کے در پردہ نامعلوم کون کونسے معاہدے ہیں کہ جن کے باعث حکومت سیاسی بے عملی اور بوکھلاہٹ کا شکار نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بھارت کے ساتھ کشمیر کے منصفانہ تصفیہ، تعلقات کی بحالی اور باہمی تجارت کے فروغ کی اہمیت کا کوئی بھی حقیقت پسند شخص انکار نہیں کرتا، لیکن اس نوع کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اگر ہم نے دستور کی سطح پر قرآن و سنت کی مکمل اور غیر مشروط بالادستی کا اہتمام نہ کیا اور بھارت کے لئے دوستی کے دروازے کھول دیئے تو ہمارا یہ طرز عمل قومی خودکشی کے مترادف ہو گا اور ہم ہمیشہ کے لئے اپنا جداگانہ تشخص کھو بیٹھیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی کسی نہ کسی دینی جماعت میں شامل ہو کر اس ملک کا حقیقی بہی خواہ ہونے کا ثبوت دے۔ انہوں نے کہا کہ وقت کی نزاکت کے پیش نظر اب ہمیں یہ انتظار ختم کر دینا چاہئے کہ پہلے تمام دینی جماعتیں اکٹھی ہوں تو ہم آگے بڑھیں۔ ہمیں اپنی اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہئے۔ اگر تمام دینی جماعتیں خلوص و اخلاص کے ساتھ غلبہ و اقامت دین کے ہدف کے لئے جدوجہد کریں گی تو ایک وقت آئے گا کہ ان شاء اللہ یہ سب اسلامی نظام کے قیام کے لئے متحد ہو جائیں گی۔

جمعہ ۶/ فروری کا خطاب

امریکہ ہر قیمت پر اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے بھارت کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے، چنانچہ موجودہ امریکی پالیسی کا اہم ترین ایجنڈا پاکستان کو بھارت کا تابع مہمل بنانا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک کو اس وقت شدید قسم کے خارجی دباؤ اور داخلی خلفشار کا سامنا ہے چنانچہ اگر جلد حالات میں مثبت تبدیلی نہ آئی تو خطرہ ہے کہ پاکستان کسی عظیم سانحے سے دوچار نہ ہو جائے۔ انہوں نے کہا ہے کہ نواز شریف حکومت کی جانب سے امریکہ کے دباؤ کی وجہ سے بھارت سے ہر قیمت پر دوستی کی "کمٹمنٹ" کا اظہار ملک و ملت کے خیر خواہوں کے لئے زبردست تشویش کا باعث ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ نواز شریف حکومت کی طرف سے اے این پی اور ایم کیو ایم کی غیر معمولی پذیرائی سے قومیت پرست عناصر کو تقویت حاصل ہو رہی ہے جو ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی کے اعتبار سے ہرگز خوش آئند نہیں ہے۔ نواز شریف اپنے بھاری مینڈیٹ کو بھاری تر مینڈیٹ میں بدلنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں، چنانچہ پارلیمنٹ کو "ربڑ سٹیمپ" بنا دیا گیا ہے اور مملکت کے

(باقی بیک ٹائٹل کے اندرونی صفحہ پر)

انقلابی تربیت کا نبویؐ منہاج

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن)

تُو خاک میں مِل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ' تعمیر نہ کر!

انقلابی جماعت کی تشکیل و تنظیم کے بعد اگلا مرحلہ افراد کی تربیت کا ہے۔ کیونکہ کچے پکے لوگوں کو جمع کر کے اگر کوئی کام شروع کیا جائے' خاص طور پر انقلاب کا کام جہاں تصادم کا شدید ترین مرحلہ بھی آتا ہے تو ظاہربات ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی ناکامی کا سبب پہلے ہی سے خود فراہم کر لیا ہے۔ اس لئے کہ کچے پکے لوگوں کے ہاتھوں کامیابی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اس کام کے لئے بہت پختہ اور بہت مضبوط لوگ درکار ہیں ——— اسی کو علامہ اقبال نے یوں کہا ہے کہ ؂

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

یعنی پختہ ہونا لازم ہے۔ خام لوگوں سے کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر ریت کے بڑے بڑے گولے بنائے جائیں اور پھر انہیں کسی دروازے یا کھڑکی کے شیشے پر پوری قوت سے دے ماریں تو شیشے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس میں تو بال بھی نہیں پڑے گا' البتہ پھینکے ہوئے ریت کے گولے بکھر جائیں گے۔ لیکن اسی ریت کو بھٹی میں پکا کر پختہ اینٹ بنا لیں' پھر اس اینٹ کو شیشے پر پر دے ماریں تو نتیجہ برآمد ہو گا کہ شیشہ کھیل کھیل ہو جائے گا ——— علامہ نے بڑے ہی پیارے اور بڑے ہی مؤثر انداز میں اسے فارسی میں خوب ادا

گیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس میں ۳+۳ کے مراحل کو ایک ایک مصرع میں سمو دیا ہے ؎

با نشّۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

پہلا مرحلہ ہے تیاری کا۔ اس کے لئے درویشی چاہئے۔ خاک میں ملنا پڑے گا' آگ میں جلنا ہوگا' آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزرنا پڑے گا' نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنا ہوگا۔ ان سب سے گزر کر پھر جب پختہ ہو جاؤ تو پھر اپنے آپ کو سلطنتِ جم پر دے مارو۔ یعنی اسلام یہ بھی نہیں چاہتا کہ بس اپنی ذاتی اصلاح ہی کو مقصود و مطلوب بنالو۔ یہ نہ ہو کہ خانقاہی مزاج ہی پختہ تر ہوتا چلا جائے اور میدان میں آنے کا مرحلہ ہی نہ آئے بلکہ وہ نظروں سے بالکل اوجھل ہو جائے۔ باطل سے تصادم کے لئے تیاری بھی بہت ضروری ہے' بغیر تیاری کے میدان میں آگئے تب بھی ناکامی ہے۔ لیکن اگر محض تیاری ہی ہوتی رہے۔ باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے کا خیال بھی دل میں نہ آئے تو وہ تیاری بے کار ہو جائے گی[1]

اس تربیت کے ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ محض انقلاب نہیں اسلامی انقلاب کی تیاری ہے' اس لئے کارکنوں کی روحانی اور اخلاقی تربیت ضروری ہے۔ جب تک وہ ان دونوں اقدار کا پیکر نہ بن جائیں تو پیش نظر انقلاب میں کہاں سے وہ اقدار آجائیں گی اور کہاں سے وہ اَبعاد (Dimensions) آجائیں گے جو اس نظام کے لازمی اجزاء میں سے ہیں جو قائم کرنا مطلوب ہے۔ لہٰذا بنیادی طور پر فرق واقع ہو جائے گا۔ ایک تربیت وہ ہے جو کسی دنیوی اور مادی انقلاب کے لئے کافی ہے اور ایک تربیت وہ ہے جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

---

[1] اس موضوع پر ارمغانِ حجاز میں علامہ اقبال کے یہ اشعار بھی نہایت موزوں ہیں ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی — یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری
شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

(مرتب)

انقلابی تربیت کا ہدف

اب جو حزب اللہ وجود میں آئے گی اس کے متعلق پہلے یہ سمجھنا ضروری ہو گا کہ اس حزب اللہ کے سامنے ہدف کیا ہے؟ اگر ہدف اسلامی انقلاب ہے تو پھر لازماً یہ غور کرنا ہو گا کہ اس کے لئے کس قسم کے کارکن درکار ہیں اور وہ نقشہ کیا ہے جس کے مطابق کارکنوں کو جدّوجہد کرنی ہے! ظاہر ہے کہ کسی مہم کے لئے ایک ہدف (Target) معین کیا جاتا ہے' پھر اسی کی مناسبت سے اسباب و وسائل مہیا کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی طے کرنا ہوتا ہے کہ اس مہم کے لئے کس نوع کے اوصاف اور صلاحیتیں رکھنے والے کارکن اور کس قسم کی سیرت و کردار کے لوگ درکار ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی قرآن پاک سے واضح راہنمائی ملتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے . کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ "اللہ والے بنو"۔ جب تک اللہ والے وجود میں نہیں آ ئیں گے' اسلامی انقلاب کا کوئی سوال نہیں۔ محض عسکری تربیت ہو' محض ڈسپلن کی عادت ہو اور محض چلت پھرت اور حرکت ہو' تو ان چیزوں سے انقلاب نہیں آتا۔ خواہ ان چیزوں کی وجہ سے کسی خاص وقت میں کوئی سماں بندھ جائے اور لوگ مرعوب ہو جائیں ــــــ لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ اس کام کے لئے اللہ والے درکار ہیں' یعنی رِبِّیُّوْن ــــــ فرمایا گیا : وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ــــــ "اور کتنے ہی انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر "رِبِّیُّوْن" یعنی اللہ والوں نے جنگ کی ہے' تو وہ ان مصیبتوں کی وجہ سے جو انہیں اللہ کی راہ میں پہنچیں نہ پست ہمت ہوئے' نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ انہوں نے دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے۔"

اس آیت میں جو لفظ "وَهَن" آیا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ اس کے معنی ضعف کے ہیں۔ اب یہی لفظ ضعف اس آیت میں آگیا ہے' ساتھ ہی "اِستکانۃ" کا بھی لفظ آیا ہے جس کے معنی بھی کمزوری کے ہیں۔ اگرچہ ان تینوں الفاظ میں کمزوری کا مفہوم مشترک ہے' لیکن ان تینوں میں ایک باریک اور نازک سا فرق بھی ہے۔ موت سے خوف

اور زندگی سے محبت دل میں جو کمزوری پیدا کرتی ہے وہ "وھن" ہے۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔[1] جسمانی کمزوری اور قوتِ ارادی کی کمزوری سے عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا ہے وہ "ضعف" ہے۔ جبکہ حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کی کمزوری اور بزدلی "اِستِکانَۃ" ہے۔ چنانچہ اس آیت سے یہ بات واضح ہوئی کہ انبیاء علیہم السلام کے حَوارِیّین جہاں شجاع، بہادر اور جنگجو تھے اور کسی قسم کی کمزوری اور بزدلی ان کے پاس پھٹکی بھی نہیں تھی، وہاں وہ "رِبِّیُّون" یعنی اللہ والے بھی تھے۔ بلکہ اگر آیت کے اسلوب کے پیش نظر یہ مفہوم لیا جائے کہ ان میں شجاعت، پامردی، جان نثاری کے اوصاف پیدا ہی اس باعث ہوئے تھے کہ وہ "رِبِّیُّون" تھے، اللہ والے بن چکے تھے، اللہ کی راہ میں جان دینا ان کو زندگی سے عزیز تر ہو گیا تھا، تو یہ بھی صحیح ہو گا۔ پس معلوم ہوا کہ اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کا اولاً اللہ والا ہونا لازمی ہو گا اور یہی لِلّٰہیت ان میں وہ بہادری، دلیری اور حوصلہ مندی پیدا کرے گی کہ وہ اپنے سے دوگنا نہیں، دس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد کی کفار کی فوج سے بھی پروانہ وار ٹکرائیں گے۔ ان کو اللہ کی راہ میں گردن کٹانے کی آرزو اور تمنا سے عزیز تر کوئی چیز نہیں ہو گی۔ اگر صرف عسکری قوت ہی ہے، صرف مادی تربیت ہی ہے اور صرف تنظیم ہے، لیکن اللہ سے تعلق کمزور ہے تو وہ کام نہیں ہو گا جسے اسلامی انقلاب، اعلائے کلمۃ اللہ، اقامتِ دین اور اظہار دین الحق علی الدّین کلّہٖ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی انقلاب کے لئے جہاں تنظیم ضروری ہے اور اس میں انتہائی مضبوط ڈسپلن ضروری ہے، وہاں اس تنظیم کے کارکنوں میں "رِبِّیُّون" یعنی اللہ والے ہونے کے اوصاف لابدّ منہ ہیں۔ ان اوصاف کے بغیر محض تنظیم اور محض ڈسپلن اسلامی انقلابی عمل کے لئے ہرگز کفایت نہیں کریں گے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب انقلاب اسلامی کے بین الاقوامی مرحلہ کی تکمیل کے لئے جنگیں ہو رہی تھیں تو دو بڑے بڑے محاذ کھل گئے تھے۔ ایک شام کا محاذ اور دوسرا ایران کا محاذ —— ایران کی افواج کے سپہ سالار رستم نے

---

[1] مشکوٰۃ، باب تغیر الناس، ص ۴۵۹

چند ایرانی جاسوس بھیجے کہ مسلمانوں کی فوجوں کے حالات معلوم کریں اور رپورٹ دیں تاکہ اندازہ ہو کہ ان کے عزم و ہمت اور حوصلہ وولولہ (Morale) کا عالم کیا ہے؟ ان کا رنگ ڈھنگ کیا ہے؟ ان کے شب و روز کیسے ہیں؟ بے سرو سامان اور لوٹ مار کی خوگر اس عرب قوم کی کایا پلٹ اور قلب ماہیت کے اسباب کیا ہیں؟ سامان جنگ ان کے پاس کس درجہ کا ہے؟ رسد رسانی کے انتظامات کیا ہیں؟ فوجوں کی اصل تعداد کیا ہے؟ وغیرہ۔ تاکہ وہ اس تحقیق کی روشنی میں اپنے لئے جنگ کی حکمتِ عملی مرتب کر سکے۔ ان تحقیقات سے یقیناً مدد ملتی ہے اور اگر کسی سمت میں کمزوری یا ضعف نظر آجائے تو اس سے حریف بھرپور فائدہ اٹھانے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ ان جاسوسوں نے مسلمانوں کے لشکر میں گھوم پھر کر حالات معلوم کئے۔ اس کے لئے انہوں نے کیا بھیس بدلا ہوگا اور کیا کیا پاپڑ بیلے ہوں گے' اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہرحال انہوں نے واپس جاکر رستم کو جامع ترین الفاظ میں جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ یہ عجیب لوگ ہیں : هُمْ رُهبَانٌ بِاللَّيلِ وَفُرسَانٌ بِالنَّهارِ۔ "یہ رات کے راہب اور دن کے شہسوار نظر آتے ہیں"۔ ان کی راتیں اپنے اللہ کے حضور میں قیام و سجود' الحاح وگریہ اور دعاو مناجات میں بسر ہوتی ہیں۔ ان کی ڈاڑھیاں اور ان کی سجدہ گاہیں خشیتِ الٰہی کے آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں ـــــ اور یہی لوگ دن کو شہسوار اور جنگجو نظر آتے ہیں اور میدان جنگ میں برق کی مانند کوندتے' لپکتے' جھپٹتے ہیں اور اس راہ میں گردن کٹا دینے کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے ہیں ـــــ جبکہ دنیا آج تک فوجیوں کے جن طور طریقوں سے واقف چلی آرہی ہے وہ تو یہ ہیں کہ ان کی راتیں شراب وکباب اور شباب سے کھیلنے میں بسر ہوتی ہیں۔ جس بستی یا اس کے گردو نواح میں کسی فوج کا پڑاؤ ہو جائے تو کیا وہاں کسی جوان خاتون کی عصمت محفوظ رہ سکتی ہے؟ لیکن وہ ایسے انوکھے' نرالے اور عجوبۂ روزگار سپاہی تھے کہ ان کی شخصیت کے یہ دو رخ "رُهبَانٌ بِاللَّيلِ وَفُرسَانٌ بِالنَّهارِ" اتنے ظاہر و نمایاں تھے کہ غیر مسلم ایرانی جاسوسوں کو بھی نظر آگئے۔

تو یہ جو دو متضاد کیفیات کو جمع کر دیا ہے درحقیقت یہ تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کمال ہے۔ اس زمانے میں ان دونوں اقسام کے لوگ موجود تھے۔ شام و فلسطین

کے علاقوں میں راہب اور راہب خانے بڑی کثرت سے موجود تھے۔ ایران اور روما اُس وقت کی دو عظیم ترین سلطنتیں تھیں اور ان کے درمیان وقفہ وقفہ سے سالہا سال تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ چنانچہ ایرانی' راہبوں اور ان کے روز و شب کے معمولات سے خوب واقف تھے۔ بحیرہ راہب کا نام سب نے سن رکھا ہے جس نے حضور ﷺ کو بچپن میں پہچانا تھا ــــــ جب آپؐ ابو طالب کے ساتھ ایک تجارتی قافلہ میں شامل ہو کر شام تشریف لئے گئے تھے ــــــ کہ آپؐ نبی آخر الزماں ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ اس راہب کا کتنا علم اور کتنا فہم ہو گا! اسی طریقہ سے حضرت سلمان فارسیؓ کی داستان میں کئی راہبوں کا ذکر آتا ہے۔ اور ایک راہب ہی نے' جبکہ وہ بستر مرگ پر تھا' حضرت سلمانؓ کے یہ پوچھنے پر کہ آپ کے بعد میں کس کے پاس جاؤں؟ کیونکہ تلاش حقیقت کی میری پیاس ابھی بجھی نہیں ہے اور آپ کے انتقال کا وقت آگیا ہے' تو اسی نے بتایا تھا کہ کھجوروں کی سرزمین میں آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ اس طرح ایرانی' راہبوں سے خوب واقف تھے اور یقیناً ان میں چند بڑے خدا رسیدہ راہب تھے۔ لیکن وہ راہب' دن کے بھی راہب تھے اور رات کے بھی راہب۔ ان کے ہاتھ میں تلوار کبھی نظر نہیں آسکتی۔ وہ کسی میدان جنگ میں لڑتے ہوئے نظر نہیں آسکتے۔ اسی طرح ایرانی جنگی سپاہیوں سے بھی واقف تھے۔ اُس دور میں سلطنتِ روما اور سلطنتِ کسریٰ کی لاکھوں کی تعداد میں وقت کے اعلیٰ ترین اسلحہ سے لیس اور بہترین تربیت یافتہ عسکری قوت موجود تھی' اگرچہ عرب اُس وقت ان دونوں چیزوں سے نابلد تھے ــــــ پھر تعداد کے تناسب کا یہ عالم تھا کہ دورِ نبوت میں جنگِ مُوتہ کے موقع پر مسلمانوں کے تین ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں رومیوں کی ایک لاکھ کی فوج آگئی تھی۔ تو ان دونوں مملکتوں کے پاس لاکھوں کی تعداد میں فوجیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ لیکن مسلمان مجاہدین کا عالم یہ تھا کہ ع "تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا۔"

جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا یہ کمال ہے کہ ان دو متضاد چیزوں کو ایسے جمع کیا ہے کہ مسلمان رات کے راہب ہیں اور دن کے مجاہد اور مرد میدان ہیں۔ اور جب تک یہ دونوں اوصاف جمع نہیں ہوں گے وہ اسلامی انقلاب کبھی نہیں آئے گا جو

اصل مقصود ہے' اور جو برپا فرمایا تھا نبی اکرم ﷺ نے ——— اور یہ اصل میں نتیجہ تھا حضور ﷺ کی تربیت کا کہ اہل ایمان "رُھْبَانٌ بِاللَّیْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّھَارِ" کا ایک ایسا مرقع بن گئے تھے جو دشمنوں کو بھی چشمِ سر سے نظر آتا تھا۔

خانقاہی تزکیہ و تربیت

تربیت و تزکیہ ہی کے مقصد کے لئے بنو امیہ کے دور ہی میں راہبانہ اور خانقاہی نظام بنا تھا جو بہت مؤثر رہا ہے اور اس نے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن وہ نظام انقلابی کارکن پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ نظام اُس وقت بنا جب اسلامی حکومت قائم تھی۔ اگرچہ اس میں ایک خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ اسلام کے نظامِ خلافت کا یہ اصول کہ جو بھی خلیفہ بنایا جائے وہ کسی خاندانی اور قبائلی تعلق کی بنیاد پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مشورے سے بنایا جائے' ختم ہو گیا تھا۔ لیکن بہرحال پوری اسلامی مملکت میں اسلامی قانون رائج تھا' فقہاء تھے' مفتی حضرات تھے' قاضی تھے' عدالتیں تھیں اور اسلام کا پورا دیوانی اور فوجداری قانون رائج تھا۔ حدودُ اللہ جاری تھیں' تعزیرات کا اجراء ہو رہا تھا۔ قاضی حضرات بڑے بڑے باجبروت خلفاء بلکہ صحیح تر الفاظ میں ملوک و سلاطین کو مدعٰی علیہ یا شاہد کے طور پر عدالت میں حاضر ہونے کے پروانے جاری کر دیتے تھے۔ حکومت کی سطح پر زکوٰۃ، عشر اور خراج کی تحصیل و تقسیم کا انتظام موجود تھا۔ معاشی ناہمواری اور فرق و تفاوت بہت کم تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کا اٹل اصول نہ صرف تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ اس دائرے کے اندر اندر قانون سازی ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے ہیئتِ اجتماعیہ کی صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔ ان حالات میں انقلابی طرز و نوعیت کی جدوجہد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہاں جو تربیت درکار تھی وہ یہ تھی کہ اچھے مسلمان وجود میں آئیں۔ خدا ترس لوگ معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ موجود رہیں۔ ایسے لوگ چشم سر سے نظر آئیں جن کی نگاہ میں دنیا کی حیثیت پرِکاہ سے بھی فروتر ہو اور آخرت ہی ان کا مطلوب و مقصود ہو۔ لوگوں میں امانت ہو' دیانت ہو' شرافت ہو' ہمدردی ہو' دمسازی ہو' دلوں میں خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں مسلمانوں کا نظامِ تربیت خالص خانقاہی طرز

اور مزاج کا بن گیا تھا ـــــ جس میں قلوب کا تزکیہ کیا جا رہا ہے' اذکار و اشغالِ مسنونہ کی تلقین کی جاری ہے' لوگوں کی نفسیات کے پیش نظر ان کو مختلف نفلی' مستحب اور مباح دینی وظائف کی تعلیم دی جا رہی ہے ـــــ اس لئے کہ پیش نظر انفرادی اصلاح تھی' کیونکہ مقبوضاتِ اسلامیہ میں اسلام کا اجتماعی قانون تو نافذ تھا' چنانچہ انقلاب کے لئے کارکنوں کی تربیت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کارکنوں کو اس اعتبار سے میدان میں لانے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا انقلابی تربیت اور انقلابی تصورات والا حصہ اس خانقاہی تربیت میں نہیں تھا۔

ان خانقاہوں کے تربیت یافتہ لوگوں یا ان سے متعلق حضرات کا چہار دیواری سے میدان میں نکل کر باطل کو للکارنا' اس سے نبرد آزمائی اور نظامِ حق کو قائم کرنے کے لئے تن من دھن لگا دینا یہ عنصر درحقیقت اس خانقاہی طرز کی تربیت کے مزاج میں شامل نہیں ہے ـــــ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنے کلام میں خوب واضح کیا ہے۔ ان کا یہ قطعہ بڑا پیارا ہے ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور

تو خانقاہی تربیت کا ہدف کچھ اور ہے' اس کا نتیجہ کچھ اور ہے' جبکہ انقلابی یا مجاہدانہ تربیت کا ہدف کچھ اور ہوگا اور اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا۔ جہاں انقلاب کی ضرورت نہیں وہاں وہ خانقاہی تربیت کافی ہے' لیکن جہاں پیش نظر انقلاب برپا کرنا اور غلبہ دین کی جدوجہد کرنا ہو تو ظاہر بات ہے وہاں وہ خانقاہی تربیت کافی نہیں ہوگی۔

اگر بالکل Objectively اور معروضی انداز میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا طریق تربیت کیا تھا! علامہ اقبال نے اسی فرق کو اس قطعہ میں واضح کیا ہے ؎

با وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اللہ اکبر کی تسبیح ایک مجاہد بھی کرتا ہے اور کسی خانقاہ میں بیٹھا ایک صوفی بھی کر رہا ہے۔ لیکن ان دونوں کی تسبیح میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اب دیکھئے الفاظ وہ استعمال کئے ہیں جو تصوف کے ہیں "خود آگاہ اور خدا مست"۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے آپ کو بھی پہچان چکے ہیں اور محبّتِ الٰہی میں مست بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن محبتِ الٰہی میں مست ہونے کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ آپ مجذوب ہو کر بیٹھ جائیں' آپ کی قوتِ عمل معطل ہو جائے۔ اور ایک محبتِ خداوندی وہ ہے کہ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر آپ میدان میں آئیں اور اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے اپنی گردن کٹوا دیں۔ اب یہ دو نتیجے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ لہٰذا ان کو علّامہ نے محولہ بالا قطعہ میں نمایاں کیا ہے۔

اس قطعہ کے ذریعے واضح طور پر فرق و تفاوت سامنے آجاتا ہے کہ ایک ہے مذہبی اور خانقاہی نظامِ تربیت اور دوسرا ہے انقلابی و مجاہدانہ نظامِ تربیت۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جو مجاہدانہ اور انقلابی تربیت ہے اس کا شاہکار ہے تربیتِ محمدی ﷺ۔ چنانچہ حضورؐ نے جن اصحاب کو تربیت دے کر تیار فرمایا وہ سربکف ہو کر میدان میں آگئے : يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ۔ "وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔" ان کے لئے گویا زندگی کی آخری تمنّا یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں گردن کٹ جائے' جان چلی جائے اور شہادت کی موت حاصل ہو جائے۔ ان کے دلوں میں اس سے بڑی آرزو اور کوئی نہیں ہے۔ اس ضمن میں قرآن حکیم کے چند حوالے ملاحظہ ہوں ـــــ سورۃ الفتح کے آخر میں فرمایا :

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ ﴾

"وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر

تا کہ غالب کرے اسے پوری جنسِ دین پر (پورے نظامِ حیات پر) اور اللہ کافی ہے بطورِ گواہ۔"

پورے نظام ہائے زندگی اور نظام ہائے اطاعت پر دینِ حق کا غلبہ ہی تو درحقیقت انقلابی عمل ہے۔ محمد ﷺ اپنے اس فرضِ منصبی کی ادائیگی میں جو کچھ کر سکتے تھے وہ کر گزرے تو اس کے لئے بطورِ گواہ اللہ کافی ہے۔ کسی اور کی گواہی کی آپؐ کو ضرورت نہیں ـــــ اگلی آیت میں فرمایا کہ یہ کام کون کریں گے' یا یہ کام کس نے کیا! فرمایا : "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ" یہ درحقیقت محمد ﷺ اور وہ لوگ' جو ان کے ساتھ ہیں' سب کی مشترکہ جدّوجہد اور سعی و محنت ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت کو کم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔ اللہ تعالیٰ تو انہیں اپنی کتابِ مبین میں اپنے رسول ﷺ کا مُعین قرار دے رہا ہے۔ غور کا مقام ہے اسلامی انقلاب اگر اکیلے رسول کے ذریعے سے ہو سکتا ہو تا تو کیوں نہ حضرت نوح علیہ السلام انقلاب برپا کر دیتے! لیکن رسول کے ساتھ ایک ایسی جمعیت اور جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جس کی رسول کے ساتھ Total Commitment ہو' جو اپنے آپ کو رسول کے مقصد کے لئے ہمہ تن وقف کرلے اور کامل تعاون و اعانت کا عملی مظاہرہ دکھادے۔ جہاں رسول کا پسینہ بہے وہ اپنے خون کی ندیاں بہادے۔ وہ رسول کے چشم و ابرو کے اشارے پر اپنی گردنیں کٹوا دینے کو اپنے لئے دنیا کی عظیم ترین نعمت و سعادت سمجھے۔ جب تک ایسے لوگوں کی جماعت و جمعیت موجود نہ ہو انقلاب نہیں آسکتا' اللہ کا دین غالب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی خصوصیت والی آیتِ مبارکہ : "هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا" سے متصلاً بعد فرمایا : "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ" ـــــ یہ ہے ان دونوں آیات کا باہمی ربط و تعلّق۔ یہ ہے نظمِ آیات جس میں معانی و مفاہیم اور حکم و بصائر کے کبھی ختم نہ ہونے والے خزانے موجود ہیں۔ یہ ہیں وہ جواہرات اور عجائبات جو قرآن و حدیث اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں معروضی طور پر تدبّر اور غور و فکر کرنے والے طالب علم کے

نصیب میں آتے ہیں۔

انقلابی کارکنوں کے مطلوبہ اوصاف

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ

سورۃ الفتح کی آخری آیت میں آگے چل کر پہلے ان لوگوں کی سیرت کے دو اوصاف اور دو ابعاد (Dimensions) بیان ہوئے جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہیں ۔

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ... ﴾

"محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں، کفار کیلئے نہایت سخت ہیں، آپس میں (مسلمانوں کے حق میں) نہایت نرم دل، شفیق، ہمدرد و دمساز ہیں۔"

اسی کو علامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے ۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم!
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

پس کسی انقلابی جماعت میں پہلا وصف "اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ" ہے۔ ایک انقلابی شخص یہ سمجھتا ہے کہ رائج الوقت نظام باطل ہے ـــــــ اب جو اس نظام سے وفاداری کا رشتہ رکھتا ہے، وہ چاہے باپ ہو، بیٹا ہو، بھائی ہو، یا کوئی اور رشتہ دار، ان کے ساتھ اس انقلابی کارکن کا کوئی تعلق نہیں رہ سکتا۔ اگر نظامِ باطل کی فرماں برداری و وفاداری کسی کے اندر ہے تو اس کے ساتھ ایک انقلابی شخص کے تمام روابط، تمام تعلقات حتیٰ کہ رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی، تمام محبتیں منقطع ہو جائیں گی۔

یہ کام تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے عملاً کر کے دکھایا۔ چنانچہ میدان بدر میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، کفار کے ساتھ تھے اور باپ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورؐ کے جلو میں سرفروشی کے لئے موجود تھے۔ عبدالمطلب کے ایک بیٹے عباس جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، کفار کے ساتھ اُدھر

اور ایک بیٹے حمزہ اَسدُ اللہ و اَسدُ رسولہٖ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ عتبہ بن ربیعہ سپہ سالارِ لشکرِ کفار اُدھر ہے اور بیٹے ابو حذیفہ بن عتبہ حضورؐ کے ساتھ ہیں ——— ماموں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اِدھر اسلامی لشکر کے ساتھ تھے اور بھانجا اُدھر کفار کے ساتھ تھا۔ اس طرح نہ معلوم کتنے قریبی رشتہ دار معرکۂ بدر میں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء تھے۔ تمام رشتے کٹ گئے۔ اب یہاں قرابت داری کا کوئی سوال نہیں۔ عبدالرحمٰن بن ابو بکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے ایمان لانے کے بعد حضرت ابو بکرؓ سے ایک موقع پر کہا "ابا جان! غزوۂ بدر میں آپ میری تلوار کی زد میں آگئے تھے، لیکن میں نے آپ کی رعایت کی۔" اس کے جواب میں حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں "بیٹے تم نے یہ اس لئے کیا کہ تم اُس وقت باطل کے لئے لڑ رہے تھے۔ خدا کی قسم اگر کہیں تم میری تلوار کی زد میں آگئے ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا' اس لئے کہ میری جنگ حق کے لئے تھی۔"

جنگِ یرموک کا ایک بڑا دل گداز واقعہ ہے جو "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کی بڑی نمایاں عکاسی کرتا ہے ——— ایک زخمی کی آواز آتی ہے العَطش العَطش۔ ایک مجاہد پانی لے کر اپنے زخمی بھائی کی طرف لپکتے ہیں کہ اچانک دوسری طرف سے ایک زخمی مجاہد کی آواز سنائی دیتی ہے العَطش العَطش۔ وہ زخمی کہتے ہیں کہ پہلے میرے اُس بھائی کی پیاس بجھاؤ۔ پانی لانے والے مجاہد اُس کے پاس پہنچتے ہیں کہ تیسری طرف سے آواز آگئی العَطش العَطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پانی پہلے اُس بھائی کے پاس لے جاؤ۔ وہ اُدھر لپکتے ہیں۔ پانی وہاں پہنچا نہیں ہے کہ زخمی کی روح پرواز کر گئی۔ وہ پلٹ کر دوسرے زخمی تک پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں وہ بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا۔ پہلے زخمی کے پاس آئے ہیں تو وہ بھی اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کر چکا۔ تینوں بغیر پانی پئے چلے گئے' لیکن سورۂ حشر کی آیت نمبر ۹ میں مومنین صادقین کے لئے جو الفاظ مبارکہ آئے ہیں : وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ("خواہ اپنے اوپر کتنی ہی تنگی ہو اہلِ ایمان اپنے دوسرے بھائیوں کو اپنے سے مقدم رکھنے والے ہوتے ہیں") یہ شہداء کرام اس کی عملی تصویر پیش کر گئے۔ پھر حضور ﷺ نے ہجرت کے بعد مہاجرین و انصار رضی اللہ

تعالیٰ عنہم کے درمیان جو مواخات قائم فرمائی ' تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

پس ان کی شخصیت کا ایک وصف تو یہ ہے کہ محبت کے ' دوستیوں کے ' قرابت داریوں کے پیمانے بالکل بدل گئے ہوں ــــــ اگر یہ نہیں ہو گا تو یہ جماعت انقلابی جماعت نہیں ہے۔ اِدھر بھی محبتیں ہیں ' اُدھر بھی تعلقات ہیں۔ دل یہ بھی چاہتا ہے کہ اسلام کا غلبہ ہو جائے لیکن جو لوگ باطل کی گاڑی کھینچ رہے ہیں ان سے بھی گاڑھی چھن رہی ہے اور دلی دوستیاں بھی نبھائی جا رہی ہیں ' تو ان طریقوں سے انقلاب نہیں آتا ــــــ تمام دلی محبتیں ' تمام ہمدردیاں ان لوگوں کے لئے سمٹ آئیں جو راہ حق میں ان کے ہم سفر اور ساتھی ہیں۔ یہ ہے ہمارے دین اور ایمان کا تقاضا اور یہ ہے اسلامی انقلاب کے کارکنوں میں مطلوب و مقصود پہلا وصف!

ان "رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ" کا اللہ کی نگاہ میں کیا مرتبہ ' کیا مقام اور کیا وقعت ہے اسے اس حدیثِ قدسی سے سمجھئے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ میدان حشر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکار ہوگی : اَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیْ اَلْیَوْمَ اُظِلُّھُمْ تَحْتَ ظِلِّیْ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلِّیْ ــــــ "کہاں ہیں وہ لوگ جو میرے جلال کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ آج کے دن میں ان کو اپنے عرش کے سایہ میں پناہ دوں گا کہ اِس دن میرے عرش کے سائے کے سوا کہیں اور کوئی سایہ نہیں ــــــ اس کی تائید اس حدیثِ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے : مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "جس نے کسی سے اللہ کے لئے محبت کی اور کسی سے اللہ ہی کے لئے علیحدگی اختیار کی اور کسی کو اللہ کی خوشنودی کے لئے دیا جو کچھ دیا اور اللہ ہی کی رضا کے لئے روکا جو کچھ روکا تو یقیناً اس شخص نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔"

ذوقِ عبادت اور شوقِ رکوع و سجود

دوسرا وصف (Dimension) یہ بیان ہوا : تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا "تم دیکھو گے ان کو رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے۔ وہ اللہ

کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں۔"

یہ دوسرا وصف ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھیوں کے معمولات کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔ اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کی تربیت کا یہ وہ رخ ہے جسے ایرانی جاسوسوں نے رہبانٌ باللیل سے تعبیر کیا تھا۔ حضر ہو کہ سفر ہو' امن ہو کہ جنگ ہو' ان اللہ والوں کے ان مشاغل میں فرق نہیں آتا تھا۔ ایک طرف عالم یہ ہے کہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے' اللہ کے باغیوں اور سرکشوں سے تمام دوستیاں' محبتیں' تمام رشتہ داریاں اور تعلقات ختم ہو چکے ہوں اور دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت

اسلامی انقلابی پارٹی کے وابستگان کا تیسرا وصف ہے جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جوش اور ولولہ ـــــ اور شہادت کی موت کی تمنّا اور آرزو۔

اللہ والوں کی اس انقلابی جماعت کے کارکنوں کے سامنے علائقِ دنیوی اور سامانِ زیست کی محبت کے مقابلہ میں اللہ' اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی اہمیت کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ جھڑکی واضح کسوٹی ہے کہ :

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾ (التوبہ : ۲۴)

(اے نبی ﷺ) ان سے کہہ دیجئے : اگر تمہیں اپنے باپ' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں' اپنے رشتہ دار' اپنے وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں' اپنے وہ کاروبار جن کے مندے کا تمہیں خطرہ اور اندیشہ رہتا ہے اور اپنے وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں (جو تم نے بڑے ارمانوں سے بنائے اور سجائے ہیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ

سے، اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے، تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے، اور اللہ ایسے فاسقوں اور نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔"

اس آیت کے اختتام کا جو اسلوب ہے اس کے پیش نظر "فَتَرَبَّصُوا..." کی ترجمانی اور تعبیر یوں مناسب ہے "جاؤ دفع ہو جاؤ اور انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ تم جیسے فاسقوں کے متعلق اپنا فیصلہ فرمادے"۔ غالباً اسی آیت سے تأثر لے کر علامہ نے اپنی مشہور نظم "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" میں یہ شعر کہا ہے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الّا اللہ!

پس اللہ والوں کی جماعت کے دو اوصاف تو وہ ہوئے جو سورۃ فتح کی آخری آیت کے اس ابتدائی حصہ میں آئے: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ تَرٰىہُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا"۔ لیکن اللہ والوں کی انقلابی جماعت کا تیسرا وصف جوشِ جہاد و ذوقِ شہادت ہے۔ اسی طرح ایک چوتھی Dimension مزید ہے۔ بلکہ ایک کامل نقشہ کے اعتبار سے اصل میں سورۃ المائدہ کی آیات ۵۴ تا ۵۶ نہایت جامعیت کی حامل ہیں جن میں سے آیت نمبر ۵۴ اہم ترین ہے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ...﴾

"اے اہلِ ایمان! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر گیا..."

پھر جانے میں ہٹ جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس سے ایک تو ظاہری ارتداد مراد ہے۔ یعنی کوئی اسلام ہی کو چھوڑ دے، کافر ہو جائے، کسی کذّاب مدعیٔ نبوت پر ایمان لے آئے ــــــ جیسے لوگ مسیلمہ پر ایمان لے آئے۔ ہمارے دور میں مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان لے آئے۔ ایک تو یہ قانونی اور ظاہری ارتداد ہے، لیکن ایک باطنی اور حقیقی ارتداد ہوتا ہے، یعنی منافقت ــــــ اندر سے کافر لیکن ظاہری طور پر مسلمان، قانونی اعتبار سے مسلمان۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی کی نمازِ جنازہ حضور ﷺ نے پڑھائی۔ بظاہر وہ

مسلمان تھا لیکن بباطن مرتد ہو کافر۔ اسی طریقے سے جو شخص بھی اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے میدان میں آتا ہے اور پھر اپنی جان کی محبت کی وجہ سے' رشتہ داروں کی محبت کی وجہ سے' مال و اسباب دنیا کی محبت کی وجہ سے پیچھے ہٹتا ہے ـــــ تو یہ بھی ارتداد ہے' اگرچہ یہ قانونی ارتداد نہیں ہے۔ جیسے منافق قانونی طور پر مرتد نہیں ہوتا' حقیقت کے اعتبار سے مرتد ہوتا ہے' اسی طرح وہ شخص ہے جو اقامتِ دین اور اظہار دین الحقّ علی الدّین کلّہ کی فرضیت کو سمجھ کر بھی دنیوی مفادات و تعلقات کی وجہ سے اس فریضہ کی ادائیگی سے جان چرا رہا ہے۔ اپنی جان پیاری ہے' یا مال پیارا ہے' یا دنیا پیاری ہے' لہٰذا پیچھے ہٹ رہا ہے تو یہ بھی در حقیقت ارتداد ہے' اگرچہ اس پر قانونی ارتداد کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا۔ انہی لوگوں کو یہاں للکارا جا رہا ہے : اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ـــــ یعنی ایمان کے مدعی ہو۔ جو کوئی بھی تم میں سے ارتداد اور پسپائی اختیار کرے گا وہ سن رکھے "فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ" اللہ تعالیٰ انہیں دفع کرے گا' انہیں Reject کر دے گا اور کسی دوسری قوم کو لے آئے گا ـــــ اور اس قوم کے ہاتھ میں اپنے دین کا جھنڈا تھمادے گا۔ وہ قوم اللہ کے دین کے قیام و نفاذ کے لئے مجاہدہ کرے گی' جس میں یہ یہ اوصاف ہوں گے۔ اب اسی آیت میں آگے چار اوصاف وارد ہوئے ہیں۔

پہلا وصف يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ "اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس (تعالیٰ) سے محبت کریں گے"۔ تو یہ اللہ کا تعلق ہے۔ اسی کا ایک مظہر ہے قیام اللیل ـــــ دوسرا وصف ہے اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ "اہل ایمان کے حق میں بہت نرم' کافروں کے حق میں بہت سخت"۔ یہ دونوں چیزیں تو وہی ہیں جو سورۂ فتح میں بایں الفاظ آئی ہیں : "اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" البتہ یہاں ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ یہاں تیسرا وصف آ رہا ہے "يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے الفاظ میں' یعنی وہ اپنی پوری قوتیں' ہمہ تن' ہمہ وجوہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے لگا دیں گے اور چوتھا وصف "لَا يَخَافُوْنَ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَآئِمٍ" کے الفاظ میں بیان ہو رہا ہے' یعنی اس کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ بددل اور خوف زدہ ہوں گے اور نہ ہی کوئی تاثر لیں گے۔

ہر قسم کی ملامت و مخالفت سے بے پروائی

یہ ملامت مخالفانہ بھی ہوتی ہے اور ناصحانہ بھی۔ لوگ ہمدرد بن کر کہتے ہیں : میاں اپنے Career کی فکر کرو' کچھ تو اپنے مستقبل کا خیال کرو' اپنی اولاد کے متعلق سوچو' بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں ـــــ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ پاگل اور دیوانے ہو گئے ہو؟ کہ بس ایک دُھن تم پر سوار ہو گئی ہے' کچھ تو سوچو اور اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ یہ ناصحانہ انداز کی مخالفت ہے۔ دوسری مخالفانہ انداز کی ملامت ہوتی ہے : شیخ چلی کے خواب دیکھ رہے ہو! صدیوں سے جے جمائے نظام کو بدلنے کے لئے کھڑے ہو رہے ہو؟ ہم نے اپنے آباء و اجداد سے جو نظام ورثہ میں پایا ہے اس کی مخالفت کر رہے ہو۔ کیا ہمارے اسلاف نادان تھے جو اس نظام کو قائم کر گئے اور کیا ہمارے موجودہ عمائدین و قائدین بیوقوف ہیں جو اس نظام کو چلا رہے ہیں؟ پھر ان کی سیادت و قیادت ہے' ان کا اثر و رسوخ ہے' ان کے ہاتھ میں قوت و طاقت ہے' ان کے مالی و معاشی مفادات اس نظام سے وابستہ ہیں۔ تم مٹھی بھر سر پھرے کیا تیر مار لو گے؟ ـــــ ان دونوں ملامتوں سے کوئی اثر لئے بغیر اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں' اپنی صلاحیتیں اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے لگانا' یہ ہے چوتھا وصف۔ جو لوگ یہ چاروں اوصاف اپنے اندر پیدا کر لیں گے ان کو اللہ نے "حِزبُ اللّٰہ" کہا ہے : "فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ" جن لوگوں کے اندر یہ بیان کردہ اوصاف پیدا ہو جائیں وہ لوگ حزب اللہ بن جائیں گے' یہ وہ پارٹی بن جائیں گے جن کی محبتیں بھی اپنے ہی دائرہ میں ہوں گی۔ وہ اللہ سے' اس (تعالیٰ) کے رسولؐ سے اور اہل ایمان سے محبت کریں گے۔ اور جن سے ان کی مخاصمت اور مخالفت ہو گی' مجاہدہ اور مجادلہ و مقاتلہ ہو گا وہ بھی صرف اور صرف اللہ اس کے رسول ﷺ اور دین الحق کی سربلندی کے لئے ہو گا۔ کوئی ذاتی غرض' کوئی ذاتی عداوت' کوئی ذاتی دشمنی' اس دنیا کا کوئی ذاتی مفاد ان کے پیش نظر نہیں ہو گا۔

ایسے لوگوں کے لئے پہلی نوید : "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝" ہے۔ یعنی جن لوگوں میں مطلوبہ اوصاف پیدا ہو جائیں تو "یہ ان پر اللہ کا فضل ہے' وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا

ہے"۔ انسان کی اس سے بڑی سعادت اور کون سی ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کے دین کے لئے جبکہ وہ غالب نہ ہو بلکہ سرنگوں ہو' خود جادۂ حق پر ثابت قدم رہ کر' اس راہ کی مشکلات و موانع کا مواجہہ کر کے اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اپنا تن من دھن لگاتا ہے۔ وہ نوع انسانی کو آخرت کے عذاب اور اللہ کے دین سے روگردانی کے باعث دنیا میں پیدا ہونے والی افراتفری اور فتنہ و فساد سے بچانے کے لئے اپنی توانائیاں' صلاحیتیں اور وسائل لگاتا ہے۔ اسے یہ توفیق بھی اللہ کے فضل سے ملتی ہے اور اللہ کا فضل غیر محدود ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ اس کے فضل کا اہل اور مستحق کون سا بندہ ہے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے : "فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝" اللہ کا اس حزب اللہ سے وعدہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہے گی ـــــ یہی بشارت اور یہی وعدہ سورۂ آل عمران میں بایں الفاظ فرمایا گیا : وَلَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ "اور نہ سست ہو نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔" سربلندی اور غلبہ کا وعدہ یہاں مشروط ہے حقیقی ایمان اور قلبی یقین سے' جس کا عملی مظہر ہے اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد ـــــ جیسا کہ سورۂ حجرات میں حقیقی ایمان کی تعریف میں فرمایا :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾

"مومنین تو صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر' پھر شک میں نہ پڑے اور جنہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے' اور ایسے لوگ ہی اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہیں۔"

ایسے مومنینِ صادقین' ایسے سرفروشوں اور جاں نثاروں کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے غلبہ اور سربلندی کا۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو وفا کرنے والا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ حزب اللہ کو جو تربیت درکار ہے اس کے ہدف مجاہدانہ کردار اور تعلق مع اللہ پیدا کرنا ہیں۔ اور جب تک ان کے اندر یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوں گی اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔

(جاری ہے)

"میثاق"

تحریر : مولانا امین احسن اصلاحی

میثاق کے بانی مدیر مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم و مغفور کی یہ قابل قدر تحریر اولاً جون ۱۹۵۹ء کے میثاق میں "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان کے تحت شائع ہوئی تھی۔

اس رسالے کا نام "میثاق" محض اتفاق سے نہیں رکھ لیا گیا ہے' بلکہ یہ نام سوچ سمجھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ نام بہت بڑی حد تک اس مقصد کو تعبیر کرتا ہے جو اس کے نکالنے سے پیش نظر ہے۔

لغت میں میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہوا کرتا ہے جو شعور اور ارادے کے ساتھ پورا کرنے کے لئے باندھا جائے۔ قرآن و حدیث میں اس کا مفہوم اس سے بہت بلند ہے اور چونکہ وہی مفہوم اس نام میں ہمارے پیش نظر ہے اس وجہ سے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ قرآن نے اس قسم کے دُو میثاقوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ان کی عقل و فطرت سے لیا ہے۔ اس میثاق کا ذکر سورۂ اعراف میں اس طرح فرمایا ہے :

﴿ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ﴾

(الاعراف ۰ ۱۷۲)

"اور یاد کرو جبکہ نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی ذُرّیت کو اور ان کو خود ان کے اوپر گواہ بنایا' پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے اقرار کیا کہ ہم گواہ ہیں کہ تو ہمارا رب ہے۔ یہ اس لئے ہوا تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس چیز سے بالکل بے خبر ہی رہے۔"

یہ خدا کی ربوبیت اور اس کی توحید کا میثاق ہے جو ہر انسان کی فطرت سے لیا گیا ہے اور اس پر ہماری عقل و فطرت گواہ ہے۔

دوسرا عہد و میثاق وہ ہے جو اسی میثاقِ فطرت کی بنیاد اور درحقیقت اسی کے تقاضوں اور مطالبات کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارے رب نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے ہم سے لیا ہے۔ یہ میثاق حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمدؐ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر اور رسول آئے ہیں سب نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی اپنی اُمتوں سے لیا ہے۔ یہ میثاق اپنی فطرت کے لحاظ سے ہے ایک ہی میثاق' لیکن چونکہ اس کی تجدید بار بار اور مختلف زمانوں میں ہوئی ہے اس وجہ سے ظاہر میں اس کے اندر تعدّد پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن مجید نے ان تمام میثاقوں کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ یہ میثاق اب اُمتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لیا جا رہا ہے' تو اس امت کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس میثاق پر خود بھی قائم رہیں اور دوسروں کو بھی اس کے اندر شامل کرنے اور ان کو اس پر قائم رکھنے کے لئے برابر اس کی شہادت دیتے رہیں۔ قرآن' جو اس میثاق کی آخری اور مکمل دستاویز ہے' اس حقیقت کی یاد دہانی ان الفاظ میں کر رہا ہے :

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ (المائدہ : ۷)

"اور تم اس فضل کو یاد رکھو جو اللہ نے تم پر فرمایا اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا' جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور قبول کیا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو' بے شک اللہ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔"

ایک جگہ فرمایا ہے :

﴿وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝﴾ (الحدید : ۸)

"اور اللہ نے تم سے میثاق لیا ہے اگر تم مومن ہو۔"

یہی میثاق ہے جو ان تمام حقوق و فرائض کو متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہم نے تسلیم کئے ہیں۔ یہی میثاق ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارے حدودِ کار کیا ہیں اور اگر ہم ان کے پابند رہیں تو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور اگر ہم ان کی خلاف ورزی کریں تو اس جرم کی سزا کیا دے گا۔ یہ عہد و میثاق یک طرفہ نہیں ہے بلکہ 'جیسا کہ ہر عہد و میثاق کی فطرت ہوتی ہے' یہ دُو طرفہ ہے۔ اگرچہ تمام کائنات کے خالق و مالک کی شان اس سے ارفع ہے کہ وہ اپنے بندوں اور غلاموں پر اگر کچھ حقوق و فرائض عائد کرے تو اس کے جواب میں خود اپنے اوپر بھی ان کے حقوق عائد کرلے اور اس چیز کو ایک معاہدہ اور میثاق کا درجہ دے دے' لیکن چونکہ اس نے ہمیں اختیار کی نعمت عطا فرمائی ہے' اس وجہ سے اس نے اس عہد و میثاق کو ہمارے اوپر یک طرفہ واجب نہیں کیا ہے بلکہ اپنے فضل و رحمت سے خود اپنے اوپر بھی اس میثاق کی ذمہ داری لی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے :

﴿اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝﴾

(البقرہ : ۴۰)

"تم اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے' میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے' تو تم مجھ ہی سے ڈرو۔"

اسی میثاق پر ہمارے رب کے ساتھ ہمارے تمام تعلقات قائم ہیں۔ اگر ہم اس پر قائم رہیں تو ہم اپنے رب کی وفادار رعیت اور اس کے اطاعت شعار غلام ہیں اور اس کی طرف سے ہمارے لئے فوز و فلاح اور غلبہ و نصرت کا وعدہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے

﴿وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا

عَظِيْمًا ۝﴾ (الفتح : ۱۰)

"اور جو ان باتوں کو پورا کرے گا جن کے لئے اس نے اللہ سے عہد کیا ہے تو اللہ اس کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔"

اور اگر ہم اس عہد کو توڑ دیں تو ہم اس کے نافرمان اور باغی ہیں اور اس جرم کی پاداش میں اس کی طرف سے ہمارے لئے لعنت اور دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی ہے' ارشاد ہے :

﴿وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝﴾ (الرعد : ۲۵)

"اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوطی کے ساتھ باندھ چکنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کے لئے لعنت اور برا ٹھکانا ہے۔"

یہود کے بارے میں فرمایا ہے :

﴿ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ... ﴾ (المائدہ : ۱۳)

"بوجہ اس کے کہ انہوں نے میثاق کو توڑا ہم نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور ان کے دل سخت کر دیئے۔"

نصاریٰ کے بارے میں فرمایا ہے :

﴿ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ .... ﴾ (المائدہ : ۱۴)

"اور ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان کا میثاق لیا تو جس چیز کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے تو ہم نے ان کے اندر اس کی پاداش میں قیامت تک کے لئے دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔"

یہ رسالہ اسی میثاق کی تذکیر و یاددہانی کے لئے جاری کیا گیا ہے اور اسی نسبت سے اس کا نام میثاق رکھا گیا ہے۔ جس طرح ہر باوفا اور ہر صداقت شعار کے لئے اس میثاق پر ہر طرح کے حالات کے اندر قائم رہنا ضروری ہے اسی طرح ہر صاحبِ علم اور ہر صاحبِ شعور کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو اس عہد و پیمان کی یاددہانی بھی کرتا رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے اس میثاق پر قائم رہنے کا بھی عہد لیا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کو اس سے آگاہ کرنے اور ان پر اس کی حجت تمام کرنے کا بھی عہد لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے :

﴿ وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوْحٍ وَإِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۖ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ ﴾ (الاحزاب : ۷)

"اور یاد کرو' جبکہ ہم نے نبیوں سے میثاق لیا اور تم سے اور نوح سے' ابراہیم سے' موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے' سب سے میثاق لیا' اور لیا ہم نے ان سے مضبوط میثاق۔"

اسی طرح اہل کتاب کے علماء اور پیشواؤں سے یہ عہد لیا گیا کہ جس کتاب اور شریعت کی پابندی کا انہوں نے اقرار کیا ہے اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ خود بھی قائم رہیں اور اس کی دفعات اور اس کے مضمرات دوسروں پر بھی آشکارا کرتے رہیں۔ فرمایا ہے :

﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ .... ﴾ (آل عمران : ۱۸۷)

"اور یاد کرو جبکہ اللہ نے اہل کتاب سے اس بات کا میثاق لیا کہ تم اس کو اچھی طرح لوگوں کے لئے واضح کرتے رہو گے۔"

یہ رسالہ اس فرض عظیم کو بلاامتیازِ مذہب عام انسانوں کے اندر بھی ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کے اندر بھی اس کو ادا کرنا چاہتا ہے اور ان

دونوں دائروں کے اندر ان کے فطری تقاضوں کے لحاظ سے اس کا طریق تذکیر و دعوت کسی قدر الگ الگ ہو گا۔

عام بنی نوع انسان کو یہ خدا کے میثاقِ ربوبیت کی بنیاد پر دعوت دے گا۔ اس میثاق کے اوپر گواہ' جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے انسان کی عقل و فطرت ہے۔ اس وجہ سے عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے اندر اس کی جو شہادتیں موجود ہیں ان کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے گی اور پھر زندگی کے اندر اس کے جو تقاضے ابھرنے چاہئیں ان کی نشاندہی کی جائے گی۔ جدید فلسفہ نے فکر و تحقیق کے ہر گوشے میں اگر ایک طرف حقیقت کو گم کر دینے والی بہت سی مزخرفات کا انبار لگا رکھا ہے تو دوسری طرف اس میں ایسے نشاناتِ راہ بھی پائے جاتے ہیں جن کی مدد سے اس کی پیدا کی ہوئی بہت سی الجھنوں کو دور بھی کیا جا سکتا ہے' بشرطیکہ ان کو اچھی طرح اجاگر کیا جا سکے اور قرآنی حکمت کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جا سکے۔ اس مقصد کے تحت اس رسالے میں جو مضامین شائع ہوں گے ان شاء اللہ وہ ان ذہنوں کے لئے تریاق کا کام دیں گے جو جدید فکر و فلسفہ سے متأثر یا مسموم ہیں اور جو ہر بات کو صرف عقل کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں۔

خاص مسلمانوں کے لئے اس رسالے کی دعوت ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَوْفُوا۟ بِٱلْعُقُودِ...﴾ (المائدہ : ۱) کی دعوت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کے واسطہ سے ہم نے اس کی جس آخری شریعت کی اطاعت اور پابندی کا عہد کیا ہے ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس شریعت کی پابندی کرے۔ یہ شریعت ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان ایک میثاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" کہہ کر اس میثاق میں شامل ہوئے ہیں اور ہماری بندگی اور وفاشعاری کا تقاضا یہ ہے کہ اس میثاق کے مطالبات پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کریں۔ یہی میثاق درحقیقت وہ حبل اللہ ہے جو ہمیں خدا کے ساتھ جوڑتی اور ہمیں دنیا و آخرت میں ان نعمتوں کا حق دار بناتی ہے جن کا خدا کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حبل اللہ ٹوٹ

جائے تو پھر خدا سے ہمارا تعلق ہی سرے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ہمیں قومی اور اجتماعی حیثیت سے جینے کی کوئی مہلت ملتی ہے تو اس کی حیثیت بس ایک مہلت کی ہے۔ یہ مہلت اس لئے نہیں ملتی کہ ہم عزت کے ساتھ جینے کے حقدار ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ سُنّت کے تحت محض اس لئے ملتی ہے کہ ڈوبنے کے لئے ہماری کشتی اچھی طرح بھر جائے۔ اس مہلت کے دوران میں اگر زندگی کے کسی گوشے میں چمک دمک کے کچھ آثار بھی نظر آئیں تو اس سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اس کی مثال مریض کے اس سنبھالے کی سی ہے جو وہ دم توڑنے سے پہلے لیا کرتا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ ــــ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا اقرار کر کے خدا سے کوئی عہد و میثاق باندھا ہے تو ان لوگوں نے باندھا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے' اس عہد و میثاق کی ذمہ داری ان لوگوں پر کس طرح عائد ہوتی ہے جو بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے؟ اس وسوسے سے اپنے ذہن کو پاک رکھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جب تک ہم اللہ کو اپنا رب' قرآن مجید کو اس کا صحیفۂ آسمانی' محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اپنا واجب الاطاعت ہادی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس اُمّت کا ہراول دستہ مانتے ہیں اس وقت تک ہم اِس سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کی ذمہ داری سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتے جس کا اقرار صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ اس اقرار کی ذمہ داری صحابہؓ نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کی اور پھر ان سے یہ ذمہ داری درجہ بدرجہ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ ہر عہد کے اخیار و صالحین نے اس ذمہ داری کو اپنے اسلاف کا سب سے زیادہ مقدس ورثہ سمجھا۔ اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے جو اقرارِ صالح اگلوں نے کیا تھا پچھلوں نے بھی اس کو اپنا اقرارِ صالح تسلیم کیا۔ اس لئے کہ اس اقرار کا انکار یا اس سے گریز و فرار ان کے لئے اس وقت تک ممکن ہی نہ تھا جب تک وہ اپنے ان اسلاف سے خدانخواستہ براءت کا اور اسلام سے اپنے قطع تعلق کا اعلان نہ کر دیں۔

ہم اگر ان مقدس اسلاف ہی کے خلف ہیں اور اپنے اس ماضی سے بیزار نہیں ہو گئے ہیں تو سمع و طاعت کا جو اقرار ہمارے اسلاف نے کیا ہے وہ خود ہمارا بھی اقرار ہے اور ہم اپنی ناخلفی کا اعلان کئے بغیر اس اقرار کی ذمہ داریوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کو کوئی مسلمان جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل حقیقتوں سے بھی کوئی صاحبِ نظر انکار نہیں کر سکتا۔

ہم میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو سرے سے اس بات سے واقف ہی نہیں ہیں کہ ہمارے رب کے ساتھ ہمارا تعلق کسی میثاق کے تحت ہے اور اس میثاق کی ہر چیز لکھی ہوئی اور متعین ہے اور ہم نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کے اقرار کے ساتھ اس کی تصدیق کی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق خدا کے ساتھ محض رسمی اور رواجی ہے اور اگر وہ کسی حد تک اس کو نباہتے ہیں تو اسی حیثیت سے اس کو نباہتے ہیں کہ اس کے اندر کوئی زندگی ہے نہ کوئی اثر۔

ہم میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس معاہدے کی بہت سی دفعات سے متعلق مختلف قسم کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے شبہات و شکوک کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ بعض ان کو ظاہر تو نہیں کرتے لیکن ان کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، جس کے سبب سے وہ نفاق اور بے یقینی کے مریض بن کر رہ گئے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس میثاق کی دفعات میں سے صرف انہی دفعات کو ماننا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہیں۔ ان دفعات کو یہ نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشات کے خلاف ہیں۔ یہ ترک و اختیار وہ من مانے طور پر یک طرفہ کر رہے ہیں، حالانکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہوا ہے جس میں کوئی ادنیٰ تغیر و تبدل بھی وہ خدا کی مرضی کے بغیر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ انہوں نے اس ردّ و قبول کے لئے کسوٹی تہذیب حاضر کو قرار دیا ہے، جو چیز اس کسوٹی پر پوری اتر جائے وہ سر آنکھوں پر اور جو چیز اس پر پوری نہ اتر سکے وہ ناقابل التفات۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف قسم کی طفلانہ تاویلوں سے اس پورے میثاق کو

ایک بازیچۂ اطفال بنائے دے رہے ہیں اور اس کی ہر دفعہ کی ایسی ایسی تاویلیں کر رہے ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر مقصد تو در حقیقت پورے میثاق کا انکار ہے لیکن کھلم کھلا انکار کے بجائے انہوں نے تاویلِ باطل کی راہ اختیار کی ہے۔

بعض لوگوں نے سرے سے اس ذات ہی کو مجروح کرنا شروع کر دیا ہے جو اس میثاق کا اصل واسطہ ہے اور جس نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے ہم سے یہ میثاق لیا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اس میثاق کا وہ سارا ریکارڈ مشتبہ ہے جو اُس ذات کے قول و فعل سے متعلق ہے۔

بعض لوگوں نے حکمتِ عملی یا عملی سیاست کے نام سے اس میثاق کی قطع و برید کے لئے دین میں ایک نئے اصولِ ردّ و قبول کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت اس میثاق کی ہر دفعہ کالعدم کی جا سکتی ہے۔

یہ رسالہ مذکورہ بالا سارے گروہوں کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے گا اور ان شاء اللہ ہر باب میں اس کا اندازِ بحث علمی اور تحقیقی ہو گا۔ اس میں نقل کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی وہ اہمیت دی جائے گی جس کی وہ مستحق ہے تاکہ وہ لوگ بھی ان مباحث سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں جو جدید نظریات کے شعبدوں سے متأثر ہیں۔ اس طرح کے لوگ ان شاء اللہ اس رسالہ کے ہر نمبر میں اپنے لئے نہایت روح پرور اور صحت بخش غذا پائیں گے۔ ہمارے کالجوں میں بھی اور دینی مدرسوں میں بھی ایسے بہت سے ذی صلاحیت اور ذہین لوگ موجود ہیں جو خدا کی شریعت کو ان پہلوؤں سے سمجھنا چاہتے ہیں جن پہلوؤں سے موجودہ عہد میں اس کو سمجھنا ضروری ہے، لیکن وہ اپنی اس تشنگی کو دور کرنے کا کہیں سامان نہیں پا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ رسالہ کے اس باب کے مضامین ان کے لئے اچھا فکری مواد فراہم کریں گے۔

اب میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور اس رسالہ کے تمام قارئین سے [illegible]
[illegible]

ایک حقیری خدمت انجام دینے کے لئے یہ کام شروع کیا ہے۔ اے رب! تو اس کام کو قبول فرما۔ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے رب! ہم تیرے ساتھ اپنے عہد کو تازہ کرنے کا عزم کرتے ہیں تو اس عزم میں ہماری مدد فرما اور اے رب! ہمیں توفیق دے کہ ہم تیرے دوسرے بندوں کے اندر بھی اس عزم کی گرمی پیدا کر سکیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

تنظیم اسلامی ہی کیوں؟

—— عمران این حسین ——

عمران نذر حسین کا تعلق ٹرینیڈاڈ (جزائر غرب الہند) سے ہے۔ انہوں نے علومِ اسلامیہ کی تعلیم ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن انصاری مرحوم سے علیمیہ انسٹی ٹیوٹ کراچی میں حاصل کر کے اجازۃ العالیہ کی سند حاصل کی' بی اے (فلسفہ' نفسیات اور عمرانیات) اور ایم اے فلسفہ کی ڈگری کراچی یونیورسٹی سے حاصل کی' یونیورسٹی آف ویسٹ انڈیز سے بین الاقوامی تعلقات (International Relations) میں پوسٹ گریجوایٹ ڈپلومہ لے کر اسی مضمون میں ایم اے کی ڈگری جنیوا کے گریجوایٹ انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل سٹڈیز سے حاصل کی۔ حکومت ٹرینیڈاڈ اور ٹوباگو کی وزارت خارجہ میں ۱۹۸۵ء تک ملازم رہے۔ جذبہ خدمت اسلام کے تحت ملازمت کو خیرباد کہا اور دنیا کے کئی حصوں میں "لیکچر ٹور" کئے۔ سات مرتبہ ملائیشیا اور سنگاپور کا دورہ کیا۔ ۱۹۹۱ء میں نیویارک میں اسلامک سٹڈیز کی مسلم آرگنائزیشنز کی متحدہ کمیٹی کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس دوران مین ہٹن میں واقع اقوام متحدہ کے مرکز میں مسلمانوں کے لئے خطیب اور امام کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت پر امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے انہیں تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کا ناظم برائے دعوت و تبلیغ مقرر کیا۔ عمران این حسین صاحب نے متعدد موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں

اسلام اور بدھ مت جدید دنیا میں' اسلام اور متغیر ورلڈ آرڈر' اسلام میں ممانعتِ ربا کی اہمیت' خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ' دین ابراہیم اور ریاستِ اسرائیل' قرآن کی روشنی میں خلافت' حجاز اور سعودی وہابی قومی ریاست' قرآن و سنت سے ربا کی ممانعت —— اور استنبول سے رباط تک۔ آخر الذکر کتاب کا اردو ترجمہ مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور نے شائع کیا ہے۔ عمران این حسین صاحب نے اکتوبر ۹۶ء میں قرآن آڈیٹوریم لاہور میں تین لیکچر دیئے اور مارچ ۹۷ء میں محاضرات قرآنی کے موضوع پر خطاب کیا۔ موصوف کا زیر نظر مضمون اصلاً انگریزی زبان میں تھا' جسے رفیق مکرم سید افتخار احمد صاحب نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

کُل حمد اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک ہے' بے انتہا رحم کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ درود و سلام ہو اللہ تعالیٰ کے مبعوث کردہ نبی اُمّی محمد ﷺ پر جو اللہ ذوالجلال کی طرف سے الھدٰی (قرآن مجید) اور دینُ الحَق (وحی الٰہی کے مطابق نظامِ زندگی) دے کر بھیجے گئے تاکہ یہ دینُ الحَق زندگی کے ہر گوشہ پر خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی' دنیاوی ہو یا اخروی' مکمل طور پر محیط اور غالب ہو جائے۔ اس دنیا کی زندگی میں دینُ الحَق کا مقصد انسانیت کو استحصال اور جبر سے نجات دلانے والی طاقت بننا ہے اور اخروی زندگی میں فلاح اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ! نیز اللہ تعالیٰ نے اِس دین کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ چنانچہ دین الحق کے یہ تمام مقاصد تو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پورے ہو گئے' مگر آپؐ کے وصال کے بعد اِس عظیم مشن کی جدّوجہد کو جاری رکھنے کی ذمہ داری اب آپؐ کی امت پر عائد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انتہائی تاکیدی انداز میں فرمایا ہے کہ اسوۂ محمدیؐ (سیرت و سنّتِ رسولؐ) مسلمانوں کے لئے وہ ٹھوس نمونہ ہے' جس کی پیروی کر کے ہی وہ نجاتِ اخروی اور رضائے الٰہی حاصل کر سکتے ہیں' اور جس کی پیروی کے ذریعے ہی وہ دنیا کی زندگی میں اپنی ذمہ داری نبھا سکتے ہیں:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ﴾

(الاحزاب . ۲۱)

"درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول ﷺ (کی زندگی) میں ایک بہترین نمونہ ہے' ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

اسوۂ رسول ﷺ کے دو بنیادی پہلو ہیں' ذاتی یا انفرادی اور اجتماعی یا معاشرتی۔ پہلا پہلو تو آپؐ کی انفرادی زندگی کے معاملات اور ذاتی تعلق مع اللہ اور مسلمانوں سے روابط کے حوالے سے ہے' جبکہ دوسرا پہلو آپؐ کے بطور سربراہ اُمّت ہونے کے حوالے سے

ہے۔ اسوۂ رسول ﷺ کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان آپ ﷺ کی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے رہنمائی اخذ کرکے اپنی زندگی گزارنے کا لائحہ عمل مرتب کریں۔ صرف وہی لوگ اللہ تعالیٰ (کی رضا) اور یومِ آخرت (میں فلاح) کے امیدوار ہو سکتے ہیں جو اپنی زندگیوں کو سنّتِ رسول ﷺ کے دونوں پہلوؤں کے مطابق بنانے کی جدّوجہد کریں۔

جو کچھ بھی سُنّت سے ثابت ہے وہ قرآن مجید کے عین مطابق ہے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ کَانَ خُلُقُہُ الْقُرآن 'یعنی "رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج و رجحان قرآن مجید کا پرتو (عکس) تھا۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خوب معلوم تھا کہ سنت کی پیروی دراصل قرآن مجید ہی کی پیروی ہے۔ یہ اس لئے تھا کہ رسول اکرم ﷺ بالفعل ان میں موجود تھے۔ آج جبکہ رسول اکرم ﷺ بالفعل ہم میں موجود نہیں ہیں' ہمارے لئے قرآن مجید ہی رہنمائی کا بنیادی ذریعہ ہے' اور اسی لئے ہم نے سنت کی اہمیت واضح کرنے کے لئے مندرجہ بالا آیت کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے قرآنی رہنمائی کے مکمل طور پر مسلمان امت کے بنیادی ڈھانچہ میں جذب ہو جانے کی ضرورت اور اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔

لہٰذا "تنظیم اسلامی ہی کیوں؟" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں مندرجہ ذیل نکات کا جائزہ لینا ہوگا۔

۱) قرآن مجید کو رہنمائی کا منبع اعظم تسلیم کرنا جبکہ نبی اکرم ﷺ ہم میں بالفعل موجود نہیں ہیں۔

۲) مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے حوالہ سے اسوۂ حسنہ (سیرت و سُنّتِ رسولؐ) سے مطابقت پیدا کرنا۔

نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں مسلمانوں کا اجتماعی نظام

سب سے پہلے ہمیں نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا جائزہ لینا ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی تاریخی اعتبار سے دُو ادوار میں منقسم ہے۔ پہلا قبلِ

ہجرت کا (مکی) دور اور دوسرا بعدِ ہجرت کا (مدنی) دور۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بعدِ ہجرت زمانہ میں نبی اکرم ﷺ اور مسلمان اُمّت کے زیر اثر ایک علاقہ تھا' جس میں انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور انفرادی اور اجتماعی سطح پر سرِ تسلیم خم کرنے اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ اسی کا نام دارالاسلام تھا۔

ہجرت کے بعد ابتدائی ایام میں جب کہ ابھی اُمّتِ مسلمہ کو علاقہ پر مکمل کنٹرول حاصل نہ ہوا تھا' ایک دستوری صلح نامے بعنوان "میثاقِ مدینہ" نے دارالاسلام کے لئے ایک "مخلوط" نوعیت کی اجتماعی بنیاد فراہم کی۔ اس میثاق کے ذریعے ریاست کی مختلف اکائیوں (یعنی مسلم اور غیر مسلم) کے مابین دفاع اور امورِ خارجہ وغیرہ کے حوالے سے' جو کہ مسلمانوں کی حفاظت کے سلسلہ میں نہایت اہمیت کے حامل تھے' معاملات کی تنظیم کی گئی۔ معاہدے کے تمام فریقوں کے لئے لازم تھا کہ وہ اس معاہدے کے تحت اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں گے۔

بعد کے ایام میں اس میثاق کے خاتمہ پر' جبکہ ایک طاقتور مسلمان اُمّت وجود میں آ چکی تھی جسے کافی علاقہ پر مکمل اختیار بھی حاصل ہو گیا تھا' دارالاسلام کا وہ "مخصوص" نمونہ (بمقابلہ پہلے سے موجود "مخلوط" نمونہ کے) سامنے آیا جو ۱۹۲۴ء تک قائم رہا۔ ہجرت سے پہلے کے زمانہ میں چونکہ مسلمانوں کو کسی علاقہ پر کوئی اختیار حاصل نہ تھا' لہٰذا اسے دارالاسلام نہیں کہا گیا۔ مگر دونوں ادوار میں مشترک بات یہ ہے کہ امّتِ مسلمہ کو نبی اکرم ﷺ نے ایک جماعت کی شکل میں اور ایک امیر کی قیادت میں منظم کیا تھا۔ بالفاظ دیگر' دونوں ادوار میں گویا بھیڑیں ایک گلہ کی شکل میں ایک گڈریئے کی قیادت میں منظم ہوئیں اور اس گڈریئے نے احکامِ الٰہیہ کی رہنمائی میں اس گلہ کی دیکھ بھال کی۔ اسی لئے یہ ایک سنت ہے کہ مسلمان اجتماعی طور پر متحد ہو کر جماعت کی شکل اختیار کریں اور یہ جماعت ایک امیر کی قیادت میں منظم ہو' نیز یہ امیر اس جماعت کے جملہ معاملات قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق چلائے۔ امیر کی اطاعت ایک دینی فریضہ ہے!

قبل ہجرت کے دور میں ایک رات نبی اکرم ﷺ معجزانہ طور پر مکہ مکرمہ سے بیت المقدس لے جائے گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں پر (جسے الاسراء اور المعراج کہتے ہیں)۔ اس سفر کے دوران وحی کے حوالہ سے ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ معراج کے دوران اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات رسول اکرم ﷺ کو عطا فرمائیں' جبکہ باقی پورا قرآن نبی اکرم ﷺ کو زمین پر وحی کیا گیا۔ ان آیات (البقرہ ۲۸۵'۲۸۶) میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یہ شان بیان فرمائی کہ ﴿كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ﴾ "وہ سب ایمان لائے اللہ پر' اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر..." اس کے بعد قرآن مجید مسلمانوں کی زبان سے یہ الفاظ ادا کراتا ہے کہ "... ہم اللہ کے پیغمبروں میں کوئی فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ : ہم نے سنا اور اطاعت کی..."۔

ان دو آیات کا مقصد جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو معراج میں عطا فرمائیں اور خصوصاً ان الفاظ کا جو خود اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی زبان سے کہلوائے یعنی "ہم نے سنا اور اطاعت کی" یہ ہے کہ ایک مومن کے ایمان کی بہترین تعبیر "سمع وطاعت" ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "سمع وطاعت" کے رویئے میں ہی وہ نظم ہے جو نہ صرف ایک جماعت اور اس کے ارکین کو اندرونی اور بیرونی انتشار سے بچاتا ہے بلکہ جماعت کے اتحاد اور دوام کی بھی ضمانت دیتا ہے۔

کفارِ مکہ نے ایک مرتبہ ایک ایسی تجویز پیش کی تھی جسے اگر قبول کر لیا جاتا تو مکی سوسائٹی کی وحدت تو قائم رہتی مگر مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا۔ وہ یہ کہ "اگر تم ہمارے خداؤں کی عبادت کرو تو ہم تمہارے اللہ کی عبادت کریں گے۔" یہ تھا وہ "مصالحانہ" نظریہ جو انہوں نے پیش کیا مگر جسے دھتکار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نظریہ کا رد سورۃ الکافرون کے ذریعہ فرمایا' جس میں نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوا کہ کفار سے کہہ دیجئے :

﴿قُلْ يَاأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ○ وَلَا أَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَا أَعْبُدُ ○ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ○ وَلَا أَنْتُمْ

عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۝ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ۝ ﴾

"کہہ دو' میری رسالت کا انکار کرنے والو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔ نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں! تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔"

اس طرح اللہ تعالیٰ نے مکہ میں ہجرت سے پہلے مسلمانوں کی جماعت (اور اس کے تشخص) کی حفاظت کا بندوبست فرمایا اور واضح کیا کہ جماعت کے خالص پن اور اسلامی نظم معاشرہ میں سیکولرزم کے عمل سے کوئی کثافت شامل نہ ہونے دی جائے۔ اگر قریش کی تجویز مان لی جاتی تو اس مصالحت کی وجہ سے نہ صرف سچائی چھپ جاتی بلکہ مسلمانوں کی جماعت آہستہ آہستہ مکہ کی جاہلیت میں ہی مدغم ہو جاتی۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی جماعت کے خالص پن کو برقرار رکھا گیا۔ میثاقِ مدینہ کے ذریعے دو فریقوں (مسلم و غیر مسلم) کے مابین متحدہ دفاع' امورِ خارجہ اور دیگر اہم معاملات کو اس طرح منظم کیا گیا کہ اُمّت کا تشخّص قائم رہے اور مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی آزادی بھی برقرار رہے۔

اس سے تین باتیں اخذ ہوتی ہیں :

۱) مسلمانوں کے اتحاد سے وجود میں آئی ہوئی ایک جماعت' ایک امیر یا امام کے زیر قیادت "نمونۂ پیغمبریؐ" کا ایک لازمی جزو ہے۔

۲) امیر اس جماعت کے تمام معاملات کو قرآن مجید اور سُنّتِ رسول ﷺ کے مطابق چلانے اور اس جماعت میں اسلام کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے لئے ہم خطبہ حجۃ الوداع کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ "میں اپنے پیچھے دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے تم گمراہ نہیں ہو گے —— اللہ کی کتاب اور میری سُنّت۔"

امیر ایک مسلمان مرد ہونا چاہئے جسے قرآن و سنت کا ضروری علم حاصل ہو۔

وہ جماعت ایک خالص اسلامی جماعت کی خصوصیت سے محروم ہو جاتی ہے جس کے اراکین ایک عورت کو اپنا امیر بنا لیں۔ اس کی بنیاد قرآن مجید کی آیت (النساء : ۳۵) کے حوالہ سے ہے کہ "اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ" یعنی "مرد عورتوں پر نگہبان ہیں"۔ نیز رسول اکرم ﷺ نے ایک سنت بھی قائم فرما دی جبکہ آپؐ نے تمام مناصب پر مسلمان مَردوں ہی کو متعین فرمایا۔

امیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ پر بھی اور اپنے اہل و عیال پر بھی قرآن و سنّت کے احکامات کا نفاذ کیا ہو۔ امیر کو یوم حساب اپنے رب کے حضور پیش ہو کر جماعت کی ذمہ داری کا حساب دینا ہو گا۔

۴) جماعت کے اراکین کا دینی فریضہ ہے کہ وہ امیر کی اطاعت کریں' بشرطیکہ وہ ان کو اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کا حکم نہ دے۔ "سمع و طاعت" دراصل اسلامی طرز حیات کی روح ہے' لہٰذا امیر کی نافرمانی گناہ ہے!

اب ہم مندرجہ بالا نتائج کا شمالی امریکہ یا دنیا کے دوسرے خِطّوں میں رہنے والے مسلمانوں کے حوالے سے جائزہ لیتے ہیں۔

شمالی امریکہ میں جماعت سازی کے مقاصد

شمالی امریکہ میں رہائش پذیر مسلمانوں کو اس موضوع پر خصوصاً غور کرنا چاہئے کیونکہ ان کی غالب اکثریت اسلامی انجمنوں اور اسلامی مراکز کی صورت میں مجتمع ہے۔ یہ تنظیمیں Articles of Association اور دساتیر کے مطابق قائم کی گئی ہیں جن کی بنیاد پر مجلس منتظمہ' مجلس عاملہ' بورڈ آف ڈائریکٹرز وغیرہ قائم ہوتے ہیں تاکہ ان انجمنوں کے کام کو بخوبی چلایا جا سکے۔ یہ کمیٹیاں اور بورڈ ہمیشہ انتخابات کے ذریعے وجود میں آتے ہیں جس میں اعانت دینے والے ممبران ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ افراد نامزد کئے جاتے ہیں جو مختلف مناصب کے لئے "کھڑے" ہوتے ہیں۔ انتخابات لڑنے کے لئے مہم چلانا ایک معمول کی بات ہے۔ الیکشن اور اس کے معمولات معاشرہ میں گروہ بندی اور فرقہ واریت کو ہوا دیتے ہیں اور بعض اوقات الیکشن کا دن ایک مچھلی منڈی کا سماں پیدا

کرتا ہے۔ اس گروہ بندی اور فرقہ واریت سے بسا اوقات عدالتی جنگ تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ آج شمالی امریکہ یا دنیا کے کسی اور خطہ میں یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔

الیکشن سے انجمن یا ادارے کا ایک سربراہ چنا جاتا ہے جسے عموماً "صدر" کہتے ہیں۔ وہ اکثر ایک پروفیشنل شخص ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر، انجینئر، اکانومسٹ یا بینکر وغیرہ، جس نے جدید سیکولر تعلیم حاصل کی ہوتی ہے اور جو ادارہ کے ممبران کے ساتھ قریبی تعلقات اور اچھی شہرت رکھتا ہے۔ کچھ نہ کچھ اخلاص اور ذاتی پرہیزگاری کے باوجود یہ "صدر" اسلام کے بارے میں ضروری علم سے بالعموم محروم ہوتا ہے، اور اس کے اور اس کے اہل خانہ کے طرز زندگی سے اسلام کے اسی ادھورے علم کا اظہار ہوتا ہے۔ عام طور پر "صدر" کے نقائص دراصل اس ادارے کے ارکان ہی کی کوتاہیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اکثر اس نے گھر یا کار خریدنے، بچوں کی تعلیم اور دیگر ضروریات کے لئے بینک سے سود پر رقم بھی مستعار لی ہوتی ہے اور بعض دفعہ اس کے سیکولر خیالات کی وجہ سے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ اسے سود کے حوالے سے یہ باور کرایا جا سکے کہ وہ گناہ عظیم کا مرتکب ہو رہا ہے۔

ان انجمنوں کا دستور صدر یا مجلس منتظمہ پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کرتا کہ وہ لازماً اپنے اراکین پر، انفرادی یا اجتماعی طور پر، اسلامی طرز زندگی کو نافذ کریں، اور نہ ہی اراکین کے لئے اس بارے میں صدر کی بات سننے اور ماننے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا صدر کی نافرمانی کرنا کوئی گناہ متصور نہیں ہوتا۔

بدقسمتی سے شمالی امریکہ بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت ایک ٹھیٹھ اسلامی جماعت کی صورت میں اور ایک ایسے امیر کی قیادت میں منظم نہیں ہے جو مسلمانوں کے تمام معاملات قرآن و سُنّت کی رہنمائی میں چلا سکے۔ اس طرح شمالی امریکہ کے مسلمان ایک ایسے امیر کی قیادت سے محروم ہیں جس کی اطاعت مذہبی فریضہ کے طور پر کی جاتی ہو۔ شمالی امریکہ میں مقیم اکثر مسلمان اور ان کے لیڈر (صدر، انجمنوں کے عہدیدار اور مجلس اعانت کے ارکان وغیرہ) سب ایک بڑے خطرے میں مبتلا ہیں۔ ان سب کو ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اس خود ساختہ اندھے پن کے لئے جواب دہ ہونا ہے

جس کی وجہ سے وہ اور دیگر مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی سنت پر عملدر آمد میں ناکام ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے قرآن مجید کی یہ آیات باعثِ انذار ہیں :

﴿ یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ۝ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل : ۷۱، ۷۲)

"اس دن ہم بلائیں گے ہر فرقہ کو ان کے سرداروں کے ساتھ۔ سو جس کو ملا اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں، سو وہ لوگ پڑھیں گے (خوشی سے) اپنا لکھا۔ ان پر ایک تاگے کے برابر ظلم نہ ہو گا۔ اور جو کوئی رہا اس جہان میں اندھا (یعنی جس نے سنتِ رسولؐ پر عمل نہ کیا) سو وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور وہ (سیدھی) راہ سے دور گمراہی میں جا پڑا۔"

اگر مسلمان اپنے آپ کو بطور ایک جماعت اور ایک امیر کی قیادت میں، جس کی پوری اطاعت کی جائے، متحد کرنے میں ناکام ہو گئے تو انہیں اس دنیا میں بھی بہت سے تباہ کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ مسلمان گویا ایسی بھیڑوں کی طرح زندگی گزاریں گے جن کا نہ کوئی گلہ ہو نہ گڈریا۔ یہ سب بھیڑیں جلد یا بدیر سیدھی راہ سے دور ہٹتی جائیں گی اور بالآخر بھیڑیوں کی خوراک بنیں گی۔ شمالی امریکہ کے مسلمان پہلے ہی اس کا کافی تجربہ کر رہے ہیں کہ کس طرح ایسی گمراہ بھیڑیں خونخوار بھیڑیوں کے ذریعے تباہی کا شکار ہو رہی ہیں۔ تقریباً ہر مسلمان خاندان کو اس (ملحد و بے دین) معاشرے میں کوئی نہ کوئی سانحہ پیش آیا ہے، جس کے ساتھ اب وہ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

شمالی امریکہ کے مسلمان اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور چونکہ مقامی اور تارکین وطن دونوں قسم کے مسلمانوں کو اپنے تشخص کے لئے مساجد کی ضرورت ہے، اس لئے بے شمار مسجدیں بھی تعمیر ہو رہی ہیں۔ مگر تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ ان نئی مساجد کے باوجود شمالی امریکہ کے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی

میں اسلام رُو بہ تنزّل ہے' اور غالباً یہ صرف ایک یا دو نسلوں کی بات ہے کہ یہاں رہنے والے مسلمان موجودہ بے دین مغربی تہذیب کی بھٹی میں پگھل کر اپنا تشخص بھی کھو دیں گے۔ اسی طرح مسلمان تارکین وطن کی بڑی اکثریت امریکی دستور کے ساتھ عہدِ وفاداری استوار کر کے اس ملک کی شہریت اختیار کر لے گی' اور یہ شرک ہے! ان کی اکثریت سود پر قرض لے گی تاکہ مکان' کار اور دیگر ضروریات زندگی حاصل کر سکے۔ بہت سے لوگ کریڈٹ کارڈ استعمال کریں گے جو یقیناً سود ہے! تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے بچے یا ان کے بچوں کی اولاد انڈوں اور خنزیر کے گوشت کا ناشتہ کریں گے' شراب پئیں گے اور رفع حاجت کے بعد پانی کے بجائے کاغذ استعمال کریں گے!

یہ بہت ہی تکلیف دِہ حقیقت ہے جس کا میں نے ۱۹۸۹ء سے شمالی امریکہ میں دین کی خدمت کرتے ہوئے ادراک کیا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو اس موضوع کی اہمیت کو واضح کرتی ہے' یعنی "تنظیم اسلامی ہی کیوں؟" —— تنظیم اسلامی اس معاملہ میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟ یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ ہم پوری سنجیدگی اور انہماک سے اس فرق کا مطالعہ کریں جس کی مظہر تنظیم اسلامی ہے۔

آج کی مشکل

۱۹۲۴ء میں تُرک قومی اسمبلی کے خلافت کو ختم کرنے کے فیصلہ کے بعد سے دنیائے اسلام "دار الاسلام" سے محروم ہے۔ کیا دار الاسلام محض اس لئے ختم ہو گیا کہ ترکوں نے استنبول میں خلافت کو ختم کر دیا تھا؟ کیا دنیا کا کوئی اور خطہ ایسا نہ تھا جہاں دار الاسلام بن سکتا؟ یعنی ایک ایسا خطہ جہاں مسلمانوں کا کنٹرول ہوتا اور وہ احکامِ الٰہی کا نظام اللہ تعالیٰ کی مکمل حاکمیت کے تحت چلا سکتے۔ اگر کہیں ایسا نظام قائم ہوتا تو خلافت کا ادارہ وہاں منتقل کیا جا سکتا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن طاقتوں نے استنبول میں خلافت کے خاتمہ کا منصوبہ بنایا اور اس پر عملدر آمد کروایا' انہوں نے اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ خلافت جو مسلمانوں کا مرکزی ادارہ ہے کہیں اور قائم نہ ہو سکے۔

آج پوری دنیا میں مسلمانوں کا کسی خِطۂ ارضی پر ایسا کنٹرول نہیں ہے کہ وہاں اللہ

تعالیٰ کی مکمل حاکمیت تسلیم کی جاتی ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان اب ایک ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جو قبلِ ہجرت کا دور کہلایا جا سکتا ہے۔ اور آج ہمارا مقصد ایک مرتبہ پھر گویا "مکی دور" سے "مدنی دور" میں داخل ہونا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جب تک قبل ہجرت کے دور میں ہیں انہیں مشکلات کا سامنا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ان پر سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق ایک جماعت کی صورت میں اور ایک ایسے امیر کے تحت منظم ہونا لازم ہے جس کی اطاعت مذہبی فریضہ کے طور پر کی جائے' لیکن ایک ایسی جماعت جو دنیا کے تمام مسلمانوں کو متحد کر سکے ابھی وجود میں نہیں آئی ہے' اور اس کے لئے اب تک کی مساعی ناکام ہو چکی ہے۔ ان حالات میں شمالی امریکہ کے مسلمانوں کو کیا روش اختیار کرنا چاہئے؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟ آج یہی اصل مشکل ہے! اس مشکل کو حل کرتے وقت دراصل ہم اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ "تنظیم اسلامی ہی کیوں؟"۔

تنظیم اسلامی بطور حل

نبی اکرم ﷺ نے موجودہ ابتر حالات کی پیش گوئی فرمائی تھی' جب کہ آپؐ نے واضح فرمایا تھا کہ یہ اُمت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو گی' اور وہ سب گمراہ ہوں گے' سوائے ایک گروہ کے۔ ہم کس طرح یہ معلوم کریں کہ وہ ہدایت یافتہ گروہ کونسا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہدایت یافتہ گروہ وہی ہو گا جو نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ کی سُنّت پر عمل پیرا ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ دیگر سُنّتوں کے ساتھ یہ گروہ ایک صحیح اسلامی جماعت کی شکل میں منظم ہو گا' ایک ایسے امیر کی قیادت میں کام کرے گا جسے اسلام کا وسیع علم ہو۔ یقیناً اس امام یا امیر کو جماعت کے تمام معاملات قرآن و سنت کی روشنی میں طے کرنے ہوں گے' اور یہ جماعت امام یا امیر کی اطاعت کو مذہبی فریضہ جانے گی۔

علاوہ ازیں قبل ہجرت دور میں امام یا امیر کی بیعت کا نظام موجود نہیں تھا مگر ہجرت کے بعد سے یہ نظامِ بیعت ہمیشہ موجود رہا ہے۔ تمام صحابہؓ' تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے امام یا امیر کی بیعت کا عہد کیا ہے۔ امام حسینؓ نے یہ عہد امیر معاویہؓ سے کیا تھا' مگر یزید کے

لئے امام حسینؓ نے یہ عہد کرنے سے انکار کر دیا ___ اور وہ اس معاملہ میں بالکل صحیح موقف پر تھے ___ اور یہی انکار کربلا کے حادثہ پر منتج ہوا۔

چنانچہ یہ ہدایت یافتہ گروہ روئے زمین پر کسی بھی جگہ رہنے والے ان مسلمانوں کا گروہ متصور ہو گا جو ایک امام یا امیر کی قیادت میں ایک جماعت کی شکل میں ہوں، اور وہ امام یا امیر ان کے معاملات قرآن و سنت کی روشنی میں چلائے اور اس کی امارت بیعت کے اصول پر قائم ہو ___ نیز یہ ہدایت یافتہ گروہ وہ ہو گا جو قرآن مجید کو اسلام کا بنیادی سرچشمۂ ہدایت سمجھتا ہو۔

تنظیم اسلامی ان شرائط پر پورا اترنے والی ایک جماعت ہے۔ عین ممکن ہے کہ آج صرف یہی ایک جماعت نہ ہو، مگر وہ یہ سمجھتی اور تسلیم کرتی ہے کہ کل اللہ کے بندے ایک امام یا امیر کی قیادت میں اور ایک جماعت کی صورت میں متحد ہو جائیں گے۔ بے شک یہ بات اس جماعت کا ایک بنیادی وصف ہے جو قرآن و سنت کے اصولوں پر دیانتداری سے عمل پیرا ہو کہ ایسی جماعت متواتر اللہ کے بندوں کو متحد اور منظم کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے تاکہ وہ سب ایک امیر کی قیادت میں ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیں۔

یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ہم تنظیم اسلامی کو ایسی جماعت کے طور پر جانتے ہیں جس نے قرآن حکیم کو اسلام کے بنیادی سرچشمۂ ہدایت کے طور پر تسلیم کیا ہے اور دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ غالباً آج کوئی زندہ شخصیت ایسی نہیں ہے جس نے قرآن کے مقصد کو صحیح طور پر سمجھ کر اس کی اتنی خدمت کی ہو جتنی کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی نے کی ہے۔

علاوہ ازیں تنظیم اسلامی دنیا کی ان چند جماعتوں میں سے ہے جس نے فی زمانہ امیر کی بیعت پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسلمان اس جماعت میں شمولیت اختیار کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور اس طرح ایک اہم سنت پر عمل سے محروم ہیں۔ میں خود کافی عرصہ اسی تذبذب میں مبتلا رہا ہوں۔

مسئلہ بیعت اور اس سے انحراف کے نتائج

ہمیں اِس وقت ان لوگوں کے خیالات پر اپنی توجہ مرکوز کرنا ہے جو بیعت کے لئے

ضروری سمجھتے ہیں کہ "تمام مسلمان ایک امیر کے تحت" متحد ہو چکے ہوں۔ یہ حضرات ایک جائز اشکال پیش کرتے ہیں اور ان کی مناسب تشفی ہونا چاہئے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی اس پیشین گوئی کو سامنے رکھیں جس میں اُمت کے ۷۳ فرقوں میں منقسم ہو جانے اور ان میں سے صرف ایک کے راہ حق پر ہونے کا ذکر ہے۔ یہ فرقہ بندی تو امت میں وقوع پذیر ہو چکی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں حالات مزید دگرگوں ہوں گے۔ چنانچہ یہ مطالبہ غیر مناسب بلکہ احمقانہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تمام مسلمانوں کے ایک امیر کی قیادت میں متحد ہونے کی توقع رکھیں۔

ان مسلمانوں کو ہماری نصیحت یہ ہے کہ وہ سُنّت سے مطابقت رکھنے والی جماعت ــــــ یعنی ایسی جماعت جو بیعت کے اصول پر ایک ایسے امیر کی قیادت میں قائم ہوئی ہو جو جماعت کے معاملات قرآن و سنت کے مطابق چلاتا ہو ــــــ کو تلاش کرکے اس میں شامل ہونے میں جلدی کریں، اور اس دن کا انتظار نہ کریں جو شاید ان کی زندگی میں کبھی نہ آئے۔

دوسری طرف کچھ لوگوں کا نظریہ یہ کہ انہوں نے کسی شیخ طریقت سے بیعت کرکے اِس سُنت کو پورا کر دیا ہے۔ یہ خیال صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہ شیخ طریقت نہ صرف اپنے مریدوں کی اخلاقی و روحانی تربیت کر رہا ہو بلکہ اس جماعت کے ذریعہ انقلابی طرز پر احیائے خلافت اور غلبۂ دین حق کی جدوجہد کی قیادت میں بھی مشغول ہو۔ یہ بات آج بہت کمیاب ہے۔ ایسے صوفی شیخ تو محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ ہی تھے، چنانچہ فی زمانہ ہم "مرابطون" کو دیکھتے ہیں جو شیخ عبدالقادر الصوفی کی قیادت میں ایک ایسی اسلامی انقلابی جدّوجہد میں مشغول ہیں جو بہرحال قابل تکریم ہے۔ یہ صوفی سلسلہ سُود یعنی ربا کے مطالعے اور اس مسئلے کی تشہیر میں باقی امت مسلمہ سے بہت آگے ہے۔

عمر ابراہیم وادیلو کی تازہ تحقیق بعنوان "The Return of the Gold Dinar" کا ان تمام افراد کو لازماً مطالعہ کرنا چاہئے جو ربا کے مسئلے کو سنجیدگی سے دیکھتے ہیں۔ صوفیاء کا یہ طبقہ احیائے خلافت کے لئے بھی سنجیدگی سے کوشش کر رہا ہے۔ فی

الحال ان کی تمام مساعی ترکی تک محدود مگر روبہ ترقی ہے۔ شیخ عبدالقادر الصوفی کی تازہ تحریر "The Return of the Khalifate" ان کی اس جدّوجہد میں پیش رفت کی مظہر ہے۔

مسلمانوں کو امیر اور جماعت سے منسلک نہ ہونے کی صورت میں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟ اگر فی زمانہ مسلمان ایک امیر کی قیادت میں "سمع و طاعت" کے اصول پر بیعت والی جماعت کی صورت میں منظم نہ ہوئے تو انہیں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس صورت میں مسلمان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مرتکب ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ.. ﴾ (النساء ۰ ۵۹)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں سے اولوالامر ہیں"۔

بیعت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو ایک مسلمان پر اس آیت کے تیسرے حصے کے مطابق یعنی "تم میں سے جو صاحب امر ہیں" ان کی اطاعت کی ذمہ داری ڈالتا ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں آج کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جو اس خصوصیت کا حامل ہو۔ اگر نہیں ہے تو مسلمانوں کی یہ اہم اور فوری ذمہ داری ہے کہ وہ کسی کو یہ حق دے کر اس کی اطاعت کریں۔ اسی ذمہ داری کے شعور کے تحت تنظیم اسلامی ایک امیر کی قیادت میں بیعت کے اصول پر قائم ہوئی ہے' اور میں نے بذات خود پاکستان کے شہر راولپنڈی میں اکتوبر ۱۹۹۶ء میں اپنا ہاتھ امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ میں دے کر بیعت کی ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہم بلا مبالغہ اس "دورِ فتن" میں جی رہے ہیں' جس کی رسول اکرم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ یہ قیامت سے پہلے کا ایک شیطانی دور ہو گا۔ اس "دور فتن" کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ یہ لوگوں کی عظیم اکثریت کو بالآخر الحاد اور دہریت اور خدا فراموشی کی طرف لے جائے گا۔ اور یہ بات آج روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ دور شروع ہو چکا ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس حدیث مبارکہ کے

مطابق جو کہ امام بخاریؒ کی صحیح میں درج ہے' اس دور کے ۱۰۰۰ میں سے ۹۹۹ آدمی دوزخ میں داخل ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں اس دور میں جہنم سے بچنے' اپنے ایمان کو بچانے اور جنت میں داخل ہونے کے لئے کیا کرنا ہو گا؟ کیا رسول اکرم ﷺ نے اس موضوع پر ہماری رہنمائی فرمائی ہے؟ اگر ہاں تو آپؐ نے کیا نصیحت فرمائی؟ ایک دوسری حدیث میں جو کہ صحیح بخاریؒ ہی میں درج ہے' رسول اکرم ﷺ نے صحابہؓ کے پوچھنے پر اس کا جواب مرحمت فرمایا۔ حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ

لوگ اللہ کے رسول ﷺ سے اچھائی کے متعلق پوچھتے تھے مگر میں برائی کے بارے میں دریافت کرتا تھا' مبادا میں اس کے زیر اثر آ جاؤں۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہم دور جاہلیت اور بہت برے ماحول میں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ خیر عطا فرمایا (یعنی اسلام)۔ کیا اس اچھائی کے بعد کوئی برائی ہو گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کیا کہ اس برائی کے بعد کوئی اچھائی ہو گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں' مگر یہ آلودہ (یعنی ناخالص) ہو گی۔ میں نے عرض کیا اس کی آلودگی کیا ہو گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کچھ لوگ (ایسے ہوں گے جو) دوسروں کی رہنمائی کریں گے (مگر) وہ راہنمائی میری ہدایت کے مطابق نہیں ہو گی۔ تم ان کی کچھ باتوں کی تصدیق کرو گے اور کچھ کی تکذیب۔ میں نے عرض کیا' کیا اس اچھائی کے بعد کوئی برائی ہو گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں' کچھ لوگ (ایسے ہوں گے جو) دوسروں کو جہنم کے دروازوں پر بلائیں گے اور آنے والوں کو اس میں پھینک دیں گے۔ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ اس کی وضاحت فرما دیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: وہ ہمارے لوگوں ہی میں سے ہوں گے اور ہماری ہی طرح باتیں کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ مجھے کیا نصیحت فرمائیں گے اگر یہ میری زندگی میں ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم جماعت (یعنی مسلمانوں کا ایسا گروہ جو ایک جماعت کی شکل میں منظم ہو) اور اس کے امام (یعنی امیر یا لیڈر جس کی قیادت بیعت کے اصول پر مسلم ہو) سے منسلک ہو۔ میں نے عرض کیا کہ اگر نہ جماعت ہو نہ امام؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تب تم ان فرقوں (یعنی مسلمانوں کے گمراہ گروہ جو بیعت کے اصول پر ایک امیر کی قیادت میں منظم نہ ہوں) سے دوری

اختیار کرلو، خواہ تمہیں درختوں کی جڑیں کھانی پڑیں، یہاں تک کہ تمہیں اس حالت میں موت آجائے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

اس حدیث شریفہ سے واضح ہوتا ہے کہ دورِ فتن میں نجات کا دارومدار اس بات پر ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو مصدقہ جماعت و مصدقہ امام کے ساتھ منسلک رکھیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بہت سی احادیث ایسی ہیں جن کی رو سے جو مسلمان جماعت سے علیحدگی کی حالت میں مرا، یا بیعت کے بغیر مرا، یا امام کے بغیر مرا، درحقیقت اس نے جاہلیت کی موت پائی۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت آج جماعت سے لاتعلق ہے۔ ان کا کوئی امیر نہیں ہے جس کی اطاعت وہ اپنا مذہبی فریضہ مان کر کریں اور نہ ہی انہوں نے کسی کی بیعت اختیار کی ہے۔

مندرجہ ذیل احادیث ایسے لوگوں کو جاہلیت کی موت سے خبردار کرتی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا :

((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الاثْنَيْنِ أَبْعَدُ، مَنْ أَرَادَ بُحْبُوحَةَ الْجَنَّةِ فَلْيَلْزَمِ الْجَمَاعَةَ))

(سنن الترمذی، أبواب الفتن)

"جماعت میں شامل رہو اور فرقوں (گمراہ مسلمان جو جماعت کی شکل میں منظم نہ ہوں) میں تقسیم نہ ہو۔ اس لئے کہ یقیناً شیطان ایک (اکیلے رہ جانے والے مسلمان) کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دو (جو ایک جماعت میں منظم ہوں) سے دور رہتا ہے۔ جو کوئی جنت کی خوشبو سے لطف اندوز ہونا چاہے لازم ہے کہ وہ جماعت سے منسلک رہے۔" (ترمذیؒ)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ ((يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شُذَّ إِلَى النَّارِ)) (سنن الترمذی، أبواب الفتن)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا : "اللہ کا ہاتھ (یعنی اس کی تائید) جماعت کے ساتھ ہے، اور جو کوئی علیحدگی

اختیار کرتا ہے (جماعت سے) وہ جہنم کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔" (ترمذیؒ)

فَقَالَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ: ((إِنَّهُ لاَ إِسْلاَمَ إِلاَّ بِجَمَاعَةٍ، وَلاَ جَمَاعَةَ إِلاَّ بِإِمَارَةٍ، وَلاَ إِمَارَةَ إِلاَّ بِطَاعَةٍ)) (سنن الدارمی، المقدمہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جماعت کے بغیر کوئی اسلام نہیں، امارت کے بغیر کوئی جماعت نہیں ہے، اور اطاعت کے بغیر امارت کی کوئی حیثیت نہیں۔"

عَنِ الْحَارِثِ الْأَشْعَرِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((... وَأَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اللّٰهُ أَمَرَنِي بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلاَمِ مِنْ عُنُقِهِ إِلاَّ أَنْ يَرْجِعَ، وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ مِنْ جُثَاءِ جَهَنَّمَ، ... وَإِنْ صَامَ وَإِنْ صَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ)) (مسند احمد و سنن الترمذی)

حضرت حارث الاشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، مجھے اللہ نے ان کا حکم دیا ہے۔ جماعت کا التزام، سمع و طاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ۔ اور جان لو جو کوئی جماعت سے علیحدہ ہوا ایک بالشت بھر تو اس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلادہ اتار پھینکا، سوائے اس کے کہ واپس آ جائے۔ اور جس کسی نے کوئی جہالت کی پکار لگائی تو وہ جہنم کا ایندھن ہو گا ... اگرچہ وہ روزے رکھے، نماز پڑھے اور اسے زعم ہو کہ وہ مسلمان ہے۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ (رضی اللّٰه عنهما) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ((مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لاَ حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً))

(مسلم، کتاب الإمارہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:

"جس نے اطاعت (امیر) سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا تو اس کی ملاقات قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ہو گی کہ اس کے پاس کوئی (ایمان کی) دلیل نہ ہو گی اور جو کوئی فوت ہوا اس حال میں کہ اس کے گلے میں بیعت کا قلادہ نہ ہوا تو وہ تو جاہلیت پر مرا۔" (مسلمؒ)

عَنْ مُعَاوِيَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ مَاتَ بِغَيْرِ إِمَامٍ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) (مسند احمد)

حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص امام کے بغیر مرا اس نے جاہلیت کی موت پائی۔" (احمدؒ' ترمذیؒ)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللّٰه عنهما) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ ((مَنْ مَاتَ مُفَارِقًا لِلْجَمَاعَةِ فَقَدْ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) (مسند احمد)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص جماعت سے علیحدگی کی حالت میں مرا اس نے جاہلیت کی موت پائی۔" (احمدؒ)

کچھ لوگوں کے لئے ان احادیث کو پڑھنے کا یہ پہلا موقع ہو گا اور بے اعتباری کی وجہ سے شاید وہ ان کو مشکوک سمجھیں۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ صحیح احادیث نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں میں ان کا عام تذکرہ ہوتا اور نتیجتاً آج ہم بیعت سے مکمل کنارہ کشی اور خلافت کے خاتمہ کا مشاہدہ نہ کرتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے قرآن مجید اور احادیث شریف میں سود کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اور بڑے شد و مد کے ساتھ اس سے منع فرمایا گیا ہے' اس کے باوجود مسلمانوں کی بڑی اکثریت آج اس موضوع کی اہمیت سے بے خبر ہے' بلکہ بدبختی یہ ہے کہ اس ممانعت کی برملا حکم عدولی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ بیعت کے بارے میں ان احادیث کی مصدقہ حیثیت اور ثقاہت اس وقت واضح ہوئی جب شیخ الازہر (یعنی الازہر یونیورسٹی کے چانسلر) نے صحیح مسلمؒ کے حوالے سے ان احادیث کو اس مشترکہ اعلان میں نقل کیا جو الازہر اور مصر کے علماء کی طرف سے ترکی میں خلافت کے خاتمہ پر جاری کیا گیا تھا کہ:

"جو کوئی اس حال میں مرے گا کہ اس کے گلے میں بیعت کا قلادہ نہیں ہو گا (یعنی ایک امیر سے عہد نہیں کیا ہو گا کہ سمع و طاعت کے اصول پر اس کی اطاعت کریں گے) وہ جاہلیت کی موت مرا۔" (مسلمؒ)

ترکی کی اعلیٰ قومی اسمبلی نے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کے خاتمہ کا اعلان کیا تو الازہر سے اس واقعے کے تین ہفتہ بعد مذکورہ بالا اعلان جاری ہوا جو پوری مسلمان دنیا کے ردعمل کا مظہر تھا۔ اس حدیث کا اتنے اہم بیان میں حوالہ آنا ہی اس کی اہمیت اور (علماء کے نزدیک) اس کے صحیح ہونے کی کافی دلیل ہے۔

اب ہم ان لوگوں پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک امیر کی بیعت ضرور ہونی چاہئے، مگر وہ اس وقت بیعت کریں گے جب تمام امت میں خلافت کا نظام قائم ہو جائے گا۔ ان کو قائل کرنے کے لئے ہم واضح کریں گے کہ گزشتہ ۷۰ سال (۱۹۲۴ء۔ ۱۹۹۴ء) میں خلافت کا نظام دوبارہ قائم ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ (جاری ہے)

ضرورت رشتہ

اُمّتِ مُسلِمہ کی عمر(۹)

اور

مستقبل قریب میں مہدی کے ظہور کا امکان

امین محمد جمال الدین

شعبۂ دعوت و ثقافت، دعوتِ اسلامی کالج، جامعہ الازہر

کی معرکۃ الآراء کتاب "عمر امۃ الإسلام وقربُ ظهورِ المهدی" کا

چھٹا باب

راستے کی جھلکیاں

مترجم : پروفیسر خورشید عالم، قرآن کالج لاہور

فصل اول

عام واجبات

ذہن میں بہت ہی ضروری سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فتنوں اور خون ریز معرکوں کی تیاری کے لئے ایک مسلمان کو کیا کرنا چاہئے؟ خاص طور پر جبکہ ان فتنوں نے سر اٹھالیا ہے اور دفعتاً کسی لمحہ آیا چاہتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آنے والے مرحلے کی تیاری کے لئے مسلمان کے لئے عام واجبات یہ ہیں :

۱) علم : علم سے ہماری مراد وہ صحیح علم ہے جس کا ثبوت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

سے ملتا ہو۔ ایسا علم جو خرافات اور ضلالت و گمراہی سے پاک ہو۔ عام طور پر یہاں علم سے مراد قرآن' حدیث' فقہ اور شریعت کا علم ہے۔ اور خاص طور پر اس سے مراد اس مرحلہ کی سوجھ بوجھ ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ یعنی پہلا خونریز معرکہ کب ہو گا؟ مہدی کا ظہور کب ہو گا؟ ان کی علامت کیا ہے؟ دجال کا خروج کب ہو گا؟ اس کے اوصاف کیا ہیں؟ اور اس کے فتنہ کا طول و عرض کیا ہے؟ یہ عالم حاضر و موجود کا علم اور اس مرحلہ کی سوجھ بوجھ ہے۔

آنے والے مرحلہ کے واقعات' اس کے فتنوں' اس کے خونچکاں معرکوں سے عدم واقفیت ان فتنوں کے جال میں پھنسا کر انسان کو ہلاکت کے گڑھے کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ کوئی بھی بے خبر دجال کے فتنے میں مبتلا ہو سکتا ہے جب دجال اس سے کہے گا : کیا خیال ہے اگر میں تمہارے والدین کو زندہ کر دوں تو تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے؟ تو وہ جواب دے گا؟ ہاں۔ پھر دو شیطان اس کے والدین کی شکل دھار کر سامنے آ کھڑے ہوں گے اور کہیں گے بیٹے جی! اس کی پیروی کرو' یہ تمہارا رب ہے۔ چنانچہ وہ بے خبر اس پر ایمان لے آئے گا کیونکہ اسے یہ پتہ نہیں ہو گا کہ یہ دجال ہے اور اس کے فتنے کا سکوپ کیا ہے؟ چنانچہ علم کے سوا اس کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں۔ یہ علم اللہ کے حضور میں اخلاص' توفیق الہی اور صحیح فہم سے بارور ہو گا اور یہ صفات تقویٰ سے حاصل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے :

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

(البقرہ . ۲۸۲)

"اور خدا سے ڈرو! اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو جاننے والا ہے۔"

۲) <u>توبہ</u> : دوسری ضروری چیز گناہوں سے توبہ ہے' خواہ گناہ بڑے ہوں یا چھوٹے' خفیہ ہوں یا اعلانیہ۔ کیونکہ فتنوں اور جنگوں کے زمانے میں انسان کے ہوش و حواس اُڑ جائیں گے اور وہ اپنے نفس کی کُنہ تک نہ پہنچ سکے گا۔ اگر اس نے پہلے سے توبہ نہ کی ہو گی تو بھوک اور فقر' قحط اور خشک سالی اور جنگ و جدال اسے توبہ کی کہاں مہلت دیں گے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

"سات باتوں سے پہلے پہلے نیک کام کر لو۔ کیا تم ایسے فقر کے منتظر ہو جو غافل کر دے؟ یا ایسی تونگری کے منتظر ہو جو سرکشی پر آمادہ کرے؟ یا ایسے مرض کے منتظر ہو جو تباہ و برباد کر دے؟ یا ایسے بڑھاپے کے منتظر ہو جو عقل کو ضعیف کر دے؟ یا ایسی موت کے منتظر ہو جو کام تمام کر دے؟ یا دجال کے منتظر ہو؟؟ کیونکہ نہ دکھائی دینے والی برائی تمہارا انتظار کر رہی ہے یا تم قیامت کے آنے کے انتظار میں ہو کہ قیامت کی مصیبت سب سے بڑھ چڑھ کر ہوگی"۔ [1]

اے اللہ کے بندو! توبہ کر لو پیشتر اس کے کہ فتنے تم پر دھاوا بول دیں اور پیشتر اس کے کہ مغرب سے آفتاب طلوع ہو اور درِ توبہ بند ہو جائے۔

۳) دنیا سے بے رغبتی : اس کا مقصد دنیا سے روگردانی بالکل نہیں کیونکہ رسولِ خدا ﷺ کھاتے تھے، پیتے تھے، سوتے تھے، عورتوں سے شادی بھی کرتے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے اور دنیاداری کی طرف توجہ دیتے تھے مگر آپ ﷺ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے ایک پردیسی یا مسافر رہتا ہے [2] یعنی دنیا سے اس قدر زادِ راہ لو جو مسافر کو منزل تک پہنچا دے، چنانچہ اپنے ساتھ سوچ سمجھ کر سامان سفر لے کر جاؤ۔

مقصد صرف دنیا کی محبت کو ترک کرنا ہے کیونکہ یہ سب مصیبتوں کی جڑ ہے۔ جو آدمی دنیا سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ محبت اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے وہ حسد کرنے لگتا ہے، ظلم کا خوگر بن جاتا ہے، حرص و طمع کا شکار ہو جاتا ہے اور بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

۴) آخرت کا توشہ : اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ﴾

(البقرہ : ۱۹۷)

"اور زادِ راہ لے لیا کرو، یقیناً بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہو"۔

نیکیوں کا بازار شب و روز لگا ہوا ہے۔ کامیاب اور خوش بخت وہی ہے جو اس میں محنت کر کے نفع کماتا ہے۔ فریب خوردہ اور نقصان میں وہ ہے جو اس میں کوتاہی کرتا ہے اور گھاٹا اٹھاتا ہے۔ نیکی کے دروازے کئی ایک ہیں' آسان بھی ہیں اور سہل بھی۔ قرآن پڑھو' ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ملے گی۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں :

"جو کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھتا ہے اس کو ایک نیکی ملتی ہے اور ہر نیکی کی جزا دس گنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے' بلکہ الف ایک حرف ہے' لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے"۔ {۳}

اللہ کو یاد کرو۔ سبحان اللہ کہو' الحمد للہ کہو' اللہ اکبر کہو اور لا الٰہ الا اللہ پڑھو۔ کم کم سہی اسے وردِ زبان بناؤ اور اسے مسلسل پڑھتے رہو' تمہارے نامۂ اعمال میں پہاڑوں جتنی نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔

جی نہ چاہتا ہو تو پھر بھی پورا پورا وضو بناؤ۔ مسجدوں کی طرف زیادہ سے زیادہ قدم اٹھاؤ۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرو۔ اتنا ثواب ملے گا جتنا اس لشکر کو جو اللہ کی راہ میں سرحدوں کی حفاظت کے لئے قیام کرتا ہے۔

اپنے والدین کی فرمانبرداری کرو' صلہ رحمی کرو' پڑوسی سے اچھا سلوک کرو' مہمان کی مہمان نوازی کرو' تمہیں کئی گنا اجر ملے گا اور تمہارے درجات بھی بلند ہوں گے۔

سلام کو پھیلاؤ' کھانا کھلاؤ' مریض کی تیمارداری کرو' اور لڑنے والوں کے درمیان مصالحت کرادو۔ تمہارے درجات بلند ہوں گے اور تمہاری برائیاں جھڑ جائیں گی۔

بیوی اپنے شوہر کی اطاعت کرے' اس کے ساتھ ٹھیک طریقے سے رہے سہے' ساتھ ساتھ دین کے ارکان پر مداومت کرے۔ اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جائیں گے' جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

چنانچہ نیکی کے دروازے بہت سے ہیں' سب کھلے ہیں۔ اللہ کے بندو! جلدی سے نیکیاں کر لو اور اس جنت میں داخل ہو جاؤ جس کا عرض زمین و آسمان کی وسعتوں کے برابر ہے۔

۵) <u>اللہ کی طرف دعوت</u> : اس سے مراد صرف لیکچر یا خطبہ دینا نہیں ہے بلکہ مراد

یہ بھی کہ اپنے پڑوسی کو دین پر عمل کرنے کی اور اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھنے کی دعوت دو اور اپنے گھر والوں کو اللہ کی اطاعت اور عبادت کا حکم دو۔ اگر ایسا کرو گے تو اللہ کی طرف دعوت دینے والے کہلاؤ گے اور کسی کی بات اتنی خوبصورت نہیں ہو گی جتنی تمہاری۔ تمہیں بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا تمہارا کہا ماننے والوں کو۔

۶) <u>تابعداری</u> : مومن اللہ تعالیٰ کی شریعت کے بارے میں دلیل بازی نہیں کرتا۔ جب اس کے پاس اللہ یا اس کے رسول ﷺ کا کوئی حکم آتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ ہم نے سن لیا اور اطاعت کی۔

اللہ تعالیٰ کا قول ہے :

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾ (الاحزاب ۰ ۳۶)

"اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کو اپنے کام کا کوئی اختیار ہو۔ اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ کھلی گمراہی میں ہو گا"۔

اللہ انصار کی عورتوں پر رحم کرے جب اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ (النور : ۳۱) "اور وہ اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں" اور لوگ اپنے گھروں کو اللہ کی نازل کردہ آیات تلاوت کرتے ہوئے لوٹے تو عورتوں نے آیات کی تصدیق کرتے ہوئے اور اللہ کے قول پر ایمان لاتے ہوئے اٹھ کر اپنی چادروں کو پھاڑ کر اپنے سر ڈھانپ لئے اور وہ سروں کو ڈھانپے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے یوں کھڑی ہو گئیں گویا ان کے سروں پر کوے بیٹھے ہوئے ہیں۔ [۴]

۷) <u>فرقہ بندی اور اختلاف کو چھوڑنا</u> : اختلاف خواہ کسی قسم کا ہو برا ہے' اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ یہ ہم سے پہلے گزرنے والی امتوں کی بیماری ہے۔ ایسی لاعلاج بیماری کہ جب بھی کسی امت کو لاحق ہوتی ہے اسے تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اس کی ہوا اکھڑ جاتی

ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ـــــ احمد اور ترمذی کی زبیرؓ بن عوام سے مروی حدیث میں ـــــ فرمایا ہے :

"پہلی امتوں کی بیماری' حسد اور کینہ تمہارے اندر سرایت کر گئی ہے۔ یہ بیماری حجامت بنا دیتی ہے۔ دین کی نہ کہ بالوں کی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' تم اُس وقت تک مومن نہیں کہلا سکتے جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلادوں جس کے کرنے سے تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے۔ اپنے درمیان سلام کو پھیلاؤ!"

پس مسلمانوں کے درمیان انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے اختلاف ترک کرنا فرض اور واجب ہے' خاص طور پر ان دنوں جبکہ دشمن ان پر دھاوا بول رہے ہیں اور اقوامِ عالم مل جل کر ان پر ایسے ٹوٹ پڑی ہیں جیسا کہ کھانے والے پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

دیکھیے! ہر وہ آدمی جو آج کل مسلمانوں کے درمیان فروعی اختلافات کو ہوا دیتا ہے وہ گنہگار ہے' گنہگار ہے۔ ان لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہئے جو مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہیں اور ان کی جمعیت کو پریشان کر رہے ہیں۔

طوالت کے خوف سے ہم انہی فرائض پر اکتفا کرتے ہیں۔ مقدور بھر ہم نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ صرف ضروری باتیں لکھی جائیں۔ ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ ایسی لایعنی باتوں سے صفحوں کو کالا کرتے جائیں جن سے قاری اکتا جائے اور اس کا وقت برباد ہو۔ ہم اللہ سے دعاگو ہیں کہ وہ ہمیں علم' عمل اور اخلاص عطا کرے۔

<u>دوسری فصل</u>

خاص انتباہ اور خاتمہ

فتنوں اور جنگوں کے دوران ہم درج ذیل باتیں مسلمانوں کو ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں :

ـــ اے اللہ کے بندے! اس لشکر میں ہرگز شامل نہ ہونا جو بیت اللہ کے قریب مہدی سے

لڑنے کے لئے جائے گا۔ وہ لشکر بد نصیب ہو گا جسے زمین میں گاڑ دیا جائے گا۔

— اللہ کے خلیفہ مہدی کے ظہور کا یقین ہونے کے بعد یا تو خود جاکر اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا' اگر ایسا ممکن نہ ہو تو دل سے بیعت کرلینا۔

— اے اللہ کے بندے! بڑے خونریز معرکہ میں پسپا ہونے والے ایک تہائی شکست خوردہ لشکر میں سے نہ ہونا' وگرنہ توبہ سے محروم ہو جاؤ گے' بلکہ ثابت قدم رہنا' تمہیں دو نیکیوں میں سے ایک نیکی (غازی یا شہید) حاصل ہو گی۔

— دجال کے ظہور کے وقت مکہ یا مدینہ کی گود میں رہنا۔ اگر ایسا نہ کر سکو تو اس کے سامنے ڈٹ کر سورۂ کہف کی ابتدائی آیات یا آخری آیات پڑھنا' وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

— دجال کی روٹی اور اس کے پانی کے دریا کے قریب نہ پھٹکنا۔ وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ اے اللہ کے بندے! اُس آگ کا قصد کرنا جو اس کے پاس ہے۔ اپنے سر کو جھکالینا' اپنی آنکھوں کو نیچا کرلینا اور اس میں سے پی لینا' وہ میٹھا پانی ہو جائے گا۔

— پابندی سے تسبیح' تحمید' تکبیر اور تہلیل کرتے رہنا۔ بھوک' قحط اور خشک سالی کے دنوں میں یہی تمہارا کھانا پینا ہو گا۔

— دجال والا دن ایک سال کی مانند ہو گا۔ اس میں اپنی نماز کا اندازہ کرلینا۔ اس دن پانچ نمازیں کافی نہ ہوں گی۔ تمہارے لئے لازمی ہے کہ اس دن سال بھر کی نمازیں پڑھو۔

— عیسیٰ علیہ السلام کو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہنچانا۔

— ان لوگوں میں سے ہو جانا جو رات کو قیام کرتے ہیں۔ اس طرح اس طویل رات کو بیدار رہو گے جو مغرب سے طلوع آفتاب سے پہلے ہو گی' جس کے بعد در توبہ بند ہو جائے گا اور تمہارا خاتمہ بالخیر ہو گا۔

— اللہ کے جانور سے ڈر کر مت بھاگنا کیونکہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ وہ تو تمہارے چہرے پر نشان لگائے گا جس کے باعث اللہ کے حکم سے تمہارا چہرہ دمک اٹھے گا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے علم سے ہمیں نفع پہنچائے۔ اس بات کا علم عطا فرمائے جسے ہم جانتے نہیں اور ظاہری و باطنی ہر قسم کے فتنوں کو ہم سے دور رکھے، وہ ہمیں زندگی اور موت کی آزمائشوں سے اور مسیحِ دجّال کے فتنے سے بچائے کیونکہ وہ بہترین کارساز اور بہترین مددگار ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ○

"آپ کا رب جو بڑی عظمت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ کافر بیان کرتے ہیں۔"

وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ (اور سلام ہو پیغمبروں پر)

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

"اور تمام تر خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے"

جمعہ کی رات کو اس کتاب سے فراغت ہوئی

القاہرہ۔ ۱۳ صفر ۱۴۱۷ھ موافق ۵ جولائی ۱۹۹۶ء

امین جمال الدین

حواشی

{۱} ترمذی نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے، ان کا قول ہے کہ حدیث حسن ہے، اس کی سند میں کلام ہے۔

{۲} بخاری، مسلم اور احمد وغیرہ نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

{۳} ترمذی نے عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے اور کہا کہ حسن صحیح ہے۔

{۴} اس حدیث کے معانی کو بخاری نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ (بخاری کی روایت میں انصار کی عورتوں کی جگہ پہلے مہاجرین کی عورتوں کے الفاظ ہیں۔)

"تنظیم اسلامی کی دعوت"

ایک تصحیح ـــــــ ایک وضاحت

جنوری کے میثاق میں "تنظیم اسلامی کی دعوت" کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی حلقہ جنوبی پنجاب مختار حسین فاروقی صاحب کا جو مضمون شائع ہوا اس میں پروف ریڈنگ کی چند اغلاط رہ گئی ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں معذرت کے ساتھ مندرجہ ذیل تصحیح و وضاحت پیش خدمت ہے۔

۱) صفحہ ۴۲ سطر ۱۱ میں "پر انسان" کے بجائے "ہر انسان" پڑھا جائے۔

۲) صفحہ ۴۷ پر دینی فرائض کے تذکرے میں جزو (ج) کی عبارت نامکمل رہ گئی تھی۔ مکمل عبارت اس طرح ہے :

ج۔ اب پہلی چھت سے چار ستون مزید بلند ہوتے ہیں، جن پر دوسری چھت تعمیر ہوگی۔ یہاں بھی یہ فرائض توجوں کے توں رہیں گے۔ اس دوسری چھت کو ہم ان الفاظ سے موسوم کر سکتے ہیں : "ہر مسلمان کا دین کا علمبردار بننا اور اس کو پھیلانا"۔ اس کے لئے قرآن و حدیث کی یہ اصطلاحات ہیں : i) تبلیغ ii) دعوت iii) انذار و تبشیر iv) وعظ و نصیحت v) شہادت علی الناس vi) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

۳) صفحہ ۵۴ پر آخری سے پہلے پیرے میں لفظ "قلزم" کے بجائے "ملتزَم" ہونا چاہئے تھا ـــــ یعنی "خیر القرون کے بعد اسلام کے گہوارے میں آنے والا "آخَرِينَ مِنْهُمْ" کا یہ خطہ جو جغرافیائی نقشہ میں عین ملتزَم کے سامنے ہے، شاید عالمی خلافت کا نقطہ آغاز ثابت ہو جائے"۔

(واضح رہے کہ "ملتزَم" بیت اللہ میں طواف کا شوط شروع کرنے کا مقام ہے۔)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ

خواتین کے ایک اجتماع میں ایک بہن کا خطاب

خطبہ مسنونہ کے بعد پڑھا :

﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۸۵)

"ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے' اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا' تو جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا' اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے"۔

اللہ احکم الحاکمین کی پر حکمت اور پر رحمت کتاب میں سے جس بابرکت مقام کا ترجمہ میں نے آپ کے گوش گزار کیا ہے پہلے اس مقام کی پہچان فرمالینا ضروری ہے۔ یہ مقام عالی شان اللہ ملک العلام ذوالجلال والاکرام کی پر رحمت کتاب کے چوتھے پارے کا دسواں رکوع اور سورۂ آل عمران کا انیسواں رکوع ہے۔ اس مقام عالیشان میں اللہ عظیم و برتر نے ایک ایسا مسئلہ بیان فرمایا ہے جس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جتنے بھی انسان گزرے ہیں' خواہ وہ مومن ہوں یا کافر و مشرک ـــــ نمرود اور فرعون ہوں یا خلیل اللہ اور کلیم اللہ علیہم السلام' یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس میں آج تک کسی فرد بشر نے اختلاف نہیں کیا۔ وگرنہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں اختلاف نہ ہو۔ دنیا میں صرف یہی ایک مسئلہ ملے گا جس میں کسی نے اختلاف نہ کیا ہو اور یہ مسئلہ ہے موت!

موت میں آج تک کسی کو اختلاف نہیں' چاہے وہ ابو جہل اور ابو لہب ہوں یا ابو بکر صدیق ؓ اور عمر فاروق ؓ۔ یہ مسئلہ اتنا اٹل ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ہر بات میں اختلاف ہوا

لیکن موت میں اختلاف نہیں ہوا۔ اس کے بارے میں میرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے :

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ' اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ○ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ' وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ' وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ○ ﴾

مکہ کے کافر کہتے ہیں محمدؐ کو کب موت آنی ہے؟ اللہ فرماتے ہیں ۔ اے محبوبؐ! آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک انسان گزرتے چلے گئے' ہم نے کسی انسان کے لئے ہمیشہ زندہ رہنا رکھا ہی نہیں۔ کوئی انسان آب حیات پی کر نہیں آیا۔ جو آیا اس نے اپنی زندگی گزاری اور چل بسا۔ ان کا وقت ختم ہوا اور اس دنیا سے چلتے بنے۔ "اَفَاِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ؟" اے محبوبؐ! اگر آپ نے وفات پائی ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ زندہ رہیں گے؟؟ "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ' وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً"۔ موت تو ہر جاندار کو آنی ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں ہم نیکی اور بدی کے ساتھ تمہاری آزمائش کرتے ہیں۔ نیکی کمانے والے کو بھی موت آنی ہے مگر وہ کتنی اچھی موت ہے جو نیکی کی راہ میں آجائے۔ اور وہ موت کتنی افسوسناک ہو گی جو بدی کے راستے میں آجائے۔ آنکھیں تو قیامت کو کھلیں گی۔ اے اللہ! قرآن کے نور کے ساتھ ہمارے سینوں کو منور فرما۔

سورۃ الجمعہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِىْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ ﴾

یعنی اے محبوبؐ! کہہ دیجئے! وہ موت جس سے تم بھاگ رہے ہو' جس سے حفاظت کا سامان تیار کر رہے ہو' ایک وقت آئے گا کہ وہ تمہیں مل کر رہے گی۔ کوئی حاکم ہو یا کوئی محکوم' کوئی زبردست ہو یا ضعیف' کوئی اس مسافر خانے میں آنے کی تیاری کر رہا ہے اور کوئی آچکا ہے' کوئی آ رہا ہے اور کوئی آکر جا چکا ہے۔

اس دنیا کی زندگی کے متعلق ہر فرد بشر سمجھتا ہے کہ نہایت عارضی زندگی ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ کئی بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں جو صرف ایک دو سانس لے کر اگلی دنیا کو

کوچ کر جاتے ہیں۔ کئی ایسے ہوتے ہیں جو صرف چند دن اس دنیا میں آنکھیں کھولتے ہیں۔ ماں کا دل ٹھنڈا کیا' باپ کی آنکھیں ٹھنڈیں کیں۔ ماں باپ ابھی خوشیاں منا رہے ہیں' اس کے عقیقہ کے لئے بکرے خریدے جا رہے ہیں اور آنے والا دنیا سے چلا بھی گیا ـــــ ابھی بازار سے کپڑے کھلونے اور بائیسکل خرید کر لا رہے ہیں' ابھی جوتے کا تلا بھی نہیں گھسا کہ پہننے والا اس دنیا سے چلا بھی گیا ـــــ ایک بچہ بیس بائیس برس کا جوان ہوا' ماں باپ نے منگنی کر دی' شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں' زیورات خریدے جا رہے ہیں' بُری خریدی جا رہی ہے۔ آج شادی کا دن ہے' دولہا میاں بارات لے کر دلہن کے گھر جا رہے ہیں۔ ابھی بارات منزل مقصود تک نہیں پہنچی کہ راستے میں حادثہ پیش آگیا اور دولہا میاں کی لاش گھر واپس آگئی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طرف سے کسی نوجوان کی بارات جا رہی ہوتی ہے تو دوسری طرف سے ایک نوجوان کا جنازہ چلا آ رہا ہے۔ پتہ چلا کہ موت نہ جوانی دیکھتی ہے نہ بڑھاپا نہ بچپن ـــــ اور نہ کسی کی دولت دیکھتی ہے نہ عزت اور عظمت۔ کوئی پانچ برس زندہ رہا' کوئی پچاس برس' اور کوئی حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ساڑھے نو سو سال ـــــ لیکن ایک وقت ایسا آنا ہے کہ موت آنی ہے اور قبر کے دروازے سے گزرنا ہے۔ اے لوگو! موت آنے والی ہے۔ اس سے پہلے کچھ تیاری آخرت کے لئے بھی کر لو۔

موت کا راز رب نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ اگر اللہ موت کا راز کسی کو بتاتا تو کم از کم اپنے نبیؐ کو بتاتا۔ جب موت سرہانے آ کھڑی ہو گی تو آدمی کہے گا اے اللہ' کچھ دنوں کی مہلت دے دے۔ اگر دنوں کی نہیں تو کچھ گھنٹوں کی مہلت دے دے۔ ماں سے کوئی بات کر لوں' بچوں کو ہی سینے سے لگا لوں' کچھ صدقہ خیرات کر لوں۔ اللہ فرمائے گا تجھے میں نے ساٹھ سال مہلت دی' اسّی سال مہلت دی' سو سال عمر دی' لیکن تو نے کوئی قدر نہ کی' اب تجھے ایک سانس کی مہلت بھی نہ ملے گی۔ اپنی طویل زندگی میں تو ہماری طرف نہیں آیا بلکہ تیرے فخر اور غرور کے غبارے فضاؤں میں اڑتے رہے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ۝ وَأَنْتُمْ حِينَئِذٍ تَنْظُرُونَ ۝

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ○ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ○ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(الواقعہ : ۸۳-۸۷)

فرمایا : اے بندے! جب کسی کا سانس حلق میں پہنچ جاتا ہے اور اس وقت تم دیکھ رہے ہوتے ہو کہ ایک طرف عزیز و اقارب کھڑے ہیں' دوسری طرف ڈاکٹر اور حکیم کھڑے ہیں' بیوی بچے اور دوست احباب بھی موجود ہیں۔ لوگوں کا اجتماع ہے۔ لیکن اے بندے! حقیقت میں یہ سب سے دُور ہیں' اگر سب سے زیادہ کوئی قریب ہے تو اللہ کی ذات ہے۔ اللہ کہتا ہے میں اب تیری روح نکالنے لگا ہوں۔ دنیا جہان کے ڈاکٹروں' حکیموں اور اعزہ و اقارب سے کہو کہ وہ اس کو واپس کر لیں!! پتہ چلا کہ موت اٹل ہے' چاہے کوئی نبی ہو یا نبی زادہ' چاہے کوئی ولی ہو یا ولی زادہ' موت کے پنجے سے نہ کوئی بچ سکا ہے نہ بچ سکے گا۔

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے ساتھ ایک بی بی کی ملاقات ہوتی ہے۔ سوال کرتے ہیں : "بی بی کہاں سے آئی ہو؟" بی بی ہر بات کا جواب قرآن کی آیت سے دیتی ہے۔ جواب ملتا ہے : "سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" پوچھا : بی بی تمہارا نام کیا ہے؟ جواب ملتا ہے : وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ یعنی نام مریم ہے۔ پوچھا : کوئی بیٹا ہے؟ جواب ملتا ہے : "وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ" یعنی دو بیٹے اسحاق اور یعقوب ہیں۔ پوچھا : کیا تمہارے پاس سواری ہے؟ جواب دیا : "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" کہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے' دوست رکھتا ہے' اگر سواری دو گے تو اجر پاؤ گے۔ بی بی کو سواری دی گئی۔ جب سوار ہوئی اور چلنے لگی تو پڑھا : "سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ' وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ" جب بیت المقدس آگیا تو بی بی نے پہلے مسجد اقصیٰ میں دو رکعت نماز پڑھنی شروع کی۔ جب پہلے سجدہ میں گئی تو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ (یا اللہ زندگی دے تو اس طرح بسر کرنے کی

توفیق دے اور اگر موت دے تو اس طرح کی موت دے)۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے ان کے بیٹوں سے پوچھا کہ تمہاری والدہ کوئی بات قرآن کے بغیر نہیں کرتی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ ہماری ماں نے چالیس برس سے کوئی بات ماسوائے قرآن کے نہیں کی۔ اس لئے نہیں کی کہ "مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ" یعنی ہر بات جو انسان کے منہ سے نکلتی ہے لکھی جاتی ہے۔ ہماری ماں کہتی تھی کہ قیامت کے دن جب میرا نامہ اعمال پیش ہو تو اس میں قرآن کے سوا اور کوئی بات نہ ہو۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ ہمارے اعمالنامہ میں کہیں جھوٹ ہے' کہیں گالیاں ہیں' کہیں الزام تراشیاں ہیں۔ یا اللہ ہم سب کو اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔

اِس دنیا میں کسی کو ہمیشہ رہنا ہوتا تو آمنہ کے لال ﷺ رہتے۔ جب وہ نہیں رہے تو اور کون ہمیشہ رہ سکتا ہے؟ جب میرے آقا کی باری آئی تو چودہ دن بخار آیا۔ (جس کو خود بخار چڑھ جائے وہ مشکل کشا کیسے ہو سکتا ہے؟) جبرائیل بھی آتا ہے اور عزرائیل بھی آتا ہے۔ اللہ نے فرمایا: اے جبرائیل' دستک دینا اور پہلے تم اندر جانا' اگر میرا محبوب اجازت دے تو عزرائیل اندر جائے۔ آقا کو بے ہوشی تھی اور اتنا سخت بخار تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اُمّ المومنین فرماتی ہیں کہ ہم نے آپؐ کے جسم مبارک پر سات مشکیں پانی کی ڈالیں تو بخار کچھ کم ہوا۔ جب جبرائیل نے دستک دی تو آپؐ کے گھر والوں نے سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہے اور عیادت کرنے والوں نے تنگ کر دیا ہے' کیونکہ لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اندر آنے کی اجازت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ہوش آیا تو فرمایا: بیٹی کیا بات ہے؟ کہا: ابا جان باہر کوئی اعرابی ہے جو اندر آنا چاہتا ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کوئی اعرابی نہیں' یہ وہ ہے جو بچوں کو یتیم کرتا ہے' سہاگنوں کا سہاگ ختم کرتا' شہروں اور گھروں کو ویران کرتا ہے۔

میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اے اللہ! جب موت آئے تو تیری عبادت کرتے ہوئے آئے اور موت آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں آئے۔ آمین

وآخرُ دَعوانا اَنِ الحمدُ للّٰہ ربِّ العٰلمین O
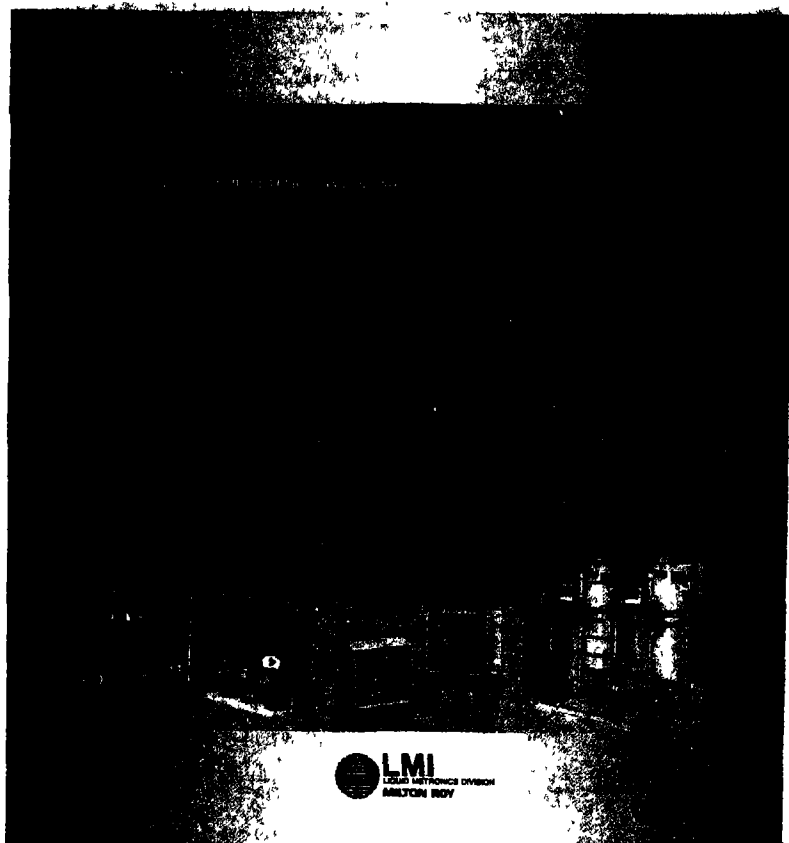
LMI
MILTON ROY

حضرت امام شامل ؒ (۵)

امام شامل ؒ کے حالات زندگی پر انگریزی زبان میں شائع ہونے والی کرنل محمد حامد اور لیسلے بلانچ کی کتب سے ماخوذ

ترتیب و ترجمہ : اظہار احمد قریشی

لڑائی کے درمیان وقفہ میں جبکہ طرفین ایک دوسرے کا موازنہ کر رہے تھے امام شامل اور ان کے نائب نماز اور ذکر میں مصروف ہو گئے۔ یہ اپنا وقت مسجد میں گزار رہے تھے جس کی عمارت سلامت تھی اگرچہ اس کا مینار روسی توپ خانے نے گرا دیا تھا۔ اس دوران عورتیں غاروں اور ملبہ میں سے نکلنی شروع ہو گئیں اور انہوں نے خانگی ساماحول پیدا کر دیا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے چولہے جلا کر روٹیاں پکانی شروع کر دیں۔ بکھرے ہوئے پتھروں کو ٹھکانے لگایا' مسجد کا چھت سے لٹکتا ہوا پیتل کا لیمپ پالش کیا' خوبصورت جائے نمازوں کو جھاڑا۔ یہ خوبصورت جائے نمازیں امام شامل کی انتہائی سادگی کے باوجود ان کے قلعہ کی مسجد میں آراستہ تھیں۔ عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی تلواریں ایک جانب رکھ دیں اور اپنے پھٹے ہوئے اور لڑائی کے دھبوں والے کپڑوں کی مرمت کرنے لگیں اور اسی طرح مرد مجاہدوں کے جوتے اور لباس مرمت کرنے لگیں۔

جنگ سے بچے ہوئے بچے محفوظ کونوں میں کھیلنے' ناچنے کودنے اور دھوپ سینکنے لگے۔ غاروں کے اندھیروں سے نکل کر یہ بہت خوش ہوتے تھے۔ ان میں جو پانچ یا چھ سال سے زیادہ عمر کے تھے وہ نیزہ بازی کی مشق کرتے تھے یا اپنی تلواروں کو بڑے ماہرانہ انداز میں تیز کرتے تھے۔ ان بچوں میں ایک آٹھ سالہ لڑکا بھی تھا۔ یہ امام صاحب کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کا نام جمال الدین تھا۔ اس کا اس کتاب کی کہانی میں بہت حصہ ہو گا۔ جمال الدین دبلا' سنجیدہ نظر آنے والا چھوٹا سا لڑکا تھا۔ اس کی بڑی بڑی کالی ترچھی آنکھیں اپنی

ماں پر تھیں۔ اس کے چہرے پر نہایت دلکش مسکراہٹ ہوتی تھی۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں چلتا تھا اور اپنے والد کے ساتھ ہر جگہ جاتا تھا۔ یہ اب تک مکمل گھوڑسوار اور نشانہ باز بن چکا تھا اور امام صاحب کے ساتھ کئی جگہوں پر حملہ کرنے میں شامل رہ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ایک تلوار رہتی تھی جو محسوس ہوتی تھی کہ اس کے لئے زیادہ وزنی ہے۔ اس علاقہ میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی' یہاں تو بارہ سال کا لڑکا مکمل جنگجو شمار ہوتا تھا۔ محاصرہ کے دوران جمال الدین اپنے والد سے ایک قدم پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ جنگی محاذ پر' مسجد میں یا مجاہدین کی جنگی مجلس مشاورت میں' ہر جگہ وہ اپنے والد سے ایک قدم پیچھے ہوتا تھا۔

اب روسیوں نے فیصلہ کرلیا کہ اکھلگو فتح نہیں ہو سکتا جب تک مجاہدین کی سپلائی لائن نہ کاٹ دی جائے اور قلعہ بندیوں کو مکمل طور پر چاروں طرف سے نہ گھیرلیا جائے اور دریائے کوسو پر خستہ حال پلوں کی تعمیر نو نہ کرلی جائے۔ اس کام میں ایک مکمل مہینہ صرف ہوا۔ مجاہدین کی سخت مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود ایک پل آخرکار بن گیا۔ مجاہدین کھلے علاقہ میں روسی توپ خانہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔

روسیوں کو مزید کمک غمری کے راستے سے پہنچ گئی۔ غمری امام صاحب کی جائے ولادت تھی اور امام صاحب کو اعتماد تھا کہ غمری امام صاحب کی وفادار رہے گی اور مشترکہ دشمن کی مخالفت کرے گی۔ لیکن غمری نے کوئی حرکت نہیں کی اور روسی قافلوں کو اجازت دے دی کہ وہ بلاخوف وخطر گزر جائیں۔ امام صاحب نے غمری کی یہ حرکت کبھی معاف نہیں کی۔ بھاری توپیں نئی جگہوں پر نصب کردی گئیں۔ دو بٹالین فوج محاصرہ سے ہٹا کر سب طرف پھیلادی گئی تاکہ کوئی مجاہد اکھلگو تک کوئی سامان نہ پہنچاسکے۔ اسی زمانے میں ایک روسی کاریگر نے ایک لمبی لکڑی کی گیلری بنائی جس میں روسی سپاہ' مجاہدین کی گولیوں سے محفوظ رہتے ہوئے سفر کرسکتے تھے اور جہاں ان کی ضرورت تھی وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔ یہ بالکل نئی اختراع تھی۔

اگست کے وسط تک جنرل گراب نے اپنے آپ کو اس کامیابی پر مبارک باد دی کہ اکھلگو مکمل طور پر گھیرے میں ہے اور باہر سے کٹ چکا ہے اور اب بس قبضہ ہونے ہی

والا ہے۔ سخت گرمی کے باعث روسی سپاہ میں قریباً نصف لوگ ٹائفائڈ میں مبتلا تھے۔ ادھر قلعہ کے اندر حالات بے حد خراب تھے۔ کنواں خشک ہو چکا تھا۔ خوراک اور ایندھن ختم تھے۔ زخمیوں کو باہر نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ لکڑی وہاں نہیں تھی چونکہ اس پہاڑی علاقے کا لیول جنگلات سے اونچا تھا۔ روسی توپیں رات دن گولے برسا رہی تھیں اور اس گولہ باری سے زیر زمین پناہ گاہیں اور حفاظتی انتظامات بھی متاثر ہو رہے تھے جن کو امام صاحب نے سخت محنت اور اعتماد سے تعمیر کیا تھا۔

بالآخر امام صاحب کو معلوم ہو گیا کہ وہ پھنس گئے ہیں۔ بہت تھوڑے سے مجاہدین زندہ بچے تھے۔ عورتوں اور بچوں میں سے نصف مر چکے تھے اور گولہ بارود تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ قبل ایک نزدیکی گاؤں چرکائی کے سردار نے جنرل گراب کو اپنی خدمات بیچ بچاؤ کے لئے پیش کی تھیں تو گراب نے اسے بتلا دیا تھا کہ وہ امام شامل کے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی بات نہیں مانے گا۔ اس کے علاوہ امام صاحب کا بیٹا جمال الدین لازماً ضمانت کے طور پر دیا جائے تاکہ امام صاحب صلح کی بات چیت کے دوران نیک چلنی پر قائم رہیں۔

پہلے پہل امام صاحب ان شرائط کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے اور انہوں نے بڑا سخت جواب دیا جس کے بارے میں روسیوں کا کہنا یہ تھا کہ یہ جواب اس قابل نہیں تھا کہ ایک روسی جرنیل کو دیا جاتا۔ لیکن اب امام صاحب کے پاس اپنے فخر و اعتماد کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی عزت نفس اس تذلیل پر اور شکست کی تلخیوں پر بڑی کھول رہی تھی اور وہ جمال الدین کو دینے پر بھی خود کو راضی نہیں کر سکتے تھے۔

مزید ایک ہفتہ اکادکا حملوں اور بے کار گولیاں چلانے کے بعد اور بخار اور تھکن کی وجہ سے نقصانات کے بعد طرفین مزید کمزور ہو گئے۔ لیکن روسیوں کے لئے اکھلگو کی فتح زیادہ آسان نہیں ہوئی' نہ ہی امام صاحب جنگ کو لمبا کر سکنے کی بہتر پوزیشن میں آئے۔ اس وقت تک ان کے بقایا مجاہدین اس قدر تھک چکے تھے کہ وہ برسرعام موت کے لئے دعا کرتے تھے۔ صرف امام صاحب کا اعتماد اور ان کی قوت ارادی اس مقابلے کو جاری رکھے ہوئے تھی۔ قلعہ بندیوں کے اندر جابجا لاشیں پھیلی ہوئی تھیں اور گدھ ٹوٹے پڑتے تھے جبکہ بچے کھچے لوگ جو زیادہ تر عورتیں تھیں ان گدھوں کو زخمیوں سے دور

رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ۱۸/اگست کو امام صاحب نے سفید جھنڈا لہرادیا اور بڑی تلخی اور بڑے صدمے کے ساتھ ننھے جمال الدین کو یرغمال کے طور پر ان قابل نفرت غیر مسلموں کو دینے پر رضامند ہوئے۔ بچہ رویا نہیں۔ اس کے والد اور والدہ دونوں نے اسے کہا تھا کہ وہ دشمن کے سامنے پروقار رہے۔

جمال الدین کی آئندہ کہانی

حضرت امام شامل اوپر کھڑے جمال الدین کے جانے کا منظر دیکھتے رہے اور اس واقعہ کے انتقام لینے پر غور کرتے رہے۔ اس انتقام میں سولہ سال لگیں گے اور آخر میں پھر جمال الدین اس میں متعلق ہو گا۔ وہ ساری رات امام صاحب نے گہرے فکر اور غصہ میں گزاری۔ ان کے قلعہ پر دشمن کا قبضہ ہو جائے ان کا بیٹا یرغمال میں دے دیا جائے۔ یہ دونوں اللہ کے نام پر قربان ہو جائیں۔ اللہ ان کی مدد کرے گا اور وہ وقت آنے پر دونوں کو دوبارہ حاصل کرلیں گے۔

اگلے روز امام صاحب کو صلح کی گفتگو کرنی تھی۔ جنرل پلو اور اس کا شاف قلعہ میں داخل ہوئے اور ایک پتھروں سے بھرے ہوئے غار میں جس کے گرد مجاہدین کی سڑتی ہوئی لاشیں تھیں۔ امام صاحب ان سے اپنے عمومی مغرورانہ انداز میں کسی بھی قسم کے جذبات ظاہر کئے بغیر ملے۔ امام صاحب نے کہا کہ میں دو شرائط پر ہتھیار ڈالوں گا۔ اول یہ کہ مجھے اپنے علاقہ داغستان میں رہنے دیا جائے اور جمال الدین نزدیکی گاؤں چرکی میں چرکی کے سردار کی نگرانی میں رہے۔ جنرل پلو کمانڈر انچیف کے پاس یہ خبر لے کر گئے۔ سارے ماحول پر بڑی منتظر خاموشی چھا گئی۔ گفت و شنید کئی دن جاری رہی۔ جنرل گراب نے بھی محسوس کرلیا کہ امام صاحب کے متعلق جو جنرل کلوگنو کا تجربہ تھا یہ ویسے ہی کوئی بھی بات نہ ماننے والے اور ضدی ہیں۔ جنرل گراب نے کہا کہ امام صاحب کا لہجہ ناقابل برداشت ہے۔ اتنی جنگ کے ساتھ گستاخی بھی ہے۔ چنانچہ میں امام کا سر مزید جھکاؤں گا۔ چنانچہ جنرل گراب نے ٹکا سا انکار بھیج دیا کہ امام صاحب کو جہاں زار روس کا حکم ہو گا رہنا ہو گا اور یہ کہ جمال الدین کو پہلے ہی سینٹ پیٹرز برگ بھیجا جا چکا ہے' جہاں حکومت فیصلہ

کرے گی کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔

روسیوں کی جانب سے جمال الدین کو بھیجنے کی کارروائی بڑی چبھن والی دھوکہ دہی تھی۔ یہ اغوا تھا اور ان تمام جنگی اصولوں کی نفی تھی جس پر وہ فخر کرتے تھے اور جس کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں پر اخلاقی طور پر برتر تھے۔ اس کارروائی کے ذریعہ روسیوں نے امام صاحب کو ایک غیر مہذب ڈاکو والا سلوک دیا جبکہ وہ ایک سیاسی مخالف تھے۔ جمال الدین کو روسیوں نے صلح کی گفت و شنید کے دوران کے لئے لیا تھا۔ اسے اتنی دور روانہ کرنا دھوکہ تھا۔

روسیوں کا پیغام امام صاحب کو بجلی کی کڑک محسوس ہوا۔ ان کا جواب بڑی زوردار فائرنگ تھا جس سے روسیوں کو یہ پیغام تھا کہ ہم نہیں مانیں گے۔ امام صاحب کے تصور میں بھی یہ نہ تھا کہ روسی اس قدر جلد جواب دیں گے اور اس قدر ظالمانہ کارروائی کریں گے اور یہ کہ جمال الدین کو اس قدر دور بھیجنے سے پہلے اس کے والد کو اطلاع بھی نہیں دیں گے۔ امام صاحب اب بیٹے کو حاصل کرنے کے لئے کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ روسی اب جمال الدین کو اپنے سب سے کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال کریں گے۔ اب امام صاحب کی واحد امید اس جگہ سے فرار تھی۔ اکھلگو ہار دیا جائے' لیکن تحریک مجاہدین چلنی چاہئے' تاکہ اس علاقے کی آزادی اور جمال الدین کے حصول کی خاطر جنگ جاری رکھی جائے۔

اگلے دن جب روسیوں نے حملہ کیا اور وہ جوابی کارروائی کی توقع کر رہے تھے تو بڑی بامعنی خاموشی چھائی رہی۔ وہ آگے بڑھے لیکن کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوئی۔ روسی بڑی تعداد میں قلعہ میں داخل ہو گئے۔ بالکل خاموشی چھائی رہی۔ صرف گدھ لاشوں کے بڑے ڈھیر پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ جب حملہ آوروں نے اس ویران آبادی کے ایک حصہ کا چکر لگایا تو انہیں اس گہرے کھڈ کے پار بہت سارے آدمی نظر آئے جو پرانے اکھلگو کی جانب چڑھے چلے جا رہے تھے۔ جب روسی سپاہی ان کو دیکھ رہے تھے تو اچانک ان کو دیہاتیوں کی ایک بھیڑ نے آلیا جو کہ امام صاحب کا ترانہ گا رہے تھے۔ ان لوگوں کا مقصد اتنا قلعہ کی حفاظت نہیں تھا جتنا کہ یہ اللہ کے واسطے مرنا چاہتے تھے۔

بڑی زوردار لڑائی ہوئی۔ عورتیں مردوں کی طرح بے جگری سے اپنی مدافعت کر رہی تھیں اور بالکل غیر مسلح حالت میں سنگینوں پر خود کو ڈال رہی تھیں۔ لیکن ان پر قابو پا لیا گیا اور اب روسیوں نے پرانے اکھلگو پر توجہ کی جہاں بقایا مجاہدین آخری جنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ مجاہدین اب بھی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھے اور چونکہ روسی بالکل نزدیک تھے تو مجاہدین نے نہایت سخت دست بدست لڑائی لڑی۔ چنانچہ لڑائی ایک ہفتہ مزید جاری رہی۔

پتھر کی ہر جھونپڑی اور ہر غار طاقت کے استعمال سے ہی قابو کئے جا سکے۔ عورتیں اور بچے، پتھر یا تلواریں ہاتھوں میں اٹھائے روسیوں کی سنگینوں پر اپنے آپ کو ڈال دیتے تھے یا پھر مایوسی کی صورت میں اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا دیتے تھے۔ ان میں حضرت امام شامل کی بہن بھی تھی۔ اس انتہائی خونریز لڑائی کے مناظر تصور میں لانے بھی مشکل ہیں۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو خود اپنے ہاتھوں قتل کیا تاکہ وہ روسیوں کے ہاتھ نہ آجائیں۔ کئی خاندان اپنے مکانوں کے ملبے تلے ختم ہو گئے۔ بعض مجاہد جو گہرے زخموں کی وجہ سے تھکے ہوتے تھے اپنی جانوں کے عوض بڑی قیمت وصول کرتے تھے۔ وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ انہوں نے اپنا اسلحہ چھوڑ دیا ہے لیکن پوری مکاری سے ان روسی سپاہیوں پر وار کرتے تھے جو ان کے نزدیک آتے تھے۔

مجاہدین کو دریائے کوسو کے اوپر کے غاروں سے نکالنے میں بے انتہا مشکلات کا سامنا ہوا۔ روسیوں کو اپنے سپاہی رسوں کی مدد سے نیچے اتارنے پڑے۔ روسی سپاہی بے شمار لاشوں کی بدبو سے بے حال ہو گئے۔ دونوں اکھلگوؤں کے درمیان کے گہرے کھڈ میں حفاظتی دستہ بدبو کی وجہ سے ہر چند گھنٹے بعد بدلنا پڑتا تھا۔ ایک ہزار سے زیادہ لاشیں گنی گئیں۔ بے شمار دریا میں بہہ گئیں یا چٹانوں پر پڑی سڑ رہی تھیں نو سو قیدی پکڑے گئے جن میں زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے لیکن انہوں نے بھی اپنے زخموں اور تھکاوٹ کے باوجود آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بعض نے اپنی بقایا طاقت استعمال کر کے اور روسیوں سے سنگینیں چھین کر خودکشی کر لی تاکہ قید نہ ہونا پڑے اور زندگی ختم ہو جائے۔ اس سارے ڈرامہ کا آخری منظر یہ تھا کہ کچھ بچے جو زندہ بچ گئے تھے وہ رو رہے تھے اور

آہ و بکا کر رہے تھے اور زخمی اور قریب الموت لوگ کراہ رہے تھے۔

۲۹/اگست کو محاصرہ ختم ہو گیا۔ یہ ۸۰ دن لمبا محاصرہ تھا جس کے دوران روسیوں کی نصف فوج ختم ہو گئی۔ لیکن روسیوں کی فتح بڑے اضطراب میں تبدیل ہو گئی کیونکہ امام صاحب غائب ہو گئے تھے۔

اکھلگو کے محاذ پر شکست کے بعد
امام شامل کا دشمن کے نرغے سے فرار

کافی عرصہ تک امام صاحب کے غائب ہونے کے بارے میں حقیقت معلوم نہیں ہو سکی۔ امام صاحب کا غائب ہو جانا ایک معجزہ ہی معلوم ہوتا تھا، لیکن آخر کار معلوم واقعات سے مسلسل کہانی بن گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱/اگست کی رات کو جب امام صاحب کو معلوم ہوا کہ جمال الدین کو سینٹ پیٹرز برگ بھیج دیا گیا ہے تو انہوں نے اس انتہائی دلیرانہ فرار کی سکیم بنائی اور اس پر عمل کیا۔

یہ رات بڑی سخت تاریک تھی اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ امام صاحب معہ ان کی عزیز بیوی فاطمہ اور غاضی محمد جو ان کا چھوٹا بیٹا تھا، چند وفادار نائب، امام صاحب کی دوسری بیوی جاورت اور اس کا چند ماہ عمر کا بیٹا سعید، یہ سب اس مہم پر چل پڑے۔ فاطمہ ان کا ساتھ نہیں دے سکی۔ وہ سب رینگتے ہوئے پہاڑ سے اتر رہے تھے اور پہاڑ سے چمٹے ہوئے تھے۔ فاطمہ کو آٹھ مہینے کا حمل تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ وہ زیادہ آہستہ رفتار سے پیچھے آئیں گی اور دور نیچے دریا پر سب کے ساتھ مل جائیں گی۔ اس نشیبی سفر کے آدھے راستہ میں یہ لوگ پورا ایک دن ایک غار میں چھپے رہے۔ اس دوران انہوں نے قطعاً کوئی حرکت نہیں کی اور نہ ہی فاطمہ پر نظر ڈالی کہ کہیں کسی روسی سپاہی کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔

اگلی رات کی تاریکی میں وہ اس کھڈ کو عبور کرنے میں ایک درخت کے تنے کی مدد سے جو بڑے خطرناک طریق پر کھڈ پر پڑا تھا، کامیاب ہو گئے۔ امام صاحب نے غاضی محمد کو

اپنی کمر پر اٹھایا ہوا تھا اور بچے کے جوتے منہ میں پکڑے ہوئے تھے۔ آخر کار وہ مقابل کی چٹان تک حفاظت سے پہنچ گئے۔ اس وقت امام صاحب نے دیکھا کہ فاطمہ نابوں تک پہنچ گئی ہے اور گھڈ عبور کرنے ہی والی ہے۔ اپنی صحت کی نازک حالت کے باوجود اور نیچے خطرناک گہرائیاں ہونے کے باوجود جن میں پر شور پانی بہہ رہا تھا فاطمہ بھی حفاظت سے پار اتر گئیں۔ جاورت فاطمہ کے پیچھے آرہی تھی اور چھوٹے بیٹے سعید کو اٹھائے ہوئے تھی کہ ایک روسی سپاہی نے اسے دیکھ لیا اور گولی چلادی جس سے ماں بیٹا دونوں ہلاک ہو گئے۔ دوسرے لوگ اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جاورت کو دفنائیں۔ یہ تو خود روسی گولیوں کی زد میں تھے۔ چنانچہ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا گیا اور انہوں نے درخت کے تنے کے پل کو گرا دیا تاکہ کوئی ان کا تعاقب نہ کر سکے۔ پھر یہ چھوٹا سا گروہ چٹانوں میں چھپ گیا اور اس وقت تک چھپا رہا جب تک روسی نشانہ بازوں نے اپنی نگرانی ختم نہیں کر دی۔ پھر یہ گروہ رینگتا ہوا دریا تک پہنچا۔ یہاں انہوں نے لکڑی کے تنے جوڑ کر ایک رافٹ بنایا اور اس پر گھاس پھوس کے مصنوعی انسان سے بنائے اور جب اس رافٹ کو پانی پر بہایا تو روسی سپاہیوں نے اس کو امام شامل صاحب کی سواری سمجھا اور اس پر خوب گولیاں برسائیں۔ رافٹ بہاؤ کے ساتھ نیچے جا رہا تھا تو روسی سپاہی بھی نیچے کی طرف بڑھ بڑھ کر گولیاں برساتے رہے۔

امام صاحب اور ان کے پیروؤں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور دریا کے اوپر کی جانب چل پڑے۔ ایک جگہ دریا کچھ چوڑا تھا۔ یہاں ان کو امید ہوئی کہ کوئی پہاڑی پناہ گاہ مل جائے گی لیکن بدقسمتی سے یہاں ان کو ایک روسی چوکی ملی اور اس سے زوردار لڑائی چھڑ گئی۔ امام صاحب زخمی ہو گئے۔ ایک نائب شہید ہو گئے اور ایک روسی سنگین نے چھوٹے غاضی محمد کی ٹانگ کو زخمی کر دیا۔ لیکن امام صاحب کی تلوار نے روسی لیفٹنٹ کا کام تمام کر دیا اور روسیوں کا چونکہ لیڈر مارا گیا تو باقی بڑی بزدلی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سارا دن وہ چیچنیا کے سخت پہاڑی علاقے میں چھپ چھپ کر چلتے رہے اور اوپر چڑھتے رہے تاکہ بلند پہاڑوں میں پہنچ جائیں جن پر کوئی کوئی انسان بس کبھی کبھی ہی جاتے تھے۔ اکھلگو سے چلنے کے بعد انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کے علاوہ غاضی محمد اب

اپنے ٹانگ کے زخم کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تھا اور کھانا اور پانی مانگ رہا تھا لیکن ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ فاطمہ پر مردنی چھا گئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مزید ساتھ نہیں چل سکے گی۔ اس جگہ کی مزید تفصیل لیسلے بلانچ کی کتاب میں نہیں ہے۔

دوپہر کے وقت یہ لوگ آرام کے لئے ٹھہر گئے لیکن انہیں دور سے غمری کے سکاؤٹوں نے دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ یہ سکاؤٹ روسیوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور انہی کی جانب سے پہرہ اور تلاش کر رہے تھے۔ ان غمریوں نے فائر کھول دیا لیکن ان کا نشانہ صحیح نہیں تھا۔ امام صاحب نے ان کو پہچان لیا کہ یہ غدار لوگ تھے۔ امام صاحب کھڑے ہو گئے اور اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ کھڑی حالت میں ان پر بہت آسانی سے نشانہ لگایا جا سکتا تھا۔ امام صاحب نے ان غمریوں پر لعنت ملامت کی اور خدا کو گواہ بنا کر بلند آواز میں کہا کہ میں تم لوگوں سے بدلہ لوں گا۔ "اے غمری والو ہم دوبارہ ملیں گے" یہ کہہ کر وہ اوپر چڑھنے لگے۔ فائرنگ کا ایک بڑا برسٹ غمریوں کی طرف سے آیا لیکن امام صاحب کے اردگرد ادھر ادھر ہی بکھر گیا۔ اس کے بعد غمریوں نے پیچھا نہیں کیا۔ غالباً یہ لوگ اب تک امام صاحب سے خائف اور مرعوب ہو چکے تھے۔ ایک گولی امام صاحب کے ساتھ سے گزری لیکن نشانے سے چوک گئی۔

اس رات یہ گروہ بری طرح سے تھکا ہوا سو رہا تھا اور یہ اپنی چوکیداری بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس وقت دھوکہ باز احمد خان جس کے ساتھ کچھ غدار قبائلی لوگ تھے اس جگہ سے چند فٹ کے فاصلے سے گزرا جہاں امام صاحب چھپے ہوئے تھے۔ احمد خان نے روسیوں سے اجازت لے لی تھی کہ وہ امام صاحب کو قتل کر دے۔ کتاب "کرانیکل" جو امام صاحب کے ایک شاگرد نے تاریخ کے طور پر مرتب کی ہے کے الفاظ ہیں: "اللہ نے ان کی آنکھوں کو دوسری جانب پھیر دیا"۔ چنانچہ وہ اپنے شکار کو نہ دیکھ سکے اور اپنے روسی اڈہ کو لوٹ گئے۔ اس بار پھر ایک مرتبہ مزید یہ واقعہ ہوا کہ امام صاحب معجزانہ طریقہ پر بچ گئے۔

چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ تحریک جہاد جاری رہے گی۔ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ البتہ اکھنگو کے معرکے میں امام صاحب کا بہت نقصان ہوا۔ جاورت اور اس کا بچہ ''

صاحب کا بیٹا جمال الدین' ان کا قلعہ' ان کا فخر او ر اعتماد' نوے فیصد سے زیادہ مجاہدین اور قاضی محمد کا زخم جو اسے لنگڑا کر سکتا تھا۔ فاطمہ اور اس کے حمل کے متعلق تو امام صاحب کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس ہنگامی سفر میں زندہ بچ سکے گی۔ اس وقت ایسا محسوس ہو تا تھا کہ امام صاحب دربدر پھریں گے اور ان کے دشمن ان کی تلاش میں رہیں گے لیکن انسان اپنا کام ختم کرنے تک زندہ رہتا ہے۔ چنانچہ امام صاحب اپنی قسمت کے لکھے کے مطابق اپنے سفر زندگی پر رواں دواں رہے اور انہوں نے اپنے علاقہ کی تاریخ میں بہت بڑا نام پیدا کیا۔

روسی کیمپ

امام صاحب کے دوسری مرتبہ غائب ہونے کے بعد روسی ایک دوسرے کو فتح پر مبارک باد دے رہے تھے۔ روسیوں کے لئے اب اکھلگو میں کچھ معمولی کام رہ گئے تھے' مثلاً چند ایک بقایا گنوار قبائل کو زیر کرنا وغیرہ۔ حضرت امام شامل کے سر کی قیمت جنرل گراب نے تھوڑی سی مقرر کی لیکن اس معاملہ میں زیادہ سنجیدگی نہیں دکھائی اور فتح کے نشے میں تیمر خاں شورا لوٹ گیا۔ سینٹ پیٹرز برگ میں زار نے اکھلگو کی فتح کی خوشی اس طرح منائی کہ فتح مند فوج کے لوگوں کے لئے ایک میڈل بنوایا۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ امام صاحب کہاں ہیں۔ ان کے فرار کو ان افسروں کی بے عزتی سمجھا جا رہا تھا جن کو امید تھی کہ وہ امام صاحب کو اپنا قیدی بنائیں گے لیکن ابھی اس چیز کا احساس نہیں تھا کہ فرار ہونے کی وجہ سے امام صاحب ہتھیار ڈالنے سے بچ گئے' چنانچہ ان کی عزت محفوظ ہے۔

اس علاقے کے مجاہدین ڈالنے رکھنے کی نسبت موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ روسیوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ مجاہدین کے نزدیک ہتھیاروں خاص طور پر تلواروں کی کس قدر قدر و قیمت ہے۔ چونکہ امام صاحب آزاد ہیں اور ان کے ہاتھ میں تلوار ہے تو ان کی شکست بے معنی ہے۔ روس کو محض ایک پہاڑی چٹان بہت بھاری قیمت پر ملی ہے۔ امام صاحب کا بہت نقصان ہوا ہے لیکن ان کی آزادی اور عزت دونوں برقرار ہیں۔

روسیوں کو البتہ امام صاحب ایک مارا ہوا شکار لگتے تھے۔ ان کے متعلق گراب نے لکھا :

"شامل کا شرمناک فرار اور جن قبائل نے اس کا ساتھ دیا تھا ان کو ایسا سبق جس کو ان کی نسلیں یاد رکھیں گی۔ ان کی وجہ سے شامل اپنے اثر و رسوخ سے محروم ہو گیا ہے اور اب اس کی ایسی حالت ہو گئی ہے کہ پہاڑوں میں اکیلا گھومتا پھرے گا اور اسے صرف اپنی ضروریات زندگی اور اپنی ذات کی حفاظت کا ہی خیال رہے گا۔ تحریک جہاد اپنے تمام پیروؤں اور ہمدردوں کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔"

جنرل گراب کو اپنے اس خیال پر پختہ یقین تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مستقبل کی کسی روسی مہماتی فوج کو کوئی مقابلہ درپیش نہیں ہو گا اور یہ کہ اب متعدد قلعے تعمیر کئے جا سکتے ہیں جن کی کوئی مزاحمت نہیں کرے گا۔ اب کوئی بے چینی نہیں ہے اور نہ کسی بغاوت کا خطرہ ہے۔

زارِ روس

جنرل گراب کی رپورٹ کے حاشیہ پر زارِ روس نے لکھا :

"بہت خوب' یہ تو سب بہت اچھا ہوا لیکن شامل کا فرار افسوسناک ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پھر گڑبڑ کرے گا اگرچہ وہ اپنے وسائل اور اپنے اثر و رسوخ کا بیشتر حصہ ضائع کر چکا ہے۔"

لیکن داغستان میں اپنے لوگوں کے لئے اور بقایا جہادی قوتوں کے لئے جو تمام پہاڑوں میں پھیلی ہوئی تھیں' کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ حضرت امام شامل ان کے سردار' ان کے امام اور پیشوا رہے' اور سب لوگ اپنے اس امام کے اگلے قدم اٹھنے کے منتظر رہے۔

(جاری ہے)

افکار و آرا

کیا عربی گرامر اور تعلیماتِ قرآنی کا سیکھنا ہی کافی ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اکثر قارئین کے علم میں ہے کہ
((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرآنَ وَعَلَّمَهٗ)) (بخاریؒ)
تم میں سے بہترین وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں"۔

اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں وہ تمام حضرات و خواتین بڑے خوش نصیب ہیں جو پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ تعلیماتِ قرآنی سیکھنے اور سکھانے کی خدمت میں مصروف ہیں۔ البتہ اگر صرف عربی گرامر، قرآن حکیم کا ترجمہ اور اس کے تفسیری نکات سیکھنا اور سکھانا ہی پیشِ نظر ہے اور اس سے آگے بڑھ کر کسی حرکت اور عملی جدوجہد کا ارادہ نہیں تو اس سے بڑی محرومی کوئی نہیں۔ اس کی وجوہات یہ ہیں :

۱۔ قرآن حکیم بار بار پورے کے پورے دین پر عمل کی دعوت دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذابِ شدید کی وعید سناتا ہے جو دین کے کچھ حصوں پر عمل کریں اور کچھ پر نہ کریں۔ قرآن حکیم پر عمل محض نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی سے مکمل نہیں ہوتا بلکہ قرآن حکیم بار بار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور قیامِ عدل و قسط کے لئے جہاد کی دعوت دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو آل عمران ۸۴ اور ۱۱۰، النساء ۱۳۵، المائدہ ۸، الحج ۷۸، الشوریٰ ۱۳ اور الحدید ۲۵۔ اب اگر ہم ترجمہ اور تفسیرِ قرآن صرف پڑھتے اور پڑھاتے ہی رہیں اور ہمارے اکثر اوقات اپنے کیریئر بنانے اور کاروبار چمکانے میں صرف ہوں اور قرآن حکیم کا پڑھنا پڑھانا محض ایک مشغلہ (hobby) بن جائے تو ہماری شخصیت split ہو جائے گی۔ ایک باضمیر آدمی جس میں اپنا تجزیہ کرنے یعنی self criticism کی صلاحیت ہوتی ہے اپنی نگاہوں میں خود کو حقیر محسوس کرے گا کہ

قرآن کچھ اور کہہ رہا ہے جبکہ تم کچھ اور کر رہے ہو۔ اپنی ہی نگاہوں میں ذلیل ہونے کی کیفیت انسان کو نفسیاتی مریض بنا دیتی ہے اور اس میں خود اعتمادی کا وصف ختم کر دیتی ہے جس سے اس کے تمام معمولاتِ زندگی متاثر ہوتے ہیں۔

۲۔ قرآن حکیم اپنے پڑھنے والوں میں بے حیائی، برائی اور ظلم کے خلاف ایک حرکت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حرکت اِس کائنات کا اصل الاصول ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات اِک تغیّر کو ہے زمانے میں

اب اگر قرآن حکیم کے پڑھنے اور پڑھانے والوں میں مطلوبہ حرکت پیدا نہ ہو تو یہ جمود اسے پسپائی پر مجبور کر کے معکوس سمت میں متحرک کر دیتا ہے۔ انسان کی فکر صحیح تصورِ دین تک رسائی کے بعد اب محرومی کی طرف لوٹتی ہے۔ انسان اپنی بے عملی کے خوش نما جواز فراہم کرنا شروع کرتا ہے اور "اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ" (اللہ نے اسے باوجود علم کے گمراہ کر دیا۔ الجاثیہ : ۲۳) کا ضابطۂ خداوندی حرکت میں آ جاتا ہے۔

۳۔ اِس وقت ظلم و ستم، جور و استبداد، بے ہودگی و بے حیائی اور کئی گمراہ کن تصورات بڑے منظم انداز میں اور ایک طوفان کی صورت میں اہل ایمان پر حملہ آور ہیں۔ طوفان کا مقابلہ طوفان ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ ؏

عِشق خود اِک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام!

لہٰذا برائی و بے حیائی کے اس طوفان کی راہ روکنے کے لئے نیکی اور تقویٰ کی تلقین کا منظم اور بھرپور طوفان اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے یہ منزل سر کر لی تو وہ وقت دُور نہیں جب زمانہ پھر وہ منظر دیکھے گا کہ

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾

"بلکہ ہم حق کو اٹھا کر باطل پر دے مارتے ہیں، پس وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے اور باطل مٹ کر رہ جاتا ہے۔"

۴۔ نزولِ قرآن کا اصل مقصد نوعِ انسانی کے لئے ہدایت و رہنمائی فراہم کرنا ہے،

حصولِ ہدایت کے لئے محض قرآن حکیم کا پڑھنا اور پڑھانا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے حق کی سربلندی کی خاطر پیہم جدوجہد درکار ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا...﴾

"اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنے راستوں کی ہدایت دیتے ہیں۔"

گویا قرآن حکیم سے حصولِ ہدایت اور آخرت میں فوز و فلاح کے لئے ہر سطح پر احکاماتِ خداوندی کی سربلندی کے لئے مسلسل جہاد ازبس ضروری ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : ۴۷
شمارہ : ۳
ذوالقعدہ ۱۴۱۸ھ
مارچ ۱۹۹۸ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقامِ اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن۔ طابع: رشید احمد چودھری۔ مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

ڈاکٹر اسرار احمد بنام مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم

مولانا اصلاحی کی زندگی کے آخری سالوں میں ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ دو خطوط جن کے ذریعہ مولانا مرحوم کے بارے میں امیر تنظیم کے حقیقی احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے

صاحب تدبر قرآن اور بانی "میثاق" مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم و مغفور کی رحلت پر ہماری جانب سے تعزیتی شذرہ جنوری کے "میثاق" میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں فروری کے شمارے میں "میثاق" کے عنوان سے مولانا مرحوم کا فکر انگیز مضمون' قند مکرر کے طور پر ہدیہ قارئین کیا گیا جس میں مولانا نے اس جریدے کے وجوہ تسمیہ پر روشنی ڈالی تھی اور لفظ میثاق کی معنویت قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے اجاگر کی تھی ـــــــ امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تحریر کے حوالے سے مولانا مرحوم کے ساتھ ان کے نیاز مندانہ مراسم کا ذکر بھی اختصار کے ساتھ اس تعزیتی شذرے میں شامل تھا۔ مولانا مرحوم کو امیر تنظیم نے ہمیشہ اپنا ایک محسن اور بزرگ سمجھا اور اس اعتراف میں کبھی باک محسوس نہیں کیا کہ جن چار سلاسل سے ان کا فکر قرآنی تشکیل پایا ہے ان میں ایک سلسلہ جو نظم قرآن کے حوالے سے ہے' مولانا اصلاحی اور مولانا فراہیؒ کے پیش کردہ افکار پر مبنی ہے۔ مولانا اصلاحی مرحوم کے دروس قرآن میں شرکت اور باہم تبادلہ خیال کے ذریعے ان سے براہ راست علمی استفادے کا موقع بھی امیر محترم کو ایک طویل عرصہ تک حاصل رہا۔ تاہم ان کی بعض تفسیری آراء بالخصوص رجم کے معاملے میں ان کی رائے سے امیر تنظیم کو اختلاف رہا۔ امیر تنظیم نے مولانا مرحوم نے جو علمی فیض پایا اس کا اعتراف بھی ہر موقع پر برملا کیا اور مولانا کی جس رائے سے انہیں اختلاف ہوا اس کا اظہار بھی اپنی تحریر و تقریر میں وضاحت سے کیا ـــــ ۱۹۷۲ء کے بعد سے امیر محترم اور مولانا مرحوم کے مابین وہ گرم جوشی کا تعلق بوجوہ قائم نہ رہ سکا اور باہمی فاصلہ بتدریج بڑھنے لگا۔ "وصل و فصل" کی یہ داستان قدرے تفصیلی انداز میں امیر تنظیم کی تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل ہے۔

مولانا مرحوم کی علالت کے آخری سالوں میں امیر تنظیم ان کی عیادت کے لئے گاہے بگاہے ان کی خدمت میں باہتمام حاضر ہوتے رہے۔ مولانا مرحوم کی پیرانہ سالی' ضعف اور ثقل سماعت کے باعث ان سے گفتگو کے ذریعے تبادلہ خیال کرنا تو اب چونکہ ممکن نہیں رہا تھا' لہٰذا امیر محترم نے

بعض مواقع پر اپنے جذبات و احساسات ان تک پہنچانے کے لئے تحریر اور خط کا سہارا لیا۔ اواخر [illegible] میں امیر تنظیم نے مولانا مرحوم کو جو دو مراسلے ارسال کئے ان کے ذریعے چونکہ نہ صرف یہ کہ مولانا کے بارے میں امیر تنظیم کے حقیقی جذبات و احساسات کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ حد رجم کے ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت کی' کہ جس کی رو سے رجم کے حکم پر مشتمل آیت پہلے قرآن میں شامل تھی اور بعد میں منسوخ التلاوۃ ہو گئی' ایک عمدہ تاویل سامنے آتی ہے' لہٰذا قارئین کے افادہ کے لئے ان دو خطوط کو ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

بخدمت گرامی مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ'

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

تقریباً ایک ماہ قبل آپ سے کئی سال بعد شرف ملاقات حاصل ہوا۔ آپ نے جس خوشدلی اور خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اس کا دل پر بہت اثر ہوا۔ مزید بر آں اس پیرانہ سالی میں' جسمانی نقاہت اور سماعت و بصارت میں قدرے کمی کے باوصف' آپ کی ذہنی و فکری استعداد کے حیرت انگیز حد تک برقرار رہنے سے بہت خوشی بھی ہوئی۔

ع "کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ" کے مصداق آپ کے طرز عمل سے ہمت پا کر چند باتیں عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں یہ عریضہ فوراً ہی تحریر کر دیتا لیکن بعض حوادث کی بنا پر تاخیر ہو گئی۔ یعنی اولاً تو آپ کے یہاں سے واپسی پر میری گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی تھی جس میں گاڑی کو تو بہت نقصان پہنچا۔ البتہ الحمدللہ جسم اور جانیں محفوظ رہیں۔ سوائے اس کے کہ میرے بائیں شانے میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا جو پہلے تو بہت شدید رہا اب تدریجاً کم ہو رہا ہے۔ ثانیاً اس کے بعد میں ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا ہو گیا۔ جس سے اب بھی پوری طرح چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ تاہم چونکہ ۲۸/ اگست کو مجھے امریکہ روانہ ہو جانا ہے لہٰذا میں' جیسے بھی بن آ رہا ہے' یہ عریضہ تحریر کر رہا ہوں۔

اپنی گزارشات سے قبل ایک بات کا تذکرہ اس لئے کر رہا ہوں کہ مبادا آپ بھول گئے ہوں۔ چند سال قبل ایک طویل تعطل کے بعد جب میری آپ کے یہاں حاضری کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تھا تو میں کچھ عرصے تک مسلسل ہر ماہ حاضری دیتا رہا تھا۔ تا آنکہ خود آپ کی جانب سے اس پر اظہار ناپسندیدگی ہوا۔ اس سے کئی سال قبل بھی جب آپ ابھی خانقاہ ڈوگراں ہی میں مقیم تھے میں نے محسوس کیا تھا کہ کچھ میرے اور آپ کے مابین واقعی نظریاتی اختلاف اور کچھ بعض حاسدوں اور شرپسندوں کے "شر" کے باعث آپ کے مزاج میں میری جانب کسی قدر خشونت پیدا ہو گئی ہے تو خانقاہ ڈوگراں ہی کی ایک ملاقات میں' میں نے عرض کیا تھا کہ "مولانا! آپ کا اختلاف اپنی جگہ' بر ہمی بھی بجا' لیکن آپ میرے لئے اپنے دروازے بند نہ کریں!" جس پر آپ نے نہایت گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا تھا کہ "اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں ہے' آپ کے لئے میرے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

میری گزارشات میں سے اولین اور اہم ترین یہ ہے کہ آپ خدارا "حد زنا" کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی فرمائیں۔ میں اس مسئلے پر کسی فنی بحث کا ہرگز اہل نہیں' اور خاص طور پر آپ کے سامنے زبان کھولنے کی تو کبھی جرات ہی نہیں کر سکتا لیکن میری درخواست صرف یہ ہے کہ امت کے چودہ سو سالہ "اجماع" کے مقابلے میں اپنی ذاتی رائے اور رجحان کو قربان کر دیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو میں ان شاء اللہ آپ کی بعض دوسری آراء سے اختلاف کے علی الرغم تازیست (اگرچہ اب میں خود اپنے آپ کو بھی عالم دنیا کے مقابلے میں عالم آخرت کے قریب تر محسوس کرتا ہوں) آپ کا بندۂ بے دام بنے رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ میں اس وقت بلا تشبیہ آنحضورؐ کے ان الفاظ کا حوالہ دینے کی بھی جسارت کر رہا ہوں جو آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے عندالوفات کہے تھے!

اس ضمن میں نہایت ادب کے ساتھ مزید یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ رجم سے متعلق حضرت عمرؓ کی روایت کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ اس میں "قرآن" سے مراد "تورات" ہے' اس لئے کہ اس کی جانب اشارہ سورۂ سبا کی آیت ۳۱ کے الفاظ مبارکہ "لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ

(الآیہ)" میں بھی موجود ہے' اور اس کی تائید اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ ایک دوسری روایت کی رو سے حضرت عمرؓ نے آنحضورؐ کے سامنے تورات کی کسی عبارت کو دلیل کے طور پر پیش کیا تھا جس پر آنحضورؐ ناراض ہوئے تھے ـــــ ثالثاً اس سے اس امر کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے کہ حدیث عمرؓ میں وارد الفاظ عربیت کے لحاظ سے نہایت بھونڈے ہیں۔ اس لئے کہ یہ اصلاً تورات کا ترجمہ تھے جو کسی نااہل شخص نے کیا تھا۔ واللہ اعلم!

میری اِس گزارش کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اگرچہ آخرت کے معاملے کا تو پورا دار و مدار "نیتوں" پر ہے' لیکن دنیا میں آپ کا یہ "شذوذ" لوگوں اور فراہیؒ مکتب فکر اور بالخصوص آپ کے طریق تدبر قرآن کے مابین حجاب بن گیا ہے۔ واللہ اعلم!

دوسری گزارش میری یہ ہے کہ آپ جس طرح بھی بن آئے اپنی شاہکار تالیف "دعوت دین اور اِس کا طریق کار" کو لفظاً لفظاً نظر سے گزار جائیے یا پڑھوا کر سن لیجئے اور جہاں کہیں بھی نصف صدی سے زائد عرصے کے دوران اپنے ذہنی و فکری ارتقاء یا رائے کی تبدیلی کے باعث کسی ترمیم کی ضرورت محسوس کریں صرف اس کو قلمبند کر دیں یا املا کرا دیں۔ آپ کو تو شاید یاد نہ ہو اب سے لگ بھگ پچیس سال قبل حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ مولانا اصلاحی اپنی اس کتاب کے بہت سے مباحث سے "رجوع" کر چکے ہیں۔ لیکن جب میں نے آپ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا تھا : "معاذ اللہ! میں نے یہ کتاب قرآن حکیم کی محکمات کی اَساس پر لکھی ہے' اِس کی کسی بات سے میں کیسے رجوع کر سکتا ہوں!" ـــــ آج کل پھر کئی سال سے جاوید احمد غامدی صاحب اپنے حلقے میں اس رائے کا اظہار کر رہے ہیں کہ آپ کے بعض مباحث و آراء سے انہیں اختلاف ہے۔ چنانچہ انہوں نے آپ کی تالیف ہی کی اَساس پر اپنی کتاب تصنیف فرمائی ہے جس میں اکثر و بیشتر حوالے تو آپ ہی کے ہیں۔ میرا گمان تو یہ تھا کہ انہوں نے یہ احتیاط کی ہے کہ آپ کی جن باتوں سے انہیں اختلاف ہے اِنہیں انہوں نے حذف کر دیا ہے اور اس طرح گویا صرف صرف نظر اور غضِ بصر پر اِکتفاء کی ہے لیکن بعض احباب جنہوں نے کتاب کا بالاستیعاب

مطالعہ کیا ہے یہ رائے رکھتے ہیں کہ اولاً انہوں نے آپ کے بعض خیالات کی آپ کے ذکر کے بغیر واضح نفی کی ہے اور ثانیاً کتاب کی اٹھان ایسی رکھی ہے کہ عام قاری جس نے آپ کی تالیف کا وقت نظر سے مطالعہ نہ کیا ہو ان کے ان نظریات کو آپ کی جانب سے منسوب کر سکتا ہے۔ واللہ اعلم! بہر حال آپ کے زندگی کے اس آخری دور کے نظریات کے ضمن میں آپ کی یہ تھوڑی سی کاوش ان شاء اللہ بعد کے لوگوں کے لئے بہت بڑی رہنمائی اور عظیم صدقہ جاریہ کی صورت اختیار کرلے گی۔ بصورت دیگر آپ کا فکر لوگوں کے لئے چیستاں بن جائے گا۔

اِس ضمن میں ایک اِعتراف و اطلاع بھی! میں نے کچھ عرصہ قبل اپنے کتابچے "راہ نجات سورۃ العصر کی روشنی میں" کے نئے اور مجلد ایڈیشن کے آغاز میں ایک مقدمہ تحریر کیا تھا جس میں خاصی درشتی کے انداز میں خود آپ پر بھی یہی گرفت کی ہے کہ آپ نے "تدبر قرآن" میں سورۃ العصر کی تفسیر کے ضمن میں اکثر و بیشتر تو مولانا فراہیؒ ہی کے اقتباسات دیئے ہیں لیکن غالباً بعض وقتی اثرات کے تحت ان کی ایک مستقل فصل "تواصی سے قیام خلافت کا وجوب" سے صرف نظر کر لیا ہے! حالانکہ "دعوت دین اور اِس کا طریق کار" کے اہم ترین باب "تبلیغ کس لئے" کی پوری بحث کا نقطہ عروج ہی نظام خلافت کے قیام کا وجوب ہے! میں اپنی وہ کتاب بھی اس عریضے کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ اور امید رکھتا ہوں کہ آپ اپنی روایتی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے میری اس گستاخی پر بھی عفو و درگزر سے کام لیں گے۔ ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (التغابن : ۱۴)

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ۲۸/ اگست کو بیرون ملک روانہ ہو رہا ہوں۔ پروگرام تو وسط اکتوبر میں واپس آنے کا ہے لیکن مستقبل کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ کیا پتہ یہ "نصف ملاقات" بھی آخری ہو۔ اگر واپس آ گیا تو ان شاء اللہ پہلی فرصت میں حاضر خدمت ہوں گا، الا یہ کہ آپ ہی کی جانب سے دوبارہ NO ADMISSION کا حکم صادر ہو جائے۔ (بلکہ میں تو ان دنوں بھی علالت کے باوصف حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن ہمارے "ندائے خلافت" کے نو آموز کارکنوں نے میری آپ سے ملاقات کی خبر شائع کر دی ــــ اور ستم بالائے ستم

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

سلسلہ تقاریر ——— منہج انقلابِ نبویؐ ——— خطابِ دوم (۲)

تزکیہ و تربیتِ محمدیؐ کے عناصرِ سہ گانہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتّب : شیخ جمیل الرحمٰن)

تزکیہ و تربیت کے لئے جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جو نظام اختیار فرمایا اِس کے تین عناصر ہیں، جن کو جان لینے پر ہی اِس تربیت کے نظام کے سمجھ لینے کا دار و مدار ہے، البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ زیر بحث انقلابی تربیت ہے، خانقاہی تربیت نہیں۔ خانقاہی تربیت کے اپنے اہداف و مقاصد ہیں، لیکن اگر اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے تو آج کے دور میں وہ خانقاہی تربیت نہیں بلکہ مجاہدانہ تربیت درکار ہے۔ چنانچہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے اختیار کردہ نظام تزکیہ و تربیت میں مندرجہ ذیل تین عناصر کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

انقلابی نظریات کا استحضار اور انقلابی جذبہ کی آبیاری بذریعہ تلاوتِ قرآن

اِس مجاہدانہ تربیت کے لئے سب سے پہلی لازم چیز یہ ہے کہ جو شخص بھی اس میدان میں آئے اس کا اپنے اِس انقلابی نظریہ کے ساتھ شعوری تعلق پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ اگر کہیں اپنے انقلابی نظریہ کے ساتھ ذہنی تعلق کمزور ہو جائے گا تو وہ شخص مضمحل ہو جائے گا اور پھر وہ انقلابی کام نہیں کر سکے گا۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے حصول کے لئے قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں سب سے زیادہ زور قرآن حکیم کی تلاوت پر دیا گیا ہے۔ نہایت ناساعد ماحول اور شدید ترین مخالفت کے دنوں میں نبی اکرم ﷺ کو یہی حکم دیا جا رہا ہے : "اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ" (العنکبوت : ۴۵) "(اے محمد

ﷺ) تلاوت کرتے رہا کرو اس کتاب کی جو اللہ نے آپ ؐ پر نازل کی ہے" ــــــ غور کیجئے کہ یہ حکم صرف حضور ؐ کو نہیں ہے بلکہ آپ ؐ کی وساطت سے تمام اہل ایمان کو دیا جا رہا ہے کہ اگر اس انقلاب کے لئے تمہیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے تو تمہارا شعوری اور ذہنی و قلبی تعلق اس نظریہ کے ساتھ مضبوط ہونا چاہئے۔ اگر وہ کمزور پڑ جائے گا تو اس جدوجہد کے لئے جو جذبہ درکار ہے وہ بھی مضمحل ہو جائے گا ــــــ آگے فرمایا : وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ' اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ "اور نماز کو قائم رکھو' بلاشبہ نماز فحش اور برے کاموں سے روکنے والی چیز ہے"۔

یہاں دو چیزیں جمع کر لیں۔ یعنی قرآن اور نماز۔ اس لئے کہ نماز کا جزوِ اعظم بھی قرآن ہے۔ قرآن کا لبِّ لباب سورۂ فاتحہ ہے' اس کی تلاوت نماز کی ہر رکعت میں لازمی ہے۔ اس کے ذریعے سے توحید کے ساتھ ہمارے ذہنی رشتہ کی استواری اور ہمارے عہد کی تجدید ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم پڑھتے ہیں : ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ تو ہم توحیدِ نظری یا توحید فی العقیدہ کا اعادہ کرتے ہیں اور جب ہم کہتے ہیں : ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ تو ہم توحیدِ عملی یعنی اللہ کی عبادت و استعانت کا اقرار کرتے ہیں ــــــ اسی طرح سورۂ کہف اُس زمانے میں نازل ہوئی جبکہ مکہ میں قریش کی طرف سے حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ یہ مکی دور کا آخری حصہ ہے۔ اس میں حضور ؐ کو کیا حکم دیا جا رہا ہے! ﴿وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ' لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ' وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝﴾ "(اے نبی ﷺ) تلاوت کیا کرو اس کتاب کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف وحی کی گئی ہے۔ اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں۔ اور تم اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے"۔ یاد رہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تمام اہل ایمان بھی اس حکم کے مخاطب ہیں کہ اِس کتاب کی تلاوت کرو اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط بناؤ۔ اِس کتاب کے ساتھ جس کا تعلق جتنا مضبوط ہو گا اتنا ہی انقلابی نظریہ کے ساتھ اس کا شعوری اور قلبی تعلق مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ دوسرے انقلابات کے نظریئے انسانی ذہنوں کی پیداوار ہیں جبکہ اسلامی انقلاب کا نظریہ وحی کے ذریعے سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا گیا ہے۔

لہٰذا زیادہ سے زیادہ قرآن سے تعلق، زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت، نماز میں زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھنا ضروری ٹھہرایا گیا۔ خصوصاً تہجد کے وقت اس کا التزام ہو اور "اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا" کے مصداق نماز فجر میں قرآن مجید کی طویل قراءت ہو۔ اسی لئے اس کو "قُرآنَ الفجر" کا نام دیا گیا۔ باقی نمازوں میں اتنی طویل قراءت نہیں ہوتی، لیکن فجر کی نماز میں طویل قراءت مطلوب ہے۔ فرمایا گیا کہ جان لو قرآن پڑھنا فجر کا مشہود ہے۔ یعنی اس کی گواہی دی جاتی ہے۔ اس موقع پر فرشتے سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ رات کے فرشتے بھی، جن کی ڈیوٹی ختم ہو رہی ہوتی ہے اور دن کے فرشتے بھی، جو آ کر چارج لیتے ہیں، فجر کی نماز کے وقت دونوں جمع ہوتے ہیں۔

درحقیقت تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نظام کی سب سے اہم اور اولین شق قرآن کو زیادہ سے زیادہ ٹھونک ٹھونک کر اپنے ذہن و قلب میں اتارنا ہے۔ ذہن کی گتھیوں کو سلجھانے، آئینہ قلب کو صیقل کرنے، ایک بندۂ مومن کے باطن کے نور کو اجاگر کرنے اور اس میں ایک تازہ ولولہ اور جوش عمل پیدا کرنے کیلئے قرآن حکیم سے زیادہ موثر شے اور کوئی نہیں ہے۔ یہ کتابِ مبین ہے، جو "تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ" بن کر نازل ہوئی ہے۔ یعنی "سیدھی راہ دکھانے والی اور یاد دہانی ہر اس بندے کیلئے جو اللہ کی طرف رجوع کرے۔" اسی بات کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے کہ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یعنی یہ قرآن اگر کسی کے ذہن میں اتر جائے گا اور اس کے دل میں رچ بس جائے گا تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا اور اس کی شخصیت بدل جائے گی۔ اور جب اندر انقلاب آئے گا تو یہ بالآخر ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ پھر علامہ نے یہ بھی کہا کہ اپنے نفس کے تزکیہ کیلئے بھی اس قرآن سے زیادہ موثر شے اور کوئی نہیں ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است — زانکہ اُو گم اندر اعماق دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی —!!

یعنی ابلیس کو قتل کر دینا آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ تو انسان کے دل پر جا کر گھات

لگا تا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا : "اِنَّ الشَّیطٰنَ یَجرِیْ مِنَ الْاِنسانِ مَجْرَی الدَّمِ" (یقیناً شیطان انسان کے جسم میں خون کی مانند دوڑتا ہے) پس جو زہر پورے جسم میں سرایت کر گیا ہو' اس کے لئے تریاق بھی وہ درکار ہے جو پورے وجود میں سرایت کر جائے اور وہ تریاق صرف قرآن ہے۔ اس کو اپنے باطن میں اتارو۔ اس کو اتارنے کا عمل یہ ہے کہ اسے بار بار پڑھو' اسے Hammer کرو' اسے ٹھونک ٹھونک کر اپنے اندر اتارو۔ یہ نہیں کہ ایک بار پڑھا اور سمجھ لیا' بلکہ اس کو پڑھتے رہو۔ اِس طریقہ سے یہ قرآن رفتہ رفتہ انسان کے وجود میں سرایت کرتا ہے۔

تلاوتِ قرآن کے انقلابی نظریہ اور تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ منطقی ربط و تعلق سے واضح ہوا کہ انقلابی کارکن کے لئے اہم ترین بات یہ ہے کہ اس کا ذہنی و قلبی تعلق اپنے انقلابی نظریہ کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ یہ تعلق کمزور رہے گا تو انقلاب کے لئے قربانی کا مطلوبہ جذبہ بھی مضمحل رہے گا۔ اور قرآن چونکہ انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوۃ والسلام کا نظریہ ہے' لٰہذا تربیت محمدیؐ کی پہلی شق یہی ہے کہ اِس قرآن کو مسلسل اور پیہم محنت کرکے انسانوں کے اندر اتارا جائے۔

مخالفت و مجاہدۂ نفس بذریعہ عبادات
بالخصوص قیام اللیل و تہجد

اسلامی انقلابی تربیت کا دوسرا عنصر نفس کی مخالفت ہے۔ یہ نفس جسے ہم IDD یا LIBIDO بھی کہہ سکتے ہیں' جس کے لئے قرآن کی اصطلاح "نفس امارہ" ہے' یہی راستہ کی رکاوٹ بنتا ہے۔ دنیا کی محبت' مال کی محبت اور دیگر خواہشات نفس آدمی کا راستہ روکتی ہیں' بقول جگر ؎

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

انسان کو عافیت اور عیش و آرام درکار ہے، وہ دولت چاہتا ہے، شہرت چاہتا ہے۔ اور یہ حُبِّ مال، حُبِّ جاہ، حُبِّ دنیا، علائق دنیوی اور ساز و سامان دنیا کی محبت ہی تو بندۂ مومن کے راستے کی اصل رکاوٹ ہے۔ ان کو جمع کر لیں تو یہ ہے نفس ـــــ اِس نفس کی مخالفت دوسری شق ہے تربیت محمدیؐ کی ـــــ اس کے لئے ہمارے دین میں عبادات کا نظام رکھا گیا ہے، جنہیں اب ہم نے رسوم (Rituals) بنالیا ہے۔ بالفاظ علامہ اقبال ؎

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی" نہ رہی

اب وہ صرف مراسم عبودیت بن کر رہ گئے۔ یہ تو درحقیقت ہمارے انحطاط کا نتیجہ ہے۔ اِس بات کی ضرورت ہے کہ سمجھا جائے کہ تربیت محمدیؐ میں عبادات کی اصل غایت اور حقیقی مقام کیا ہے! نماز کی ایک غایت ابھی بیان ہو چکی : وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا : "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے"۔ انسان اپنی دنیوی مصروفیات کے دوران دن میں پانچ مرتبہ نکلے تاکہ وقفہ وقفہ سے اسے یاددہانی حاصل ہو کہ وہ کسی کا بندہ اور غلام ہے، وہ مختار کل نہیں ہے، اسے اپنے روز مرہ کے معمولات بھی اسی اللہ کے احکام کے مطابق انجام دینے ہیں جس کے ذکر یعنی یاددہانی کے لئے وہ دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرتا ہے۔

روزہ رکھنے کی بھی ایک غایت ہے تاکہ نفس کے اندر جو بھوک کا تقاضا ہے، زبان جو چٹخارے مانگتی ہے، شہوت کا جو تقاضا ہے، ان کا روزہ کے ذریعہ سے مقابلہ کرو۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ ڈھال ہے : اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ۔ نفس کے حملوں سے روکنے والی چیز تمہارے پاس روزہ کی ڈھال ہے، جو اللہ نے تمہارے لئے فرض عبادت کے طور پر رکھی ہے۔ سال میں ایک مہینہ یعنی رمضان میں تو لازماً روزہ رکھو، اور اسے تمام مسلمان رکھیں، ایک اجتماعی ماحول بن جائے۔ لیکن صرف اس پر اکتفانہ کرو، بلکہ نفلی روزے بھی رکھو، ہر مہینہ میں تین دن رکھنے کا اہتمام کرو، اور اس روزے کے ذریعہ سے اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کرو۔ تربیت محمدیؐ کی یہ دوسری شق ہے۔ نماز اور روزہ دنیا کے Mode of Worship کے عمومی تصور سے بالکل علیحدہ ہیں۔ یہ یقیناً بندگی اور اللہ

کے سامنے عاجزی و تذلل کا ایک اظہار بھی ہے' لیکن یہ چیزیں تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وہ بنیادی امور ہیں جن کے ذریعہ سے تربیت دی جانی مقصود ہے۔ انہی کے ذریعے سے انسان کی قوت ارادی کو تقویت حاصل ہوگی اور اس میں صلاحیت پیدا ہوگی کہ وہ نفس کے زور آور تقاضوں کا مقابلہ کر سکے۔

اسی طرح زکوٰۃ کی فرض عبادت ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ہی ایتاءِ زکوٰۃ کا حکم ہے۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرو' اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ انسان کے دل میں سب سے بڑی جو نجاست پیوست ہو جاتی ہے وہ مال کی محبت ہے۔ یہ گویا بریک ہے۔ جب تک گاڑی کا Brake نہیں کھلے گا آپ کتنا ہی ایکسی لیٹر دبائیں انجن پھڑپھڑا کر بند ہو جائے گا۔ مال کی محبت کا بریک لگا ہوا ہے تو جس صحیح رخ پر ایک مسلمان اور ایک مجاہد کا کردار پروان چڑھنا چاہئے' وہ کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ لہٰذا اسے دل سے کھرچ کھرچ کر نکالنا ہو گا۔ اس کے لئے زکوٰۃ جیسے صدقاتِ واجبہ ہیں' پھر صدقاتِ نافلہ ہیں۔ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں ان صورتوں میں خرچ کرو۔ واضح رہے کہ لفظ زکوٰۃ تزکیہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پاک کرنا' صاف کر دینا۔ گویا بریک کھول دینا' رکاوٹ کو دور کر دینا۔ تزکیہ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک مالی جب اپنے باغ میں دیکھتا ہے کہ اس نے پھل یا پھول والے جو پودے لگائے ہیں' ان کے ساتھ کچھ خودرو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ بھی اگ آیا ہے اور اب یہ جھاڑ اور خودرو گھاس بھی زمین سے غذا لے رہی ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ پوری غذا ان پودوں کو ملے۔ ہوا میں جو قوت نمو ہے یہ خودرو چیزیں اس کو بھی جذب کر رہی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو یہ پوری قوت ان پودوں کو ملے گی جن کو وہ چاہتا ہے کہ پروان چڑھیں ——— چنانچہ وہ مالی کھرپا ہاتھ میں لیتا ہے اور ان تمام خودرو چیزوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اس عمل کا نام عربی میں تزکیہ ہے۔ انسان کی شخصیت میں جو اوصاف پروان چڑھنے چاہئیں' ان کی نشوونما اور ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ مال کی محبت اور دنیا کی محبت ہے۔ یہ نجاست ہے جو یہ دل سے نکلے گی تو جو صلاحیتیں بالقوہ انسان کے باطن میں موجود ہیں وہ پروان چڑھیں گی۔ تو یہ ہے حقیقت میں تزکیہ کا عمل۔ اور زکوٰۃ کا لفظ تزکیہ سے ماخوذ ہے۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد قرآن کے ان الفاظ سے واضح ہے : "اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی" "وہ جو اپنا

مال دیتا ہے حصول تزکیہ کے لئے"۔ سورۃ التوبہ میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جاتا ہے :
"خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا" "(اے نبیؐ) ان مسلمانوں کے مالوں میں سے صدقات (زکوٰۃ) لیجئے تاکہ اس طرح آپؐ ان کو پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں"۔

نفس کی مخالفت کا جو تیسرا پروگرام اقدمیت واولیت رکھتا ہے اور جو تربیت محمدیؐ کا اہم ترین نکتہ ہے' وہ ہے رات کو جاگنا۔ نیند بھی انسان کے نفس کا بہت بڑا تقاضا ہے۔ جہاں پیٹ کا بھرنا نفس کا تقاضا ہے' زبان کا چٹخارا نفس کا تقاضا ہے' شہوت کا جذبہ نفس کا تقاضا ہے' وہاں نیند' آرام' استراحت بھی نفس کا ایک زوردار تقاضا ہے ـــــ لٰہذا نفس کی مخالفت میں سب سے زیادہ انسان کی قوت ارادی کو مضبوط کرنے والی شے یہی ہے۔ سورۃ المزمل میں فرمایا گیا : "اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِيَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّاَقۡوَمُ قِيۡلًا" یعنی نفس کو کچلنے' نفس کی قوت کو توڑنے اور قابو میں رکھنے کے لئے سب سے موثر شے رات کا جاگنا ہے۔

اگرچہ نزول وحی سے قبل بھی نبی اکرم ﷺ انسان کامل تھے' آپؐ کی شخصیت اور سیرت بے داغ تھی' اس پر کوئی دھبہ نہیں تھا' دشمنوں نے آپؐ کو اَلصَّادِق اور اَلاَمِین مانا ہے' لیکن اس کے باوجود انذار آخرت اور تکبیر رب کے کام کیلئے مزید تربیت ضروری تھی۔ سورۃ القلم میں فرمایا گیا۔ "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ" اے نبی آپؐ خلق عظیم کا نمونہ ہیں۔ لیکن بایں ہمہ جو بار گراں اور بھاری ذمہ داری آپؐ کے کاندھوں پر آنے والی ہے اس کے لئے ایک اضافی تربیت کی ضرورت ہے اور وہ ہے قیام اللیل۔ اور اس میں کیا کیجئے۔ "وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا" اس قرآن کا آپؐ کے قلب مبارک پر نزول ہو۔ اسے ٹھہر ٹھہر کر' رک رک کر پڑھنا ہے' جیسے کہ ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی ہے۔ ایک بار کی چوٹ سے بات نہیں بنتی بلکہ بار بار کی چوٹ مقصد کو پورا کرتی ہے : "كَذٰلِكَ' لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلۡنٰهُ تَرۡتِيۡلًا٥" (الفرقان : ۳۲) "اسی طرح اتارا تاکہ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو ثبات عطا فرمائیں۔ لٰہذا پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر"۔ تاکہ یہ قرآن آپ کے قلب میں جاگزیں ہو جائے۔

یہ حکم اور یہ کام صرف حضورؐ کے لئے نہیں تھا' بلکہ حضورؐ کے ساتھ آپؐ کی جو

جماعت تیار ہو رہی تھی اِس کے لئے بھی تھا۔ چنانچہ اسی سورۃ المزّمل کے دوسرے رکوع میں فرمادیا' جو بعد میں نازل ہوا ہے : "اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ "یعنی "اے نبی! ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپؐ بھی اور آپؐ کے ساتھیوں کی ایک جماعت بھی دو تہائی رات اور آدھی آدھی رات اور تہائی رات کے قریب کھڑے رہتے ہیں"۔ مراد ہے وہ ترتیل قرآن کا کام سرانجام دے رہے ہیں جس کا حکم ابتداء میں صرف آپؐ کے لئے آیا تھا ــــــ یہ ہے تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ کا جامع ترین لائحہ عمل جس میں قراءت قرآن' اقامتِ صلوٰۃ اور رات کا جاگنا تین چیزیں جمع ہو گئیں۔ اندازہ کیجئے کہ نصف رات تو بہت ہی زیادہ ہے لیکن ایک تہائی شب بھی کم نہیں ہے۔ اگر سردیوں کی رات چودہ گھنٹوں کی اور گرمیوں کی رات نو گھنٹوں کی ہو تو بالترتیب قریباً ساڑھے چار گھنٹے اور تین گھنٹے تو لگائے جائیں گے تب کہیں جا کر کم از کم تقاضا پورا ہو گا ــــــ یہ تھا قیام اللیل کا مکی دور میں کم از کم نصاب ــــــ مکی دور کے اواخر میں سورۂ بنی اسرائیل میں اِس کا مستقل نصاب بایں الفاظ بیان ہوا ہے : "وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ" ــــــ دن کے اوقات میں تو اے نبی آپؐ نماز پڑھتے ہی ہیں۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ ہے اور بعض رکعتوں میں قرآن کا دوسرا حصہ بھی پڑھا جاتا ہے' اور نمازِ فجر تو گویا ہے ہی قرآن الفجر' لیکن آپ کے لئے یہ کافی نہیں ہے' لہٰذا رات کا ایک حصہ تو اس قرآن کو ساتھ لے کر جاگئے۔ یہ آپؐ کے لئے زائد ہے۔ یہاں "فَتَهَجَّدْ بِهٖ" کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یعنی قرآن کے ساتھ جاگنا مطلوب ہے ــــــ آپؐ کی وساطت سے اُمت اور خاص طور پر اُن لوگوں کے لئے جو تکبیرِ رب' اقامتِ دین' اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ کے لئے کمربستہ ہو جائیں' یہ نفل مشقت قرآن جمع صلوٰۃ ہے۔ تاکہ حالتِ نماز میں قرآن حکیم کو اپنے قلب و ذہن میں اتارنے کا یہ موثر ترین طریقہ جاری و ساری رہے۔ رات کی تنہائیوں میں طویل قیام میں ترتیل کے ساتھ قرآن کی قراءت دل کے آئینہ کو جس طرح صیقل کرتی ہے اور اس سے قوتِ ارادی کو جو نمو حاصل ہوتی ہے اور اس سے روح کو جو کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اس سے لذت آشنا وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کو یہ توفیق و سعادت ملتی ہے۔

مخالفت و ایذا پر صبر و اِستقامت

نبی اکرم ﷺ کی تربیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ تربیت میدان میں اتارنے کے لئے تھی، محض گوشے میں بٹھانے کی تربیت نہیں تھی۔ اس لئے کہ فوراً کشاکش یا عرفِ عام میں کشمکش شروع ہو جاتی تھی۔ جہاں زبان سے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا کلمہ نکلا فوراً مار پڑنی شروع ہو جاتی تھی۔ اب یہ جو مار پڑ رہی ہے تو یہ عملی تربیت کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ اگر اس کو جھیلو گے تو تمہاری قوتِ ارادی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی، تمہارے اندر صبر و استقامت کے اوصافِ عالیہ ترقی پاتے چلے جائیں گے۔ اگر یہ کشمکش نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ کسی شخص کو تیرنے کی تربیت خشکی پر دیں اور اسے بتائیں کہ تیرنے کے لئے یہ کرنا ہوتا ہے، وہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن سال بھر کی ٹریننگ سے بھی وہ شخص تیراک نہیں بنے گا، جبکہ زیرِ تربیت تیراک کو پانی میں اتاریئے اور اسے بتایئے کہ تیرنے کے لئے اسے ہاتھ، پاؤں اور پورے جسم کو کس طرح استعمال کرنا ہے تو وہ چند دنوں میں بلکہ اگر کوئی ذہین ہو تو ایک ہی دن میں تیراک بن جائے گا ـــــ تو محمد ﷺ کی تربیت خانقاہی نہیں ہے۔ گوشے میں بٹھا کر دی جانے والی تربیت نہیں ہے۔

مقامِ غور ہے، محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں کیا کہ لوگوں کو نکال کر کہیں اور لے جائیں اور وہاں تربیت دیں، بلکہ یہ کیا ہے کہ جو شخص جہاں ہے، وہیں تربیت پائے۔ اور وہ شخص وہیں کھڑے ہو کر کہے کہ میں ایک اللہ کو مانتا ہوں، میں جناب محمد ﷺ کو رسول اللہ تسلیم کر چکا ہوں اور آپؐ کے نقشِ قدم اور آپؐ کی سنت پر چلنے کا فیصلہ کر چکا ہوں، میں آخرت کے محاسبہ کا یقین رکھتا ہوں۔ اس پر کشمکش شروع ہو جائے گی۔ اپنے گھر میں کشمکش ہو گی۔ اہل و عیال اور رشتہ داروں سے کشمکش ہو گی۔ آج آپ ذرا کسی رسم کو چھوڑ کر دیکھئے، آپ کی برادری آپ کا حقہ پانی بند کر دے گی۔ ذرا آپ زمانے کے جو چلن ہیں، جو رواج ہیں ان کو چھوڑ دیجئے، آپ کو یہ نظر آ جائے گا کہ آپ کے بچوں کے لئے رشتے نہیں ملیں گے، آپ کی بچیوں کے لئے کہیں سے پیغام نہیں آئیں گے۔ یہ ہے اصل میں تربیت۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ماریں کھا کر تربیت حاصل کی تھی۔ اُس دورِ سعید اور

ہمارے دور میں جو فرق ہے وہ پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ وہاں کلمہ طیبہ پڑھنے پر مار پڑتی تھی۔ جس نے کہا : اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه اُسے ماریں پڑنا شروع ہو جاتی تھیں۔ یہاں تو آپ ہزار دانے کی تسبیح لے کر بیٹھ جائیں اور اس پر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہیں، کوئی مخالفت نہیں ہوگی، کوئی مار نہیں پڑے گی، بلکہ ایسے شخص کے احترام و توقیر میں اضافہ ہو گا کہ یہ شخص بڑا اللہ والا ہے۔ آپ راتوں کو جاگئے، قرآن کی تلاوت کو معمولات میں شامل کیجئے، نفلی روزوں کا اہتمام کیجئے، اس پر آپ کو کوئی مار نہیں پڑے گی، بلکہ اگر لوگوں کے علم میں بھی یہ بات آجائے تو آپ کے تقویٰ اور تدین کی دھوم ہوگی۔

آج کے دور میں کشمکش جو شروع ہوگی وہ اس سے ہوگی کہ "میرے نزدیک ازروئے شریعت یہ کام غلط ہے، میں یہ نہیں کروں گا"۔ بس آپ نے جوں ہی یہ کیا وہیں کشمکش شروع ہو گئی۔ آج جو کشمکش ہے وہ شریعت پر عمل کرنے کی کشمکش ہے۔ اُس مکی دور میں شریعت نہیں تھی، صرف کلمہ شہادت پر مار پڑتی تھی۔ لیکن یہ طے ہے کہ جب تک مار نہ پڑے، کشمکش نہ ہو، تربیت نہیں ہوتی۔ وہ تربیت خانقاہی تربیت ہے جس میں مار نہیں پڑتی۔ ایک شخص ایک گوشہ میں بیٹھا اوراد و وظائف کی تسبیحات پڑھ رہا ہے تو اس کا بھی فائدہ ضرور ہو گا، لیکن اس کا ہدف وہ نہیں ہے جو تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ وہ تربیت انقلابی تربیت نہیں ہوگی، خانقاہی تربیت ہوگی۔ اگرچہ اس تربیت سے اچھا مسلمان وجود میں آئے گا، اسے روحانی ترفع حاصل ہو گا، وہ نیک ہو گا، صالح ہو گا، نماز میں اس کا جی لگے گا، ذکر اللہ میں اسے لذت حاصل ہوگی۔ یہ سب کچھ اسے حاصل ہو جائے گا لیکن وہ مرد میدان کبھی نہیں بنے گا، وہ باطل سے پنجہ آزمائی کبھی نہیں کر سکے گا۔ باطل اور طاغوت کو وہ کبھی نہیں للکار سکے گا۔ جبکہ یہاں وہ لوگ درکار ہیں جو میدان میں آئیں، باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کریں۔ اس کے لئے ضرورت ہے اس تربیت کی جس میں ماریں پڑ رہی ہوں، جس میں گھر والوں اور ماحول کے ساتھ شدید کشمکش سے سابقہ پیش آیا ہو۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے کہ ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے جان نثار ساتھی فی الواقع آگ میں جلے تھے۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا تھا۔ اب جو شخصیت اِس طرح پک گئی' پختہ ہو گئی' جس نے صبر و مصابرت کا یہ مورچہ سر کر لیا وہ کیا میدان میں کبھی پیٹھ دکھا دے گی؟۔ یہ ہے انقلابی تربیت جس پر جب آپ عمل شروع کرتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ "یہ ہے میرا راستہ جس پر میں چلوں گا' چاہے والدین کو ناپسند ہو' چاہے اہل و عیال کو ناپسند ہو' چاہے رشتہ داروں کو ناپسند ہو" معاشرے کے ساتھ آپ کی کشمکش شروع ہو جائے گی۔ وہ شخص جو رشوت لے رہا ہے اور گھر والے عیش کر رہے ہیں وہ آج طے کر کے دیکھے کہ میں رشوت نہیں لوں گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سب سے پہلی لڑائی گھر میں ہو گی۔ اس لئے کہ جو دو دو پراٹھے کھاتے تھے اگر ان کو سوکھی روٹی پر گزارا کرنا پڑے تو سب سے پہلے دشمن خود اپنے گھر والے ہوں گے۔ جب تک اس قسم کی کشمکش در کشمکش نہیں ہوتی' اُس وقت تک وہ تربیت نہیں ہو گی جو اسلامی انقلاب کیلئے درکار ہے۔ کوئی شخص چالیس دن کے چلے کیلئے اپنے وطن سے دور تبلیغ کیلئے نکل جاتا ہے' وہاں اسے کوئی نہیں جانتا' اس کی عبادت اور نوافل دیکھ کر لوگ متاثر ہوں گے' مگر اپنے وطن میں وعظ و تبلیغ کرنا مشکل ہے کیونکہ لوگ آئینہ سامنے رکھ دیں گے کہ تم عملی زندگی میں رشوت اور سود سے پرہیز تو کرتے نہیں۔ پس اصل تربیت اپنے مقام اور ماحول میں ہوتی ہے جس طرح محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فرمائی۔

غلطیوں کی اِصلاح کا نبوی ﷺ طریق کار

علامہ محمد صالح المنجد کی تالیف
"الأساليب النبوية في التّعامل مع أخطاء النّاس" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

الحمدُ للّٰه ربِّ العالمين ' الرَّحمٰنِ الرَّحيم ' مالكِ يَوم الدين ' الٰهِ الاوَّلين وَالاخِرين' وَقيُّومِ السَّمَاوات وَالارضين ' وَالصَّلاةُ وَالسَّلامُ على نبيِّه الامِين ' مُعَلِّم الخلقِ المَبعوثِ رحمةً لِلعالمين

اما بعد

لوگوں کو دین کی باتیں بتانا' اور دین کی تعلیم دینا بہت بڑی نیکی ہے' جس سے نہ صرف تعلیم دینے والے کو فائدہ پہنچتا ہے' بلکہ اس کی خیر و برکت ہر خاص و عام تک پہنچتی ہے۔ پھر یہ عمل انبیاء و رسل کی وہ میراث ہے جس میں سے تبلیغ و تربیت کا فریضہ انجام دینے والے ہر شخص کو حصہ نصیب ہوا ہے۔

"لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینے والے پر اللہ بھی رحمت نازل کرتا ہے اور اس کے فرشتے' بلکہ آسمان و زمین میں رہنے والی تمام مخلوقات اسے دعائیں دیتی ہیں' حتیٰ کہ بل میں موجود چیونٹی بھی اور مچھلی بھی اس کے لئے دعا کرتی ہے۔"(۱)

تعلیم کے بہت سے طریقے اور مختلف ذرائع ہیں۔ ان میں "غلطی کی اصلاح" بھی شامل ہے۔ اصلاح' تعلیم کا ایک لازمی جزو ہے' اور انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

غلطیوں کی اصلاح اس "خیر خواہی" میں شامل ہے جو ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اور اس کا "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے فریضہ سے گہرا تعلق ہے' جس کی وضاحت کی

ضرورت نہیں۔ (۲)

علاوہ ازیں وحی الٰہی میں بھی غلطیوں کی اصلاح پائی جاتی ہے اور یہ قرآنی طریقہ کار ہے' کیونکہ قرآن مجید میں اوامر ونواہی بھی نازل ہوئے ہیں۔ اس میں بعض امور کو سابقہ حالت پر برقرار بھی رکھا گیا ہے' بعض امور کی تردید کی گئی ہے اور غلطیوں کی اصلاح بھی کی گئی ہے' حتیٰ کہ اگر نبی اکرم ﷺ سے بھی کوئی خلاف اولیٰ بات ہو گئی ہے تو قرآن مجید میں اس پر تنبیہہ نازل ہو گئی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ○ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓی ○ اَوْيَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ○ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ○ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ○ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ○ وَهُوَ يَخْشٰی ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ○ ﴾ (عبس ۱۰-۱)

"(محمد ﷺ) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے' کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا' آپ کو کیا معلوم شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا' یا نصیحت قبول کرتا تو اسے نصیحت سے فائدہ پہنچتا۔ جو پروا نہیں کرتا' آپ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں' حالانکہ اگر وہ پاکیزگی حاصل نہ کرے تو آپ پر کچھ (الزام) نہیں' اور جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا' اور وہ (اللہ سے) ڈرتا ہے' اُس سے آپ بے رخی فرماتے ہیں۔"

اور فرمایا :

﴿ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَی النَّاسَ ' وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ﴾ (الاحزاب ۳۷)

"جب آپ اس شخص سے فرمارہے تھے جس پر اللہ نے احسان کیا' اور آپ نے بھی احسان کیا' (فرماتے تھے :) اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور اللہ سے ڈر' اور آپ اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ کرتے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا' اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے' حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔"

اور فرمایا :

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾

(الانفال ۶۷)

"پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں، جب تک وہ (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں خون نہ بہالے۔ تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو، اور اللہ آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔"

اور فرمایا :

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ﴾ (آل عمران ۱۲۸)

"(اے نبی) اس کام میں آپ کو کچھ اختیار نہیں۔ (اب دو صورتیں ہیں) یا اللہ ان پر مہربانی کرے یا انہیں عذاب دے کہ وہ ظالم لوگ ہیں۔"

بعض اوقات کسی صحابی سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی کہ انہوں نے قریش کے نام خط لکھ دیا کہ نبی اکرم ﷺ ان پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّىْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِىْ سَبِيْلِىْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِىْ ۖ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ ﴾

(الممتحنہ ۱)

"اے مومنو! اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم چھپ کر ان سے دوستی (کرنے کی کوشش) کرتے ہو، حالانکہ وہ اس دین حق سے منکر ہیں جو

تمہارے پاس آیا ہے' وہ رسول کو اور تمہیں صرف اس لئے (وطن سے) نکالتے ہیں کہ تم اپنے مالک اللہ پر ایمان لائے ہو۔ اور مجھے خوب معلوم ہے جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو کچھ علی الاعلان کرتے ہو۔ اور تم میں سے جو شخص یہ کام (کافروں سے دوستی) کرے گا' وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔"

اسی طرح غزوۂ اُحد میں جب تیرانداز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ جگہ چھوڑ دی جہاں نبی ﷺ نے انہیں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا' تو یہ فرمان الٰہی نازل ہوا :

﴿ حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ' مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ﴾

(آل عمران ۱۵۲)

"حتی کہ تمہیں اللہ نے وہ کچھ دکھادیا جو تم پسند کرتے تھے' اس کے بعد تم نے ہمت ہار دی' اور (نبی کے) حکم کے بارے میں اختلاف کرنے لگے' تم میں بعض دنیا چاہتے تھے اور بعض آخرت کے طالب تھے۔"

جب نبی اکرم ﷺ نے تادیب کے طور پر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے الگ قیام فرمایا تو بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ' وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ﴾

(النساء ۸۳)

"اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے' تو اسے (بلا تحقیق) مشہور کردیتے ہیں۔ (حالانکہ) اگر وہ اس کو رسول اللہ ﷺ کے پاس اور اپنے سرداروں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کرلیتے۔"

بعض مسلمانوں نے بغیر کسی شرعی عذر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان نازل کیا :

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ' قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ' قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً

﴿فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا﴾ (النساء : ۹۷)

"جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں' جب فرشتے ان کی جان قبض کرنے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں : ہم زمین میں عاجز اور کمزور تھے۔ وہ کہتے ہیں : کیا اللہ کی زمین فراخ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟"

جب منافقوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں افواہ پھیلائی جس سے اُم المومنین ؓ کا دامن پاک تھا' تو بعض مسلمانوں نے بھی منافقوں کے بہکاوے میں آ کر زبان سے نامناسب الفاظ نکالے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں :

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝﴾ (النور ۱۴-۱۵)

"اگر تم پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی' تو جس بات کا تم چرچا کرتے تھے' اس کی وجہ سے تم پر ایک بڑا عذاب نازل ہو جاتا۔ جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے' اور اپنے منہ سے ایسی بات کہتے تھے جس کا تمہیں علم نہ تھا' اور تم اسے معمولی سمجھتے تھے' حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔"

اس کے بعد فرمایا :

﴿وَلَوْ لَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ' سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (النور ۱۶'۱۷)

"جب تم نے اسے سنا تو کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ایسی بات زبان پر لائیں۔ (اے اللہ) تو پاک ہے' یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر مومن ہو تو دوبارہ کبھی ایسا کام نہ کرنا۔"

ایک بار نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں صحابہ کرام ؓ میں کسی بات پر اختلاف

ہو گیا۔ بحث کے دوران ان کی آوازیں کچھ بلند ہو گئیں۔ اس پر یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں :

﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ' اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ ﴾ (الحجرات ۱'۲)

"اے مومنو! (اپنی بات کو) اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھاؤ 'اور اللہ سے ڈرو 'بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ اے مومنو! نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو 'اور آپ ﷺ سے اس طرح بلند آواز سے بات نہ کرو جس طرح ایک دوسرے سے بلند آواز سے بات کر لیتے ہو 'ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں احساس بھی نہ ہو۔"

ایک دفعہ جناب رسول اللہ ﷺ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ تجارتی قافلہ آگیا۔ بعض لوگوں نے خطبہ چھوڑ دیا اور تجارتی سامان کی خرید و فروخت کے لئے چلے گئے۔ اس پر یہ فرمان الٰہی نازل ہوا :

﴿ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَیْهَا وَتَرَکُوْكَ قَائِمًا ' قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ' وَاللّٰهُ خَیْرُ الرَّازِقِیْنَ ○ ﴾
(الجمعہ ۱۱)

"جب وہ تجارت یا کھیل تماشے کی چیز دیکھتے ہیں 'تو آپ کو کھڑا چھوڑ کر اُدھر چلے جاتے ہیں۔ کہہ دیجئے : اللہ کے پاس جو کچھ ہے 'وہ تماشے اور تجارت سے بہتر ہے۔ اور اللہ بہتر رزق دینے والا ہے۔"

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے غلطیوں کی اصلاح اور خاموش نہ رہنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ کے نازل کردہ نور کی روشنی میں برائی کی روک ٹوک اور غلطی کی اصلاح کے اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے 'اور آپ ﷺ نے اس کام میں کسی قسم کی سستی سے کام

نہیں لیا۔ اسی قسم کے دلائل سے علماء کرام نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ : "نبی ﷺ کے حق میں بیان اور وضاحت کو ضرورت کے وقت سے مؤخر کرنا جائز نہیں۔"

نبی اکرم ﷺ کی زندگی جن افراد کے درمیان گزری ' ان سے سرزد ہونے والی غلطیوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا طرز عمل انتہائی اہمیت کا حامل ہے ' کیونکہ آنحضرت ﷺ کو اللہ کی تائید و نصرت حاصل تھی ' اور آپ ﷺ کے اقوال و افعال کی تائید یا تصحیح وحی کے ذریعے ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے اختیار کردہ اسالیب زیادہ محکم اور زیادہ مفید ہیں۔ ان کے استعمال سے یہ امید زیادہ ہے کہ لوگ اصلاح کرنے والے کی بات مان لیں۔ تربیت کا فریضہ انجام دینے والا کوئی بھی فرد اگر ان طریقوں اور اسالیب پر عمل پیرا ہو تو اس کا یہ عمل زیادہ صحیح اور بہتر ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے ' اس لئے نبوی طریق کار اور اسالیب پر عمل کرنے سے آنحضرت ﷺ کی اقتداء کا شرف بھی حاصل ہو جاتا ہے اور اخلاص کی موجودگی میں یہ چیز اجر و ثواب کے حصول کا باعث ہے۔

نبوی ؐ طریق کار کا مطالعہ کرنے سے دنیا میں پائے جانے والے متعدد اسالیب کی ناکامی اور غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر اسلوب واضح طور پر غلط ہیں ' اور ان کی بنیاد غلط نظریات پر رکھی گئی ہے ' مثلاً بے قید آزادی کا نظریہ۔ یا وہ نسل در نسل منتقل ہونے والے غلط خیالات پر مبنی ہوتے ہیں ' مثلاً آباء و اجداد کی اندھی تقلید۔

یہاں یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس نبوی منہج کو عملی طور پر اختیار کرتے ہوئے بہت حد تک اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے ' تاکہ حالات و واقعات اور نتائج کو مد نظر رکھتے ہوئے جو اسلوب زیادہ مناسب معلوم ہو وہی کام میں لایا جائے۔ اور فقیہانہ نظر رکھنے والا شخص ملتے جلتے حالات و کیفیات پر گہری نظر ڈال کر مناسب اسلوب کا انتخاب کر سکتا ہے۔

اس کتاب یہ میں کوشش کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا واسطہ جن افراد سے تھا ' اور جن حضرات کے درمیان آپ ﷺ کی زندگی گزری ' ان کے مقام و مرتبہ کے فرق اور ذہن و فکر کے اختلافات کو سامنے رکھتے ہوئے ' آنحضرت ﷺ نے ان کی غلطیوں کے بارے میں جو مختلف انداز کار و یہ اختیار کیا ' ان اسالیب کو جمع کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے مسلمان بھائیوں کو توفیق دے' فائدہ پہنچائے اور صحیح بات کی طرف راہنمائی فرمائے۔ یہ سب کچھ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے' اور وہی سیدھی راہ کی ہدایت دینے والا ہے۔

غلطیوں کی اصلاح کے موقع پر پیش نظر رکھے جانے والے بعض امور

اصل موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ بعض ایسی باتیں بیان کر دی جائیں' جن کا دوسروں کی غلطیوں کی اصلاح کرنے سے پہلے اور اصلاح کے دوران خیال رکھنا ضروری ہے :

۱) اخلاص :

جب کسی کی غلطی کی اصلاح کا ارادہ کیا جائے تو ضروری ہے کہ اس عمل سے مقصود اللہ کی رضا کا حصول ہو' کسی سے برتری کی خواہش نہ ہو' نہ کسی پر اپنا غصہ نکالنے کا جذبہ کار فرما ہو' نہ یہ کوشش ہو کہ عوام کی نظروں میں کوئی مقام حاصل ہو جائے۔

امام ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک تابعی حضرت شفی اصبحی کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ وہ مدینہ منورہ پہنچے تو دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک بزرگ کے ارد گرد جمع ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا کہ یہ صحابی رسول ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں : وہ لوگوں کو احادیث نبویہ سنا کر وعظ کر رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ قریب ہوتے ہوتے آپؓ کے سامنے جا بیٹھا۔ جب وہ وعظ سے فارغ ہوئے اور لوگ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے عرض کی : میں آپؓ کو حق کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے ایسی کوئی حدیث سنائیں جو آپ نے جناب رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سنی اور سمجھی ہو اور آپ کو اچھی طرح یاد ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا : "ہاں' میں سناؤں گا' میں ایسی ہی حدیث سناؤں گا' جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے سنائی' اور میں نے اسے سمجھا اور یاد کیا۔" پھر اچانک ان کی حالت غیر ہو گئی' تھوڑی دیر بعد حواس بجا ہوئے تو فرمایا : "میں آپ کو ضرور وہ حدیث سناؤں گا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اِس گھر میں سنائی تھی' اُس وقت آنحضرت ﷺ

کے پاس میرے سوا کوئی نہیں تھا۔" اتنا کہتے ہی پھر حالت غیر ہو گئی۔ جب افاقہ ہوا تو چہرے سے پسینہ پونچھنے لگے۔ پھر فرمایا : "ہاں' میں آپ کو ضرور وہ حدیث سناؤں گا' جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے سنائی تھی' جب کہ میں اِس گھر میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تھا' میرے سوا آپ ﷺ کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا"۔ اس کے بعد پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حالت خراب ہو گئی اور آپؓ چہرے کے بل جھک گئے' میں نے بہت دیر تک آپؓ کو سہارا دیئے رکھا۔ تب آپؓ کی حالت سنبھلی۔ تب فرمایا : مجھے جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث سنائی کہ :

"جب قیامت کا دن ہو گا' اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے زمین پر تشریف فرما ہوں گے۔ ہر جماعت گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی ہو گی۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ جن شخصوں کو بلائیں گے' ان میں سے ایک وہ آدمی ہو گا جس نے قرآن پاک یاد کیا ہو گا' اور ایک وہ آدمی ہو گا جو اللہ کی راہ میں جنگ کرتا رہا ہو گا اور ایک بہت مال دار آدمی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کے عالم سے فرمائیں گے : کیا میں نے تجھے وہ کتاب نہیں سکھائی تھی جو میں نے اپنے رسول پر نازل کی تھی؟ وہ کہے گا : جی ہاں' یا رب۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : پھر تو نے اپنے علم پر کیسے عمل کیا؟ وہ کہے گا : میں رات دن اس میں مشغول رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : تو نے جھوٹ کہا' اور فرشتے اسے کہیں گے : تو نے جھوٹ کہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : تیری نیت تو یہی تھی کہ کہا جائے فلاں آدمی (بڑا) قاری اور عالم ہے۔ وہ (دنیا میں) کہا جا چکا ہے۔ اسی طرح صاحب ثروت شخص کو حاضر کیا جائے گا' اللہ تعالیٰ اسے فرمائیں گے : کیا میں نے تجھے (مالی) آسودگی نہیں بخشی تھی حتیٰ کہ میں نے تجھے کسی کا محتاج نہ رہنے دیا؟ وہ کہے گا : جی ہاں' یا رب۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : پھر تو نے دیئے ہوئے مال کا کیا کیا؟ وہ کہے گا : میں رشتہ داروں پر احسان کرتا تھا اور (سب ضرورت مندوں پر) صدقہ کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی کہیں گے : تو جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : تو یہ چاہتا تھا کہ لوگ کہیں : فلاں بہت سخی ہے۔ وہ (دنیا میں) کہا جا چکا۔ اسی طرح اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کو حاضر کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے فرمائیں گے : تجھے کس لئے قتل کیا گیا؟ وہ کہے گا : مجھے تیری راہ میں

جہاد کا حکم ملا' تو میں جنگ کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے قتل کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے فرمائیں گے : تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی اسے کہیں گے : تو جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : بلکہ تیری خواہش صرف یہ تھی کہ کہا جائے : فلاں بہت بہادر ہے۔ وہ کہا جاچکا۔" اس کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر فرمایا : "ابو ہریرہ! یہ تین شخص ہیں' جو قیامت کے دن تمام مخلوقات میں سب سے پہلے جہنم میں جھونکے جائیں گے۔"[۳]

اگر نیت صحیح ہو تو ثواب بھی ملے گا' اور اللہ کے حکم سے بات میں اثر بھی پیدا ہو گا اور سننے والے اس کی بات مانیں گے۔

۲) غلطی فطری چیز ہے :

ارشاد نبوی ہے :

((كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَ خَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ)) [۴]

"تمام بنی آدم خطاکار ہیں' اور بہتر خطاکار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں۔"

یہ ایک واضح حقیقت ہے' اسے یاد رکھنے سے ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ تربیت کرنے والے استاد اور واعظ کو افراد سے اعلیٰ ترین مثالی کردار یا معصوم عن الخطا ہونے کی توقع رکھ کر ان کا محاسبہ نہیں کرنا چاہئے' نہ دوبارہ غلطی ہو جانے پر یا بڑی غلطی سرزد ہو جانے پر ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا درست ہے کہ ان کی صلاح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان کے ساتھ حقیقت پر مبنی رویہ رکھنا چاہئے اور یاد رکھنا چاہئے کہ انسان فطری طور پر لاعلمی' غفلت' نقص' خواہش نفس اور نسیان جیسے عوارض کا شکار ہو جایا کرتا ہے۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے سے یہ فائدہ بھی ہو گا کہ اچانک کوئی غلطی سامنے آجانے کی صورت میں داعی جذبات میں آکر توازن سے محروم نہیں ہو جائے گا' ورنہ غلطی کرنے والے کی طرف سے نامناسب ردعمل پیش آسکتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے مبلغ اور استاد کو یہ بات یاد رہے گی کہ وہ خود بھی ایک انسان ہے' اس سے بھی اسی غلطی کا صدور ممکن ہے جو دوسرے شخص نے کی ہے۔ چنانچہ وہ غلطی کرنے والے کے ساتھ سختی کی نسبت نرمی کا معاملہ اختیار

کرنے کو ترجیح دے گا' کیونکہ اصل مقصد اصلاح ہے' انتقام یا سزا نہیں۔

لیکن مذکورہ بالا گزارشات کا یہ مطلب نہیں کہ ہم غلطی کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں' اور کبیرہ گناہوں کے مرتکب افراد کی طرف سے یہ معذرت کریں کہ وہ نوجوان ہیں' یا ان کا دور گناہوں پر ابھارنے والے عوامل اور فتنوں سے بھرپور ہے' بلکہ برائی سے روکنا اور محاسبہ کرنا چاہئے' لیکن شریعت کی میزان کے مطابق۔

۳) شرعی دلیل کی بنیاد پر' اور مدلل تردید' نہ کہ بغیر علم کے محض جذبات کی بنیاد پر :

حضرت محمد بن منکدر رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے صرف ایک چادر اوڑھ کر' اسے سر کے پیچھے گرہ لگا کر نماز پڑھی (۵) حالانکہ ان کے کپڑے (قریب ہی) تپائی پر پڑے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا : "آپ ایک چادر میں نماز پڑھتے ہیں؟" انہوں نے فرمایا : "میں نے اس لئے یہ کام کیا ہے تاکہ تجھ جیسا احمق دیکھ لے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک میں ہم میں سے کس کے پاس دو کپڑے ہوتے تھے؟" (۶)

امام ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا : "یہاں احمق سے مراد بے علم ہے......ان کا مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے' اگرچہ دو کپڑے پہن کر نماز پڑھنا افضل ہے۔ انؓ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ کام جان بوجھ کر بیان جواز کے مقصد سے کیا ہے' تاکہ بے علم یا ویسے ہی میری پیروی کر لے' یا مجھے ٹوکے تو میں اسے بتاؤں کہ یہ جائز ہے۔ انہوں نے کلام میں سختی اختیار فرمائی تاکہ علمائے کرام کو ٹوکنے سے منع فرمائیں' اور اس لئے بھی کہ لوگ شرعی مسائل میں تحقیق کیا کریں۔" (۷)

۴) غلطی جتنی بڑی ہو' اس کی اصلاح کا اہتمام اتنا ہی زیادہ ہونا چاہئے :

چنانچہ جن غلطیوں کا تعلق عقیدہ سے ہے' ان کی اصلاح کا اہتمام آداب وغیرہ سے تعلق رکھنے والی غلطیوں کی نسبت زیادہ ہونا چاہئے۔ نبی اکرم ﷺ نے شرک کی ہر قسم سے تعلق رکھنے والی غلطیوں کی چن چن کر اصلاح کی' کیونکہ شرک سب سے خطرناک چیز ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس دن جناب رسول اللہ ﷺ کے فرزند حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی' اس دن سورج گرہن تھا۔ بعض لوگوں نے کہا : یہ تو ابراہیم ؓ کی وفات کی وجہ سے بے نور ہو گیا ہے۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا : "سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں' انہیں کسی کے مرنے جینے سے گرہن نہیں لگتا۔ تم جب انہیں گہنایا ہوا دیکھو تو گرہن ختم ہونے تک اللہ سے دعا اور نماز میں مشغول رہو۔"(۸)

حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ جہاد کے لئے حنین تشریف لے جا رہے تھے' راستے میں آپ کا گزر مشرکین کے ایک درخت کے پاس سے ہوا جو "ذات انواط" کے نام سے معروف تھا' وہ لوگ اس پر (برکت حاصل کرنے کے لئے) اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ بعض مسلمانوں نے عرض کی : یا رسول اللہ ﷺ! جس طرح ان کا یہ "ذات انواط" ہے' اسی طرح ہمارے لئے بھی کوئی درخت مقرر فرما دیجئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "سبحان اللہ! یہ تو ایسی ہی بات ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا : جس طرح ان لوگوں کے معبود (بت) ہیں' ہمارے لئے بھی ایک معبود بنا دیجئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' تم (مسلمان) ضرور اپنے سے پہلوں (غیر مسلموں) کے طریقوں پر چلو گے۔"(۹)

حضرت ابو واقد رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور روایت میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حنین کی طرف روانہ ہوئے۔ (راستے میں) کافروں کی ایک بیری تھی' وہ اس کے پاس (مجاور بن کر) بیٹھتے اور اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ اسے ذات انواط کہا جاتا تھا۔ صحابی ارشاد فرماتے ہیں : ہم ایک بڑی ہری بھری بیری کے پاس سے گزرے تو ہم نے کہا : یا رسول اللہ ؐ! ہمارے لئے بھی ایک ذات انواط مقرر فرما دیجئے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' تم نے وہی بات کی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا جس طرح ان لوگوں کے معبود ہیں' ہمارے لئے بھی ایک معبود بنا دیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا : "تم تو جہالت کی بات کر رہے ہو"۔ یہی تو وہ طور طریقے ہیں' تم گزشتہ اقوام

کی ایک ایک رسم اپنالوگے۔"(۱۰)

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : جناب رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی' رات کو بارش ہوئی تھی' نماز سے فارغ ہو کر آنحضرت ﷺ صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا : "کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟" صحابہ نے عرض کی : اللہ کو اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "اللہ تعالیٰ نے فرمایا : "اِس صبح میرا کوئی بندہ مجھ پر ایمان لانے والا بن گیا' کوئی کفر کرنے والا۔ جس نے تو یہ کہا : ہمیں اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ملی ہے' وہ مجھ پر ایمان رکھنے والا ہے اور ستاروں کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔ اور جس نے کہا : فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے' وہ میرے ساتھ کفر کرنے والا اور ستارے پر ایمان رکھنے والا ہے۔"(۱۱)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا : اے اللہ کے رسول! جو کچھ اللہ چاہے' اور جو آپ چاہیں وہی ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "تو نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا؟ بلکہ وہی ہوتا ہے جو اکیلا اللہ چاہے۔"(۱۲)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک قافلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو باپ کی قسم کھاتے پایا تو جناب رسول اللہ ﷺ نے سب لوگوں کو بلند آواز سے مخاطب کر کے فرمایا : "سنو! اللہ تمہیں باپوں کی قسمیں کھانے سے منع فرماتا ہے' جسے قسم کھانا ہو وہ اللہ کی قسم کھائے' ورنہ خاموش رہے۔"(۱۳)

حضرت ابو شریح ہانی بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ وہ ایک آدمی کو عبد الحجر (پتھر کا غلام) کہہ کر بلاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے اسے کہا : "تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے کہا : عبد الحجر (پتھر کا بندہ)۔ فرمایا : "نہیں' تو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) ہے۔"(۱۴)

(جاری ہے)

حواشی

(۱) سنن ترمذی' حدیث ۲۶۸۵ (طبع احمد شاکر) امام ترمذی نے فرمایا : یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

(۲) البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ "غلطی" کا دائرہ "منکر" (برائی) سے زیادہ وسیع ہے۔ کیونکہ غلطی کبھی "منکر" میں شامل ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔
(۳) سنن ترمذی' حدیث ۲۳۸۲۔ امام ترمذی نے فرمایا : یہ حدیث حسن غریب ہے۔
(۴) سنن ترمذی' حدیث ۲۴۹۹۔ سنن ابن ماجہ' حدیث ۴۲۵۱۔ تحقیق عبد الباقی۔
(۵) اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس پاجامے نہیں ہوتے تھے' تو نمازی چادر کو سر کے پیچھے گردن پر گرہ لگا لیا کرتا تھا تاکہ رکوع اور سجدہ میں پردہ قائم رہے۔ (فتح الباری طبع سلفیہ ۱/۴۶۷)
(۶) صحیح بخاری' فتح الباری حدیث ۳۵۲۔
(۷) فتح الباری ۱/۴۶۷۔
(۸) صحیح بخاری' حدیث نمبر ۱۰۶۱۔
(۹) جامع ترمذی حدیث نمبر ۲۱۸۰۔ امام ترمذی نے فرمایا : یہ حدیث حسن صحیح ہے۔
(۱۰) مسند احمد' جلد ۵ صفحہ ۲۱۸
(۱۱) صحیح بخاری' حدیث نمبر ۸۴۶۔
(۱۲) مسند احمد' ۱/ ۲۸۳۔
(۱۳) صحیح بخاری' حدیث نمبر ۶۱۰۸۔

نوٹ : مسند احمد میں سعدؒ بن عبیدہ سے مروی ہے' انہوں نے کہا : میں ایک حلقہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا۔ انہوں نے دوسرے حلقہ میں موجود ایک شخص کو کہتے سنا : "میرے باپ کی قسم"۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے کنکریاں ماریں اور فرمایا۔ "عمرؓ نے یہ قسم کھائی تھی تو نبی ﷺ نے انہیں منع کیا اور فرمایا : یہ شرک ہے۔" (الفتح الربانی ۱۴/ ۱۶۴)
(۱۴) الادب المفرد' امام بخاری' حدیث ۸۱۳۔ جناب البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ (صحیح الادب المفرد' حدیث ۶۲۳)

تنظیم اسلامی ہی کیوں؟

تحریر : عمران این حسین' ترجمہ : سید افتخار احمد

گزشتہ سے پیوستہ

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اور موجودہ دور میں اُمّتِ مسلمہ پر ہونے والے شیطانی حملے کے پس پردہ حقائق کا تجزیہ

جب ہم قرآن مجید کے پس منظر میں جائزہ لیتے ہیں تو خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا واقعہ ہمیں ایک ایسے وقت میں ظہور پذیر ہوتا نظر آتا ہے جبکہ قرآن مجید کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل بعض دوسرے واقعات بھی رونما ہو رہے تھے۔ مثلاً سلطنتِ عثمانیہ کی شکست و ریخت نہ ہوتی اگر یورپ میں ایک ایسی بنیادی تبدیلی نہ واقع ہو گئی ہوتی جس نے یورپین تہذیب کو دنیا کے اسٹیج پر ایک بڑے کردار کی صورت میں پیش کیا۔ ہماری مراد فرانس اور روس کے انقلابات سے ہے جو مشرقی و مغربی یورپ کی تہذیب کو اس کی بنیاد یعنی عیسائیت سے ہٹا کر ملحدانہ اور بے خدا تہذیب کی طرف لے گئے۔ سائنسی اور صنعتی انقلابات اور سرمایہ دارانہ معاش کے ظہور نے اس بے خدا تہذیب کو تمام انسانیت کو اپنے چنگل میں پھنسا لینے کے قابل بنا دیا۔ طاقت کے حصول کے بعد اس ملحدانہ یورپی تہذیب نے بقیہ دنیا کو ملحد بنانے کا مشن اپنے سر لے لیا۔ سلطنت عثمانیہ عین یورپ کے سر پر تھی جس کی بنیاد تاحال متبرک اور مقدس (یعنی مذہبی) اصولوں پر قائم تھی' اور نظام خلافت نے اسلام کے شرعی اور مقدس نمونے کو ایک اجتماعی اور عالمی نظام کے حوالے سے قائم کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت عثمانیہ کو باقاعدہ ہدف بنا کر ختم کیا گیا۔ خلافت کے خاتمہ کے نتیجہ میں ان قوتوں کی راہ کی آخری بڑی رکاوٹ دور ہو گئی جو تمام انسانیت کو ملحد اور بے خدا بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اُس حدیثِ قدسی کے ظہور کا وقت آن پہنچا جس کی رو سے دورِ فتن میں ہر ۱۰۰۰ میں سے ۹۹۹ اشخاص جہنم کا لقمہ بننے

والے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں موجودہ ملحدانہ تہذیب کے ہاتھوں خلافت کے خاتمہ کا مطلب یہ تھا کہ یاجوج وماجوج کے زمانہ کی شروعات ہو چکی ہیں :

﴿ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝ ﴾

(الکہف : ۹۸-۹۹)

"(ذوالقرنین نے اس آہنی دیوار کو دیکھ کر) کہا (یہ جو کچھ ہو تو فی الحقیقت) میرے رب کی مہربانی ہے، مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس (دیوار) کو ڈھا کر برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔ اور (جس دن یہ بات ظہور میں آئے گی تو) اس دن ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ وہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا پھر ہم سب انسانوں کو (میدان حشر میں) جمع کر دیں گے"۔

تاریخ کے اس مرحلے میں جہاں ایک طرف جدید ملحدانہ یورپی تہذیب خلافت عثمانیہ کو ختم کر رہی تھی، وہاں دوسری طرف اس سے بھی زیادہ شرانگیز انقلاب دنیائے یہود میں نمودار ہو رہا تھا۔ ایک ملحدانہ صیہونی تحریک مشرقی یورپ کے یہودیوں میں پیدا ہوئی، جس نے اعلان کیا کہ فلسطین کی مقدس سرزمین یہودیوں کی ملکیت ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کی تھی۔ صیہونیوں نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا کہ یہود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں بگاڑ پیدا کر کے اس سے غداری کی ہے، اور نتیجتاً وہ اس متبرک سرزمین پر اپنے حق سے محروم ہو چکے ہیں۔ عام یہودیوں نے اس صیہونی تحریک کے ترغیبی چارہ کو ہڑپ کر لیا اور اس طرح اب اسرائیلی ریاست کا قیام یہودیوں کے لئے ہدف قرار پایا، قطع نظر اس سے کہ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے انہیں کیا صحیح یا غلط ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ صیہونیت ایک شیطانی قوت کی پیدا کردہ تحریک تھی جس نے یہودیوں کو دھوکہ دیا اور انہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کر لیا۔ یہود ایک ایسی راہ پر چل نکلے جس کے آخری سرے پر یہودیوں اور یہودیت دونوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے تباہی لکھی ہوئی

ہے۔ اس شیطانی قوت (یعنی دجال) کے خروج اور یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کے بارے میں قرآن حکیم کی آخری سے پہلی سورۃ میں خبردار کیا گیا ہے :

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ○ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ○ ﴾

(الفلق : ۱'۲)

"(اے پیغمبرؐ) کہہ دیجئے میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی' اس (شیطانی قوت کے) شر سے جو اس نے پیدا فرمایا"۔

اس طرح ہم نے خلافت کی تباہی اور اسی دور میں ریاست اسرائیل کے قیام کا مشاہدہ کیا۔ ان دونوں واقعات کے پیچھے ایک ہی شیطانی قوت کار فرما تھی۔ اس کی تصدیق قرآن مجید کی سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۵'۹۶ سے ہوتی ہے' جہاں پر اللہ تعالیٰ نے ایک بستی (بیت المقدس بطور اسرائیلی ریاست) کی تباہی کا ذکر فرمایا۔ اور پھر اس بستی کے دوبارہ آباد ہونے (یعنی ریاست اسرائیل کے دوبارہ قیام) کا ذکر فرمایا کہ یہ بستی یاجوج ماجوج کے دور میں ہی دوبارہ آباد ہوگی :

﴿ وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○ حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ○ ﴾

"اور ممکن نہیں ہے کہ جب ایک بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ سکے یہاں تک کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے"۔ (الانبیاء : ۹۵'۹۶)

ہم نے دیکھا کہ کس طرح یہودیوں کو دھوکہ دیا گیا اور انہیں اس راہ پر گامزن کر دیا گیا جس پر وہ انسانیت کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص فسق و فجور اور ظلم و ستم پر مشتمل اپنے رویہ کو جاری رکھ سکیں۔

اسی ضمن میں ایک تیسرا واقعہ بھی پیش آیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشانی تھی جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے جس کے مطابق یہودیوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم نے فرعون کی روش اختیار کی تو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو فرعون کا ہوا تھا۔ (حوالہ قرآن مجید سورۂ یونس : ۹۲) یہ واقعہ ۱۸۹۸ء میں Loret کے ہاتھوں مصر کے زیریں حصہ میں

وادیٔ بادشاہوں کی وادی میں فرعون کی لاش کا دریافت ہونا تھا۔

اس کے ساتھ ہی تین اور واقعات پیش آئے' بلکہ در حقیقت پیش آ رہے ہیں' جو سب کے سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ اس شیطانی قوت کے ظہور ہی سے متعلق ہیں۔ یہ واقعات جدید مغربی تہذیب کی مادہ پرستی والحاد پر مبنی فلسفیانہ بنیاد ہی کے مختلف نتائج ہیں :

۱) یورپی معیشت کا سود کی بنیاد پر قائم ہونا' اور پھر پوری دنیا کی معیشت پر اس لعنت کا مسلط ہو جانا۔ سلطنت عثمانیہ اس کا خاص طور پر نشانہ بنی۔ اس عظیم ریاست کا زوال تو محمود ثانی (۱۸۰۸ تا ۱۸۳۹ء) کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا' جب یہودی ساہو کار سود کے ساتھ وہاں داخل ہو گئے تھے۔ ۱۸۹۶ء تک عثمانی معیشت پر سودی نظام کا تسلط اس قدر شدید ہو چکا تھا اور اس کے نتیجہ میں عثمانی خلیفہ اس طرح جکڑا جا چکا تھا کہ صیہونی لیڈر ہرزل کو سلطان عبدالحمید دوم سے ملاقات کرنے اور معاشی لحاظ سے بلیک میل کرنے کا موقع مل گیا۔ فلسطین کے عوض اس نے سلطنت عثمانیہ کی معیشت کو کلی طور پر تباہی سے بچانے کی پیشکش کی۔ عبدالحمید کے انکار پر اسے معزول کرا دیا گیا اور اس طرح آسانی سے خلافت ختم کرا دی گئی۔ یہودی ساہو کاروں کا یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔

۲) یورپ کی جدید فلسفیانہ سیاست کی بنیاد پر شرک کا ابھرنا۔ آج اللہ تعالیٰ کو حاکم مطلق نہیں مانا جاتا بلکہ اب جدید لادینی ریاست حاکم مطلق ہے۔ جدید یورپی نظام ریاست و سیاست نے تمام انسانیت کو اپنی مہلک آغوش میں لے لیا۔ بالخصوص خلافت کی مسند اس کا نشانہ بنی۔ جب خلافت ختم ہو گئی تو ترکی کی جدید لادینی ریاست اس شرک کی بنیاد پر ابھری۔ ترکی سے یہ لعنت عبدالعزیز بن سعود کی طرف منتقل ہوئی جس نے عالم اسلام کے قلب کو سعودی عرب کی جدید ریاست میں تبدیل کر دیا جس کی بنیاد وہی شرک تھا۔ پاکستان نے بھی کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی کی تقلید کی اور اس طرح علامہ اقبال کی مساعی بظاہر رائیگاں چلی گئی۔

۳) یورپ کے جدید لادینی معاشرہ کے قلب میں نئے فلسفہ نسواں (Feminism) کا ابھرنا۔ اس کے نتیجہ میں جنسی انقلاب آیا جس نے گویا اخلاقیات کی عمارت کو منہدم

کر دیا۔ اس آزادی کے نتیجہ میں جنسی آوارگی کا وہ سیلاب آیا جو تاریخ میں پہلی مثال تھا۔ یہ وہ "کثرالخبائث" تھا جس کو رسول اکرم ﷺ نے یاجوج ماجوج کی رہائی کی علامت قرار دیا تھا۔ اس تباہ کن اور مادر پدر آزاد شہوانیت نے اب تمام انسانیت بالخصوص دنیائے اسلام کو اپنا نشانہ بنالیا ہے۔

ان واقعات سے ذرا پیشتر' یا جب یہ رونما ہو رہے تھے' دنیائے اسلام نے اب تک ظاہر ہونے والے نبوت کے جھوٹے دعویداروں یعنی دجالوں میں سے سب سے بڑھ کر خطرناک دجال کا مشاہدہ کیا۔ ہماری مراد آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی ہے جو احمدی تحریک کا بانی تھا۔ وہ اس وقت ظاہر ہوا جب نظام خلافت پر حملہ کی تیاری ہو رہی تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے خیالات اور عقائد کو بگاڑنا تھا' بالخصوص ان عقائد کو جو دورفتن کی ماورائے حواس حقیقت کے صحیح شعور سے تعلق رکھتے تھے۔ مرزا قادیانی خلافت کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنانے والی شیطانی قوتوں کا آلہ کار تھا۔ اس کا اصل کردار فکر اسلامی کی توجہات کو ان قوتوں کی طرف سے ہٹانا اور دانش مند طبقے کو کلامی بحثوں میں جتلا کرکے الجھا دینا تھا۔

علامہ اقبال ان تمام واقعات کے پیچھے چھپی حقیقت کو سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے ان شیطانی قوتوں کو جو دنیا میں پھیلا دی گئی تھیں اور اپنے وقت کے اہم ترین خطرہ کو خوب پہچان لیا تھا۔ علامہ اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے جہاں وہ مکار دجال مرزا غلام احمد بھی کچھ عرصہ رہا تھا۔ اقبال نے اس کے وہ شیطانی منصوبے بھانپ لئے تھے جن سے وہ امت کی تباہی بپا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن انہیں ایک ایسی جماعت کی طاقت اور مدد حاصل نہ تھی جو ان منصوبوں کا توڑ کر سکتی۔ تاہم انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی مذمت [1]

---

[1] علامہ اقبال کی ایک مصدقہ جماعت بنانے کی کوشش حال ہی میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب "علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین" کی اشاعت سے ظاہر ہوئی ہے۔ یہ کتاب تعلیمات اسلامی کمیٹی نے لاہور (پاکستان) میں ۱۹۹۶ء میں شائع کی۔ اس کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے حافظ عاکف سعید صاحب نے ایک مضمون "بعض غیبی اشارات کے پیش نظر علامہ اقبال کی آخری خواہش جو بوجوہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی" کے عنوان سے تحریر کیا ہے' جسے مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس بڑے خطرہ سے آگاہ کیا جو انہیں قادیان کے شریر دجال کی طرف سے درپیش تھا۔ انہوں نے یورپ کی جدید ملحدانہ اور بے خدا تہذیب کے خطرات سے بھی مسلمانوں کو خبردار کیا اور یہود کی نئی روش کے خوفناک نتائج کے متعلق بھی مسلمانوں کو قبل از وقت آگاہ کیا۔ اگر کسی کا یہ خیال تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے لیڈر محمد علی جناح ایک اسلامی جماعت اور اس کے امیر کے طور پر کام کرتے ہوئے جنوبی ایشیا میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا باعث بنیں گے تو یہ بہت بڑی غلط فہمی تھی کیونکہ نہ تو مسلم لیگ ایک ٹھیٹھ اسلامی جماعت تھی اور نہ ہی جناح ایک مستند امیر یا امام تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جناح نے کبھی ایسا کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور مسٹر جناح کو اتنی قرآن فہمی حاصل نہیں تھی کہ وہ موجودہ دور کی خطرناک حقیقت حال کو سمجھ سکتے' یہ صرف اقبال ہی کی ذہنی استعداد تھی کہ انہوں نے اس شر کو پہچان لیا۔ مسلم لیگ نہ تو خلافت کے خاتمہ پر مناسب ردعمل کا مظاہرہ کر سکی اور نہ ہی وہ ملحدانہ اور بے خدا دور کے خطرات کو سمجھ سکی۔ جہاں تک اس دجال کا تعلق ہے جو جنوبی ایشیا کے دانش مند مسلمان طبقے کو بیوقوف بنانے کے لئے بھیجا گیا تھا' تو واقعہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ مسٹر جناح نے سر ظفر اللہ خان کو' جو مرزا کا بہت ہی صاحب کمال اور ذہین پیروکار تھا' پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ مقرر کر دیا۔

ہم خلافت کے خاتمہ کی تاریخی حقیقت کے ماورائے حواس پہلو کا سرسری جائزہ لینے کی حد تک کفایت کرتے ہیں' تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کن وجوہات کی بنا پر اس کی بحالی ان ۷۳ سالوں میں ممکن نہ تھی۔ تاہم بعض ایسے لوگ جو بیعت سے متردد ہیں' یہ سوال کرتے ہیں کہ استنبول میں خاتمے کے بعد خلافت کسی اور جگہ کیوں بحال نہ ہو سکی؟ اور اب ہم ۷۰ سال سے کیوں خلافت کے بغیر رہ رہے ہیں؟ اس کا اصل سبب صرف یہ دور ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ سب سے بڑی شیطانی قوت کا ظہور ہو گیا ہے جو بالآخر انسانی شکل میں ظاہر ہو گی۔ یہ دجال اور یاجوج ماجوج کا دور ہے۔ اسلامی انقلابی تحریک جو خلافت کی بحالی کے لئے کوشاں ہے اپنی اس جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس موجودہ دور کی اصل حقیقت کا صحیح

ادراک نہ کرلے اور تسلیم نہ کرلے کہ یہ درحقیقت دجال کا دور ہے۔ وہ مستند اسلامی انقلابی تحریک یا جماعت جو دورِ حاضر سے متعلق اقبال کے صحیح قرآنی فکر سے آراستہ ہو' ۱۹۲۴ء میں اور اس کے بعد موجود نہیں تھی' تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ خلافت کی بحالی کے لئے ایک کامیاب جدوجہد کی جاسکتی؟ الحمد للہ اب دنیائے اسلام میں کئی ایک جگہ ایسی مستند اسلامی انقلابی تحریکیں ابھر رہی ہیں۔

اب ہم اس دور کی سیاسی حقیقت کا تجزیہ کرتے ہیں' جس نے خلافت کے خاتمے کا مشاہدہ کیا اور جو ۱۹۲۴ء سے آج تک گزرا ہے۔

ترکی کی اعلیٰ قومی اسمبلی کے خاتمہ خلافت کے اعلان کے ٹھیک چار روز بعد ۷ مارچ ۱۹۲۴ء کو شریف حسین (اردن کے موجودہ شاہ حسین کے پردادا) نے خلافت کا دعویٰ کر دیا۔ وہ خلافت عثمانیہ کی طرف سے شریف مکہ مقرر تھا۔ لیکن اس نے استنبول کے خلاف بغاوت کردی اور حکومت برطانیہ کے ایجنٹ کے طور پر خلافت عثمانیہ کو شکست دینے کی برطانوی کوشش میں پورا تعاون کیا تھا۔ اس کے اس کردار کا معاوضہ اسے برطانوی خزانہ سے ۷۰ لاکھ سٹرلنگ پونڈ کی صورت میں ملا تھا۔ تاہم اس کی طرف سے خلافت کا دعویٰ سلطنت عثمانیہ کے خلاف برطانوی و صیہونی مقاصد سے متصادم تھا۔ برطانیہ اور صیہونی تحریک کی یہ جنگ صرف ترکوں کے خلاف نہیں تھی' بلکہ یہ اصل میں اسلام کے خلاف جنگ تھی۔ اس کا مقصد خلافت کو تباہ اور دنیائے اسلام کو بے بس کرنا تھا تاکہ اسرائیل کی صورت میں یہودی ریاست قائم ہو سکے اور مسلمانوں کا ایمان برباد ہو جائے۔

شریف حسین کا یہ اعلان خلافت برطانوی و صیہونی منصوبے کے لئے خطرے کا باعث تھا۔ چنانچہ انہیں کسی طرح اس سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ یہ کام بڑی مکاری سے کیا گیا۔ انہوں نے عبدالعزیز بن سعود کو شریف حسین پر حملہ کی ترغیب دی۔ عبدالعزیز بن سعود اس سعودی وہابی اتحاد کا سربراہ تھا جو سو سال پہلے مختصر مدت کے لئے مکہ پر قابض رہ چکا تھا۔ عبدالعزیز نے سلطنت عثمانیہ کی تباہی میں انگریزوں کا ۱۹۱۶ء کے غیر جانبداری کے معاہدہ کے ذریعے ساتھ دیا تھا۔ اس کے لئے برطانوی خزانہ سے پانچ ہزار سٹرلنگ پونڈ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ اس نے اپنے سادہ لوح سلفی بھائیوں کو بتایا کہ یہ دراصل جزیہ

ہے اور انہوں نے اس وضاحت کو قبول بھی کرلیا!

برطانوی اور صیہونی سیاسی منصوبہ بندی کامیاب ہوئی اور شریف حسین کی جگہ سعودی، وہابی بادشاہت کا قیام عمل میں آ گیا، جس نے خلافت کو بحال نہ ہونے دیا۔ یہ منصوبہ سادہ مگر نہایت ذہانت پر مبنی تھا۔ کسی شخص کے لئے خود کو خلیفہ تسلیم کروانا اور اپنی خلافت کو درست ثابت کروالینا ممکن نہ تھا تاوقتیکہ اس کا حرمین اور حج پر کنٹرول نہ ہوتا۔ حرمین اور حج پر کنٹرول حاصل کرنے میں کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ مغربی افواج کی مدد اور حمایت کے بل پر عرب میں سعودی حکومت کا تسلط ہے اور سعودی وہابی کبھی اتنے بیوقوف نہیں ہو سکتے کہ خود خلافت کا اعلان کریں۔ آخر شریف حسین کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا مقصد تنبیہ ہی تو تھا۔ یہ تنبیہ موثر ثابت ہوئی اور وہابیوں نے خلافت کا نام نہیں لیا۔ حقیقت یہ تھی اور اب تک ہے کہ خلافت بحال نہیں ہو سکتی جب تک کہ عرب مغرب کے بالواسطہ تسلط سے آزاد نہیں ہوتا اور دارالاسلام بحال نہیں ہو جاتا۔ اور اگرچہ بحالی خلافت کی جدوجہد مسلسل جاری رہنا چاہئے (جو ان شاء اللہ جاری رہے گی) تاہم یہ امکان زیادہ قرین قیاس نظر آتا ہے کہ عرب اس وقت تک آزاد نہ ہو گا جب تک کہ امام مہدی ظاہر نہ ہوں۔

جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو آخر انہیں بھی تو اپنی مدد کے لئے مسلمانوں کی جماعت کی ضرورت ہو گی۔ تب ایک مستند اسلامی انقلابی تحریک یا جماعت کا وجود ناگزیر ہو گا۔ اس جماعت کی ضرورت جنوبی ایشیا میں باقی دنیا کی نسبت زیادہ اہم ہے کیونکہ مرزا غلام احمد قادیانی کے جنوبی ایشیا میں ظاہر ہونے کا یہی تقاضا ہے۔ بالفاظ دیگر اس شیطانی قوت نے جو المسیح الدجال کے آنے کا راستہ ہموار کر رہی ہے، اس مخفی قوت کی اہمیت تسلیم کرلی ہے جو جنوبی ایشیا کے مسلمان موجودہ ملحدانہ دور میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی کامیاب جدّوجہد کے لئے اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی عرب یا افریقی دنیا کی بجائے جنوبی ایشیا میں ظاہر ہوا۔

بحالیٔ خلافت کے لئے ایک مستند جماعت کے قیام کی اہمیت

خلافت کو بحال کرنے سے پہلے ایک جماعت کا قائم ہونا ضروری ہے۔ یہ مستند جماعت ایک ایسے امام یا امیر کی قیادت میں ہونی چاہئے جسے قرآن و سنت کا ضروری علم حاصل ہو۔ جماعت کے مستند ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جماعت کے اراکین امیر کی بیعت کریں، اور تمام معاملات میں "سمع و طاعت" کے اصول پر سختی سے کاربند ہوں جب تک کہ اس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ ایسی جماعت کی شدید ضرورت ہے تاکہ وہ خلافت اور دارالاسلام کی بحالی کی منظم طریقہ پر اجتماعی جدوجہد کو جاری رکھے تاکہ اسلام کا معاشرتی و معاشی و سیاسی نظام قائم کیا جاسکے۔

خلافت کی بحالی کے لئے ایک انقلابی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ترکی، پاکستان، ملائشیا اور الجزائر کی اسلامی تحریکوں کے سامنے فوری طور پر لیکن نرمی اور دلسوزی کے انداز میں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہئے۔ ایک اسلامی جماعت اپنی مستند حیثیت کھو دیتی ہے جب وہ اپنے آپ کو لادینی ریاست میں محض ایک سیاسی جماعت کے طور پر تسلیم کروا کے ایک ایسے دستور کے تحت، جو اپنے آپ کو حاکم کل کہتا ہے، الیکشن میں حصہ لینے لگے۔ اگرچہ پاکستانی دستور میں قرارداد مقاصد موجود ہے مگر دردناک حقیقت تو یہ ہے کہ اس ریاست کے قیام کے وقت ہی سے عملاً حاکمیت اعلیٰ ریاست کو ہی حاصل رہی ہے اور یہ حق کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو نہیں دیا گیا۔ اس لئے عملی طور پر پاکستانی دستور کے شرک اور کھلم کھلا طور پر لادینی ریاستوں کے دساتیر میں ریاست کے حاکمیت اعلیٰ کے دعویٰ کی شکل میں موجود شرک میں کوئی فرق نہیں۔

مستند جماعت کو طاقت فراہم کرنے کی جدوجہد میں مشغول رہنا چاہئے —— ایسی طاقت جو کسی بھی علاقہ کو دارالاسلام کا درجہ دے کر اس پر اپنا کنٹرول قائم رکھ سکے اور پھر اس علاقہ سے حرمین اور حجاز کی آزادی کی جدوجہد کرے۔ جب ایسا ہو جائے تو گویا یہ مستند جماعت اس تاریخی عمل اور سنہری دور سے دوبارہ گزرے گی جس میں نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں اپنی اساس قائم کر کے مکہ مکرمہ کو آزاد کرانے کی جدوجہد کی تھی۔

یہ مستند جماعت فرقہ وارانہ اختلافات کی بھینٹ نہیں چڑھائی جا سکتی۔ اس کے برعکس اسے اسلامی عقیدہ کی اس حقیقی بنیاد پر قائم ہونا چاہئے۔ اور وسیع القلبی کی اس حکمت سے اپنا عمل جاری رکھنا چاہئے' جو درست اسلامی عقیدے کے مختلف رنگوں کے حامل مسلمانوں کو ہر طرف سے اپنی طرف مائل کر سکے۔ ایسے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے بعد ان کے ذہنوں سے واضح طور پر غیر اسلامی عقائد کو نکال دے اور باقی رہ جانے والے بے ضرر اور سطحی اختلافات کے ضمن میں برداشت اور وسیع القلبی کی روش اختیار کرے۔ اس مستند جماعت کو شیعہ مسلمانوں اور اسلامی ایران تک بھی رسائی حاصل کرنا ہوگی' اور عقیدے کا ایک ایسا مشترک بندھن تلاش کرنا ہوگا جو باہمی تعاون اور اتحاد کے ذریعے ایک مشترکہ ہدف کی جستجو کے لئے ٹھوس بنیاد بن سکے۔ یہ بالکل واضح ہونا چاہئے کہ آج کے تنگ نظر اور غیر رواداری سلفی مسلمان جو اپنا بنیادی جذبہ محرکہ ابن سعود کے متشدد وہابی اخوان سے حاصل کرتے ہیں' مشکل ہی سے ایک مستند جماعت کے طور پر کام کر سکتے ہیں۔ وہ عقائد کے بے ضرر اور سطحی اختلافات کے بارے میں تو بڑا شر آمیز "جہاد" اختیار کئے ہوئے ہیں جبکہ اسلام کی حقیقت اور سچائی کو اس جھوٹ اور برائی پر جو اس وقت دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور جو انسانیت پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے (مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ) غالب کرنے کے لئے اور انسانیت کو ظلم سے آزادی دلانے کے لئے کی جانے والی اسلامی انقلابی جدوجہد کے ساتھ بڑی ڈھٹائی سے دغا بازی کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

مستند اسلامی جماعت کو اپنے اراکین کی اخلاقی و روحانی ترقی اور تربیت و تزکیہ میں مشغول ہونا چاہئے۔ اس روحانی مقناطیسیت اور روجدانی کیفیت کے بغیر' جو قلب کی درستی ہی سے وجود میں آتی ہے' مستند اسلامی جماعت کے امراء مسلمانوں کی بڑی تعداد کو انقلابی جدوجہد میں عملی اور متحرک شرکت کے لئے کھینچ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دراصل اسی شے کی کمی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی قائم کردہ جماعت اسلامی کی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری تھی۔ اللہ تعالیٰ جماعت اسلامی کو اس کمزوری کی تلافی کرنے کی طرف رہنمائی عطا فرمائے اور فاضل مولانا کی مغفرت فرمائے کہ اسلام کی

خدمت کے لئے ان کی عظیم مساعی کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ آمین

میں نے تنظیم اسلامی کو ہو بہو ایک ایسی مستند اسلامی جماعت پایا جس نے خلافت کی بحالی اور دارالاسلام کے دوبارہ قیام کے لئے جدوجہد اختیار کی ہے' تاکہ اسلام کے معاشرتی و معاشی و سیاسی نظام کے قیام کو ممکن بنایا جاسکے۔ میں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو بھی ہو بہو ایسا ہی امیر پایا جنہوں نے بیعت کے اصول کو لازم تسلیم کیا ہے۔ میں نے ان سے عہد کیا اور اس اسلامی انقلابی جماعت کا رکن بن گیا۔ انہوں نے واضح طور پر تنظیم اسلامی کے رفقاء کے لئے روحانی اصلاح و ترقی اور تزکیہ کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ تاہم اس نہایت اہم شعبہ کے لئے انہوں نے "تصوف" کی مشہور اصطلاح کی بجائے "الاحسان" کی قرآنی اصطلاح استعمال کی ہے۔ نیز انہوں نے زبانی و تحریری دونوں طرح بڑی تعظیم اور تحسین کے ساتھ اپنے ہم عصر معتبر صوفی شیوخ مثلاً مولانا عبدالعلیم صدیقی (وفات ۱۹۵۳ء) کا ذکر کیا ہے' جن کی روحانی مقناطیسیت اور تبلیغی سرگرمیوں نے ان کی چالیس سالہ طویل اور ان تھک مساعی کے دوران دنیا کے کئی خطوں میں مسلمان افراد اور برادریوں کو متحرک کیا تھا۔

علامہ اقبال اور تنظیم اسلامی

موجودہ دورِ فتن اور ملحدانہ جدیدیت میں ایک اسلامی انقلابی تحریک کے لئے علامہ اقبال کی اہمیت مندرجہ ذیل نکات سے سامنے آتی ہے :

۱) علامہ اقبال بذاتِ خود دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کے سب سے بڑے نقیب اور مفکر ہیں۔ دنیا پر چھائی ہوئی جدید ملحدانہ اور بے خدا تہذیب کے چیلنج کا اسلامی نقطہ نظر سے ناقدانہ' جامع اور علمی جواب ہی اسلامی انقلابی تحریک کے لئے اقبال کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ استدلال' معقولیت اور فراست کے ساتھ یہ جواب دیتے ہوئے علامہ اقبال دراصل سنتِ رسول ﷺ کی اتباع کر رہے تھے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دجال آپ ؐ کی زندگی میں ظاہر ہوگیا تو آپ ؐ خود اس سے عقلی جنگ لڑیں گے۔

"جب وہ (دجال) ظاہر ہو گا اور میں تمہارے درمیان موجود ہوا تو میں اس کو دلائل کے ساتھ مطیع کروں گا (شکست دوں گا) اور اگر وہ ظاہر ہو در آنحالیکہ میں تمہارے درمیان موجود نہ ہوں تو تم میں سے ہر ایک کو اس کے ساتھ مجادلہ یا بحث و تمحیص کرنا چاہئے"۔ (کنز العمال جلد ۷ حدیث نمبر ۲۰۷۶)

۲) چونکہ علامہ اقبال نے کسی دار العلوم سے روایتی مذہبی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ انہیں وہ عقلی و علمی آزادی حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ جدید علوم کی روشنی میں قرآن مجید پر تدبر کر سکے اور قرآن میں سے سچائی (الحق) کے وہ پہلو تلاش کر پائے جن کی فی زمانہ ضرورت تھی۔ یعنی ملحدانہ جدیدیت کی علمی تردید' وغیرہ۔ ان کی یہ سعی ہراول دستے کی مانند تھی جس میں انہوں نے یہاں تک کامیابی حاصل کی کہ اسلامی دنیا کے تقریباً تمام جدید تعلیم یافتہ اہل دانش' جنہوں نے اقبال کے افکار کا مطالعہ کیا' ان کے افکار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اگر اسلامی انقلابی تحریک کو ایسے اہل دانش مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر کے انہیں متحرک کرنا ہے تو اقبال کے ساتھ ایک حقیقی اور حرکی تعلق ناگزیر ہے۔

۳) فرقہ واریت آج کے دور میں اُمّتِ مسلمہ کو لاحق ہونے والی مہلک ترین بیماریوں میں سے ایک ہے۔ اسلامی انقلابی تحریک کو فلسفیانہ اور مذہبی طور پر ایک ایسا نقطہ نظر تلاش کرنا ہو گا جس کے ذریعے فرقہ واریت کے عفریت سے کامیابی کے ساتھ نپٹا جا سکے۔ علامہ اقبال کو یہ یکتائی حاصل ہے کہ ان کے افکار میں مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے مسلمانوں کو متحد کر کے ایک منظم قوت بنانے کا وصف پایا جاتا ہے۔ ایسے مسلمان جو روایتی تعلیم یافتہ ہیں اور ایسے مسلمان جنہوں نے جدید لادینی تعلیم حاصل کی ہے اور ایسے مسلمان جو اپنے مذہبی خیالات میں دلائل اور عقلیت کی طرف مائل ہیں اور ایسے مسلمان جو روحانیت اور تصوف کی طرف رجحان رکھتے ہیں وہ سب کے سب اقبال کے افکار میں اپنے مخصوص رجحانات سے متعلق ہمدردانہ' مستند اور مدلل خیالات پائیں گے۔

۴) اقبال کے افکار کی بدولت اسلامی انقلابی تحریک اقامت دین کی جدوجہد کے روحانی

پہلو سے کماحقہ سرشار ہو سکتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر رومیؒ نہ ہوتے تو اقبال بھی پیدا نہ ہوتا۔ لاہور جانے کا راستہ قونیہ (جہاں مولانا جلال الدین رومیؒ کا مزار واقع ہے) سے ہو کر گزرتا ہے۔

تنظیم اسلامی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جدیدیت کے حوالے سے اس کا زیادہ تر فیضان اور جذبہ عمل اقبال سے مستعار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال روایتی معنوں میں ایک عالم نہیں تھے، کیونکہ انہوں نے مروجہ اسلامی علوم کی روایتی مذہبی درسگاہوں میں تحصیل نہیں کی تھی، لیکن یہی تو ایک خاص وجہ ہے کہ اقبال وہاں کامیاب ہو گئے جہاں (اس طرح کی تعلیم رکھنے والے) بہت سے لوگ ناکام ہو گئے تھے (یعنی ملحدانہ جدیدیت کا محاذ)۔ علامہ اقبال کی لاثانی کامیابی ان کا حکمت قرآن کو سمجھنے اور واضح کرنے کا وہ طریقہ ہے جس کی بدولت وہ ملحدانہ جدیدیت کے پیدا کردہ بحرانوں کا کلام اللہ کی بنیاد پر شاندار، متحرک اور موزوں جواب دے سکے۔ اس اعتبار سے علامہ اقبال نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خیالات پر اس قدر گہرا، قوت آفریں اور حقیقی اثر کیا جتنا محمد علی جناح یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ پر نہیں ہوا تھا۔ اس لئے یہ تنظیم اسلامی ہی ہے، نہ کہ جنوبی ایشیا کی کوئی اور اسلامی تحریک، جسے صحیح طور پر اقبال کے محنت اور محبت سے بوئے گئے انقلابی بیج کا پہلا اور مستند پھل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگر ہمارا یہ ادراک صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تنظیم اسلامی میں پنپنے کی بے پناہ مخفی قوت اور صلاحیت موجود ہے اور یہ جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی اور نمایاں اسلامی تحریک بنے گی۔ جب ایسا ہو گا تو ان شاء اللہ یہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مؤسسِ تنظیم اسلامی کی بصارت، حوصلہ، دیانت اور صدق کا ایک فصیح و بلیغ ثبوت اور اس کی تائید ہو گی۔

لیکن اگر تنظیم اسلامی کو جنوبی ایشیا اور شمالی امریکہ کے اہل دانش مسلمانوں کی اکثریت کی تائید حاصل کرنا ہے، اور اگر اسے ایک ایسی جماعت کی حیثیت سے ابھرنا ہے جس نے اقبال کی اسلامی انقلابی جدوجہد کا مشن ورثہ میں پایا ہے تو تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کو علامہ اقبال کے ملحدانہ اور بے خدا جدیدیت کے مستند اور پُرمغز اسلامی رد کو

موضوع واضح کرنے کے لئے بہت جانفشانی سے کام کرنا ہو گا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی "Ideology of the Future" اور اس سے بڑھ کر ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن انصاری کی "Qur'anic Foundations and Structure of Muslim Society" کو علامہ اقبال کے قابل اور ممتاز شاگردوں کی وہ قابل قدر مساعی قرار دیا جاسکتا ہے جو انہوں نے اقبال ہی کی جلائی ہوئی شمع کو مزید روشن کرنے اور علم کی سرحدوں کو وسیع تر کرنے کے لئے انجام دی۔

تنظیم اسلامی نیویارک میں "انسٹیٹیوٹ آف قرآنک وِزڈم" قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ مزید برآں یہ شمالی امریکہ میں نوجوان، ذہین، تعلیم یافتہ اور بہت زیادہ فعال مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک باسط بلال کوشل ہیں جو اس وقت ڈریو یونیورسٹی (نیو جرسی) میں اپنے Ph.D کے مرحلہ میں ہیں۔ یہ حقیقت اس صداقت کو مزید مبرہن کرتی ہے کہ تنظیم اسلامی ایک سنجیدہ اسلامی انقلابی تحریک اور جماعت ہے۔ اور یہ ہر اس مسلمان کی طرف سے جس کا دل احیائے اسلام کی تمنا رکھتا ہے، ایک سنجیدہ رد عمل کی حق دار ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں اور اس کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے تنظیم اسلامی کی طرف میری رہنمائی کی اور اس فاضل عالم دین تک مجھے پہنچایا جو تنظیم اسلامی کے امیر ہیں! تنظیم اسلامی میرے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے جس کے لئے میں اس (اللہ تعالیٰ) کا بے پناہ شکر گزار ہوں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تنظیم اسلامی باذن اللہ ان مسلمانوں کے لئے بھی تحفہ اور نعمت ثابت ہو جو اس مضمون کو مکمل توجہ سے پڑھیں گے۔ اور ایک دن وہ بھی اللہ تعالیٰ کا اس توفیق کے لئے شکر ادا کریں گے۔ آمین

اسلام کے بعد کا دور

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۸)

ڈاکٹر ابو معاذ

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۰۲-۱۰۵)

"اے ایمان دار لوگو! اللہ سے اسی طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں جب موت آئے تو صرف حالتِ اسلام ہی میں آئے۔ اور اللہ کی رسّی کو اجتماعی طور پر مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بندی میں پڑ کر بکھر نہ جانا' اور اپنے آپ پر (نازل ہونے والی) اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم آپس کی دشمنیوں میں مگن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں محبت کی لو روشن کر دی' پھر اسی نعمت کے باعث تم میں بھائی چارے (یعنی مواخات) کی عظیم صبح طلوع ہو گئی۔ ایک وقت تھا جب تم آگ کی گہری کھائی کے دہانے پر پہنچ چکے تھے' پھر اس نے تمہیں اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت کی راہ اختیار کر سکو۔ اور تم میں سے ایک

گروہ ایسا بھی ہونا چاہئے جو بھلائی کے راستوں کی طرف رہنمائی کر سکے اور برائی سے روکے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے کامیابی و کامرانی (کی نوید) ہے۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور واضح نشانیاں ظاہر ہونے کے بعد بھی باہم اختلافات کا شکار ہو گئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کیلئے بہت بڑا عذاب آنے والا ہے"۔

قرآن پاک کی ان آیات کی تلاوت اور ترجمہ کے بعد ناچیز یہ عرض کرنا چاہے گا کہ فروعی اختلافات کو اگر اصلِ اسلام پر حاوی کر دیا جائے تو حقیقت خرافات میں گم ہو جاتی ہے۔ رومی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

(اے کہ تمہیں خفی اور جلی (یعنی اصل اور فروع) کی اہمیت کا احساس نہیں ہے، تو ہوش کے ناخن لے اور اے وہ شخص جو ابوبکرؓ اور علیؓ میں الجھ کے رہ گیا ہے، ہوش میں آجا!)

علّامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

(رسول اللہؐ تک پہنچ جاؤ کہ دین تمام کا تمام وہیں ہے۔ اگر آپؐ تک نہ پہنچ سکنے کے باعث اِدھر اُدھر الجھ کے رہ گئے تو پھر ابولہب کے عقائد میں الجھ کے رہ جاؤ گے۔)

یہاں پر ابولہب کے عقائد سے مراد رجعت پسندی، جمود، قدیم اور غلط روایات پر ضد کرنا، قبائلی اور نسلی تضادات میں الجھ کے رہ جانا اور حقیقت کے واضح طور پر روشن ہونے کے بعد ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ ایک بار پھر شاعرِ مشرقؒ کی زبانی عرض کرتا ہوں ؎

ملّتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ — سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما — رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
ملّت از یک رنگیٔ دلہا ستی — روشن از یک جلوۂ سینا ستی
قوم را اندیشہ ہا باید یکے — در ضمیرش مدّعا باید یکے
ما مسلمانیم و اولادِ خلیل — از "اَبِیکُم" گیر اگر خواہی دلیل

مدعاے ما مآلِ ما یکیست — طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم — یک زباں و یک دل و یک جاں شدیم

(ملتِ بیضا اگر جسم ہے تو اس کی روح لا الٰہ یعنی توحید کی قوت ہے۔ ہمارے ساز کی تاروں اور پردوں کو چلانے والی قوت بھی لا الٰہ ہے۔ ہمارے تمام اسرارِ نہاں یعنی خفیہ رازوں کی دولت لا الٰہ ہے اور یہی وہ رشتہ اور تعلق ہے جس نے ہماری سوچوں کو اکٹھا کر کے ایک وحدت میں سمو رکھا ہے۔ ہماری قوم کے اتحاد کا راز دلوں کے ایک ہی رنگ میں رنگے جانے میں ہے۔ ایک ہی جلوۂ طورِ سینا سے ہماری روشنی ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور "مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ" کے مصداق ایک ہی سرچشمہ یعنی دینِ ابراہیمی سے ہماری دلیل ہے۔ ہمارا مقصد اور ہماری آرزوئیں ایک ہیں۔ ہمارا طرزِ حیات' انداز فکر اور خیالات ایک ہی ہیں۔ ہم توحید کی نعمتوں کے باعث بھائی بنے ہیں (یہ متذکرہ بالا آیت آل عمران : ۱۰۳ کی طرف اشارہ ہے) اور اسی وجہ سے ہم ایک زبان ایک دل ایک جان ہوئے ہیں۔)

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں ؎

رومیاں را گرم بازاری نماند — آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند — استخوانِ او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود ست و ہست — ملّتِ اسلامیاں بود ست و ہست
عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است — از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

(رومی بادشاہت کا عروج ختم ہو گیا۔ ان کی بادشاہت کے آئین و دساتیر اور فاتحانہ سرگرمیاں قصۂ پارینہ بن گئیں۔ ایران کی عظیم ساسانی شاہنشاہت کی عظمت کے نقوش ان کے اپنے ہی خون کی ندیوں میں بہہ گئے۔ یونان کی تہذیب اور فلسفے کی بوقلمونیاں اور موشگافیاں مٹ گئیں۔ مصری بھی اپنی ہیبت اور جلال برقرار رکھنے میں ناکام ہو گئے اور فرعونوں کی ہڈیاں اہرام کی گہرائیوں میں عبرت کا نشان بن گئیں۔ اگر کچھ باقی ہے تو اذاں کی آواز ہے اور رہی ہے۔ مسلمانوں کی امت ابھی تک زندہ رہی ہے' اور ہے۔ عشق ہمارے دل کے سوز کے باعث زندہ ہے اور اس کی چمک دمک اور فروغ لا الٰہ کی چنگاریوں کے باعث ہے۔)

[illegible] طرح آپ فرماتے ہیں ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

یہاں پر ہمارے مدِ نظر فی الحال علامہ اقبال کے فلسفہ اور فکر کو بیان کرنا نہیں بلکہ آپ کے سامنے مسلمانوں کے ان گروہی اور فروعی اختلافات کی تصویر کھینچنا ہے جو امتدادِ زمانہ کے باعث فروغ پاتے چلے گئے اور ہم مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

مجھے ڈاکٹر اسرار احمد مدّظلّہ العالی کے خیالات سے کاملاً اتفاق ہے کہ اسلام میں دو ہی فرقے ہیں' ایک سُنّی اور ایک شیعہ' باقی تمام مکاتب فکر ہیں۔ بدقسمتی سے کم علمی اور کبھی کبھی کم عقلی کے باعث ایک دوسرے پہ کفر کے فتوے لگانا کچھ لوگوں کا شعار رہا ہے مگر اجتماعی طور پر سُنّی اور شیعہ ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے۔ آج مجھے حکم ملا ہے کہ میں تشیع کی اصل صورت آپ کے سامنے پیش کروں۔

شیعیت کی ابتدا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اسلام کے لئے عظیم خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ بقول قابل قدر شیعہ علماء کے آپ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ہاں پرورش پائی اور بچپن میں ہی اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے باعث سبقت حاصل کی۔ آپ ؓ کو آنحضور ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کے موقع پر اپنے بستر پر لٹا کر مدینہ کی راہ لی اور اپنے کئی دنیاوی امور آپ ؓ کے سپرد کئے کہ وہ ان کو نمٹانے کے بعد مدینہ کی جانب سفر فرمائیں۔ پھر اپنی سب سے لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضور ؐ نے آپ ؓ کے نکاح میں دے دیا۔ معرکہ ہائے حق و باطل میں حضرت علی ؓ پیش پیش رہے اور خیبر کی فتح کا سہرا آپ ؓ کے سر رہا۔ حضور ﷺ کے گھرانے سے محبت کرنے والوں کی نظر میں حضرت علی ؓ، حضرت فاطمہ ؓ، حضرت حسن ؓ، حضرت حسین ؓ اور حضرت زینب ؓ سے عقیدت ایک فطری امر ہے۔ ان تمام امور میں سُنّی اور شیعہ مسلمانوں میں کہیں بھی اختلاف نظر نہیں آتا' بلکہ حُبِّ اہل بیت کا اظہار پانچ نمازوں میں ہر دوسری رکعت میں

درود سے ہوتا ہے جس میں آلِ محمد ﷺ پر درود اور برکات بھیجے جاتے ہیں۔ بعض سُنّی زعماء (مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ' علامہ وحید الزمان حیدر آبادی اور علامہ اقبال کسی حد تک) حُبِ علی اس حد تک بڑھ کر بیان فرماتے ہیں کہ ان اصحاب کا اظہار عقیدت جمہور سُنّی علماء سے کسی حد تک مختلف ہو جاتا ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے اپنے وصیت نامہ میں ہرچند خود کو حنفی سنی قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی اہل بیت کی محبت کا اظہار بلند آہنگ سے فرمایا ہے اور کسی قسم کی لگی لپٹی نہیں رکھی۔

آنحضور ﷺ نے اپنا مشن مکمل کر لیا تو آپؐ بھی اس جہان فانی سے بتقاضائے بشریت رخصت ہو گئے۔ شیعہ احباب کے خیال میں آنحضور ﷺ نے ۱۰ھ میں حضرت سلمان فارسیؓ' عمار بن یاسرؓ' ابوذر غفاریؓ اور دیگر اصحاب کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو اپنا جانشین نامزد فرمایا۔ اس دن کو عید غدیر کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ دن عید الاضحیٰ کے بعد ذوالحجہ کے مہینہ میں آتا ہے۔ مگر جمہور اہل سُنّت کے ہاں ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ آنحضور ﷺ کی رحلت کے موقع پر حضرت علیؓ کو ثقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کے امیدوار کے طور پر پیش کیا گیا مگر اکثریت کی رائے کے مطابق حضرت ابوبکرؓ منتخب ہو گئے۔ پہلے چھ ماہ ہرچند حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے اعراض فرمایا مگر حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کی کوششوں سے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت فرمالی۔ اس دوران بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت اور سرکاری کنٹرول کو تسلیم کیا گیا۔ اسی دوران حضرت فاطمہؓ باغ فدک کے مسئلہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاں تشریف لے گئیں اور مسئلہ پیش کیا مگر آپؓ نے جس انداز سے معاملے کی وضاحت فرمائی حضرت فاطمہؓ بغیر کسی مزید استدلال اور دعویٰ کے واپس تشریف لے آئیں۔

ازاں بعد حضرت علیؓ نے اصحابِ ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے ادوار میں کبھی بھی اپنے استحقاق کی بات نہیں چھیڑی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے سفر فلسطین (فتح بیت المقدس) کے موقع پر آپ قائم مقام خلیفہ کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی شہادت کے موقع پر خلافت کے

انتخاب کے لئے جس کمیٹی کا اعلان کیا اُس میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ عملی اعتبار سے کوئی بھی ایسا موقع نظر نہیں آتا جہاں تاریخ کے اوراق میں حضرت علیؓ اصحابِ ثلاثہ کی حکومت یا اقتدار کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے نظر آئے ہوں۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت (۲۵ ذوالحجہ ۳۵ھ) کے بعد آپ خلیفہ چہارم کے مقام پر فائز ہوئے۔ ہر چند کہ آپ کی خلافت کے دوران جنگِ جمل اور جنگِ صِفّین کی صورت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلافات ابھرے مگر اہل سُنّت کے تمام ذی شعور حلقے اجتماعی طور پر حضرت علیؓ کی فضیلت اور خلافت بطور خلیفہ چہارم کے استحقاق کے قائل ہیں۔ سیاسی مصلحت کے باعث آپ نے دارالخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کر لیا اور پھر پانچ برس اور تین ماہ کی خلافت کے بعد خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم کے ہاتھوں ۴۰ھ میں شہید ہو گئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بعض سیاسی امور پر اختلافات ضرور ابھرتے رہے ہیں مگر ہم لوگ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کے مصداق ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان تمام اصحابِ رسولؐ کی عظمت کے قائل ہیں جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار اور آپؐ کا ساتھ نصیب ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم حضرت علیؓ کی عظمت کو سلام کہتے ہیں۔

آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ نے ایک برس کی خلافت کے بعد حضرت امیر معاویہؓ سے مصالحت کے بعد خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ پھر جب یزید بن معاویہ کی موروثی حکومت کے قیام کے دوران حضرت حسینؓ نے بیعت سے انکار فرمایا تو اس قضیہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابو بکرؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی بیعتِ یزید سے پہلو تہی فرمائی۔ گویا پہلے دونوں خلفاء کے صاحبزادوں کا موقف بھی حضرت حسینؓ (فرزندِ خلیفہ چہارم) سے مختلف نہیں تھا۔ تاہم اہل کوفہ کی درخواست پر حضرت حسینؓ نے جب بیعتِ خلافت کے لئے کوفہ کا رخ کیا تو سانحہ کربلا پیش آیا جس میں حضرت حسینؓ اور آپ کے تمام مَرد ساتھی (ماسوائے حضرت زین العابدینؒ) کے شہادت کے مقام پر سرفراز ہوئے۔ علّامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

"اللہ کی شان دیکھئے کہ باپ (حضرت علیؓ) بسم اللہ کی "ب" کے طرح عظیم تھے اور حضرت اسماعیلؑ کی طرح بیٹا (حضرت حسینؓ) ذبح عظیم (قرآن پاک کی آیت سے اقتباس ہے) کی صورت میں قربانی کا اعلیٰ نمونہ بن گئے"۔

۱۰ محرم ۶۱ھ کا سانحہ کربلا دلوں پر گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ شہادت کے کچھ ہی عرصہ بعد مختار ثقفی نے کوفہ پہنچ کر قاتلینِ آل بیت کو چن چن کر مارا اور مرے ہوؤں کی ہڈیاں بھی قبروں سے نکال لیں۔ یہ حامیانِ آل بیت کا پہلا انتقام تھا۔

حضرت حسینؓ کا نکاح آخری ساسانی فرمانروا یزدگرد سوم کی بیٹی شہزادی شہربانوؓ سے ہوا تھا۔ اس طرح شاہی خاندان سے تعلق کے باعث آپ ایرانی شاہ پرستوں کی نظر میں اور بھی گرامی قدر اور عزیز ٹھہرے۔

علویوں کی حکومتیں

ہشام بن عبدالملک اُموی (۱۰۱ تا ۱۰۵ھ) کے زمانہ میں حضرت زین العابدینؒ کو حامیان اہلِ بیت نے خلافت کے حصول کے لئے جدّوجہد کرنے کو کہا مگر آپ نے دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ پھر لوگ حضرت علیؓ کے بیٹے محمد بن حنفیہ (جو غیر فاطمی تھے) کی جانب راغب ہوئے اور آپ کی بیعتِ خلافت کرلی۔ آپ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے ابو ہاشم کی بیعتِ خلافت کی اور عراق و خراسان میں دعوت کو فروغ دیا۔ ابو مسلم خراسانی بھی اس دعوت میں شریک ہو گیا۔ مگر جناب ابو ہاشم نے خلافت محمد بن علی بن عباس بن عبدالمطلب کو تفویض کردی اور دعوائے خلافت علویوں سے عباسیوں میں منتقل ہو گیا۔ ابو مسلم خراسانی کی مدد سے اپنی حکومت مستحکم کرنے کے بعد منصور نے اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر اسے قتل کروادیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اہل خراسان میں سے کچھ عقیدت مند اسے ذاتِ خداوندی کا مظہر قرار دیتے تھے۔

خلیفہ منصور عباسی (۱۳۶ھ۔۱۵۸ھ) کے زمانہ میں ایک بار پھر اولادِ علیؓ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ حضرت حسنؓ کے پڑپوتے محمدؒ نے اپنی خلافت کا اعلان کر کے مدینہ کے عباسی گورنر کو قید کرلیا اور چند ہی یوم میں تمام حجاز اور یمن میں محمدؒ کو خلیفہ تسلیم کرلیا گیا۔

اِس موقع پر امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے بھی محمد کی خلافت کی حمایت کی۔

زبردست جنگ کے بعد ۱۴۵ھ میں منصور کے لشکر نے علویوں کو شکست سے دوچار کیا اور بیشتر مشاہیر جنہوں نے علویوں کا ساتھ دیا تھا موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان کے گھر مسمار کروا دیئے گئے اور مدینہ میں بنو حسنؓ اور بنو حسینؓ کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اہل مدینہ کی خصوصی رعایات ختم کر دی گئیں۔ مصر سے مدینہ آنے والی رسد روک لی گئی۔ حضرت جعفر صادقؒ نے جائیداد واپس مانگی تو انہیں قتل کی دھمکی دی گئی۔ امام ابو حنیفہؒ کو زندان میں ڈال دیا گیا اور امام مالکؒ کو کوڑے لگوائے گئے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ ۱۴۸ھ میں مدینہ میں وفات پا گئے۔ آپ کے بیٹے حضرت موسیٰ کاظمؒ امام تسلیم کئے گئے۔ امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے اسماعیل کی بیعت کرنے والے اسماعیلی کہلوائے اور امام موسیٰ کاظمؒ کے ماننے والے اثنا عشری کہلوائے' کیونکہ انہوں نے حضرت امام موسیٰ کاظمؒ اور بعد کے ائمہ کو ملا کر بارہ اماموں کی امامت کو تسلیم کیا۔

پھر خلیفہ عباسی موسیٰ الہادی (۱۶۹۔ ۱۷۰ھ) کے زمانہ میں مدینہ کے گورنر نے حضرت حسنؓ کی اولاد پر سختی شروع کر دی۔ حضرت حسنؓ کے پڑپوتے حسینؒ کی سرکردگی میں انہوں نے مقابلہ کیا مگر ناکام رہے۔ اس خاندان کے متعدد افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ حسین کا چچیرا بھائی ادریس ماریطانیہ چلا گیا' جہاں بربروں کی مدد سے ادریسیہ خلافت کی بنیاد رکھی۔

خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے دور (۱۷۰ ۔ ۱۹۸ھ) میں بحیرہ خزر (Caspian Sea) کے جنوبی ساحل پر موجود دیلم کے علاقہ میں حضرت علیؓ کے خاندان کے فرد یحییٰ بن عبداللہ نے دیلمیوں کی مدد سے خلافت کا دعویٰ کیا۔ ان کی تادیب کے لئے فضل کی قیادت میں پچاس ہزار کا لشکر بھیجا گیا مگر جنگ کی بجائے مصالحت سے یحییٰ بن عبداللہ کو بغداد لایا گیا اور وہاں پر پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا مگر یحییٰ نے ایک بار پھر حصول خلافت کی کوشش شروع کر دی۔ وہ قید ہوئے اور حالت اسیری میں وفات پا گئے۔

خلیفہ مامون الرشید عباسی (۱۹۸۔۲۱۸ھ) نے پہلی مرتبہ خاندان علیؓ کی نجابت کے احترام میں حضرت امام علی الرضاؒ کو (جو مامون سے بائیس برس بڑے تھے) ۲۰۲ھ میں ولی

عہدِ سلطنت نامزد کیا اور آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے احکامات جاری کئے۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی جاری کیا کہ اب عباسی اپنی روایتی سیاہ قبا پہننے کی بجائے اہل تشیع کی سبز رنگ کی پوشاک پہنیں گے۔ اس سے اہل تشیع تو مطمئن ہو گئے مگر عباسیوں میں بددلی پھیل گئی اور حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے اور بالآخر امام علی رضاؒ کی شہادت پہ منتج ہوئے۔ روایات کے مطابق آپ کو طوس کے مقام پر زہر دیا گیا تھا۔

بعد میں طبرستان (ایران کا شمالی صوبہ جو اب مازندران کہلاتا ہے) میں ۲۵۰ھ میں علویوں نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے حسین بن زید نے (جو داعی کبیر کہلواتا تھا) بنی عباس' طاہریوں اور یعقوب لیث کو شکست دے کر طبرستان' دیلم' گرگان اور رے (موجودہ تہران) پر حکومت قائم کرلی۔ پھر اس کے بھائی محمد بن زید داعی نے ۲۷۰ سے ۲۷۷ھ تک حکومت کی اور اسماعیل سامانی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

قریباً چودہ برس بعد ۳۰۱ھ میں حضرت امام زین العابدینؒ کی اولاد میں سے ایک شخص حسن بن علی نے طبرستان پر قبضہ کرلیا اور سادات حسنی میں سے حسن بن قاسم کو گیلان کی حکومت سونپ دی۔ پھر ان کی آپس میں چپقلش جاری رہی اور حسن نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی۔

ائمہ اثنا عشری اور شیعیت : (شیعیت کی رو سے)

اثنا عشری ائمہ میں بارہ کے بارہ اصحاب انتہائی متدین' نیک سیرت اور پرہیزگار تھے۔ حضرت علیؓ' حضرت حسنؓ' حضرت حسینؓ' حضرت زین العابدینؒ' حضرت باقرؒ' حضرت جعفر صادقؒ' حضرت موسیٰ کاظمؒ' حضرت علی رضاؒ' حضرت علی نقیؒ' حضرت علی تقیؒ' حضرت حسن عسکریؒ اور حضرت محمد بن حسن عسکریؒ کے مقام اور فضیلت پر کوئی کلام نہیں ہے۔ ہمارے اثناء عشری احباب ان دوازدہ اصحاب کو معصوم' مطہر اور مامور من اللہ سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق نبوت جب اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو اختتام پذیر ہو جاتی ہے اور جب نبوت کا خاتمہ ہوتا ہے تو وہاں سے امامت کا آغاز ہوتا ہے' تاکہ پیغامِ الٰہی کی رسالت میں تسلسل قائم رہ سکے۔ شیعہ احباب کی اکثریت نبوت اور رسالت کو اعلیٰ

دینی مقام دیتی ہے مگر نبوت کے بعد امامت کا مقام ہے۔ قریباً سوا دو سو برس تک امامت کا تسلسل جاری رہا اور پھر حضرت محمد بن حسن عسکریؒ غائب ہو گئے۔ انہیں لوگوں نے بلادِ شام میں سر من رای کی غار میں جاتے ہوئے دیکھا۔ کوئی ڈیڑھ سو برس غیابتِ صغریٰ کا دور ہے جب آپ کبھی کبھار باہر آ کر لوگوں میں ظاہر ہوتے رہے اور پھر اس کے بعد امام غائب کبھی کسی کو نظر نہیں آپائے اور یہ دور غیابتِ کبریٰ کا دور ہے۔ آپ قیامت سے قبل امام مہدی موعود کی صورت میں دوبارہ ظاہر ہوں گے اور لوگوں کی قیادت فرمائیں گے۔ یہ ائمہ معصوم و مطہر اور مامور من اللہ ہونے کے باعث اولوالامر ہیں اور ان کی اطاعت و تقلید لازمی ہے۔ جب بھی کبھی مشکل کا دور آیا ہے لوگوں نے امام غائب کو پکارا ہے اور امام غائب یا صاحب الزمان کو آواز دی ہے۔ ناچیز نے ۱۹۷۸ء میں شاہ کے آخری ایام میں ایران میں اکثر یہ اشتہار دیکھا ہے :

اے امامِ زمان کجاہستید دنیا منتظرِ شماست!

(اے امامِ وقت آپ کہاں ہیں؟ دنیا آپ کے لئے چشم براہ ہے)

اسی طرح عربی زبان میں ہمارے ہاں شیعہ احباب کے گھروں اور دوکانوں میں ایسی تحریریں دیکھنے میں آتی ہیں۔

چونکہ اولوالامر ائمہ ہیں اور رسالت کے بعد ان کا تسلسل موجود ہے اس لئے جہاں رسالت کی انتہا اور امامت کی ابتداء (نقطہ اِتّصال) ہے وہ مقام سب سے اہم ہے۔ اس لئے آنحضور ﷺ تمام انبیاء میں افضل ہیں اور حضرت علیؓ تمام ائمہ میں افضل۔ چونکہ امام کی موجودگی میں کسی کو حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اس لئے جو شخص بھی ان کے ہوتے ہوئے خلافت کے مقام پر فائز ہوتا ہے وہ امامِ وقت کے استحقاق کو مجروح کرتا ہے۔ زیدیوں کے ہاں (جو حضرت زید بن زین العابدین) کے پیروکار ہیں ہرچند کہ خلافت امام وقت (یعنی حضرت علیؓ) کا ہی حق تھا مگر چونکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو خلافت مل گئی اور شیخین نے تمام فیصلے دین برحق کی رو سے کئے اس لئے وہ قابل عزت و احترام ہیں اور ان کی حکومت عملاً اور اخلاقاً تسلیم شدہ ہے۔

ایران میں قاجاری دور (۱۲۰۰ھ ۔ ۱۳۴۳ھ) میں بھی بادشاہان قاجار یہ تسلیم

کرتے تھے کہ حکومت صرف اور صرف امام غائب کا حق ہے مگر صاحب الزمان کی عدم موجودگی میں وہ امانتاً حکومت سنبھال رہے ہیں اور جب کبھی بھی امام غائب ظاہر ہو جائیں گے وہ اسی وقت تاج و تخت ان کو سونپ کر حکومت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اور ہر بادشاہ اپنی تاجپوشی کے موقع پر اس امر کا حلف اٹھانے کا پابند تھا۔

صرف اور صرف امام وقت ہی قرآن کی تاویل کر سکتے ہیں اور ان کو ہی فقہ کے امور پر رائے دینے کا حق ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں شیعیت کے ہاں متداول مذہبی نظام کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز حضرات یعنی آیت اللہ العظمیٰ کو نائب امام کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے جو اپنے اجتہاد کی رو سے احکاماتِ شریعت کی تاویل کر سکتے ہیں۔

ائمہ اثنا عشری اور اہل سُنّت عمائدین کا رویّہ

اہل سنت وہ مسلمان ہیں جو سُنّی کہلواتے ہیں اور یا تو وہ ائمہ اربعہ (امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) میں سے کسی کے مقلّد ہیں یا غیر مقلّد۔ یہ لوگ صحاحِ ستّہ کی احادیث اور سنت کی روایات سے استناد حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ہاں رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی ذات معصوم نہیں ہے۔ اپنے اپنے فقہی مسائل میں تقلید کرتے وقت وہ روزمرہ امور اور دینی احکامات کی بابت اپنے اپنے امام کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں یا اپنی فقہ کے متأخر علماء سے استناد کرتے ہیں۔

اب مسئلہ یہ رہا کہ ابتدائی دور میں ان کے ائمہ اہل بیت سے تعلقات کیسے رہے ہیں تو جیسا کہ عرض کیا گیا ہے غالی سُنّیوں (جو بہت قلیل تعداد میں ہیں) کو چھوڑ کر تمام سنی حضرات حضرت علیؓ اور آپ کے خاندان کی تہہ دل سے عزت کرتے ہیں۔ خود حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت میں ہر طرح سے تعاون فرمایا ہے۔ اسی طرح واقعہ کربلا کی بابت بھی سنی حضرات کو حضرت حسینؓ سے عقیدت، ہمدردی اور محبت نظر آتی ہے۔ وہ کبھی بھی آپؓ پر تنقید کرنا روا نہیں سمجھتے۔

حضرت امام جعفر صادقؒ سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے خصوصی تعلقات کا پتہ چلتا ہے اور روایات کے مطابق حضرت امام ابو حنیفہ نے حضرت جعفر صادق سے کسب فیض

بھی کیا ہے۔ پھر حضرت زید بن زین العابدین سے آپ کے گہرے مراسم رہے ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے حضرت زید کو خلافتِ علوی کی بحالی اور خلافتِ عباسی کے خاتمہ کے لئے کچھ رقم بھی عطا کی تھی مگر جب عملاً مدد کے لئے کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ لوگ آپ" کا ساتھ چھوڑ جائیں گے اور ایسے ہی ہوا۔ امام زید بن زین العابدین نے فقہ پر کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام "المجموع فی الفقه" ہے۔ اس کتاب کے مندرجات پڑھ کر قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اپنی کتب کی تدوین میں اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔

اسی طرح حضرت امام حسنؓ کے پوتے محمد کی مدد کے لئے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک کی مساعی کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ جس مامون الرشید نے پہلے امام علی رضاؒ کو ولی عہد نامزد کیا بعد میں (بنابہ روایات) زہر دلوا کر شہید کر دیا' اسی مامون الرشید سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب "خطاب بہ دوستانِ آشنا" کی رو سے شیعہ مذہب میں امامت کے جو اعلیٰ ترین خصائل پیش کئے جاتے ہیں ان پر امام احمد بن حنبلؒ کی ذات گرامی پوری طرح پوری اترتی ہے۔

استحقاق خلافت کے دعویٰ میں حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے علاوہ ائمہ دوازدہ میں سے کوئی شخصیت دلچسپی لیتی ہوئی نظر نہیں آتی ماسوائے حضرت امام علی رضاؒ کے' جنہیں بطور خود مامون الرشید نے ولی عہد نامزد کیا تھا۔ علاوہ بریں خاندان علیؓ سے دیگر اصحاب خلافت کے لئے کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

مزید برآں یہ بھی نظر نہیں آتا کہ حضرت علیؓ اور ائمہ اثنا عشریہ کے عقائد و اعمال میں دیگر مسلمانوں کی نسبت کوئی زیادہ فرق ہو۔ حضرت علیؓ بھی ہمیں تاریخ کے جھروکوں میں سے مسجد نبوی میں اسی طرح سب سے مل کر نمازیں پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے باقی اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ عقائد و اعمال میں اُس وقت کے اہل سُنّت اور ائمہ اثنا عشریہ میں بہت حد تک ہم آہنگی تھی۔ ہمیں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جہاں فریقین نے ابتدائی سوا دو سو برسوں میں (امام دوازدھم کے غائب ہونے سے قبل) کبھی بھی ایک دوسرے کی تکفیر کی ہو یا طعن و تشنیع کی ہو۔ ائمہ اثناء عشریہ کی راست بازی اور

دیانت داری سُنّیوں کے ہاں بھی ایک مسلّمہ امر رہا ہے۔

شیعہ اور سُنّی عقائد کی ہم آہنگی

دنیائے اسلام کے دونوں فرقے توحید پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ غالی شیعہ حضرات کے ایک فرقہ علی اللّٰھی کا ذکر ملتا ہے جو حضرت علیؓ کو خدا کا بہروز سمجھتے ہیں مگر یہ فرقہ انتہائی قلیل تعداد میں ہے اور جمہور شیعہ احباب کی نمائندگی نہیں کرتا۔

رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت اور رسالت پر مکمل ہم آہنگی موجود ہے بلکہ شیعہ حضرات آنحضور ﷺ کی اِتباع اور سنت میں بعض امور میں زیادہ احتیاط برتتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے آنحضور ﷺ مسجد نبوی میں نماز پڑھتے وقت مٹی پر سجدہ ریز ہوتے تھے، اب مسجدوں میں قالین اور مصلّے بچھ گئے ہیں، مگر جی یہی چاہتا ہے کہ پیشانی مٹی پر آئے۔ اس لئے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو وہ باہر سے مٹی لا کر سجدہ کی جگہ پر بکھیر دیں جس سے مسجد میں گندگی پھیلنے کا احتمال ہے۔ اس لئے وہ پاک مٹی کی ٹکیہ بنا کر پیشانی کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔

حج یا عمرہ کے موقع پر وہ عام لباس میں ہوائی سفر کرتے ہیں اور پھر بس پر بیٹھ کر میقات پر روانہ ہو جاتے ہیں جہاں سے وہ احرام باندھ کر آتے ہیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے احرام باندھ کر اونٹنی پر سفر کیا تھا اس لئے آپؐ کے سر پر کسی چیز کا سایہ نہیں تھا۔ وہ بھی حالتِ احرام میں ایسی بسوں میں سوار ہوتے ہیں جن پر چھت نہیں ہوتی۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ بعض اوقات سخت گرمی کے باعث یہ عمل بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک پر انہیں غیر متزلزل ایمان ہے اور قرآن پاک کی ان کے ہاں وہی ترتیب ہے جو حضرت عثمان غنیؓ نے فرمائی تھی۔ قرآن پاک میں تحریف کے بارے میں کوئی بھی ثبوت مُدّعین پیش نہیں کر پائے۔ شاہ کے زمانے میں عقوبت خانوں میں ایران کے نوجوان راتوں کو قرآن پاک کی انہی آیات کی تلاوت فرماتے تھے جو ہمارے ہاں مشکل کے مواقع پر متداول ہیں۔

نماز اور روزہ میں بھی معمولی فرق ہیں، مگر وہ بھی ایسے نہیں کہ ان ہر دو فرائض کی

بابت ہمیں مشکوک کر سکیں۔ زکوٰۃ کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس سے انکار نہیں کرتے اور نہ ہی سونے یا جائیداد غیر منقولہ پر زکوٰۃ کے منکر ہیں۔ رقوم اور بنک ڈیپازٹ کے بارے میں ان کے سُنّیوں سے فقہی اختلافات ضرور ہیں۔

حج کے مراسم میں کوئی بھی فرق شیعہ اور سنی حضرات میں نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ اس لئے نہ ہو کہ آپ ؐ نے صرف ایک ہی حج کیا تھا اور آپ کو ایک لاکھ سے زائد حضرات نے دیکھا تھا اور مختلف لوگوں نے ایک جیسی روایات بیان کی ہوں گی۔ راقم الحروف کو ۱۹۹۲ء میں حج کے موقع پر فارسی زبان میں ایک کتاب ملی جو حکومتِ ایران نے حجاج کی رہنمائی کے لئے چھاپی تھی' وہ اب بھی میرے پاس ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ آپ لوگوں پر لازم ہے کہ مقامی امام کی اقتداء میں نماز ادا کریں اور جمیع مسلمانوں سے کسی موقع پر جدا نہ ہوں۔ پھر یہ بھی منقول ہے کہ آنحضور ﷺ کے روضۂ مبارک کی جالیوں سے مت چمٹیں اور دھاگے وغیرہ نہ باندھیں اور نہ ہی کوئی اور حرکت کریں۔ ایسی حرکات کا نہ تو شریعت میں جواز ہے اور نہ کوئی فائدہ' بلکہ مقامی لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے جو حج میں ممنوع ہے۔

علاوہ بریں نکاح کے احکام' دیوانی معاملات اور دیگر روزمرہ امور مثلاً حجاب شرعی وغیرہ میں بھی کہیں پر اصولی اختلاف نہیں ہے۔

سنت کے علاوہ احادیث میں بھی ہم آہنگی ہے۔ کتاب خطبات بہاولپور میں ڈاکٹر حمید اللہ کا خیال ہے کہ راویوں کا بے شک فرق ہے' مثلاً میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت پر ایک چیز بیان کرتا ہوں وہی بات میرا شیعہ بھائی حضرت علیؓ کی روایت پر بیان کرتا ہے' تو یہ مفروضہ کہ شیعہ سنی کی حدیثوں کی کتب میں فرق ہے' غلط ہے۔ فرق صرف روایت میں ہے' حدیث کے مندرجات میں فرق نہیں۔ اب تک ایسی کوئی خاص چیز ملی بھی نہیں جس میں یہ کہا جائے کہ شیعہ کتابوں میں "الف" چیز کا حکم ہے اور سنی کتابوں میں اس کے بالکل برعکس "الف" کی ممانعت کا حکم دیا گیا ہے۔

افکار اور تصوف میں ہم آہنگی کا یہ عالم ہے کہ ہر دو کے ہاں غزالیؒ' رومیؒ' حافظؒ اور جامیؒ قابل احترام ہیں اور مشہور شیعہ فلسفی نصیر الدین طوسی سے سُنّی حضرات نے بھی

استناد کیا ہے۔ اسی طرح امام خمینی نے گورباچوف کو اپنے مشہور خط میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے مشہور سُنّی صوفی محیؒ الدین ابن عربیؒ کی تحریروں کا حوالہ دیا ہے۔ متاخرین میں سے جمال الدین افغانیؒ اور علامہ اقبال کو جو شہرت و مرتبہ ایران میں حاصل ہے وہ بھی اس کا ثبوت ہے۔

یہ سب کچھ مشترک ہوتے ہوئے ہردو فرقوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کا امکان اتنا مشکل نظر نہیں آتا جتنا کہ لوگ سمجھ لیتے ہیں۔

شیعہ اور سُنّی اختلافات

ہرچند کہ اختلافات فروعی اور معمولی قسم کے ہیں مگر بسا اوقات دونوں جانب سے غلو کے باعث اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں بے خبری کے نتیجہ میں یہ سنگین صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لئے شیعہ عقائد و اعمال کا مختصر تعارف کروانا بھی ضروری ہے۔

○ توحید اور رسالت میں چنداں اختلاف نہیں ہے۔ تاہم خاندانِ نبوت کے افراد (ازواجِ مطہراتؓ اور بیٹیوںؓ) کے بارے میں عموماً ترجیحی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح تسلسلِ امامت کا تصور شیعہ عقائد میں اہم سمجھا جاتا ہے۔

○ نماز میں ہاتھ کھول کر رکھے جاتے ہیں۔ فقہ مالکی میں بھی یہی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ تاہم رفع الیدین نماز میں ہر حرکت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ التحیات نماز میں شامل نہیں ہے۔ سلام کے لئے دائیں اور بائیں چہرے موڑنے کی بجائے تین بار رفع الیدین کیا جاتا ہے اور پھر داہنے ہاتھ کو دائیں اور بائیں حرکت دی جاتی ہے۔ جماعت میں ساتھ والے نمازیوں سے مصافحہ بھی کیا جاتا ہے۔ جمعہ کی نماز شہر میں ایک ہی جگہ ادا ہوتی ہے۔ عموماً وضو میں پاؤں نہیں دھوئے جاتے کیونکہ ایران کی عمومی مساجد میں وضو کی جگہ اتنی بلند ہوتی ہے کہ پاؤں وہاں تک پہنچ نہیں پاتے۔ اذان میں کچھ جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً "اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ" "اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا حُجَّةُ اللّٰهِ" اور "حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ"۔ ایران کے شیعہ حضرات کے برعکس برصغیر کے شیعہ احباب "اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيَّ خَلِيفَةُ رَسُولِ اللّٰهِ بِلَا فَصْل" کا جملہ بھی شامل کرتے ہیں۔

○ روزہ میں انتہائے سحر اور آغازِ افطار کا وقت بالترتیب قدرے جلدی اور دیر سے ہوتا ہے۔

○ کرنسی نوٹ اور بینک ڈپازٹ پر زکوٰۃ نہیں دی جاتی۔

○ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک ہی تصور کیا جاتا ہے۔

○ مُتعہ (عارضی شادی) کو جائز سمجھا جاتا ہے اور اس میں کسی معذرت سے کام نہیں لیا جاتا۔ اس سلسلہ میں نائلہ حائری کی کتاب نے چونکا دینے والے انکشافات کئے ہیں۔ انقلاب کے بعد جب وسیع پیمانے پر سزائے موت دی گئی تو نوجوان باکرہ لڑکیوں کو سزائے موت دینے کے سلسلہ میں ہچکچاہٹ کا اظہار ہوا۔ چنانچہ یہ پالیسی اپنائی گئی کہ پہلے مُتعہ کے ذریعہ انہیں چند گھنٹے کے لئے شادی شدہ کر دیا جائے اور اس کے بعد انہیں سزائے موت دی جائے۔ اس موضوع پر اس موقع پر مزید روشنی ڈالنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ آیت اللہ حاجی کاظم شریعت مداری کے بقول متعہ کے حکم کو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے منسوخ کیا تھا جس کا انہیں اختیار نہیں تھا۔

○ چونکہ شیعہ احباب کی اکثریت اصحابِ ثلاثہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ) کو امامِ وقت (حضرت علیؓ) کی موجودگی میں قیادت کا حق دار نہیں سمجھتے اس لئے ان کی بابت ناگواری کا تاثر ابھرتا ہے جو مختلف صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ بعینہٖ ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کی بابت بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ تصورات زیادہ تر صفوی دور کے بعد شیعہ عقائد میں شامل ہوئے ہیں۔ اس بارے میں کبھی کبھی غلو سے کام بھی لیا جاتا ہے جس سے صورت حال مکدر ہو جاتی ہے۔ باغ فدک کے مسئلہ کو بھی اچھال کر اصحاب ثلاثہ پر اہل بیت کی حق تلفی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ روشن فکر شیعہ حضرات بتدریج ایسے معاملات میں احتیاط سے کام لے رہے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ بہتری کی صورت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد کبھی کبھار زبردست اختلافات پیدا ہو جاتے تھے اور نوبت جنگِ جمل،

(باقی صفحہ ۸۱ پر)

طلاق

اسباب ــــ اور ــــ تدارک

ــــ از : ڈاکٹر نور احمد شاہتاز ــــ

پاکستان میں اگرچہ طلاق کے واقعات کا تناسب اتنا نہیں جتنا کہ دیگر ممالک (خصوصاً عرب ممالک) میں ہے تاہم کچھ عرصہ سے طلاق کے واقعات میں قدرے اضافہ ہوا ہے۔ مشرقی لڑکیاں طلاق کا باعث عموماً بہت کم بنتی ہیں کیونکہ ان کے ذہن میں یہ بات بخوبی بیٹھ چکی ہوتی ہے کہ طلاق کی صورت میں ان کا مستقبل تاریک ہوگا اور معاشرہ میں نکاح ثانی کو جن نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اس کی بناء پر بھی کوئی پاکستانی لڑکی کوئی ایسی غلطی نہیں کرتی جس سے اس کا سہاگ اجڑ جائے۔ پھر تاخیر سے رشتہ طے ہونے اور مناسب رشتہ کے انتظار میں جس ذہنی اذیت سے ایک بار ایک لڑکی دوچار ہو چکی ہو وہ دوبارہ اس قسم کی صورتحال سے دوچار ہونے کے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لیتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اب معاملہ پہلے سے بھی دشوار تر ہوگا۔

ہمارے معاشرہ میں لڑکیاں سسرالی گھر میں وہ سب کچھ برداشت کر لیتی ہیں جن کی اپنے گھر میں انہیں ہوا بھی نہیں پہنچی ہوتی اور جس کا انہوں نے کبھی خوابی منظر بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ وہ اپنے شوہر کے علاوہ اپنے سسر، ساس اور دیگر تمام سسرالی رشتہ داروں کی مقدور بھر بلکہ اس سے بھی زیادہ خدمت گزاری قبول کرتی ہے اور اس کے عوض صرف شوہر کی توجہ اور پیار چاہتی ہے جو کہ بہت کم کے حصہ میں آتا ہے۔

ہمارے معاشرہ کی دیگر امور میں افراط و تفریط کے ساتھ ساتھ ایک قباحت یہ بھی ہے کہ اکثر گھرانوں میں بہو ہی کو گھر کے سارے کام کاج کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اور بہو کے گھر آتے ہی گھر کی خواتین سکھ کا سانس لینا چاہتی ہیں اور یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ بس اب ان

کے کام کاج سے ریٹائر ہونے اور آرام کرنے کا مرحلہ آگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ توقع رکھتی ہیں کہ ان کی بہو سب سے پہلے بیدار ہو اور گھر کی صفائی اور ناشتہ کی تیاری سے فارغ ہو کر دیگر لوگوں کو جگائے اور ان کی آنکھ کا تارا کہلائے، رات کو وہ سب سے آخر میں سوئے اور کسی کی بات پر اف تک نہ کہے۔ بہو گھر میں لائی جانے والی ایک ایسی دیومالائی شخصیت ہونی چاہئے کہ جس سے گھر کے چھوٹے سے بڑے تک ہر فرد چھوٹا بڑا ہر کام کہہ سکے اور اس کو انکار کی جرأت نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے کوئی مطالبات نہ ہوں اور نہ ہی وہ اپنی کسی خواہش کا دبے لفظوں میں بھی ذکر کرے۔ اسے جو کھانے کو دیا جائے کھالے اور جو پہننے کو ملے پہن لے۔ اس کی پسند ناپسند کا کوئی تذکرہ نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے اپنے شوہر کے ساتھ بھی کہیں نہ جائے۔

بعض گھرانوں میں بہو پر اس قدر ذہنی دباؤ ہوتا ہے کہ وہ بے چاری جس کام کو بھی خلوص دل اور نیک نیتی سے انجام دینا چاہتی ہے اس میں کوئی نہ کوئی قباحت گھر والوں کو نظر آہی جاتی ہے۔ چنانچہ بسا اوقات صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور ساس بہو، نند بھاوج اور دیور بھاوج کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور اس قسم کے جھگڑے بڑھتے بڑھتے نوبت طلاق تک جا پہنچتی ہے۔

لیکن طلاق کا سبب صرف گھریلو جھگڑے نہیں بلکہ یہ ان اسباب میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ متعدد ایسے اسباب ہیں جو طلاق کا موجب بنتے ہیں۔ ان میں سے بعض اسباب ایسے ہیں جو معاشرہ میں وبا کی طرح پھیل کر عام ہو چکے ہیں۔ ان اسباب کا تدارک ہم سب کی معاشرتی ذمہ داری ہے۔

اب ہم طلاق کے بعض عمومی اور اہم اسباب کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ زوجین میں سے کسی ایک یا دونوں کا شریعت کے مقرر کردہ اصولوں سے انحراف وہ سب سے بڑا سبب ہے جو طلاق کے اسباب میں عموماً سرفہرست نظر آتا ہے۔ متعدد جوڑوں میں طلاق کی نوبت ایسے ہی کسی سبب سے آتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ طلاق کے ۷۰ فیصد واقعات میں یہی سبب موجود ہوتا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مثلاً ایک خاتون اپنے شوہر سے پریشان ہیں اور طلاق حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا شوہر

نشہ کرتا ہے اور مے نوشی یا ہیروئن کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی خاتون اس لئے شوہر کی طرف سے دلبرداشتہ ہیں کہ ان کے شوہر نامدار نشہ کے عادی ہو کر یا بری سوسائٹی کا شکار ہو کر بے روزگار ہو گئے ہیں اور گھر میں بچوں کے لئے کچھ نہیں۔ خاتون خود کام کاج کر کے بچوں کا پیٹ پال رہی ہے اور اپنی عزت داؤ پر لگائے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ اس طرح کے واقعات اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں جیسا کہ حال ہی میں ہدایت بی بی کا شائع ہوا جس کا شوہر اس سے بدکاری کرانا چاہتا تھا۔ اس غیرت مند خاتون نے گوارا نہ کیا اور بے غیرت پولیس افسر اور دیوث شوہر کا کام تمام کر دیا۔

کبھی کسی شوہر سے شکایت سننے کو ملتی ہے کہ بیوی صرف بے نماز ہی نہیں فلموں کی رسیا ہے اور گھر کے معاملات و عبادات سے اسے قطعاً کوئی سروکار نہیں۔ رات بھر ٹی وی، وی سی آر کے سامنے گزارنا اور صبح نصف النہار تک سوئے رہنا عام معمول ہے۔ سمجھانے بجھانے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا بلکہ معاملہ مزید بگڑ رہا ہے۔ اس طرح کی شکایات عموماً اس حلقے سے ملتی ہیں جسے ہمارے ہاں اونچی سوسائٹی کے لوگوں کا حلقہ کہا جاتا ہے اور جو عرف عام میں پڑھا لکھا طبقہ کہلاتا ہے۔

۲ - دوسرا بڑا سبب غصہ ہے ــــــ اور غصہ بھی کسی معقول بات پر نہیں بلکہ بہت ہی معمولی معمولی باتوں پر۔ اور کبھی یہ غصہ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ مرد لفظ "طلاق" کا استعمال کر بیٹھتا ہے اور پھر غصہ فرو ہونے پر لوگوں سے مسئلہ دریافت کرتا اور علماء سے غصے میں دی گئی طلاق کو طلاق نہ ہونے کا فتویٰ حاصل کرنے کے لئے مارا مارا پھرتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فتویٰ اور مسئلہ کی دریافت کا تکلف نہیں کرتے، محض اپنے اجتہاد یا عزیزوں، رشتہ داروں یا آس پڑوس اور دوست احباب کے اس مشورہ کو صائب جانتے ہیں کہ غصے میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ دونوں ازدواجی زندگی گزارتے اور زناکاری کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

بسا اوقات لڑائی جھگڑے اور روز روز کی تو تکار سے تنگ آ کر خاتون طلاق کا مطالبہ کر بیٹھتی ہیں اور میاں بھی اسے عزت نفس کا مسئلہ سمجھتے ہوئے طلاق دے ڈالتے ہیں اور پھر اہل علم سے رجوع کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ طلاق تو ہو گئی۔ چنانچہ اب حلالہ کا مکروہ ترین

عمل کرنے پر بھی زوجین راضی ہوتے ہیں اور کسی بھی صورت ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتے۔

۳۔ تیسرا سبب زوجین کے اہل خاندان میں سے کسی کا ان کی پرائیویٹ زندگی میں مخل ہونا ہے۔ بسا اوقات یہ مداخلت لڑکی کے والدین اور کبھی لڑکے کے والدین میں سے کسی کی طرف سے ایسی ہوتی ہے جو زوجین میں سے کسی ایک کو سخت ناگوار گزرتی ہے اور اس سے تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اصلاح اور نصیحت کی خاطر پند و موعظت کے انداز میں کبھی کبھار کچھ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں، مگر اس میں بھی یہ امر پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرے کے سامنے سخت سست نہ کہا جائے کہ اس سے عزت نفس مجروح ہوتی اور زوجین کے مابین قائم وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

۴۔ طلاق کے اسباب میں سے چوتھا بڑا سبب جہالت ہے۔ لوگ دینی مسائل سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے شرعی احکامات سے جاہل رہتے ہیں اور وہ اپنی جہالت کی بنا پر لفظ "طلاق" کا استعمال کر گزرتے ہیں۔ پھر انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اگر بالفرض طلاق کی نوبت آ ہی گئی ہے تو طلاق کس طرح اور کب دی جائے۔ کوئی بھی شخص طلاق دیتے وقت یہ خیال نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کن ایام سے گزر رہی ہے۔ الا ماشاء اللہ شاید چند فیصد لوگ ہی یہ بات جانتے ہوں گے کہ طلاق ایام حیض میں نہیں بلکہ ایام پاکیزگی (طہر) میں دی جانی چاہئے۔ پھر تعلق زوجیت کو منقطع کرنا اگر اتنا ہی ناگزیر ہو گیا ہے تو یکبارگی تین طلاق دے ڈالنا خود اپنے اوپر اور اپنی بیوی پر ظلم کے مترادف ہے۔ ایسے حالات میں صبر سے کام لینا ضروری ہے اور ناگفتہ بہ حالات میں جب طلاق کے سوا چارہ نہ رہا ہو تو ایک طہر میں ایک طلاق دی جانی چاہئے تاکہ رجوع کا دروازہ کھلا اور Option (آپشن) باقی رہے۔ ممکن ہے اس ایک طلاق کے بعد ہی زوجین میں سے قصوروار فریق کو اپنے قصور کا ادراک ہو جائے اور وہ واپسی کا راستہ اختیار کر سکے۔ یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ پاکیزگی کے ایام میں بھی اس وقت طلاق دینا چاہئے جب ابھی ازدواجی رابطہ (جماع) نہ ہوا ہو اور جس طہر یا جن ایام پاکیزگی میں میاں بیوی جماع کر چکے ہوں ان میں طلاق نہ دی جائے بلکہ اس کے بعد ایام حیض گزرنے دیئے جائیں اور جب نیا طہر (ایام پاکیزگی) شروع ہو تب

طلاق دی جائے۔

زوجین کے درمیان کسی شکر رنجی کی صورت میں والدین اور اقارب کا فرض ہے کہ وہ جلد از جلد دونوں کے مابین صلح جوئی کی کوشش کریں اور معاملہ بگڑنے سے قبل ہی اپنا کردار ادا کر کے ایک مشکل مرحلہ سے خود کو اور اپنے بچوں کو بچائیں۔

غصہ کی صورت میں بھی عزیز و اقارب کا فرض ہے کہ وہ کسی ایک کے طرفدار بن کر مسئلہ کو مزید الجھانے کی بجائے عارضی طور پر دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے ان کا غصہ فرو کریں اور انہیں اس حدیث رسول ؐ پر عمل کروائیں جس میں آپ ؐ نے فرمایا کہ "جس کسی کو غصہ آ جائے اسے چاہئے کہ وضو کر لے اور اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے' بیٹھا ہے تو لیٹ جائے"۔

انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ طلاق کے بہت سے معاملات میں سبب بہت معمولی ہوتا ہے مثلاً کسی خاص تقریب میں شرکت سے منع کرنے پر جھگڑا اور نوبت طلاق' کسی عزیز یا عزیزہ کی شادی میں مخصوص لباس نہ خریدنے یا حسب خواہش تحائف نہ لے جانے پر جھگڑا اور طلاق' کبھی گھر میں کسی کے آنے جانے پر پابندی میں اختلاف پر جھگڑا اور طلاق' کبھی محض شک کی بناء پر کہ میاں یا بیوی کسی اور کو چاہنے لگے ہیں جھگڑا اور طلاق۔

اسلام نے ازدواجی معاملات میں پیدا ہونے والی مشکلات کا واحد حل طلاق تجویز نہیں کیا بلکہ اس کے متعدد مراحل بیان کئے ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ سمجھانے بجھانے کا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے : ﴿وَالّٰتِی تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ﴾ یعنی "جن خواتین سے تمہیں (حدود تعلق زوجیت پار کر کے) سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں نصیحت کرو (سمجھاؤ بجھاؤ)"۔

دوسرا مرحلہ بستر الگ کرنے کا ہے کہ اگر نصیحت کارگر ثابت نہ ہو تو ان کے بستر الگ کردو' جسے قرآن کریم نے ﴿وَاهْجُرُوهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ﴾ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی "ان کو اپنے بستروں سے الگ کردو"۔ پھر اگر یہ ترکیب بھی کارگر ثابت نہ ہو تو پھر تیسرا مرحلہ زبانی کی بجائے عملی سرزنش کا ہے یعنی ہلکا پھلکا مارنا' جسے قرآن کریم نے ﴿وَاضْرِبُوهُنَّ﴾ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی "انہیں مارو"۔

چوتھا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب سابق تینوں مرحلوں سے معاملہ آگے بڑھ گیا ہو اور صورت حال بے قابو (out of control) ہو رہی ہو۔ اس مرحلہ میں دونوں جانب کے اعزہ کو جمع کیا جائے گا، خصوصاً بڑوں بزرگوں کو، تاکہ وہ مل بیٹھ کر تصفیہ کرا دیں۔ اسے قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ ﴿فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ یعنی "دونوں کے اہل خانہ میں سے حکم (فیصلہ کرنے والے ثالث) مقرر کر لئے جائیں جو دونوں کے بیان حاصل کر کے صلح کی کوشش کریں"۔

پانچواں مرحلہ "ایلاء" کا ہے اور ایلاء کے معنی طلاق کے بغیر مرد اپنی زوجہ سے رشتہ ازدواج منقطع کر لے۔ اس میں اسے اختیار ہے کہ حسب ضرورت خود مدت مقرر کر لے۔ ایک ماہ، دو ماہ، تین ماہ، مگر یہ بائیکاٹ یا انقطاع تعلق چار ماہ سے زیادہ کا نہ ہو۔

آخری مرحلہ "طلاق" کا ہے اور وہ بھی اس طرح جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا۔ یعنی ایک طہر میں ایک طلاق نہ کہ یکبارگی تین طلاقیں۔

طلاق کے اسباب میں سے ایک سبب اور بھی ہے اور وہ ایسا سبب ہے کہ جس میں نہ تو کوئی شرعی مجبوری ہوتی ہے اور نہ ہی اخلاقی۔ بس صرف اس لئے طلاق دی جاتی یا دلوائی جاتی ہے کہ نکاح بٹے سٹے کا تھا۔ اب چونکہ ایک جوڑے کا آپس میں نباہ نہیں ہو سکا اور ان کے درمیان طلاق تک نوبت پہنچ کر معاملہ ختم ہو گیا لہٰذا اب دوسرے جوڑے سے بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ بھی اپنا ازدواجی رشتہ ختم کر لیں اگرچہ وہ کتنے ہی پرسکون اور پرکیف ازدواجی تعلقات و ایام زندگی گزار رہے ہوں۔ مثلاً زید کی شادی عمرو کی بہن سلمہ سے اور عمرو کی شادی زید کی بہن آمنہ سے ہوئی۔ اب اگر کسی وجہ سے زید نے عمرو کی بہن سلمہ کو طلاق دے دی ہے تو عمرو کے گھر والے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ عمرو بھی لازمی طور پر آمنہ کو فارغ خطی دے دے کیونکہ زید نے سلمہ کو طلاق دے دی ہے۔ باوجودیکہ عمرو اور آمنہ خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں مگر معاشرتی جبر کا شکار ہو کر وہ اپنا گھر اجاڑنے پر مجبور ہیں۔ اس قسم کی طلاق کا مطالبہ کرنے والے کس قدر گناہ کے مرتکب ہوتے ہوں گے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ یہ سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں ایک اور برائی مطلقہ کے بارے میں طے شدہ فارمولا ہے اور وہ فارمولا یہ ہے کہ "اگر اتنی ہی اچھی ہوتی تو طلاق کیوں پاتی"۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اس طلاق میں قصور وار کون رہا ہوگا؟ اسباب کیا رہے ہوں گے؟ بس ایک ہی بات طے شدہ ہے کہ لڑکی ہی میں کوئی خرابی ہوگی۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکا جنسی طور پر نااہل نکلا ہو یا نشہ کا عادی ہو' یا اس کی مرضی کے بغیر والدین نے شادی کر دی ہو اور اس نے اس لئے طلاق دے ڈالی ہو' یا جس قسم کی بیوی کا تصور اس نے اپنے ذہن میں بٹھا رکھا تھا وہ اس کے برعکس ثابت ہوئی ہو اور اس کے خوابوں کی ملکہ کوئی اور ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ لڑکے نے اس شریف لڑکی سے کسی غیر اخلاقی غیر شرعی امر کا تقاضا کیا ہو اور لڑکی نے بے غیرت بننے پر طلاق حاصل کرنے کو ترجیح دی ہو۔ کیا ہمارے معاشرہ میں ایسے واقعات نہیں ہوتے کہ لڑکا اپنی بیوی سے بے پردہ اپنے یاروں دوستوں میں گھل مل جانے کا تقاضا کرتا ہو اور وہ کسی ایسے شریف خاندان کی ہو جہاں غیر مردوں نے کبھی قدم رکھنے کی جرات نہ کی ہو۔ کیا اس معاشرہ میں اس قسم کے واقعات نہیں ہوتے کہ ایک لڑکی اپنے گھر میں سخت پردہ کا اہتمام کرتی تھی مگر میاں کے گھر آکر اس سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ وہاں کے لوگوں اور اس خاندان والوں کے رواج کا احترام کرتے ہوئے برقعہ اور چادر اتار پھینکے؟

جہاں اس قدر افراط و تفریط ہو وہاں صرف لڑکی کو موردِ الزام ٹھہرانا اور اس کے بارے میں یہ طے کر لینا کہ یہی قصور وار رہی ہوگی کہاں کا انصاف ہے؟ خدارا حقائق کی دنیا میں آیئے اور اپنے معیارات تبدیل کیجئے۔ مفروضات پر نتائج کی عمارت کھڑی کرنے کی بجائے معاشرتی بے راہ روی کو پیش نظر رکھتے ہوئے واقعات کا تجزیہ کیجئے۔

مطلقہ (طلاق یافتہ) لڑکیوں کے بارے میں ہمارے معاشرہ میں جس قدر تنگ نظری اور بدگمانی پائی جاتی ہے اس کا تدارک اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسلام کے سنہری اصولوں کو اپنانے' پھیلانے اور عام کرنے کا عمل زندگی کے ہر شعبہ میں جاری ہو۔ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقہ عورتوں سے نکاح نہیں کئے؟ خود آپ ؐ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جنہیں ان کے پہلے شوہر حضرت زید ؓ نے طلاق

دی تھی۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی حضورؐ کی وہ زوجہ محترمہ ہیں جو پہلے مسافع بن صفوان کے عقد میں رہ چکی تھیں اور غزوہ مریسیع کے موقع پر اسیر ہو کر مدینہ آئی تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں فرمائی۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آنے سے قبل مسعود بن عمرو بن عمری ثقفی سے علیحدگی اختیار کر کے ابو رہم بن عبد العزی کے نکاح میں آئیں اور ابو رہم کے انتقال کے بعد حضورؐ نے ان سے نکاح کیا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح سلام بن مشکم القرظی سے ہوا تھا' وہاں سے طلاق ہوئی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں' کنانہ کے غزوۂ خیبر میں مارے جانے کے بعد حرم نبوی میں داخل ہوئیں۔ ان ازدواج مطہراتؓ کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسے گمان کا اظہار نہیں فرمایا جس سے ان کے مطلقہ ہونے کو مطعون کیا جا سکے۔ مگر اس کا کیا جائے کہ ہم مسلمان ہو کر بھی نبی اکرم ﷺ کی پیروی نہیں کرتے اور اپنی روش ترک کرنے پر سنجیدگی سے نہیں سوچتے بلکہ مطلقہ کو ہی مطعون ٹھہراتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ طلاق کے معاملات میں انتہائی صبر و احتیاط سے کام لیا جائے۔ طلاق کے اسباب کے ازالہ کی ہر سطح پر کوشش کی جائے۔ نئے شادی شدہ جوڑوں کو ایک دوسرے کے حقوق و فرائض سمجھائے جائیں۔ سسرال والے بھوؤں کو اپنی بیٹیوں کی طرح ہی سمجھیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک کریں جو وہ اپنی بیٹی کے ساتھ سسرال والوں کے ہاں ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں اور شوہر اور ان کے اہل خانہ زوجہ و بہو سے اس قسم کی خدمات کی توقع نہ کریں جنہیں وہ اپنی بچیوں کے لئے ناگوار خیال کرتے ہوں۔ مطلقہ عورتوں کو ہر صورت میں قصوروار گرداننے اور انہیں مطعون کرنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے ان شکستہ دلوں کے معاملات کا جائزہ لیں اور انہیں نفسیاتی مریض بننے سے بچائیں۔

بچوں اور بچیوں کو شادی سے قبل و بعد نکاح و طلاق کے مسائل لازمی طور پر سکھائے اور پڑھائے جائیں۔ چھوٹی عمر سے ہی بچوں میں دینی رجحان پیدا کرنے کی کوشش کریں اور گھر کا ماحول مصنوعی اور رومانٹک بنانے کی بجائے قدرتی اور حقیقی بنائیں تاکہ

بچوں میں فطری اسلامی جذبہ بیدار ہو اور اسلامی اصولوں سے آشنائی و روشناسی کی طلب پیدا ہو۔

اسلامی اقدار کی پاسداری بہت سے دکھی گھرانوں کو سکون و راحت کی وہ دولت مہیا کر سکتی ہے جس کی تلاش میں لوگ فلموں' ڈراموں' منشیات اور دیگر منفی سرگرمیوں میں اپنا وقت' مال اور آبرو برباد کرتے ہیں۔

بقیہ : فکرِ عجم

جنگِ صفّین اور مسلح تصادم اور کشت و خون تک جا پہنچی تھی مگر یہ مثال کہیں نہیں ملتی کہ ایک فریق دوسرے کی اعلانیہ تکفیر کرتا ہو۔ اس موضوع کو سیاسی اہمیت ہی حاصل رہی ہے۔

○ ائمہ کرامؒ اور دیگر بزرگ ہستیوں کی قبور کو زیارت گاہ بنا دیا گیا مگر بدعات اور خرافات اس قدر نظر نہیں آئیں جس قدر برصغیر میں قبورِ اولیاء پر معمول ہیں۔ سعودی عرب میں انہدامِ قبور پر بھی ناگواری کا اظہار کیا جاتا ہے اور جنّت البقیع کے ایسے نقشے ان اصحاب کے پاس ہوتے ہیں جن سے اہل بیت کی بزرگ ہستیوں کی قبور کی نشاندہی ہوتی ہے۔
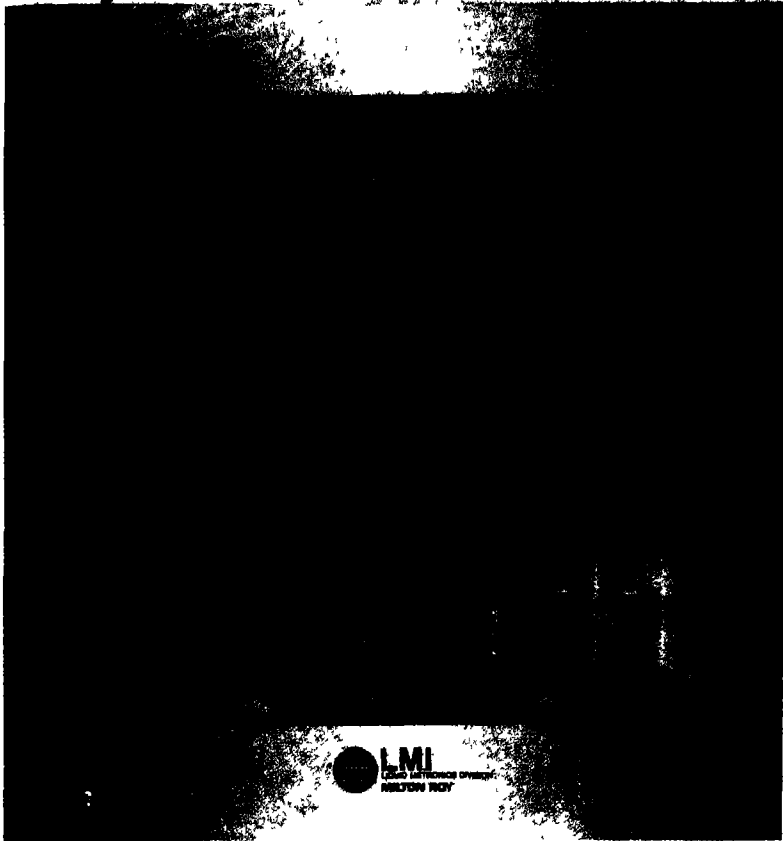
خیرِ اُمت کا سب سے بڑا وصف اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ

مولانا محمد شہاب الدین ندوی' بنگلور (انڈیا)

ملت اسلامیہ کی تشکیل نو اور تعمیر جدید اس وقت زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم تر اصلاح عالم کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اب ہم کو "کرو یا مرو" (do or die) کے مطابق یا تو کچھ کر کے دکھانا ہے یا پھر کسی دوسری قوم کے لئے راستہ خالی کر دینا ہے ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴾ گویا ہم میدان خلافت سے فرار چاہتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ اور ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ ہم اس قدر سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے دین کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دیں اور اس کے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہو جائیں۔ یہ گویا ہماری ملی موت کے مترادف تو ہو گا ہی مگر خدا کے نزدیک بھی ہمارا یہ فعل ناقابل معافی جرم ہو گا۔ لہٰذا دین و عقل کا تقاضا ہے کہ ہم زندہ اور بہادر قوموں کی طرح اس میدان میں آگے بڑھیں۔ خلافت ارض کوئی کھیل تماشا نہیں ہے' اِس میں بہت سے خطرات ہیں اور بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ مگر یہ ایسا معاملہ ہے کہ اِس میں ذرا بھی غفلت نہیں برتی جا سکتی۔ اقوام عالم میں اِس وقت اُمت مسلمہ ہی وہ واحد ملت ہے جو خلافت ارض کی حامل ہے۔ لہٰذا وہی موجودہ گھٹاٹوپ تاریکیوں میں امید اور روشنی کی کرن دکھائی پڑتی ہے اور اس کی تشکیل نو اور تنظیم نو پر اقوام عالم کی صلاح و فلاح کا مدار ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر' واولئك هم المفلحون ○ ﴾

(آل عمران ۱۰۴)

"اور تم میں ایک ایسی جماعت (ضرور) ہونی چاہئے جو (لوگوں کو) خیر کی طرف بلائے اور (انہیں) معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے"۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے :

﴿ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس و تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر.... ﴾ (آل عمران : ۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جو عام لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے۔ (تمہارا منصب یہ ہے کہ) تم انہیں معروف کا حکم کرتے رہو اور منکر سے روکتے رہو...."

ان دونوں آیتوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔ پہلی آیت ملت اسلامیہ کے ساتھ مخصوص ہے جب کہ دوسری آیت پوری نوع انسانی سے متعلق ہے۔ اس لحاظ سے پہلی آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہئے جو ہر قسم کے دینی و شرعی معاملات میں تمہاری رہنمائی کرے۔ (حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ : "خیر سے مراد اتباع قرآن و سنت ہے"۔ تفسیر ابن کثیر ج ۱، ص ۳۹۰) اور تمہارے ملی و اجتماعی مسائل حل کرے۔ اس مخصوص جماعت کی حیثیت پوری ملت اسلامیہ کے درمیان ایک نگران اعلیٰ اور شاہد کی سی ہو گی جیسا کہ "ولتکن منکم" کے الفاظ تقاضا کر رہے ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ اس کا عقلی و منطقی تقاضا ہے کہ ایسی جماعت کو دینی و دنیوی تمام مسائل پر عبور رہنا چاہئے تاکہ وہ ملت کی صحیح رہنمائی کر سکے۔

دوسری آیت کریمہ کا تعلق خصوصیت کے ساتھ نوع انسانی سے ہے جیسا کہ اس کے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ عالم انسانی کا "خیر" صرف دنیائے اسلام ہی سے وابستہ ہو سکتا ہے اور وہی امت خیر ہونے کی حیثیت سے نوع انسانی کی صلاح و فلاح کی ذمہ دار ہے کہ دعوت و تبلیغ کے صحیح اصولوں سے کام لے کر اور ہر ممکن طریقے اپنا کر یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دے۔ جیسا کہ ایک دوسری جگہ مذکور ہے :

﴿ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ

وجادلھم بالتی ھی احسن... ﴾ (النحل : ۱۲۵)

"اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت و دانائی اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور ان کے ساتھ بہترین طریقے سے مباحثہ کرو"۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی امت مسلمہ کی دائمی صفت ہو گی۔ یہ کوئی وقتی اور موقت فریضہ نہیں ہے جیسا کہ "یامرون" اور "ینھون" کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں۔ یہاں پر یہ نہیں کہا جا رہا کہ تم یہ کام کرو' بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ "خیر امت" ہونے کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ یہ سب کام کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا آج ہم پر جو بھی بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوئی ہیں وہ اپنے اس وصف اور فریضے کو ترک کرنے کی بدولت ہیں۔

معروف کے لغوی معنی ہیں "جانا پہچانا" اور منکر کے لغوی معنی ہیں "غیر جانا پہچانا"۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں :

"معروف ہر وہ فعل ہے جس کو عقل یا شرع بہتر سمجھیں اور منکر وہ ہے جس کو یہ دونوں برا جانیں۔" (المفردات فی غریب القرآن' ص ۳۳۱)

مفسرین کی تصریح کے مطابق معروف میں وہ تمام احکام آ جاتے ہیں جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دے رکھا ہے اور منکر میں وہ تمام "منہیات" داخل ہو جاتے ہیں جن سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس طرح معروف و منکر میں پورا دین اور پوری شریعت آ جاتی ہے۔ اور تمدنی و اجتماعی امور و معاملات بھی دین و شریعت سے الگ نہیں ہیں بلکہ انہی کے ضمیمے اور لاحقے ہیں جو دین و شریعت کے دائرے ہیں اور ان ہی کی حفاظت کی خاطر ہیں۔ اس طرح اسلام میں ہر چیز کے حدود و ضوابط واضح ہیں اور ہر چیز کا ایک مخصوص مقام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پورے دین اسلام کی روح معروف اور منکر میں سمیٹ دی گئی ہے اور سارا دین ان ہی دو امور کے گرد گھومتا نظر آ رہا ہے۔ جس نے معروف اور منکر کی صحیح حقیقت کو سمجھ لیا اس نے گویا کہ دین الٰہی کے رمز کو پا لیا۔ ہماری پوری زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی معروف کے مطابق ڈھلتے رہنا چاہئے اور اس میں خیر کا پہلو نمایاں ہونا چاہئے۔ اس میں دین و شریعت' تہذیب و ثقافت اور تمدن و اجتماع سب کچھ آ جاتے ہیں۔

اور جو تمدن معروف کے دائرے سے ہٹ کر منکر کے حدود میں داخل ہو جائے تو وہ مضر اور نقصان دہ ہو گا اور اس کا رو کا جانا ضروری ہو گا۔ جصاص رازی فرماتے ہیں : "دنیا میں جتنے بھی فتنے' فسادات اور شرور و آفات پیدا ہوتے ہیں وہ سب منکر ہی کے باعث ہوتے ہیں"۔ (احکام القرآن ج ۲' ص ۳۴)

موجودہ دور میں معروف و منکر کی صحیح ادائیگی ہی کے باعث اسلامی اور انسانی معاشروں کی اصلاح عمل میں آسکتی ہے اور اس سلسلے میں حکمت و دانش اور دعوت و تبلیغ کے تمام اصولوں کو کام میں لانا اور انسانی نفسیات کے مطابق ترغیب و ترہیب (رغبت و خوف دلانے) کے تمام طریقوں کو آزمانا ضروری ہے۔ قرآن اور حدیث کے مطالعے سے یہ حقیقت ہم پر بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی نفسیات کے مطابق دین و شریعت میں ترغیب و ترہیب یا انذار و تبشیر کے دونوں طریقوں سے خوب کام لیا گیا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم دعوت و تبلیغ کی راہ میں ان اصولوں کو راہنما بنائیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو "معروف" جو کہ اوامر دین کا مجموعہ ہے' پورے کا پورا ترغیب ہے اور "منکر" جو کہ نواہی کے مجموعے کا نام ہے' پورے کا پورا ترہیب ہے۔ اس طرح پورا دین و شریعت اور اس کا سارا تمدن و اجتماع ایک حیثیت سے معروف و منکر کے گرد گھوم رہا ہے تو دوسری حیثیت سے وہ ترغیب و ترہیب کے گرد گردش کر رہا ہے۔

جو حال موجودہ ترقی یافتہ قوموں کا آج ہے وہی حال قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کا بھی رہ چکا ہے جب کہ اہل اسلام اپنے باطن کے ساتھ ساتھ ظاہری حیثیت سے بھی ممتاز تھے تو اس وقت دوسری قومیں ان کے اقوال کو سند کا درجہ دیتی تھیں۔ اور ان کے اقوال سے استدلال کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ یہ مقام جب تک پھر دوبارہ پیدا نہیں ہوتا امت مسلمہ صحیح معنوں میں کوئی معزز مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ "تنھون" کے لغوی مفہوم اور اس کے تقاضے پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ "روکنا یا باز رکھنا" محض باتوں اور زبانی جمع خرچ ہی کا نہیں بلکہ حسب ضرورت کچھ زور اور قوت کا بھی مقتضی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں اس آیت کریمہ کی تشریح و تفصیل اس طرح ملتی ہے :

((من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ' فان لم یستطع فبلسانہ'

فان لم یستطع فبقلبہ ' وذلک اضعف الایمان))
"تم میں سے جو کوئی کسی بری بات کو دیکھے تو چاہئے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کو اس کی طاقت نہ ہو تو پھر (کم از کم) زبان ہی سے اس فعل کی مذمت کرے اور اگر (مخالفانہ ماحول کی وجہ سے) اس کی طاقت بھی نہ ہو تو پھر دل میں اس چیز کو برا جانے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے"۔

(صحیح مسلم 'کتاب الایمان)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایمان کا کامل ترین درجہ یا کمال ایمان امر اول کی ادائیگی میں ہے اور یہ ہر مسلمان کا آئیڈیل (ideal) ہونا چاہئے کہ معاشرے میں اس کی حیثیت ایک سپاہی یا خدائی فوجدار کی سی ہو۔

"نہی عن المنکر" کا تعلق خصوصیت کے ساتھ "ظلم" سے ہے۔ (جیسا کہ مختلف حدیثوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے) یعنی جہاں کہیں کوئی ظلم و زیادتی ہو رہی ہو تو ضروری ہو جاتا ہے کہ حتی المقدور اس کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ دنیا میں کوئی تمدن 'کوئی عمران 'کوئی اجتماع پنپ نہیں سکتا اور یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ اگرچہ وہ بظاہر کتنا ہی خوشنما اور پائیدار کیوں نہ نظر آ رہا ہو"۔ "سنت الٰہی" کے مطابق جب عذاب الٰہی کا کوئی جھونکا آتا ہے تو پھر پائیدار سے پائیدار تمدن و عمران کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں اور اس کے تنکے بکھر جاتے ہیں اور ایسے موقع پر کسی عظیم سے عظیم تر تمدن کی حیثیت بھی شاخ نازک پر ایک آشیانے سے زیادہ نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں تاکید کی گئی ہے کہ سوسائٹی میں ظلم و عدوان کو ہر حال میں روکا جائے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اس فعل سے باز رکھا جائے۔ ورنہ مسلسل ظلم و زیادتیوں کی بنا پر جب پاپ کا گھڑا بھر جائے گا تو اس کے نتیجے میں جو عمومی تباہی آئے گی اس کی لپیٹ میں اچھے برے سب ہی آ جائیں گے۔ اور کوئی بھی باقی نہیں بچے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین میں ظلم و عدوان سخت ناپسند ہے اور وہ کسی بھی طرح ظلم کو اپنے بندوں کے حق میں پسند نہیں کرتا:

﴿ وما اللّٰہ یرید ظلمًا للعباد ﴾ (المومن ۳۱)
"اور اللہ بندوں کے لئے کسی طرح کا ظلم پسند نہیں کرتا"۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں (کا باعث) ہو گا اور حریصانہ بخل (شُح) سے بچو۔ یہی حریصانہ بخل یعنی خود غرضی تم سے پہلے والوں کو بھی ہلاک کر چکی ہے۔ جس نے ان کو لوگوں کے قتل و خون ریزی پر ابھارا تو انہوں نے لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلا"۔

(مسلم، باب تحریم الظلم، مطبوعہ ریاض)

ایک اور حدیث پاک ہے:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یا تو تم معروف کا حکم کرتے رہو گے اور منکر سے روکتے رہو گے یا پھر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر کوئی عذاب مسلط کر دے پھر تم دعا کرو گے تو تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی"۔

(ترمذی، باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر)

ایک اور حدیث میں ہے:

"جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں مگر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ سب کو کسی عذاب میں مبتلا کر دے"۔ (ابوداود، باب الامر والنھی)

یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جہاد کی اصل غرض و غایت اور اس کی اسپرٹ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب "معروف" کا وجود خطرے میں پڑ جائے اور "منکرات" کا ظہور اور ان کا دور دورہ ہو جائے تو پھر جہاد فرض و واجب ہو جاتا ہے اور ایسے مواقع پر جہاد نہ کرنا عند اللہ جرم اور گناہ کی بات متصور ہو گی۔ جہاد فرق مراتب کے اعتبار سے ہر مسلمان پر فرض ہے جیسے جہاد بالقلب، جہاد باللسان، جہاد بالمال وغیرہ۔ اور جہاد بالسیف کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا ہے۔ لہٰذا منکرات و فواحش کی روک تھام حسب استطاعت ہر مسلمان کے ذمہ ضروری ہے اور اس کے لئے ہم کو سر بکف ہو جانا چاہئے۔ اسی مقصد کے لئے انبیائے کرام کی بعثت ہوئی تھی اور یہی دین اسلام کا خلاصہ اور جوہر ہے۔

بقیہ : عرضِ احوال

یہ کہ میرے نام کے ساتھ "مدظلہ" جڑ دیا' جو اصلاً آپ کے نام کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ بنا بریں میں محجوب ہو گیا۔) تاہم "ندائے خلافت" ہی میں آپ کی ایک گفتگو کا حوالہ میرے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ چنانچہ اس عریضے کی تحریر کی "جرات" میں بھی اس کو کسی قدر دخل حاصل ہے!

دعا کا طالب

اسرار احمد عفی عنہ

☆ ☆ ☆

۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

۱۹/ نومبر ۱۹۹۵ء

مخدومی مولانا! دام ظلکم!!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

اب سے لگ بھگ تین ہفتے قبل شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی معیت میں آپ کی خدمت میں حاضری ہوئی تھی تو ہم دونوں نے محسوس کیا تھا کہ آپ پر (کم از کم اس وقت) نقاہت کا شدید اثر ہے' بنا بریں گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لئے ہم تو تھوڑی دیر بیٹھ کر اور آپ کی مزاج پرسی ہی پر اکتفا کرتے ہوئے واپسی کے لئے اٹھنے لگے تھے' لیکن اچانک آپ نے سوال کر لیا کہ "آپ لوگوں کے آنے کا مقصد کیا تھا؟" لیکن چونکہ اُس وقت میں ایک دوسری مصروفیت کے باعث مزید زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا لہٰذا میں نے سکوت ہی مناسب سمجھا۔ خیال تھا کہ چونکہ اس وقت بھی آپ سے برادرم نعمان صاحب تحریراً ہی گفتگو کر رہے تھے' لہٰذا میں بھی آپ کے سوال کا جواب تحریراً ہی ارسال کر دوں گا۔ تاہم اس میں مصروفیات کے باعث تاخیر ہو گئی۔

اب گزارش ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری کا اہم ترین سبب تو آپ سے نیاز مندی اور احسان مندی کا اظہار ہے جسے میں جاری رکھنا چاہتا ہوں اور ع "خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو!" کے مصداق حاضری دیتے رہنا چاہتا

ہوں' الا یہ کہ آپ گرانی محسوس کریں! اگر خدانخواستہ ایسا ہو تو آپ برادرم نعمان صاحب کے ذریعے مطلع فرما دیں!

ویسے اُس روز میں اپنی ان گزارشات کا جواب بھی چاہتا تھا جو میں نے اپنے گزشتہ عریضے کے ذریعے پیش خدمت کی تھیں۔ بعد میں مجھے ان کا جواب برادرم نعمان صاحب سے مل گیا ـــــ یعنی یہ کہ (۱) آپ "رجم" کے بارے میں اپنی رائے پر جازم ہیں' اور (۲) اسی طرح "دعوت دین اور اِس کا طریق کار" میں درج جملہ نظریات و آراء پر بھی قائم ہیں ـــــ پہلی بات کے ضمن میں تو ع "اِک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!" کے مصداق آپ سے بھی گزارش ہے کہ نظر ثانی فرمائیں اور اللہ سے بھی دعا ہے کہ آپ کے ذہن اور قلب کو پھیر دے' تاہم آئندہ آپ سے تو دوبارہ کچھ عرض نہیں کروں گا ـــــ البتہ اللہ تعالیٰ سے دعا جاری رہے گی ـــــ رہی دوسری بات تو اس پر خوشی بھی ہوئی اور اللہ کا شکر بھی ادا کیا۔ اتنی سی "خواہش" مزید ہے کہ اِس بات کو برادرم نعمان صاحب کو املا کرا دیں تو بہت ممنون ہوں گا۔

باقی آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟" تو میں اسے آنحضور ﷺ کے ان الفاظ مبارکہ پر محمول کرتے ہوئے جو آپؐ نے حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمائے تھے کہ : "اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ يَا مَعَاذ بِرَأْسِ هٰذَا الامرِ وَ ذروةِ السَّنامِ مِنْه" عرض کرتا ہوں کہ اگرچہ مجھے یہ اندازہ نہیں ہے کہ میرے موجودہ کاموں اور خیالات سے آپ کس حد تک آگاہ ہیں اور پچھلی باتیں بھی کتنی یاد رہ گئی ہیں' تاہم جو بھی معلومات آپ کے ذہن میں ہوں ان کی بنا پر جو "نصائح" بھی للہ وفی اللہ آپ مجھے کرنا چاہیں برادرم نعمان صاحب کو اِملا کرا دیں۔ میں بہت ممنون اور مشکور ہوں گا اور ان سے حتی الامکان استفادے کی کوشش کروں گا۔ فقط والسلام

دُعا کا طالب

اسرار احمد عفی عنہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد : ۴۷

شمارہ : ۴

ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ

اپریل ۱۹۹۸ء

فی شمارہ ۱۰/-

سالانہ زرِ تعاون ۱۰۰/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' افریقہ' ایشیا یورپ' جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران' ترکی' اومان' مسقط' عراق الجزائر' مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت : 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700۔فون : 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون : 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ' مرکزی انجمن' طابع : رشید احمد چودھری' مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

یہ بات اکثر قارئین کے علم میں ہو گی کہ ان دنوں امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ اپنے گھٹنوں کے بڑے آپریشن کے سلسلہ میں ملک سے باہر ہیں۔ گھٹنوں کی تکلیف گزشتہ تین چار سال سے بہت شدت اختیار کر چکی تھی اور ماہر معالجین تین سال قبل اس رائے تک پہنچ چکے تھے کہ "تبدیلیٔ گھٹنا" یعنی "Total Knee Replacement" ہی مسئلے کا واحد حل ہے۔ اکثر معالجین کی رائے یہ تھی کہ اس آپریشن میں تاخیر غیر مناسب ہو گی۔ تاہم بعض وجوہات کی بنا پر اس آپریشن میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ ان میں ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ امیر محترم شروع میں اس بارے میں متردد رہے کہ یہ آپریشن پاکستان میں کرایا جائے یا امریکہ میں ـــــ امریکہ میں مقیم رفقاء و احباب کے حلقے میں شامل ڈاکٹر اور سرجن حضرات کا اصرار تھا کہ آپریشن کے سلسلے میں جو سہولتیں اور خصوصاً بعد از آپریشن نگہداشت اور فوری ضروری علاج کا جتنا عمدہ انتظام امریکہ میں ہے اس کا عشر عشیر بھی پاکستان میں دستیاب نہیں ہے لہٰذا یہ سوچنا ہی غلط ہو گا کہ یہ آپریشن پاکستان میں کرایا جائے۔ تاہم گزشتہ سال کے وسط تک امیر تنظیم کا فیصلہ تھا کہ وہ پاکستان ہی میں آپریشن کرائیں گے اور اس ضمن میں معروف آرتھوپیڈک سرجن ڈاکٹر عامر عزیز سے مسلسل رابطہ تھا جو ہر طرح سے تعاون کیلئے تیار ہی نہیں بے تاب تھے ـــــ لیکن گزشتہ سال نومبر میں تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کے کنونشن کے موقع پر وہاں کے بعض سینئر رفقاء نے امیر محترم کے آپریشن کے حوالے سے نہایت جذباتی بلکہ رقت آمیز تقاریر کیں۔ امیر محترم نے ۱۴ جنوری کو قرآن اکیڈمی کراچی سے رفقاء تنظیم کے نام جو مفصل خط تحریر کیا تھا جو بعد میں "ندائے خلافت" میں شائع بھی ہوا' اس میں اس معاملے کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے :

> "میرے گھٹنوں کے عارضے کے ضمن میں تو تنظیم کے ملتزم رفقاء کی عظیم اکثریت نے تو فیصلہ دے ہی دیا تھا کہ اب آپریشن میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہئے اور یہ آپریشن امریکہ ہی میں کرایا جانا چاہئے۔ تاہم میں خود اور میرے جملہ اہل خانہ

خصوص میری اہلیہ نومبر ۹۷ء کے اواخر تک اس پر جازم تھے کہ اپریشن لاہور ہی میں کرایا جائے گا۔ لیکن اواخر نومبر میں تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کا جو سالانہ اجتماع ہوسٹن (ٹیکساس' امریکہ) میں ہوا۔ اس میں تنظیم کے ملتزم رفقاء کا جو خصوصی اجلاس منعقد ہوا اس کے بعد مجھے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ اس لئے کہ اس موقع پر متعدد سینئر رفقاء نے جس اصرار و الحاح بلکہ رقت آمیز انداز میں مجھ سے اپیل کی (یہاں تک کہ بعض رفقاء بالفعل رونے بھی لگے' جس پر خود میں بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا) اس پر سوائے "سپر انداختن" کے کوئی اور طرز عمل ممکن ہی نہیں تھا (رقت کے باعث بولنا بھی ممکن ہی نہیں تھا!)۔ البتہ بعد میں' میں نے اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ میں اس پورے معاملے کو "سپردم تو مایہ خویش را" کے انداز میں اولاً اللہ تعالیٰ کے اور ثانیاً بالکلیہ تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کے حوالے کرتا ہوں ـــــ ادھر وہ حضرات تو جیسے سبز جھنڈی کی ذرا سی حرکت ہی کے منتظر تھے۔ چنانچہ جھٹ پٹ فیصلہ ہو گیا کہ میرے پہلے سے اعلان شدہ پروگراموں کی تکمیل کے فوراً بعد ـــــ یعنی لگ بھگ مارچ ۱۹۹۸ء میں ڈیٹرائٹ کے مشہور ہنری فورڈ ہاسپٹل میں آپریشن کرایا جائے گا"۔

بحمد اللہ' طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۶ مارچ کو پاکستانی وقت کے مطابق ساڑھے نو بجے شب امریکہ کے شہر ڈیٹرائٹ میں امیر محترم کے دونوں گھٹنوں کا بیک وقت آپریشن ہوا۔ یہ آپریشن قریباً ۴ گھنٹوں پر محیط تھا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ آپریشن کے بعد تین چار روز اگرچہ خاصی تکلیف میں گزرے اور پیٹ میں اپھارے کی شکایت بھی رہی تاہم کوئی بڑی پیچیدگی بحمد اللہ پیدا نہیں ہوئی۔ حال ہی میں امیر محترم سے جو رابطہ ہوا ہے اس سے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اب تکلیف میں خاصا افاقہ ہے۔ ڈیٹرائٹ میں امیر محترم کے خصوصی معالج ڈاکٹر سراج الحق نے تازہ ترین صورتحال کے بارے میں ای میل کے ذریعے جو اطلاع رفقاء تنظیم کے نام بھیجی ہے وہ حسب ذیل ہے :

"محترم ڈاکٹر صاحب آپریشن کے بعد صحت یابی کے مرحلے میں ہیں۔ سرجری کے بعد پیش آنے والے معمول کے مسائل کے علاوہ کوئی بڑی پیچیدگی نہیں ہوئی

ہے۔ آج محترم ڈاکٹر صاحب بستر سے اتر کر آٹھ دس قدم چلے تھے۔ فزیو تھراپی شروع کرنے کے سلسلے میں وہ زیادہ رضامند نہیں ہیں' لیکن یہ بہت ضروری ہے تاکہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو سکیں اور سرجری کی پیچیدگیاں رونما نہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ان کو اس سلسلے میں تھوڑا سا Push کرنا پڑے گا۔ فی الحال میں فون کالز یا ملاقاتوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا"۔

محمد سراج الحق' ڈیٹرائٹ

آپریشن سے متصلاً قبل ۲۴ مارچ کو امیر محترم نے رفقاء کے نام ایک اور مفصل خط بذریعہ فیکس ہمیں ارسال کیا تھا جو یکم اپریل کے "ندائے خلافت" میں "آپریشن سے قبل امیر تنظیم اسلامی کا آخری خط" کے عنوان سے شائع کر دیا گیا ہے۔ جو احباب اس خط سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ مذکورہ "ندائے خلافت" کا مطالعہ ضرور فرما لیں"۔

LMI

سلسلۂ تقاریر ——— منہج انقلابِ نبویؐ ——— خطاب سوم

تصادم کا مرحلۂ اوّل

صبرِ محض اور عدم تشدّد

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن)

حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے دین کا اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا انقلابی پہلو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ ہم نے نوعِ انسانی کے عظیم ترین انقلابی جناب محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس پر تقدس' احترام اور تعظیم کا ایک ہالہ اس انداز سے قائم کیا ہوا ہے کہ ہم نے اپنے ذہنوں میں ایک مافوق الفطرت (Super Human) شخصیت کا ہیولیٰ اور نقشہ جما رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے عقیدت و عظمت کا احساس تو پوری طرح موجود ہے لیکن یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ انقلاب کس طور سے برپا فرمادیا' اور سطحِ زمین پر حضورؐ کی جدّوجُہد کن مراحل سے گزری ہے اور حضورؐ نے قدم بقدم خالص انسانی سطح کی کشمکش سے گزر کر اور ہر مرحلہ پر مصائب و شدائد' تکالیف اور مشکلات جھیل کر کس طریقے پر اسلامی انقلاب کو تکمیل تک پہنچایا ہے' ان اہم امور کا ہم نے جائزہ ہی نہیں لیا۔ اس لئے کہ اس پہلو سے حضورؐ کا اتباع ہمارے پیش نظر ہی نہیں رہا۔ یہ تو اُس وقت ہوگا جب کہ دل میں یہ عزم پیدا ہو جائے کہ اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے۔ تب انسان سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا خاص طور پر اس پہلو سے مطالعہ کرے گا کہ وہ کیا اہم نشاناتِ راہ (Land Marks) ہیں جو ہمیں سیرت مبارکہ سے اسلامی انقلابی عمل کے لئے ملتے ہیں۔

ایک الزام کی وضاحت

تصادم کے مراحل کے ذکر سے پہلے دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ ہمیں لفظ تصادم سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ دنیا کے سامنے ہمارا انداز جو معذرت خواہانہ اور apologetic رہا ہے کہ اسلام میں تو صرف مدافعانہ جنگ ہے' تصادم اور جارحیت نہیں ہے' اس کو پہلے اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے۔ اس کا باعث اغیار کا یہ شدید اعتراض تھا کہ یہ مسلمان قوم بڑی خونی قوم ہے اور اسلام کی جو بھی اشاعت و تبلیغ ہوئی ہے وہ تلوار کے زور سے ہوئی ہے ع "بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"۔ اغیار نے ہم پر یہ تہمت اس شدومد سے لگائی کہ ہم ہاتھ جوڑتے ہی رہ گئے اور معذرت کے انداز سے اس الزام کو اپنے سر سے اتارنے میں حد سے تجاوز کر گئے۔ یہ انداز اب بالکل بدل جانا چاہئے۔ اور الحمدللہ ہمارے بہت سے اصحاب علم و فضل کی مدلل تحریروں کی بدولت بڑی حد تک یہ انداز بدل بھی گیا ہے۔ لیکن ایسے نام نہاد دانش وروں کی ابھی اچھی خاصی تعداد خود ہمارے یہاں موجود ہے جن کے ذہنوں پر سابقہ دور میں بنی ہوئی فضا کی چھاپ ابھی موجود ہے اور وہ اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جنگ ہے' اسلام میں کوئی جارحانہ جنگ نہیں ہے' حضورؐ نے صرف مدافعت کے لئے جنگ لڑی ہے' حضورؐ نے کبھی بھی پیش قدمی کر کے جنگ کا آغاز نہیں کیا' وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں جس انداز سے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہیں اصل میں وہ انداز بالکل غلط ہے' اِس کو بالکل ختم ہونا چاہئے۔

تصادم کا آغاز انقلاب کے علمبردار کرتے ہیں

یہ حقیقت ہے کہ کوئی انقلابی تنظیم یا انقلابی جماعت جب کسی معاشرے میں اپنی دعوت کا آغاز کرتی ہے تو محض یہ دعوت کا آغاز ہی اس کی طرف سے تصادم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلاب اسی کا نام ہے کہ کوئی کھڑا ہو کر کہے کہ یہ نظام جو چل رہا ہے یہ سراسر غلط نظام ہے۔ جب رائج الوقت نظام کو غلط کہہ دیا جائے اور اس عزم کا اظہار کر دیا جائے کہ اس کو بدلنا ہوگا تو تصادم کا آغاز تو کر دیا گیا۔ اس لئے کہ جو مراعات

یافتہ طبقات ہیں، جن کے Vested Interests اس باطل نظام سے وابستہ ہیں، ان کی عافیت تو اسی میں ہے کہ رائج الوقت نظام قائم رہے، Status Quo برقرار رہے، دبے ہوئے طبقات جن بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں انہی میں بندھے رہیں، جس طرح کی جکڑ بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں انہی میں جکڑے رہیں۔ ظالم اور استحصالی طبقات ہرگز نہیں چاہیں گے کہ وہ جن ناجائز حقوق کے مالک ہیں وہ ان سے چھن جائیں۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ نظام جیسا بھی ہے ویسا ہی رہے۔ جبکہ آپ کہتے ہیں کہ یہ نظام غلط ہے، اس کو ہم تبدیل کر کے رہیں گے یا اس جدّوجہد میں ختم ہو جائیں گے۔ پس تصادم کا آغاز تو آپ نے کیا۔ جو بھی ہو، چاہے وہ فردِ واحد ہو، یا کوئی گروہ یا کوئی جماعت ہو۔ اگر آپ اس نظام کو غلط کہہ کر اس کی تردید کر رہے ہیں، اسے ظالمانہ اور استحصالی کہہ رہے ہیں، اس کو ختم کرنے کا داعیہ لے کر سامنے آئے ہیں تو گویا آپ نے رائج الوقت نظام کو چیلنج کیا ہے۔

یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ تصادم کا آغاز ہمیشہ انقلابی دعوت دینے والوں کی طرف سے ہوتا ہے، چاہے وہ کوئی فرد ہو، گروہ ہو، یا جماعت ہو۔ اگرچہ وہ جماعت ہاتھ نہیں اٹھاتی، وہ کسی کو گالیاں نہیں دیتی، کسی کو کسی نوع کی جسمانی تکلیف نہیں پہنچاتی، لیکن وہ یہ دعوت لے کر اٹھتی ہے کہ پورا نظام غلط اور فاسد ہے اور اس داعیہ کا اظہار کرتی ہے کہ یا تو اس نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اپنے نظریہ کی بنیاد پر بالکل نیا نظام قائم کر کے رہیں گے یا اسی کوشش اور جدوجہد میں ہم اپنی جانیں دے دیں گے۔ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر تصادم کا آغاز فرمایا کہ "تمہارا مذہب غلط، تمہارا معاشرہ غلط، تمہارے اخلاق غلط، تمہارا پورا نظام غلط"۔ یہ صدیوں سے قائم و رائج نظام سے بغاوت ہے۔ یہ ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو اس نظام میں قیادت و سیادت کے مناصب پر فائز ہیں اور جو اس نظام سے ناجائز اور استحصالی طور طریقوں سے انتفاع کر رہے ہیں۔ پس تصادم کا آغاز داعئ انقلاب کرتا ہے اور وہ جماعت کرتی ہے جو اس دعوت کو قبول کر کے داعی انقلاب کے اعوان و انصار پر مشتمل ہوتی ہے۔

انقلابی جدوجہد کے ابتدائی مراحل اور اس کے بعد تصادم کے مرحلے کو علامہ اقبال کا یہ شعر بڑے اچھے انداز میں واضح کرتا ہے۔

با نشّۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

اب جبکہ افراد پختہ ہو گئے تو اب اپنے آپ کو سلطنتِ جم پر دے ماریں۔ یہاں "سلطنتِ جم" سے بطور استعارہ وہاں کا رائج نظام مراد ہے۔ انقلاب اسی طرح آئے گا۔ اگر وہ طاقت محفوظ پڑی رہے' وہ Potential جو فراہم ہوا ہے وہ غیر متحرک اور غیر فعال رہے تو ظاہر بات ہے کہ انقلاب نہیں آسکے گا۔ للذا اس شعر سے بھی اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ تصادم کا آغاز درحقیقت انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے اور تصادم انقلاب کا ناگزیر خاصہ ہوتا ہے۔

صبر محض اور عدم تشدد کا مرحلہ

درحقیقت تصادم کا آغاز تو اسی لمحہ ہو جاتا ہے جس لمحہ انقلابی دعوت شروع ہوتی ہے' لیکن ابھی اس انقلابی جماعت کو کچھ مہلت درکار ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی دعوت کی توسیع کر سکے' اپنے دعوتی Base کو وسیع کر سکے' لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اسے قبول کریں' اس جماعت میں شامل ہوں۔ پھر ان کی تربیت ہو' ان کو منظم کیا جائے۔ اس کام کے لئے بڑا وقت اور مہلت درکار ہے۔ جس کو انگریزی میں کہتے ہیں "to buy time" یعنی اپنے دشمنوں سے وقت کو خریدنا ہے' ان سے کچھ مہلت لینی ہے۔ للذا پہلا مرحلہ ہوتا ہے صبر محض یعنی Passive Resistance کا۔ معاندین و مخالفین داعی کو پاگل' دیوانہ' مجنوں اور بیوقوف کہیں گے' مگر حکمت دعوت کا تقاضا ہے کہ ان سب کو برداشت کیا جائے اور جواباً زبان سے کوئی نازیبا جملہ نہ نکلے' ان مخالفین کے تمام استہزاء و تمسخر کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے' مصابرت و استقامت کا مظاہرہ ہو' اپنے موقف پر ڈٹ کر دعوت و تبلیغ کا فرض کماحقہ ادا ہوتا رہے۔ جب مخالفین اس میں ناکام ہو جائیں گے اور دیکھیں گے کہ انہوں نے جس کو مشتِ غبار سمجھا تھا اور اسے چٹکیوں میں اڑانا چاہا تھا' وہ تو زبردست آندھی بنتی نظر آرہی ہے' عام لوگوں خاص طور پر نوجوانوں کو متاثر کر رہی ہے اور وہ داعی کے اعوان و انصار بن کر اٹھ رہے

ہیں' تو پھر مخالفین آگے بڑھیں گے۔

اس طرح دوسرا مرحلہ تشدد کا شروع ہوتا ہے۔ معاندین دعوت قبول کرنے والوں پر ستم اور مصائب کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ دہکتی آگ پر ننگی پیٹھ لٹاتے ہیں۔ مکہ کی سنگلاخ اور توے کی طرح تپتی ہوئی زمین پر کھینچتے ہیں۔ برچھی سے ایک مظلوم خاتون کو نہایت بہیمانہ طور پر ہلاک کرتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ پاؤں سرکش اونٹوں سے باندھ کر اونٹوں کو بھگاتے ہیں کہ جسم کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ کسی کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں چھوڑتے ہیں۔ کسی کو مادر زاد ننگا گھر سے نکال دیتے ہیں۔ کسی کو اتنا پیٹتے ہیں کہ بس مرنے کی کسر رہ جاتی ہے۔ داعی الی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دست درازی کرتے ہیں۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں۔ آپؐ کے گھر میں غلاظت پھینکنا معمول بنا لیتے ہیں۔ آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے ہیں کہ چشم ہائے مبارک ابل پڑتی ہیں۔ آپؐ کی پشت مبارک پر عین سجدہ کی حالت میں اونٹ کی نجاست بھری اوجھری رکھ دیتے ہیں۔ آپؐ پر پتھروں کی اس قدر بارش ہوتی ہے کہ جسم اطہر لہولہان ہو جاتا ہے۔ آپ کا معاشی مقاطعہ ہوتا ہے اور آپؐ کو تین سال تک آپؐ کے قبیلے کے تمام لوگوں کے ساتھ' چاہے انہوں نے دعوت قبول کی ہو یا نہ کی ہو' ایک وادی میں محصور کر دیا جاتا ہے ـــــ لیکن حکم ہے کہ معاندین و مخالفین کے ان تمام متشددانہ طرز عمل کو برداشت کرو' جواب میں اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ مت اٹھاؤ۔ البتہ اپنے موقف پر ڈٹے رہو' اس سے پیچھے نہ ہٹو' کوئی بھی معافی اور توبہ نامہ دے کر ان مصائب سے بچنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ لیکن ہاتھ اٹھانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ جواب میں تشدد کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ہے صبر محض۔

صبر محض کا یہ مرحلہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں مسلسل بارہ برس تک جاری رہا۔ اور اس بارہ سال کے عرصہ میں اس بہیمانہ تشدد کی وجہ سے نہ تو کسی نے کمزوری دکھائی' نہ اپنے موقف سے ہٹا اور نہ ہی کسی نے جواباً ہاتھ اٹھایا۔ حالات میں عام طور پر لوگ desperate ہو کر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ کمال ہی نہیں معجزہ ہے جناب محمد ﷺ کی تربیت و تزکیہ کا' کہ ایک شخص نے بھی آپؐ کے حکم اور

ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کی۔ نہ کوئی اپنے موقف سے ہٹا اور نہ کسی نے جواب میں ہاتھ اٹھایا۔ یہ اہم ترین وقت تھا۔ یہی مہلت تھی جسے محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بھرپور طریقے پر استعمال فرمایا۔ حق تو یہ ہے کہ ہمیں سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے پورا فلسفۂ انقلاب سیکھنا ہے اور وہیں سے ہمیں اصول اخذ کرنے ہیں۔

"صبرِ محض" کی حکمت

اس صبرِ محض (Passive Resistance) کے مرحلہ کی حکمت یہ ہے کہ ابتداء میں چند باہمت اور سلیم الفطرت لوگ اس انقلابی نظریہ کے قائل اور حامی ہوتے ہیں۔ اگر وہ لوگ Violent ہو جائیں، یعنی تشدد کا جواب تشدد سے دینے لگیں تو اس غلط نظام کے علمبرداروں کو پورا اخلاقی جواز مل جائے گا کہ انقلاب کے حامیوں کو کچل کر رکھ دیں۔ جب تک انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھایا تو ان مخالفین و معاندین کے چودھریوں اور سرداروں کے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ اس حال میں اگر وہ تشدد کر رہے ہیں تو بلاجواز کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رفتہ رفتہ عامّۃ الناس کی ہمدردیاں اس انقلابی جماعت کے ساتھ ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں کو آخر کیوں مارا اور ستایا جا رہا ہے، جبکہ یہ ہمارے معاشرے کے شریف، بے ضرر اور بہتر افراد میں سے ہیں۔ اور یہ لوگ خاموشی سے کیوں ماریں کھا رہے ہیں! اب ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے کہ حضرت بلالؓ کو مکّہ کی سنگلاخ اور تپتی زمین پر گردن میں رسی باندھ کر اس طرح گھسیٹا جا رہا ہے جیسے کسی مُردہ جانور کی لاش کو گھسیٹا جاتا ہے۔ آخر دیکھنے والے بھی انسان تھے۔ ان کے اندر بھی احساسات تھے! اگرچہ ان میں جرأت اور ہمت نہیں کہ اس بہیمانہ ظلم پر صدائے احتجاج بلند کریں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں خاموش اکثریت (Silent Majority) کہا جاتا ہے۔ یہ خاموش اکثریت اندھی اور بہری نہیں ہوتی۔ دیکھتی بھی ہے اور سنتی بھی ہے۔ خاموش تو ہے، بولتی نہیں ہے، لیکن وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہتی ہے کہ یہ کیسا ظلم ہو رہا ہے؟ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ بلالؓ جیسے محنتی اور فرض شناس غلام کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں ہو رہا ہے! خبابؓ جیسے شریف

النفس شخص کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر کیوں لٹایا جا رہا ہے۔ خبابؓ بن ارت پیشے کے اعتبار سے لوہار تھے اور بڑے ہی نیک نوجوان تھے۔ حضورؐ کے دامن سے وابستہ ہو کر کردار مزید بلند ہو گیا۔ مکہ کے سرداران ایمان لانے کی پاداش میں ان کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیتے تھے۔ مکہ کے اندر یہ ظلم اہل مکہ دیکھ تو رہے تھے۔ مگر ظلم کرنے والے ابو جہل' ولید بن مغیرہ' اُمیہ بن خلف' عقبہ بن ابی معیط اور عتبہ بن ربیعہ وغیرہ بڑے بڑے چوہدری اور سردار تھے۔ ان کے خلاف آواز اٹھانا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تو عوام کا ان کے خلاف کھڑے ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لیکن اندر ہی اندر ہمدردی کے احساسات پیدا ہو رہے تھے' بقول شاعر کیفیت یہ ہو رہی تھی کہ ع "جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ"۔ چنانچہ دل اندر ہی اندر فتح ہو رہے تھے۔ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان مظلوموں نے کوئی جرم نہیں کیا' کسی کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی' بس ایک بات کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ بس یہی ان کا قصور ہے۔ کسی پر انہوں نے آج تک ہاتھ نہیں اٹھایا' کسی کو انہوں نے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا' پھر ان کے ساتھ یہ ظلم اور تشدد کیوں ہو رہا ہے۔

اصل میں صبر محض کے مرحلے کی حکمت اور اس کا فلسفہ یہی ہے۔ کسی انقلابی جماعت کو اس "صبرِ محض" (Passive Resistance) کے دور میں تین ابتدائی کاموں کو کرنے کی مہلت ملتی ہے۔ یعنی دعوت زیادہ سے زیادہ پھیلانا' دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کرنا اور پھر اس مرحلے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی تربیت کرنا۔ اس لئے کہ اگلے مراحل کی کامیابی کا انحصار انہی لوگوں پر ہے۔ گویا اگلے تمام مراحل کی کامیابی کا دارومدار ان تمہیدی و ابتدائی مراحل کی پختگی پر ہے۔ اگر ان مراحل کے تقاضوں کو کماحقہ ادا کیا گیا ہے اور انقلابی کارکنوں کی سیرت و کردار میں پختگی اور مضبوطی آگئی ہے تب تو آگے چل کر کامیابی ہو گی' ورنہ وہی بات ہو گی کہ ریت کا گولہ بنا کر شیشے پر ماریں گے تو شیشہ کھڑا رہے گا اور وہ ریت بکھر جائے گی ـــــ پھر ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ ماریں کھا کر لیکن ہاتھ نہ اٹھا کر ایک طرف ان کارکنوں میں قوت برداشت اور قوت ارادی پروان چڑھتی ہے' اپنے نظریہ سے ان کی وفاداری مضبوط ہوتی ہے اور اس پر انہیں

استقامت حاصل ہوتی ہے' جیسے خام سونا کٹھالی میں تپ کر کندن بنتا ہے اسی طرح ان انقلابی کارکنوں میں مظالم و مصائب کی بھٹیوں سے گزر کر ایک آہنی عزم اور پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ جور و تعدّی' یہ تشدد اور ظلم و ستم جھیل کر یہ لوگ معاشرہ کی خاموش اکثریت کے دل جیتتے چلے جاتے ہیں۔

داعی کی کردار کُشی اور نفسیاتی حربے

اس صبرِ محض کے بھی دو مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں زبانی کلامی تشدد ہوتا ہے۔ یعنی کوفت پہنچاؤ' ذہنی اذیت پہنچاؤ' لیکن کوئی جسمانی تشدد اور جسمانی تکلیف نہ دو۔ اس مرحلہ پر اصل ہدف اور نشانہ خود داعی بنتا ہے' اس کے ساتھی ہدف نہیں بنتے۔ اسلئے کہ ابتداء میں لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص ہے جس کا دماغ خراب ہوا ہے اور یہ ہمارے نوجوانوں کے دماغ خراب کر رہا ہے۔ ان نوجوانوں کو تو انہوں نے reclaim کرنا ہے' انہیں واپس لینا ہے' لہٰذا اُنکے خلاف ابھی ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے بلکہ داعی کی شخصیت کو مجروح کرنے (Character Assassination) کی کوشش ہوگی۔ کہا جائے گا پاگل ہے' fanatic ہے' ساحر ہے' شاعر ہے اور دیوانہ ہے۔ سیرتِ مطہرہ میں یہ ساری ہی باتیں ملتی ہیں' جن کا تذکرہ ابتدائی مکی سورتوں میں آتا ہے۔ مکی دور کے قریباً تیرہ برس کے ابتدائی تین سال میں صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تشدد ہوا ہے اور تشدد جسمانی نہیں بلکہ صرف زبانی کلامی تشدد کہ ان کو کوفت پہنچاؤ' انہیں ذہنی اذیت پہنچاؤ۔ جیسے کہ قرآن مجید میں سورۃ الحجر میں ان معاندین و مخالفین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے : "یٰاَیُّھَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ" اگر عربی زبان سے ذرا سی واقفیت ہو تو اندازہ ہو گا کہ کتنا زہر میں بجھا ہوا یہ جملہ ہے : "اے فلانے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی ذکر نازل ہو رہا ہے' ہم تو تم کو پاگل سمجھتے ہیں۔" اب یہ بات بھی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنی۔ غور کیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر اس کا کس قدر اثر ہوا ہو گا۔ اس کو کہتے ہیں اعصابی جنگ (War of Nerves) یعنی

کسی طرح سے ان کی قوت ارادی کو ختم کر دو' ان کے اندر جو آہنی عزیمت ہے کسی طرح اس کو پگھلا کر رکھ دو۔ اسی سورۃ الحجر کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں : وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۞ "(اے محمد ﷺ) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس سے آپؐ کا سینہ بھنچنے لگتا ہے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید ذہنی اذیت و کوفت ہوتی ہے)"۔

داعی سوچتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو کل تک میرے قدموں تلے آنکھیں بچھاتے تھے' جو مجھے دیکھتے ہی کہا کرتے تھے : جَاءَ الصَّادِق' جاءَ الاَمِینُ ــــ ہر جگہ خیر مقدم ہوتا تھا' ہر ایک مجھ سے محبت کرتا تھا' ہر شخص میرا احترام کرتا تھا' لیکن یہی لوگ ہیں جو آج میرا استہزاء و تمسخر کر رہے ہیں' کوئی مجنون و دیوانہ کہہ رہا ہے' کوئی شاعر و ساحر کہہ رہا ہے۔ سورۃ الدخان میں فرمایا : وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۞ "اور انہوں نے کہا کہ یہ تو (معاذ اللہ) سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ یعنی آپؐ کو کوئی اور سکھاتا پڑھاتا ہے اور یہ آکر ہم پر دھونس جماتے ہیں کہ یہ کلام مجھ پر اللہ کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ حضور ﷺ کے قلب مبارک پر کیا گزرتی ہوگی جب یہ باتیں کہی جاتی ہوں گی۔ مزید برآں آپؐ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک روز حضورؐ کی خدمت میں عتبہ بن ربیعہ آیا جو قریش کے بڑے سرداروں اور چودھریوں میں سے تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے معاندین و مخالفین میں سے یہ شخص بڑا شریف النفس تھا۔ وہ بڑے ہی مخلصانہ و مشفقانہ اور بڑے ہی مربیانہ و ہمدردانہ انداز میں حضورؐ سے کہنے لگا کہ "بھتیجے! اگر واقعی تم پر کسی بدروح کا سایہ ہو گیا ہے تو مجھے بتا دو' میرے بہت سے عاملوں اور ماہر فن کاہنوں سے تعلقات ہیں' میں کسی کو بلا کر تمہارا علاج کرا دوں گا"۔ غور کا مقام ہے کہ یہ سن کر حضورؐ کے قلب مبارک پر کیا گزری ہوگی۔ تشدد کا پہلا نشانہ بحیثیت داعی اول جناب محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس تھی۔ استہزاء و تمسخر بھی بلاشبہ تشدد ہوتا ہے' بلکہ ذہنی اور نفسیاتی کوفت سے بڑا تشدد کوئی اور نہیں۔ جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ تکلیف انسان کو اس وقت ہوتی ہے جب اسے ذہنی کوفت پہنچتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی تین سال تک اعصاب شکنی کی پوری کوشش ہوتی رہی

آپ کے اعصاب ٹوٹ کر رہ جائیں اور آپ میں وہ ہمت باقی نہ رہے کہ کھڑے رہ کر دعوت پیش کرتے رہیں۔ مخالفین کی طرف سے اس کی ایک اور انداز سے بھی کوشش ہوئی تھی۔ بعض عامل لوگوں نے بہت سی ریاضتوں کے ذریعہ سے اپنی آنکھوں کے اندر ایک خاص کشش اور چمک پیدا کرلی ہوتی ہے اور قوتِ ارادی کو اپنی آنکھوں میں اس طور سے مرتکز کرلیا ہوتا ہے کہ وہ کسی کو گھور کر دیکھیں تو وہ ذہل کر رہ جائے اور اس کی قوت ارادی پاش پاش ہو جائے۔ یہ نفسیاتی مشقیں دنیا میں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور آج کے دور میں تو اس نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کرلی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر ایسی کوششیں بھی کی گئیں۔ سورۃ القلم میں فرمایا گیا ہے :

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ۝ " یہ کفار جب "الذکر" یعنی قرآن سنتے ہیں تو یہ آپ کو ایسی نگاہوں سے گھور کر دیکھتے ہیں گویا آپ کے قدم اکھاڑ دیں گے (آپ کی آہنی قوت ارادی کو پاش پاش کر دیں گے) اور زبان سے کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) یہ ضرور مجنون و دیوانہ ہے۔"

استہزاء و تمسخر کے یہ الفاظ آپ کے قلب مبارک پر تیر کی طرح جا کر لگ رہے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے عاملین کی باقاعدہ خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ اپنی نگاہوں سے جناب محمد ﷺ کی قوتِ ارادی کو پاش پاش کر کے رکھ دیں۔ بس یہ ہے تشدد کا پہلا دور یعنی داعی اول کو ذہنی کوفت پہنچانے کی ہر امکانی سعی و کوشش۔ چنانچہ پہلے تین سال میں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی اور صاحب ایمان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا ہو۔ اس لئے کہ ظاہر بات ہے کہ ان کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے "فساد کی اصل جڑ" تو داعی اول ہی تھا جو یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا ہے۔ لہٰذا وہ کہتے تھے کہ کسی طریقہ سے اس کو اکھاڑ پھینکیں تو فساد ختم ہو جائے گا۔ ہمارے کچھ جوشیلے اور سر پھرے نوجوان ہیں اور ہمارے شرفاء میں سے بھی کچھ لوگ اس کی باتوں میں آگئے ہیں، لیکن اگر ہم نفسیاتی و ذہنی حملوں کے ذریعہ سے اسی داعی اول کو بد دل (disheart) کر دیں اور اس کی قوت ارادی کو ختم کر دیں تو یہ سب سے کامیاب حربہ ہے۔ پھر کامیابی ہی کامیابی ہے۔

جسمانی تشدّد اور تعذیب

پس پہلے تین سال تو جناب محمدؐ رسول ﷺ اس بد ترین ذہنی و اعصابی تشدد کا نشانہ بنے رہے۔ آغازِ وحی کے بعد چوتھے سال میں سردارانِ قریش دار الندوہ میں باقاعدہ مشاورت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اب تک ہم نے جو تدبیریں کی ہیں وہ سب ناکام ہو چکی ہیں اور یہ دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے۔ گویا ع "نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے" ۔ اور اب تو یہ آگ ہمارے بارود خانوں تک پہنچ گئی ہے اور ہمارے غلاموں کے طبقہ کے لوگ محمد (ﷺ) کی دعوت کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں۔ ان کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اب کیا ہو گا؟ کیونکہ غلاموں کا طبقہ اس معاشرے کے لئے بڑی افرادی قوت (Human Potential) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نظام میں غلام اپنی قسمت پر قانع تھے اور اس کے ساتھ خود کو Reconcile کر چکے تھے کہ ٹھیک ہے، ہمارے نصیب میں یہی کچھ ہے۔ لیکن اگر کہیں ان کے اندر ان کی عزّتِ نفس بیدار کر دی گئی، اور انہیں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ہم بھی انسان ہیں اور ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں تو کیا ہو گا؟ ہمارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ یہ طاقت اگر کہیں ہمارے خلاف کھڑی ہو گئی تو اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کی اس تشویش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دعوت ان کے نوجوانوں میں نفوذ کر رہی ہے جو ایک بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کون ہیں؟ خاندانِ بنو اُمیہ کا ایک صالح نوجوان۔ مصعب بن عمیر، سعد بن ابی وقاص، حذیفہ بن عتبہ اور عبد اللہ بن مسعود کون ہیں؟ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ یہ اونچے گھرانوں کے نوجوان ہیں۔ یہ اور متعدد دوسرے نوجوان محمد (ﷺ) کے قدموں میں پہنچ گئے۔ لہٰذا کفارِ مکہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب تک ہماری جو حکمت عملی تھی وہ کامیاب اور مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اب ان پر جسمانی تشدد کرو تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ ہم میں سے جس کو بھی جس کسی پر کوئی اختیار اور کوئی اقتدار حاصل ہے وہ اسے ان پر استعمال کرے اور ان کو جور و تعدی اور ظلم و ستم کا نشانہ بنائے تاکہ وہ اپنے آبائی

دین کی طرف لوٹ سکیں۔ چنانچہ آغازِ وحی کے چوتھے سال اہلِ ایمان کے لئے جسمانی تشدد کا دور شروع ہوا۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تین سال تک تو ذہنی تشدد اور Torture کا ہدف خاص طور پر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس رہی۔ لیکن اب قریباً تمام اہلِ ایمان شدید قسم کی تعذیب' تعدی اور بہیمانہ ظلم و ستم کا ہدف بنے۔ مثلاً حضرت عثمانؓ ہیں' وہ غلام نہیں ہیں' کوئی آقا تو ان کو نہیں مار سکتا۔ لیکن وہاں کے معاشرے کے اصول و رواج کے مطابق آنجنابؓ کا چچا موجود ہے جو بمنزلہ باپ ہے اور اسے اپنے بھتیجے پر اختیار حاصل ہے۔ اس نے حضرت عثمانؓ کو مارا بھی اور بالآخر ایک چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھونی دے دی۔ اب دم گھٹ رہا ہے اور مرنے کے قریب ہیں۔ آخر کوئی وجہ تھی کہ جب سن پانچ نبوی میں حضورؐ نے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہجرتِ حبشہ کی اجازت دی تو حضرت عثمانؓ اور آپؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا' جو رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر ہیں' یہ دونوں ان میں شامل تھے۔ جعفرؓ بن ابو طالب بھی ان مہاجرین میں شامل تھے جو بنو ہاشم کے سردار کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے بھائی ہیں۔ یہ لوگ غلام تو نہیں تھے۔ لیکن وہاں بزرگوں کو خوردوں پر ایک اختیار حاصل تھا' لہٰذا یہ نوجوان اہلِ ایمان اپنے گھر والے مشرکین کے تشدد اور مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔

لیکن غلاموں کے ساتھ اس سے بھی بہت آگے بڑھ کر جور و ستم کا معاملہ ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ظلم و تشدد کی چکی میں سب سے زیادہ پسنے والے وہی لوگ تھے۔ ان کے تو کوئی حقوق تھے ہی نہیں' کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کے مملوک تھے۔ ان کے آقا اگر انہیں ذبح کر دیں تو ان سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے کسی کی بکری ہو تو وہ جب چاہے اسے ذبح کر دے' کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غلاموں کے ساتھ وہاں جو کچھ ہوا اس کو سن کر سخت سے سخت دل میں بھی جھرجھری آ جاتی ہے۔ حضرت بلالؓ کے ساتھ اُمیّہ بن خلف نے جو کچھ کیا وہ آپ کے علم میں ہے۔ لیکن کوئی نہیں تھا جو اس سے پوچھ سکے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ایک گوشت پوست کے زندہ انسان کے ساتھ وہ بہیمانہ سلوک کیا جا رہا تھا جو اگر کسی مُردہ جانور کے ساتھ بھی کیا جائے تو طبیعت میں ناگواری کا احساس پیدا ہو جائے' لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

مکہ میں ان کے علاوہ ایک اور طبقہ تھا جو حلیفوں کا طبقہ کہلاتا تھا' جو نہ قرشی تھے' نہ غلام تھے' بین بین کی ایک حیثیت کے حامل تھے۔ دراصل مکہ صرف ایک قبیلہ کا شہر تھا' اس میں صرف قریش آباد تھے' اور کوئی دوسرا قبیلہ آباد نہیں تھا ـــــ اس تفاوت کو پیش نظر رکھئے کہ تمدنی اعتبار سے مدینہ منورہ زیادہ ارتقائی مرحلہ پر تھا' اس میں پانچ قبیلے آباد تھے' عربوں کے دو قبائل اوس و خزرج اور یہودیوں کے تین قبائل بنو نضیر' بنو قینقاع اور بنو قریظہ ـــــ جبکہ مکہ تمدنی اعتبار سے ابھی بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھا اور صرف ایک قبیلے کا شہر تھا۔ اب اس میں یا تو قریش آباد تھے یا اُن کے غلام جو اُن کے نزدیک بھیڑ بکریوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک تیسری کیٹیگری وہ تھی کہ کوئی شخص باہر کا آکر اگر خود کو قریش کی کسی بڑی شخصیت کی حمایت میں دے دے' اس کا حلیف بن جائے تو گویا وہ اس بڑے شخص کے زیر حفاظت مکہ میں رہ سکتا ہے۔ اس طرح اس قرشی کو اس پر پورا اختیار حاصل ہو جائے گا۔ اس کی حیثیت اگرچہ غلام کی نہیں ہے لیکن وہ پوری طرح آزاد بھی نہیں۔ وہ گویا آزادوں اور غلاموں کے بین بین ایک تیسری مخلوق ہو گئی۔

حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہی تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یمن کے رہنے والے ایک باعزت انسان تھے۔ انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں ان ؓ کو حضور ﷺ کی بعثت کی بشارت ہوئی تھی۔ اسی کے پیش نظر وہ مکہ میں آئے اور ایک شریف النفس قرشی کے حلیف بن کر اور اس کی پناہ میں آکر مکہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اسی شخص کی ایک کنیز حضرت سُمیّہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے آقا کی اجازت سے ان کا نکاح ہو گیا اور اس طرح یہ ایک خاندان بن گیا۔ وہ قرشی لاولد مر گیا اور جو شخص اس کا وارث اور جانشین بنا وہ ابو جہل تھا۔ چنانچہ اب وہی حیثیت آلِ یاسر پر ابو جہل کو حاصل ہو گئی۔ حضرت یاسرؓ غلام تو نہیں ہیں لیکن ابو جہل کے حلیف اور اس کی پناہ میں ہیں۔ اس لئے کوئی اور ابو جہل سے نہیں پوچھ سکتا کہ تم اس خاندان کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مسلسل اور بدترین تشدد کا نشانہ بننے والے یہ دو میاں بیوی اور ایک ان کے بیٹے حضرت عمارؓ ہیں۔ یہ تینوں حضور ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان پر ابو جہل نے شدید ترین مظالم کئے۔ حضرت سُمیّہ رضی اللہ عنہا کو شوہر اور بیٹے کی نگاہوں کے سامنے

انتہائی بہیمانہ طور پر شہید کیا۔ یہ ایک مؤمنہ کا پہلا خون تھا جس سے مکہ کی سرزمین لالہ زار ہوئی۔ پھر حضرت یاسرؓ کے ہاتھ پاؤں چار سرکش اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انہیں چار سمتوں میں ہانک دیا گیا جس سے انؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔

"کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ" کا حکم

مکی دور کے بارہ برس تک اہل ایمان کو یہ حکم تھا کہ کسی تشدد، ظلم، اور زیادتی کے جواب میں ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیت تو مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے اور وہ بھی مدنی دور کے پانچویں یا چھٹے سال، جس کے الفاظ ہیں : "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوا اَيْدِيَكُمْ" (النساء : ۷۷) "کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کی طرف جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو" یہ حکم مکی دور کی کسی سورت میں نہیں ملے گا ــــ یہ ایک بہت اہم مثال ہے اس بات کی کہ عمل کے اعتبار سے بسا اوقات سُنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام قرآن مجید پر مقدم ہوتی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ مدنی سورت کی ایک آیت میں ذکر ہو رہا ہے اس اسلوب سے کہ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوا اَيْدِيَكُمْ "ان سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو" تو کہنے والا کون تھا؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اس نوع کی کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم تھا جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا۔ تاہم اس میں دونوں امکانات ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حضورؐ کا اپنا ذاتی اجتہادی فیصلہ ہو۔ اس کی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفی نہیں ہوئی تو توثیق ہو گئی۔ جیسے کہ حدیث کی اقسام میں ایک "تقریری حدیث" ہے کہ حضورؐ کے سامنے ایک کام ہوا اور آپؐ نے اس سے روکا نہیں، تو اسے بھی سُنّت ہونے کی سند حاصل ہو گئی۔ اس لئے کہ اگر یہ کام غلط ہوتا تو حضورؐ اس سے منع فرما دیتے۔ تو یہ گویا اللہ کی طرف سے "تقریر" ہو گئی۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ وحی خفی یا وحی غیر متلو کے ذریعے سے حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو اور اسے آپؐ نے صحابہ کرامؓ تک پہنچا دیا ہو۔ اور بعد میں سورۂ نساء میں اس وحی خفی کا اس وحی جلی اور وحی متلو میں ذکر آ گیا کہ ان سے کہا گیا تھا : "كُفُّوا اَيْدِيَكُمْ" کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو، روکے رکھو ــــ No Retaliation۔

کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔

آگے فرمایا: "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" اُس وقت حکم یہ تھا کہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے رہو۔ یعنی تربیت ہی کا مرحلہ تھا ؂

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

ابھی "بر سلطنتِ جم زن" کا حکم نہیں آیا تھا۔ بلکہ تربیت اور تیاری کا مرحلہ تھا۔ اللہ سے زیادہ سے زیادہ لو لگاؤ۔ اللہ کی محبت دلوں میں مزید جماؤ۔ اپنے عزم و ارادہ کو اور زیادہ تقویت دو۔ اللہ کی راہ میں مصائب و تکالیف جھیلنے کا خود کو زیادہ سے زیادہ عادی اور خوگر بناؤ۔ بقول اقبال ؂

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو رہا تھا کہ ہمیں باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا چاہئے' اس سے پنجہ آزمائی کرنا چاہئے۔ چنانچہ سورۂ نساء کی اس آیت کی تفسیر میں امام رازی رحمتہ اللہ علیہ نے امام طبریؒ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں متعدد صحابہؓ مثلاً عبدالرحمن بن عوف' سعد بن ابی وقاص اور بعض دوسرے صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا نام مذکور ہے' کہ یہ وہ حضرات تھے جو بار بار حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ اب ہمیں قتال کی اجازت ملنی چاہئے' ہم کب تک برداشت کریں گے! تصور کیجئے کہ جب مکہ میں حضرت سُمیّہ رضی اللہ عنہا پر ظلم کیا جا رہا تھا جو صنفِ نازک میں سے تھیں' پھر بوڑھی بھی' تو کم از کم چالیس مسلمان موجود تھے۔ کیا ان کا خون کھولتا نہیں ہو گا؟ کیا وہ جوش میں نہ آتے ہوں گے؟ اور حضورؐ سے عرض نہ کرتے ہوں گے کہ "یارسول اللہ! آپؐ کی نام لیوا ایک بوڑھی خاتون کو اس طرح ستایا جا رہا ہے اور بے عزت کیا جا رہا ہے' تو کیا ہم بے غیرت ہیں' کیا ہم میں مردانگی کا جوہر نہیں ہے؟ ہمیں اس بربریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا چاہئے۔ لیکن اس وقت حکم یہی تھا کہ نہیں' کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ' اپنے ہاتھ بندھے رکھو' ابھی اپنے اس جوش و جذبہ کو تھام کر رکھو۔ جلد ہی

وقت آئے گا تب اپنا یہ جوش نکال لینا۔ کیونکہ انقلابی عمل کے اعتبار سے حکمتیں اسی میں ہیں کہ جوش کو تھامو اور روکو۔ صبر کرو اور جھیلو۔ مدافعت میں ہاتھ مت اٹھاؤ۔ چنانچہ حضور ﷺ جب حضرت یاسرؓ کے خاندان کے پاس سے گزرتے تو انہیں صبر کی تلقین فرماتے : ((اِصْبِرُوا یَا آلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ)) "اے یاسر کے گھر والو' صبر کرو! اس لئے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے"۔

یہ ابتدائی دور قریباً ساڑھے بارہ برس جاری رہا۔ درحقیقت یہ دور انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ناگزیر بنیادی لازمہ (Prerequisite) ہے۔ اسی میں انقلابی نظریہ و فکر کی دعوت و تبلیغ بھی ہو رہی ہے' دعوت قبول کرنے والوں کی تنظیم بھی ہو رہی ہے اور اسی میں اہل ایمان کے تزکیہ اور تربیت کے مراحل بھی طے پا رہے ہیں۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ یعنی ایک طرف ان کے روحانی تزکیہ اور ترفع کا پروگرام بھی چل رہا ہے۔ اور دوسری طرف ان کو ماریں کھانے اور مصائب جھیلنے کا خوگر بنایا جا رہا ہے اور پھر یہ کہ ان کو ڈسپلن کی پابندی کا عادی بنایا جا رہا ہے[1] جس سے ان کی قوت برداشت اور قوت ارادی کو چٹان کی مانند مضبوطی حاصل ہو رہی ہے۔ گویا تطہیرِ افکار اور تعمیرِ سیرت و کردار کے دونوں کام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ بلاشبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین (معاذ اللہ) بزدل نہیں تھے کہ خاموشی سے ماریں کھاتے رہے اور ظلم و ستم اور عقوبت و تعذیب جھیلتے رہے۔ بلکہ یہ اس لئے تھا کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کا حکم تھا کہ ہاتھ نہ اٹھائیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر صحابہ کرام کے طرز عمل کا عکاس ہے کہ ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

---

[1] غور کیجئے کہ اِس سے بڑی ڈسپلن کی پابندی اور کیا ہو سکتی ہے کہ چاہے تمہارے ساتھ یا تمہارے کسی رفیق کے ساتھ یا خود رسول اللہ داعی اول ﷺ کے ساتھ تشدد کا کتنا ہی ہولناک اور ناقابل برداشت معاملہ کیا جائے' ظلم و ستم کے کتنے ہی پہاڑ توڑے جائیں تم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اِس طرح گویا اِن کی سمع و طاعت کی تربیت بھی ہو رہی ہے۔ (مرتب)

"اپنے آپ کو مصطفیٰ ﷺ کے قدموں تک پہنچاؤ' اس لئے کہ دین تو نام ہی مصطفیٰ ﷺ کا ہے۔ اگر وہاں تک رسائی نہ ہوئی تو اس کے باہر تو بولہبی یعنی کفر' زندقہ اور ضلالت ہی ضلالت ہے"۔

یہ قرآن جس پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے' ہمیں محمد مصطفیٰ ﷺ ہی سے ملا ہے۔ یہ مجھ پر یا کسی اور پر تو نازل نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ابو بکر' عمر' عثمان' علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم) پر بھی نازل نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ پر قرآن بھی نازل ہوا اور نہ معلوم اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر مزید کیا کیا نازل فرمایا! حضورؐ کا ارشاد ہے۔ ((اُوْتِیتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ)) "مجھے قرآن بھی ملا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی مثل اور بھی ملا ہے۔" اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکمت دی ہے' بصیرت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بے پناہ صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ پھر وحی خفی ہے۔ بہت سی باتیں اللہ تعالیٰ بذریعہ الہام حضورؐ کو پہنچا رہا ہے۔ کبھی خواب کے ذریعے سے رہنمائی دی جا رہی ہے' کبھی کشف ہو رہا ہے۔ یہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا ایک حصہ ہیں جو اُس (تعالیٰ) نے اپنے نبی کریم ﷺ کی فرمائی۔

تشدد کے جواب میں ہاتھ نہ اٹھانے اور صبر کرنے کی بہت سی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ لوگ سمع و طاعت کے خوگر ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک حکم اور بھی ہے کہ پیچھے نہیں ہٹنا! اپنے موقف پر ڈٹے رہنا ہے! یہ نہ ہو کہ اس تشدد سے گھبرا کر اپنے انقلابی نظریہ کو خیرباد کہہ دو اور اس سے کنارا کش ہو جاؤ۔ نہیں! ڈٹے رہنا ہے اور کھڑے رہنا ہے۔ جان جاتی ہے تو جائے! یہ ہے اس تصادم کا پہلا مرحلہ —— "صبر محض" یا Passive Resistance۔

گاندھی کا نظریہ عدم تشدد اور حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے اغیار نے بھی بہت سے سبق حاصل کئے ہیں۔ چنانچہ مناسب وقت پر عدم تشدد کا مسنون انداز بھی غیروں نے اپنایا ہے۔ اس کی مثالوں میں سے ایک مثال مسٹر گاندھی کی ہے۔ گاندھی نے عدم تشدد کا جو نظریہ اختیار

کیا در حقیقت حضورؐ کی سیرت سے ماخوذ ہے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے یہ چیز صرف دو جگہ نظر آتی ہے۔ یا جناب محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں' مسلسل بارہ برس۔ اس سے بڑا اور طویل عرصہ کہیں نظر آئے گا ہی نہیں ـــــ یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے تین سال کے دوران۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال یہ ہیں کہ "اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو باہنا بھی پیش کر دو۔" اور یہ کہ "اگر کوئی نالش کر کے تمہارا چوغہ لینا چاہے تو تم کرتا بھی اتار کر دے دو۔" اور "تمہیں کوئی بیگار میں اپنے ساتھ ایک کوس لے جانا چاہے تو تم دو کوس جاؤ" ـــــ یہ درحقیقت بالکل ابتدائی اور تمہیدی دور کی تعلیم ہے جس میں دعوت و تبلیغ کے ساتھ ہی مصائب و تشدد کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام صبر محض اور ایثار و قربانی کی تعلیم دے رہے ہیں' تاکہ ایک طرف معاندین و مخالفین کا بغض اور خُبثِ باطن آشکارا ہو جائے' تو دوسری طرف اہل ایمان میں قوتِ برداشت پیدا ہو۔ اب یہ مشیتِ الٰہی تھی کہ اسی صبر محض یعنی Passive Resistance کے دور میں آں جناب علیہ السلام کا رفعِ آسمانی ہو گیا۔ گو کہ یہودیوں نے تو اپنی دانست میں آنجناب علیہ السلام کو صلیب پر چڑھوا کر دم لیا تھا۔ عیسائیوں کی عظیم ترین اکثریت بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا چلی آ رہی ہے' جبکہ انجیل برناباس میں وہی باتیں بیان ہوئیں جو قرآن میں ہوئی ہیں اور جو حقیقت و صداقت پر مبنی ہیں۔ کتاب و سنت کے مطابق آپ علیہ السلام جسدِ خاکی کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور وہاں جسم و روح کے اتصال کے ساتھ زندہ ہیں۔ قرب قیامت میں آنجناب علیہ السلام کا نزول ہو گا' آپ علیہ السلام بنفس نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ اس وقت آپ علیہ السلام کے ہاتھ میں تلوار بھی ہو گی یعنی آپ علیہ السلام قتال فرمائیں گے۔ اور سیرتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام کے مدنی دور کی جھلک بھی دنیا سیرت عیسوی علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام میں دیکھ لے گی۔ آپ علیہ السلام اس نزول کے وقت نبی آخر الزماں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہوں گے۔ آپ علیہ السلام کے ہاتھوں یہودیوں کو عذاب استیصال کا مزا چکھنا ہو گا۔ دجال اکبر آں جناب علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہو گا۔ یہودی دنیا سے اسی طرح نیست و نابود کر دیئے جائیں گے

جیسے قوم نوح' قوم عاد' قوم ثمود' قوم لوط اور اصحاب مدین وغیرہ وقت کے رسولوں کی تکذیب کے جرم میں اس دنیا سے بھی نسیاً منسیا کردی گئیں اور آخرت کا عذاب تو ان کا مقدر رہے ہی۔

سیرتِ عیسوی علیہ السلام میں چونکہ "اِقدام" (Active Resistance) کا دور آیا ہی نہیں' لہٰذا مسلح تصادم کا دور کیسے نظر آتا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نیا نظام شریعت لے کر تشریف نہیں لائے تھے بلکہ شریعتِ موسوی علیہ السلام کی تجدید و احیاء کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ چنانچہ موجودہ اناجیل میں آپ علیہ السلام کے "پہاڑی کے وعظ" میں یہ قول آج بھی موجود ہے کہ جہاں تک قانون شریعت کا تعلق ہے میں اسے بدلنے نہیں آیا۔ قانون تورات ہی کا نافذ رہے گا۔ خود قرآن میں قصاص کا قانون تورات کے حوالے سے بیان ہوا ہے اور شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تورات کے اس قانون کو باقی رکھا گیا ہے' تو کیسے ممکن تھا کہ قصاص کے اس قانون کو حضرت مسیح علیہ السلام ساقط کر دیتے۔ لیکن قانون اور ہوتا ہے' دعوت و تبلیغ کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی دور میں کسی طرح بھی قصاص کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس موقع پر حکم ہوتا ہے "کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ"۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال میں اگر تدبّر اور غور و فکر سے کام لیا جائے' تو وہاں بھی یہی حکمت کارفرما نظر آتی ہے۔

اگرچہ تورات میں نازل شدہ قصاص کا یہ قانون پوری دنیا میں زبان زدِ عام ہو گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور جان کے بدلے جان' لیکن مکّی دور میں نبی اکرم ﷺ نے قصاص کے اس آفاقی و مسلّمہ قانون کی بجا آوری سے صحابہ کرامؓ کو روک رکھا تھا۔ ورنہ اگر ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہوتی تو بلالؓ صبر و سکون کے ساتھ اُمیّہ بن خلف کے بہیمانہ تشدد کا نشانہ نہ بنتے۔ وہ جان پر کھیل جاتے اور اس ظالم کو مزا چکھا دیتے۔ کیا جو ذہنی اور جسمانی کوفت و اذیت مکّہ کی گلیوں میں مُردہ جانور کی طرح کھینچے جانے کے باعث ہو رہی تھی' وہ جان دینے سے کم تھی؟ ____ اگر اجازت ہوتی تو خبابؓ بن ارت ننگی پیٹھ دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹنے کے بجائے کیا دو چار کو ساتھ لے کر نہ مرتے؟ ____ ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ یہ سارا اہتمام میرے لئے ہو

رہا ہے۔ یہ دہکتے انگارے میرے لئے بچھائے جا رہے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ کرتا اتارو اور وہ اتار دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے ان انگاروں پر لیٹ جاؤ اور وہ لیٹ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ورنہ آدمی پس و پیش کرتا ہے۔ آدمی مایوس اور desperate ہو جائے تو اس میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کمزور ہو تو بھی ایسے شخص میں مقابلے کی زبردست طاقت عود کر آتی ہے۔ مشہور ہے کہ اگر بلی کہیں گھیرے میں آجائے اور اسے کسی طرف نکلنے کا راستہ نہ ملے تو وہ انسان پر حملہ آور ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ جان لیتی ہے کہ اس کے سوا اس کے لئے کوئی چارہ نہیں۔ لیکن وہاں اس کی اجازت نہیں تھی۔ تو یہ بات بہت اہم ہے۔ معاذ اللہ! وہاں بزدلی کا معاملہ نہیں تھا۔ نہ معاذ اللہ بے غیرتی اور بے حمیتی کا کوئی معاملہ تھا کہ اہل ایمان یہ تشدد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن حرکت نہیں کرتے۔ یہ فلسفۂ انقلاب ہے ــــــ اور گاندھی نے عدم تشدد کا فلسفہ یہیں سے سیکھا ہے۔ البتہ گاندھی کی حماقت یہ ہے کہ اس نے اسے مستقل فلسفہ بنا لیا۔ جبکہ یہ فلسفہ ایک دور کا فلسفہ ہے' کوئی مستقل فلسفہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس درجے میں عدم تشدد کہ جس درجہ میں بعد میں جا کر گاندھی نے اس کی تبلیغ کی' وہ نری حماقت ہے۔ جن لوگوں کی نظر سے مولانا آزاد کی کتاب "India Wins Freedom" گزری ہے' ان کے علم میں ہو گا کہ وہ گاندھی کے اس فلسفہ کا مذاق اڑاتے ہیں کہ گزشتہ جنگِ عظیم میں گاندھی نے اتحادیوں کو ہٹلر کے آگے عدم تشدد کے فلسفہ کے تحت ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی تھی۔ عدم تشدد کے فلسفہ کو اس سطح تک لائیں گے تو یہ پاگل پن ہے۔ لیکن ہاں' ایک انقلابی تحریک اپنے ابتدائی مرحلہ میں اسے اختیار کرتی ہے۔ گاندھی نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا تھا۔ اس لئے کہ اگر شروع میں کانگریس کی پالیسی عدم تشدد کی نہ ہوتی تو انگریز آناً فاناً پوری تحریک کو کچل کر رکھ دیتا اور تحریک آگے نہ بڑھ سکتی۔ لیکن ان کی طرف سے عدم تشدد کے باعث حکومت کے ہاتھ بندھ گئے تھے کہ کیا کرے؟ یہ تشدد تو کر نہیں رہے۔ اسے عالمی رائے عامہ کا بھی لحاظ رکھنا تھا۔

سکھوں کی گوردوارہ پربندھک تحریک

عدم تشدد کی ایک اور مثال سکھوں کی گوردوارہ پربندھک تحریک ہے۔ سکھوں کے گوردواروں کے ساتھ جو اوقاف تھے ان پر قبضہ ہندوؤں کا تھا۔ چونکہ سکھوں کے بارے میں پورے طور پر یہ معیّن نہیں تھا کہ یہ کوئی علیحدہ مذہب ہے اور ہندو انہیں ہندومت ہی کا ایک فرقہ قرار دیتے تھے' لہٰذا سکھوں کے گوردواروں کے اوقاف پر ہندو قابض تھے اور ان کی آمدنی میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کچھ بڑے لوگ پٹواریوں کی مٹھی گرم کرکے کاغذات اور دستاویزات تبدیل کرا کے انہیں ذاتی ملکیت بنا لیتے تھے۔ [۱] سکھوں نے تحریک چلائی کہ ہمارے گوردواروں اور ان کے اوقاف کا کنٹرول ہمارے پاس ہونا چاہئے۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ عبادت گاہیں تو ہماری ہیں اور ان کے ساتھ جو املاک واوقاف ہیں وہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہندو کی رسائی انگریز کے دربار میں بہت ہو چکی تھی۔ لہٰذا انگریز نے ہندوؤں کی پشت پناہی کی اور سکھوں کے اس معقول مطالبہ کو رد کر دیا۔ اور پولیس کو تو حکومت کی شہ اور ہیسہ چاہئے۔ لہٰذا اس کی طرف سے بھی ہندوؤں کا پورا پورا ساتھ دیا گیا۔ بالآخر سکھوں نے اس تحریک کو عدم تشدد کے اصول پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ احتجاج کے لئے سکھوں کا جو جتھا نکلتا تھا اس کو حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھیں۔ ہر جتھا عموماً پچاس رضاکاروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ غالباً دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی' لہٰذا قانون کی خلاف ورزی ہو گئی۔ اور پولیس کو اختیار حاصل ہو گیا کہ ان پر لاٹھی چارج کرے' ڈنڈے چلائے اور ان کو منتشر کر دے —— ادھر ان رضاکاروں کو یہ حکم تھا کہ اپنے ہاتھ

---

[۱] جیسے ہمارے یہاں مزارات ہیں اور ان کے ساتھ اوقاف ہیں' تو گدی نشین صاحبان اُن کے ایک طرح مالک ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی جب اوقاف ایکٹ بنا تو اِن گدی نشینوں میں سے بڑی اکثریت نے پٹواریوں کی مٹھی گرم کرکے بہت سی املاک کے لئے اپنے حق میں کاغذات اور دستاویزات مرتب کرا لیں اور اب اِن کی آمدنی پر عیش کر رہے ہیں۔ (مرتب)

بندھے رکھیں، ماریں کھائیں لیکن پیچھے نہ ہٹیں۔ حاجی عبدالواحد صاحب مرحوم و مغفور، جو امرتسر کے رہنے والے تھے، وہ اس تحریک کے عینی شاہد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لاٹھیاں پڑنے سے سکھ رضا کار کا سر پھٹ گیا اور وہ زمین پر گر گیا لیکن اس کے ہاتھ بندھے رہے۔ اس طرح جتھے کے تمام رضا کار زخمی ہو کر گرتے رہے لیکن کیا مجال کہ کسی کے ہاتھ کھلے ہوں۔ ایک جتھا اس بری طرح زخمی ہو گیا تو اس کی جگہ لینے دوسرا جتھا آ گیا۔ چنانچہ انگریز کو جھکنا پڑا اور سکھوں کی تحریک کامیاب ہوئی۔ اور اُن کے گوردواروں کے اوقاف کا انتظام و انصرام ان کو مل گیا۔

چوراچوری کا واقعہ

گاندھی نے ۲۱۔ ۱۹۲۰ء میں عدم تشدد کی بنیاد پر ترکِ موالات کی جو تحریک، تحریکِ خلافت کے ساتھ مل کر چلائی تھی تو اس کے دوران پورے ہندوستان میں صرف ایک جگہ عدم تشدد کے اصول کی خلاف ورزی ہوئی۔ صوبہ بہار کا "چوراچوری" نامی ایک قصبہ تھا۔ یہاں پر پولیس والوں نے کچھ شرارت کی، جس سے جلوس میں شامل بعض لوگ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے تھانے پر حملہ کیا، بہت سے سپاہیوں کو مار دیا اور تھانہ میں آگ لگا دی، جس میں کچھ پولیس والے زندہ جل کر مر گئے۔ اب آپ دیکھئے کہ گاندھی نے صرف اس ایک حادثہ پر پوری تحریک ختم (Call Off) کر دی۔ اُس وقت گاندھی کی زندگی میں بڑا نازک مرحلہ آیا تھا۔ پورے ہندوستان میں اس کے خلاف جذبات مشتعل ہو گئے کہ یہ کیسا لیڈر ہے کہ اس نے تحریک ختم کر دی۔ ایسے موقع پر تو عموماً لوگ لیڈر کو گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن گاندھی نے اپنی لیڈری کی موت کا خطرہ مول لیا اور صرف یہ کہا کہ اگر تم میرے حکم پر نہیں چل سکتے تو میں تمہاری رہنمائی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ میرا حکم یہ تھا کہ تمہیں ہاتھ نہیں اٹھانا، تشدد نہیں کرنا، لیکن تم تشدد کر رہے ہو تو گویا تم میرا حکم ماننے کو تیار نہیں ہو۔ میں اس تحریک کی رہنمائی کی ذمہ داری کیسے قبول کر لوں کہ جس کے بارے میں مجھے یہ اعتماد نہ ہو کہ اس تحریک میں حصہ لینے والے میری بات کو مانیں گے۔ گاندھی کی بات بڑی معقول تھی۔

گاندھی کا ذکر اگر میں کرتا ہوں تو اس اعتبار سے نہیں کہ معاذ اللہ وہ میرے لئے کوئی حجت یا کوئی دلیل ہے یا رہنمائی کے لئے کوئی مثال ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ گاندھی نے یہ اصول سیرتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے سیکھا ہے۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ گاندھی نے اسلام کا مطالعہ کیا تھا ــــــ اس کے لئے میں دو مثالیں پیش کر دیتا ہوں۔

(i) علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب:

۱۹۸۴ء میں حیدر آباد دکن کے دعوتی دورے کے دوران میں نے متعدد تقریریں کیں اور قرآن حکیم کے دروس بھی دیئے۔ وہاں پر ایک صاحب، جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ہیڈ آف پولیٹیکل سائنس کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے انہیں میری فلسفۂ انقلاب والی تقریر بہت پسند آئی اور وہ اس سے بہت متأثر ہوئے۔ بعد میں وہ مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے میری باتوں کی توثیق کے لئے بہت سے واقعات بتائے۔ انہوں نے علی گڑھ سے ایم اے کیا تھا۔ انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کا ایک واقعہ سنایا، جو غالباً ۱۹۱۸ء کے آس پاس کا ہے۔ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیازات کے خلاف گاندھی نے جو تحریک چلائی تھی، اس کی وجہ سے وہ پوری دنیا میں مشہور ہو گئے تھے۔ کالج میں اعلان ہوا کہ گاندھی کالج آرہے ہیں۔ اُس وقت تک علی گڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ لوگوں میں بڑا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ صاحب بتاتے ہیں کہ گاندھی آئے اور سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جس میں سرسید احمد خاں مرحوم کی قبر ہے۔ وہاں وہ اکیلے پون گھنٹے تک سرسید مرحوم کی قبر کے پائنتی بیٹھے رہے۔ ایسا کیوں ہوا! یہ اللہ جانے۔ گاندھی جب باہر آئے تو منتظمین اور طلبہ نے ان سے جلسہ سے خطاب کے لئے کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو صرف سرسید صاحب کی قبر کی زیارت کے لئے آیا تھا، مجھے اور کوئی کام نہیں ہے۔ جب بہت زور دیا گیا تو گاندھی نے کہا کہ پہلے میں پورے کالج اور ہوسٹل کا ایک چکر (Round) لگانا چاہتا ہوں۔ اُس وقت ہوسٹل کی وہ صورت نہیں تھی جو آج کل ہے، اُس وقت علی گڑھ میں نواب زادوں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے رئیسوں کے لڑکے پڑھتے تھے۔ ان کے کمروں میں قالین بچھے ہوئے تھے اور صوفے لگے ہوئے تھے۔ کالج کے طلبہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔

گشت کے بعد گاندھی نے ہال میں مختصر سی تقریر کی' جس میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ "میں آپ حضرات کو خوشخبری دیتا ہوں کہ آپ کا یہ کالج جلد ہی یونیورسٹی بن جائے گا۔ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے"۔ دوسری خاص بات یہ کہی کہ "اگر آپ کا کالج یا آپ کی یونیورسٹی ایک بھی حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) پیدا کر دے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ لیکن میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ کا کالج یا یونیورسٹی ایک بھی حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ لئے ہیں' صوفوں اور قالینوں پر پڑھنے والے حضرت عمر نہیں بن سکتے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کتنا گہرا مطالعہ تھا۔ کیا حضرت عمرؓ کو جانے بغیر کوئی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے؟ ـــــ میں نے جب اُن سے یہ واقعہ سنا تو فوراً میرا ذہن علامہ اقبال مرحوم کی اِس نظم کی طرف منتقل ہوا جو علامہ نے اسی زمانہ میں کہی تھی جس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ گاندھی کی اس تقریر کی اخبارات میں رپورٹنگ ہوئی ہو گی اور شاید علامہ نے اسی سے متأثر ہو کر یہ اشعار کہے ہوں گے کہ ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی' ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا' شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل!
نہ زورِ حیدری" تجھ میں نہ استغنائے سلمانی !!

بہرحال یہ ایک خیال ہے۔ اب کوئی اس کی تحقیق کرے تو بات واضح ہو سکے گی۔

(ii) گاندھی کا مشورہ کانگریس کے وزراء کو :

گاندھی کی دوسری بات بہت مشہور و معروف ہے کہ جب ۱۹۳۷ء میں بہت سے صوبوں میں انڈیا ایکٹ ۳۵ء کے تحت پہلی بار کانگریس کی وزارتیں بنیں تو گاندھی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں لکھا کہ "میں تمام وزیروں سے کہتا ہوں کہ حکومت میں حضرت ابوبکر(رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) کی مثال سامنے رکھیں' جنہوں نے درویشی میں ایک عظیم ترین سلطنت کی سربراہی کی"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے پہلے قرن سعید کا گاندھی کا مطالعہ کتنا تھا!۔ بہرحال میں گاندھی کے عدم تشدد کی

بات کرتا ہوں تو اس اعتبار سے کہ انہوں نے یہ سبق سیرت النبیؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے سیکھا ہے۔ {۱}

لاحاصل احتجاجی مظاہرے

ہمارے یہاں بھی تحریکیں چلتی ہیں گو وہ انقلاب کے لئے نہیں ہوتیں' صرف ایک ناپسندیدہ حکمران یا پارٹی کو ایوان حکومت سے بے دخل کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ تحریک کے قائدین کہا کرتے ہیں کہ جلوس تو ہم نے نکالا لیکن توڑ پھوڑ کوئی اور کر گیا۔ عجیب بات ہے۔ اگر آپ کی اتنی تنظیم نہیں ہے' اگر آپ کا اتنا کنٹرول نہیں ہے' اگر آپ کا اتنا ڈسپلن نہیں ہے تو آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ سڑکوں پر آئیں۔ کیا طرفہ تماشا ہے کہ جلوس تو نکل رہا ہے حکومت وقت کے خلاف اور شامت آرہی ہے قومی اَملاک کی۔ کہیں اسٹریٹ لائٹیں توڑ دی گئی ہیں' کہیں نیون سائن اور اسٹریٹ سگنلز کی شامت آگئی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بسوں کے ٹائر پھاڑے جارہے ہیں' بسیں جلائی جارہی ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ساٹھ ستر آدمیوں کو ہم نے بس سے اتار کر کھڑا کردیا اور بس کو آگ لگادی تو کیا وہ لوگ ہم کو دل میں گالیاں نہیں دے رہے ہوں گے؟ اور اس طرح رائے عامہ ہمارے حق میں جارہی ہے یا خلاف جارہی ہے؟ اب آپ سوچئے کہ اگر کسی کو چار پانچ میل دور کسی مقام پر جانا ہے تو اس پر کیا بیتی ہوگی؟ پھر ایسی حرکتوں سے برسراقتدار طبقہ کو کیا تکلیف پہنچتی ہے اور اس کا کیا نقصان ہوتا ہے؟ تکلیف پہنچتی ہے عوام الناس کو اور نقصان ہوتا ہے قومی املاک کا —— اس کا نام مظاہرہ نہیں ہے' یہ تو درحقیقت فساد ہے' ہنگامہ ہے۔ اس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ نتیجہ خیز مظاہرے وہ تھے

{۱} محترم ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر ۱۹/ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو مسجد دارالسلام میں ارشاد فرمائی تھی۔ بعد ازاں "نوائے وقت" کے ممتاز کالم نگار جناب م۔ ش مرحوم کا ایک خط ڈاکٹر صاحب کو موصول ہوا جس میں فاضل کالم نگار نے یہ اِنکشاف کیا کہ خان عبدالغفار خاں نے ایک بار انہیں (یعنی م۔ ش صاحب کو) یہ بتایا کہ گاندھی نے عدم تشدد کا فلسفہ حضور ﷺ کی سیرت سے اخذ کیا ہے۔ (مرتب)

جن کا اوپر ذکر ہوا ــــ اپنے حقوق کے لئے، اپنے جائز مطالبوں کے لئے کسی ظالم اور جابر برسراقتدار طبقے کے خلاف سڑکوں پر نکلنا پڑے تو نکلئے ــــ لیکن اس شان سے کہ لاٹھی چارج سے سر پھٹ جائے، گولیوں کی بوچھاڑ سے جسم زخمی ہو جائے، آنسو گیس سے آنکھوں میں شدید اذیت پہنچے لیکن ہاتھ بندھے رہیں اور جواب میں کسی نوع کا بھی متشددانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے۔ رہا توڑ پھوڑ، بسوں، موٹروں اور قومی املاک کو نقصان پہنچانا تو یہ فساد ہے، بدامنی ہے جو حکومت وقت کو پوری قوت کے ساتھ تحریک کو کچلنے کا اخلاقی اور قانونی جواز فراہم کرتی ہے۔

عدم تشدد کی اوپر بیان کردہ مثالیں اگرچہ غیروں کی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سیرت نبوی ﷺ سے ماخوذ ہیں۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو آنکہ از خاکش بروید آرزو!!
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

یعنی دنیا میں جو کچھ بھی خیر اور بھلائی کہیں نظر آ رہی ہے وہ یا تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ روشنی ہی سے حاصل کی گئی ہے یا ابھی نوع انسانی نورِ مصطفیٰ کی تلاش میں ہے۔ یعنی غیر شعوری طور پر اُن راستوں کی تلاش میں ہے اور انہی کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے جو راستے محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دیئے تھے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

غلطیوں کی اصلاح کا نبویؐ طریق کار (۲)

تالیف : علامہ محمد صالح المنجد ' مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

(گزشتہ سے پیوستہ)

اصلاح کے موقع پر پیش نظر رکھے جانے والے بعض امور

۵) اصلاح کرنے والے کے مقام و مرتبہ کا لحاظ :

بعض اوقات ایک شخص کی ایسی سختی برداشت کر لی جاتی ہے جو دوسروں کی طرف سے ہو تو برداشت نہیں کی جاتی' کیونکہ اس کو وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کو نہیں ہوتا' یا اس کو وہ اختیار حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً باپ کو بیٹے پر' استاد کو شاگرد پر' محتسب کو عام آدمی پر وہ اختیار حاصل ہے جو دوسروں کو نہیں ہے۔ اپنے سے بڑی عمر والے سے اس انداز سے بات نہیں کی جاتی جس طرح ہم عمر سے یا چھوٹے سے کی جاتی ہے۔ رشتہ دار اور اجنبی برابر نہیں۔ صاحب اختیار کی حالت وہ نہیں ہے جو اختیار نہ رکھنے والے کی ہے۔ اس فرق کو پیش نظر رکھ کر اصلاح کرنے والا ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھ سکتا ہے اور معاملات کو صحیح طور پر پرکھ سکتا ہے' تاکہ غلطی سے منع کرنے یا اصلاح کرنے کی کوشش میں اس سے بڑی غلطی پیدا نہ ہو جائے۔ تنبیہہ کس درجہ کی ہو اور اس میں سختی یا نرمی کا کیا معیار رکھا جائے' اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ غلطی کتنی بڑی ہے اور غلطی کرنے والے کے دل میں منع کرنے والے کا کیا مقام اور کس درجہ کا رعب و دبدبہ ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے دو امور مستنبط ہوتے ہیں :

اول : جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کوئی مقام و مرتبہ اور اقتدار و اختیار عطا فرمایا ہے' اس کا فرض ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور لوگوں کی

تربیت کا کام انجام دے اور اس بات کا احساس کرے کہ اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے' اور لوگ دوسروں کی نسبت اس کی بات زیادہ مان سکتے ہیں' اور وہ جو کچھ کر سکتا ہے دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔

دوم : امر و نہی کا فریضہ انجام دینے والے کو چاہئے کہ اپنے مقام کا غلط اندازہ نہ لگائے' اور خود کو اپنے حقیقی مقام سے بلند تر مقام پر رکھ کر اس انداز سے کام نہ کرے جو اس کے لئے مناسب نہیں' کیونکہ اس طرح لوگ اس سے دور ہٹیں گے اور اصل مقصد کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔

جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو عظیم مقام اور عام لوگوں کے دلوں میں آپؐ کی جو ہیبت عطا فرمائی تھی' آنحضرت ﷺ تنبیہہ اور تربیت میں اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور بعض اوقات آپؐ کا طرز عمل ایسا ہوتا تھا کہ اگر کوئی اور شخص وہ انداز اختیار کرے تو اس سے صحیح فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے :

حضرت یَعیش بن طِهفَه غفاری نے اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا' انہوں نے فرمایا : جو نادار حضرات نبی اکرم ﷺ کے مہمان ہوا کرتے تھے (ایک بار) ان میں (شامل ہو کر) میں بھی آنحضرت ﷺ کے ہاں مہمان ہوا۔ آنحضرت ﷺ رات کو اپنے مہمانوں کی دیکھ بھال کی غرض سے تشریف لائے تو مجھے پیٹ کے بل لیٹے دیکھا۔ آنحضرت ﷺ نے مجھے قدم مبارک سے ٹھوکا دیا اور فرمایا : "اس انداز سے نہ لیٹو۔ اللہ تعالیٰ اس انداز سے لیٹنے کو ناپسند فرماتے ہیں۔" ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ قدم مبارک سے ٹھوکا دے کر جگایا اور فرمایا : "یہ اہل جہنم کا لیٹنے کا انداز ہے"۔(۱۵)

نبی اکرم ﷺ کے مقام و مرتبہ کے پیش نظر آنحضرت ﷺ کے لئے تو اس انداز سے تنبیہہ کرنا بالکل مناسب تھا' لیکن عام آدمی کے لئے اسے اختیار کرنا قطعاً مناسب نہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو پیٹ کے بل سوئے ہوئے دیکھتا ہے تو یہ درست نہیں کہ اسے پاؤں کی ٹھوکر مار کر جگا دے' اور پھر یہ امید رکھے کہ وہ اس کی بات مان لے گا اور شکریہ بھی ادا کرے گا۔(۱۶)

ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنے خاص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی اعرابی یا اجنبی کی نسبت زیادہ سختی سے تنبیہہ فرماتے تھے۔ اور یہ سب کچھ حکمت میں شامل ہے' اور تنبیہہ کرتے وقت حالات کا صحیح اندازہ کرنے کی مثال ہے۔

۶) مسئلہ سے لاعلم غلطی کرنے والے اور جانتے ہوئے غلطی کرنے والے میں فرق کرنا :

اس کی ایک واضح مثال حضرت معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ وہ صحرائی زندگی گزارنے والے آدمی تھے۔ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ نماز کے دوران بات چیت کرنا حرام ہے۔ وہ فرماتے ہیں : "میں جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک نمازی کو چھینک آگئی۔ میں نے (نماز کے دوران ہی) کہہ دیا : "یرحمک اللہ" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے کہا : ہائے میں مرجاؤں! تم لوگ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ انہوں نے اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر مجھے خاموش کرانا چاہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش کرانا چاہتے ہیں تو (میرا جی چاہا کہ انہیں جواب دوں) لیکن (اپنے آپ پر ضبط کر کے) میں خاموش ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے نماز مکمل کرلی تو ـــــ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان' میں نے کوئی معلم آنحضرتؐ سے بہتر انداز سے تعلیم دینے والا نہیں دیکھا ـــــ اللہ کی قسم' حضور علیہ السلام نے نہ مجھے جھڑکا' نہ مارا' نہ برا بھلا کہا' بس یہ فرمایا : اس نماز میں لوگوں والی باتیں کرنا درست نہیں' اس میں تو تسبیح و تکبیر اور تلاوت ہوتی ہے"۔(۱۷)

یعنی جاہل کو تعلیم دینے کی ضرورت ہوتی ہے' جسے کوئی شبہ یا غلط فہمی ہو اسے مسئلہ کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے' غافل کو یاد دہانی چاہئے' اور غلطی پر اصرار کرنے والے کو نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جاسکتا کہ مسئلہ سے واقف اور ناواقف کو ایک ہی انداز سے تنبیہہ کی جائے۔ بلکہ جاہل پر سختی کرنے سے عام طور پر اس کے دل میں نفرت اور انکار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن

اگر پہلے حکمت کے ساتھ نرمی سے سمجھایا جائے تو ایسا نہیں ہوتا۔ مسئلہ سے ناواقف شخص اپنے آپ کو غلطی پر تصور نہیں کر رہا ہوتا' لہٰذا جب اس پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ گویا زبان حال سے کہہ رہا ہوتا ہے: بھائی! مجھ پر حملہ کرنے سے پہلے آپ نے مجھے مسئلہ تو بتایا ہوتا۔

بعض اوقات غلطی کرنے والا غیر شعوری طور پر درست راہ سے ہٹ گیا ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات وہ خود کو صحیح راستے پر تصور کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس چیز کا لحاظ رکھا جانا چاہئے۔ مسند احمد میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے کھانا تناول فرمایا۔ پھر نماز کی اقامت ہوئی تو آنحضرت ﷺ نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے اس سے پہلے وضو کیا ہوا تھا۔ لیکن میں (دوبارہ) وضو کے لئے پانی لے آیا۔ حضور علیہ السلام نے مجھے جھڑک دیا۔ فرمایا: "پیچھے رہو"۔ مجھے اس سے بہت تکلیف ہوئی۔ نماز کے بعد میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتائی۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! مغیرہؓ آپ کی سرزنش کی وجہ سے بہت دلگیر ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ آپ کے دل میں ان سے ناراضگی تو نہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "میرے دل میں تو اس کے لئے اچھے جذبات ہی ہیں' لیکن وہ میرے پاس وضو کے لئے پانی لے آیا تھا' حالانکہ میں نے صرف کھانا کھایا تھا۔ اگر میں وضو کرتا تو میری اتباع میں سب لوگ (کھانا کھا کر) وضو کیا کرتے (جس سے امت کے لئے مشقت ہوتی)"۔ (۱۸)

یہاں یہ امر ملحوظ رہنا چاہئے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس عظیم مقام پر فائز تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انہیں غلطی پر متنبہ کرنے سے ان کے دلوں میں کوئی ناپسندیدگی یا ذہنی بعد جیسے منفی اثرات پیدا ہونے کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا ان پر مثبت اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی سے عدم التفات کا اظہار فرماتے تھے تو وہ اپنے آپ کو قصوروار تصور کرتا اور ڈرا سہما رہتا تھا۔ وہ اس وقت تک بہت پریشان رہتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جاتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی دور ہو چکی ہے۔

اس واقعہ میں یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب مغیرہ رضی

اللہ عنہ پر عتاب فرمایا تو اس کی وجہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے ناراضگی نہیں' بلکہ آنحضرت ﷺ کی عام مسلمانوں پر شفقت اور مسئلہ کی وضاحت تھی تاکہ وہ غیرواجب کو واجب سمجھ کر مشکل میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

شاگرد اور پیرو کار کے دل میں استاد اور قائد کا مقام بہت بلند ہوتا ہے' لہٰذا جب وہ کسی شاگرد یا پیرو کار کو تنبیہہ کرتا ہے یا اس کے کسی کام کو غلط قرار دیتا ہے' تو اس کے دل میں اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات تربیت کا فریضہ انجام دینے والا محض عام لوگوں کے فائدہ کے پیش نظر اپنے کسی ساتھی کو تنبیہہ کرتا ہے اور مقصود دوسرے لوگوں سے متعلق کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے دل میں منفی اثر باقی رہنے دیا جائے بلکہ دوسرے طریقوں سے اس کا تدارک ہونا چاہئے تاکہ وہ اثر ختم ہو جائے۔ مثلاً پیرو کار کسی مناسب طریقے سے اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے اگرچہ کسی کے واسطہ سے ہی ہو۔ جیسے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اپنے جذبات آنحضرت ﷺ تک پہنچائے۔ اس کے جواب میں قائد کی طرف سے موقف کی وضاحت کرکے یہ واضح کیا جانا چاہئے کہ وہ اس سے حسن ظن رکھتا ہے اور اس کے دل میں اس کا ایک مقام ہے۔

۷) اجتہاد کی بنا پر ہونے والی غلطی میں اور جان بوجھ کر یا غفلت اور کوتاہی سے ہونے والی غلطی میں فرق ہے :

پہلی قسم کی غلطی کا مرتکب تو یقیناً ملامت کا مستحق نہیں' بلکہ وہ اپنے اخلاص و اجتہاد کی بنا پر ثواب پائے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

((اِذَا حَکَمَ الْحَاکِمُ فَاجْتَھَدَ فَاَصَابَ فَلَہٗ اَجْرَانِ ' وَاِذَا حَکَمَ فَاَخْطَأَ فَلَہٗ اَجْرٌ وَاحِدٌ)) (۱۹)

"فیصلہ کرنے والا جب فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد صحیح ہو جائے تو اسے دوگنا ثواب ملے گا اور اگر اس سے فیصلہ میں غلطی ہوئی تو اسے اکہرا ثواب ملے گا۔"

اس کے برعکس جو شخص جان بوجھ کر غلطی کرے' یا غلطی میں خود اس کی کوتاہی کا دخل ہو' تو اس کا یہ حکم نہیں۔ پہلے آدمی سے خیر خواہی کا سلوک کرتے ہوئے اسے صحیح مسئلہ بتایا جائے گا' دوسرے کو وعظ و نصیحت کر کے غلطی سے روکا جائے گا۔

وہ اجتہاد جس میں غلطی کرنے والے کو معذور قرار دیا جا سکتا ہے' اس کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد کرنے والا اس کا اہل ہو' اور اس پر عمل ہو سکتا ہو۔ اس کے برعکس جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دیتا ہے یا لوگوں کے حالات کی رعایت نہیں کرتا' اس کا اجتہاد درست نہیں۔ اسی لئے زخمی شخص کو غسل کا فتویٰ دینے والے صحابہ کرام کو آنحضرت ﷺ نے سختی سے تنبیہہ فرمائی تھی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : "ہم لوگ سفر میں تھے' ہم میں سے ایک صاحب کو پتھر لگا جس سے ان کے سر میں زخم آ گیا۔ اس کے بعد انہیں نیند میں نہانے کی حاجت ہو گئی۔ انہوں نے اپنے ہم سفر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مسئلہ پوچھا اور کہا : کیا آپ کے علم کے مطابق میرے لئے تیمم کرنا جائز ہے؟ انہوں نے کہا : ہمارے خیال میں تو آپ کو یہ اجازت حاصل نہیں' کیونکہ پانی موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے غسل کیا جس کے نتیجے میں وہ فوت ہو گئے۔ جب ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو یہ واقعہ بھی عرض کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : ((قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ' اَلاَ سَاَلُوا اِذْلَمْ يَعْلَمُوا؟ فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّوالُ)) "انہوں نے اسے قتل کر دیا' اللہ انہیں قتل کرے! اگر انہیں معلوم نہیں تھا تو انہوں نے (کسی صاحب علم سے) پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیونکہ لاعلمی کا علاج سوال کرنا ہے"۔ [۲۰]

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا ہے :

((الْقُضَاةُ ثَلاثَةٌ ' واحدٌ فِي الجَنَّةِ وَاثنانِ فِي النَّارِ ' فَاَمَّا الَّذِى فِى الجَنَّةِ فَرجلٌ عرَفَ الحَقَّ فَقَضٰى بِهٖ' ورَجلٌ عرَفَ الحقَّ فجَارَ فِي الحُكْمِ فهو فِي النَّارِ ' ورَجلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ علٰى جَهْلٍ فهو فِي النَّارِ)) [۲۱]

"فیصلہ کرنے والے تین طرح کے ہیں' ان میں سے ایک جنتی ہے اور دو جہنمی ہیں۔ جنت میں تو وہ جائے گا جس نے حق کو سمجھ کر اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ البتہ

جس نے حق کو سمجھ لیا' پھر غلط فیصلہ کیا' وہ جہنم میں جائے گا۔ اسی طرح جس نے حق کو سمجھے بغیر بے علمی کے باوجود فیصلہ کر دیا وہ بھی جہنم میں جائے گا"۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اس تیسری قسم کے آدمی کو معذور قرار نہیں دیا۔

تنبیہہ میں شدت کا درجہ متعین کرنے میں جن امور کا دخل ہے' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس ماحول کو مدنظر رکھا جائے جس میں غلطی کا صدور ہوا ہے۔ مثلاً اس ماحول میں اکثر لوگ سنت پر عمل کرنے والے ہیں' یا بدعت کا رواج ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس ماحول میں وہ غلطی کتنی عام ہے' یا اس کے جواز کا فتویٰ دینے والا کوئی نام نہاد یا متساہل عالم تو موجود نہیں جس کے علم پر اس غلطی کا ارتکاب کرنے والا اعتماد کرتا ہو۔

۸) غلطی کرنے والے کی خیر خواہی' تنبیہہ کرنے سے رکاوٹ نہیں بن سکتی:

حضرت عمرو بن یحییٰؒ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : میں نے اپنے والد سے سنا' وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا : ہم لوگ صبح کی نماز سے پہلے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ڈیوڑھی پر (انتظار میں) بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جب وہ گھر سے باہر تشریف لاتے تو ہم ان کے ساتھ مسجد میں جاتے۔ (ایک دن) ہمارے پاس حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور فرمایا : کیا ابھی تک ابو عبدالرحمٰن (ابن مسعودؓ) باہر نہیں آئے؟ ہم نے کہا : جی نہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے حتیٰ کہ وہ باہر تشریف لے آئے۔ جب وہ آئے تو ہم سب اکٹھے ہی اٹھ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ ابو موسیٰؓ نے کہا : ابو عبدالرحمٰن! میں نے ابھی ابھی مسجد میں ایک کام دیکھا ہے جو مجھے عجیب سا محسوس ہوا ہے' ویسے الحمدللہ میں نے اچھی چیز ہی دیکھی ہے۔ ابن مسعودؓ نے کہا : وہ کام کیا ہے؟ انہوں نے کہا' زندگی رہی تو (مستقبل میں) آپ بھی دیکھ لیں گے۔ پھر فرمایا : میں نے مسجد میں کچھ لوگ نماز کے انتظار میں حلقے بنا کر بیٹھے دیکھے ہیں' ان کے سامنے کنکریاں پڑی ہیں' ہر حلقہ میں ایک آدمی ہے' وہ کہتا ہے : سو بار اللہ اکبر پڑھو' وہ سو بار اللہ اکبر کہتے ہیں۔ پھر کہتا ہے : سو بار لا الٰہ الا اللہ کہو' وہ سو بار لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں۔ پھر کہتا ہے

: سو بار سبحان اللہ کہو' وہ سو بار سبحان اللہ کہتے ہیں(اسی طرح ذکر میں مشغول ہیں)۔
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا : پھر آپ نے انہیں کیا کہا؟ انہوں نے کہا : میں نے کچھ نہیں کہا' بلکہ آپ کی رائے اور حکم کا انتظار کیا۔ انہوں نے فرمایا : آپ نے انہیں یہ حکم کیوں نہ دیا کہ وہ اپنے گناہ شمار کریں' اور انہیں یہ ضمانت کیوں نہ دی کہ ان کی کوئی نیکی ضائع نہیں ہو گی؟

اس کے بعد وہ (مسجد کی طرف) چل پڑے۔ ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ چلے۔ حتیٰ کہ آپ ان حلقوں میں سے ایک حلقے کے پاس جا کھڑے ہوئے اور فرمایا : میں تمہیں یہ کیا کرتے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا : اے ابو عبدالرحمٰن! یہ کنکریاں ہیں' ہم ان کے ساتھ گن کر تکبیر' تہلیل اور تسبیح کرتے ہیں۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا : "اپنے گناہ شمار کرو' میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہاری کوئی نیکی ضائع نہیں ہو گی۔ اے محمد ﷺ کی امت! تم پر افسوس ہے' کتنی جلدی تم ہلاکت کے راستے پر چل پڑے ہو' ابھی تو تمہارے نبی ﷺ کے صحابہ بکثرت موجود ہیں' ابھی تو آنحضرت ﷺ کے کپڑے بھی نہیں پھٹے' ابھی تو آنحضرت ﷺ کے برتن بھی نہیں ٹوٹے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یا تو تم محمد ﷺ کے راستے سے بھی زیادہ ہدایت والے راستے پر ہو' یا گمراہی کا دروازہ کھول رہے ہو"۔ انہوں نے کہا : ابو عبدالرحمٰن! اللہ کی قسم ہمارا ارادہ تو صرف نیکی کا ہے۔ فرمایا : "بہت سے لوگ نیکی کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن انہیں نیکی تک پہنچنا نصیب نہیں ہوتا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ کچھ لوگ ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے آگے نہیں جائے گا (دل پر قرآن کا کوئی اثر نہیں ہو گا)۔ اللہ کی قسم! معلوم نہیں شاید ان میں سے اکثر تم لوگ ہی ہو"۔ یہ کہہ کر ان کے پاس سے چلے آئے۔ حضرت عمرو بن سلمہؓ نے فرمایا : ہم نے جنگ نہروان میں دیکھا کہ ذکر کے وہ حلقے قائم کرنے والوں میں سے اکثر افراد خارجیوں کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف لڑ رہے تھے"۔[۲۲]

۹) غلطی پر تنبیہہ کرنے میں انصاف اور غیر جانبداری کا خیال رکھنا :

اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ﴿واذا قلتم فاعدلوا﴾۔ "جب تم بات کرو تو انصاف کرو"۔

اور فرمایا : ﴿وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ "جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو"۔

حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہما) وہ شخصیت ہیں جن سے جناب رسول اللہ ﷺ کو بہت محبت تھی اور ان کے والد سے بھی بہت محبت تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرنے کی کوشش کی تو جناب رسول اللہ ﷺ نے انہیں سختی سے تنبیہہ فرمائی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں فتح مکہ کے ایام میں جس عورت نے چوری کی تھی' اس کے بارے میں خاندان قریش کے افراد کو بہت فکر ہوئی (کہ اب اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا)۔ انہوں نے کہا : اس کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کون عرض کرے گا؟ تب انہوں نے کہا : یہ جرات تو صرف اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہما) ہی کر سکتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو بہت پیارے ہیں۔ جب اس خاتون کو آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہما) نے اس کے بارے میں عرض کیا۔ اس پر جناب رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ (غصے کی وجہ سے) متغیر ہو گیا۔ اور فرمایا : "کیا تو اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں شفاعت کرتا ہے؟" اسامہ رضی اللہ عنہ نے (اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے) عرض کیا : یارسول اللہ! میرے لئے اللہ سے مغفرت کی دعا فرمایئے۔

شام کو جناب رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔ پہلے اللہ کی شایان شان تعریف فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا :

((أَمَّا بَعْدُ ' فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ ' وَإِنِّي وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا))

"اللہ کی حمد و ثنا کے بعد واضح ہو کہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے تباہ ہوئے کہ ان میں جب کوئی اونچا آدمی چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے' اور جب کوئی

کمزور آدمی چوری کرلیتا تھا تو اس پر حد نافذ کر دیتے تھے۔ مجھے اُس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

پھر اس چوری کرنے والی عورت کے بارے میں حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ (۲۳)

نسائی کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : ایک عورت نے معروف لوگوں کے نام لے کر کچھ زیور عاریت کے طور پر حاصل کئے' وہ خود غیر معروف تھی۔ اس نے وہ زیور بیچ کر رقم حاصل کرلی۔ اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کے گھر والوں نے حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہما) سے رابطہ کیا۔ حضرت اسامہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے بات کی تو آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل گیا اور آپؐ نے فرمایا : "کیا تو اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتا ہے؟ اسامہؓ نے عرض کیا : اللہ کے رسول! میرے لئے بخشش کی دعا کیجئے۔ اسی شام کو رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اللہ کی حمد و ثنا بیان فرمائی جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ پھر فرمایا :

((امَّا بعدُ ' فانّما هلَكَ الناسُ قَبلَكم انَّهم كانُوا اذا سرَقَ الشَّريفُ فيهم ترَكُوهُ وَاذا سَرَقَ الضَّعيفُ فيهم اَقامُوا عَليه الحدَّ ' وَالَّذى نَفْسِى بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّ فاطمةَ بنتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا))

"اما بعد' تم سے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے کہ ان میں جب کوئی اونچا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کر دیتے تھے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا"۔

اس کے بعد اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ (۲۴)

حضرت اسامہؓ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے رویہ سے آپؐ کا عدل و انصاف ظاہر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نظر میں شریعت انسانوں کی محبت سے بالاتر مقام کی حامل تھی اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان اس شخص کو تو معاف کر سکتا ہے جس کی غلطی کا تعلق اس کی ذات سے ہو' لیکن جس کی غلطی کا تعلق

شریعت کے احکام سے ہو، اسے نہ معاف کر سکتا ہے، نہ اس سے نرمی کر سکتا ہے۔
بعض لوگ اپنے دوست یا رشتہ دار کی غلطی پر اس شدت سے تنقید نہیں کرتے جس طرح کسی اجنبی کی غلطی پر کرتے ہیں، اور بعض اوقات اس بنیاد پر معاملات میں واضح طور پر خلاف شریعت حد تک جانبداری اور امتیاز نظر آتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے دوست کی غلطی کو نظرانداز کر دیتا ہے، جب کہ دوسرے کی غلطی پر سخت رویہ اپناتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے :

وَعَیْنُ الرِّضَا عَنْ کُلِّ عَیْبٍ کَلِیْلَةٌ
وَلٰکِنَّ عَیْنَ السُّخْطِ تُبْدِی الْمَسَاوِیَا

"خوشنودی کی آنکھ کو کوئی عیب نظر نہیں آتا، لیکن ناراضگی کی آنکھ برائیاں ہی ظاہر کرتی ہے"۔

یہی کیفیت اس موقعہ پر نظر آتی ہے جب ہم دوسروں کے کسی عمل کا مقام متعین کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص جس سے ہمیں محبت ہے، اس سے ایک فعل سرزد ہوتا ہے تو ہم اس کا ایک اچھا محمل تلاش کر لیتے ہیں، اور وہی فعل کسی اور سے سرزد ہوتا ہے تو ہم اسے کسی اور چیز پر محمول کر لیتے ہیں۔
مذکورہ بالا تمام باتیں اس صورت میں ہیں جب حالات ایک جیسے ہوں، ورنہ بعض دوسرے امور کے پیش نظر بظاہر ایک جیسے دو معاملوں میں مختلف طرز عمل اختیار کیا جا سکتا ہے، جیسے کہ آئندہ سطور میں بیان ہو گا۔

۱۰) ایک غلطی کی اصلاح کے نتیجہ میں اس سے بڑی غلطی وجود میں نہ آجائے:

شریعت کا یہ قاعدہ معروف ہے کہ بڑی برائی کو دور کرنے کے لئے چھوٹی برائی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اصلاح کرنے والے کو بعض اوقات ایک غلطی پر خاموشی اختیار کرنا پڑتی ہے تاکہ اس سے بڑی غلطی کا ارتکاب نہ ہو جائے۔
نبی اکرم ﷺ کو یقینی طور پر معلوم تھا کہ منافق کفر پر قائم ہیں، اس کے باوجود آپؐ خاموش رہے، اور ان کی طرف سے دی جانے والی تکلیفوں پر صبر کرتے رہے، تاکہ لوگ

یہ نہ سمجھیں کہ محمد ﷺ اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں اور خاص طور پر اس لئے بھی حضور علیہ السلام خاموش رہے کہ عام لوگ ان منافقین کی حقیقت سے واقف نہیں تھے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے کعبہ شریف کو ابراہیم علیہ السلام کی مقرر کردہ بنیادوں پر تعمیر کرنے کے لئے اسے گرانے سے صرف اس لئے اجتناب کیا کہ قریش کے اکثر لوگ حال ہی میں اسلام میں داخل ہوئے تھے اور آنحضرت ﷺ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ان کی سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آئے گی۔ اس لئے عمارت کو اسی طرح رہنے دیا، حالانکہ وہ اصل ابراہیمی تعمیر سے رقبہ میں کم تھی، اس کا دروازہ بھی اونچا بنادیا گیا تھا اور عام لوگ کعبہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ سب امور ایسے تھے جیسے نہیں ہونے چاہئیں تھے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے باطل معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع فرما دیا تھا ـــــ حالانکہ یہ ایک نیک کام ہے ـــــ کیونکہ اس کے نتیجے میں مشرکین اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے تھے، جو سب سے بڑی برائی ہے۔

بعض اوقات داعی ایک برائی کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے، یا اس پر تنقید کو وقتی طور پر مؤخر کر دیتا ہے، یا اس سے منع کرنے کا طریق کار تبدیل کر دیتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح ایک بڑی غلطی یا گناہ کا سدباب ہو سکتا ہے۔ اس اقدام کو کوتاہی یا پسپائی کا نام نہیں دیا جا سکتا، بشرطیکہ اس کی نیت درست ہو اور اس کے دل میں کسی کی ملامت کا خوف نہ ہو، اور وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں بلکہ دین کی مصلحت کے لئے اس سے رکا ہو۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک غلطی سے منع کرتے ہوئے اس سے بڑی غلطی کے ارتکاب کی ایک وجہ ایسا جوش بھی ہے جس کے ساتھ حکمت کو مدنظر نہ رکھا گیا ہو۔

۱۱) غلطی کرنے والے کی فطری کمزوری کا احساس :

بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو مکمل طور پر ختم کرنا ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا تعلق کسی فطری معاملہ سے ہوتا ہے، البتہ ان غلطیوں کو کم یا ہلکا کیا جا سکتا ہے، کیونکہ زیادہ باریک بینی کے نتیجے میں کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے، جیسے کہ عورت کا معاملہ ہے، جس کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہے :

((اِنَّ الْمَرأَۃَ خُلِقَتْ مِن ضِلَعٍ ' لَنْ تَستقِیمَ لَکَ علٰی طریقۃٍ ' فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِھَا اسْتَمْتَعْتَ بِھَا وَبِھَا عِوَجٌ ' وَاِنْ ذَھَبْتَ تُقِیمُھَا کَسَرتَھَا ' وَکَسْرُھَا طَلاَقُھَا)) (۲۵)

"عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے' وہ کسی طرح بھی (مکمل طور پر) سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اگر تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کجی کی موجودگی میں ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے گا تو اسے توڑ بیٹھے گا۔ اس کے ٹوٹنے سے مراد طلاق ہے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے :

((اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَیرًا ' فَاِنَّھُنَّ خُلِقْنَ مِن ضِلَعٍ ' وَاِنَّ اَعْوَجَ شَیءٍ فِی الضِّلَعِ اَعْلاَہُ ' فَاِنْ ذَھَبْتَ تُقِیمُہُ کَسَرْتَہُ ' وَاِنْ تَرَکْتَہُ لَمْ یَزَلْ اَعْوَجَ ' فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَیرًا)) (۲۶)

"میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ عورتوں سے بھلائی کرتے رہنا' کیونکہ عورتوں کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے' اور پسلی اوپر کی طرف سے زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اگر تو اس کو سیدھا کرنا چاہے گا تو اسے توڑ ڈالے گا' اور اگر رہنے دے گا تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ عورتوں سے بھلائی کرتے رہنا۔"

امام ابن حجرؒ نے فرمایا : "فرمان نبویؐ "عورتوں سے بھلائی کرتے رہنا" میں یہ اشارہ ہے کہ نرمی سے سیدھا کیا جائے' اس میں نہ تو اتنی شدت برتی جائے کہ ٹوٹنے (طلاق) تک نوبت پہنچ جائے' نہ اسے ویسے ہی رہنے دے کہ وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے.... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے فطری نقص سے زیادہ ٹیڑھی ہو جائے یعنی کسی گناہ کا ارتکاب کرے یا کسی فرض کو ترک کرے تو اُسے اتنی کجی کی حامل نہیں رہنے دینا چاہئے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جائز کاموں میں اس کی کجی برداشت کرے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تالیف قلب کے لئے لوگوں سے نرمی کا سلوک کرنا چاہئے۔ اس میں عورتوں سے بہتر سلوک کی ہدایت بھی ہے کہ ان کی غلطیوں کو معاف کیا جائے اور ان کی کجی پر صبر کیا جائے' اور جو شخص انہیں بالکل سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ ان سے

فائدہ اٹھانے سے محروم ہو جائے گا' حالانکہ انسان کو ایک عورت کی ضرورت بہر حال ہوتی ہے' تاکہ اس سے تسکین حاصل ہو اور زندگی بسر کرنے میں اس کی مدد حاصل رہے۔ گویا کہ آنحضرت ﷺ یوں فرمارہے ہیں : اس سے فائدہ صرف اسی صورت میں اٹھایا جاسکتا ہے جب اس کی کوتاہیوں پر صبر کیا جائے"۔ (۲۷)

۱۴) دین کی مخالفت اور کسی کی ذات پر حملہ میں فرق ہے :

چونکہ ہماری نظر میں ہمارے دین کی قدر و قیمت ہماری ذات اور شخصیت کی قیمت سے کہیں بڑھ کر ہے' اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم دین کی حمایت و دفاع میں اپنی شخصیت کے دفاع کی نسبت زیادہ غیرت کا مظاہرہ کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک شخص کو گالی دی جاتی ہے تو اسے غصہ آتا ہے لیکن جب دین کی توہین یا مخالفت کی جاتی ہے تو اسے یا تو غصہ آتا ہی نہیں' یا وہ جواب دیتا بھی ہے تو بڑے کمزور لہجے میں شرماتے اور جھجکتے ہوئے بات کرتا ہے۔ یہ دینی غیرت کی کمزوری کی دلیل ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ آپؐ اپنی ذات اقدس سے متعلق دوسروں کی غلطیوں سے اکثر چشم پوشی فرماتے تھے' خصوصاً جاہل بدوؤں کی تالیف قلب کے لئے ان کی نامناسب حرکتیں معاف فرمادیتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں فرمایا : "میں جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلا جارہا تھا' آنحضرت ﷺ نے موٹے کنارے والی نجرانی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ایک بدو پیچھے سے آیا اور آپؐ کی چادر مبارک پکڑ کر اسے زور سے کھینچا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی گردن مبارک پر چادر کے کنارہ کی رگڑ سے نشان پڑ گیا۔ پھر وہ بولا : یا محمد! آپ کے پاس اللہ کا جو مال ہے' اس میں سے مجھے بھی دلوائیے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور ہنس دیئے' پھر اسے کچھ مال دلوادیا"۔ (۲۸)

البتہ اگر غلطی کا تعلق دین سے ہوتا تو نبی اکرم ﷺ اللہ کی خاطر غضب ظاہر فرماتے تھے۔ اس کی مثالیں آگے آئیں گی۔

پیش نظر رکھے جانے والے بعض دیگر امور :

غلطیوں کے بارے میں ہمارے رویہ میں کچھ اور چیزوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً :

○ بڑی غلطی اور چھوٹی غلطی میں امتیاز کریں۔ خود شریعت نے بھی کبیرہ گناہوں اور صغیرہ گناہوں کو ایک درجہ میں نہیں رکھا۔

○ گناہ کے عادی شخص اور شاندار ماضی والے ایسے انسان کے درمیان فرق ہوتا ہے جس کی غلطی اس کی عظیم نیکیوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ماضی میں کارنامے انجام دینے والے شخص کی ایسی بات کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے جو اگر کوئی اور کرے تو نظرانداز نہیں کی جاتی۔ اس کی وضاحت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے ہو سکتی ہے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا : ہم لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ جب ہم مقام "عرج" پر پہنچے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ ڈالا۔ ہم بھی سواریوں سے اتر آئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں اپنے والد محترم رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھ گئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیقؓ دونوں کا سامان ایک ہی اونٹ پر تھا' جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک غلام کی ذمہ داری میں تھا۔ حضرت ابوبکرؓ بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ (کچھ دیر بعد) غلام آپہنچا لیکن اونٹ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ابوبکرؓ نے فرمایا : "تمہارا اونٹ کہاں ہے؟" اس نے کہا : "وہ تو رات کو گم ہو گیا"۔ ابوبکرؓ نے غلام سے فرمایا : "ایک اونٹ بھی تجھ سے گم ہو گیا؟" اور اسے مارنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا' اور ارشاد فرمایا : "ان احرام والے (حاجی صاحب) کو دیکھو' کیا کر رہے ہیں؟" ابن ابی رزمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا : "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف یہی بات فرماتے رہے : "دیکھو یہ حاجی صاحب کیا کر رہے ہیں" اور مسکراتے رہے۔ (۲۹)

○ بار بار غلطی کرنے والے اور پہلی بار غلطی کرنے والے میں فرق ملحوظ رکھا جائے۔

○ یکے بعد دیگرے غلطی کا ارتکاب کرنے والے میں اور طویل عرصہ بعد دوبارہ غلطی کرنے والے میں فرق کا خیال کیا جائے۔

○ سرعام غلطی کرنے والے اور چھپ کر وہی غلطی کرنے والے میں فرق مدنظر رکھا جائے۔

○ جس شخص کا ایمان کمزور ہو اور اس کی تالیف قلب کی ضرورت ہو' اس پر سختی نہ کی جائے۔

○ غلطی کرنے والے کے مقام و مرتبہ کو پیش نظر رکھا جائے۔

ان امور کو ملحوظ خاطر رکھنا اس عدل کے منافی نہیں جس کا کچھ پہلے ذکر ہوا۔

○ بچے کو غلطی پر تنبیہہ کرتے وقت اس کی عمر کا خیال رکھا جائے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ حضرت حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور لے کر منہ میں ڈال لی تو نبی ﷺ نے فرمایا : "تھو' تھو' تجھے معلوم نہیں کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھایا کرتے"۔(۳۰)

طبرانیؒ نے جناب رسول اللہ ﷺ کی سوتیلی بیٹی حضرت زینب بنت ابی سلمہ (رضی اللہ عنہما) سے روایت بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ غسل فرمارہے تھے کہ وہ اندر چلی گئیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے چلو بھر پانی لے کر میرے چہرے پر پھینکا اور فرمایا : "اری' پیچھے رہ!"(۳۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلطی کرنے والے کا بچہ ہونا اس کی غلطی کی اصلاح سے مانع نہیں' بلکہ یہ اس کی تربیت کا ایک جزو ہے' کیونکہ بچپن میں سنی ہوئی بات اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور مستقبل میں محفوظ رہتی ہے۔ مذکورہ بالا مثالوں میں پہلی حدیث میں یہ سبق ہے کہ بچے کو تقویٰ کی تعلیم دینی چاہئے اور دوسری حدیث میں یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ بچے کو اجازت لے کر اندر آنے کی عادت ڈالی جائے اور سکھایا جائے کہ چھپانے کے قابل چیزوں کو نہیں دیکھنا چاہئے۔

اس سلسلہ کی ایک خوبصورت مثال چھوٹے بچے حضرت عمر بن ابی سلمہؓ (حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا کے بھائی) کی ہے' وہ فرماتے ہیں : میں جناب رسول اللہ ﷺ کی کفالت میں تھا۔ (ایک بار آنحضرت ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کے دوران) میرا ہاتھ برتن میں گردش کر رہا تھا (کبھی کہیں سے لقمہ لے لیا' کبھی کہیں سے)' جناب رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا : ((یَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِينِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ)) "لڑکے! اللہ کا نام لو' سیدھے ہاتھ سے کھاؤ' اور اپنے قریب سے کھاؤ"۔ صحابیؓ فرماتے ہیں : اس کے بعد سے میں ہمیشہ اسی طرح کھانا کھاتا ہوں"۔ (۳۲)

○ اجنبی عورتوں کو غلطی پر ٹوکنے میں احتیاط سے کام لیا جائے' تاکہ اس روک ٹوک کا کوئی غلط مطلب نہ لیا جائے' اور انسان فتنہ میں پڑنے سے محفوظ رہے۔ اس لئے جوان لڑکے کو ڈھیل نہ دی جائے کہ جوان لڑکی سے بات چیت کرے اور غلطی کی وضاحت' برائی سے ممانعت اور مسئلہ کی تعلیم کا بہانہ بنا لے۔ کیونکہ یہ عمل بہت سے مصائب کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ اس میدان میں زیادہ کردار ان اداروں کے افراد کو ادا کرنا چاہئے جن پر برائیوں کی روک تھام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے' اور معمر بزرگوں کو ان سے تعاون کرنا چاہئے۔ نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے منع کرنے والے کو چاہئے کہ عورتوں سے بات کرنے میں وہ اسلوب اختیار کرے جس کے مفید ہونے کا زیادہ امکان ہو۔ اگر اس کا غالب گمان یہ ہو کہ بات کرنے سے فائدہ ہو گا تو بات کرے' ورنہ خاموش رہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بد تمیز اپنی غلطی پر اصرار کرتے ہوئے روکنے والے پر کوئی نازیبا الزام لگا دے۔

برائی سے منع کرنے اور تبلیغ کے عمل میں معاشرے کا حال اور منع کرنے والے کا مقام اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ واقعہ پڑھئے :

ابو رُھمؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت عبیدؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایک عورت مسجد کی طرف جاتی نظر آئی جس نے خوشبو لگا رکھی تھی۔ آپؓ نے فرمایا : "جبار کی بندی! کدھر جا رہی ہے؟" وہ بولی : "مسجد میں جا رہی ہوں۔" فرمایا : کیا اسی لئے خوشبو لگائی ہے؟" اس نے کہا : "جی ہاں۔" حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا : "میں نے

رسول اللہ ﷺ سے یہ ارشاد مبارک سنا ہے : ((اَیُّمَا امْرَاۃٍ تَطَیَّبَتْ ثُمَّ خَرَجَتْ اِلَی الْمَسْجِدِ لَمْ تُقْبَلْ لَهَا صَلَاۃٌ حَتّٰی تَغْتَسِلَ)) "جو عورت خوشبو لگا کر مسجد کی طرف چلے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی' حتیٰ کہ غسل کرے"۔ (۳۳)

صحیح ابن خزیمہ میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے ایک عورت گزری' اور اس کی خوشبو مہک رہی تھی۔ آپؓ نے اس سے فرمایا : "جبار کی بندی! کہاں جا رہی ہو؟" اس نے کہا: "مسجد میں"۔ فرمایا: "خوشبو لگا رکھی ہے؟" اس نے کہا: "جی ہاں"۔ فرمایا: "واپس جا کر غسل کرو' میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا : "اللہ تعالیٰ اس عورت کی نماز قبول نہیں کرتا جو مسجد کی طرف اس حال میں جائے کہ اس کی خوشبو مہک رہی ہو' حتیٰ کہ واپس جا کر نہالے (تا کہ خوشبو کا اثر ختم ہو جائے)"۔ (۳۴)

- غلطی کے اثرات مٹانے کی کوشش کرنے کی بجائے اصل غلطی اور اس کے سبب کو دور کیا جائے۔
- غلطی کو مبالغہ کے ساتھ بڑھا چڑھا کر پیش نہ کریں۔
- غلطی کو ثابت کرنے میں تکلف سے کام نہ لیں اور یہ کوشش نہ کریں کہ غلطی کرنے والا اپنی زبان سے اپنی غلطی تسلیم کرے۔
- غلطی کی اصلاح کے لئے مناسب حد تک وقت دیں۔ خاص طور پر ایسے شخص کو اصلاح کا کافی موقع دیں جو طویل عرصہ تک اس غلطی کا عادی رہا ہے۔ ساتھ ہی اسے وقتاً فوقتاً تنبیہہ کرتے رہیں اور دیکھیں کہ کس حد تک اصلاح ہو رہی ہے۔
- غلطی کرنے والے کو یہ احساس نہ پیدا ہونے دیں کہ آپ اسے اپنا مخالف سمجھتے ہیں۔ یہ امر پیش نظر رکھیں کہ اپنے موقف کی تائید حاصل کر لینے سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ ایک شخص آپ کا ساتھی بن جائے۔

اس مقدمہ کے بعد اب کچھ ذرائع اور طریقے پیش خدمت ہیں' جو نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کی غلطیوں کے بارے میں اختیار فرمائے' جیسا کہ علمائے کرام کی روایت کردہ صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱۵) مسند احمد ۔ دیکھئے الفتح الربانی ۱۴/ ۲۴۴'۲۴۵۔ سنن ترمذی حدیث نمبر ۲۷۹۸ طبع شاکر۔ سنن ابی داؤد' کتاب الادب' حدیث نمبر ۵۰۴۰۔ طبع دعاس۔ صحیح الجامع' حدیث نمبر ۷۰۲۲۔۲۲۷۱۔

(۱۶) اس سے ملتی جلتی مثال غلطی کرنے والے کو پیٹنا یا اسے کنکری مارنا ہے۔ بعض صحابہؓ اور تابعینؒ نے ایسا کیا ہے۔ ان سب کا دارومدار تنبیہہ کرنے والے کے مقام و مرتبہ پر ہے۔ یہاں چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

حضرت سلیمان بن یسارؒ سے روایت ہے کہ مدینہ میں ایک آدمی آیا۔ اس کا نام صَبیغ تھا۔ وہ قرآن مجید کی متشابہ آیات کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھجور کی چھڑیاں منگوائیں اور اس شخص کو طلب فرمالیا۔ آپؓ نے فرمایا : تو کون ہے؟ اس نے کہا : میں اللہ کا بندہ صَبیغ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے ایک چھڑی لے کر اسے پیٹا اور فرمایا : میں اللہ کا بندہ عمر ہوں۔ آپؓ نے اسے اتنا پیٹا کہ اس کے سر سے خون نکل آیا۔ تب اس نے کہا: امیرالمومنین! بس کریں' میرے سر کی بیماری دور ہو گئی ہے۔ (سنن دارمی' تحقیق عبداللہ بن ہاشم یمانی ۱/۵۱۔ حدیث نمبر ۱۴۶)

حضرت ابن ابی لیلیٰؒ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ مدائن میں تھے۔ آپؓ نے پانی طلب فرمایا۔ ایک کسان چاندی کے برتن میں پانی لے آیا۔ آپؓ نے پیالہ اس کے منہ پر دے مارا۔ ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں: ہم نے ایک دوسرے سے کہا: خاموش رہو۔ اگر ہم نے سوال کیا تو آپؓ ہمیں بات نہیں بتائیں گے۔ کچھ دیر کے بعد آپؓ نے فرمایا: جانتے ہو میں نے پیالہ اس کے منہ پر کیوں دے مارا تھا؟ ہم نے کہا: جی نہیں۔ فرمایا: میں نے اسے منع کیا تھا (لیکن اس نے پھر یہی حرکت کی)۔ اور فرمایا: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے "سونے کے برتنوں میں نہ پیا کرو"۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے یہی حدیث ان الفاظ میں مروی ہے: "سونے یا چاندی کے برتن میں نہ پیو' نہ باریک یا موٹا ریشم پہنو' یہ چیزیں دنیا میں ان (کافروں) کے لئے ہیں اور آخرت میں تمہارے لئے"۔ (مسند احمد ۵/۳۹۶)۔

امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت سیرینؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے

مکاتبت کی درخواست کی۔ حضرت انسؓ صاحب ثروت تھے، تاہم انہوں نے یہ درخواست قبول نہ کی۔ سیرینؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جا بتایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے فرمایا : اس سے مکاتبت کرلو۔ انسؓ نے انکار کیا، تو عمرؓ نے انہیں کوڑا مارا، اور یہ آیت پڑھی: فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا۔ (اگر تمہیں ان غلاموں میں خیر نظر آئے تو ان سے مکاتبت کر لیا کرو)۔ چنانچہ انس رضی اللہ عنہ نے مکاتبت کر لی۔ (فتح الباری۔۵/۱۸۴)

امام نسائیؒ نے روایت کی ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے، اچانک مروان رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا ان کے سامنے سے گزرنے لگا۔ انہوں نے (اشارے سے) روکا، وہ نہ رکا، انہوں نے اسے مارا۔ بچہ رونے لگا اور مروانؓ کو جا کر بتایا۔ مروانؒ نے ابو سعیدؓ سے کہا: آپ نے اپنے بھتیجے کو کیوں مارا؟ انہوں نے فرمایا: میں نے اسے نہیں مارا، میں نے شیطان کو مارا ہے۔ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا : "جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور اس کے سامنے سے کوئی انسان گزرنا چاہے تو جہاں تک ہو سکے اسے روکے، اگر نہ رکے تو اس سے لڑے، وہ شیطان ہے"۔ مجتبیٰ نسائی ۸/۶۱۔ صحیح سنن نسائی حدیث ۴۵۱۸)

حضرت ابو النضرؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ٹانگ میں تکلیف تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر لیٹ گئے۔ ان کے بھائی رضی اللہ عنہ تشریف لائے، (انہیں اس طرح لیٹے دیکھا تو) ان کی دکھتی ٹانگ پر ہاتھ مارا جس سے انہیں تکلیف ہوئی۔ انہوں نے کہا : آپ نے میری ٹانگ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ دکھتی ہے؟ فرمایا : ہاں (معلوم تھا)۔ انہوں نے کہا : پھر آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے فرمایا: کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس (طرح لیٹنے) سے منع فرمایا ہے۔ (مسند احمد ۳/۴۲)

حضرت ابو زبیر مکیؒ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے سے اس کی بہن کا رشتہ مانگا۔ لڑکی کے بھائی نے (بات چیت کے دوران) ذکر کر دیا کہ لڑکی سے ناجائز تعلق کی غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے اس شخص (لڑکی کے بھائی) کو پیٹا، یا سختی سے سرزنش کی۔ اور فرمایا : تو نے یہ بات کیوں بتائی؟ (موطا امام مالک۔ حدیث ۱۵۵۳۔ روایت ابو مصعب زہری)

حضرت ابو اسحاقؒ نے فرمایا : میں بڑی مسجد میں حضرت اسود بن یزید کے ساتھ بیٹھا

ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ امام شعبیؒ بھی تھے۔ شعبیؒ نے حضرت فاطمہ بنت قیس (رضی اللہ عنہا) والی حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رہائش اور خرچ نہیں دلوایا تھا۔ حضرت اسود نے کچھ کنکریاں پکڑ کر شعبی کو ماریں اور فرمایا: تم یہ حدیث بیان کرتے ہو حالانکہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ ہم ایک عورت کی وجہ سے اللہ کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت نہیں چھوڑ سکتے۔ معلوم نہیں' اس خاتون کو واقعہ یاد بھی رہا ہے یا نہیں۔ بلکہ (تین طلاق والی) عورت کو (عدت کے دوران) رہائش اور خرچ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ﴾ (عورتوں کو گھروں سے مت نکالو' نہ وہ خود نکلیں' الا یہ کہ وہ واضح بے حیائی کی مرتکب ہوں) (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۴۸۰)

امام ابوداؤد نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ دو آدمی کندہ کے دروازوں کی طرف سے آئے۔ ابو مسعود انصاری ؓ ایک حلقہ میں تشریف فرما تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے کہا: ہے کوئی شخص جو ہمارے درمیان فیصلہ کرے؟ حلقہ میں موجود ایک شخص بولا: میں کرتا ہوں۔ حضرت ابو مسعودؓ نے ہاتھ میں کنکریاں پکڑ کر اسے دے ماریں اور فرمایا: "رک جاؤ' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس طرح جلدی سے منصف بن جانا پسند نہیں کرتے تھے"۔ (سنن ابوداؤد' کتاب الاقضیہ' باب فی طلب القضاء والتسرع الیہ)۔

(۱۷) صحیح مسلم' حدیث نمبر ۵۴۷ (طبع عبدالباقی)۔

(۱۸) مسند احمد ۴/ ۲۵۳۔

(۱۹) سنن ترمذی حدیث ۱۳۲۶۔ طبع شاکر۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

(۲۰) سنن ابی داؤد' کتاب الطہارہ' باب المجروح یتیمم۔ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اشارہ کیا ہے کہ آخری جملہ ضعیف ہے۔ (صحیح ابوداؤد حدیث ۳۲۵)۔

(۲۱) سنن ابی داؤد' حدیث نمبر ۳۵۷۳۔ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے (ارواء الغلیل حدیث ۲۱۶۴)

(۲۲) سنن دارمی' حدیث نمبر ۲۱۰۔ تحقیق عبداللہ ہاشم یمانی۔ البانی نے سلسلہ صحیحہ میں حدیث نمبر ۲۰۰۵ کے تحت فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ نیز دیکھئے مجمع الزوائد ہیثمی ۱/ ۱۸۱۔

(۲۳) یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔ یہاں ذکر کردہ عبارت صحیح

مسلم کی حدیث نمبر ۱۶۸۸ کے مطابق ہے۔

(۲۴) سنن نسائی طبع دار الفکر' جلد ۸ ص ۷۳۔ البانی نے صحیح سنن النسائی میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (حدیث نمبر ۴۵۴۸)

(۲۵) صحیح مسلم بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ حدیث نمبر ۱۴۶۸۔

(۲۶) صحیح بخاری مع فتح الباری۔ حدیث نمبر ۵۱۸۶

(۲۷) فتح الباری جلد ۹' صفحہ ۹۵۴۔

(۲۸) صحیح بخاری' مع فتح الباری' حدیث نمبر ۵۸۰۹

(۲۹) سنن ابی داؤد' کتاب المناسک' باب المحرم یودب غلامہ۔ علامہ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ (صحیح سنن ابی داؤد۔ حدیث نمبر ۱۶۰۲)

(۳۰) صحیح بخاری مع فتح الباری' حدیث نمبر ۳۰۷۲۔

(۳۱) معجم کبیر طبرانی ۲۸۱/۲۴۔ ہیثمی نے فرمایا: اس کی سند حسن ہے (مجمع ۲۶۹/۱)۔

(۳۲) صحیح بخاری مع فتح الباری' حدیث نمبر ۵۳۷۶۔

(۳۳) سنن ابن ماجہ' حدیث نمبر ۴۰۰۲۔ صحیح ابن ماجہ ۳۶۷/۲۔

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان ذُوالنُّورَین رضی اللہ عنہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

میں چونکہ قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں لہٰذا میری کوشش یہ ہوئی کہ قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی روشنی میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے چند مناقب و فضائل اور ان کی سیرت کے چند پہلو آپ کے سامنے رکھوں۔

امیرالمومنین سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل کے ضمن میں سب سے زیادہ مشہور و معروف بات ان کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دامادی کی قرابت ہے جو تقریباً ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک نسلی تعلق اور قرابت داری اصل اساسِ فضیلت نہیں ہے۔ قرآن مجید نے تو اس تصور کی کامل نفی کی ہے، چنانچہ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا ہے :

﴿ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝ ﴾ (الحجرات ۱۳)

"لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے (جدا جدا) خاندان اور قومیں جو بنائی ہیں تو باہم شناخت کے لئے (نہ کہ تکبر و افتخار کے لئے) بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت دار تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ بیشک اللہ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

رنگ و نسل اور خون کے رشتوں کے تعلق کو، جنہیں عام طور پر دنیا میں شرف و فضیلت کی اساس سمجھا گیا ہے، قرآن مجید نے غلط قرار دیتے ہوئے رنگ و نسل کے تمام

بتوں کو توڑ ڈالا ہے اور اصل بنائے شرف و عزت اور کرامت و فضیلت صرف تقویٰ کو قرار دیا ہے۔ اسی کی تفسیر و تشریح نبی اکرم ﷺ نے اس طرح فرمائی کہ حضورؐ نے اپنے اہل خاندان کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا اور رشتہ داری کے لحاظ سے جو لوگ قریب ترین تعلق کے حامل ہو سکتے ہیں ان کو نام بنام مخاطب فرمایا کہ :

((...يَا عَبَّاسُ بْنَ عَبْدِالْمُطَّلِبِ لَا أُغْنِي عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ' وَيَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُولِ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ' وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ ' سَلِيْنِي مَا شِئْتِ مِنْ مَالِي ' لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا)) (متفق علیه)

"... (اے رسول اللہ کے چچا) عباس بن عبد المطلب ' میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا ' اور اے صفیہ ' رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی! میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا ' اور اے محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ! تم میرے مال میں سے جو چاہو مجھ سے مانگ سکتی ہو ' لیکن اللہ کے ہاں میں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا"۔

یہ مضمون متعدد احادیث میں بیان ہوا ہے۔ ترمذی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں :

((يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ (ﷺ) اَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ ' فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا))

"اے محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لئے کہ میں اللہ کے مقابلے میں تمہارے لئے کسی نقصان یا نفع کا اختیار نہیں رکھتا"۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں نسل ' نسب اور رنگ و خون کو بنائے شرف و فضیلت سمجھنے کے باطل نظریہ پر یہ ارشاد فرما کر کاری ضرب لگائی کہ :

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ ' أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ ' وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ ' أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ ' وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ ' وَلَا لِأَحْمَرَ

عَلٰی اَسْوَدَ، وَلاَ اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ، اِلاَّ بِالتَّقْوٰی))

(مسند احمد، عن ابی نضرۃ)

"اے لوگو! جان لو کہ تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہی ہے! جان لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر، اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ بنائے فضیلت صرف تقویٰ ہے"۔

سورۃ الحجرات کی مذکورہ آیت میں تقویٰ کو فضیلت و اکرام کی بنیاد قرار دینے کے علاوہ قرآن حکیم نے اس بات کو مختلف اسالیب سے بیان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی حسب و نسب کسی کے کام نہیں آ سکے گا، بلکہ ہر انسان کو صرف اس کے اپنے اعمال ہی اللہ کی پکڑ سے بچا سکیں گے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلاَّ مَا سَعٰیO وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰیO﴾ اور متعدد مقامات پر فرمایا گیا: ﴿لاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰیO﴾

یہود و نصاریٰ کو یہی پندار لاحق ہو گیا تھا کہ چونکہ وہ انبیاء کی اولاد ہیں اور ان کی نسل میں جلیل القدر پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے چہیتے ہیں اور اس کے بیٹوں کی مانند ہیں: ﴿وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدہ: ۱۸) چنانچہ ان کے اس پندار کو قرآن مجید نے باطل قرار دیا اور فرمایا گیا:

﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا لاَّ تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلاَ یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ...﴾ (البقرہ: ۴۸) نیز ان کو متنبہ کیا گیا کہ پچھلوں کی کمائی ان کے لئے تھی اور تمہاری کمائی تمہارے لئے ہے: ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ﴾ (البقرہ: ۱۳۴ و ۱۴۱)

پس معلوم ہوا کہ از روئے قرآن مجید اصل بنائے فضیلت اور اصل بنائے شرف نسل اور خون کا رشتہ نہیں ہے بلکہ ایمان و تقویٰ ہے۔ بایں ہمہ دو باتیں انتہائی قابل غور ہیں۔ پہلی یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری اور رشتے داری کا تعلق چاہے کلی طور پر بنائے فضیلت نہ ہو لیکن من وجہٍ فضیلت کی ایک بنیاد ضرور ہے۔

دوسری یہ کہ چونکہ عوام کے ذہن عموماً اِن بنائے شرف کو قبول کر لیتے ہیں' بلکہ عوام کی اکثریت کا تصور فضیلت یہی ہے' چنانچہ ہمارے یہاں ایک مکتبۂ فکر نے عوام الناس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسی چیز کو بنائے شرف و فضیلت بنا کر اس کا زبردست چرچا کیا ہے۔ لہٰذا اِس نقطۂ نظر سے اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری کے پہلو کو نمایاں اور واضح کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

حضورؐ سے قرابت

امرواقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرابت و رشتہ داری کے لحاظ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تہرا رشتہ اور تعلق ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خاندان کے لحاظ سے نجیب الطرفین قرشی ہیں اور پانچویں پشت میں ان کا اور حضور ﷺ کا نسبی تعلق یکجا ہو جاتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ کی والدہ حضرت اروی بنت اُم الحکیم بنت عبدالمطلب تھیں' لہٰذا حضرت عثمان غنیؓ کی والدہ محترمہ جناب عبدالمطلب کی نواسی تھیں اور نبی اکرم ﷺ عبدالمطلب کے پوتے۔ گویا حضور ﷺ اور حضرت عثمان غنیؓ کی والدہ ماجدہ کے مابین پھوپھی زاد بہن اور ماموں زاد بھائی کا رشتہ ہے۔ لہٰذا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اِس نسبت سے نبی اکرم ﷺ کے بھانجے ہیں۔

شرفِ دامادی

دوسرا رشتہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے دوہرے داماد ہیں۔ ہجرت مدینہ سے بہت قبل حضورؐ کی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آئیں۔ ہجرت کے بعد غزوۂ بدر کے متصل ہی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا تو حضورؐ کی تیسری صاحبزادی حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا' حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حبالۂ نکاح میں آئیں۔ اِسی نسبت سے حضرت عثمان غنیؓ کا لقب "ذوالنورین" قرار پایا۔ حضور ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کا عقد نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہو چکا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضورؐ کی

دامادی کا شرف حاصل تھا۔ دامادی کے اس شرف کا ایک خاص گروہ کی طرف سے خوب چرچا کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی بادنیٰ تامل صاف نظر آتا ہے کہ حضرت عثمان غنی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں دامادی کی فضیلت دوچند اصل ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت عثمانؓ پر انتہائی رنج وملال طاری تھا اور افسردگی و پژمردگی ان کے چہرۂ مبارک سے ہویدا تھی۔ ایک روز اسی رنج و الم کے عالم میں حضورؐ نے پوچھا کہ "اے عثمانؓ تمہارا کیا حال ہے!" حضرت عثمانؓ نے عرض کیا: "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! میرے برابر اور کسی کو مصیبت نہ پہنچی ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی وفات پاگئیں اور میرے اور آپؐ کے درمیان دامادی کا رشتہ منقطع ہو گیا۔" حضور ﷺ نے فرمایا: "اے عثمانؓ! تم یہ کہہ رہے ہو اور جبریل علیہ السلام میرے پاس موجود ہیں' اور وہ مجھے خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح تم سے کر دیا ہے۔" گویا حضرت عثمان غنیؓ کا اُم کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح آسمان پر پہلے ہوا اور زمین پر بعد میں ـــــ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ یہ فضیلت صرف حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نصیب میں آئی کہ جس طرح اُم المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح حضورؐ سے پہلے آسمان پر ہوا اور بعد میں زمین پر' اسی طرح کا معاملہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہو چکا تھا ـــــ جب حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا بھی وفات پاگئیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر میری چالیس بیٹیاں ہوتیں اور وہ یکے بعد دیگرے انتقال کرتی رہتیں تو بھی میں اپنی بیٹیوں کو یکے بعد دیگرے عثمانؓ کے نکاح میں دیتا رہتا۔ روایات میں تعداد مختلف ہے لیکن سب میں یہ بات مشترک ہے کہ نبی اکرم ﷺ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی دامادی اور ان کے حسن سلوک سے اس قدر راضی' خوش اور مطمئن تھے کہ یکے بعد دیگرے اپنی صاجزادیوں کو ان کے نکاح میں دینے کے لئے تیار تھے۔

آپ جانتے ہیں کہ خسر اور داماد کا رشتہ بڑی نزاکتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اگر کسی داماد کے سلوک سے کسی بیٹی کا باپ غیر مطمئن ہو تو وہ کسی حال میں بھی اپنی دوسری بیٹی کو اس داماد کے نکاح میں دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ حضور

ﷺ حضرت عثمان غنیؓ کے نکاح میں یکے بعد دیگرے اپنی چالیس صاحبزادیاں دینے کے لئے تیار ہیں۔ یہ ایک ایسا شرف ہے کہ جس میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں اور یہ اس بات کی بھی روشن دلیل ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ حضورؐ کو کس قدر محبوب تھے۔

"ذُوالنّورین" کالقب

اگر دامادی کوئی وجہ شرف و فضیلت ہے اور یقیناً ایک درجے میں یہ وجہ شرف و فضیلت ہے تو اس لحاظ سے بھی حضرت عثمان غنی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فوقیت حاصل ہے۔ اور اسی نسبت سے آپؐ کالقب "ذوالنورین" قرار پایا تھا۔ اس معزز لقب کے چند اور پہلو بھی ہیں جو آگے بیان ہوں گے۔

معاندین کی جسارت

شاید آپ کو معلوم ہو کہ اِس دَور میں ایک مخصوص گروہ کی طرف سے نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ تاریخ کو مسخ کرنے کی جسارت کی جارہی ہے' اور وہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ کی صلبی صاحبزادی صرف حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا تھیں۔ بقیہ تین صاحبزادیاں حضرت زینب' حضرت رقیہ اور اُم کلثوم (رضی اللہ عنہن) حضور ﷺ کی صلبی بیٹیاں نہیں تھیں' بلکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے کسی پہلے فوت شدہ شوہر سے تھیں اور حضورؐ کی ربیبہ تھیں —— اتنا بڑا سفید جھوٹ اِس اعتماد پر گھڑا گیا ہے کہ آج سے پچاس ساٹھ سال بعد اس جھوٹ کو کسی طرح ایک تاریخی سند حاصل ہو جائے۔ چونکہ عوام الناس میں نہ شعور ہوتا ہے اور نہ ذوق تحقیق و جستجو' لہٰذا ان کے لئے پچاس ساٹھ سال پہلے کی کسی مطبوعہ کتاب کی عبارت بھی ایک سند اور دلیل کا درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ دراصل یہ جرمنی کے ڈاکٹر گونبلز کی خاص تکنیک ہے کہ بڑے سے بڑے جھوٹ ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ بولو اور مسلسل بولتے رہو' چند لوگ تو مغالطہ میں آکر اس جھوٹ کو سچ مان ہی لیں گے' اور بہت سے لوگ اگر تسلیم نہ بھی کریں تو کم از کم شکوک و شبہات

میں ضرور مبتلا ہو جائیں گے۔

یہ سب کچھ اس لئے کیا جا رہا ہے کہ جس گروہ نے نسلی تعلق اور قرابت ہی کو بنائے شرف و فضیلت قرار دیا ہے اور اسی پر اپنے تمام فلسفہ کی عمارت تعمیر کی اور اس کا تانا بانا اُستوار کیا ہے تو جب انہیں یہ نظر آتا ہے کہ حضورؐ سے دامادی کا تعلق اِدھر (یعنی حضرت علیؓ کی طرف) اکہرا ہے اور اُدھر (یعنی حضرت عثمانؓ کی طرف) دوہرا ہے تو انہوں نے اس بات کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی کہ خود ان کے اپنے مسلک کی تاریخ، فقہ اور احادیث کی کتابوں میں یہ بات بالصراحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن سے اور نبی اکرم ﷺ کے صلب سے چار بیٹیاں عطا فرمائی تھیں۔ انہوں نے یہ جھوٹ گھڑ لیا کہ نبی اکرم ﷺ کی صرف ایک ہی صُلبی صاحبزادی تھی اور وہ تھیں حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا۔ یہ طرزِ عمل ڈھٹائی اور بے شرمی نہیں تو اور کیا ہے؟

ذاتی فضائل

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جن اہل ایمان کا حضور ﷺ کے ساتھ قرابت اور رشتہ داری کا تعلق تھا ان کے لئے یہ تعلق بھی ایک بنائے فضیلت ہے، لیکن یہ اصل اور واحد بنائے فضیلت نہیں ہے، اصل بنائے فضیلت درحقیقت انسان کا اپنا کردار، اپنا عمل، اپنا تقویٰ اور اپنے اوصاف ہوتے ہیں۔ عربی کا ایک مشہور شعر ہے کہ ؎

إنَّ الفتٰی مَن یقول ھَا انا ذا
لیس الفتٰی مَن یقول کانَ ابی کذا

(اصل جواں مرد تو وہ ہے جو یہ کہے کہ "یہ میں ہوں"۔ وہ جواں مرد نہیں جو یہ کہے کہ میرا باپ ایسا تھا!)

اس شعر کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ "پدرم سلطان بود" کہنے والوں کو کبھی بھی دنیا میں مقام عزت حاصل نہیں ہوا ہے۔ سوال تو یہ ہوتا ہے کہ تم کیا ہو؟ جواں مرد تو وہی کہلانے کا مستحق ہے جو میدان میں آ کر یہ کہے کہ "یہ میں موجود ہوں" اور اُس میں واقعی جوان مردی کے جوہر موجود ہوں۔ جوان مرد وہ نہیں ہے جو یہ کہے کہ میرے باپ دادا ایسے

شجاع' جری اور دلیر تھے۔ دنیا ایسے دعووں کو کبھی تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی نظر میں قدر و وقعت صرف اس انسان کی ہوتی ہے جس میں اپنے ذاتی اوصاف حمیدہ موجود ہوں۔

مُنعَمَ علیہم کون ہیں؟

میں چاہتا ہوں کہ خاص ذاتی اَوصاف اور سیرت و کردار کے اعتبار سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت مبارکہ کا جائزہ لیا جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ الفاتحہ ہماری نماز کا جزوِلازم ہے۔ اس سورہ میں ہم اپنے رب سے ہر رکعت میں دعا کرتے ہیں کہ :

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا"۔ لیکن یہاں یہ بیان نہیں ہوا کہ "منعم علیہم" کون لوگ ہیں کہ جن کے راستے کی راہنمائی کی دعا کی جارہی ہے ـــــ فہم قرآن کا ایک اصول یہ ہے کہ : اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا' چنانچہ سورۂ نساء میں اس بات کو واضح کیا گیا۔ وہاں فرمایا گیا کہ ان اہل ایمان کو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو اس دنیا میں لازم کرلیں گے' آخرت میں ان لوگوں کی رفاقت و معیت نصیب ہوگی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا' اور یہ مُنعَم علیہم اور خوش نصیب لوگ انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین ہیں۔ ایسے مبارک اور احسن لوگوں کی رفاقت اہل ایمان کو نصیب ہوگی :

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ' وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ﴾ (النساء : ٦٩)

سورۂ نساء کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ ازروئے قرآن حکیم منعم علیہم کی چار جماعتیں ہیں۔ ان میں انبیاء کرام علیہم السلام بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ پھر صدیقین کا درجہ ہے' ان کے بعد شہدائے کرام' اور ان کے بعد مؤمنین صالحین ہیں۔ اِن چاروں درجات عالیہ میں سے جہاں تک نبوت کا تعلق ہے تو وہ پہلے ہی کسبی نہیں تھی' وہبی تھی۔ اور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر اس کا دروازہ ہمیشہ ہمیش کے لئے بند ہو چکا ہے۔

اب قیامت تک کسی نوع کا کوئی نبی مبعوث نہیں ہو گا' نہ ظلی نہ بروزی۔ اب جو بھی دعویٰ نبوت کرے اس کے کذّاب ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ البتہ بقیہ جو تین مراتب و مدارج ہیں ان کے دروازے اب بھی کھلے ہیں۔ اصحاب ہمت و عزیمت کے لئے اپنی اپنی ہمت' کوشش' محنت' ایثار اور کسی درجے میں اپنی اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے ان تینوں مراتب پر فائز ہونا اب بھی ممکن ہے۔ البتہ جو نفوسِ قدسی ؓ نبی اکرم ﷺ کے صحبت یافتہ ہیں اور صحابی ہونے کے شرف کے حامل ہیں ان کے رتبے اور مرتبے کو پہنچنا ممکن نہیں۔ ہاں! ان مقاماتِ عالیہ کے دروازے بند نہیں ہوئے اور مومنین کو اپنی اپنی سعی و جہد اور محنت کے نتیجہ میں یہ درجات حاصل ہو سکتے ہیں۔

صدّیقِ اکبرؓ کا مقام

اب اس مقدمے کے ساتھ آخری پارے کی سورۃ اللّیل کی چند آیاتِ مبارکہ پر غور کیجئے۔ اس سورۂ مبارکہ کی آخری چھ آیات کے متعلق تو مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں' جو بلاشبہ صدیق اکبر ہیں' اور جن کی شان یہ ہے کہ وہ "افضلُ البشرِ بعد الانبیاء بالتحقیق" ہیں۔ ان آیات میں "الاَتقٰی" کا مصداق اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان آیات میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف اللہ کی راہ میں مال صرف کرنا بیان ہوا ہے : ﴿اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ۝﴾ یہ مال اللہ کی راہ میں صدیق اکبرؓ نے اپنے تزکیہ کے لئے صرف کیا۔ یہ نہیں کہ ان پر کسی کا قرض یا دباؤ تھا بلکہ یہ سارا انفاق لِوَجْہِ اللّٰہِ تھا۔ چنانچہ فرمایا ﴿وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ تُجۡزٰۤی ۝ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِ الۡاَعۡلٰی ۝﴾ اس مال کے صرف کا ایک ہی مقصد صدیق اکبرؓ کے پیشِ نظر تھا اور وہ تھا رضائے الٰہی کا حصول ـــــ یتیموں کی سرپرستی' بیواؤں کی دستگیری' صاحبِ ایمان غلاموں کی خرید اور رُستگاری' مسافروں کی خبرگیری' محتاجوں کی حاجت روائی اور پھر دینِ حق کے غلبے اور اللہ کے جھنڈے کو بلند کرنے' اسلام کی نشر و اشاعت' جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے سامان کی فراہمی میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مال و منال خرچ ہو رہے تھے' اور تمہ

اور آرزو تھی تو صرف یہ کہ اللہ راضی ہو جائے ـــــ اس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی صدیق اکبرؓ کو اپنی رضا کی ان الفاظ میں خوش خبری سنائی ہے کہ : ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ○﴾ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورۃ اللیل دراصل "سورۃ الصدیق" ہے اور فوراً مابعد سورۃ الضحیٰ سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے ـــــ یہی نکتہ ہے کہ سورۃ اللیل میں صیغہ غائب میں فرمایا ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ○﴾ اور سورۃ الضحیٰ میں واحد حاضر کے صیغہ میں فرمایا : ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ○﴾

صدّیقیت کے عناصرِ ترکیبی

مقام صدیقیت کے جو عناصر ترکیبی ہیں وہ سورۃ اللیل کی اِن تین آیتوں میں بیان ہوئے ہیں : ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ○﴾ جس صاحب ایمان شخص کی سیرت و کردار میں یہ اَجزائے ثلاثہ "اِعطاء' تقویٰ اور تصدیق بالحسنٰی" جمع ہو جائیں اس کے لئے مقامِ صدیقیت کی راہ کشادہ اور آسان ہو جاتی ہے۔ آخری آیات میں سب سے زیادہ اعطاء کے وصف کو نمایاں کیا گیا' جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں : ﴿اَلَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ○﴾ ـــــ ایک طرف اِعطاء ہو' جُود و سخا ہو۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر انسان تڑپ اٹھے' اس کی تکلیف دور کرنا اگر اس کے بس میں ہو تو اسے دُور کرے۔ کسی کو احتیاج میں دیکھ کر اس کا اپنا آرام حرام ہو جائے' اور اس پر یہ دھن سوار ہو کہ کسی طرح اس کی احتیاج کے دور کرنے میں اس کا تعاون شامل ہو جائے۔ مقام صدیقیت کا یہ سب سے اعلیٰ وصف ہے۔ دوسرا وصف ہے تقویٰ ـــــ طبیعت میں نیکی کا مادہ' خیر کا جذبہ' نیکی کا فطری میلان' برائی اور بدی سے طبعی کراہت اور نفرت' برائی سے بچنے کا ذاتی رجحان اور کوشش ـ گویا خدا خوفی اور خدا ترسی کی ایک کیفیت ـــــ اور تیسرا وصف جو مقام صدیقیت کی تکمیل کرتا ہے' اور جس سے کسی کی صدیقیت پر مہر ثبت ہو جاتی ہے وہ ہے ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ○﴾ یعنی جو بھی اچھی بات سامنے آئے اس کی فوراً تصدیق کرے۔ انانیت نہ ہو' تکبر نہ ہو کہ میں اگر دوسرے کی بات مان لوں گا تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا اور وہ بڑا ہو جائے گا ـــــ ہم خود اپنے اوپر اکو

بات کو وارد کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ بسا اوقات کسی سے بحث ہو رہی ہو اور اثنائے بحث میں انسان محسوس کر بھی لے کہ مقابل کی بات درست ہے' لیکن وہ اپنی بات کی اُنچ اور انانیت کی بنا پر اپنے موقف کے غلط ہونے کے شعور و ادراک کے باوجود دوسرے کی بات تسلیم کرنے سے احتراز کرتا ہے اور اسے اپنی شکست اور ہیٹی سمجھتا ہے' لہٰذا کٹ حجتی اختیار کرتے ہوئے دلیل پر دلیل وضع کرتا چلا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کی بات کو مان لینا اور تسلیم کر لینا آسان کام نہیں۔ جس شخص میں یہ وصف ہو کہ چاہے دشمن بھی ایسی کوئی بات کہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہو تو اسے فوراً تسلیم کرے' بلاشبہ وہ صاحب کردار شمار ہو گا۔ اس طرزِ عمل کا نام ہے تصدیق بالحسنیٰ ــــــ یہ تینوں اوصاف اِعطاء' تقویٰ اور تصدیق بالحسنیٰ جس صاحب ایمان میں جمع ہو جائیں' وہ شخص صدیق کہلائے گا۔ چنانچہ سب سے زیادہ اور سب سے نمایاں طور پر یہ اوصاف ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں جمع ہوئے' اسی لئے وہ صدّیقِ اکبرؓ ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "صِدّیق" صرف وہی ہیں' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صدیقین کی جماعت میں حضرت ابوبکرؓ دراصل "صدیق اکبر" کے مقام پر فائز ہیں' وہ صدیقین کی جماعت کے سرخیل اور گلِ سرسبد ہیں۔ اس کی دلیل سورۃ النساء کی محوّلہ بالا آیت میں موجود ہے' جس میں جمع کا صیغہ "صِدّیقین" استعمال ہوا ہے۔

یہی بات سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝﴾ یعنی "بے شک صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں' اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیں' ان کے لئے دوگنا اجر ہے اور بہترین بدلہ ہے' جس میں اضافہ ہوتا رہے گا"۔ اس آیت کریمہ میں ایک اصطلاح "صدقہ" کی استعمال ہوئی ہے اور ایک "اللہ کو قرضِ حسن دینے کی"۔ اِن دونوں اصطلاحوں کے علیحدہ علیحدہ مفاہیم ہیں۔ "صدقہ" اُس اِنفاق کو کہتے ہیں جو یتیموں' بیواؤں' محتاجوں' مسافروں اور حاجت مندوں کی خبرگیری اور حاجت روائی کے لئے صرف کیا جائے' جبکہ اللہ کے ذمے "قرضِ حسن" دراصل وہ انفاق مال ہے جو اللہ کے دین کے غلبے' نشرو اشاعت اور دعوت و تبلیغ کی راہ میں کیا جائے'

جس کا مقصود و مطلوب ہو : لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔

سورۃ الحدید میں اللہ کے دین کے غلبے کے لئے مسلمانوں کو ترغیب و تشویق کا مضمون تانے بانے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا : ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهُ لَهُ وَلَهُ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ○﴾ "کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تاکہ وہ اس میں مسلسل اضافہ فرماتا رہے؟ ایسے شخص کے لئے اجر کریم ہے"۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی اور رحیمی ہے کہ وہ اس مال کو جو اس کے دین کی سربلندی کے لئے صرف کیا جائے' اپنے ذمے "قرض حسنہ" سے تعبیر کرتا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ تو الغنی ہے' اسے کسی کے مال کی کوئی حاجت نہیں' اس کی شان تو قرآن میں ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن وہ اپنے دین کی راہ میں خرچ کئے جانے والے مال کو اپنے ذمے قرض حسن سے تعبیر فرماتا ہے' جس سے محض مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی مقصود ہے۔

اسی سورۃ الحدید میں صاحب احتیاج لوگوں کی حاجت روائی اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے مال صرف کرنے والوں سے اجر کریم کے وعدے کے بعد فرمایا :

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ "اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے' وہی صدّیقین اور شہداء میں سے ہیں۔ ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے"۔ یعنی جن لوگوں میں اِعطاء کا وصف موجود ہے' جو بخیل نہیں' جود و سخا سے متصف ہیں' جو غرباء' یتامیٰ' مساکین اور دوسرے صاحب احتیاج لوگوں کی خبر گیری اور حاجت روائی' نیز اللہ کے دین کے غلبے اور نشر و اشاعت کے لئے اپنا مال صرف کرتے ہیں' یہی وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی ہوتی ہے تو وہ پورے طور پر بار آور ہوتا ہے' اور خوب برگ و بار لاتا ہے۔ یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بیج ایک ہو لیکن اگر زمین مختلف ہو تو نتائج بھی مختلف بر آمد ہوتے ہیں۔ ہر بیج کی نشو و نما اور بار آوری کے لئے لازم ہے کہ زمین اس بیج کے لئے سازگار ہو۔ اگر زمین بنجر ہو گی تو بیج ضائع ہو جائے گا۔ اسی بات کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادِ گرامی سے بھی واضح کیا اور اِسی کی ایک

تمثیل انجیل میں بھی بیان ہوئی ہے' جس کا مفاد یہ ہے کہ زمینوں کے فرق سے پیداوار میں زمین و آسمان کا تفاوت ہو جائے گا ـــــ ایک کشتِ قلب وہ ہے جس میں اِعطاء' صدقہ' اور انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چل چکا ہے۔ اس میں جب ایمان کا بیج پڑے گا تو بار آور ہو گا اور اس کو صدیقیت و شہادت کے مقاماتِ عظمیٰ تک رسائی حاصل ہو جائے گی : ﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ ﴾ "یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے نزدیک صدیق بھی ہیں اور شہید بھی ـــــ ﴿ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ﴾ "یہی وہ لوگ ہیں جن کا بدلہ بھی اللہ کے ہاں محفوظ ہے اور جن کا نور بھی محفوظ ہے"۔

سیرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے چند درخشاں پہلو

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے لقب "ذوالنورین" کی شرح اس آیت کی روشنی میں بھی ہوتی ہے' کیونکہ ہم جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت مبارکہ کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ نورِ صدیقیت اور نورِ شہادت' دونوں جس شخصیت میں یکجا جمع ہوئے ہیں وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اس بات کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت کے تجزیئے سے بہتر طریقے پر سمجھا جا سکے گا۔ میں جو بات واضح کرنا چاہتا ہوں' میں اس کا تانا بانا بُن چکا ہوں۔ اب آپ اس میں بہ سہولت پھول ٹانک سکتے ہیں' اب یہ پھول آپ کو علیحدہ محسوس نہیں ہوں گے بلکہ تانے بانے میں گتھے ہوئے نظر آئیں گے۔

جُود و سخا

سب سے پہلے "اِعطاء" کے وصف کو لیجئے جو مقامِ صدیقیت کا وصفِ اول ہے۔ یہ وصف حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "اِزَالَۃُ الخِفاء عَن خِلافۃِ الخُلفاء" میں محققین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو "ذُوالنّورین" کا جو لقب ملا تو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان میں دو سخاوتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ایک سخاوت اسلام لانے سے پہلے کی زندگی کی ہے اور دوسری سخاوت کی شان وہ ہے کہ جو اسلام لانے

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے بعد ظاہر ہوئی۔ اصلاً تو آپؓ کو "ذُوالنُّورین" کا لقب حضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں کا یکے بعد دیگرے آپؓ کے حبالۂ عقد میں آنے کی وجہ سے ملا تھا' لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک محققینِ اُمّت کا یہ قول بھی سند کا درجہ رکھتا ہے کہ اس معزز لقب کا باعث حضرت عثمانؓ کی زندگی میں اسلام سے قبل اور قبول اسلام کے بعد کی جود و سخا بھی ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عمر نبی اکرم ﷺ سے پانچ سال کم تھی۔ ان کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی بڑے گہرے مراسم تھے۔ ظاہر ہے کہ گہرے اور مضبوط دوستانہ تعلقات و مراسم میں طبیعت و مزاج کی یگانگی اور موافقت موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا جس طرح اسلام سے قبل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پیکر جود و سخا اور نوع انسانی کی ہمدردی سے معمور شخصیت تھے اسی کا عکس کامل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی تھے ــــــ اسلام لانے کے بعد جس طرح صدیق اکبرؓ نے اپنا سارا اثاثہ اور مال و منال دین حق کی سربلندی اور غلبے کے لئے لگایا اور ان غلاموں کو جو دولت ایمان سے مشرف ہونے کے باعث اپنے آقاؤں کے ہاتھوں ظلم کی چکی میں پس رہے تھے' اپنی جیب خاص سے خرید کر آزاد کیا' اور غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنا پورا گھر کا اثاثہ سمیٹ کر نبی اکرم ﷺ کے قدموں میں لاڈالا' کم و بیش یہی کیفیت حضرت عثمان غنیؓ کی بھی رہی ہے' اور انہوں نے نہایت ہی نامساعد حالات میں اپنے سرمائے سے دین کی خدمت کی ہے' جس کی چند مثالیں آگے بیان ہوں گی۔ اِس وقت جو بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر صدیق کی سیرت میں صدیقیت کبریٰ کا عکس ضرور نظر آئے گا۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت میں یہ عکس بتمام و کمال موجود ہے اور اسی وصف کے باعث ان کا دوسرا معزز لقب "غنی" بھی ہے۔

بئر رومہ کا وقف کرنا

ہجرت کے بعد جب مدینہ میں مسلمانوں کے لئے پانی کی قلت ہوئی اور مسلمانوں کی عورتیں بئرِ رومہ سے' جو ایک یہودی کی ملکیت تھا اور مدینہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر

تھا، پانی بھرنے جاتی تھیں تو یہودی ان پر فقرے کستے تھے اور اس طرح مسلمانوں کی عزت مجروح ہوتی تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے میٹھے پانی کے اس کنویں کے مالک یہودی کو منہ مانگی بھاری قیمت ادا کر کے بئرِ رومہ خریدا اور اُسے مسلمانوں کے اِستفادے کے لئے وقف کر دیا ـــــ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "اَلنَّاسُ کَالْمَعَادِنِ" یعنی "لوگ معدنیات کی مانند ہوتے ہیں"۔ سونے کی دھات جب ناصاف اور کچی حالت میں ہو تب بھی تو سونا ہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے ساتھ مٹی، چونا اور دوسری چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس کچی دھات کو کٹھالی میں ڈالئے تو خالص سونا فراہم ہو جائے گا، اس کی ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہی بات ہے جو اس حدیث مبارکہ میں بیان ہوئی ہے کہ خِیارکم فِی الجاھلیَّۃِ خیارکم فی الاسلام "تم میں سے جو دورِ جاہلیت میں بہترین لوگ تھے وہی اسلام میں بھی بہترین لوگ ہیں"۔ سونا جب تپ تپا کر کٹھالی سے برآمد ہوتا ہے تو زرِ خالص ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ صدیقین کا ہوتا ہے۔ ان میں جو اوصاف ایمان سے قبل موجود ہوتے ہیں وہ ایمان کی بھٹی میں گزر کر مزید نکھر جاتے ہیں اور پختہ ہو جاتے ہیں۔ اسی اعتبار سے صدیق اکبر اور عثمان غنی رضی اللہ عنہما کی سیرتوں کے دونوں ادوار میں فیاضی اور سخاوت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

غلاموں کو آزاد کرانا

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جو بالکل آغاز ہی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ایمان لائے تھے، خود فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت ایمان کرنے کے بعد میری زندگی میں کوئی جمعہ ایسا نہیں گزرا جس میں، میں نے کسی نہ کسی غلام کو آزاد نہ کیا ہو۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ میں کسی جمعہ کو غلام آزاد نہ کر سکا تو اگلے جمعہ کو میں نے دو غلام آزاد کئے۔

حرمِ نبویؐ کی توسیع

مسجد نبوی کی توسیع کے لئے نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا کہ "کون ہے جو

فلاں موچی خانے کو مول لے اور ہماری مسجد کے لئے وقف کردے تاکہ اللہ اس کو بخش دے" تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بیس یا پچیس ہزار دینار میں یہ قطعہ زمین خرید کر مسجد نبوی کے لئے وقف کر دیا۔

جیشِ عُسرہ کے لئے ایثار

غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ دیدنی تھا۔ یہ وہ موقع تھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تو اِس مقام بلند ترین تک پہنچے کہ کُل اثاثُ البیَت لاکر حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا' گھر میں جھاڑو تک نہ چھوڑی اور جب حضورؐ نے فرمایا کہ "کچھ فکر عیال بھی چاہئے" تو اُس رفیق غار اور عشق و محبت کے رازدار نے کہا کہ ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صِدّیق ؓ کے لئے ہے خدا کا رسول ؐ بس

یہی وہ موقع تھا کہ جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال گزرا تھا کہ وہ اس مرتبہ انفاق میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بازی لے جائیں گے' کیونکہ حسن اتفاق سے اُس وقت' خود حضرت عمر فاروقؓ کے بقول' اُن کے پاس کافی مال تھا۔ انہوں نے اپنے تمام اثاثے کے دو مساوی حصے کئے' ایک حصہ اہل و عیال کے لئے چھوڑا اور دوسرا حصہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا' لیکن جب جناب صدیق اکبرؓ کا یہ ایثار ان کے سامنے آیا کہ گھر میں جھاڑو پھیر کر سب کچھ خدمتِ اَقدس میں لاڈالا تو وہ بے اختیار پکار اٹھے کہ صدیق اکبرؓ سے آگے بڑھنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ غزوۂ تبوک کی تیاری ہو رہی ہے' سینکڑوں میل دُور کا سفر درپیش ہے' سخت ترین گرمی کا موسم ہے' جہاد کے لئے نفیر عام ہے' وقت کی عظیم ترین طاقت سلطنتِ روما سے مسلح تصادم کا مرحلہ سامنے ہے۔ مسجد نبویؐ میں نبی اکرم ﷺ منبر پر تشریف فرما ہیں اور لوگوں کو بار بار ترغیب و تشویق دلا رہے ہیں کہ وہ اِس غزوہ کے لئے زیادہ سے زیادہ انفاق کریں' آلاتِ حرب و ضرب اور سامانِ رسد و نقل و حمل مہیا کریں یا' اُس کی فراہمی کے لئے نقد سرمایہ فراہم کریں۔ اِس موقع پر حضرت

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے ہیں اور بارگاہ رسالت میں عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ! میری طرف سے ایک سو اونٹ مع ساز و سامان حاضر ہیں۔ حضورؐ کو علم ہے کہ کتنی عظیم مہم درپیش ہے اور کتنا ساز و سامان درکار ہے' لہٰذا حضورؐ صحابہ رضی اللہ عنہم کو انفاق کی مزید ترغیب دیتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پھر کھڑے ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ! میں مزید ایک سو اونٹ مع ساز و سامان پیش کرتا ہوں۔ حضورؐ لوگوں کو مزید ترغیب دیتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ تیسری بار پھر کھڑے ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ میں ساز و سامان سمیت ایک سو اونٹ مزید فی سبیل اللہ نذر کرتا ہوں۔ یعنی اس مرد غنیؓ کی جانب سے اس غزوہ کے لئے تین سو اونٹ مع ساز و سامان پیش کئے جاتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس موقع پر حضور ﷺ منبر سے اترے اور دو مرتبہ فرمایا کہ اس کے بعد عثمانؓ کو کوئی بھی عمل (آخرت میں) نقصان نہیں پہنچا سکتا"۔ اس واقعہ کے متعلق پوری حدیث درج ذیل ہے :

عن عبدالرحمٰن بن خباب رضی اللّٰہ عنہ قال شَهِدتُ النبیَّ صلَّی اللہ علیہ وسلم وھو یَحُثُّ علٰی تَجھیزِ جَیْشِ العُسْرَۃِ ' فقَام عثمانُ بنُ عَفَّان ' فقال : یارَسولَ اللّٰہ' عَلَیَّ مِائۃُ بعیر بِاَحْلاَسِهَا و اَقْتَابِهَا فِی سبیلِ اللّٰہِ' ثُمَّ حَضَّ عَلَی الْجَیشِ ' فقَام عُثمانُ فقال یارَسولَ اللّٰہِ. عَلَیَّ مِائَتَا بَعیرٍ بِاَحْلاَسِهَا و اَقْتَابِهَا فِی سبیلِ اللّٰہِ' ثُمَّ حَضَّ عَلَی الْجَیشِ' فقَامَ عُثمان فقال یارَسولَ اللّٰہِ عَلَیَّ ثَلاثُمِائَۃِ بعیرٍ بِاَحْلاَسِهَا و اَقْتَابِهَا فِی سبیلِ اللّٰہِ' فَاَنَا رَاَیتُ النبیَّ صلَّی اللّٰہ علیہ وسلم یَنْزِلُ علَی الْمِنبرِ وھُو یَقولُ : ((مَا عَلٰی عُثمانَ ما فَعَلَ بعدَ ھٰذِہٖ ' مَا علٰی عُثمانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ ھٰذِہٖ)) (رواہ الترمذی)

اسی جیش عسرہ کے لئے حضور ﷺ نقد سرمائے کے انفاق کی بھی ترغیب دلاتے ہیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے مستقر پر جاتے ہیں اور اپنے گماشتوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ

جس قدر بھی نقد سرمایہ جمع ہو سکے فوراً پیش کرو۔ چنانچہ ایک ہزار دینار (اشرفیاں) ایک تھیلی میں بھر کر نبی اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضورؐ منبر پر تشریف فرما ہیں' عثمان غنیؓ حضورؐ کی گود میں وہ اشرفیاں الٹ دیتے ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جوشِ مسرت سے چہرۂ انورؐ کی رنگت اتنی سرخ ہو جاتی ہے کہ جیسے رخسار مبارک پر سرخ انار نچوڑ دیئے گئے ہوں۔ یعنی فرطِ مسرت سے حضورؐ کا چہرۂ مبارک گلنار ہو گیا تھا۔ آپؐ جوشِ مسرت کے ساتھ اپنی گود میں ہاتھ ڈال کر ان اشرفیوں کو بار بار الٹ پلٹ رہے تھے۔ اس موقع پر بھی حضورؐ دو مرتبہ فرماتے ہیں کہ: "آج کے دن کے بعد عثمانؓ کو (آخرت میں) کوئی عمل ضرر نہیں پہنچا سکتا"۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

عن عبد الرحمٰن بن سَمرة رضی اللّٰہ عنہما' جَاءَ عُثمانُ اِلَی النَّبیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِاَلْفِ دِینارٍ فِی کُمِّہٖ حِینَ جَھَّزَ جَیْشَ الْعُسْرَۃِ ' فَنَثَرَھَا فِی حَجْرِہٖ' قال عبدُالرحمٰن : فَرَاَیْتُ النبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَلِّبُھَا فِی حَجْرِہٖ وَیَقُولُ ((مَا ضَرَّ عُثمانَ ما عَمِلَ بَعْدَ الْیَوْمِ — مَرَّتَیْنِ))

(رواہ الترمذی' ورواہ ایضًا احمد فی "المسند")

اس کا دُور دُور بھی امکان نہیں تھا کہ آنحضور ﷺ کی اس بشارت کے بِرتے پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے مؤمنِ صادق سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی کوئی معصیت صادر ہو گی۔ حضورؐ کا یہ ارشاد دراصل حضرت عثمان غنیؓ کے اس بلند ترین مقام و مرتبہ کے اظہار کے لئے تھا جو انہوں نے انفاق فی سبیل اللہ کی بدولت حاصل کیا تھا۔

اسی غزوۂ تبوک کے سلسلہ میں اِزالۃُ الخِفاء میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سالم بن عبد اللہ بن عمرؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ تبوک کے سفر میں جتنی بھوک پیاس اور سواری کی تکلیف درپیش آئی اتنی کسی دوسرے غزوے میں نہیں آئی۔ دورانِ سفر ایک مرتبہ سامان خورد و نوش ختم ہو گیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے مناسب سامان اونٹوں پر لاد کر حضورؐ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اونٹوں کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ ان

(باقی صفحہ ۷۸ پر)

عظمت کے نشان

لشکر اسلام اپنے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معیت میں میدانِ اُحد سے مدینہ طیبہ لوٹ رہا ہے۔ ستر سے زیادہ اسلام کے ان سپوتوں کو سپرد خاک کر کے، جن کے حسن و جمال، شجاعت و عزیمت، خلوص و للّٰہیت کی جزیرۂ عرب میں کوئی مثال ہی پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور جو مجاہد بچ گئے ہیں ان کے جسم بھی گہرے زخموں سے چور چور ہیں۔ ان کی واپسی پر مدینہ طیبہ کی خواتین، بوڑھوں، بچوں نے اپنے جن تأثرات کا اظہار کیا وہ تعلیماتِ احمدیؐ کی اعجاز آفرینیوں کی ایسی دلکش مثالیں ہیں جن کی نظیر انسانیت کی ساری تاریخ میں جستجوئے بسیار کے باوجود نایاب ہے۔

لشکر اسلام کی سب سے پہلے راستہ میں ایک مسلم خاتون سے ملاقات ہوتی ہے جن کا نام حمنہ بنت جحش ہے۔ مرشد کامل صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یاد فرماتے ہیں: یَا حِمَّا اِحْتَسِبِی "اے حمنہ! اپنی مصیبت کا اجر اپنے رب سے طلب کرو۔" وہ پریشان ہو کر پوچھتی ہے: مَن یَا رَسُولَ اللّٰہ "کس کی موت پر صبر کا اجر اپنے رب سے طلب کروں" فرمایا: خَالُکِ حَمزَۃُ بنُ عَبدِ المُطَّلِب "تیرے ماموں حمزہ بن عبد المطلب شہید ہو چکے ہیں"۔

یہ اندوہناک خبر سن کر اس خاتون نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون غَفَرَ اللّٰہُ لَہُ وَھَنِیئًا لَہُ الشَّھَادَۃُ "اللہ تعالیٰ انہیں بخشے اور یہ شہادت انہیں خوشگوار ہو"۔ حضورؐ نے دوبارہ فرمایا: اِحْتَسِبِی "اپنی مصیبت کا اجر اپنے اللہ کے پاس طلب کرو۔" قَالَتْ مَنْ یَا رَسُولَ اللّٰہ "کس کی موت پر صبر کا اجر اپنے رب سے طلب کروں۔" آپؐ نے فرمایا: اَخُوکِ عَبدُ اللّٰہِ بنُ جَحْش "تمہارے بھائی عبداللہ بن جحش شہید ہو چکے ہیں۔" اس خاتون نے کہا: "اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ ھَنِیْئًا لَہُ الشَّھَادَۃُ" تیسری مرتبہ حضورؐ نے فرمایا : اِحْتَسِبِیْ
"حمنہ اپنی مصیبت کا اجر اپنے رب سے طلب کرو۔" قَالَتْ مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ "کس
کی موت پر صبر کا اجر اپنے رب سے طلب کروں" فرمایا : زَوْجُکِ مُصْعَبُ بْنُ
عُمَیْر "تیرے خاوند معصب بن عمیر شہید ہو چکے ہیں۔" فَقَالَتْ وَاحُزْنَا
وَصَاحَتْ وَوَلْوَلَتْ کہنے لگی صد افسوس! پھر ان کی چیخ نکل گئی۔

حضور ﷺ نے معصب کی شہادت پر اس خاتون کا یہ کہنا سن کر فرمایا : اِنَّ زَوْجَ
الْمَرْأَۃِ مِنْھَا لَبِمَقَامٍ "عورت کے دل میں اس کے شوہر کا ایک خاص مقام ہوتا
ہے"۔ پھر حضور ﷺ نے پوچھا : تم نے ایسا کیوں کہا ہے۔ عرض کرنے لگی : یَا
رَسُوْلَ اللّٰہِ ذَکَرْتُ یُتْمَ بَنِیْہِ فَرَاعَنِیْ "مجھے ان کے بیٹوں کا یتیم ہونا یاد آیا تو میں
خوفزدہ ہو گئی"۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت حمنہ کے لئے اور ان کے بچوں کے لئے دعا
مانگی کہ ان پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل و احسان فرمائے۔

حضور ﷺ مع اپنے لشکر کے آگے بڑھے۔ یہ موکب بنی عبد الاشہل کی بستی
تک پہنچا۔ اس قبیلہ کے بہت سے بہادر شہید ہوئے تھے۔ لوگ اپنے اپنے شہیدوں پر رو
رہے تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ کی چشمانِ مبارک سے آنسو بہنے لگے۔ پھر فرمایا
"لٰکِنْ حَمْزَۃُ لَا بَوَاکِیَ لَہٗ" لیکن میرے چچا حمزہ پر کوئی دو آنسو بہانے والا بھی
نہیں ۔ اس قبیلہ کی مستورات کو حضورؐ کی آمد کا علم ہوا تو سلام عرض کرنے کے لئے
ساری باہر نکل آئیں۔ حضورؐ کو بخیر و عافیت دیکھ کر انہیں اپنے سارے دکھ بھول گئے
اور بے ساختہ حضرت ام عامر اشہلیہ کی زبان سے نکلا : "کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ
جَلَلٌ" حضورؐ سلامت ہیں تو پھر ہر مصیبت ہیچ ہے۔

حضورؐ کے صحابہ کا یہ قافلہ بنی دینار قبیلہ کی اس خاتون کے پاس سے گزرا جس کا اُحد
کی لڑائی میں باپ، خاوند اور بھائی تینوں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ جب اس اللہ کی
بندی کو ان کی شہادت کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے کہا : انہیں رہنے دو، مجھے بتاؤ کہ
میرے آقا اور میرے سرور کا کیا حال ہے۔ اس کو بتایا گیا "خَیْرًا یَا اُمَّ فُلَانٍ۔ ھُوَ
بِحَمْدِ اللّٰہِ کَمَا تُحِبِّیْنَ" الحمد للہ حضورؐ بالکل بخیر و عافیت ہیں۔ کہنے لگی مجھے

دکھاؤ میرے آقاﷺ کہاں ہیں تاکہ میں روئے زیبا دیکھ کر تسلی کرلوں۔ اشارہ کرکے بتایا گیا کہ دیکھو حضورﷺ وہ کھڑے ہیں۔ حضور کو بخیریت دیکھ کر اس مؤمنہ صادقہ کی زبان سے نکلا: "کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ جَلَلٌ" "حضورﷺ سلامت ہیں تو پھر ہر مصیبت ہیچ ہے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں حضورﷺ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی۔ تلاش حقیقت کے لئے انصار کی ایک خاتون کمر باندھ کر مدینہ طیبہ سے نکلی۔ راستہ میں اس کی ملاقات اپنے باپ' اپنے خاوند' اپنے بھائی اور اپنے بیٹے سے ہوئی لیکن اس نے کسی کی طرف توجہ نہ کی۔ جب چاروں کے پاس سے گزر گئی تو لوگوں نے اسے متوجہ کرنے کے لئے کہا کہ یہ تیرا باپ ہے' یہ تیرا خاوند ہے' یہ تیرا بیٹا ہے' یہ تیرا بھائی ہے۔ اس نے ادھر ذرا التفات نہ کیا۔ کہتی رہی انہیں رہنے دو' مجھے یہ بتاؤ میرے آقاﷺ کا کیا حال ہے۔ بتایا گیا حضورﷺ وہ سامنے تشریف فرما ہیں۔ جب حضورﷺ کے پاس پہنچی تو اس نے حضورﷺ کے کپڑے کا دامن پکڑ لیا اور عرض کرنے لگی: "بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَا اُبَالِیْ اِذَا سَلِمْتَ مَنْ عَطِبَ" "اے اللہ کے پیارے رسول! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں جب آپ سلامت ہیں تو مجھے ذرا پروا نہیں کہ کون مارا گیا"۔

ابن ابی حاتم' عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں حضورﷺ کی خیریت کی خبر پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو مدینہ کی خواتین حضورﷺ کی خیریت دریافت کرنے کے لئے مدینہ سے باہر نکل آئیں' سامنے سے ایک اونٹ آرہا تھا جس پر دو شہیدوں کی لاشیں تھیں۔ انصار کی ایک خاتون نے پوچھا کہ یہ دو لاشیں کن کی ہیں۔ انہیں بتایا گیا فلاں فلاں کی ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک اس کا خاوند تھا اور ایک اس کا بیٹا۔ اس نے کہا انہیں چھوڑو' مجھے یہ بتاؤ میرے آقاﷺ کا کیا حال ہے۔ بتایا گیا کہ حضورﷺ بخیریت ہیں۔ کہنے لگی "لَا اُبَالِیْ' یَتَّخِذُ اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہٖ شُھَدَاءَ" "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بعض کو شہادت کے مرتبہ پر فائز فرمایا کرتا ہے" ــــــ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُھَدَاءَ﴾ "اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنا لے تم میں سے کچھ شہید" (آل عمران : ۱۴۰)

سرورِ عالم ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار ہیں۔ حضرت سعد بن معاذؓ لگام پکڑے ہوئے ہیں۔ اسی اثناء میں حبشہ بنت رافع حضرت سعد کی ماں' حاضر خدمت ہوتی ہیں۔ سعد عرض کرتے ہیں : میرے آقاؐ' یہ میری ماں ہے' فرمایا : مرحبا' خوش آمدید۔ وہ قریب آگئیں اور حضورؐ کو بڑے غور سے دیکھنے لگیں : پھر عرض پیرا ہوئیں : حضورؐ کی زیارت کے بعد ہر مصیبت ہیچ نظر آنے لگی ہے۔ ان کے بیٹے عمرو بن معاذ نے اس معرکۂ حق وباطل میں شہادت پائی تھی۔ حضورؐ نے ان کی والدہ سے تعزیت کی۔ پھر فرمایا : "اے سعد کی ماں! تمہیں خوشخبری ہو اور اپنے گھر والوں کو بھی خوشخبری سنادو کہ جنگ میں تمہارے شہید جنت میں سب اکٹھے ہو گئے ہیں' انہوں نے اپنے اہل و عیال کے بارے میں شفاعت کی ہے جو قبول کرلی گئی ہے"۔ اس خاتون نے عرض کی : "رَضِينَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ' وَمَنْ يَبْكِي عَلَيْهِمْ بَعْدَ هٰذَا" "اے اللہ کے رسول! ہم اپنے رب کی اس مہربانی پر بہت خوش ہیں اور اب ان مقتولوں پر کون روئے گا۔" پھر خیال آیا دریائے رحمت آج جوش پر ہے۔ "ہے آج وہ مائل بہ عطا اور بھی کچھ مانگ" کے مصداق سے عرض پیرا ہوئیں يَا رَسُولَ اللّٰهِ اُدْعُ لِمَنْ خُلِّفُوا "پسماندگان کے لئے دعا فرمایئے"۔ اللہ کریم کے کریم محبوب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور عرض کی "اَللّٰهُمَّ اَذْهِبْ حُزْنَ قُلُوبِهِمْ وَاجْبُرْ مُصِيبَتَهُمْ وَاَحْسِنِ الْخَلَفَ عَلٰى مَنْ خُلِّفُوا" "اے اللہ! ان کے دلوں کے غم کو دور کردے۔ ان کی مصیبت کی تلافی کردے اور پیچھے آنے والوں کو اپنے پیشرووں کے لئے بہتر فرمادے"۔

پھر فرمایا : سعد میرے گھوڑے کی باگ چھوڑ دو۔ انہوں نے باگ چھوڑ دی۔ سارے لوگ ساتھ ساتھ تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا : "اے سعد! تمہارے قبیلہ کے بہت سے لوگ زخمی ہیں' قیامت کے روز جب یہ لوگ حاضر ہوں گے تو ان کے زخموں سے خون جوش مار کر بہہ رہا ہوگا۔ اس کی رنگت خون کی سی ہوگی لیکن خوشبو کستوری کی ہوگی۔ میرا یہ حکم سب کو سنادو کہ سارے زخمی اپنے اپنے گھروں کو جائیں"۔ کوئی بھی میرے ساتھ نہ آئے۔ حسب حکم سارے رک گئے۔ رات بھر گھروں میں آگ جلتی رہی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہوتی رہی۔ سعدؓ خود حضورؐ کے ہمراہ کاشانہ اقدس تک گئے۔

زخموں کے باعث حضور ﷺ کو اٹھا کر گھوڑے سے اتارا گیا۔ حضرت سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ کے کندھوں پر ٹیک لگا کر حضورؐ اپنے حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے گئے۔ کاشانہ اقدس میں پہنچ کر حضورؐ نے اپنی تلوار سیدۃ النساء کو دی کہ اس پر خون لگا ہے اسے دھو ڈالیں۔ پھر فرمایا "وَاللّٰہِ لَقَدْ صَدَقَنِی الْیَوْمَ" "بخدا آج اس نے اپنا حق ادا کر دیا ہے"۔

پھر سیدنا علیؓ نے بھی اپنی تلوار حضرت خاتون جنتؓ کو صاف کرنے کے لئے دی۔ آپ نے بھی اپنی شمشیر خارا شگاف کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے فرمایا "فَوَاللّٰہِ لَقَدْ صَدَقَنِی الْیَوْمَ" بخدا آج اس نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ رحمتِ عالمیاں ﷺ نے فرمایا "لَئِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ الْقِتَالَ لَقَدْ صَدَقَهُ مَعَكَ سَهْلُ بْنُ حَنِيفٍ وَاَبُو دُجَانَةَ" "اے علی! اگر آج آپ نے دشمن سے جنگ کرنے کا حق ادا کیا ہے تو آپ کے ساتھ سہل بن حنیف اور ابو دجانہ نے بھی دشمن سے لڑنے کا حق ادا کر دیا ہے۔" دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "لَئِنْ اَحْدَثْتَ الضَّرْبَ بِسَيْفِكَ لَقَدْ اَحَادَ سَهْلُ بْنُ حَنِيفٍ وَاَبُو دُجَانَةَ وَعَاصِمُ بْنُ ثَابِتٍ وَالْحَارِثُ بْنُ الصِّمَّةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ" "اگر آپ نے اپنی تلوار کے ساتھ دشمن پر وار کرنے میں اپنی کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے تو سہل بن حنیف' ابو دجانہ' عاصم بن ثابت' حارث بن صمہ (رضی اللہ عنہم) نے بھی اپنی تلواروں کے ساتھ اپنی شجاعت کے خوب جوہر دکھائے ہیں"۔

نماز مغرب کے لئے حضورؐ سعدینؓ کے کندھوں پر ٹیک لگائے ہوئے تشریف لائے۔ نماز کے بعد حجرہ شریف میں واپسی ہوئی۔ پھر سعد بن معاذ اپنے قبیلہ میں گئے اور قبیلہ کی ساری عورتوں کو ہمراہ لے آئے تاکہ حضورؐ سے حضرت حمزہؓ کی دلگداز شہادت پر اظہار تعزیت کریں۔ مغرب سے عشاء تک یہ مستورات روتی رہیں۔ نماز عشاء تک حضورؐ نے آرام فرمایا۔ طبیعت میں کافی افاقہ محسوس ہونے لگا۔ بغیر سہارے کے چل کر حضورؐ نماز عشاء کے لئے تشریف لے آئے اور انصار کی عورتوں کو دعاؤں سے رخصت فرمایا۔ ایک روایت میں ان کے لئے یہ دعا مرقوم ہے: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْكُنَّ وَعَنْ

أَوْلَادِكُنَّ " اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہو اور تمہاری اولاد پر بھی راضی ہو"۔ حضورؐ نے ان کے مردوں کو فرمایا :

"مُرُوهُنَّ فَلْيَرْجِعْنَ وَلَا يُنْكِيْنَ عَلٰى هَالِكٍ بَعْدَ الْيَوْمِ"

"انہیں حکم دو کہ اپنے گھروں کو واپس چلی جائیں اور آج کے بعد کسی مرنے والے پر نہ روئیں"۔

(اقتباس از ضیاء النبی جلد سوم، مولف : پیر محمد کرم شاہ الازہری)

بقیہ : شہید مظلوم

کی وجہ سے دور سے تاریکی نظر آرہی تھی جس کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لوگو! تمہارے واسطے بہتری آگئی ہے"۔ اونٹ بٹھائے گئے اور جو کچھ ان پر سامان لدا ہوا تھا، اتار اگیا۔ حضورؐ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا "میں عثمانؓ سے راضی ہوں، اے اللہ، تو بھی عثمانؓ سے راضی ہو جا۔" یہ فقرہ حضورؐ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا کہ "تم بھی عثمانؓ کے حق میں دعا کرو"۔

(جاری ہے)

افکار و آراء

خاندان کی سربراہی اور اسلام

—— سید مظہر علی ادیب ‘ ایم اے (اسلامیات) ——

مغربی ممالک میں ہر سال ہزاروں خواتین حلقہ بگوش اسلام ہو رہی ہیں۔ مغرب کا دانشور طبقہ سخت مضطرب ہے اور اس "تبدیلی" کو اپنے لئے "سبز خطرہ" تصور کرتا ہے۔ اس طبقے نے اسلام کے خلاف اپنی مہم تیز تر کر دی ہے اور اپنے ہاں کی خواتین کو مختلف طریقوں سے اسلام سے دور رکھنے کی کوششیں زور شور کے ساتھ شروع کر دی ہیں۔ اب یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ اسلام کے خاندانی نظام میں سربراہی مرد کو حاصل ہے اور عورت کو اس کا دست نگر اور محکوم بن کر رہنا پڑتا ہے' خاندان میں مرد کے حقوق و اختیارات عورت کے مقابلے میں زیادہ ہیں اور خانگی زندگی میں عورت کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔

اہل مغرب کی اسلام کے بارے میں رائے یا خیالات کبھی تعصب اور بغض سے پاک نہیں ہوتے۔ حق کے ساتھ باطل کی ضرور آمیزش کرتے ہیں' ادھوری بات کرتے ہیں اور ضرورت کے مطابق مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ قرآن و سنت کی رُو سے خاندان کا سربراہ مرد ہی ہوتا ہے' خانگی زندگی کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے' لیکن اس میں محکومیت' مظلومیت یا دست نگری کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ جہاں قرآن و سنت نے مردوں کو خاندان کی بالادستی عطا فرمائی ہے وہاں ان پر الفت و محبت' عفو و درگزر' نرمی و شفقت کی حدود و قیود یا پابندیاں بھی عائد کر دی ہیں اور ان "پابندیوں" کے توڑنے پر سخت عذاب کی وعید آئی ہے۔ کسی زیادتی یا ظلم کی صورت میں عورت مرد کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتی ہے' علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔ شریعت نے اپنے نظام معاشرت میں اس کا مداوا رکھا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام نے خاندان کی سربراہی عورت کو کیوں نہیں سونپی اور عورت کے ساتھ یہ "بے انصافی" کیوں کی گئی؟ تمام اختیارات "انصاف کے ساتھ" برابر تقسیم کیوں نہیں کئے گئے؟ اب عورت مرد کے برابر کماتی ہے اور اپنی روزی خود مہیا کرتی ہے لہٰذا وہ خاندان کی سربراہ یا حاکم کیوں نہیں بن سکتی؟

اسلام دین فطرت ہے اور اس نے فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق، مَردوں اور عورتوں کے درمیان تقسیم کار کی ہے۔ دونوں کی فطری، جسمانی و ذہنی قوتوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر رکھا ہے۔ دونوں کے طبعی رجحانات و میلانات میں فرق کا خیال رکھا ہے۔ ایک کو بیرون خانہ سرگرمیوں کے لئے موزوں پایا تو دوسرے کو اندرون خانہ امور کے لئے مناسب سمجھا۔ ایک کے کندھوں پر معاشی ذمہ داریوں یا خاندان کی کفالت کا بوجھ ڈال دیا تو دوسرے کو اس ذمہ داری سے بالکل ہی سبکدوش کر دیا۔ کفالتی ذمہ داریوں کے باعث استحقاق کے علاوہ، مرد کا مضبوط جسم اور اس کے طاقت ور اعصاب، رُعب و دبدبہ، جرأت و حوصلہ، سختی، عمیق فکری اور عملیت، مزاحمت، نفاذ فیصلہ، تنظیم، غیرت و حمیت، صبر و استقامت، عفو و درگزر وغیرہ جیسے اوصاف اسے خاندان کی سربراہی کا اہل بنا دیتے ہیں۔ عورت کی مامتا، ہمدردی، لچک، انفعالیت و جذباتیت، رقت، حیا اور اس کا جذبہ ایثار، احساس عفت و عصمت اسے نسل انسانی کی پرورش و تربیت کرنے والی، خاندان کی معمار حسب نسب کی محافظ و پاسبان اور ایک اعلیٰ منتظم خانہ بننے میں معاونت کرتے ہیں۔

عورت کا اپنی روٹی کمانے اور پورے خاندان کی تمام معاشی و معاشرتی ذمہ داریاں سنبھالنے میں بڑا فرق ہے۔ اگر عورت کو خاندان کا سربراہ بنا دیا جائے تو ظاہر ہے مرد اپنی کفالتی ذمہ داریاں سنبھالنے سے انکار کر دے گا اور یہ خود عورت پر ظلم اور خاندان کی تباہی و بربادی کا باعث ہوگا۔ ایک دوسرے کی فطری صلاحیتیں اور ان کے طبعی اوصاف ضائع ہوں گے۔ دنیا کے کسی ادارے کے دو سربراہ نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے درمیان اختیارات کی برابر برابر تقسیم ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ناقابل عمل مہمل خیال ہے۔ ۱/۲ اگست ۱۹۸۸ء کے "نوائے وقت" کے مطابق : "برطانوی عورتوں کی جانب سے مَردوں کے برابر حقوق حاصل کرنے اور گھر میں مرد کو حاکم تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے برطانیہ میں طلاق کی شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ اب برطانوی عورت اپنے شوہر کو گھر کا محافظ، بچوں کا باپ اور پیسہ کمانے والا اچھا شوہر نہیں سمجھتی جس سے مرد بدترین قسم کے سرد رو میں مبتلا ہو کر اپنی بیویوں کو دھڑا دھڑ طلاقیں دے رہے ہیں"۔

☆ ☆

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت : 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون : 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون : 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع : رشید احمد چودھری، مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

تنظیم اسلامی حلقہ لاہور کے زیر اہتمام ۲۶/اپریل کو صبح ۱۰ بجے ماڈل ٹاؤن لاہور میں وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف کی ذاتی رہائش گاہ کے باہر ایک خاموش مظاہرہ کیا گیا۔ رفقاء تنظیم ایسی عبارات پر مشتمل بینرز اور ٹی بورڈز اٹھائے ہوئے تھے جن میں دستوری سطح پر قرآن و سنت کی بالادستی اور نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس موقع پر ناظم اعلیٰ عبدالرزاق صاحب کی قیادت میں تنظیم کے ایک سہ رکنی وفد نے وزیر اعظم سے بالمشافہ ملاقات کر کے ان سے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے آئین میں ضروری ترامیم کرنے اور سودی نظام معیشت کے خاتمہ کے لئے فوری اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا۔ تنظیم کے وفد نے وزیر اعظم کو ایک یادداشت پیش کی جس میں اُن آئینی دفعات کی نشاندہی کی گئی ہے جو قراردادِ مقاصد سے متصادم ہیں' اور ان دفعات میں بعض لفظی ترامیم کے ذریعے انہیں قراردادِ مقاصد سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے اور اس طرح اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے اور یہاں نظام خلافت قائم کرنے کے تقاضے دستوری سطح پر پورے کئے جا سکتے ہیں۔ مزید برآں اس یادداشت میں وزیر اعظم کو اپنے گزشتہ وعدے اور عزائم بھی یاد دلائے گئے ہیں۔

تنظیم اسلامی لاہور کا یہ مظاہرہ در حقیقت تنظیم کی "مطالبہ تکمیل دستورِ خلافت مہم" کے سلسلے کی ایک کڑی تھا' جس کا آغاز گزشتہ سال مارچ میں کیا گیا تھا' اور جس میں دستور پاکستان کو مکمل اسلامی بنانے کے لئے مجوزہ ترامیم کے حق میں عوامی حمایت حاصل کرتے ہوئے مذکورہ مطالبہ پر مشتمل ساڑھے تین لاکھ سے زائد پوسٹ کارڈ اور لاتعداد ٹیلی گرام وزیر اعظم پاکستان کو بھجوائے گئے۔ اسی مہم کے سلسلے میں تنظیم اسلامی کے ایک وفد نے امیر تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر قیادت وزیر اعظم ہاؤس میں ۲۴ مئی ۹۷ء کو وزیر اعظم پاکستان اور بعض وفاقی وزراء پر مشتمل ان کے وفد کے ساتھ ملاقات کی تھی ـــــ بعد ازاں تنظیم کے اعلیٰ عہدیداروں پر مشتمل ایک وفد نے ۴ مارچ ۹۸ء کو ایوان صدر میں صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ سے ملاقات کر کے ان کی توجہ

اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف مبذول کرائی تھی اور ان سے اپنی حیثیت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی درخواست کی تھی کہ وہ آئین میں مجوزہ ترامیم کر کے اس کو ایک اسلامی دستور میں ڈھالنے کا مبارک کام سرانجام دے۔

☆ ☆ ☆

تنظیم اسلامی کے دینی و احیائی فکر میں افغانستان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جو تاریخی طور پر اُس "خراسان بزرگ" کا اہم تر حصہ رہا ہے جس کا ذکر متعدد احادیث میں اس حیثیت سے ملتا ہے کہ یہ خطہ قیامت سے قبل عالمی غلبہ اسلام کے ضمن میں نہایت اہم کردار ادا کرے گا۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ جہادِ افغانستان میں دی گئی لاکھوں قربانیوں کو اسلام کے عالمی غلبہ کی نوید قرار دیتے ہیں۔ افغانستان سے روسی افواج کے انخلاء کے بعد مجاہدین کی باہمی خانہ جنگی کے باعث افغانستان میں ایک حقیقی اسلامی ریاست کے قیام کا خواب ایک امیدِ موہوم کی صورت اختیار کر رہا تھا، لیکن طالبان حکومت کے قیام کے بعد "روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں" کا منظر دیکھنے میں آ رہا ہے۔ امیر محترم اپنی شدید خواہش کے باوجود اپنے گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے افغانستان کے حالات کا مشاہدہ کرنے اور طالبان کی اعلیٰ قیادت کو اسلامی حکومت کے قیام پر مبارک باد پیش کرنے کے لئے افغانستان کا سفر نہ کر سکے۔ تاہم امیر محترم کی ہدایت پر تنظیم اسلامی کے ایک چودہ رکنی وفد نے گزشتہ ماہ افغانستان کا آٹھ روزہ مطالعاتی و مشاہداتی دورہ کیا۔ پیش نظر شمارے میں اس دورہ کی مفصل رپورٹ ہدیۂ قارئین ہے۔

☆ ☆ ☆

جیسا کہ گزشتہ شمارہ میں عرض کیا گیا تھا، محترم امیر تنظیم اسلامی کے دونوں گھٹنوں کا آپریشن ۲۶ مارچ کو ڈیٹرائٹ امریکہ میں بحمد اللہ خیر و خوبی سے ہو گیا تھا۔ اس کے بعد فزیو تھراپی کا عمل جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امیر محترم رو بصحت ہو رہے ہیں۔ فزیو تھراپی کا سلسلہ ۱۵ مئی تک جاری رہے گا جس کے بعد ڈاکٹروں کی طرف سے سفر کی اجازت مل سکے گی۔ چنانچہ امیر محترم ان شاء اللہ العزیز ۲۰ مئی کے لگ بھگ پاکستان واپس تشریف لے آئیں گے۔ ○○

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان ذُوالنُّورَین رضی اللہ عنہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

(دوسری قسط)

فیاضی کی مزید مثالیں

"ازالۃ الخفاء" ہی میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اُم المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں پر چار دن بے آب و دانہ گزر گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے مجھ سے پوچھا "اے عائشہ! کہیں سے کچھ آیا؟"۔ میں نے کہا "خدا آپؐ کے ہاتھ سے نہ دلوائے تو مجھے کہاں سے مل سکتا ہے!"۔ اس کے بعد حضورؐ نے وضو کیا اور اللہ کی تسبیح کرتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ کبھی یہاں نماز پڑھتے کبھی وہاں اور اللہ سے دعا فرماتے" ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تیسرے پہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے' انہوں نے پوچھا "اے ماں! رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟" میں نے کہا کہ "بیٹے! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں نے چار دن سے کچھ نہیں کھایا۔ آپؐ اسی پریشانی میں باہر تشریف لے گئے ہیں"۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ رو پڑے۔ فوراً واپس گئے اور آٹا' گیہوں اور خرمے اونٹوں پر لدوائے اور کھال اتری ہوئی بکری اور ایک تھیلی میں تین سو درہم لے کر آئے"۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "حضرت عثمانؓ نے مجھے قسم دلائی کہ جب کبھی ضرورت پیش آئے' مجھے ضرور خبر کیجئے گا" ـــــ کچھ دیر بعد حضور ﷺ تشریف لائے اور پوچھا : "میرے بعد تم کو کچھ ملا؟" میں نے کہا : "اے اللہ کے رسولؐ آپ اپنے اللہ سے دعا کرنے گئے تھے اور اللہ آپؐ کی دعا رد نہیں کرتا!" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے بعد میں نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ رسول

اللہ ﷺ یہ سن کر پھر مسجد میں چلے گئے اور میں نے سنا کہ آپؐ ہاتھ اٹھا کر دعا فرما رہے تھے کہ "اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہو گیا' تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہو گیا' تو بھی اس سے راضی ہو جا!"۔

صدقے میں حضرت عثمانؓ کا مرتبہ بے حد بلند تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کے صدقے کا ایک عجیب ماجرا بیان کیا ہے جو دورِ صدیقی میں پیش آیا تھا۔ یہ واقعہ بھی شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب "ازالة الخفاء" میں درج کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک سال قحط پڑا' سامان خورد و نوش کے ذخیرے ختم ہو گئے۔ لوگوں نے حضرت صدیق اکبرؓ سے فریاد کی تو انہوں نے فرمایا کہ اِن شاء اللہ کل تمہاری تکلیف دور ہو جائے گی۔ دوسرے روز علی الصبح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ایک ہزار اونٹ غلے سے لدے ہوئے مدینہ پہنچے۔ مدینہ کے تاجر علی الصبح حضرت عثمانؓ کے گھر پہنچے اور ان کو پیشکش کی کہ وہ یہ غلہ ان کے ہاتھ فروخت کر دیں تاکہ بازار میں بیچا جا سکے اور لوگوں کی پریشانیاں دور ہوں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا : میں نے یہ غلہ شام سے منگایا ہے' تم میری خرید پر کیا نفع دو گے؟ تاجروں نے دس کے بارہ (یعنی بیس فیصد منافع) کی پیشکش کی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا : مجھے اس سے زیادہ ملتے ہیں۔ تاجروں نے کہا ہم دس کے چودہ (چالیس فیصد منافع) دیں گے۔ آپ نے کہا : مجھے اِس سے بھی زیادہ ملتے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ ہم سے زیادہ دینے والا کون ہے؟ مدینہ میں تجارت کرنے والے تو ہم ہی لوگ ہیں ـــــ حضرت عثمانؓ نے کہا : مجھے تو ہر درہم کے بدلے میں دس ملتے ہیں۔ کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو؟ ان لوگوں نے کہا : نہیں! حضرت عثمانؓ نے کہا : "اے تاجرو! میں تم لوگوں کو گواہ کرتا ہوں کہ میں یہ تمام غلہ مدینہ کے محتاجوں پر صدقہ کرتا ہوں"۔

حضرت ابن عباسؓ مزید بیان کرتے ہیں کہ اسی رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ نور کی ایک چھڑی آپؐ کے دست مبارک میں ہے اور آپؐ کے جوتے کے تسمے بھی نور کے ہیں اور آپؐ بعجلت کہیں تشریف لے جانے کا ارادہ فرما رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضورؐ میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں آپؐ کا بے

حد مشتاق ہوں‘ مجھ پر بھی کچھ توجہ فرمایئے۔ حضورؐ نے فرمایا : ”میں عجلت میں ہوں‘ اس وجہ سے کہ عثمان غنیؓ نے اللہ کی راہ میں ایک ہزار اونٹ غلہ صدقہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا صدقہ قبول کرلیا ہے۔ اس کے عوض جنت میں ان کی شادی ہے‘ میں اسی میں شرکت کے لئے جارہا ہوں۔“

اللہ! اللہ! یہ ہے اِعطاء کی شان‘ جس کے حامل نظر آتے ہیں حضرت عثمان غنی‘ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔ اِس وصف میں پیکر اکمل وافضل اور نبی اکرم ﷺ کے عکس کامل ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور صدیق اکبرؓ کے عکس کامل نظر آتے ہیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اب ذرا سورۃ الحدید کی ان دو آیات پر ایک نگاہ بازگشت ڈال لیجئے :

﴿ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ﴾ (الحدید ۱۸‘۱۹)

تقویٰ کی شان

اب آگے چلئے اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت میں تقویٰ کے وصف کا جائزہ لیجئے۔ شاہ ولی اللہ نے ”الاستیعاب“ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ خود یہ فرماتے ہیں کہ ”میں نے اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں کبھی بھی نہ تو زنا کیا اور نہ چوری کی“ ـــــــ یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ صدیق پر دورِ جاہلیت کبھی بھی نہیں آتا‘ وہ فطرتاً سلیم الطبع اور مکارم اخلاق سے متصف ہوتا ہے۔ زمانی لحاظ سے چونکہ اجراءِ وحی سے قبل کا دَور دورِ جاہلیت کہلاتا ہے لہٰذا حضرت عثمانؓ کے قول میں ان کے اسلام سے قبل کے زمانے کے لئے ”دورِ جاہلیت“ استعمال ہوا ہے۔ یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر کی طرح حضرت عثمان (رضی اللہ عنہما) نے بھی ایام جاہلیت ہی میں‘ جس میں شراب نوشی اور زنا کو معیوب سمجھنے کے بجائے قابل فخر کام سمجھا جاتا تھا‘ شراب کو اپنے اوپر حرام

کرلیا تھا' اور ان نفوسِ قدسی کے شکم میں کسی وقت اس اُم الخبائث کا ایک قطرہ بھی نہیں گیا تھا۔ پھر یہ کہ ان دونوں بزرگوں نے کبھی کسی بت کے سامنے کسی قسم کے مراسم عبودیت انجام نہیں دیئے تھے۔ یہ نتیجہ تھا اُس فطرتِ سلیمہ کا جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ :

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلاَّ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ ' فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ اَوْ يُنَصِّرَانِهِ اَوْ يُمَجِّسَانِهِ)) (متفق علیہ)

"ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت (سلیمہ) پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی' نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں"۔

یعنی ہر انسان فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو ماحول اور ماں باپ کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ یہ فطرتِ سلیمہ مسخ ہو جاتی ہے اور انسان شرک اور دوسرے ذمائم اور فواحش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ورنہ اگر فطرت اپنی صحت و سلامتی پر برقرار رہے تو انسان سے معاصی کا صدور محال ہے۔ اس لئے کہ فطرت اُس ہستی کی بنائی ہوئی ہے جو کہ ﴿فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ﴾ اور فاطرِ انسان ہے۔ چنانچہ ہر نبی اور ہر صدیق فطرتِ سلیمہ پر برقرار ہوتا ہے۔

نبوت و صدیقیت میں مزاج کے اعتبار سے بڑا قرب ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کا دستِ حنائی کسی ایک پھول کو چن لیتا ہے۔ جیسے ایک باغ میں بے شمار گلاب کھلے ہوتے ہیں لیکن باغبان ان میں سے ایک پھول کا انتخاب کر لیتا ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کا یہ انتخاب "اصطفاء" اور "اجتباء" کہلاتا ہے جس پر انبیاء و رُسل فائز ہوئے ہیں اور اسی کو وہبی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ مصطفیٰ بھی ہیں اور مجتبیٰ بھی' صلی اللہ علیہ وسلم! ـــــ بقیہ پھولوں کو اگر صدیقین تصور کیا جائے تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے ہی نبی اور رسول کی دعوت ان کے کانوں تک پہنچتی ہے تو وہ یہ کہتے ہوئے لبیک کر اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں کہ : ﴿رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا﴾ (آل عمران : ۱۹۳) "اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک منادی کو یہ پکارتے ہوئے سنا کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر' تو ہم ایمان لے آئے!" ـــــ یہ

صدیقین دعوتِ حق کو قبول کرنے میں ایک لحظہ بھر توقف و تامل نہیں کرتے بلکہ فوراً تصدیق کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ تیسرا وصف جس کے حامل تمام صدیقین ہوتے ہیں اور اِن نفوس قدسیہ کی فطرت انبیاء کی فطرت سے بہت مشابہہ ہوتی ہے۔ صِدّیقیت کے اس وصف کے لئے قرآن حکیم میں فرمایا گیا ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی﴾

حیاء اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے بدی اور برائی سے جو کراہیت اور حجاب رکھا ہے اسی جذبہ صادق کو دین کی اصطلاح میں حیاء کہا جاتا ہے۔ حیاء کا یہ جوہر ہر انسان کی فطرت میں فاطر کائنات کی طرف سے ودیعت شدہ ہے : ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ چنانچہ برا کام کرنے پر انسان کا نفس لوامہ اسے ٹوکتا ہے 'جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سورۃ القیامہ کے آغاز میں قسم کھائی ہے : ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ اسی کو ہم ضمیر کی خلش سے تعبیر کرتے ہیں —— نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ گناہ کی تعریف یوں فرمائی : ((اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِی صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) (مسلم و الترمذی) "گناہ وہ ہے جس سے تمہارے سینے میں خلجان پیدا ہو جائے اور تم اس کو ناپسند کرو کہ تمہارا وہ عمل لوگوں کے علم میں آجائے اور لوگ اس پر مطلع ہو جائیں" پس گناہ کے دو پہلو ہو گئے۔ پہلا یہ کہ اندر سے نفسِ لوّامہ ملامت کرے 'سینہ بھنچے۔ دوسرا یہ کہ انسان اس کو ناپسند کرے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس نے کیسی غلط حرکت کی ہے۔ اسی احساس کا دوسرا نام حیاء ہے اور حیاء کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ : ((اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ)) (متفق علیہ) "حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے"۔ اور ایک حدیث میں تو حیاء کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کی سند موجود ہے کہ ((اَشَدُّهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ)) اور ((اَكْثَرُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ)) جو اکثر خطیب حضرات جمعہ کے خطبوں میں بیان کرتے ہیں۔ یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں حیاء کے باب میں حضرت عثمانؓ غنی سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ متفق علیہ حدیث ہم نے

ابھی پڑھی ہے کہ ((اَلْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِیْمَانِ)) لہٰذا حضرت عثمانؓ کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ : "کَامِلُ الْحَیَاءِ وَالْاِیْمَانِ" تو وہ صد فیصد درست ہے' کیونکہ جو حیاء میں کامل ہو گا وہ ایمان میں بھی کامل ہو گا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حیاء کے بارے میں مسلم شریف میں ایک واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبانی بیان ہوا ہے' وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ میرے حجرے میں تشریف فرما تھے اور آپؐ ایک گدیلے پر بے تکلفی سے استراحت فرما رہے تھے [اپنے ذاتی حجرے میں جبکہ صرف اہلیہ موجود ہوں بے تکلفی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی ساق مبارک کھلی ہوئی ہو اور پورا جسم ڈھکا ہوا نہ ہو۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کو ہمارے اپنے گھروں کے کمروں پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہو گا۔ اُمہات المومنین کے حجروں کے طول و عرض کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ اتنا چھوٹا تھا کہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنی ٹانگیں پھیلائے رکھیں اور حضورؐ نماز تہجد میں بآسانی سجدہ فرما لیں۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ اُم المومنین کی ٹانگیں اکثر مصلّٰی پر سجدے کی جگہ آ جاتی تھیں اور حضورؐ سجدے میں جاتے وقت یا تو اُم المومنین کے پیروں کو ٹھونکا دیتے یا پھر ایک طرف ہٹا دیتے ـــــ اسی چھوٹے سے حجرے میں نبی اکرم ﷺ استراحت فرما رہے ہیں' اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی موجود ہیں۔]

وہ روایت کرتی ہیں' اطلاع ملی کہ حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے ہیں اور اِذنِ باریابی کے خواہاں ہیں۔ حضورؐ کی اجازت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حجرے میں تشریف لائے اور حضورؐ جس حال میں استراحت فرما رہے تھے اسی طرح لیٹے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو بات کرنی تھی کی اور واپس تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ عمر فاروقؓ ملاقات کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور اِذنِ باریابی کے طالب ہیں۔ ان کو بھی اندر آنے کی اجازت مل گئی' وہ آئے' اور حضورؐ اسی طرح لیٹے رہے (حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے اوپر چادر ڈال کر ایک طرف پیٹھ پھیر لی)۔ وہ بھی اپنی بات کر کے رخصت ہو گئے ـــــ تیسری مرتبہ اطلاع دی گئی کہ حضرت عثمان غنیؓ بھی ملاقات کرنا

چاہتے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد حضورؐ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے درست فرما لئے (تہبند سے ساق مبارک ڈھانک لی) اور ساتھ ہی مجھے (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو) حکم دیا کہ اپنے کپڑے خوب اچھی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لو (اور پورا جسم ڈھانپ کر دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاؤ۔ یہ اہتمام کرنے کے بعد) حضرت عثمانؓ غنی کو اِذن باریابی ملا۔ وہ بھی حجرۂ مبارک میں حاضر ہوئے اور جو بات کرنی تھی کر کے رخصت ہوئے۔

(حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جانے کے بعد) میں نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے آنے پر تو آپؐ نے کوئی خاص اہتمام نہیں فرمایا۔ یہ کیا خاص بات تھی کہ عثمان غنیؓ کے آنے پر آپؐ نے خود بھی کپڑوں کی درستگی کا خاص اہتمام فرمایا اور مجھے بھی ہدایت فرمائی کہ میں خوب اچھی طرح کپڑے لپیٹ لوں؟ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ "اے عائشہ! عثمان انتہائی حیادار شخص ہیں۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں اسی طرح بے تکلفی سے لیٹا رہا تو عثمانؓ اپنی فطری حیاء اور حجاب کی وجہ سے وہ بات نہیں کر سکیں گے جس کے لئے وہ آئے تھے اور ویسے ہی واپس چلے جائیں گے"۔ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "عثمانؓ کی شخصیت تو وہ ہے کہ جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں' چنانچہ میں نے بھی ان سے حیاء کی ہے"۔ یہ واقعہ مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے :

اَنَّ اَبَابَکْرٍ الصِّدِّیْقَ اسْتَاْذَنَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ مُضْطَجِعٌ عَلٰی فِرَاشِہٖ لَابِسٌ مِرْطَ عَائِشَۃَ ' فَاَذِنَ لِاَبِیْ بَکْرٍ وَھُوَ کَذٰلِکَ' فَقَضٰی اِلَیْہِ حَاجَتَہٗ ثُمَّ انْصَرَفَ ' ثُمَّ اسْتَاْذَنَ عُمَرُ فَاَذِنَ لَہٗ وَھُوَ عَلٰی تِلْکَ الْحَالِ ' فَقَضٰی اِلَیْہِ حَاجَتَہٗ ثُمَّ انْصَرَفَ ' قَالَ عُثْمَانُ : ثُمَّ اسْتَاْذَنْتُ عَلَیْہِ فَجَلَسَ وَقَالَ لِعَائِشَۃَ : اِجْمَعِیْ عَلَیْکِ ثِیَابَکِ ' فَقَضَیْتُ اِلَیْہِ حَاجَتِیْ ثُمَّ انْصَرَفْتُ ' فَقَالَتْ عَائِشَۃُ : یَارَسُوْلَ اللّٰہِ' مَالِیْ لَمْ اَرَکَ فَزِعْتَ

لِاَبِی بَکْرٍ وَعُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا کَمَا فَزِعْتَ لِعُثْمَانَ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہ عَلَیه وسلَّم : ((اِنَّ عُثْمَانَ رَجُلٌ حَیِیٌّ وَاِنِّی خَشِیْتُ اِنْ اَذِنْتُ لَهُ عَلٰی تِلْكَ الْحَالِ اَنْ لَا یَبْلُغَ اِلَیَّ فِی حَاجَتِهٖ))

یہ ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حیا کا معاملہ! پھر حضرت عثمانؓ خود فرماتے ہیں کہ جس روز سے میں نے ایمان قبول کیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی ہے اس کے بعد سے میں نے نہ کبھی گانا گایا ہے اور نہ گانے کی تمنا کی ہے، اور پھر یہ کہ اس بیعت کے بعد اپنے داہنے ہاتھ کو، جو بیعت کے لئے حضورؐ کے دست مبارک میں دیا گیا تھا، کبھی اپنی شرمگاہ سے مس نہیں کیا"۔ حضرت عثمانؓ کے الفاظ یہ ہیں : مَا تَغَنَّیْتُ وَمَا تَمَنَّیْتُ وَلَا مَسَسْتُ ذَکَرِی بِیَمِیْنِی مُنْذُ بَایَعْتُ بِهَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہ علیه وسلَّم!

حضرت عثمانؓ کے تقویٰ کے چند مزید احوال

منقول ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں پورا قرآن شریف یاد کر لیا تھا اور کبھی کبھی رات کو نوافل میں پورا قرآن مجید پڑھا کرتے۔ صحیحین میں روایت ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے وضو کا طریقہ بالکل رسول اللہ ﷺ کے وضو سے مشابہہ ہوتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی لونڈی نے اور زبیر بن عبد اللہ نے اپنی دادی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ صائم الدھر اور قائم اللیل تھے۔ صرف اول شب تھوڑی دیر کے لئے سوتے تھے۔ امام دار الہجرت امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ حج اور عمرے میں سب سے بازی لے گئے تھے اور یہ کہ آپ اپنے ہمسروں میں صلہ رحمی میں سب سے بڑھ کر تھے۔

مشکوٰۃ میں روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی اشکوں سے تر ہو جاتی۔ لوگوں نے دریافت کیا : کیا وجہ ہے کہ آپ جنت و دوزخ کے ذکر سے اتنے اشکبار نہیں ہوتے جتنا کہ قبر کے ذکر پر ہوتے ہیں۔ آپؓ نے جواب میں کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے :

((اَلْقَبْرُ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِن مَنَازِلِ الْاٰخِرَةِ ' فَاِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ اَيْسَرُ مِنْهُ وَاِنْ لَمْ يَنْجَ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ اَشَدُّ مِنْهُ)) (رواہ الترمذی)

" قبر آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے۔ اگر کوئی اس سے نجات پا گیا تو اس کے بعد کے مراحل اس کے لئے آسان تر ہوں گے' اور اگر اس سے نجات نہ پائی تو اس کے بعد اس سے بھی زیادہ سختی ہے"۔

ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا :

((مَا رَاَيْتُ مَنْظَرًا قَطُّ اِلَّا الْقَبْرَ اَفْظَعَ مِنْهُ))

"میں نے قبر سے زیادہ کسی مقام کو ہیبت ناک نہیں دیکھا"۔

یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ

"اگر میں دوزخ و جنت کے درمیان ہوں اور مجھے معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہو گا' میرے لئے ان میں سے کس کا حکم دیا جائے گا' تو میں اس کا حال معلوم کرنے سے قبل راکھ ہو جانے کو پسند کروں گا"۔

ان چند واقعات سے اندازہ کر لیجئے کہ جس کے اِعطاء' تقویٰ اور حیاء کا یہ عالم ہو تو اس کی فضیلت و منقبت کا کیا کہنا! رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ وارضاہ۔

تصدیق بالحسنٰی

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى﴾ کی پوری شان نظر آرہی ہے۔ رہا تصدیق بالحسنٰی کا معاملہ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ "السَّابِقون الاوَّلون" میں شامل ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک ایمان لانے والوں میں ان کا پانچواں یا چھٹا نمبر ہے۔ گویا آپ رضی اللہ عنہ اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح' حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف' حضرت زبیرؓ بن العوام' حضرت سعیدؓ بن زید' حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے بھی قبل دولت ایمان سے مشرف ہو چکے تھے۔

تو یہ ہیں صدیقیت کے وہ اوصاف ثلاثہ جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت مبارکہ

میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

صدیقیت و شہادت کے دو نور

سورۃ الحدید کی محولہ بالا آیات میں صدقہ کرنے والے اور اللہ کے دین کے لئے قرض حسن دینے والے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کے لئے جہاں اجر عظیم کی نوید سنائی گئی ہے' وہاں ان کو صدیقین و شہداء کے زمرے میں شامل ہونے کا مژدہ بھی سنایا گیا اور ان کو یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ ان کا اجر اور ان کا نور ان کے رب کے پاس محفوظ ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت میں صدیقیت کے اوصاف بھی موجود ہیں اور پھر وہ شہادت عظمیٰ پر فائز ہوئے ہیں۔ گویا ان کی شخصیت میں صدیقیت اور شہادت کے دونوں نور موجود ہیں۔ اس اعتبار سے بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شخصیت ذوالنورین کے معزز لقب کی صحیح مصداق نظر آتی ہے۔

رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ ان کو اللہ کی طرف سے ایک خاص تحفظ حاصل ہوتا ہے اور وہ مقتول نہیں ہوتے۔ چونکہ عالم ظاہری میں اس طرح رسولوں کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے اور مغلوبیت رسول کے شایان شان نہیں' لہٰذا اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ : ﴿لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ﴾ "لازماً میں اور میرے رسول غالب رہیں گے" ـــــ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راہ حق میں شہادت کا بڑا اشتیاق تھا۔ چنانچہ کتب احادیث میں آنحضور ﷺ کی یہ دعائیں منقول ہوئی ہیں : اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ شَھَادَۃً فِی سَبِیلِكَ ـــــ اور اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِی سَبِیلِكَ ـــــ مزید برآں نبی کریم ﷺ کا یہ قول بھی احادیث میں موجود ہے :

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اَغْزُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلَ ' ثُمَّ اَغْزُوَ فَاُقْتَلَ ' ثُمَّ اَغْزُوَ فَاُقْتَلَ)) (متفق علیہ)

"میری یہ آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں' (پھر مجھے زندہ کیا جائے اور) میں پھر اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں۔

(پھر مجھے زندہ کیا جائے اور) میں پھر اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں)۔"

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' رسولوں کے باب میں اللہ کی سنت یہ ہے کہ رسول کبھی قتل نہیں ہوتے' کیونکہ اس میں ظاہری طور پر رسول کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے۔ البتہ انبیائے کرام قتل بھی ہوئے ہیں' جیسا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سانحہ قتل سے ہر مسلمان واقف ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے باب میں بھی اللہ کی وہی سنت کارفرما نظر آتی ہے جو رسولوں سے متعلق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ جو صدیقیت کبریٰ کے مقام پر فائز ہیں طبعی طور پر وفات پاتے ہیں' جبکہ مابعد کے تینوں خلفاء راشدین حضرت عمر فاروق' حضرت عثمان غنی اور حضرت علی حیدر کرار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مرتبہ شہادت سے سرفراز کئے جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ ان تینوں خلفاء کی شہادت کی پیشگی خبر دے چکے تھے۔ وہ حدیث تو بہت مشہور ہے کہ ایک روز نبی اکرم ﷺ حضرت ابوبکر' حضرت عمر' اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ کوہ اُحد پر تشریف لے گئے تو کوہ اُحد کانپنے اور لرزنے لگا۔ حضورؐ نے اپنے پائے مبارک سے اُحد کو ٹھونکا دیتے ہوئے فرمایا کہ "اے اُحد تھم جا' رک جا' اِس وقت تیری پیٹھ پر ایک نبی' ایک صدیق' اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں"۔ (متفق علیہ)

"ذُوالنُّورین" کی مصداق چند دیگر فضیلتیں

اب ہم اس پہلو سے جائزہ لیتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت میں اسلام و ایمان کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ایثار و قربانی کی اور کیا کیا فضیلتیں ہیں جن پر ذوالنورین کا معزز لقب صادق آتا ہے۔

۱) دُوہجرتوں کا شرف : کتب احادیث میں منقول ہے کہ حبشہ کی طرف سب سے پہلے ہجرت کرنے والوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شامل تھے۔ آپ کے ساتھ آپؓ کی زوجہ محترمہ' رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ اس ہجرت کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے بعد (شوہرو

(بیوی ایک ساتھ) ہجرت کرنے والا یہ پہلا جوڑا ہے۔ یہ روایت امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں عبد الرحمٰن بن اسحاق بن سعد سے روایت کی ہے۔ حضرت انس بڑٹھ سے منقول روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لوط علیہ السلام کے بعد اپنی اہلیہ کے ساتھ ہجرت کی ہے"۔ اس سے غالباً جوانی کے عالم میں میاں بیوی کا ہجرت کرنا مراد ہے۔ آپؓ کی دوسری ہجرت مدینۃ النبی کی طرف ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی بڑٹھ کو راہ حق میں ھجرتین کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس لحاظ سے بھی آپؓ ذوالنورین کے لقب کے مصداق قرار پا سکتے ہیں۔

ii) ذوالقرنین اور اصحاب کہف سے مماثلت : جن حضرات نے سورۂ کہف کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے دوسرے رکوع میں اصحاب کہف کا واقعہ بیان ہوا ہے اور سورہ کے آخری رکوع سے ماقبل حضرت ذوالقرنین کی فتوحات کے تذکرے کے ساتھ ہی ان کی سیرت میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے اوصاف کو نمایاں کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب ذوالقرنین ایک خدا پرست، خدا ترس اور نیک بادشاہ تھے۔ قرآن شہادت دیتا ہے کہ ﴿اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا٥﴾ واقعہ یہ ہے کہ وہ اُس دور کی ایک عظیم ترین سلطنت کے شہنشاہ تھے۔ اصحابِ کہف کون تھے؟ از روئے قرآن یہ وہ نوجوان تھے جو ایک مشرکانہ ماحول اور مشرک بادشاہ کے دور میں توحید کے ساتھ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے، جس کی وجہ سے ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور وہ نوجوان اپنا ایمان اور اپنی جان بچانے کے لئے ایک پہاڑ کی کھوہ میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ان دونوں واقعات سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ انتہائی حالات ہیں جن سے اس دنیا میں اہل ایمان کو سابقہ پیش آ سکتا ہے۔ اصحاب کہف جیسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ جن میں ایمان اور جان بچانے کے لئے کہیں پناہ گزیں ہونا پڑے اور حضرت ذوالقرنین کی طرح یہ صورت حال بھی پیش آ سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اپنے فضل سے سطوت، شان و شوکت اور ایک عظیم سلطنت سے نوازے۔ اب آپ خلافت راشدہ کی تاریخ میں دیکھئے کہ خلفائے راشدین میں سے حضرت عثمان بڑٹھ کی ذات میں یہ دونوں

شانیں اور کیفیات مجتمع نظر آئیں گی۔ حضرت عثمانؓ کی سطوت' حکومت اور سلطنت وسعت کے اعتبار سے حضرت ذوالقرنین کی سلطنت و حکومت سے سہ چند تھی۔ تاریخی لحاظ سے حضرت ذوالقرنین کی سلطنت کی حدود مکران سے لے کر بحیرۂ روم کے ساحل تک تھیں۔ اس میں دارا اول کے دور میں مزید وسعت ہوئی' لیکن اس سلطنت کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی مملکت کی حدود سے کوئی تقابل نہیں ہے۔ پورا جزیرہ نمائے عرب' پھر حضرت ذوالقرنین کی سلطنت کی جو مشرقی سرحد تھی' اس سے لے کر تا بخاک کاشغر کا علاقہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں اسلام کے پرچم تلے تھا۔ اس کے علاوہ پورا شمالی افریقہ مصر سے لے کر مراکش تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زیر نگیں تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں صرف مصر اسلامی مملکت میں شامل ہوا تھا لیکن حضرت عثمانؓ کی حدودِ سلطنت ماوراء النہر کو پھاند کر بلخ و بخارا اور کاشغر و تاشقند تک وسیع ہو چکی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمانؓ اصحاب کہف جیسی حالت سے بھی دوچار ہوئے اور آپؓ فتنہ کے زمانے میں باغیوں کی دست درازیوں کی وجہ سے چالیس دن رات سے بھی زیادہ عرصہ اپنے گھر میں اس حال میں محصور رہے کہ پینے کے لئے پانی تک موجود نہیں —— یہ دونوں شانیں کہ حضرت ذوالقرنین سے سہ چند سطوت و سلطنت اور اصحاب کہف کی طرح محصوری و پناہ گزینی' حضرت عثمانؓ کی زندگی میں جو نظر آتی ہیں' ان کو بھی ہم ذوالنورین کے لقب کا مصداق قرار دے سکتے ہیں۔

iii) <u>غزوۂ بدر اور حدیبیہ میں آپؓ کا موجود تصور کیا جانا</u> : حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی میں دو ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ آپ رضی اللہ عنہ ذاتی حیثیت سے موجود نہیں ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موجود قرار دیئے جاتے ہیں —— پہلا واقعہ غزوۂ بدر کے موقعہ پر پیش آیا۔ اُس وقت حضرت رقیہؓ کافی علیل تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت عثمانؓ کو اپنی صاحبزادی کی تیمارداری کے لئے مدینہ میں چھوڑ دیا تھا' اور فرمایا تھا کہ آپ کو بدر کی شرکت کا ثواب اور اس کا حصہ ملے گا۔ مزید برآں صحیح روایات میں مذکور ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد' جس میں اللہ تعالیٰ نے تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں کے جتھے کو

کفار کے ایک ہزار کے مسلح لشکر جرار پر فتح عنایت فرمائی تھی' جس کے نتیجہ میں ابو جہل سمیت ستر صنادیدِ عرب کافر کھیت رہے تھے اور قریش کا سارا غرور اللہ تعالیٰ نے خاک میں ملا دیا تھا اور جس میں ستر کے قریب کفار مسلمانوں کی قید میں آئے تھے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے غنائم میں سے حضرت عثمانؓ کو وہی حصہ مرحمت فرمایا جو دوسرے بدری صحابہؓ کو مرحمت کیا گیا تھا۔ گویا حضرت عثمانؓ کو اس غزوے میں مجازی طور پر شریک قرار دیا جبکہ حقیقی طور پر وہ شریک نہیں تھے۔

دوسرا واقعہ حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۶ھ میں نبی اکرم ﷺ عمرے کی نیت سے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے۔ اثنائے سفر میں معلوم ہوا کہ قریش مکہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں اور انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چاہے خون کی ندیاں بہہ جائیں' وہ مسلمانوں کو عمرہ نہیں کرنے دیں گے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر قیام فرمایا۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ قریش مکہ کے پاس سفارت بھیجی جائے جو ان کو سمجھا سکے کہ مسلمان لڑائی کی غرض سے نہیں آئے ہیں اور ان کا مقصد صرف عمرہ ادا کرنا ہے' نیز ان مسلمانوں کو بھی تسکین دے سکے جو مکہ میں محصوری کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور کفارِ مکہ کے جور و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ اس سفارت کے لئے نبی اکرم ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا اور ان کو قریش مکہ سے سلسلہ جنبانی کرنے اور ان مسلمانوں کو جو مکہ میں قریش کی قید میں تھے' تسلی دینے کے لئے مکہ روانہ فرمایا۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ انتخاب حضرت عثمانؓ کی بہت سی فضیلتوں کی دلیل ہے۔ پہلی یہ کہ حضرت عثمانؓ حضورؐ کے معتمد علیہ اصحاب میں شامل ہیں۔ دوسری یہ کہ حضرت عثمانؓ قریش کے نزدیک بھی معزز ترین اشخاص میں شمار ہوتے تھے۔ تیسری یہ کہ جب حضرت عثمانؓ مکہ چلے گئے تو اصحاب رسولؐ میں سے چند ایک نے یہ کہا کہ عثمانؓ کو خانہ کعبہ کا طواف مبارک ہو۔ حضورؐ نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ "مجھے یقین ہے کہ اگر عثمانؓ مکہ میں زمانۂ دراز تک رہیں تو بھی وہ اُس وقت تک طواف نہیں کریں گے جب تک میں طواف نہ کر لوں"۔ اللہ! اللہ! کتنا اعتماد تھا حضورؐ کو جناب عثمانؓ پر ـــــ اور ہوا بھی یہی کہ

حضرت عثمانؓ کے چچا زاد بھائی ابان بن سعید بن عاص نے ان کو مکہ میں اپنی پناہ میں لے لیا' اور ان کو دعوت دی کہ وہ طواف کرلیں۔ لیکن اِس محب رسولؐ نے کہا کہ "جب تک نبی اکرم ﷺ طواف نہیں کرلیں گے میں طواف نہیں کر سکتا"۔ چوتھی یہ کہ جب یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمانؓ کو مکہ والوں نے شہید کرڈالا ہے' تو حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کے لئے تمام صحابہ کرام سے بیعت لی' جن کی تعداد مختلف روایات کے مطابق ۱۴۰۰ سے لے کر ۲۴۰۰ تک بیان ہوئی ہے اور جو "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور ہے۔ نیز جس کے متعلق سورۃ الفتح میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا۝﴾ "(اے نبیؐ) بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے' ان کے دلوں کا حال اُس کو (یعنی اللہ کو) معلوم تھا۔ اُس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو انعام میں فتح قریب بخشی"۔

غور کیجئے خون عثمانؓ کی حضورؐ کی نگاہ میں اتنی قدر و منزلت اور وقعت تھی کہ حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے کے لئے نبی اکرم ﷺ اپنے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لیتے ہیں ـــــ یہی وہ دوسرا موقع ہے جس میں حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کے حقیقی طور پر موجود نہ ہونے کو بھی مجازی طور پر موجود قرار دیا۔ چنانچہ "بیعت رضوان" کے موقع پر حضورؐ نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر فرمایا کہ "یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے" اور بایاں ہاتھ اٹھا کر فرمایا کہ "یہ میرا ہاتھ ہے" اور یہ فرما کر اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ "یہ عثمانؓ کی طرف سے (اگر وہ زندہ ہیں) بیعت ہے"۔ یہ حضرت عثمانؓ کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ وہ موجود نہ ہوتے ہوئے بھی "بیعت رضوان" میں داخل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو مکہ اس لئے روانہ کیا تھا کہ مکہ والوں کے نزدیک آپؓ سے زیادہ کوئی صاحب عزت نہ تھا۔ بیعت رضوان آپؓ کے قتل کی خبر پھیلنے کے بعد ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ فرمایا اور اسے دوسرے پر ہاتھ مار کر ارشاد فرمایا کہ یہ عثمانؓ کی بیعت ہے"۔

اللہ! اللہ! خون عثمانؓ کے قصاص کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً

۱۴۰۰ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بیعت لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس بیعت پر اپنی خوشنودی اور رضامندی کا اظہار فرماتا ہے۔ اس کے بعد بھی حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں کوئی شک کرے، ان کی تنقیص کرے، ان پر اعتراضات و اتہامات وارد کرے اور ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں محاسبہ کا جواب بھی سوچ لے۔

غزوۂ بدر اور حدیبیہ دونوں مواقع پر اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حقیقی طور پر موجود نہیں ہیں لیکن حضور ﷺ ان کو مجازی طور پر موجود قرار دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی "ذوالنورین" کا لقب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بالکل راست آتا ہے!

iv) دورِ فاروقی اور دورِ علوی کی جھلک : حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت عمر فاروق اور حضرت علی حیدر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ادوارِ خلافت کے رنگ بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں اصحاب رسولؐ نہ صرف عشرۂ مبشرہ میں بلکہ مسلمہ طور پر خلفائے راشدین میں شامل ہیں، اور فضیلت کے لحاظ سے پوری امت میں حضرت عمر فاروقؓ دوسرے نمبر پر اور حضرت علی حیدرؓ چوتھے نمبر پر فائز ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مراحل سے گزر کر تیئس سالہ جاں گسل جدوجہد اور محنت شاقہ کے بعد اپنی بعثت کے اس امتیازی مقصد کی تکمیل فرمادی، جو خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے آپؐ کا فرض منصبی تھا، اور جو قرآن حکیم میں تین مرتبہ بایں الفاظ میں بیان ہوا ہے : ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنا رسول الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ اسے غالب کردے کل جنس دین پر"۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا دین بہ تمام و کمال قائم ہو گیا اور ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ کی شان بالفعل نظر آنے لگی اور ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا﴾ کے مصداق اللہ ہی کا کلمہ سب سے بلند و بالا ہو گیا۔

ختم المرتبت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، عرب میں اسلامی انقلاب کے خلاف ایک شدید ردعمل پیدا ہوا۔ چنانچہ بہت سے جھوٹے

مدعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے' چند قبائل مرتد ہو گئے' بعض مضبوط قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان تمام فتنوں کو فرو کیا۔ دراصل صدیق کا مقام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ رسول کے کام کو مستحکم کرتا ہے' معاندین کی قوت کو کچلتا ہے اور ہر ردِ عمل کو ختم کرتا ہے۔ چنانچہ صدیق اکبر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ڈھائی سالہ دورِ خلافت اسی شان کا مظہر نظر آتا ہے۔ اس کام کی تکمیل کے بعد وہ بھی رخصت ہو گئے۔

اِس کے بعد دورِ فاروقی شروع ہوتا ہے' جس کو ایک جملہ میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ باغ اپنی پوری بہار پر آ گیا ـــــ حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ دورِ فاروقی میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس دور میں داخلی استحکام کے ساتھ فتوحات کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ اسلامی سلطنت میں اصل توسیع دورِ فاروقی میں ہوئی ہے۔ سلطنت کسریٰ کا نام و نشان اسی دور میں صفحۂ ہستی سے محو ہوا اور وہ ایک داستان پارینہ بن کر رہ گئی۔ سلطنت روما کی بھی ایک ٹانگ اسی دور میں ٹوٹ چکی تھی۔ قیصر روم کا تین برِاعظموں مغربی ایشیا' یورپ اور شمالی افریقہ کے اکثر حصہ پر تسلط تھا' اس میں سے مغربی ایشیا کی حد تک روما کی سلطنت کا اسی دَور میں خاتمہ ہوا ـــــ اور پھر دورِ عثمانی میں اسلامی سلطنت کی سرحدیں ماوراء النہر تک پھیل گئی گئیں۔ ذرا تصور کیجئے کہ اُس وقت کا لیبیا' تیونس' الجزائر' اور مراکش حضرت عثمانؓ کے دور میں اسلام کے پرچم تلے آ چکا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ شاید یہ فتنہ اور فساد ہی کا دور تھا ـــــ یہ بہت بڑا مغالطہ' بلکہ صریح بہتان و افترا ہے۔ خلفائے اربعہ میں سے سب سے زیادہ طویل دورِ خلافت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کا دور تقریباً ڈھائی سال رہا' حضرت عمرؓ کا دور تقریباً دس سال رہا' حضرت علیؓ کا دور تقریباً پونے پانچ سال اور حضرت عثمانؓ کا دور تقریباً بارہ سال رہا۔ خلافت عثمانیہ کے اس بارہ سالہ طویل دَور میں فاروقی اور علوی دورِ خلافت کے دونوں رنگ موجود ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت کے پہلے آٹھ سال میں امن و امان اور دبدبہ کا وہی رنگ رہا ہے جو دورِ فاروقی میں نظر آتا ہے۔ اِن آٹھ سالوں میں وہی عدل و انصاف اور داخلی استحکام کی وہی کیفیت ہے جو دورِ فاروقی کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ ساتھ ہی

ساتھ مجاہدین اسلام کے قدم آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔

حضرت عمر فاروق ؓ کی شہادت کے بعد دشمنان اسلام نے یہ سمجھا تھا کہ شاید اسلامی حکومت قائم نہ رہ سکے گی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے فوراً بعد بعض مفتوحہ، خاص طور پر ایران کے اکثر علاقوں میں شورشیں اور بغاوتیں شروع ہوئیں، لیکن حضرت عثمان غنیؓ نے ان میں سے ایک ایک کو فرو کر دیا اور حالات پر پوری طرح قابو پا لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے کے لئے نئے نئے اقدامات کئے۔ بحر اوقیانوس کے ساحل تک شمالی افریقہ فتح ہو گیا۔ یہ جنگ 'جنگ عبادلہ' کہلاتی ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن سعد بن ابی شرح اس مہم کے کمانڈر انچیف تھے اور اس میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بھی شریک تھے۔ اسی جنگ کے نتیجے میں پورے شمالی افریقہ کی قسمت بدل گئی اور سلطنت روما کا جھنڈا وہاں سرنگوں ہو گیا اور دین مبین کا پرچم لہرانے لگا۔

عثمانی خلافت کے آخری چار سال حضرت علیؓ کے دورِ خلافت کے مماثل نظر آتے ہیں۔ خلافت عثمانی میں یہودیوں اور عجمیوں کی سازشوں نے سر اٹھانا شروع کیا اور اس فتنے کے نتیجے ہی میں شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کا سانحہ فاجعہ ظہور پذیر ہوا اور یہ فتنہ حضرت علی حیدر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اپنے عروج پر پہنچا۔ علوی خلافت کے تقریباً پونے پانچ سال اسی فتنہ و فساد اور خانہ جنگی کی نذر ہوئے اور اسی دور میں جنگ جمل اور جنگ صفین ظہور پذیر ہوئیں اور بالآخر اسی فتنہ نے چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ کی شمع حیات گل کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ کے دور میں غلبہ دین کی سمت ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا، نہ اسلامی سلطنت کی سرحدیں آگے پھیلیں ـــــ بہرحال یہاں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ عثمانی دورِ خلافت میں دورِ فاروقی اور دورِ علوی دونوں کی کیفیات جمع ہیں۔ پہلے آٹھ سال دورِ فاروقی کا کامل عکس نظر آتے ہیں جبکہ آخری چار سال وہ ہیں جن میں دشمنان اسلام کی ریشہ دوانیوں نے سر اٹھانا شروع کیا تھا، جس کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انتہائی مظلومی کی حالت میں شہید کئے گئے اور جو دورِ خلافت علوی میں ایک ہولناک فتنے کی شکل

میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ چنانچہ مسلمان آپس ہی میں دست و گریبان ہو گئے اور چوراسی ہزار کلمہ گو ایک دوسرے کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے۔ کفار کے ساتھ اِس دور میں جنگ و قتال کا کوئی معرکہ پیش نہیں آیا۔ اس فتنہ اور سازش کے اسباب کچھ اختصار کے ساتھ آگے بیان ہوں گے، یہاں صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ ایسے فتنوں کے کچھ ظاہری اسباب ہوتے ہیں جو نظروں کے سامنے ہوتے ہیں اور کچھ مخفی اور باطنی اسباب ہوتے ہیں جو نظر تو نہیں آتے لیکن فیصلہ کن کردار یہی مخفی و باطنی اسباب ادا کرتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ علوی دورِ خلافت میں جو بھی، خانہ جنگی اور مسلمانوں کے مابین خون ریزی ہوئی تو حاشا وکلا اس کا کوئی الزام ہم امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات گرامی پر نہیں لگاتے۔ یہ جسارت ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ پوری اُمت مسلمہ کے نزدیک حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ راشد ہیں۔ وہ فضیلت کے اعتبار سے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں چوتھے نمبر پر ہیں۔ گویا ہم ابوبکر صدیق، عمر فاروق، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بعد سب سے زیادہ افضل حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مانتے ہیں۔ اس فتنہ و فساد میں ان کی کوئی کمزوری شامل نہیں تھی، وہ برحق خلیفہ راشد تھے۔ صورتحال یہ تھی کہ سازش کی آگ اس طرح بھڑکا دی گئی تھی کہ نہ حضرت عثمانؓ اس کو فرو کر سکے اور نہ ہی حضرت علیؓ۔ اگر حضرت علیؓ فتنہ و فساد فرو نہ کر سکے تو اس کا ذرہ بھر الزام بھی حضرت علیؓ کی ذات گرامی پر نہیں آتا۔ بالکل یہی بات حضرت عثمانؓ پر بھی راست آتی ہے۔ اگر وہ فتنہ کو فرو نہ کر سکے تو کتنا بڑا ظلم ہے کہ سارا الزام آپؓ پر رکھ دیا جائے۔ کیسا تضاد ہے کہ ایک خلیفہ کے زمانے میں پورا دورِ خلافت فتنہ و فساد کی نذر ہو گیا اور وہ فتنہ اتنا شدید تھا کہ وہ حالات پر قابو نہ پا سکے اور فتنہ کو فرو نہ کر سکے تب بھی وہ سب کی نگاہ میں شیرِ خدا ہیں اور کسی دوسرے کے دور میں جبکہ ان کا دو تہائی دور، دورِ فاروقی کے مثل ہو اور صرف ایک تہائی دور میں فتنہ و فساد سر اٹھائے تو ان کے بارے میں یہ حکم لگایا جائے کہ وہ کمزور تھے، ان میں فلاں نقص تھا یا فلاں کمی تھی وغیرہ ـــــ انسان ذرا بھی سوچے اور انصاف بینی سے کام لے تو فکر کا یہ تضاد بالکل مبرہن ہو کر سامنے آجائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے طرز فکر پر انتہائی

ملال اور افسوس ہوتا ہے جو کیسی کیسی بے بنیاد باتوں کو بنیاد بنا کر حضرت عثمانؓ سے سوئے ظن پیدا کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں پر رحم آتا ہے جو ان پر اعتبار کر کے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے متعلق اپنی رائے کو مجروح کر لیتے ہیں اور اپنی آخرت کو برباد کرتے ہیں۔

ذوالنورینؓ کے خلاف اعتراضات کی حقیقت

آپ کو شاید معلوم ہو کہ معاندین عثمانؓ نے دورِ عثمانی ہی میں حضرت عثمانؓ پر مسجد نبوی میں صحابہؓ اور تابعین کے بھرے مجمع میں بارہ الزامات اور اعتراضات عائد کئے تھے' جن کی صفائی حضرت عثمانؓ نے اسی مجمع میں پیش کر دی تھی' جس کی تصویب و تائید خود حضرت علیؓ اور دیگر اکابر و اعاظم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کی تھی۔ مفسدین نے بعد میں جب یورش کر کے مدینہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو اس موقع پر حضرت علیؓ نے باغیوں کے ایک گروہ سے پوچھا کہ آخر ان کو خلیفہ وقت اور امیرالمومنین سے کیا شکایت ہے؟ ان لوگوں نے ان ہی بارہ اعتراضات کا اعادہ کر دیا' جن کی صفائی حضرت عثمانؓ ایک بھرے مجمع میں کر چکے تھے اور دوسرے اکابر صحابہؓ کے ساتھ حضرت علیؓ بھی اس کی تصویب و تائید اور توثیق کر چکے تھے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے اس موقع پر بھی اس گروہ کے سامنے حضرت عثمانؓ کی طرف سے پیش کردہ صفائی اپنی تصویب کے ساتھ پیش کر دی اور ان کے عائد کردہ تمام الزامات و اعتراضات سے حضرت عثمانؓ کو بری قرار دیا ـــــ یہ اور بات ہے کہ مفتریوں کے ارادے ہی خراب تھے۔ اس لئے انہوں نے حضرت علیؓ کی تصویب و تائید کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ عصر حاضر کے ایک صاحب علم اور صاحب قلم' جنہوں نے دین کی خدمت میں کافی مفید کام کئے ہیں اور جن کا بلاشبہ چوٹی کے اہل فکر علماء میں شمار ہوتا ہے' اپنی ایک کتاب میں ان ہی بارہ الزامات و اعتراضات کو بیان کرتے ہوئے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر ایسی تنقید کی ہے جس سے صریح طور پر آپؓ کی تنقیص ہوتی ہے اور آپؓ کے خلاف سوئے ظن پیدا ہوتا ہے۔ اسی کتاب کے ایک باب میں حضرت عثمان کے علاوہ حضرت امیر معاویہ اور

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر بھی دل آزار تنقید کی گئی ہے، جس سے مسلمانان پاک و ہند کے قلوب انتہائی مجروح ہوئے ہیں اور "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" والا معاملہ پیش آیا ہے۔ چنانچہ اس پر ایک گروہ کی طرف سے تو خوشنودی کے ڈونگرے برسائے گئے اور بغلیں بجائی گئیں کہ دیکھ لو، یہ "سنی" بھی وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو ہم کہتے آئے ہیں۔ پھر سنی بھی کس پائے کے! وہ جو مفکر اسلام اور مفسر قرآن ہیں —— یہ درحقیقت ہماری بدقسمتی اور شامت اعمال ہے۔

ویسے اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ زندہ میں سے مُردہ اور مُردے میں سے زندہ برآمد کرتا ہے اور شر میں سے خیر نکال لاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دل آزار کتاب کے نتیجے میں تاریخی لٹریچر میں بالخصوص بہت سی مفید کتابوں کا اضافہ ہوا۔ ہمارے ہاں تحقیق و تعمق کے کام میں عرصہ سے جو تعطل و جمود تھا، وہ ٹوٹا۔ چنانچہ تاریخ کو از سرنو کھنگالا گیا، اور اس کتاب میں حضرت عثمان، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی پاک سیرتوں کو داغدار کرنے کی جو کوشش کی گئی تھی، اس کا ازالہ کیا گیا۔ اسی سلسلہ کی ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر مرزا محمد منور صاحب نے "میثاق" میں ایک بڑا پیارا جملہ لکھا تھا کہ: "حضرت عثمانؓ پر لگائے ہوئے الزامات و اعتراضات کا اعادہ کر کے اپنی تنقید کی تعمیر کی بنیاد قائم کرنے والے ان مشہور مصنف کے نزدیک شاید حضرت علیؓ کی حیثیت (نعوذ باللہ) کرائے کے وکیل کی تھی، جنہوں نے غالباً فیس لے کر حضرت عثمانؓ کی مدافعت کی تھی...."

سوچنے کا مقام ہے کہ جن اعتراضات و الزامات کی صفائی کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوری دیانت داری سے تصویب و توثیق کی ہو، کیونکہ آپؓ کی امانت و دیانت ہمارے نزدیک مسلم ہے، تو پھر چودہ سو سال بعد بلوائیوں کے الزامات کا اعادہ کرنا کیا حضرت علیؓ کی بھی تنقیص نہیں ہوگی؟ کیا اس طرح ان کی امانت و دیانت مجروح نہیں ہوگی اور اُن کی ذات پر حرف نہیں آئے گا؟ اللہ شرورِ نفس سے بچائے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اچھے اچھے معقول لوگ کیسی کیسی ٹھوکریں کھاتے ہیں —— یہ اسی کتاب کی تنقیدوں کا شاخسانہ ہے کہ اس سے متأثر ہو کر ہمارے کتنے ہی سُنّی بھائی حضرت عثمانؓ سے سوئے ظن میں مبتلا ہو

گئے ہیں اور کتنے ہی ہیں جو حضرت امیر معاویہؓ اور فاتح مصر حضرت عمروؓ بن العاص کے نام ادب سے نہیں لے سکتے بلکہ ان کی شان میں گستاخانہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ ذہنوں کو اتنا مسموم کر دیا گیا ہے کہ خود سنیوں کے ایک گروہ میں‘ چاہے وہ تعداد کے لحاظ سے قلیل ہی کیوں نہ ہو‘ ان تینوں جلیل القدر صحابہؓ کے علاوہ بہت سے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف سوئے ظن پیدا ہو گیا ہے‘ جن میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا‘ حواریِ رسولؐ حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت طلحہؓ بھی شامل ہیں۔

صحابہؓ پر تنقید آنحضورؐ کی تنقیص ہے

اِس موقع پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص صحابہ کرامؓ اور بالخصوص خلفائے راشدین‘ عشرۂ مبشرہ‘ اصحاب بدر‘ اور اصحاب بیعت رضوان (رضی اللہ عنہم) پر تنقید کرتا ہے‘ ان کی تنقیص کرتا ہے‘ ان پر زبان طعن دراز کرتا ہے اور ان کا ادب و احترام ملحوظ نہیں رکھتا تو معاملہ اس حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ خالص علمی تجزیہ کیا جائے تو اس کی زد میں سرورِ عالم‘ محبوب خدا‘ خاتم النبیین والمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی آ جاتی ہے۔ اس لئے کہ کسی کے تربیت یافتہ اور شاگرد میں کوئی کمی یا نقص یا کوئی تقصیر ہو تو مربی‘ معلم اور استاد اس سے بالکل بری نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی کسی نہ کسی درجہ میں ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی بات کو حضورؐ کی اس حدیث میں واضح کیا گیا ہے :

((اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِي اَصْحَابِي ' لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِي ' فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي اَحَبَّهُمْ ' وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي اَبْغَضَهُمْ ' وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي ' وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللّٰهَ ' وَمَنْ آذَى اللّٰهَ فَيُوشِكُ اَنْ يَّاْخُذَهُ)) (رواہ الترمذی)

”میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرو‘ ان کو میرے بعد نشانہ نہ بناؤ۔ پس جس شخص نے ان کو محبوب جانا تو میری محبت کی وجہ سے محبوب جانا اور جس شخص نے ان کے ساتھ بغض رکھا تو میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان

[باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ فرمایئے!]

غلطیوں کی اصلاح کا نبویؐ طریق کار

تالیف : علامہ محمد صالح المُنجد' مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

(تیسری قسط)

لوگوں کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے
نبی اکرم ﷺ کے اختیار کردہ مختلف اسلوب

۱) غلطی کی فوری اصلاح :

نبی اکرم ﷺ تنبیہہ فرمانے میں جلدی کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ آپؐ کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ جب وضاحت کی ضرورت ہو آپؐ اس وقت بیان کرنے کے بجائے اسے ملتوی کر دیں۔ آپؐ اس بات کے مکلف تھے کہ لوگوں کو حق بتائیں' نیکی کی طرف رہنمائی فرمائیں اور برائی سے روکیں۔ لوگوں کی غلطیوں کی فوری اصلاح کی مثال میں آنحضرت ﷺ کی زندگی میں پیش آنے والے متعدد واقعات ذکر کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اُس صحابی کا واقعہ جنہوں نے نماز اچھی طرح نہیں پڑھی تھی' بنو مخزوم کی خاتون کا واقعہ' ابن لُتبِیَہ کا واقعہ' حضرت اُسامہ ؓ کا واقعہ اور اُن تین حضرات کا واقعہ جنہوں نے عبادت میں جائز حد سے بڑھ کر شدت سے کام لینے کا ارادہ کیا تھا۔ ان واقعات کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ اِن شاء اللہ

غلطی پر تنبیہہ کرنے میں تاخیر کی صورت میں بعض اوقات اصلاح کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور فائدہ حاصل نہیں ہوتا' بعض اوقات موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے' یا بعد میں بات کرنے کی کوئی مناسبت نہیں بنتی' یا ذہنوں میں واقعہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے تاثیر میں فرق آجاتا ہے۔

۲) غلطی کے ازالہ کے لئے شرعی حکم بیان کرنا :

حضرت جرہد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس سے رسول اللہ ﷺ گزرے' اُس وقت ان کی ران سے کپڑا ہٹا ہوا تھا' نبی ﷺ نے فرمایا : "اپنی ران ڈھانک لو' یہ پردے کے اعضاء میں شامل ہے"۔ (۱)

۳) غلطی کرنے والے کو اس شرعی اصول کی طرف توجہ دلانا' جس کی مخالفت ہوئی ہو :

بعض اوقات پیش آمدہ حالات میں شرعی اصول ذہن سے اتر جاتا ہے' لہٰذا اس اصول و قاعدہ کے اعلان و اظہار سے غلطی کرنے والا راہ راست پر واپس آتا ہے' اور غفلت کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ ایک بار منافقوں نے مہاجر اور انصاری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان فتنہ کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی' جس کی وجہ سے ایک خطرناک حادثہ پیش آتے آتے رہ گیا۔ اس موقع پر جناب رسول اللہ ﷺ کا طرز عمل زیر بحث نکتہ کی ایک بہترین مثال ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : ایک غزوہ میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ؐ کے ساتھ کافی تعداد میں مہاجرین بھی روانہ ہوئے تھے۔ مہاجرین میں ایک صاحب مزاحیہ طبیعت کے حامل تھے۔ انہوں نے (ہنسی ہنسی میں) ایک انصاری صحابی کو پاؤں سے ٹھوکر مار دی۔ انصاری صحابی کو شدید غصہ آیا حتیٰ کہ انہوں نے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ انصاری نے کہا : اے انصاریو! اس پر مہاجر نے کہا : اے مہاجرو! نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا : "یہ جاہلیت والوں کی سی پکار کیوں؟" پھر فرمایا : "بات کیا ہوئی؟" آنحضرت ﷺ کو مہاجر کے انصاری کو ٹھوکر مارنے کی بات بتائی گئی۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "یہ بات ترک کر دو' یہ ناپاک ہے"۔ (۲)

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "آدمی کو اپنے بھائی کی مدد کرنی چاہئے' خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اگر وہ ظالم ہے تو اسے ظلم سے منع کرے' یہی

اس کی مدد ہے' اور اگر مظلوم ہے تو اس کی مدد کرے"۔ (۳)

۴) غلطی کا سبب بننے والی غلط فہمی کی اصلاح :

صحیح بخاری میں حضرت حمید بن ابی حمید طویل رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث سنی۔ انہوں نے فرمایا : تین آدمی اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہوئے' اور انہوں نے (پردے کے پیچھے سے) نبی اکرم ﷺ کی (نفل) عبادت کے متعلق سوال کیا۔ جب انہیں بتایا گیا (کہ رسول اللہ ﷺ اس انداز سے عبادت کرتے ہیں) تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ عبادت تھوڑی ہے۔ تاہم انہوں نے کہا : ہماری آنحضرت ﷺ سے کیا نسبت؟ ان کے تو اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں (وہ تو اگر زیادہ عبادت نہ بھی کریں تو کوئی بات نہیں' ہمیں تو بہت زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے)۔ ان میں سے ایک بولا : میں ہمیشہ رات بھر نماز (تہجد) پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا : میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا' کسی دن ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا : میں عورتوں سے الگ رہوں گا' کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ (جب رسول اللہ ﷺ کو ان باتوں کا علم ہوا تو) آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا :

((اَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّي لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهُ ' لٰكِنِّي اَصُومُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّي وَ اَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ))

"تم لوگوں نے یہ یہ باتیں کی ہیں؟ اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ خوف خدا اور تقویٰ رکھتا ہوں' لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں' (رات کو) نماز (تہجد) بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' اور میں نے نکاح بھی کئے ہوئے ہیں"۔ (۴)

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چند افراد نے اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن سے آنحضرت ﷺ کے وہ اعمال دریافت کئے جو آپؐ گھر میں انجام دیتے تھے۔ (بعد میں) ایک نے کہا : میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا۔ ایک نے کہا : میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ ایک نے کہا : میں بستر پر نہیں سوؤں گا۔ (جب نبی اکرم ﷺ کو معلوم ہوا) تو آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا :

((مَا بَالُ اَقْوَامٍ قَالُوا كَذَا وَكَذَا؟ لٰكِنِّي اُصَلِّي وَاَنَامُ وَاَصُومُ وَاُفْطِرُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي))

"کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ فلاں فلاں بات کہتے ہیں۔ لیکن میں (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' (نفلی) روزہ بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں' اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا' وہ مجھ سے (کوئی تعلق) نہیں (رکھتا)"۔(۵)

اس واقعہ میں مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں :

- نبی اکرم ﷺ ان حضرات کے پاس تشریف لائے' دوسرے لوگوں کو شریک کئے بغیر صرف ان حضرات سے بات کی اور جب عام لوگوں کو یہ مسئلہ بتانا چاہا تو ان حضرات کی طرف اشارہ کئے بغیر اور اُن کا نام لئے بغیر بات کی' ان کو رسوا نہیں کیا' بلکہ یوں فرمایا : "کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ فلاں فلاں بات کہتے ہیں؟" اس سے ان پر شفقت اور ان کی پردہ پوشی مقصود تھی' اور سب لوگوں کو مسئلہ بتانے کا مقصد بھی حاصل ہو گیا۔
- اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے حالات اس مقصد سے معلوم کرنا درست ہے کہ ان کے اچھے کاموں کی پیروی کی جائے' اور یہ حالات معلوم کرنا اپنے نفس کی تربیت میں شامل ہے جو عقلمندی کی نشانی ہے۔
- اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مفید اور شرعی مسائل اگر مَردوں کے ذریعے معلوم کرنے میں کسی وجہ سے دشواری محسوس ہو' تو خواتین کے ذریعے معلوم کرنا بھی جائز ہے۔
- اپنے نیک اعمال کا ذکر کرنا جائز ہے بشرطیکہ ریاکاری کا خطرہ نہ ہو' اور بتانے سے دوسروں کو فائدہ ہو۔
- اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ عبادت میں اپنی جان پر سختی کرنے سے اکتاہٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں عبادت سرے سے چھوٹ جاتی ہے' اس لئے بہتر کام وہ ہے جس میں میانہ روی اختیار کی جائے۔(۶)

○ عملی غلطی کی بنیاد تصور کی غلطی ہوتی ہے۔ جب بنیادی تصورات صحیح ہوں تو غلطیوں کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث سے یہ واضح ہے کہ اُن صحابہ کرام ؓ نے جو رہبانیت اور سخت کوشی اختیار کرنا چاہی تھی۔ اس کی وجہ یہ غلط فہمی تھی کہ نجات کی اُمید تبھی ہو سکتی ہے اگر نبی اکرم ﷺ کی عبادت سے زیادہ عبادت کی جائے' کیونکہ نبی اکرم ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کی بشارت مل چکی ہے' جب کہ ان لوگوں کو یہ شرف حاصل نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے اس غلط تصور کی اصلاح کر دی اور انہیں بتا دیا کہ آپ ﷺ اگرچہ مغفور ہیں' پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرنے والے اور تقویٰ رکھنے والے ہیں اور انہیں حکم دیا کہ عبادت میں آپ ؐ کی سنت اور طریقہ پر ہی قائم رہیں۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ حضرت کہمس ہلالی ؓ کا ہے۔ وہ اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں : میں نے اسلام قبول کیا تو جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضور علیہ السلام کو اپنے قبول اسلام کی خبر دی۔ ایک سال بعد میں دوبارہ حاضر خدمت ہوا تو کیفیت یہ تھی کہ میرا جسم انتہائی دبلا پتلا ہو چکا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے نظر اٹھا کر مجھے اوپر سے نیچے تک اور نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ میں نے عرض کیا : "حضور! آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟" فرمایا : "تم کون ہو؟" میں نے کہا : "میں کہمس ہلالی ہوں"۔ فرمایا : "تمہاری یہ حالت کیوں ہو گئی؟" میں نے کہا : "آپ کے پاس سے رخصت ہونے کے بعد میں نے کبھی دن میں روزہ نہیں چھوڑا' اور رات کو کبھی نہیں سویا"۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا : "تمہیں یہ حکم کس نے دیا کہ اپنی جان کو عذاب دو؟ صبر والے مہینہ (رمضان) کے روزے رکھو' اور ہر مہینہ میں ایک روزہ رکھو"۔ میں نے کہا : "مجھے اس سے زیادہ کی اجازت دیجئے"۔ فرمایا : "صبر والے مہینہ کے روزے رکھو' اور ہر مہینہ میں دو روزے رکھو"۔ میں نے کہا : "میں اپنے اندر طاقت محسوس کرتا ہوں' مجھے مزید اجازت دے دیجئے"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "صبر کے مہینہ کے روزے رکھو' اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھ لیا کرو"۔(۷)

تصور کی اس غلطی کا تعلق بعض اوقات افراد کی قدر و قیمت کے تعین سے ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اس کی اصلاح اور توضیح کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا : جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ایک شخص گزرا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک صحابی سے فرمایا : "اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" انہوں نے عرض کیا : "یہ تو معزز لوگوں میں سے ہے' اللہ کی قسم! یہ تو ایسا آدمی ہے کہ اگر کسی سے رشتہ مانگے تو اس سے نکاح کر دیا جائے گا (ہر شخص خوشی سے رشتہ دینے کو تیار ہو گا)' اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے گی"۔ جناب رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور آدمی گزرا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "اِس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" انہوں نے عرض کیا : "یارسول اللہ! یہ تو مفلس مسلمانوں میں سے ایک (عام سا) آدمی ہے۔ یہ تو اگر کسی سے رشتہ مانگے تو اس کا نکاح نہیں ہو گا' اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ ہو' اگر بات کرے تو کوئی اس کی بات نہ سنے"۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "اُس (دولت مند) جیسے آدمیوں سے پوری زمین بھری ہوئی ہو تو ان سے یہ (مفلس مسلمان) بہتر ہے"۔ (۸)

ابن ماجہ کی روایت میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے : جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ایک شخص گزرا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "اِس شخص کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟" انہوں نے عرض کیا : "ہم وہی کہتے ہیں جو آپ کی رائے ہے۔ (ویسے بظاہر یہ کیفیت ہے کہ) یہ ایک معزز شخص ہے۔ اگر یہ نکاح کا پیغام بھیجے تو اس کا پیغام قبول کیا جائے' اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے' اگر بات کرے تو اس کی بات سنی جائے"۔ نبی ﷺ خاموش ہو گئے۔ ایک اور آدمی گزرا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "اِس شخص کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟" انہوں نے عرض کیا : "اللہ کی قسم! یارسول اللہ! (ہماری نظر میں تو) یہ ایک غریب مسلمان ہے' اگر نکاح کا پیغام بھیجے تو کوئی اسے رشتہ نہیں دے گا' اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی' اگر بات کرے تو اس کی بات نہیں سنی جائے گی"۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "یہ (مفلس مسلمان) اُس (دولت مند) جیسے زمین بھر آدمیوں سے بہتر ہے"۔ (۹)

۵) نصیحت اور بار بار تخویف کے ذریعے غلطی کی شدت کا احساس دلانا :

حضرت جُندب بن عبد اللہ بَجَلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے مقابلے میں مسلمانوں کا ایک لشکر روانہ فرمایا۔ دونوں لشکروں کا باہم سامنا ہوا۔ (جنگ کے دوران ایسا ہوا کہ) مشرکین میں سے ایک مرد جس مسلمان کو چاہتا قتل کر دیتا۔ (اس کے ہاتھ سے متعدد مسلمان شہید ہو گئے) ایک مسلمان نے اسے غافل پا کر اس پر حملہ کیا۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ نے فرمایا : صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے کہ وہ مسلمان اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما تھے۔ جب انہوں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے (فوراً) کہہ دیا : لا الٰہ الا اللّٰہ۔ صحابی نے (پھر بھی) اسے قتل کر دیا۔ (واپسی پر) ایک صحابی نے آ کر رسول اللہ ﷺ کو (فتح کی) خوش خبری دی' آنحضرت ﷺ نے ان سے حالات پوچھے' انہوں نے بتائے اور اس صحابی کی بات بھی بتائی کہ انہوں نے یہ کام کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس صحابی کو بلا کر پوچھا : "تم نے اس شخص کو کیوں قتل کر دیا؟" انہوں نے عرض کیا : "اس نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا' اور فلاں' فلاں شخص کو شہید کیا"۔ انہوں نے کئی حضرات کے نام لئے اور کہا : "میں نے اس پر حملہ کیا' اس نے جب تلوار دیکھی تو لا الٰہ الا اللّٰہ کہہ دیا"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "پھر تم نے اسے قتل کر دیا؟" انہوں نے کہا : "جی ہاں"۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "قیامت کے دن جب لا الٰہ الا اللّٰہ حاضر ہو گا تو تم کیا کرو گے؟" انہوں نے کہا : "یا رسول اللہ! میرے لئے گناہ کی معافی کی دعا کیجئے"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "قیامت کے دن جب لا الٰہ الا اللّٰہ حاضر ہو گا تو تم کیا کرو گے؟" حضور علیہ السلام بار بار یہی فرماتے رہے : "قیامت کے دن جب لا الٰہ الا اللّٰہ" حاضر ہو گا' تو تم کیا کرو گے؟"[۱۰]

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے خود بھی یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں : جناب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک دستہ کی صورت میں روانہ فرمایا' ہم نے صبح صبح جُہینہ کے گاؤں حُرقات پر حملہ کیا۔ میں نے ایک آدمی کو جا لیا۔ اس نے کہا : لا الٰہ الا اللّٰہ' لیکن میں نے اس پر وار کر دیا۔ پھر مجھے اس کے بارے میں پریشانی ہوئی۔ میں نے نبی اکرم

ﷺ کو یہ واقعہ بتایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "کیا اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا تھا، پھر بھی تو نے اسے قتل کر دیا؟" میں نے عرض کیا : "یا رسول اللہ! اس نے ہتھیار سے ڈر کر کلمہ پڑھا تھا"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "کیا تو نے اُس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ اُس (دل) نے کہا ہے یا نہیں؟ آپؐ بار بار مجھے یہی بات فرماتے رہے حتیٰ کہ میں یہ تمنا کرنے لگا کہ کاش میں اسی دن مسلمان ہوا ہوتا۔[11]

وعظ و نصیحت کے ذریعہ غلطی کی ایک صورت اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت یاد دلانا بھی ہے۔ اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔

امام مسلمؒ نے حضرت ابو مسعود بدری ؓ سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا : میں اپنے ایک غلام کو کوڑا لے کر مار رہا تھا، کہ مجھے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی : "ابو مسعود! تجھے معلوم ہونا چاہئے"۔ غصے کی شدت کی وجہ سے میں توجہ نہ کر سکا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ جب وہ قریب آ گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ ہیں، جو فرما رہے ہیں : "ابو مسعود! تجھے معلوم ہونا چاہئے"۔ میں نے کوڑا ہاتھ سے پھینک دیا۔ ایک روایت میں ہے : "آنحضرت ﷺ کی ہیبت کی وجہ سے کوڑا میرے ہاتھ سے گر پڑا"۔ آپؐ نے فرمایا : "ابو مسعود! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تجھے اس غلام پر جس قدر اختیار حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو تجھ پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے"۔ میں نے عرض کیا : "حضور! آج کے بعد میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا"۔ ایک روایت میں ہے : میں نے کہا : "یا رسول اللہ! یہ اللہ کیلئے آزاد ہے"۔ آنحضرتؐ نے فرمایا : "اگر تو (اس غلطی کی تلافی) نہ کرتا تو آگ تجھے جھلسا دیتی"۔ یا فرمایا : "آگ تجھے چھو لیتی"۔

صحیح مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا : "اللہ کی قسم! جتنی تجھے اس پر قدرت حاصل ہے اس سے زیادہ اللہ کو تجھ پر قدرت حاصل ہے"۔ چنانچہ انہوں نے اس غلام کو آزاد کر دیا۔[12]

سنن ترمذی میں حضرت ابو مسعود انصاری ؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا : میں اپنے ایک غلام کو پیٹ رہا تھا، کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کی آواز آئی : "ابو مسعود! جان لو۔ ابو مسعود! جان لو"۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ تھے۔

آپؐ نے فرمایا : "تجھے اس پر جتنی قدرت حاصل ہے' اللہ کو تجھ پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے"۔ ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا : "اس کے بعد میں نے کبھی اپنے کسی غلام کو نہیں مارا"۔ (۱۳)

۶) غلطی کرنے والے پر شفقت کا اظہار:

جو شخص اپنی غلطی پر انتہائی شرمسار ہو' اسے شدید افسوس ہو رہا ہو' اور واضح طور پر نظر آ رہا ہو کہ وہ دل سے تائب ہو چکا ہے' اسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس پر رحمت و شفقت کا اظہار کیا جائے۔ جیسے اس واقعہ میں ہوا :

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اس نے اپنی بیوی سے ظہار کیا تھا' پھر اس سے مباشرت کر بیٹھا تھا۔ اس نے کہا : یا رسول اللہ! میں نے اپنی بیوی سے ظہار کیا تھا' پھر کفارہ ادا کرنے سے پہلے اس سے مباشرت کر لی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "اس کی وجہ کیا بنی؟ اللہ تجھ پر رحم کرے"۔ اس نے کہا : چاند کی چاندنی میں اس کی پازیب پر میری نظر پڑ گئی (پھر مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "اب تو جب تک وہ کام نہ کر لے جس کا اللہ نے تجھے حکم دیا ہے (یعنی کفارہ کی ادائیگی) دوبارہ اس کے قریب نہ جانا"۔ (۱۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : "ہم نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک آدمی آگیا۔ اس نے کہا : "یا رسول اللہ! میں تباہ ہو گیا"۔ آپؐ نے فرمایا : "کیا ہوا؟" اس نے عرض کیا : میں روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس چلا گیا"۔ آپؐ نے فرمایا : "کیا تیرے پاس کوئی غلام یا لونڈی ہے جسے تو آزاد کر سکے" اس نے کہا : "جی نہیں"۔ آپؐ نے فرمایا : "کیا تو مسلسل دو ماہ روزے رکھ سکتا ہے؟" اس نے کہا : "جی نہیں"۔ فرمایا : "کیا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے؟" اس نے کہا "جی نہیں"۔ نبی اکرم ﷺ وہیں تشریف فرما رہے۔ (سائل بھی حاضر رہا)۔ اسی اثناء میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں کھجوروں کا ایک ٹوکرا پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "سائل کہاں ہے؟" اس نے کہا : "جی' میں ہوں"۔ فرمایا : "یہ لے جاؤ

اور انہیں صدقہ کر دو"۔ اس نے کہا : "اے اللہ کے رسول! کیا اپنے سے زیادہ غریب آدمی کو دوں؟ اللہ کی قسم! دونوں پتھریلے علاقوں کے درمیان (یعنی پورے مدینہ میں) ہم سے زیادہ غریب کوئی گھر نہیں"۔ نبی اکرم ﷺ کھل کر مسکرائے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے (ڈاڑھوں سے پہلے والے) نوکیلے دانت نظر آنے لگے۔ پھر فرمایا : "اپنے گھر والوں کو کھلا دو"۔(۱۵)

یہ شخص جو ایک غلطی کا ارتکاب کرنے کے بعد مسئلہ پوچھنے آیا تھا' مذاق نہیں کر رہا تھا' نہ اپنے گناہ کو معمولی سمجھ رہا تھا' بلکہ اسے اپنی غلطی کا جس شدت سے احساس تھا وہ اُس کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ "میں تباہ ہو گیا"۔ اس لئے وہ شفقت کا مستحق ہوا۔

مسند احمدؒ کی روایت میں زیادہ وضاحت سے بیان ہے کہ جب وہ مسئلہ پوچھنے آیا تو اس کی کیا کیفیت تھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا : "ایک اعرابی آیا' وہ چہرہ پیٹ رہا تھا اور بال کھسوٹ رہا تھا اور کہہ رہا تھا : میں تو برباد ہی ہو گیا ہوں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا : "تجھے کس چیز نے برباد کر دیا؟" اس نے کہا : "میں نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے مباشرت کر لی ہے"۔ آپؐ نے فرمایا : "کیا تو ایک غلام آزاد کر سکتا ہے؟" اس نے کہا : "جی نہیں"۔ آپؐ نے فرمایا : "کیا تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھ سکتا ہے؟" اس نے کہا : "جی نہیں"۔ آپؐ نے فرمایا : "کیا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے؟" اس نے کہا : "جی نہیں" اور اپنے فقر کا ذکر کیا۔ اتنے میں جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک ٹوکرا پیش کیا گیا' جس میں پندرہ صاع کھجوریں تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "وہ آدمی کہاں ہے؟" اور اس سے فرمایا : "یہ (غریبوں کو) کھلا دو"۔ اس نے کہا : "یا رسول اللہ! دونوں پتھریلے علاقوں کے درمیان ہم سے زیادہ حاجت مند گھر موجود نہیں"۔ جناب رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے نوکیلے دانت نظر آنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا : "اپنے گھر والوں کو کھلا دو"۔(۱۶)

۷) کسی کو غلطی پر قرار دینے میں جلدی نہ کریں :

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جو خود انہی کے الفاظ میں ذکر کیا جاتا

ہے۔ وہ فرماتے ہیں : جناب رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ایک بار میں نے ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ میں ان کی قراءت توجہ سے سننے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کئی الفاظ اس انداز سے پڑھ رہے ہیں جس طرح مجھے رسول اللہ ﷺ نے نہیں پڑھائے تھے۔ میرا جی چاہا کہ انہیں نماز ہی میں پکڑ لوں' لیکن میں نے صبر کیا' حتیٰ کہ انہوں نے سلام پھیر لیا۔ تب میں نے انہیں ان کی چادر سے پکڑ کر کہا : "آپ کو یہ سورت کس نے سکھائی ہے جو میں نے آپ کو پڑھتے سنا ہے؟" انہوں نے کہا : "مجھے رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی ہے؟" میں نے کہا : "آپ غلط کہتے ہیں۔ جس طرح آپ نے پڑھی ہے مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس سے مختلف انداز سے پڑھائی ہے"۔ میں انہیں پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں لے گیا اور عرض کیا : "میں نے انہیں سورۃ الفرقان کے کئی الفاظ اس طرح پڑھتے سنا ہے جس طرح آپ نے مجھے نہیں پڑھائے"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "انہیں چھوڑ دیجئے"۔ اور فرمایا : "ہشام! پڑھئے!" انہوں نے اسی طرح پڑھی جس طرح میں نے انہیں پڑھتے سنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "اسی طرح نازل ہوئی ہے"۔ پھر فرمایا : "عمر! آپ پڑھئے"۔ میں نے اس طرح پڑھی جس طرح آنحضرت ﷺ نے مجھے پڑھائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات طریقوں پر نازل ہوا ہے' لہٰذا جو طریقہ آسان معلوم ہو اسی طرح پڑھ لیا کرو"۔ (۱۷)

واقعہ میں تربیت سے متعلق نکات :

- آنحضور ﷺ نے ہر ایک سے دوسرے کے سامنے پڑھا کر سنا' اور اس کی قراءت کو درست قرار دیا۔ کسی کو غلط قرار نہ دینے اور دونوں کو صحیح قرار دینے کا یہ طریقہ بہت مؤثر ہے۔
- نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ہشام رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیں اور پکڑے نہ رکھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فریقین اطمینان سے ایک دوسرے کی بات سنیں اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔

○ طالب علم کسی مسئلہ میں علماء کے جس قول سے واقف ہے' اگر اس کے سامنے اس کے خلاف دوسرا قول پیش کیا جائے تو اسے چاہئے کہ تحقیق کے بغیر اسے غلط قرار نہ دے۔ ممکن ہے یہ بھی کبار علماء کا ایک قابل قبول قول ہو۔

اسی موضوع سے متعلق یہ نکتہ بھی ہے کہ سزا دینے میں جلدی کرنا درست نہیں' جیسے کہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ظاہر ہے :

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عباد بن شُرَحبِیل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' وہ فرماتے ہیں : میں اپنے ایک چچا کے ساتھ مدینہ آیا۔ وہاں ایک کھیت میں چلا گیا اور کچھ خوشے توڑ کر دانے نکال لئے۔ کھیت والے نے آ کر مجھے مارا اور میری چادر چھین لی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلا بھیجا' وہ حاضر ہوا تو آپ نے اسے فرمایا : "تو نے یہ کام کیوں کیا؟" اس نے کہا : "یہ شخص میرے کھیت میں آ گھسا' اس کے خوشے توڑے اور دانے نکال لئے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "وہ مسئلہ سے ناواقف تھا' تم نے اسے تعلیم نہیں دی' وہ بھوکا تھا' تم نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اس کی چادر واپس کرو"۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدھ وسق غلہ عطا فرما دیا۔[۱۸]

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ غلطی کرنے والے کے حالات معلوم کر لئے جائیں تو اس کے ساتھ صحیح رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھیت کے مالک کو سزا نہیں دی' کیونکہ وہ حق پر تھا۔ لیکن اس کے طرز عمل کو غلط قرار دیا اور واضح فرمایا کہ اس قسم کے موقع پر مسئلہ سے ناواقف آدمی کے ساتھ اس قسم کا رویہ اختیار کرنا درست نہ تھا۔ پھر اسے بتایا کہ صحیح طرز عمل کیا ہونا چاہئے اور اسے حکم دیا کہ بھوکے آدمی کے کپڑے واپس کر دے۔

(جاری ہے)

نوٹ : پیش نظر مضمون کے حواشی آئندہ شمارے میں اگلی قسط کے ہمراہ ملاحظہ فرمائیں۔

صَفوی دَور

اور ایران میں شیعیت کا فروغ

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۹)

ڈاکٹر ابو معاذ

عصر حاضر کے معروف ایرانی مفکر ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم نے اپنی تحریروں میں شیعیت کو دو اقسام میں بیان کیا ہے :

۱) **شیعیت علوی** : یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیروی میں ہے۔ اس میں حق گوئی و بیباکی، ملت و سلطنت اور ظلم کا مقابلہ مردانہ وار کرنا ہے۔ اس کا بنیادی عنصر اعلائے کلمۃ الحق ہے۔

۲) **شیعیت صفوی** : یہ صفوی دور کی ظالمانہ طور پر رائج کی گئی شیعیت ہے۔ اس کا مقصد آمرانہ شاہی نظام کو تحفظ عطا کرنے کے لئے دربار اور شاہ کی ذات کو مذہبی تقدس کا لبادہ اوڑھانا ہے۔

صفوی دور تک ایران اور فارسی گو علاقوں میں حنفی، سنی عقائد کا غلبہ رہا۔ حکومت وقت اور عوام کی واضح اکثریت بھی اسی مذہب پر کاربند رہی۔ ابوالقاسم فردوسی جیسے عظیم قومی شاعر کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ تھا۔ علاوہ بریں عظیم فارسی شعراء اور فضلاء مثلاً مولانا رومؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ، عمرو خیامؒ، حضرت سید عبدالقادر گیلانیؒ، صحاح ستہ کے جملہ ائمہؒ، ابو علی ابن سیناؒ، حکیم ابو سعید ابوالخیرؒ، شیخ سعدی شیرازیؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ، حافظ شیرازیؒ اور مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ چند ایک ایسے نام ہیں جو علم و عرفان اور شعروادب کے میدان میں بے مثال لوگ گزرے ہیں۔ یہ تمام لوگ حنفی

العقیدہ سنی عقائد کے حامل تھے (ماسوائے صحاح ستہ کے چند ائمہ اور امام غزالیؒ کے' جو سنی تو ضرور تھے مگر حنفی مسلک کے مقلد نہیں تھے)۔ اسی طرح برصغیر میں اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لئے جو بزرگ ایران و خراسان سے تشریف لے گئے وہ بھی حنفی سنی تھے۔ ان میں سے حضرت سید علی ہمدانیؒ (مبلغ کشمیر)' حضرت علی ہجویریؒ (مبلغ پنجاب)' حضرت جلال الدین تبریزیؒ (مبلغ بنگال) اور حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ سبھی لوگ سنی العقیدہ حنفی تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے پھر اچانک یہ کیسے ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں ایران کے مرکز میں شیعیت فروغ پا گئی؟ اس کے لئے صفوی خاندان کی سیاسی' سماجی اور فکری تاریخ اور حالات و واقعات کی بابت ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہرچند کہ صفویوں کا اپنا یہی دعویٰ تھا کہ وہ لوگ حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد سے ہیں' لیکن تاریخ کے محققین نے ان کے اِس دعویٰ کی صحت سے انکار کیا ہے۔ اس خاندان کے جد امجد صفی الدین اردبیلی تھے جو ایران کے صوبہ گیلان کے شہر اردبیل میں ۶۵۰ھ (بمطابق ۱۲۵۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مشہور صوفی بزرگ شیخ زاہد گیلانی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی ذاتی خوبیوں کے باعث بالآخر اپنے مرشد کے داماد بنے۔ اپنے مرشد کی وفات پر مسند ارشاد پر فائز ہوئے۔ آپ کی طلسماتی شخصیت کے زیر اثر آپ کے مریدوں کا حلقہ آہستہ آہستہ ایشیائے کوچک تک وسیع ہو گیا۔ آپ ۷۳۵ھ (بمطابق ۱۳۳۵ء) میں فوت ہوئے۔ آپ کے مریدوں میں سے عظیم فلسفی مصنف رشید الدین فضل اللہ جیسے دانشور اور ان کا بیٹا خواجہ غیاث الدین محمد شامل تھے۔ رشید الدین فضل اللہ کو منگولوں کے دربار میں وزارت عظمیٰ کا منصب حاصل رہا ہے۔ جناب صفی الدین اردبیلی کی وفات کے بعد ان کا بیٹا صدر الدین اپنے باپ کی گدی پر بیٹھا اور ۷۹۴ء (بمطابق ۱۳۹۱ء) تک بڑے زہد و تقویٰ سے زندگی گزاری۔ مشہور شاعر قاسم الانوار آپ کا مرید تھا۔ آپ کی ہر دلعزیز شخصیت کا شہرہ سن کر امیر تیمور بھی آپ کی خدمت میں پہنچا اور آپ ہی کی درخواست پر اس نے دیار بکر کے ترک قیدیوں کو رہا کر دیا جو اپنی زندگی کی امید سے محروم ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے قید سے رہائی پا کر آپ کی بیعت کر لی اور گیلان میں آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کی اولاد نے صفوی سلطنت کے قیام میں بے حد تعاون کیا۔ یہ

ترک آبادی صفوی خاندان کی عقیدت میں ہر طرح کی جان نثاری کے لئے ہمیشہ معروف عمل رہی۔ ان کے بر عکس مقامی ایرانی آبادی نے صفوی اثرات کو قبول کرنے میں وہ جوش نہیں دکھایا۔

صدر الدین کے بعد خواجہ علی نے مسند ارشاد سنبھالی۔ پھر ۸۳۰ھ (بمطابق ۱۴۲۶ء) میں آپ کے بیٹے شیخ ابراہیم اس مرتبہ تک پہنچے اور ان کی وفات پر سلطان جنید گدی نشین ہوئے۔ سلطان جنید کا حلقہ اثر جب بہت وسیع ہوا تو آذربائیجان کے حاکم جہاں شاہ قراقویونلو نے اپنے اقتدار کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہیں اردبیل سے جلاوطن کر دیا۔ آپ وہاں سے ترکی کے علاقہ دیار بکر چلے گئے جہاں کے حاکم اوزون حسن آق قویونلو نے آپ کا پرجوش خیر مقدم کیا اور عقیدتاً اپنی بہن خدیجہ آپ کے عقد میں دے دی۔ آپ شروانشاہ کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔ آپ کے بعد آپ کا بیٹا' اوزون حسن کا مقرب بن گیا اور آپ نے سلطان پر آہستہ آہستہ اتنا اثر و رسوخ قائم کر لیا کہ سلطان نے اپنی بیٹی عالم شاہ بیگم (جو یونانی عورت مارتھا کے بطن سے تھی) آپ کے عقد میں دے دی۔ اس طرح صفوی خاندان کی رگوں میں شاہی خون شامل ہو تا گیا۔ شاہی خاندانوں سے تعلقات کے باعث ان صوفی بزرگوں نے روحانیت کے ساتھ ساتھ سیاست کے انداز بھی اختیار کر لئے اور سلطنت کے حصول کی تمنا ان کے دلوں میں جاگزین ہو گئی۔ شیخ حیدر کے دو بیٹے ابراہیم مرزا اور شاہ اسماعیل تھے۔

شیخ حیدر نے حکم دیا کہ ان کے مرید ایرانی اور ترکی کلاہ کی بجائے بارہ کونوں والی سرخ ٹوپی دوازدہ ائمہ کی عقیدت کی نشانی کے طور پر پہنیں۔ اس وجہ سے یہ لوگ قزلباش (سرخ ٹوپی والے) مشہور ہوئے۔ شیخ حیدر بھی اپنے باپ کی طرح شروانشاہ کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ۸۹۳ھ (۱۴۸۷ء) میں مارے گئے۔

شاہ اسماعیل صفوی ۸۹۲ھ (۱۴۸۶ء) میں پیدا ہوا۔ جب وہ جوانی کی عمر کو پہنچا تو سلسلہ صفویہ کے تمام مریدوں نے اجتماعی طور پر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس نے اپنے مریدوں کو اپنی مقناطیسی شخصیت کے حصار میں قید کر کے اپنی غیر متزلزل اطاعت اور سرفروشی کی تربیت دی اور انہیں پوری طرح مسلح کر لیا۔ یہ پرجوش لوگ ہر وقت اپنے

مرشد کے حکم پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ اس نے سات ترک قبائل استاجلو' شاملو' روملو وارساق' ذوالقدر' قاچار اور افشار کو اپنا مرید بنالیا۔ پھر صوفیائے قراباغ نے بھی اس کی اطاعت قبول کرلی۔ اس نے شروانشاہ سے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لیا اور اسے شکست فاش دینے اور قتل کرنے کے بعد آذربائیجان کا علاقہ الوندبیگ آق قویونلو سے چھین لیا۔ اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لئے اس نے تبریز میں ۹۰۷ھ (۱۵۰۱ء) میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔

جلد ہی شاہ اسماعیل صفوی نے دیار بکر فتح کرلیا۔ باکو (آذربائیجان کا مرکزی مقام) فتح کرنے کے بعد اس نے شوشتر' فارس' کاشان اور استرآباد پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) میں اس نے بالآخر بغداد کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔

شاہ اسماعیل صفوی نے حکومت سنبھالتے ہی اثناعشری شیعہ مذہب کو ایران اور اپنے دیگر مفتوحہ علاقوں کا سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ علمائے اہل تشیع نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ان حالات میں جبکہ بلادِ ایران کے عوام کی اکثریت سنی العقیدہ ہے یہ اقدام فی الحال خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں' مگر شاہ اسماعیل نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کرادیا کہ اسے نصرت خداوندی اور ائمہ دوازدہ کی ارواح کی تائید حاصل ہے اس لئے ان عوامل سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' اس نے زور دے کر کہا کہ اگر کوئی شخص میرے خلاف آواز بلند کرے گا تو میں اسے شمشیر بے نیام سے کچل کے رکھ دوں گا اور اسے اور اس کے خاندان کو اور زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

شاہ اسماعیل صفوی کے زمانہ میں عظیم صحابہ خصوصاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلاف تبرّیٰ کا سلسلہ شروع کیا گیا اور اس سلسلہ میں دو قسم کی تاریخی روایات ملتی ہیں۔

- ایران کے عام لوگوں کو قطار کی صورت میں کھڑا کرکے انہیں خنجر تھمادیئے جاتے تھے اور انہیں حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ (شیخین) پر باآواز بلند (نعوذ باللہ) سب وشتم کرنے کو کہا جاتا تھا جو انکار کرتا تھا اسے حکم دیا جاتا تھا کہ اپنا ہی خنجر اپنے سینے میں اتار لے۔ ہزاروں لوگوں کی غیرت ایمانی یہ گوارا نہ کرسکی کہ وہ نازیبا

الفاظ اپنی زبان سے نکال سکیں۔ نتیجتاً انہوں نے اپنے ہاتھوں مرنے کو ترجیح دی۔

- سرکاری سرپرستی میں گروہ در گروہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں نکلتے اور شیخین کے خلاف دریدہ دہنی کرتے اور لوگوں کو اپنے ساتھ شریک ہونے کا حکم دیتے۔ بصورت انکار انہیں قتل کر دیتے۔

آہستہ آہستہ ان جانکاہ مظالم کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایران کے مرکزی علاقوں سے اہل سنت و الجماعت کے پیروکاروں کا قریباً قریباً صفایا ہوتا چلا گیا۔ سنی لوگ فارسی بولنے والے خطوں کے دور دراز کے علاقوں اور غیر فارسی گو علاقوں (کردستان، خوزستان، بلوچستان، سیستان، ترکمانستان اور سواحل) میں چلے گئے اور بے شمار لوگ خاموشی سے روپوش ہو گئے۔

شاہ اسماعیل نے یہ سخت متعصبانہ رویہ اپنے بعد میں فتح ہونے والے علاقوں کے لوگوں پر بھی قائم رکھا۔ وسطی ایشیاء کے فارسی گو اور ازبک علاقوں پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ اگر شاہ اسماعیل کا راستہ نہ روکا گیا تو وہ بڑھ کر ایک خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لے گا۔ شاہی سرپرستی میں زبردستی سے عوام میں شیعیت کی اشاعت اور فروغ کی جو مساعی کی جا رہی تھیں اس کی خبر بھی ان علاقوں تک پہنچ گئی اور لوگوں نے متحد ہو کر صفویوں کے خلاف مزاحمت کی ٹھان لی۔ ان ایام میں ماوراء النہر کے علاقوں میں مغل شہزادہ ظہیر الدین بابر اور شیبانی خان ازبک آپس میں برسرپیکار تھے۔ شیبانی خان ازبک نے سنیوں کے جذبات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امام العصر کا لقب اختیار کر کے شیعہ سلطنت کی توسیع کے خلاف رزم آراء ہونے کا عہد کیا۔ ان دنوں وہ بابر کو کئی مقامات پر شکست دے چکا تھا اور اس کی بہن کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ صفویوں کا خوف وسطی ایشیاء کے عوام کو شیبانی خان کے جھنڈے تلے لے آیا۔

شیبانی خان دراصل چنگیز خان کی اولاد سے تھا اور لوٹ مار اور قتل عام اس کی سرشت میں تھا۔ اس نے سمرقند، بخارا، تاشقند اور فرغانہ کے علاقوں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ۹۱۱ھ میں خراسان پر چڑھائی کر دی اور پھر ۹۱۵ھ میں شاہ اسماعیل کی قلمرو میں کرمان کے علاقہ پر یلغار کر دی۔ شاہ اسماعیل نے جب اس کے غاصبانہ قبضہ پر احتجاج کیا تو

جواباً اس نے شاہ اسماعیل کی تحقیر کیلئے کشکول اور ڈنڈا بھجوایا تاکہ اس کو فقیری کا طعنہ دے سکے۔ جواباً شاہ اسماعیل نے بھی اسے تکلا اور سوت کی گچھی بھجوائی جس کا مطلب یہ تھا کہ تم عورتوں کی طرح پیچ حربوں پر اتر آئے ہو۔ بالآخر ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں شاہ اسماعیل نے خراسان پر جوابی حملہ کردیا۔ مرو کے مقام پر اس کا مقابلہ ازبک لشکر سے ہوا۔ وہاں پر سترہ ہزار ایرانیوں نے اٹھائیس ہزار ازبکوں کو سخت جنگ کے بعد شکست فاش دی۔ بالآخر شیبانی خان گرفتار ہوا اور قتل کروا دیا گیا۔ اس کی کھوپڑی پر سونے کی پتری چڑھا کر شاہ اسماعیل نے پیالے میں تبدیل کر دیا۔ بعد میں بلخ سے ہرات تک کے تمام علاقوں پر شاہ اسماعیل نے تسلط حاصل کیا۔ بابر کی بہن کو عزت و احترام کے ساتھ شاہ اسماعیل نے ظہیر الدین بابر کے پاس بھجوا دیا۔ شیبانی خان کے خاتمے کے بعد بابر کو پاؤں پھیلانے کی فرصت مل گئی۔

اب ایران کے صفویوں اور ظہیرالدین بابر کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے بابر نے صفویوں کی شاہی بالادستی اور شیعہ مذہب کا اقتدار تسلیم کرلیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ وہ علاقے جہاں کبھی بابر کے والد عمر شیخ مرزا کی حکومت قائم تھی وہاں پر بابر کے اپنے نام کا سکہ چلے گا مگر ایرانیوں کی مدد سے فتح ہونے والے دیگر علاقوں پر شیعوں کے ائمہ دوازدہ کے ناموں سے سکے ڈھلنا قرار پائے۔ بابر نے اس معاہدہ کی رو سے ماوراء النہر پر حملہ کرکے ازبکوں سے بیشتر علاقے چھین لئے اور وہ اپنے آباء و اجداد کے دارالحکومت سمرقند میں فاتحانہ طور پر داخل ہوگیا جہاں سے اسے شیبانی خان نے ایک ذلت آمیز شکست کے نتیجہ میں نکال باہر کیا تھا۔ ان علاقوں میں جب ائمہ دوازدہ کے ناموں سے سکے جاری ہوئے تو وہاں کے متدین سنی عوام نے بابر کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا اور اجتماعی طور پر ایک مایوسی اور بددلی کی کیفیت پھیل گئی۔ اس کا پورا فائدہ ازبکوں نے اٹھایا۔ چنانچہ شیبانی خان کے جانشین عبداللہ نے ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں سنی عوام کی مدد سے بابر کو خوفناک شکست سے دوچار کیا اور سمرقند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال باہر کیا۔ بابر آخری بار پھر ایرانیوں کے تعاون سے سمرقند کو واپس لینے کے لئے آگے بڑھا اور بخارا کے شمال میں گجدوان کے مقام پر ازبکوں سے برسرپیکار ہوا، مگر شکست فاش سے

دو چار ہونے کے بعد ہمیشہ کے لئے وسط ایشیاء سے دست کش ہو گیا۔ اب اس نے بدخشاں اور کابل و غزنی پر قبضہ کر کے ہندوستان کی وسیع سرزمین پر حکومت کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ دلی پر قبضہ جمانے کے بعد بابر نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی دی۔ تاہم مغلوں اور صفویوں کا دفاعی اتحاد بعد میں بھی قائم رہا، جس کا ذکر ہم ہمایوں کی جلاوطنی کے ضمن میں کریں گے۔

اب ہم ترکی چلتے ہیں جہاں کا عثمانی حکمران سلطان سلیم بھی صفویوں کے سخت متعصبانہ رویہ اور بڑھتی ہوئی فوجی اور سیاسی طاقت سے خوفزدہ تھا۔ ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ء) میں چالداران کے مقام پر ترکوں کی یلغار کے بعد صفویوں کو اپنے دفاع کے لئے سلطان سلیم سے زبردست مقابلہ کرنا پڑا۔ ایرانی مورخین کے بقول سلطان سلیم نے صفویوں کو اشتعال دلانے کے لئے اپنے زیر انتظام علاقوں میں چالیس ہزار شیعوں کو قتل کروا دیا تھا اور سلطان سلیم ایران کی جانب چڑھ دوڑا تھا۔ عثمانیوں کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی اور ان کے پاس جدید قسم کی توپیں اور بندوقیں تھیں جن کی تکنیک انہوں نے یورپ سے حاصل کی تھی۔ صفویوں کی فوج ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ شاہ اسماعیل کی افواج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور عثمانی تبریز میں داخل ہو گئے۔ شاہ اسماعیل نے ہمدان میں پناہ لے لی اور فوجوں کو یکجا کر کے دو ہفتے کے عرصہ میں تیاری مکمل کر کے جوابی حملہ کر کے ترکوں سے تبریز واپس لے لیا، مگر دیار بکر اور کردستان کے علاقے سلطنت عثمانی کا حصہ بن گئے۔ شاہ اسماعیل نے یورپ کے دور دراز کے ممالک (جو سلطنت عثمانی کے دشمن تھے) سے اپنے روابط بڑھائے، توپ و تفنگ کی جدید ٹیکنالوجی حاصل کی اور توپ ڈھالنے کا فن خود بھی سیکھا اور اپنے حلیف بابر کو بھی منتقل کیا۔ ۹۳۰ھ (۱۵۲۴ء) میں شاہ اسماعیل پچیس برس حکومت کرنے کے بعد اڑتیس (۳۸) سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ لودھی افواج کو پانی پت کے میدان میں بابر کی توپوں نے ہی شکست سے دوچار کیا تھا۔

شاہ اسماعیل کی وفات کے موقع پر اس کا بیٹا طہماسپ گیارہ برس کی عمر میں بادشاہ بنا اور ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) تک تخت شاہی پر متمکن رہا۔ اس کے عہد میں شمال مشرق سے

شیبانی خان کا بیٹا عبد اللہ ازبک، خراسان کے علاقوں طوس، مشہد اور ہرات میں تاخت و تاراج کرتا رہا۔ بغداد میں بغاوت ہوئی اور ظہور قبیلے کے سردار نے وہاں پر اپنی ایک خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس دوران عثمانی ترک (سلطان سلیمان کے زمانہ میں) بھی صفویوں کے خلاف مسلسل برسرپیکار رہے اور بالآخر آذربائیجان اور بغداد پر قابض ہو گئے۔ شاہ طہماسپ ان دنوں خراسان میں تھا۔ واپس لوٹنے کے بعد اس نے عثمانی ترکوں سے یہ علاقے دوبارہ حاصل کر لئے۔ شاہ طہماسپ کے اپنے بھائی بھی اس سے الجھتے رہے اور مسلسل ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت جاری رہی۔ اس کا اپنا بھائی القاص بھاگ کر عثمانی دربار میں پناہ گزین ہو گیا اور عثمانی سلطان کے بیٹے بایزید نے بھی اپنے باپ کے خلاف ناکام بغاوت کے بعد صفوی دارالحکومت اصفہان میں پناہ لی۔ مجبوراً ترکوں (عثمانیوں) اور صفویوں میں صلح ہو گئی۔ ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) میں صلح کا معاہدہ طے پایا جس کے تحت ایرانیوں کو طویل عرصہ کے بعد حج پر جانے کی اجازت ملی۔ یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ حجاز مقدس پر قابض عثمانیوں نے ایرانیوں پر شیعہ ہونے کے باعث حج کے سفر پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ علاوہ بریں ایران اور عثمانی سلطنت کے سرحدی مناقشات بھی ختم ہو گئے۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے مغل تاجدار نصیر الدین ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا اور وہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ بھاگ کر ایران آ گیا۔ ہمایوں کے اصفہان میں قیام کے دوران کئی بار صفویوں کے مزاج میں تبدیلی آئی۔ کبھی کوئی شوشہ چھوڑتا کہ بابر نے شاہ اسماعیل سے کسی موقعہ پر بدعہدی کی تھی۔ کبھی ہمایوں کے بھائی کامران مرزا کا کابل سے خط آ جاتا کہ نااہل ہمایوں کی بجائے اس کی مدد کی جائے۔ صفوی خواتین کے مغل خواتین سے ان ایام میں خوشگوار مراسم اُستوار ہو گئے تھے۔ صفوی خواتین نے ہمایوں کا ساتھ دیا اور ہمایوں کے ساتھ ہندوستان کی تسخیر کے لئے ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں ایک ایرانی لشکر بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ مجبوراً ہمایوں نے شاہ ایران کی تمام شرائط تسلیم کر لیں جن میں شیعہ عقائد کی ترویج و اشاعت کے علاوہ شیعہ مذہب قبول کرنا بھی شامل تھا۔ یہ وہی صورت حال تھی جو بابر کو ماوراء النہر کی تسخیر کے موقع پر درپیش تھی۔ ایرانی فوج کے ہمراہ شیعہ مبلغین بھی ہندوستان کی جانب روانہ ہوئے۔

ایرانی فوج کی مدد سے ہمایوں نے کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کر لی اور ایرانی لشکر ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً لکھنؤ' دہلی' لاہور وغیرہ میں منتشر ہو کر مقیم ہو گیا اور یہاں پر اہل تشیع کے کئی اہم مراکز قائم ہو گئے۔ ان لوگوں کا تعلق ایران سے بدستور قائم رہا اور مذہبی مبلغین ان کی مذہبی ضروریات پورا کرنے کے لئے اسی طرح ایران سے آتے رہے جیسے آج کل ہمارے ہاں سے علماء برطانیہ وغیرہ میں مقیم پاکستانی طبقات کی مذہبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے جاتے رہتے ہیں۔

ان دنوں سواحل ایران پر موجود پرتگیزی تجارتی مراکز کے ذریعہ پرتگال سے ایران کے تعلقات قائم ہوئے اور سلطنت برطانیہ کا سفیر ملکہ الزبتھ اول کی طرف تحائف اور دوستی کا پیغام لے کر آیا۔

شاہ طہماسپ کے بعد اس کے بیٹوں میں ایک بار پھر آپس میں ٹھن گئی اور جنگ برادر کشی کے بعد شاہ اسماعیل (۹۸۴ھ - ۹۸۵ھ بمطابق ۱۵۷۶ء - ۱۵۷۷ء) بر سر اقتدار آیا۔ اس نے اپنے اہل خاندان کا خوب صفایا کروایا۔ ایرانی مورخین نے اسے عیاش' بدکار اور سنی العقیدہ قرار دیا ہے۔ صفویوں میں سے سنی شہزادے کا وجود حیرت انگیز امر دکھائی دیتا ہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ سنی سے مراد یہاں بے دین لیا گیا ہے کیونکہ اس زمانے میں یہ لفظ ایران میں عام طور پر نفرت کی علامت بن گیا تھا۔ اس کی وفات یا قتل کے بعد سلطان محمد خدابندہ (۹۸۵ھ - ۹۹۶ھ بمطابق ۱۵۷۷ء - ۱۵۸۷ء) بر سر اقتدار آیا۔ یہ بادشاہ نابینا تھا۔ اس کے زمانہ میں عثمانی ترک ایک بار پھر آذربائیجان (بشمول تبریز) پر قابض ہو گئے۔ اسی طرح ماوراء النہر کے ازبکوں کو بھی ایران میں تاخت و تاراج کا موقع فراہم ہو گیا۔ یہ زمانہ ایران کی پریشان حالی کا زمانہ تھا۔ عمائدین' علماء اور شعراء نے ان ایام میں ہندوستان کی راہ لی اور وہاں کے مغل دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے۔

اب شاہ محمد خدابندہ کے دوسرے بیٹے عباس صفوی (۹۹۶ھ - ۱۰۳۸ھ بمطابق ۱۵۸۷ء - ۱۶۲۹ء) کی باری تھی۔ اس بادشاہ نے ۴۳ برس ایران پر مسلسل حکومت کی اور عباس اعظم کہلوایا۔ اس کا ابتدائی عہد بدامنی کا زمانہ تھا۔ عثمانیوں کی یلغار اور پے در پے حملوں سے تنگ آ کر اس نے تبریز' شروان' گرجستان (جارجیا) اور لرستان کے

مفتوحات عثمانیوں کے سپرد کر دیئے۔ خود وہ عبید اللہ کے بیٹے عبد المومن خان ازبک سے مقابلہ کرنے خراسان کی جانب جا رہا تھا کہ تہران میں بیمار ہو کر بستر پر لگ گیا۔ اس دوران متعصب سنی ازبک حملہ آوروں نے مشہد پر قبضہ کر لیا۔ ازبکوں نے اہل شہر کو تہ تیغ کیا اور امام علی رضاؒ کے مقبرے کے خزانے کو لوٹا اور اسے تاخت و تاراج کیا' وہاں کی نفیس اشیاء اٹھالیں اور کتاب خانہ کو نذر آتش کر دیا۔ مشہد کی تباہی کے بعد ازبکوں نے نیشاپور' دامغان' اسفرائن' طوس اور طبس کو بری طرح لوٹ کر تباہ و برباد کیا۔ اسی دوران عبد المومن ازبک کا والد عبید اللہ ازبک وفات پا گیا اور عبد المومن بھی اپنے پیرو کاروں ہی کے ہاتھوں (جو اس کے باپ کو امام العصر مانتے تھے) مارا گیا۔ اتنے میں شاہ عباس بھی صحت یاب ہو گیا اور ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۷ء) میں اس نے ہرات میں ازبکوں کو جالیا اور انہیں ایک عبرت ناک شکست سے اس طرح دوچار کیا کہ وہ ایک طویل عرصہ تک بلاد خراسان و ایران کا رخ نہ کر سکے۔ پھر شاہ عباس نے یزد' کرمان' گیلان اور لرستان پر دوبارہ اپنی حکومت مستحکم کی اور باغیوں کا قلع قمع کیا۔

بعد ازاں اس نے پرتگالیوں کو کچھ ساحلی علاقے دینے کے بعد ان کی مدد سے بحرین اور بلوچستان کو مطیع کیا۔ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں عثمانیوں کو شکست دے کر اپنے چھینے ہوئے علاقے ترکوں سے واپس لے لئے۔ اس کے زمانے میں ایران کے ولندیزیوں (ڈچ)' فرانسیسیوں اور سپین کے یورپی ممالک سے تجارتی روابط اُستوار ہوئے۔ قندھار کا شہر مغلوں اور شاہ عباس کے درمیان مسلسل مسئلہ نزاع بنا رہا اسی مسئلہ پر ہندوستان کے مغل حکمران نور الدین محمد جہانگیر کی شاہ عباس سے قندھار کے مقام پر تاریخی ملاقات بھی ہوئی۔ اس کے زمانہ میں ملک کا دار الحکومت قزوین سے اصفہان منتقل ہوا۔ اور اس نے وہاں پر اعلیٰ ترین عمارات مثلاً مسجد شاہ' چہل ستون' علی قاپو اور میدان سپاہ کی تعمیر کروائی۔ یہ عمارات آج بھی وہاں پر سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

شاہ اسماعیل کے بعد شیعیت کی ترویج میں اس بادشاہ کا بہت ہاتھ ہے۔ اس نے مختلف قبائل سے رابطہ اُستوار کر کے مشہد کو مذہبی مرکزیت دلوانے کی مہم چلائی اور وہاں پر حضرت امام علی رضاؒ کے مدفن کی موجودگی کے باعث اسے مقدس مقام کا درجہ دلوانے

میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گاہے بگاہے اصفہان سے آٹھ سو میل کا طویل سفر طے کر کے مشہد میں حاضری دیتا اور سال میں دو ہفتے روضہ امام رضاؑ پر اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دیتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ پاپیادہ بھی زیارت کے لئے مشہد آیا تھا۔ کئی بار اس نے روضہ کی ہزاروں شمعیں اپنے ہاتھوں سے قطع کیں۔ اس نے اپنا گراں بہا خزانہ اور اس کی کمان (جس پر اس کا نام کندہ ہے) روضہ میں رکھوا دی۔ علاوہ بریں وہ زیارت کے لئے نجف بھی جاتا اور حضرت علیؓ کے مزار کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتا تھا۔ وہ زندگی بھر ایران کے لوگوں میں شیعہ عقائد کی ترویج اور عقیدت میں اضافہ کے لئے کوشاں رہا۔ اس نے مذہبی علماء کے باہمی اختلافات کو بطور احسن ختم کروایا۔ مذہبی علماء اور مجتہدین کی درجہ بندی کروائی اور سرکاری طور پر ان کے مربوط کلیسائی نظام کو تسلیم کیا۔ مختلف مزاروں کی دیکھ بھال کے لئے اوقاف قائم کئے۔ اس کے زمانہ تک سنی رعایا بری طرح سہم چکی تھی اور ایران میں شیعیت پورے زوروں پر تھی۔ علماء کی کمی کو پورا کرنے کے لئے شیعہ علماء کو خصوصی طور پر عرب ممالک سے بلوایا گیا تھا اور انہیں زبردست مراعات دی گئیں تھیں۔ یہ علماء عوام میں شاہ پرستی کی تلقین کرتے تھے۔ کلیم صدیقی نے اپنی کتاب "انقلاب ایران" میں الکار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ شیعہ علماء شاہ (اور دیگر صفوی علماء) کو تعظیمی سجدہ بھی کرتے تھے۔ چونکہ اس سے پہلے ایران میں شیعہ علماء کے مدارس اور مکاتب موجود نہیں تھے اس لئے یہ انتظام ضروری سمجھا گیا تھا۔ یہی غیر ملکی علماء صفوی دربار کے تقدس کو برقرار رکھنے میں ہردم کوشاں رہے۔

شاہ عباس کے بعد شاہ صفی (۱۰۳۸ھ - ۱۰۵۲ھ بمطابق ۱۶۲۹ء - ۱۶۴۲ء) کا دور ہے۔ اس ناتجربہ کار بادشاہ نے اپنے ہی محسنوں کو قتل کروایا، ازبکوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھائی اور عثمانی سلطان مراد چہارم کے لشکر سے شکست کھا کر کردستان اور ہمدان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ البتہ بغداد کو ترکوں سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کا بیٹا شاہ عباس دوم (۱۰۵۲ھ - ۱۰۷۷ھ بمطابق ۱۶۴۲ء - ۱۶۶۷ء) دس برس ہی کی عمر میں حکومت پر فائز ہوا۔ اس کی کم سنی میں امرائے سلطنت نے مذہبی پابندیاں مزید سخت کر دی تھیں اور میخانے بند کروا دیئے تھے۔ بادشاہ چونکہ خود بہت زیادہ شراب نوشی

[illegible]س لئے اس نے ہوش سنبھالتے ہی یہ پابندیاں نرم کر دیں۔ اس نے تمام مذاہب کے [illegible] کاروں سے یکساں نرمی کا سلوک کیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ایمان ایک امر باطن ہے اور باطن کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ میں تو صرف عالم ظاہر کا بادشاہ ہوں۔ اس نے مغل بادشاہ شاہجہان کے باغی حاکم بلخ کو مدد دی اور پہلی مرتبہ روسیوں سے جنگ لڑی۔

پھر اس کا بیٹا شاہ سلیمان ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۷ء) میں برسراقتدار آیا اور ۱۱۰۵ھ (۱۶۹۴ء) تک حکومت کی۔ یہ ضعیف العقل، ظالم اور سنگ دل انسان تھا۔ اپنے مصاحبوں تک کے کان، ناک کٹوا دینا یا آنکھ نکلوا دینا اس کا عام معمول تھا۔ یہ خواجہ سراؤں کے اثر میں آگیا تھا اور عیش و عشرت میں مستغرق رہتا تھا۔ جب ہالینڈ والوں (ولندیزیوں) نے خلیج فارس میں کشم کی بندرگاہ پر قبضہ کیا تو اسے کچھ اثر نہ ہوا۔ ازبک خراسان کو لوٹتے رہے تو اس کی بلا سے۔ تاہم اس نے پوری طرح سے شیعہ عقائد کی شدت سے پاسداری کی، امام رضاؑ کے مقبرے کے گنبد کو زلزلے سے نقصان پہنچا تو اس کی شاندار مرمت کروائی اور ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۶ء) میں وہاں پر ایک کتبہ نصب کیا۔ مشہد سے باہر معلی (مقام نماز) اس کی یادگار ہے جس کی محراب پر نیلی سطح پر سفید رنگ میں آیات قرآن درج ہیں۔ اس کی وفات کے بعد ایران میں صفوی سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ خانہ جنگیوں، ترکوں، ازبکوں اور یورپی طاقتوں کے حملوں کی تفصیل یہاں مطلوب نہیں ہے ایک وقت آیا کہ افغانوں نے محمود کی قیادت میں اصفہان، شیراز اور یزد میں لوٹ مار مچا دی۔ خراسان خود مختار ہو گیا اور عثمانی ترک ایران کے مغربی اور شمال مغربی علاقوں پر قابض ہو گئے۔

ان دنوں خراسان کے ایک شہر ابیورد میں ایک معمولی خاندان کا بچہ نادر شاہ (جس کا تعلق قرقلو قبیلہ سے تھا) افشاریوں کی مدد سے طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بچپن میں ریوڑ چراتا اور گدھے اور اونٹ پر ایندھن لاد کر بھی بازار میں بیچا کرتا تھا۔ ایک بار ازبک چھاپہ مار اس کو اور اس کی بیوہ ماں کو اٹھا کر لے گئے تھے اور انہیں خوارزم میں بیچ دیا تھا۔ چار سال انہوں نے غلامی کی زندگی بسر کی اور ایک دن نادر بھاگ کر خراسان آن پہنچا۔ یہاں ابیورد کے حاکم بابا علی بیگ احمد لو افشار کے دربار میں ملازمت

اختیار کرلی۔ بابا علی نے اس کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اسے اپنا داماد بنالیا اور اس کی وفات پر وہ ابیورد کا حکمران بن گیا۔ پھر محمود سیتانی نے اسے جب اختیار و اقتدار سے محروم کیا تو اس نے رہزنی شروع کردی اور کاروان لوٹتے لوٹتے تین ہزار کا لشکر بنالیا۔ پھر اس نے جبراً اہل خراسان سے محصول وصول کرنا شروع کیا اور قلعہ کلات پر بزور قبضہ کرلیا جو اس کے نام کی مناسبت سے کلات نادری کہلایا۔ پھر نیشاپور پر قبضہ کرنے کے بعد صفوی بادشاہ کے نام پر خراسان پر حکومت شروع کردی۔ افغانوں کو پے در پے شکست دینے کے بعد وہ ایک بار پھر ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۹ء) میں صفوی اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اصفہان میں داخل ہو کر طہماسپ صفوی کو یہ شہر سونپ دیا۔ شاہ طہماسپ صفوی شہر کی تاریخی عمارات کی شکستہ حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ افغانوں کو ملک بدر کر کے عثمانی ترکوں کو آذربائیجان اور ہمدان سے نکال باہر کیا۔ بالآخر اس نے شاہ طہماسپ کو اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا اسیر کرلیا اور خراسان جلاوطن کردیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں اس نے شاہ طہماسپ کے بیٹے عباس سوم کو بادشاہت عطا کر کے امور انتظامی (بطور ریجنٹ) اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ پھر ترکوں سے معرکہ آراء ہونے کے بعد بحیرہ خزر (Caspian Sea) کے علاقوں سے روسیوں کو باہر نکالا اور دربند اور باکو پر اپنا قبضہ مستحکم کرلیا۔ ۱۱۴۸ھ (۱۷۳۵ء) تک وہ ایران کے تمام علاقوں سے عثمانیوں، روسیوں اور افغانیوں کو نکال چکا تھا، اب اس نے باقاعدہ طور پر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ یہ اعلان اس نے ایرانی عمائدین، قاضیوں اور بزرگوں کی موجودگی میں ان کے مطالبہ پر کیا اور صفوی سلطنت ہمیشہ کے لئے ختم کردی گئی۔ تاج پوشی کے موقع پر اس نے حاضرین سے مطالبات منوائے وہ درج ذیل ہیں :

۱۔ ایران کا ایک سرکاری مذہب اہل سنت والجماعت بھی ہو گا اور حنفی فقہ سرکاری طور پر تسلیم کی جائے گی۔ اہل ایران اہل سنت والجماعت کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کردیں گے اور سنیوں کی چاروں قسم کی فقہ (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) کے ساتھ ساتھ پانچویں فقہ بھی بطور فقہ جعفری تسلیم کرلی جائے گی۔

۲۔ خانہ کعبہ میں مختلف سنی فقہ کے پیروکار چار مختلف ارکان پر نماز ادا کرتے ہیں۔

انی کسی بھی ایک رکن میں ان کے ساتھ شامل ہو کر نماز پڑھیں گے۔ شیعہ حضرات فقہ جعفری کے مطابق باقی مسلمانوں سے مل کر نماز ادا کریں گے۔

۳۔ ایرانیوں کی طرف سے ہر برس ایک امیرالحاج متعین ہو گا جو دولت عثمانی کے کارندوں سے اسی طرح معاملات طے کرے گا جیسے شام اور مصر کے امرائے حجاج معاملات طے کرتے ہیں۔

۴۔ غلاموں کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کر دی جائے گی اور جنگی قیدی آزاد کر دیئے جائیں گے۔

۵۔ سلطنت عثمانی اور ایران کے وکلاء (سفراء) ایک دوسرے کے دارالحکومت میں قیام پذیر رہیں گے اور معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

ان مطالبات کے ماننے پر نادر شاہ ایران کا مطلق العنان بادشاہ بن گیا۔ یہ مشترکہ اعلامیہ دراصل اس امر کا نتیجہ تھا کہ ایرانی عوام اور عمائدین مذہبی عناد اور تعصب سے تنگ آ چکے تھے اور وہ خود بھی باقی مسلمان امت کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے تھے۔ ہر چند کہ اس مذہبی تبدیلی کو بہت سے لوگوں نے دلی طور پر نہ مانا مگر یہ تبدیلی سرکاری سطح پر ضرور نظر آئی۔ نادر شاہ نے اہل تشیع اور اہل تسنن کے بین بین حضرت امام جعفر صادق کے نام پر مذہب جعفریہ کی ترویج کرنا چاہی اور ایران کو امت کے دھارے میں شامل کرنا چاہا مگر بعد کے حالات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ خاطر خواہ حد تک کامیاب نہیں ہو سکا۔

صفوی دور میں مذہبی سختی اور عدم رواداری کے باعث لوگ بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے اور فارسی شعر و ادب اسی وجہ سے انحطاط پذیر ہو گیا۔ مشہور شعراء سلطنت ایران کو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے جہاں کے مغل تاجدار فارسی شعر و ادب کے دلدادہ تھے اور شعراء و فضلاء کے مربی و محسن تھے۔ اس اَمر کی طرف ایران کے بیسویں صدی کے پہلے حصے کے مشہور شاعر ملک الشعراء بہار نے بڑے نازک انداز میں اشارہ کیا ہے۔ آپ کی مشہور نظم "خطاب بہ ہند" کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

چون کسی را صنعتی غالب بود　　می شتابد ہر کجا طالب بود

(اگر کسی کو کسی ہنر یا صنعت پر قدرت حاصل ہو تو وہ وہیں کا رخ کرے گا
جہاں اس کے چاہنے والے موجود ہوں گے۔)

از ہمایوں گیر تا شاہِ جہاں شاعران را بود ہند آرامِ جان
(ہمایوں سے لے کر شاہ جہاں تک ہندوستان ہی شعراء کے لئے سکون اور
روحانی اطمینان کا مقام تھا۔)

ہند بازارِ خریدِ ذوق بود ہند یکسر عشق و شور و شوق بود
(جس منڈی میں شعری ذوق کا سودا ہو سکتا تھا وہ ہند ہی تھا اور یہی ملک عشق،
شور اور شوق کی آماجگاہ تھا۔)

صنعت و ذوقِ ہنر ترکیب یافت کاروانہا جانبِ دہلی شتافت
(صنعت اور ذوق ہنر آپس میں مل گئے اور قافلے کے قافلے دہلی کی جانب
چل دیئے۔)

بس رواں شد کارواں در کارواں تنگہای دل پُر از کالای جان
(قافلوں کے پیچھے قافلے لگاتار اسی سرزمین کا رخ کرتے رہے۔ ان کا سازو
سامان ان کے دلوں کے بقچوں میں بند تھا اور یہ سامان سفر دراصل ان کی
جان یا روح کی متاع تھی۔)

رشکِ غزنیں گشت بزم اکبری نغمہ خوان ہر سو ہزاراں عنصری
(اکبر کی محفل پر غزنی کے ماضی کو رشک آنے لگا اور عنصری جیسے ہزاروں
شعراء وہاں پر نغمہ خواں ہو گئے۔)

بزمِ نور الدین گلستانی دگر درگہ نورِ جہاں جانی دگر
(نورالدین محمد جہانگیر کی محفل بھی ایک عجیب گلستان کا منظر پیش کر رہی تھی۔
نورجہاں بیگم کے دربار کا اپنا ہی ایک وجود تھا۔)

دوسری جانب شعراء اور فضلاء کے عازم ہندوستان ہونے کے باعث ایران کی شعر
و سخن کی محفلیں اجڑ چکی تھیں۔ عربی نژاد شیعہ علماء اور ان کے شاگردوں کے اقتدار کا
دور دورہ تھا۔ شعراء اگر تھے تو انہیں ائمہ دوازدہ کی منقبت اور مرثیہ گوئی پر مجبور کر دیا

گیا کیونکہ شاہان وقت اپنے قصائد کی بجائے ائمہ کی تعریف سننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اسی طرح شیعہ عقائد کی تصانیف کے سلسلے میں علماء کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ایسے علماء میں سے شیخ بہائی بھی شامل ہیں جو شام کے شہر بعلبک سے تعلق رکھتے تھے اور صفوی دور میں شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے جامع عباسی، تشریح الافلاک اور کشکول بہائی جیسی تصانیف چھوڑیں ہیں۔ اسی طرح ہمیں ملا صدرا (صدر الدین شیرازی) کا نام ملتا ہے جنہوں نے ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے دین و فلسفہ کے موضوعات پر کتب تحریر کیں۔ اسفار اربعہ، شواہد الربوبیہ، شرح اصول کافی، کتاب الہدایہ، شرح حکمت الاشراق، کتاب الواردات القلبیہ اور کسر الاصنام الجاہلیہ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ علامہ اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں بھی آپ کے فلسفیانہ افکار کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح ملا باقر مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ) کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے عربی میں بحار الانوار اور فارسی میں مشکوۃ الانوار، عین الحیات، حلیتہ المتقین، حیات القلوب، تحفہ الزائرین، جلال العیون وغیرہ لکھی ہیں۔ علاوہ بریں خشک فلسفے اور علم الکلام پر بھی ان دنوں کچھ کتابیں ملتی ہیں۔

صفوی بادشاہ اگرچہ خود ایک صوفی بزرگ کی اولاد میں سے تھے لیکن وہ خود صوفیاء کی زبردست مخالفت کرتے تھے۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ عموماً صوفیاء کرام سنی مسلک سے وابستہ تھے۔ صوفیوں کا اثر مریدوں اور عوام پر بہت تھا۔ ان سے یہ خطرہ درپیش تھا کہ کہیں وہ سرکاری مذہب کے خلاف کوئی تحریک نہ چلا دیں۔ اس لئے انہوں نے مسلک تصوف سے عوام کی توجہ ہٹانا چاہی۔ صوفی شعراء اور نثر نگاروں کا ایران میں کوئی پرسان حال نہ رہا۔ غزل، مثنوی اور رباعی (جو صوفیانہ موضوعات کے بیان کا ذریعہ تھی) ماضی کے دھندلکوں میں کھو کے رہ گئیں۔ "تاریخ ادبیات ایران" کے مولف جناب رضا زادہ شفق کے بقول شاہ طہماسپ اور شاہ عباس کا بالخصوص اور دیگر شاہان صفویہ کا بالعموم حکم تھا کہ قصیدے صرف ائمہ کے کہے جائیں، کسی صورت میں امراء اور روساء کی مدح خوانی نہ کی جائے۔ اسی لئے تمام صفوی عہد میں مولانا جامی کے علاوہ کوئی اور بڑا نام تاریخ شعر و ادب میں نہیں ملتا۔

صفوی دور میں شیعہ مذہب میں دیگر روایات کا اضافہ
تصورات کا ارتقاء

امامت کا تصور

ازمنہ قدیم میں ایران میں شہنشاہ کی ذات دینی (Religious) تسلط اور دنیاوی (Temporal) اقتدار کا سرچشمہ تھی اور مذہبی اعتبار سے وہ بھی خدا کی عکس سمجھی جاتی تھی۔ تمام مذہبی رہنما اس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ امام حسینؓ کی شخصیت میں بھی اہل ایران کو (یزدگرد سوم ساسانی شہنشاہ کی بیٹی حضرت شہربانوؒ کے عقد کے باعث) خاندان نبوت اور ایرانی شہنشاہیت کا امتزاج نظر آنے لگا۔ دینی اور نسلی و تمدنی فخرو مباہات یہاں سمٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میراث ایران کے مولف آرجی آربری کے بقول مذاہب قدیم کا تتبع کرتے ہوئے فرد واحد کو صاحب اختیار و اقتدار قرار دے دیا گیا' یعنی صاحب الشریعہ یعنی بشر میں صفات خداوندی کا پرتو دیکھا۔ ان کے ہاں امام کی ذات رومن کیتھولک عیسائیوں کے پوپ کی بجائے نسطوریوں کے مسیح کے ہم پلہ نظر آتی ہے۔ آپ نے فلسفہ اسلام کے مولف ایم ہارٹن سے استناد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پوپ کے مقابلہ میں امام کو تھما معصوم قرار دیا جاتا ہے اور عقائد کے اعتبار سے اس کا صاحب الشرع ہونا اور لغزش سے پاک ہونا مسلم ہے۔ امام کو معصوم سمجھا جاتا ہے اور مامور من اللہ تصور کیا جاتا ہے۔

عیسوی عقائد سے استنباط

جس طرح عیسائیوں کے ہاں مسلم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قربانی نے دنیا بھر کے گناہگاروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے' اسی طرح واقعہ کربلا سے قربانی اور انسانوں کے گناہوں کے کفارے کا تصور ملتا ہے۔ نور اللہ شوستری (متوفی ۱۶۱۰ء) کی کتاب مجالس المومنین میں سے پہلی مجلس کے الفاظ اگر احتیاط سے ملاحظہ ہوں تو یہ دنیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر قرار دی گئی ہے۔

اسی طرح جب کعبہ میں فتح مکہ کے موقع پر بت شکنی کے وقت رسول پاک ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا' کیونکہ شوستری کے بقول وہ جملہ عیوب سے پاک تھے' وہ بقول آربری مسلک عیسویت میں اس واقعے کی یاد دلاتا ہے جب حضرت مریم علیہا السلام نے بحکم الٰہی بدون تصرف غیر حاملہ ہو کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی گود میں لے لیا۔

اگرچہ اس قسم کے فلسفیانہ دلائل و براہین پر تمام شیعہ حضرات کا یکساں اتفاق نہیں ہے مگر مختلف آراء اور عقائد عہد صفویہ کی اگر تدوین کی جائے تو ان پر آربری کے بقول یوحنا کی انجیل کے آخری الفاظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ان تمام افکار و عقائد کے باوجود امام غائب کے تصور کے زیر سایہ صفوی بادشاہوں کا اقتدار ایک مسلمہ امر رہا اور ہرچند انہوں نے ائمہ کی شخصیات کے سامنے اپنا امیج عاجزانہ انداز میں پیش کیا مگر اقتدار شخصی (Autocracy) اور آمرانہ طریق حکومت (Dictatorship) اپنے عروج پر رہی۔ چونکہ مذہبی علماء زیادہ تر باہر سے منگوائے گئے تھے اور مراعات شاہانہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے اس لئے بادشاہت کے لئے خطرہ نہ بن سکے۔ انہی کی وفاداری نے شاہ کو امام کے مقام پر لا کھڑا کیا اور امام وقت کی غیابت (غیر حاضری) میں شاہ کو وہ اختیارات تفویض کر دیئے گئے جو امامت کا خاصہ تھے۔

واقعہ کربلا اور مرثیہ گوئی

ایران قدیم میں حماسہ گوئی (رزمیہ شاعری) کی رسم بہت اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اگر ابو القاسم فردوسی طوسی (متوفی ۱۰۲۰ء) کے شاہنامہ کا مطالعہ کیا جائے یا ساسانی عہد کے خدائی نامہ (جس کا ترجمہ ابن المقفع متوفی ۷۵۷ھ کی بدولت فارسی میں ہوا) کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اسالیب سخن واضح طور پر ابھرتے ہیں۔ ایران کی رزمیہ شاعری دراصل ڈرامہ نہیں بلکہ آرزومندی اور حصول عروج کی خواہش پر مشتمل ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ تو ایرانی مشاہیر مثلاً سہراب اور ژال کے مرثیوں یا سلطنت ہخامنشی اور ساسانی کے خاتمے پر لکھے گئے مرثیوں پر مشتمل ہے' جہاں ایران کی عظمت کے زوال اور اغیار کے عروج مثلاً سکندر اعظم مقدونی اور حضرت عمر فاروقؓ کے ایرانی بادشاہت پر حملوں کا رونا رویا گیا ہے اور آرزو کی گئی ہے کہ پھر کسی نہ کسی طرح یہ عظمت واپس آسکے۔ اسی

طرح افضل الدین بدیل خاقانی (جو ایک درویش منش سنی مسلمان تھا) نے حج کے سفر کے موقع پر قدیم ایرانی دارالحکومت مدائن کے کھنڈرات پر کھڑا ہو کر شاہان ساسانی کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ بھی ایک قسم کا عظمت رفتہ پر افسوس کا خوبصورت اشعار میں اظہار ہے۔ اسی طرح شیخ سعدیؒ نے انقراض بغداد اور عباسی خلافت کے خوفناک خاتمہ پر افسوس کا اظہار کیا۔ نظامی گنجوی نے بھی یہ رسم زندہ رکھی ہے۔ اور ھخامنشی دور کے خاتمہ اور سکندر کے ہاتھوں داریوش کی موت کے موقع پر اس کا یہ شعر اپنی نظیر نہیں رکھتا ؎

نسب نامہء دولتِ کے قباد
برگ بر برگ ہر سو برد باد

(کیقباد کی حکومت کے شجرۂ نسب کی کتاب کے ورق ایک ایک کر کے ہوا اڑا کر لے گئی۔)

صفوی دور میں یہی حماسہ گوئی ہمیں واقعہ کربلا اور دیگر ائمہ کی شہادت اور مظلومیت کے ادوار کا جذباتی نقشہ کھینچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس حماسہ گوئی کو یہاں پر مرثیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہرچند کہ سانحہ کربلا تین یوم پر مشتمل تھا مگر اس کی بابت جو اوراق شعر و نثر سے بھرے گئے ہیں وہ صدیوں پر محیط دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں واقعہ نگاری، خیال آفرینی اور اثر انگیزی اپنے پورے عروج پر ہے۔ یہی مرثیے عاشورہ اور دیگر مجالس کے موقع پر پڑھے جاتے رہے ہیں اور انہیں کے زیر اثر ماتم کا سماں بندھتا ہے۔ اس میں ڈرامے کا عنصر نہیں ہے بلکہ شہادت کے واقعات کو گہرائی اور باریکیوں سے بیان کرتے ہوئے خاندان نبوتؐ پر نازل ہونے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے امام وقت کی حکومت کے قیام اور احیاء اسلام کی آرزو کا رنگ جھلکتا ہے۔ آخری ادوار میں یہی مرثیے حماسہ گوئی کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ان میں پوشیدہ آرزوؤں کا نکتہ کمال ہمیں ایک مذہبی حکومت کے قیام کی خواہش کی صورت میں نظر آتا ہے۔

تعزیہ اور علامات

اسی دور میں تعزیہ کا فن عروج پر پہنچا اور ائمہ کے روضوں کے ماڈل بنا بنا کر نمائش کے لئے مذہبی عمارات سے عاشورہ ار دیگر مواقع پر باہر لائے جانے لگے۔ اسی طرح

واقعاتِ کربلا کی علامات مثلاً گھوڑا (ذوالجناح)، علم، پنجہ، تلوار اور دیگر علامات بطور نمائش ماتم کے مواقع پر باہر لائی جانے لگیں تا کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو جلا ملے اور حالات و واقعات کی تصویر اُن کے سامنے چلتی پھرتی نظر آئے، ان کا مقصد یہی تھا کہ اہم تاریخی مذہبی واقعات کا سماں بندھے اور جذبات پر ان کا گہرا اثر ہو۔ صفوی دور سے پہلے ہماری نظر سے یہ چیزیں نہیں گزریں۔ یہیں سے یہ نشانات صفوی حکومت کی جنگی فتوحات اور عسکری مہمات کے لئے اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ یہ نشانات لوک ورثہ کی صورت میں قائم رہے اور ان کی تعمیر و تزئین کو خاص اہمیت دی جانے لگی۔ اس طرح باطنی اور قلبی معاملات کی جگہ ظاہری علامات نے لے لی۔

فلسفہ اور علم الکلام

اسلام سے قبل یہودیت کی تاریخ میں فقہ یعنی روز مرہ امور کے بارے میں مختلف مباحث ملتے ہیں۔ عیسائیت میں علم الکلام پر زور دیا گیا ہے۔ اسلام میں اہل سنت و الجماعت کے ہاں فقہ پر زیادہ زور رہا ہے اور اکثر مذہبی تحریریں روز مرہ اور قانونی امور کی بابت ہیں۔ چونکہ اکثر مسلمان حکمرانوں کا تعلق سنی مسالک سے رہا ہے اس لئے ان کے علماء فقہ اور شرعی قوانین کی تدوین میں منہمک نظر آتے ہیں۔ تاکہ امور سلطنت اور عوام کے روز مرہ معاملات و مسائل کا مذہبی حل پیش کیا جا سکے۔ شیعہ احباب کے ہاں چونکہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا اہم تھا اس لئے وہ علم الکلام کی دقیق موشگافیوں میں پڑے رہے۔ انہوں نے فلسفیانہ تحریکوں میں سے معتزلہ، اشعریہ، جبریہ اور قدریہ کے بہت سے افکار اپنا لئے تھے۔ اسی طرح ادیان ماضی کے تصورات بھی اسلام کی حقانیت کی شرح میں پیش کرتے رہے ہیں۔ صوفیاء کرام نے قلبی واردات اور روحانی معاملات کی وضاحت اس دلچسپ پیرائے میں پیش کی ہے کہ عوام اور خواص یکساں لطف اندوز ہو سکیں۔

سُنیوں کے ہاں غزالیؒ اور رازیؒ ایسے لوگ ملتے ہیں جو فلسفیانہ مسائل میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غزالی نے تو آخری زندگی میں "تہافتہ الفلاسفہ" لکھ کر فلسفیوں پر تنقید کی ہے اور دیگر صوفیاء اور سنی شعراء نے ایقان اور وجدان پر زور دیا ہے۔ رازی کے استدلال پر رومی کا یہ کہنا ہے ؎

گر بہ استدلال کارِ دین بدی فخرِ رازی راز دارِ دین بدی
پای استدلالیان چوبین بود پای چوبین سخت بی تمکین بود

(اگر دلائل دینے سے دین کی وضاحت کی جا سکتی ہو تو فخرالدین رازیؒ دین کے سب
سے بڑے راز دان ہوتے۔ دلائل اور منطق کا سہارا لینے والے لوگوں کے پاؤں
لکڑی کے ہوتے ہیں جو بہت بودے اور بیکار ہوتے ہیں۔)

اسی طرح ابو علی ابن سینا نے فلسفہ کا سہارا لیا ہے مگر حضرت علامہ اقبال نے رومی
کے وجدان اور ایقان کو اس پر ترجیح دی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت و تا ساحل رسید او بہ دریا مثلِ خس منزل گرفت
حق اگر سوزی ندارد حکمت است شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

(بو علی سینا اونٹنی کے پاؤں کے گرد و غبار میں کھو گیا ہے جبکہ رومی نے محمل کا پردہ اٹھا
کر محبوب کا چہرہ دیکھ لیا ہے۔ رومیؒ نے آگے بڑھ کر ساحل تک رسائی حاصل کر لی
ہے مگر ابن سینا سمندر کی موجوں میں ہی خس و خاشاک کی طرح الجھ کے رہ گیا ہے۔
حق میں اگر سوز (ایمان کا نور) نہ ہو تو اسے دانائی کہتے ہیں لیکن اگر دل کی گہرائیوں
سے اس میں سوز شامل ہو جائے تو وہ شعر بن جاتا ہے۔)

اس کے برعکس ہمارے شیعہ احباب نے فلسفہ اور علم الکلام میں زبردست رسائی
حاصل کی ہے۔ صفوی دور میں ملا صدرا اپنی مثال آپ ہیں۔ شیعہ فلسفی ہمیں اُس وقت
سنی مفکرین کی مدد کو آتے ہوئے نظر آتے ہیں جب وہ فلسفے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور غیر
مسلم اور گمراہ مفکرین کے اعتراضات کا جواب نہیں دے پاتے۔ اگر شیعہ مفکرین کے
افکار کا مطالعہ کریں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں، ساتھ
ساتھ شک کا اظہار بھی کر رہے ہوں اور مختلف مثبت اور منفی پہلوؤں کی بابت پورے
اعتماد اور دلجمعی سے پر اثر دلائل بھی دے رہے ہوں۔ پھر ہولے ہولے اپنی خوشگوار
حیرت کا اظہار کرتے کرتے ایک دلپذیر انداز میں، بے پناہ طنز کے ساتھ اور نزاکت خیال
کا اسلوب اپناتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہیں۔ اس طرح کے استدلال کے نتیجے میں
اسلامی عقائد میں بنی نوع انسان کے نجات پانے کا عملی اور فکری اعتبار سے متوازن تصور

پایا جانے لگا اور بندہ و رب کے باہمی ربط کا پس منظر بھی معقول نظر آنے لگا۔ اس سے پہلے فقط اسی بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ خدا وحدت محض ہے اور قرآن خدا کا کلام ہے۔ قرآن کے کلام الٰہی یا مخلوق الٰہی کے جھگڑے نے ایک عرصہ تک متکلمین کو لاحاصل بحث میں الجھائے رکھا تھا۔ اب توحید کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو مرکز بنا کر قربانی، شفاعت اور معصومیت کے اصول بیان کئے جانے لگے تھے۔ اگر شیعہ مصنفین کے علم الکلام کا مطالعہ کیا جائے مثلاً نور اللہ شوستری کی مجالس المومنین (جو عوام الناس کے لئے تحریر کی گئی ہے) یا ملا صدرا کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس مسلک میں تعصب کا شائبہ تک موجود نہیں ہے جبکہ عملی طور پر اس کے بالکل برعکس ثابت ہو تا رہا ہے۔

شیعیت کے بنیادی افکار سے ہوس اقتدار کے پجاریوں نے اکثر ناجائز فائدہ بھی اٹھایا ہے اور کبھی کبھی اپنے خوفناک مقاصد کے حصول کے لئے اِن تصورات کی آڑلی گئی ہے حالانکہ ابتدائی افکار انتہائی سادہ رہے ہیں۔ شیعیت کے سیاسی روپ میں دینی دلالتیں بھی شامل رہی ہیں۔

تعصب

اسی دور میں سنیوں کے خلاف تعصب کو ہوا دی گئی اور اکابرین کے لئے اہانت آمیز رویہ اختیار کیا گیا، حالانکہ اس سے پہلے سنی اور شیعہ اکابرین میں ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی رہی ہے۔ نتیجتاً یہ لوگ مسلمانوں کی اکثریت سے کٹ کے رہ گئے تھے اور ان کے لئے حج پر جانا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ جلال الدین اکبر کے ابتدائی زمانہ میں جب اس کے مذہبی مشیر مخدوم الملک لاہوری سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی دولت کے باوجود حج پر کیوں نہیں چلے جاتے تو ان کا جواب تھا (حالانکہ یہ عذر لنگ تھا) کہ حجاز کے سفر کے دو راستے ہیں، ایک سمندر کا ہے جس پر فرنگی (پرتگیزی) قابض ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر یہ سفر ناممکن ہے اور دوسرا خشکی کا ہے جو ایران سے گزرتا ہے جہاں پر روافض قابض ہیں۔ میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ ایسے مقدس سفر کے لئے ان لوگوں سے اجازت نامہ لے کر وہاں سے گزروں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر کے سنی مسلمانوں میں اُن دنوں ایرانی صفویوں

کے عقائد اور اعمال سے بیزاری کا اظہار ہوتا تھا (ملاحظہ کیجئے شیخ اکرام کی "رود کوثر")۔ اسی وجہ سے نادر شاہ افشار نے حکومت سنبھالتے وقت یہ خطرہ بھانپ لیا تھا کہ اپنے سخت رویہ کے باعث ایران اردگرد سے کٹ چکا ہے۔ ماوراء النہر کے ازبک اور عثمانی ترک ایران پر حملوں کے موقع پر ان کے عقائد کے باعث اکثر برافروختہ ہو کر اپنی افواج کو ایران کے خلاف لڑائی پر اکساتے رہے ہیں۔

یہ امر باعث حیرت ہے کہ اُن دنوں ہندوستان کی مغل سلطنت میں مذہبی رواداری اپنے پورے عروج پر تھی اور اکبر کے علاوہ تمام دیگر بادشاہ سنی العقیدہ تھے، لیکن کبھی بھی وہاں پر سرکاری سطح پر کسی کو نفرت پھیلانے کا یا اس پر عمل کرنے کا موقع پیش نہیں آیا۔ یہی وجہ تھی کہ روشن فکر ایرانیوں کے لئے برصغیر پناہ گاہ بن چکی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کو اپنے ایک شیعہ اعلیٰ عہدیدار کے خلاف جب کچھ لوگوں کے دلوں میں تعصب کی اطلاع ملی تو اس نے اس امر پر سختی سے نوٹس لیا تھا اور مذہبی تعصب کے خلاف وارننگ دی تھی۔

صفوی شیعیت

ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم نے اسی وجہ سے صفوی شیعیت کو علوی شیعیت سے الگ بیان کیا ہے، کیونکہ صفوی شیعیت مخصوص غیر ایرانی ترک حکمرانوں (جو خود کو زبردستی سید کہلوانے پر مصر تھے) کی سیاسی مصلحت کے لئے شیعہ عقائد کے استحصال کا نام تھا، جس میں ظاہریت، علامات اور تعصب کو خاص مقام دیا جاتا تھا۔ جہاں شاہ کو تعظیمی سجدہ روا تھا اور جہاں غیر ایرانی علماء کے ذریعہ عوام الناس کے عقائد تبدیل کئے جاتے تھے، جہاں ہر طرح کے ظلم و ستم کو روا رکھ کر مخصوص نظریات کی اشاعت کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس شیعان علیؓ کسی بھی طرح سنی مسلمانوں سے الگ تھلگ نہیں تھے۔ ان کے عقائد و اعمال کا اشتراک انہیں سنی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک عظیم مسلمان قوم کی صورت عطا کرتا تھا اور وہ باہم شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ ہر دو فرقوں کے اکابرین اور علماء و فضلاء دونوں فرقوں کے عوام میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ صفوی شیعیت کے زیر اثر مسلمانوں سے عمل کا جوہر چھن گیا تھا اور فرد کی آزادی ختم ہو گئی تھی۔ شاہ کی ذات اور

ایک متحدہ ایرانی قومیت کا تصور اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

صفوی شیعہ عقائد اور شاہی استبدادی سیاست کا امتزاج چند صدیوں تک ایران پر اثر انداز رہا۔ جنوبی ہند کی وہ ریاستیں جو ابتدائی مغلیہ عہد میں صفوی بادشاہ کی باجگزار تھیں مثلاً گولکنڈہ' احمد نگر اور بیجاپور وہاں بھی صفوی استبدادی اثرات غالب رہے۔ یہاں پر شاہ ایران کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا تھا تاوقتیکہ اورنگ زیب عالمگیر کی افواج نے ان کی حیثیت ختم کر دی تھی۔ اسی طرح نصیرالدین ہمایوں کی مدد کے لئے آنے والی ایرانی افواج کی اولاد اور بعد میں آنے والے ایرانی زعماء و افراد نے صفوی عقائد پر عملدرآمد جاری رکھا۔ برصغیر میں ہرچند کہ اثنا عشری شیعہ عقائد دیگر اسلامی عقائد کے مقابلہ میں بہت بعد میں آئے لیکن ان کے اثرات شدت سے محسوس کئے جانے لگے۔ آخری مغل دور میں یہ اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ شیعہ اور سنی مسلمانوں کو قریب لانے کے لئے شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے عظیم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بقول (ملاحظہ کیجئے "برصغیر کی ملت اسلامیہ") آپؒ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ (جنہیں سب سے پہلے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کرنے کا شرف حاصل ہوا) پر تو باقاعدہ تشیع کا الزام لگایا گیا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان کی کوششوں کے نتیجہ میں شیعہ سنی جذبات کی تلخی کی شدت میں واضح کمی آئی اور شیعہ احباب بھی دیگر مسلمانوں میں گھل مل گئے۔ لیکن بعد کے ادوار میں یہ تلخیاں کبھی کبھی ابھر کر سامنے آتی رہیں۔ چونکہ مسلمانوں کو انگریزوں اور سکھوں کے ادوار میں ہندو اکثریت اور سکھ قوم کے مقابلہ میں بقا کا مسئلہ بھی درپیش تھا اس لئے باہمی اختلافات قیام پاکستان تک دبے رہے اور اکثر و بیشتر ہمارے بزرگوںؒ نے افہام و تفہیم اور رواداری سے کام لیا۔ کبھی بھی سنی اکابرین نے شیعہ مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا۔ بحیثیت مجموعی شیعہ احباب کو مسلمانوں کا حصہ سمجھا جاتا رہا۔

ایران میں صفوی اور قاچاری دور کے انقراض کے بعد آہستہ آہستہ صفوی شیعیت کے اثرات ماند پڑتے چلے گئے (جس کا اجمالی جائزہ اگلے صفحات میں پیش کیا جائے گا) اور مختلف نوع کی فکری تحریکوں کے نتیجے میں اسلام کی اصل روح بیدار ہونے لگی۔ جمال

[باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ فرمایئے!]

رپورتاژ

اسلامی امارت افغانستان کا مطالعاتی و مشاہداتی سفر

—— نعیم اختر عدنان ——

افغانستان اسلامی تاریخ کے ہر دور میں بہادروں اور شہواروں کا مرکز، شیروں کا مخزن، فاتحین اور سورماؤں کا مولد و منشا اور اسلام کا مضبوط قلعہ رہا ہے۔ چنانچہ امیر البیان امیر شکیب ارسلان غیور افغانیوں کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "میری جان کی قسم، اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے، کہیں بھی اس میں زندگی کی رمق باقی نہ رہے، پھر بھی کوہ ہمالیہ اور ہندوکش کے درمیان بسنے والوں میں اسلام زندہ رہے گا اور ان کا عزم جوان رہے گا"۔ علامہ اقبال نے بھی افغانی مسلمانوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے ؎ افغان باقی کہسار باقی، الحکم للہ الملک للہ۔ برصغیر پر طویل عرصہ تک حکومت کرنے والے مشاہیر افغانستان کے راستہ ہی سے صنم خانۂ ہند میں داخل ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان کی سرزمین کو غزنوی، خلجی، غوری، تیموری، ابدالی، تغلق، لودھی، سوری اور مغل حکمرانوں کی جولانگاہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جس طرح انگریزی عہد حکومت میں انگلستان اور اس کے دارالحکومت لندن کو "ولایت" کہا جاتا تھا، بالکل اسی طرح اہل ہند کے لئے سرزمین افغانستان کو "ولایت" کی حیثیت حاصل تھی۔ صحاح ستہ کی ایک روایت کے مطابق حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں حضرت تمیم انصاریؓ اور حضرت جبیرؓ کی قیادت میں ۲۷ حفاظ قرآن و مبلغین اسلام پر مشتمل نفوس قدسیہ نے افغانستان کی سرزمین کو اپنے قدموں سے شرف و افتخار بخشا۔ افغانستان کے دارالحکومت کابل کے مشہور قدیم ترین قبرستان "شہدائے صالحین" میں یہ پاک نفوس محو استراحت ہیں ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

گزشتہ دنوں اسلامی امارت افغانستان میں تنظیم اسلامی پاکستان کے وفد کے ہمراہ اس عظیم اور تاریخی قبرستان کو بچشم سر دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مسنون طریقہ سے اپنے بے مثل اسلاف کی روحوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں خاتم النبیین والمرسلین محمد مصطفیٰ اور احمد مجتبیٰ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا

کے لئے نذیر و بشیر اور ہادی و رہبر بنا کر مبعوث فرمایا ہے اور اب آپؐ کی امت کو جس کا قرآنی نام امت مسلمہ ہے، تاقیامِ قیامت قافلہ انسانیت کی قیادت و امامت کا تاج پہنا کر نبوت و رسالت کے فریضہ کی ادائیگی اور تکمیل کی ذمہ داری ادا کرنا ہے۔ قرآن مجید نے، جسے بندوں کے نام خدا کے آخری پیغام کی حیثیت حاصل ہے، وضاحت سے دنیا کی خلافت و امامت کا اصل حق دار اہل ایمان ہی کو قرار دیا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے : "اللہ نے وعدہ کرلیا ہے تم میں سے ان اہل ایمان سے جو ایمان لائیں اور اعمال صالحہ سے آراستہ ہوں کہ وہ انہیں لازماً زمین کی خلافت عطا فرمائے گا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کو عطا فرمائی گئی تھی..."۔ (النور : ۵۵)

نبی اکرم ﷺ نے انسانی سطح پر کی جانے والی بے مثل جدوجہد کے ذریعے اللہ کا دین جزیرہ نمائے عرب پر غالب و نافذ فرمادیا۔ چنانچہ آپ کی پیروی میں برپا ہونے والے خلافت راشدہ کے زریں عہد کو "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کی نبویؐ اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ کے دورِ سعادت سے اُس وقت کی انسانیت نے جی بھر کر فیض اٹھایا جبکہ آج کے دور کی انسانیت بھی "یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰؐ است" کے مصداق خلافت کے اِسی عادلانہ نظام عدل اجتماعی کی متلاشی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے فرمودات عالیہ میں دنیا کے خاتمے سے پہلے پوری دنیا پر اسلام کے عالمی غلبہ کی خوشخبری بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ امر بھی معزز قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوگا کہ اسلام کے عالمی غلبہ کی ابتداء سے متعلق اشارات بھی اسی خطہ ارضی سے متعلق ہیں جس پر افغانستان، پاکستان کے شمالی علاقہ جات (جن میں مالاکنڈ ڈویژن خاص طور پر قابل ذکر ہیں) وسط ایشیائی ریاستیں اور ایران کا کچھ علاقہ مشتمل ہے۔ عہد نبویؐ میں اور اس سے قبل اس پورے خطہ کو "خراسان" کہا جاتا تھا۔ قدیم زمانے کے عرب باشندے افغانستان کو دور دراز کا ملک سمجھتے تھے اور مسافت کی دوری اور راستوں کی دشوار گزاری کے لئے اِسے بطور مثال پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

قالوا خراسان اقصی ما یرادبنا
ثم القفول فقد جئنا خراسانا

"لوگوں نے کہا خراسان ہماری آخری منزل ہے، پھر اس کے بعد واپسی ہوگی۔ تو یہ لو ہم خراسان پہنچ گئے"۔

احادیث مبارکہ کی رُو سے اسی خطے کی اسلامی افواج حضرت مہدی کے لشکروں سے مل کر یہ نہ صرف بیت المقدس کو یہودی قبضہ سے آزاد کرائیں گی بلکہ پوری دنیا پر اسلام کو غالب و نافذ کرنے کے لئے جہاد و قتال کے معرکے بھی برپا کریں گی۔ علامہ اقبال نے اسی خطۂ ارضی کے بارے میں فرمان رسالتؐ کو بیان

کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے ؎

میر عرب ؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے' میرا وطن وہی ہے

برعظیم پاک و ہند میں گزشتہ چار صدیوں سے احیائے دین کی تجدیدی مساعی کے تسلسل میں اور افغان جہاد میں لاکھوں اہل ایمان کی قربانیوں کے ذریعے ماضی کا افغانستان جو کمیونسٹ روس کو تسلیم کرنے والا دنیا کا اولین ملک تھا' اب طالبان تحریک کے نتیجے میں اسلامی امارت افغانستان کے قالب میں ڈھل چکا ہے۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب کی کامیابی کے بعد سے لے کر افغانستان پر روس کی فوج کشی تک یعنی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۷۹ء تک کے عرصہ پر مشتمل روس افغان تعلقات کا ساٹھ سالہ دور ہمیں بڑے قریبی' گہرے اور مضبوط تعلقات کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں افغانستان کے حکمران امیر امان اللہ نے امیر کی بجائے "بادشاہ" کا لقب اختیار کر لیا اور اس نے ملک میں دور رس نتائج کی حامل تبدیلیوں کی داغ بیل ڈال دی۔ افغانستان کے بادشاہ نے ترکی کے کمال اتاترک کی پیروی میں افغان خواتین کے لئے پردہ نہ کرنے کا شاہی فرمان جاری کرتے ہوئے مخلوط تعلیم رائج کر دی۔ چنانچہ "نہ گورِ سکندر نہ ہے قبر دارا' مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے" کے مصداق علانیہ کفر کا حکم دینے والے حکمران ٹولے کو یکے بعد دیگرے تخت حکومت سے معزول کر دیا گیا۔ اب افغانستان کی باگ ڈور جنرل نادر خان کے ہاتھ میں تھی جس نے ملک کے حالات کو کسی حد تک درست کیا۔ اسی افغان حکمران جنرل نادر خان ہی کی دعوت پر علامہ اقبال' سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی ؒ نے ۱۹۳۳ء میں افغانستان کا دورہ کیا تھا' اس وفد نے کابل ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ جو اب طویل خانہ جنگی کے نتیجے میں بقیہ کابل کی طرح اپنی بربادی و ویرانی پر زبان حال سے نوحہ کناں ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے "وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ"۔ یہاں کے حکمرانوں اور قائدین کے ناعاقبت اندیش رویوں اور فیصلوں نے بہادر اور غیور افغان قوم کو تباہی و بربادی کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ مگر جیسا کہ سنت الٰہی ہے کہ وہ مردہ میں سے زندہ کو اور زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے' چنانچہ مفلوک الحال اور تباہی سے دوچار افغان قوم میں اللہ تعالیٰ نے از سر نو "يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" کی سی شان کے ساتھ "حیات نو" پیدا کر دی اور بقول اقبال "افغان باقی کہسار باقی" کے مصداق یہ قوم ان شاء اللہ قیامت تک زندہ و تابندہ رہے گی۔ اس لئے کہ یہ قوم علامہ کے اس شعر کا مصداق کامل ہے کہ

دگرگوں جہاں ان کے زور عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

ماضی کا افغانستان اب طالبان کے زیر سایہ اسلامی امارت افغانستان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ چنانچہ

شاہراہوں پر طالبان حکومت کی نگران چوکیاں جابجا نظر آتی ہیں جن پر لہراتا ہوا سفید پرچم دنیا کو افغانستان کی اسلامی حکومت کی طرف سے امن و امان کا پیغام رحیل دیتے ہوئے زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ ؎
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری۔ دیوہیکل روسی ٹینکوں کی روز شب کی مسلسل یلغار اور ہزاروں پونڈ وزنی بموں کے بے محابہ استعمال کے بعد سڑک نام کی کسی شے کا وجود کیسے برقرار رہ سکتا ہے؟ مگر انسان چونکہ خلیفۃ اللہ ہے' نائب خدا ہے اور ویرانوں کو آباد کرنے کی صلاحیت اور قوت سے آراستہ ہے' وہ تباہ و برباد دنیا اللہ کے اذن سے حیات نو بخش دیتا ہے۔ چنانچہ تعمیر نو کے جذبہ اور ولولۂ تازہ سے سرشار افغان مزدور "خادم خلق" بن کر شاہراہوں پر محنت و مشقت کرتے نظر آئے۔ اس محنت و مزدوری کا بدلہ کسی حد تک عام مسافر بھی ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ طورخم سے جلال آباد تک سڑک کے دونوں اطراف سرسبز و شاداب کھیت لہلہا رہے تھے جن میں گندم کے علاوہ پوست کی رنگا رنگ اور خوبصورت فصل قدرتی حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔ زیتون کے باغات کا تذکرہ ہم نے قرآن مقدس میں تو بارہا پڑھ رکھا تھا مگر پہلی دفعہ ان باغات کو "جنت ارضی افغانستان" میں دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سبز و سفید اور سیاہ لباس میں ڈھکے پہاڑوں کے دامن میں بھیڑوں اور بکریوں کے چرتے ریوڑ اور ناکارہ روسی ٹینک اور بکتربند گاڑیاں افغانیوں کی جرأت و بہادری کے گواہ اور روسیوں کی حماقت پر زبان حال سے نوحہ کناں تھے۔

سڑک کے دونوں جانب دنیا کی سپر طاقت روس سے نبرد آزما ہونے والے عظیم افغان شہداء کی قبریں اپنے اندر محو استراحت "زندہ اہل ایمان" کے لافانی ہونے کا اعلان کرتے ہوئے اہل افغانستان کو یہ پیغام دے رہی تھیں کہ "ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں' ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے"۔ جلال آباد امارت اسلامی افغانستان کا پہلا شہر ہے جہاں افغانستان کے مشہور فرمانروا امیر حبیب اللہ اپنے نائب السلطنت سردار عنایت اللہ خان' اپنے بیٹے غازی امان اللہ اور اپنی ہمسر (بیوی) ملکہ ثریا کے ساتھ مسجد سراج الامارت کے احاطے میں مدفون ہیں۔ سرحد کے سرخپوش رہنما خان عبدالغفار خان نے بھی اس شہر کو اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر منتخب کیا تھا۔ مسجد سراج الامارت میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد واپسی پر دودھ والی چائے کی "عیاشی" کی۔ چائے کے واجبات افغان کرنسی میں ادا کئے تو بات ۳۰ ہزار افغانیوں تک جا پہنچی۔ "افغانی" کے مقابلہ میں پاکستانی روپیہ اور پاکستانیوں کے مقابلے میں افغانیوں کا ایمان کافی مضبوط ہیں۔ جلال آباد کا شہر صوبہ ننگرہار کی ولایت میں شامل ہے' اس مناسبت سے تنظیم اسلامی کے وفد کا قیام ولایت ننگرہار کے سرکاری مہمان خانے میں ملماں (مہمان) کی حیثیت سے ہوا۔ رات کا کھانا افغانوں کی روایتی مہمان نوازی کا مظہر تھا۔

۲۴/مارچ کی صبح مولانا قاری سعید احمد جو جلال آباد یونیورسٹی کے استاد بھی ہیں' ہمارے میزبان تھے۔ ناشتے سے فراغت کے چند لمحوں بعد یونیورسٹی اساتذہ کے تین رکنی وفد سے (جسے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا) تفصیلی تعارف اور تبادلہ خیال ہوا۔ اسی نشست کا حاصل یہ تھا کہ ہمیں اسلامی آئیڈیالوجی کے ساتھ ساتھ عصری علوم اور خصوصاً جدید ٹیکنالوجی کو بھی اپنانا ہو گا' اس کے بغیر معاشرے کی صحت مند بنیادوں پر تعمیر و تشکیل ناممکن ہے۔ افغانستان میں غیر سرکاری انجمنوں (NGO's) کے کام اور کردار کے متعلق بھی تبادلہ خیال ہوا۔ یونیورسٹی اساتذہ کی طرف سے تنظیم اسلامی کے وفد سے ایک چبھتا ہوا سوال بھی کیا گیا کہ "تنظیم اسلامی کا وفد اتنی تاخیر سے افغانستان کیوں پہنچا ہے؟" اس سوال کے جواب میں وفد کے امیر جناب میجر (ر) فتح محمد نے کہا کہ روسی افواج کے جانے کے بعد یہاں مختلف الخیال جماعتوں کی حکومت تھی' تنظیم اسلامی ان جہادی گروپوں میں سے کسی کے ساتھ بھی اپنے آپ کو چسپاں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ جونہی طالبان کے ذریعے افغانستان میں ایک قیادت کے تحت اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آ گیا تو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے تنظیم کے وفد کو طالبان حکومت کے ساتھ اپنی قلبی وابستگی اور نیک خواہشات کے اظہار اور افغانستان کی اسلامی حکومت کے اقدامات کے مطالعے کے لئے یہاں بھیج دیا۔ قاری صاحب کے ہاں سے فراغت حاصل ہونے کے بعد جلال آباد سے کابل کے لئے روانگی ہوئی۔ جلال آباد شہر میں قائم گاڑیوں کے شو رومز میں کھڑی چمکتی دمکتی گاڑیوں کے سوا کوئی عمارت' کوئی پارک اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جسے ۲۰ سالہ جنگ نے تباہ نہ کر دیا ہو۔ "سروبی" میں' جو ایک مشہور قصبہ ہے' نماز ظہر اور کھانے کے بعد ہمارا قافلہ کابل کے لئے پھر سے عازم سفر ہو گیا۔ "سروبی" کے قصبے کو اس وقت شہرت حاصل ہوئی تھی جب طالبان کی یلغار سے بے بس اور خوف زدہ ہو کر گلبدین حکمت یار نے اس قصبے کو اپنا دفاعی مورچہ بنا لیا تھا مگر انہوں نے کابل ہی کی طرح سروبی میں بھی کسی قسم کی مزاحمت سے گریز ہی کیا۔

ہمارا قافلہ دو گاڑیوں پر مشتمل تھا۔ ایک گاڑی جناب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی تھی اور دوسری گاڑی کرایہ پر لی گئی تھی۔ کرایہ والی گاڑی کے ڈرائیور نے اپنا ٹیپ ریکارڈ "آن" کیا تو ایک گیت کانوں کو مسحور اور دلوں کو مسرور کرنے لگا۔ طالبان کی حمایت میں ترتیب دیئے گئے اس گیت کے بول کچھ یوں تھے : "اللہ کی نصرت ہمارے ساتھ ہے' اے مسعود! اے دوستم! تم کیوں طالبان سے لڑتے ہو۔ اے ظالمو! طالبان بہت اچھے ہیں' ان سے جنگ مت کرو"۔ تنظیم اسلامی کا وفد نماز مغرب سے ذرا پہلے افغانستان کے دارالحکومت کابل پہنچا۔ اس شہر کے در و دیوار "بخت نصر" کی یاد دلا رہے تھے جس نے آج سے ڈھائی ہزار سال قبل یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ کابل کی انڈسٹریل اسٹیٹ کھنڈرات کا

روپ دھار چکی ہے۔ جن کارخانوں میں کبھی عمدہ سے عمدہ اور نوع بہ نوع اشیائے صرف تیار ہوا کرتی تھیں وہاں آج سکوت اور ویرانی نے اپنا ڈیرہ جمایا ہوا ہے۔ افغانستان کے در و بام کیوں تباہ ہوئے؟ اہل افغانستان کو کس جرم کی پاداش میں سرخ سامراج نے اپنے خونیں پنجوں کی گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کی؟ جرم یقیناً یہی تھا کہ ؂ افغانیوں کی غیرتِ دین کا ہے یہ علاج، ملا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو۔ مغرب سے عشاء کے درمیان کچھ دیر "خجل خراب" ہونے اور آریانا اور رپلازا ہوٹلز کا "تماشا" دیکھنے کے بعد بالآخر انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کابل قافلہ کی جائے قیام ٹھہرا۔ ہوٹل کے جنرل منیجر مولانا حیات اللہ حیاتی نے وفد کو خوش آمدید کہتے ہوئے آناً فاناً تمام سہولیات بہم پہنچا دیں۔ نماز عشاء اور طعام کے بعد تھکے ماندے مسافر رات کی نیند کے مزے لینے کے لئے محوِ استراحت ہو گئے۔

۲۵/مارچ کی صبح کا آغاز نمازِ فجر کی باجماعت ادائیگی سے ہوا۔ مولانا عبدالحلیم افغانی (جنہیں اس سفر میں ناظم صلوٰۃ کی اضافی ذمہ داری سونپی گئی تھی) نے نماز کی امامت فرمائی۔ ناشتہ و دیگر ضروریات سے فراغت کے بعد حسب قرار داد مولانا حیات اللہ حیاتی (ہوٹل منیجر) ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ ۳۵ سالہ چاک و چوبند نوجوان عالم دین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے فارغ التحصیل ہیں، جبکہ موصوف کی عصری تعلیم ایف اے ہے۔ مولانا نے وفد کو بتایا کہ میں قبل ازیں آریانا ہوٹل میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا رہا ہوں، جبکہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے میں انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے جنرل منیجر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت دارالحکومت کابل میں مجموعی طور پر سات بڑے ہوٹل کام کر رہے ہیں جن کی آمدنی اسلامی امارت افغانستان کے بیت المال کو جاتی ہے۔ ماضی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے بارے میں انہوں نے تنظیم کے وفد کو بتایا کہ دنیا میں معروف "چلن" کے تمام طور طریقے یہاں بھی رائج تھے اور شراب و کباب "بڑے پیمانے اور عمدہ معیار" کے ساتھ سپلائی کیا جاتا تھا۔ گویا انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کابل کو بے حیائی اور فحاشی کے بین الاقوامی اڈے کی حیثیت حاصل تھی۔ طالبان سے پہلے مجاہد تنظیموں کے دور حکومت میں اگرچہ یہاں شراب بند کر دی گئی لیکن ہوٹل کے مختلف شعبوں میں حسب سابق کارکن خواتین اپنی ملازمت جاری رکھے ہوئے تھیں، جن میں سے اکثر جنسی بے راہ روی میں ملوث تھیں۔ طالبان حکومت نے ملک کے دیگر اداروں کی طرح جملہ ہوٹلز کو بھی مخلوط ماحول سے پاک کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ طالبان حکومت نے ملازم خواتین کو ایک سال تک بغیر کام کے تنخواہ دی۔ بعد ازاں عورتوں کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ماضی کی مجاہد تنظیموں کی حکومت اور طالبان حکومت کا فرق واضح کرتے ہوئے بتایا کہ ماضی میں اس ہوٹل پر بیت المال کا کثیر خرچ اٹھتا تھا جبکہ اب ہوٹل کی آمدنی بیت المال میں جمع ہوتی ہے۔

افغانستان کی اسلامی حکومت کے مختلف شعبہ جات کا مشاہدہ کرانے کے حکومتی پروگرام کے انتظار میں ہی آج کا دن گزر گیا۔ ہوٹل کے قرب و جوار کے علاقہ میں چہل قدمی کا موقعہ البتہ ضرور ملا۔ اسی روز جمعیت العلماء اسلام کے نائب امیر مولانا حافظ حسین احمد بھی اپنے کویتی اور یمنی دوستوں کے ہمراہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل تشریف لے آئے۔ استقبالیہ پر مولانا سے تعارفی ملاقات اور رسمی سلام و دعا ہوئی۔

۲۶/مارچ کی صبح نماز فجر' ناشتہ اور دیگر ضروریات سے فراغت کے بعد وفد کے ارکان حکومتی پروگرام کے انتظار میں تھے کہ راقم نے مولانا غلام اللہ حقانی کی معاونت سے حافظ حسین احمد کا کمرہ ڈھونڈ نکالا۔ تھوڑی ہی دیر راقم ناظم حلقہ آزاد کشمیر جناب خالد محمود عباسی اور ان کے ہم منصب جناب شاہد اسلام صاحب کے ہمراہ مولانا حافظ حسین احمد سے ملاقات کے لئے ان کے کمرے میں تھا۔ یہ موقع غنیمت جانتے ہوئے حافظ حسین احمد سے انٹرویو کے قالب میں مختصر گفتگو بھی کی جو نذرِ قارئین کی جا رہی ہے:

☆ حافظ صاحب! افغانستان میں تو طالبان تحریک کے ذریعے اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے مگر یہ فرمایئے کہ پاکستان کی دینی جماعتیں اس وقت کہاں کھڑی ہیں؟

○ پاکستان کی وہ دینی اور مذہبی جماعتیں جو میدان سیاست میں داخل ہیں اور موثر بھی ہیں' وہ بدقسمتی سے ملک کے لادینی نظام کے دائرۂ کار میں ہی رہتے ہوئے نظام کی تبدیلی کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایسی تمام کوششیں اور جدوجہد سعی لاحاصل ہے۔ لادینی نظام کی علمبردار اور اس کی تقویت کا باعث بننے والی جماعتوں کے ساتھ دینی جماعتوں نے وقتاً فوقتاً اتحاد بنا کر اس روش کا حاصل اور نتیجہ دیکھ لیا ہے۔ پاکستان قومی اتحاد' ایم۔ آر۔ ڈی' آئی جے آئی اور اب پاکستان عوامی اتحاد! ان اتحادوں کے ذریعے ہماری قیادت نے عوام کو ایک وقت میں اتحاد و یکجہتی کا درس دیا' بعد ازاں انہی لوگوں کے خلاف عوام کے مذہبی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی۔ یہ دورخی اور تضاد کی مظہر پالیسی ہی مذہبی جماعتوں کی ناکامی کا اصل سبب ہے۔ اتحادی سیاست کی بنیاد ہی ہنگامی اور وقتی سیاست کی مرہون منت ہوتی ہے' لہٰذا ان اتحادوں کا خاتمہ بھی ہنگامی طور پر اور اچانک ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں پائیدار اور مثبت بنیادوں کے لئے کبھی کوئی اتحاد نہیں بنا۔ جب تحریک کی قیادت کسی ایک شخص کے پاس ہو' تبھی وہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے (دورِ حاضر میں افغانستان کی طالبان تحریک اس کی نمایاں مثال ہے) جبکہ پاکستان میں مختلف تحریکوں کی ناکامی کا اصل سبب ایک قیادت کا فقدان ہے۔ ہر شخص خود کو امیر قافلہ سمجھتا ہے جبکہ اسلامی تحریک درحقیقت ایک امیر کی قیادت ہی میں کامیابی حاصل کر سکتی ہے۔

☆ طالبان کی اسلامی حکومت کے بارے میں پاکستان کی دینی جماعتوں کا نقطہ نظر کیا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

○ یہ دینی جماعتوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کی قیادت طالبان حکومت کے جرأت مندانہ اسلامی اقدامات کی تعریف بھی کرتی ہے، "لیکن مگر، اگرچہ، تاہم" کہہ کر وہ خود کو اسلام مخالف اور دین دشمن کیمپ میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ مغربی طاقتوں نے افغانستان کی اسلامی حکومت کے خلاف بے سروپا اور خلاف حقیقت پراپیگنڈے کا محاذ کھول رکھا ہے۔ پاکستان کی بعض دینی جماعتیں (جن میں جماعت اسلامی پیش پیش ہے) اور ان کے قابل فخر قائدین اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ہمارا اسلام طالبان کے اسلام کی طرح متشدد نہیں ہو گا" اب اگر اسلامی تحریک کا قائد ہی ایسا بیان دے دے تو ہمیں اغیار سے کیا گلہ شکوہ ہو سکتا ہے؟

☆ بھارت میں "بی جے پی" کی حکومت کے قیام پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

○ اس وقت عالمی سطح پر مذہبی تحریکوں کا دور دورہ ہے۔ الجزائر یا ترکی، فلپائن ہو یا افغانستان، اسرائیل ہو یا ہندوستان، برطانیہ یا امریکہ۔ ہر جگہ ایک ہی رجحان ہے۔ اس عالمی رجحان کے سامنے ہندوستان کی کانگریس جیسی مضبوط جماعت بھی رکاوٹ نہیں بن سکی تو پاکستان مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی غلبہ و احیاء دین کی تحریک کا راستہ روکنے میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہیں۔

☆ موجودہ حالات میں ملک میں اسلامی انقلاب کیسے برپا ہو گا؟

○ بڑی مقدار میں جمع شدہ گندے پانی کو بڑے سے بڑا بند بھی نہیں روک سکتا۔ انقلاب اور تبدیلی اپنا راستہ خود بناتے ہیں۔ دینی سیاسی جماعتوں کے سربراہ اس وقت خود سوچنے پر مجبور ہو چکے ہیں کہ موجودہ انتخابی سیاست کے ذریعے حصول مقصد ممکن نہیں ہے۔ عوام میں موجودہ استحصالی نظام کے خلاف جو لاوا پک رہا ہے اس سے دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کھل کر واضح ہو رہی ہے۔ افغانستان میں اگر صدر ربانی اور حکمت یار اسلامی اقدامات اٹھاتے تو طالبان کی حکومت کبھی قائم نہ ہوتی۔

☆ پاکستان کی دینی جماعتیں طالبان حکومت کی حمایت کے لئے کیا کردار ادا کر سکتی ہیں؟

○ طالبان حکومت کو پاکستان کی دینی جماعتوں کی حمایت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اِن دینی جماعتوں کو اپنی بقاء کے لئے طالبان کی حمایت کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے حالات افغانستان کے مقابلے میں کافی مختلف ہیں۔

حافظ حسین احمد کے ساتھ بیٹھے ہوئے کویت کے اسلامی بینک کے سربراہ نے راقم کو بتایا کہ

ہم نے اسلامی امارت افغانستان کے سربراہ ملا محمد عمر سے اپنی ۳۵ منٹ کی ملاقات میں زور دیا ہے کہ طالبان حکومت اسلامی ممالک میں زیادہ سے زیادہ وفود بھیجے۔ افغانستان کی اقتصادی و معاشی صورت حال کی بحالی کے لئے ہم نے انہیں کئی قابل عمل منصوبوں کی پیشکش کی ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ افغانستان کے امیرالمومنین اپنے آپ کو صرف افغانستان ہی کا امیرالمومنین نہ سمجھیں بلکہ وہ خود کو پوری اسلامی دنیا کا امیرالمومنین سمجھیں۔ اس وفد نے ملا عمر کو طالبان حکومت کی کمزوریوں سے بھی آگاہ کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ ملک کے ہر شعبے کو اسلامی اصولوں کے زیر سایہ زندہ کریں۔ بھوکی افغان قوم کو خوشحالی سے بھی ہمکنار کریں ورنہ بھوکی قوم کب تک خاموش بیٹھی رہے گی!

☆ کیا پاکستان افغانستان کی صورت حال سے اپنے آپ کو الگ رکھ سکتا ہے؟

○ بحیثیت قوم ہماری سوچ "امپورٹڈ" ہے۔ بعض لوگوں کی یہ سوچ کہ طالبان کا انقلاب ہی موثر ہو گا' انتہائی سادگی اور اپنے فرائض سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ افغان جہادی گروپوں کے رہنماؤں کی سوچ بھی یہی تھی کہ کوئی اور آ کر حالات درست کرے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ افغان عوام نے اپنی قسمت بدلنے کے لئے خود کو طالبان تحریک کی شکل میں منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ کشمیری قیادت بھی مصلحتوں کا شکار ہو گئی اور اُس نے اصل مقاصد کو پس پشت ڈال کر ذاتی اور گروہی مفادات کو مطمع نظر بنا لیا۔ فلسطین' الجزائر' ترکی اور بوسنیا کی نوجوان نسل نے اپنی تقدیر بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی کچھ افغانستان کی تحریک میں ہوا' جو ان کی کامیابی کا اصل محرک ہے۔ طالبان حکومت کے خلاف کئے جانے والے منفی پراپیگنڈے کے حوالے سے ایک مثبت پہلو بھی سامنے آ رہا ہے' وہ یہ ہے کہ طالبان صحیح اسلام لانا چاہتے ہیں اور لا رہے ہیں۔ طالبان کے اسلامی اقدامات نے مغربی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور پوری دنیا کو طالبان نے اپنے اسلامی اقدامات سے لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ اگرچہ پاکستان میں طالبان کی طرز کا انقلاب تو نہیں آ سکتا مگر ہر سطح پر طالبان حکومت کا دفاع کیا جا سکتا ہے اور دینی جماعتوں کو یہ کام کرنا چاہئے۔ دینی جماعتوں کو ہر محاذ پر طالبان حکومت کے حق میں آواز بلند کرنی چاہئے۔

انٹرویو کے دوران ہی میجر صاحب نے بتایا کہ اب وفد کا قیام کسی اور جگہ ہو گا لہٰذا دس منٹ کے اندر اندر یہاں سے روانگی ہو گی۔ افغان حکومت کے افسر مہمان داری جناب محمد نعیم کے ذریعے تنظیم کے وفد کے لئے اگلے تین روز کا پروگرام طے ہو گیا۔ اسلامی امارت افغانستان کے دارالحکومت کابل میں حکومتی سطح پر وفد کی پہلی ملاقات قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) الحاج نور محمد ثاقب سے ان کے دفتر میں

ہوئی۔ امیر وفد میجر ریٹائرڈ فتح محمد نے تنظیم اسلامی کے وفد کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وفد کے بیشتر اراکین تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت کے رکن اور ملک کے مختلف حلقہ جات کے امراء و ناظمین ہیں۔ میجر صاحب نے امیر تنظیم اسلامی کے افکار و نظریات اور تنظیم کے لائحہ عمل کا مختصر مگر جامع تعارف کرانے کے بعد کہا کہ تنظیم اسلامی افغانستان کی اسلامی حکومت کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے طالبان حکومت کو تسلیم کرانے کے لئے نہ صرف سب سے پہلے آواز اٹھائی بلکہ تنظیم اسلامی نے طالبان حکومت کو تسلیم کرانے کے لئے خاموش مظاہرے بھی کئے۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ افغانستان کی اسلامی حکومت کو اسلام کے عالمی غلبے کا ذریعہ بنائے۔ میجر فتح محمد صاحب نے قاضی صاحب کو بتایا کہ تنظیم کے وفد کا یہ دورہ خالصتاً مطالعاتی و مشاہداتی اور اس کا مقصد اسلامی معاشرے کی برکات کا عملی مشاہدہ کرنا ہے۔ میجر صاحب نے مزید کہا کہ طالبان حکومت کے ذریعے افغانستان میں امن و امان کی بحالی بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بے حجابی و بے پردگی کا تدارک اور موسیقی اور راگ و رنگ کا انسداد طالبان حکومت کے جرأت مندانہ اقدامات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ قاضی صاحب سے افغانستان کے عدالتی نظام کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے کی درخواست کی گئی۔ الحاج نور محمد ثاقب نے فرمایا کہ میں تنظیم اسلامی کے وفد کی افغانستان آمد پر دلی خوشی محسوس کرتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے قدر کرتا ہوں کہ آپ لوگ ٹرانسپورٹ کے خراب نظام کے باوجود افغانستان تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ تنظیم اسلامی کے وفد کی افغانستان آمد کو اللہ تعالیٰ اس اسلامی ریاست کے لئے برکت اور تقویت کا ذریعہ بنائے۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ تنظیم اسلامی کا نمائندہ وفد جو پورے ملک سے تعلق رکھتا ہے ہمارے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی اسلامی خدمات اور خلافت کے نظام کے لئے جدوجہد کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ ہمیں پاکستانی عوام کی خدمات کا بھی اعتراف ہے جنہوں نے ہر مشکل وقت میں افغان عوام کا بھرپور ساتھ دیا۔ انہوں نے کہا کہ طالبان تحریک نے افغانستان کو اسلامی مملکت میں تبدیل کر دیا ہے۔ قاضی صاحب نے بتایا کہ افغانستان میں چونکہ غالب اکثریت حنفی (دیوبندی) مسلمانوں کی ہے لہٰذا ملک کا نظام اسی اسلامی فقہ پر مبنی ہے۔ افغان جہاد میں ملک کے علماء اور طلباء کے ساتھ صوبہ سرحد کے علماء اور پوری دنیا کے مخلص مسلمانوں نے حصہ لیا ہے۔ مولانا نے فرمایا ملک بھی اللہ کا ہے، حکومت بھی اللہ کی ہے اور نظام بھی اللہ کا ہے۔ اسلامی ملک میں غیر اسلامی نظام کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، نہ امریکی نظام کی اور نہ روسی نظام کی، نہ فرانسیسی نظام کی اور نہ رومی نظام کی۔ اسلامی حکومت کے تحت حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لئے الگ الگ محکمہ جات قائم ہیں۔ "تزکیۃ الشھود" کے اسلامی حکم کے حوالے سے گواہ کی

خصوصی طور پر تفتیش کی جاتی ہے۔ عدلیہ مکمل طور پر آزاد ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ حکومتی اہلکار بھی اس میں مداخلت کی جرات نہیں کر سکتا۔ قاضی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ فریقین کو مدافع (وکیل) کی سہولت حاصل ہے۔

جناب مختار حسین فاروقی نے سوال کیا کہ مختلف مسالک کے اختلافی مسائل کو کس طرح نپٹایا جاتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں قاضی صاحب نے فرمایا کہ افغانستان کا اساسی قانون حنفی فقہ کے تصورات پر قائم ہے چونکہ ملک کی غالب اکثریت فقہ حنفی پر عمل پیرا ہے لہٰذا ملک میں ایک ہی قانون رائج ہے۔ اگرچہ ہم دیگر فقہی مذاہب (شافعی' مالکی' حنبلی) کو بھی اسلامی فقہ ہی سمجھتے ہیں۔ گویا پرسنل معاملات میں بھی ہر ایک کے لئے حنفی فقہ کی بنیاد پر ہی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف امیر المومنین کے پاس اپیل کی جا سکتی ہے جو عدالت کو نظر ثانی کی اپیل منظور کرنے کا حکم دے سکتے ہیں' اس لئے کہ قاضی صاحبان در حقیقت امیر المومنین کے نائبین کی حیثیت ہی سے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جید علماء اور دانشوروں پر مشتمل کمیشن قائم کر دیا گیا ہے جو ملک کے اساسی قانون (آئین) کا جائزہ لے رہا ہے۔ یہ کمیشن تمام ملکی قوانین کو اسلامی شریعت کے مطابق ڈھالنے کا کام بھی کر رہا ہے۔ اسلامی حجاب' قصاص اور حدود و تعزیرات کا نظام نافذ کر دیا گیا ہے' چنانچہ مجرم کوئی ہو اسے بلا امتیاز سزا دی جاتی ہے۔ اسلامی قوانین کے نفاذ کے حوالے سے افغانستان کی اسلامی ریاست پر مغربی دنیا کا شدید دباؤ ہے مگر ہم اسلامی احکام کی تنفیذ کے معاملہ میں کسی دباؤ کو گوارا نہیں کریں گے۔ انہوں نے بتایا کہ عدلیہ میں خود احتسابی کا نظام بھی قائم ہے چنانچہ مقدمات کے فیصلوں میں ناروا تاخیر کو بھی جرم خیال کیا جاتا ہے۔ اگر کسی مقدمہ میں یہ بات سامنے آجائے کہ کوئی قاضی بلا جواز فیصلے میں تاخیر کر رہا ہے تو اسے عہدے سے معذول بھی کر دیا جاتا ہے۔ لوگوں کو انصاف کے حصول کے لئے کسی قسم کی "کورٹ فیس" ادا نہیں کرنی پڑتی' یوں اسلامی ریاست افغانستان اپنے شہریوں کو مفت اور جلد انصاف فراہم کر رہی ہے۔ یہ نشست کم و بیش دو گھنٹوں پر محیط تھی۔

پاکستانی سفارت خانہ میں متعین نائب سفیر جناب محمد اصغر آفریدی سے ملاقات ہوئی۔ سفیر موصوف کو تنظیم اسلامی کے وفد کی آمد کا مقصد' امیر تنظیم کے فکر اور تنظیم اسلامی کی دعوت کا اجمالی تعارف کرایا گیا۔ جناب اصغر آفریدی نے اپنے جوابی کلمات میں تنظیم کے وفد کی افغانستان اور پاکستانی سفارت خانہ آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ خارجہ پالیسی کے حوالہ سے افغانستان کی اسلامی حکومت کو ابھی بہت کام کرنا ہے۔ خارجہ پالیسی کو بہتر بنا کر ہی مغربی دنیا کے پراپیگنڈے کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ سفیر

موصوف نے وفد کو بتایا کہ پاراچنار' کرویزاور خوست کے علاقوں میں تعلیمی ادارے باقاعدہ طور پر کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ طالبان حکومت کے قیام سے پہلے ایک گروہ افغانستان میں لوٹ مار اور خانہ جنگی میں ملوث رہا ہے۔ اس وقت تباہ حال افغانستان کی اسلامی حکومت کو مقامی تعمیر نو کے لئے مالی وسائل کی شدید کمی کا سامنا ہے جب کہ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک اور یو این او کی پابندیوں کی وجہ سے طالبان حکومت سخت مالی مشکلات سے دوچار ہے۔ جناب آفریدی صاحب نے بتایا کہ افغانستان کے قائم مقام صدر ملا محمد ربانی نے گزشتہ دنوں اسلام آباد میں ایک پرہجوم پریس کانفرنس میں (جس میں مغربی میڈیا کے نمائندوں کی بڑی تعداد بھی موجود تھی) بتایا کہ ہم افغانستان میں تمام شعبہ جات کو اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے منظم کر رہے ہیں۔ خواتین کی تعلیم کے لئے نصاب کی تیاری اور دیگر اقدامات کے لئے "کمیشن فار گرلز ایجوکیشن" قائم کیا جاچکا ہے۔ جونہی نصاب تیار ہو جائے گا اور مالی وسائل مہیا ہوں گے خواتین کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے الگ تعلیمی ادارے کام کرنے شروع کر دیں گے۔ جناب اصغر آفریدی نے بتایا کہ اس وقت پاکستان ہی دنیا کا واحد ملک ہے جس کا سفارت خانہ باقاعدہ طور پر کابل میں کام کر رہا ہے' جب کہ سعودی عرب اور عرب امارات کا سفارتی عملہ پشاور میں تمام امور نپٹا رہا ہے' ابھی تک انہی تین ممالک نے افغانستان کی اسلامی حکومت کو تسلیم کیا ہے۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ دارالحکومت کابل سمیت ملک کے دو تہائی علاقہ پر پوری طرح قابو یافتہ طالبان حکومت کو مغربی دنیا اور اُس کے آلہ کار نام نہاد مسلم حکمران اس لئے تسلیم نہیں کر رہے کہ اس نے اب اسلامی امارت افغانستان کا روپ کیوں اختیار کر لیا ہے انسانی حقوق کی نام نہاد علمبردار مغربی دنیا کا پیمانہ "مدنیت" تو بقول اقبال یہ ہے

جہاں قمار نہیں' زن تنک لباس نہیں جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مے خواری
نظر وران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

لہٰذا اس "مدنیت" سے عاری اسلامی افغانستان کو مغربی دنیا کیونکر تسلیم کر سکتی ہے!

ایرانی مفادات کی نگرانی کے فرائض بھی پاکستانی سفارت خانہ ادا کر رہا ہے۔ گویا پاکستان مسلم دنیا کا واحد ملک ہے جس نے افغانستان کی طالبان حکومت کو تمام تقاضوں کے ساتھ پوری طرح تسلیم کر رکھا ہے۔ مختار حسین فاروقی صاحب نے پاکستانی سفارت خانہ کے انچارج کے سامنے اسلام کے عالمی غلبے کے حوالے سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے موقف کی وضاحت کی اور انہیں بتایا کہ تنظیم اسلامی کے نزدیک افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کو اسلام کے عالمی غلبہ کے قیام کی اہم کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔

افغانستان کے ساتھ حکومت پاکستان کے فراخدلانہ تعاون کی تفصیلات بتاتے ہوئے سفیر موصوف نے کہا کہ افغانستان دنیا کا واحد ملک ہے جو بیرونی ممالک اور اداروں کے قرضوں سے یکسر بچا ہوا ہے۔ (گویا "اللہ تیرا شکر کہ یہ خطۂ پر سوز 'سوداگر یورپ کی غلامی سے ہے آزاد) حکومت پاکستان اپنے محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے افغان حکومت کی بھرپور مدد کر رہی ہے 'چنانچہ حال ہی میں ۱۱ ملین ڈالر کا قرضہ افغان حکومت کو دیا گیا ہے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے چھ لاکھ ٹن گندم بھی افغانستان بھجوائی گئی ہے 'علاوہ ازیں پاکستان چمن سے قندھار تک ایک بڑی سڑک تعمیر کر رہا ہے۔ انہوں نے افغانستان کی تعمیر نو کے حوالے سے پاکستان کے صنعتی اور تجارتی شعبے کے تعاون کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سٹیل 'ماربل 'سیمنٹ اور صابن انڈسٹری کی یہاں گنجائش ہے۔

جمعہ 27/ مارچ کا دن سرکاری تعطیل کی وجہ سے بالکل فارغ تھا۔ نماز جمعہ قدیم اور تاریخی جامع مسجد حاجی یعقوب خان میں ادا کی۔ خطیب شستہ اور رچے تلے انداز میں وعظ و نصیحت فرما رہے تھے 'سورۃ العصر موضوع گفتگو تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ دین اور دنیا کی بہتری کے لئے تقویٰ پر مبنی زندگی گزارتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا ہو گا۔ جہاد اسلامی زندگی کا شرف اور مسلمان کے لئے وجہ افتخار ہے۔ مشہور حدیث "مَن رَّای منکم منکرًا" کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اسلامی ریاست کے ذریعے ہی ادا کیا جا سکتا ہے لیکن اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہو تو پھر وعظ و تبلیغ کے ذریعے اس فریضے کو ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد کابل کے حضوری باغ سٹیڈیم کی طرف جانے کا قصد کیا 'جہاں دو قاتلوں سے قصاص لیا جانا تھا۔ ڈاکٹر اقبال صافی صاحب کی گاڑی میں چند منٹوں کے اندر ہم حضوری باغ سٹیڈیم کابل پہنچ گئے 'جہاں لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کا مشاہدہ کرنے کے لئے جوق در جوق آ رہے تھے۔ گھنٹہ بھر میں سٹیڈیم پوری طرح بھر چکا تھا۔ سٹیڈیم کے باہر ٹینک اور بکتربند گاڑیاں چاک و چوبند مسلح طالبان مجاہدوں کے ساتھ کسی بھی ہنگامی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار تھیں۔ دنیا بھر میں سٹیڈیم عموماً کھیلوں اور میلوں ٹھیلوں یا فوجی پریڈ کے لئے استعمال ہوتے ہیں مگر اسلامی امارت افغانستان کے حضوری باغ سٹیڈیم کابل میں آج شریعت کے ایک حکم پر عمل کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سٹیڈیم کے اندر مسلح طالبان سیکورٹی کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ چند علماء سٹیڈیم کے وسط میں تشریف لائے 'جنہیں قصاص کے اسلامی حکم پر عمل درآمد کروانا تھا۔ یہاں نہ یہاں شامیانے نصب تھے اور نہ دریاں 'نہ قالین تھے اور نہ صوفے 'نہ کرسیاں تھیں اور نہ گاؤ تکیے۔ علماء کرام اپنے کندھے والی روایتی افغان چادریں بچھا کر "تخت نشین" ہو گئے۔ صدائے شریعت ریڈیو کابل کے عملہ نے قصاص کے عمل کا

"آنکھوں دیکھا" حال سنانے کے لئے ضروری آلات نصب کر دیئے۔ سورۂ حج کے آخری رکوع کی آیات کی تلاوت سے اس "تقریب" کا آغاز ہوا۔ تین علماء نے یکے بعد دیگرے قصاص، دیت، قطع ید اور حد زنا جیسی اسلامی سزاؤں کی حکمت اور فلسفہ پر روشنی ڈالی۔ علماء کی طرف سے مقتولین کے ورثاء کو قاتلوں کو دیت کی صورت میں خون بہا وصول کر کے معاف کر دینے کی ترغیب بھی دلائی گئی، مگر ورثاء "خون کا بدلہ خون" ہی لینے پر مصر تھے جو یقیناً ان کا حق تھا۔ لہٰذا حتمی طور پر اعلان کیا گیا کہ شریعت اسلامی کے تمام تقاضے اور مطالبے پورے کر دیئے گئے ہیں اور اب قصاص کا فریضہ ادا کیا جائے۔ اسی لمحے ایک کار عین سٹیڈیم کے وسط میں آکر رکی۔ قاتل کار سے اتر کر اپنے انجام کے منتظر تھے، آخری مرتبہ قاتلوں کو مقتولین کے ورثاء سے معافی کی درخواست کا موقع دیا گیا مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ قصاص کا اعلان ہوتے ہی فضا نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی۔ اُس وقت عملاً یہ محسوس ہو رہا تھا کہ واقعی اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ قاتلوں کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے گئے اور مقتولین کے ورثاء نے قصاص کے طور پر مقتولین کو چھریوں سے باقاعدہ "ذبح" کر دیا۔ زندگی میں پہلی بار کسی انسان کو قتل ہوتے دیکھ کر ہماری طرح بہت سے لوگ گم سم ہو کر رہ گئے مگر یہی قصاص در حقیقت انسانی معاشرے کی بقاء کا ضامن ہونے کی وجہ سے لوگوں کی زندگی کا ضامن قرار پاتا ہے۔ قرآن مقدس میں ہے کہ ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾۔

اب تھوڑی سی تفصیل واقعہ قتل کی بھی پیش خدمت ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ کابل میں رہنے والے ایک افغان باشندے نے جو اپنی فیملی کے ساتھ جرمنی میں مقیم تھا کابل میں واقع اپنا مکان کرایہ پر دے رکھا تھا۔ کرایہ دار پارٹی نے ایک سال تک تو کرایہ ادا کیا مگر پھر ان کی نیت میں فتور آگیا۔ جب مالک مکان جرمنی سے کابل لوٹا تو ان لوگوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی، کھانے کی دعوتیں کیں، اس طرح کی ایک دعوت کے بعد مالک مکان اور اس کے مقامی محافظ دونوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کے ٹکڑے کر کے انہیں کہیں چھپا دیا گیا۔ افغانستان کی طالبان حکومت نے قاتلوں کا نہ صرف سراغ لگا لیا بلکہ 22 دنوں میں انہیں بر سر عام کیفر کردار تک بھی پہنچا دیا گیا۔ مقتولین کے ورثاء نے بدلہ لینے کے بعد بلا خوف و خطر سٹیڈیم سے نکل کر اپنے گھروں کی راہ لی۔ اسے کہتے ہیں انصاف! مگر ہمارے ہاں تو ہر چیز کی طرح انصاف بھی منہ مانگے داموں فروخت ہوتا ہے چنانچہ پاکستان کی عدالتیں انصاف کی "بکرا منڈی" بن کر انصاف کے بیوپاریوں کے ہاتھ اسے کھلے عام فروخت کر رہی ہیں اور حکمران ہیں کہ انہیں چیخنے اور چلانے کے سوا کچھ نہیں آتا۔

ہماری دوسری ملاقات نائب وزیر تعلیم جناب عبد السلام حنیفی سے ہوئی۔ موصوف بہاولپور اور

کراچی کے دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں۔ مولانا پشاور اور اٹک میں افغان مہاجرین کے بچوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے' بعد میں طالبان تحریک کے ساتھ عملی جہاد میں مشغول ہو گئے۔ مولانا عبدالسلام حنیفی بمشکل 30 سال کے نوجوان ہوں گے مگر ان کی باتوں سے علم کا نور جھلکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ تعلیم کا حصول ایک لازمی دینی فریضہ ہے جسے جوانی میں بھی حاصل کرنا چاہئے اور شادی کے بعد بھی جاری رکھنا چاہئے۔ اپنی وزارت کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ کمیونسٹ دور حکومت میں نصابی کتب سے اسلامیات کا وہ مضمون بھی سرے سے خارج کر دیا گیا تھا جو ظاہر شاہ کے زمانے میں رائج تھا۔ طالبان کی حکومت قائم ہوئی تو ہم نے جامع نصاب کی تیاری کو اپنی اولین ترجیح بنالیا چنانچہ قندھار میں تعلیمی اداروں کے سربراہوں اور دیگر ماہرین تعلیم کا اجلاس منعقد ہوا۔ دیگر اسلامی ممالک میں رائج جامع نصاب کا جائزہ لے کر ایک نصاب مرتب کر لیا گیا ہے۔ جس کا چیف جسٹس صاحب جائزہ لے رہے ہیں۔ ان کی نظرثانی اور منظوری کے بعد یہ نصاب پورے ملک میں رائج کر دیا جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ دینی مدارس میں عصری علوم کی تعلیم کو شامل نصاب کیا گیا ہے جب کہ سکولوں اور کالجوں میں دینی تعلیم کو نصاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہمارے اس اقدام سے دینی مدارس کے فارغ التحصیل افراد اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے مابین موجود منافرت ختم ہو جائے گی۔ دینی اور عصری علوم کی تعلیم کے لئے اقامتی طرز کے مدارس قائم کئے جا رہے ہیں۔ ہر ولایت تحصیل کی سطح پر ایسے مدارس قائم کرے گی۔ مولانا عبدالسلام حنیفی نے کہا کہ اسلامی حکومت کی ترقی اور مضبوطی کے لئے دین و دنیا کی تعلیم کا امتزاج ناگزیر ضرورت ہے۔ اسی طریقے سے عالم کفر کے باطل نظریات کا توڑ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس طرز کے مدارس جلال آباد' ننگرہار' ہرات اور قندھار میں قائم ہو چکے ہیں' اور جلد ہی ایسا ادارہ کابل میں بھی قائم کر دیا جائے گا۔ خواتین کی تعلیم کے حوالے سے وزیر تعلیم نے کہا کہ اسلام مرد اور عورت دونوں پر علم کے حصول کو فرض قرار دیتا ہے' ہم بحیثیت مسلمان اس شرعی حکم سے کیونکر غافل رہ سکتے ہیں؟ اسلام ہمارا دین ہے جس پر عمل کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ ہم خواتین کو بھی تعلیم دینا چاہتے ہیں مگر اسلامی اصولوں اور دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے! مخلوط تعلیم کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں اس وقت شدید مالی مشکلات کا سامنا ہے' مالی وسائل فراہم ہوتے ہی ہم خواتین کے تعلیمی ادارے بھی کھول دیں گے اور ان شاء اللہ اسی سال کے اندر اندر خواتین کے لئے نصاب کی تیاری سمیت تمام ضروری کام مکمل کر لیا جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ ذریعہ تعلیم فارسی اور پشتو ہو گا جب کہ عربی کو زندہ زبان کے طور پر پڑھایا جائے گا۔ افغانستان میں تعلیم کے ساتھ ساتھ کتابیں' رہائش اور کھانا بھی حکومت فراہم کر رہی ہے۔ نجی سکول' کالج اور یونیورسٹیاں قائم

کرنے پر پابندی ہے البتہ دینی مدارس نجی سطح پر قائم کئے جاسکتے ہیں مگر ان کے لئے سرکاری نصاب کو اپنانا لازم ہو گا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے الگ محکمہ "وزارت تحصیلات عالی" قائم ہے جو تیزی سے اپنی ترجیحات تیار کر رہا ہے۔

مختار حسین فاروقی صاحب نے اسلامی امارت افغانستان کی اسلامی حکومت کے قیام کا پس منظر جاننے کی خواہش کا اظہار کیا تو مولانا نے ہمیں بتایا کہ طالبان تحریک کے کامیاب جہاد کے نتیجے میں گزشتہ سال قندھار میں ملک کے تین ہزار جید علماء کا پندرہ روز طویل اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے آخری روز علماء نے ملا محمد عمر' مجاہد اسلام کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں افغانستان کی اسلامی حکومت کے امیر المومنین کے مقام پر فائز کر دیا۔ میجر صاحب نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیر موصوف کو تنظیم اسلامی کی اساس سے 'جو نظام بیعت پر ہی استوار ہے' متعارف کرایا۔ وزیر موصوف کے سامنے تنظیم کے عہد نامہ رفاقت میں درج بیعت کے الفاظ پڑھ کر سنائے گئے۔ یوں طالبان حکومت اور تنظیم اسلامی بیعت کے رشتے میں منسلک ہونے کی وجہ سے گویا ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں۔ مولانا عبدالسلام حنیفی نے بتایا کہ امیر المومنین سے کی گئی بیعت کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ "ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے آپ ہمارے امیر ہیں ہم آپ کی اطاعت کریں گے' اگر آپ اس بیعت کے تقاضے پورے نہ کر سکے یا اسلامی احکامات سے انحراف و تجاوز کیا تو آپ سے ہماری یہ بیعت ختم ہو جائے گی اور آپ ہمارے امیر نہیں رہیں گے"۔ اسلام کی حقانیت پر دلی یقین اور باطنی بصیرت کے حامل اس نوجوان کو دیکھ کر ہمیں اپنے وہ مجاہدین اسلام یاد آگئے جنہوں نے محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد کے روپ میں دنیا کو اسلام کی روشنی سے منور کیا تھا۔ علامہ اقبال نے ایسے مجاہدوں کی بابت ہی تو کہا تھا کہ ؎

تا خلافت کی بنا دُنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

آج انہی اسلاف کے خوشہ چیں' انہی کی راہ کے مسافر' انہی جیسے مجاہد' اسلام کو سربلند کرنے کے لئے افغانستان میں مصروف عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مجاہدوں کو کامیابی عطا فرمائے' ان کے اقدامات میں برکت دے اور افغانستان کے ذریعے اسلام کے عالمی غلبہ کی راہ ہموار کر دے اور پاکستان سمیت پوری دنیا کو اسلام کا عادلانہ نظام نصیب فرما دے۔ آمین

29/مارچ اتوار کا دن وزارت خارجہ کے ذمہ دار حضرات سے ملاقات کے لئے مختص تھا۔ ملا محمد ربانی وزیر خارجہ کے عہدہ پر فائز ہیں' ان کی بعض ناگزیر اور فوری مصروفیات کی وجہ سے ان کے نائب سید محمد حقانی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میجر صاحب نے حسب سابق تنظیم کے وفد کی آمد کا مقصد

بیان کیا اور طالبان حکومت کو نیک خواہشات پہنچائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل افغانستان کو روسی استعمار کے خلاف جہاد کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اس جہاد میں پوری دنیا کے مسلمانوں نے عملی طور پر ہمارا ساتھ دیا۔

اس جہاد میں لاکھوں افغان مسلمان شہید اور لاکھوں ہی بے گھر اور ہزاروں افراد معذور ہوئے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان قربانیوں کو قبول کرتے ہوئے افغانستان میں اسلامی حکومت قائم فرمادی ہے۔ اگرچہ اس وقت ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے ہمارا مطلوب و مقصود اور ہدف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا عملی نفاذ ہے جس میں ہم بحمداللہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ سے ہر شعبے میں اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کا ظہور ہوگا۔ ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ کے مصداق اللہ تعالیٰ لازماً ہمارے لئے آسانیاں فراہم کرے گا۔ اگرچہ اس وقت پورا عالم کفر افغانستان کی اسلامی حکومت کا دشمن بن چکا ہے مگر ہمیں اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی حکومت کے مخالفین غنڈے اور بدمعاش ہیں، جنہیں کبھی بھی اپنے مکروہ اور شیطانی عزائم میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی بلکہ ناکامی ہی ایسے بدکردار لوگوں کا مقدر ہوگی۔ طالبان مخالف اتحاد میں شامل حکمت یار، ربانی، دوستم اور مسعود وغیرہ کے بارے میں مولانا سید محمد حقانی نے بتایا کہ اگر یہ لوگ طالبان کی اسلامی حکومت کو تسلیم کرلیں اور شرعی نظام کو قبول کرلیں تو ان سے بات ہو سکتی ہے ورنہ یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچ کر رہیں گے۔ مولانا نے بتایا کہ روسی افواج کے انخلا اور ان کے گماشتہ کیمونسٹوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد حکومت مجاہدین کے ہاتھ میں آگئی مگر صبغت اللہ مجددی، برہان الدین ربانی اور انجینئر گلبدین حکمت یار کے ساڑھے چار سالہ دور اقتدار میں 60 ہزار مسلمان باہمی لڑائی کی بھینٹ چڑھ گئے اور شریعت کے نظام کے لئے ٹھوس پیش رفت سرے سے نہ ہوئی۔ مجاہدین کی اتحادی حکومت نے اپنے ساڑھے چار سالہ دور حکومت میں کابل کے مظلوم شہریوں کو اپنے ظلم و ستم کا بڑی بے دردی سے نشانہ بنایا۔ اس ظلم کی گواہی کابل کے درودیوار سے بھی لی جاسکتی ہے۔

اس طرح کابل میں ہماری یہ آخری سرکاری مصروفیت بھی ختم ہوگئی اور ہمارا قافلہ کابل سے جلال آباد کے لئے محو سفر ہوگیا۔ داروٹہ ڈیم کابل پر رک کر نماز مغرب ادا کی گئی اور یہاں کی مشہور اور تازہ بہ تازہ مچھلی پر مشتمل کھانا کھانے کے بعد ہم جلال آباد پہنچ گئے۔ شہر سے باہر ہی میزبان تنظیم اسلامی کے وفد کے منتظر تھے۔ مہمان خانے میں طعام و قیام کے بعد اگلی صبح نماز فجر ادا کرنے کے بعد جلال آباد سے طورخم کے لئے روانگی ہوئی۔ ہم صبح ۸ بجے کے قریب اسلامی امارت افغانستان سے "اسلامی" جمہوریہ پاکستان میں لوٹ آئے۔ یوں ہمارا یہ سفر اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

بقیہ : شہیدِ مظلوم

کے ساتھ بغض رکھا۔ اور جس شخص نے ان کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی' اس نے اللہ کو تکلیف دی' اور جس نے اللہ کو تکلیف دی تو وہ عنقریب اس کو گرفت میں لے لے گا"۔

یہ وہ حدیث ہے جو تقریباً ہر خطبہ جمعہ میں ہمارے خطباء سناتے ہیں۔ (جاری ہے)

بقیہ : فکرِ عجم

الدین افغانی"' علامہ اقبال' ڈاکٹر علی شریعتی اور ملک الشعراء بہار جیسی شخصیات کو فروغ حاصل ہوا جنہیں نہ سنی کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی شیعہ۔ انہی شخصیات کے افکار نے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی۔

اس کے مقابلہ میں برصغیر کے شیعہ احباب نے انگریزی عہد میں ایران و ہند کے مابین روابط کے انقطاع کے باعث ان تحاریک کا اثر قبول نہیں کیا اور وہ فکری خلاء میں معلق رہے۔ جب قیام پاکستان کے بعد ایران سے ثقافتی روابط قائم ہوئے تو برِصغیر اور ایران کے شیعہ احباب ایک دوسرے سے مل کر حیران ہونے لگے کہ روابط کے انقطاع اور مرورِ ایام کے باعث وہ خاصی حد تک ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر نظر آنے لگے۔
(جاری ہے)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد :	۴۷
شمارہ :	۶
صفر المظفر	۱۴۱۹ھ
جون	۱۹۹۸ء
فی شمارہ	۱۰/-
سالانہ زر تعاون	۱۰۰/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت : 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700۔ فون : 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔ گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون ۔ 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ 'مرکزی انجمن' طابع ۔ رشید احمد چودھری' مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

بھارت میں متعصب ہندو سیاسی پارٹی بی جے پی نے برسراقتدار آتے ہی تجرباتی بنیاد پر کیے بعد دیگرے پانچ ایٹمی دھماکے کر کے اس خطے میں طاقت کے توازن کے مسئلہ پر شدید بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے اور پاکستان کی سالمیت اور تحفظ کو شدید خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ بی جے پی نے عالمی رائے عامہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پوری ڈھٹائی کے ساتھ ایٹمی دھماکے کر کے اپنے انتخابی وعدوں میں سے ایک وعدہ پورا کر دکھایا ہے جس سے بھارت میں اندرونی طور پر اس کی سیاسی پوزیشن کو اگرچہ غیر معمولی استحکام ملا ہے لیکن پاکستان کے طول و عرض میں اس سے ایک اضطراب اور شدید بے چینی کا پھیل جانا ایک فطری امر ہے جس کا فوری تدارک اگر نہ کیا گیا تو پاکستان نفسیاتی طور پر انڈیا کے شدید دباؤ میں آجائے گا اور برابری کی بنیاد پر انڈیا سے مذاکرات کرنے اور معاملات طے کرنے کی پوزیشن ہمیشہ کے لئے کھو دے گا۔ پوری دنیا میں بھارت کے اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور عالمی طاقتوں نے بظاہر بھارت کی شدید مذمت کرتے ہوئے اس پر معاشی پابندیاں عائد کرنے کا عندیہ بھی دیا ہے لیکن صاف نظر آتا ہے کہ امریکہ اور دیگر عالمی طاقتوں کے اس نوعیت کے دھمکی آمیز بیانات کا اصل مقصد بھارت کو مطعون کرنا نہیں بلکہ پاکستان کو ہراساں اور مرعوب کرنا ہے تاکہ پاکستان جوابی طور پر ایٹمی دھماکہ کرنے کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔ حالانکہ پاکستان نہ صرف یہ جوابی دھماکہ کرنے کا بھرپور اخلاقی جواز رکھتا ہے بلکہ اس کی سالمیت اور تحفظ کے لئے ایسا کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے جس سے اسے روکنا صریحاً بلاجواز ہوگا۔

نواز شریف حکومت اس حوالے سے ایک شدید امتحان سے دوچار ہے۔ ایک طرف امریکی دباؤ ہے جس میں دیگر عالمی طاقتیں بھی امریکہ کی ہمنوا ہیں، اور دوسری جانب متفقہ عوامی مطالبہ ہے جو ملک و قوم کی مصلحتوں کا آئینہ دار بھی ہے۔ امریکہ اس ضمن میں "گاجر اور چھڑی" کی پالیسی اپنائے ہوئے ہے۔ شدید نوعیت کی معاشی پابندیوں کی دھمکی کے ساتھ ساتھ "لالی پاپ اور مونگ پھلیوں" کا لالچ بھی دیا جا رہا ہے۔ موجودہ حکومت شدید مخمصے کا شکار ہے۔ امریکی دباؤ قبول کرتی ہے تو عوامی حمایت سے محرومی اس کے حصے میں آتی ہے، عوامی مطالبے کے سامنے سر جھکاتی ہے تو چچا سام کی پشت پناہی سے محرومی اور مزید معاشی بدحالی اس کا مقدر بنتی ہے جو اقتدار سے محرومی پر بھی منتج ہو سکتی ہے۔ گویا ع "فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟"

جہاں تک بھارتی ایٹمی دھماکوں کے جواب میں پاکستان کے لئے ایٹمی دھماکے کے جواز کا تعلق

ایک بدیہی حقیقت ہے۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان آج بھی ہندو سامراج کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور بھارتی حکمرانوں کی دلی آرزو ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ وہ تقسیم کے نتیجے میں قائم ہونے والی سرحدی لکیر کو مٹا کر نظریہ پاکستان کو ہمیشہ کے لئے دفن اور پاکستان کے نام کو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات سے محو کر دیں۔ بی جے پی کے بر سر اقتدار آنے کے بعد تو یہ معاملہ پہلے سے کہیں زیادہ سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ بھارت کے ان ناپاک عزائم کی راہ میں اگر کوئی چیز رکاوٹ بن سکتی ہے تو وہ "ایٹمی ڈیٹرنٹ" ہے' اس لئے کہ جنگی قوت و صلاحیت اور اسلحے کی دوڑ میں پاکستان ہر اعتبار سے بھارت سے بہت پیچھے ہے۔ گویا پاکستان کی سالمیت اور تحفظ کے نقطہ نگاہ سے جوابی ایٹمی دھماکہ کرنا ایک ناگزیر قومی ضرورت ہے جس سے گریز خودکشی کے مترادف ہو گا۔ لیکن اس معاملے کا ایک دوسرا اور ہمارے نقطہ نگاہ سے اہم تر پہلو بھی ہے جس کی طرف اشارہ امیر تنظیم اسلامی نے بھی اپنے حالیہ خطاب جمعہ میں کیا تھا۔ اور وہ یہ کہ قرآن حکیم میں دو ٹوک الفاظ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دشمن کے مقابلے کے لئے بھرپور جنگی قوت اور سامان حرب فراہم کرو تاکہ تم اس کے ذریعے دشمن کے دلوں پر دھاک بٹھا سکو' اسے مرعوب اور خوفزدہ کر سکو۔ گویا اس وقت جوابی ایٹمی دھماکہ کرنا ہماری قومی و ملی ضرورت ہی نہیں' دینی فریضہ بھی ہے۔

ہمارے ملک کا ایک طبقہ اس بات سے بہت خائف نظر آتا ہے کہ جوابی دھماکہ کرنے کی صورت میں ہم پر عالمی سطح پر معاشی پابندیاں عائد کر دی جائیں گی۔ یہ اندیشہ اگرچہ بجا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ دھماکہ نہ کر کے ہم معاشی طور پر خوشحال ہو جائیں گے۔ ہماری ملکی معیشت جس منحوس چکر کی لپیٹ میں ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم نے ابھی تک دھماکہ نہیں کیا لیکن اس کے باوجود بھی آج ہمارا اسٹاک ایکسچینج تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہا ہے۔ بیرونی قرضوں کے محض سود کی ادائیگی کے لئے بھی ہم مزید سودی قرضے لینے پر مجبور ہیں بلکہ اس کے لئے دربدر بھیک مانگتے اور آئی ایم ایف کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں۔ امریکہ کی جانب سے بے وفائی اور وعدوں سے پھر جانے کا تجربہ ہمیں بارہا ہو چکا ہے۔ ہماری فاقہ کشی کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم قرض کی مے پینے بلکہ پیتے رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس منحوس چکر سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ ہم سے یہ بیساکھیاں چھین لی جائیں۔ ہم پر جب تک لیبیا' ایران اور سوڈان کی طرز پر معاشی پابندیاں عائد نہیں ہوں گی ہمارے اندر قومی سطح پر بیداری اور اپنی ذمہ داری اور مقصد کا شعور اجاگر نہیں ہو گا اور ہمارے اندر معاشی طور پر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی امنگ پیدا نہیں ہو گی۔ لہٰذا "تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا۔ ہم کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے

لئے" کے مصداق ہمیں قوی امید ہے کہ یہ ممکنہ معاشی پابندیاں انجام کار کے اعتبار سے ہمارے لئے خوش آئند ثابت ہوں گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے لئے ابتدا میں ہمیں سختیاں جھیلنے اور قربانیاں دینے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ گھاس کھا کر گزارہ کرنے کے لئے ذہنا آمادہ ہونا پڑے گا، تبھی ہم معاشی طور پر خود کفیل اور اقوام عالم میں ایک باعزت قوم کے طور پر ابھر سکیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے اللہ کی مدد اور نصرت و حمایت ہمیں درکار ہوگی، جس کے حصول کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم اس ملک خداداد پاکستان میں قرآن و سنت کی بالادستی کے نظام کو نافذ و غالب کریں۔ پاکستان کی سالمیت اور بقا کے لئے یہ قدم اٹھانا ناگزیر ہے۔

☆ ☆ ☆

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ حسب پروگرام دونوں گھٹنوں کا آپریشن کروانے کے بعد جمعرات ۲۱ مئی کو پاکستان واپس تشریف لے آئے تھے۔ بحمد اللہ آپریشن کے بعد گھٹنوں کی قدیمی تکلیف بہت حد تک رفع ہو چکی ہے اور بحالی صحت کی رفتار بھی اطمینان بخش ہے۔ امیر تنظیم نے وطن واپس تشریف لاتے ہی اگلے روز یعنی جمعہ ۲۲ مئی کو مسجد دارالسلام میں اجتماع جمعہ سے خطاب فرمایا اور جوابی ایٹمی دھماکے کی ضرورت و اہمیت اور دھماکہ نہ کرنے کے خوفناک نتائج و عواقب پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس خطاب جمعہ کا پریس ریلیز جو اس کے جامع خلاصے کی حیثیت رکھتا ہے، حسب ذیل ہے

جوابی ایٹمی دھماکہ نہ کرنا کفران نعمت اور ملک وملت سے غداری ہے

۲۲۔ مئی، بھارتی ایٹمی دھماکوں کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے ایٹمی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ ہماری اہم قومی ضرورت ہی نہیں ہمارا دینی و ملی فریضہ بھی ہے۔ بھارت کے پے در پے ایٹمی دھماکوں کے بعد جنوبی ایشیا میں پیدا ہونے والی نئی صورت حال کے نتیجے میں پاکستان فیصلہ کن دوراہے پر کھڑا ہے۔ چنانچہ بھارتی دھماکوں کے بعد اگر جوابی ایٹمی دھماکہ نہ کیا گیا تو پاکستان بھارت کا طفیلی ملک بن کر رہ جائے گا۔ ان خیالات کا اظہار امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطاب جمعہ میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کا قیام چار سو سالہ تجدیدی و احیائی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ چنانچہ پاکستان کے معجزانہ قیام کی طرح ملک کی ایٹمی صلاحیت بھی عطیہ خداوندی ہے۔ اس خداداد ایٹمی صلاحیت کا مظاہرہ نہ کرنا کفران نعمت اور ملک وملت سے غداری کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بھارت میں متعصب ہندو سیاسی پارٹی بی جے پی کے برسراقتدار آنے کے بعد اب بھارت کے ایٹم بم کو "ہندو بم" کہنا زیادہ مناسب ہوگا جس کے مقابلہ کے لئے "اسلامی بم" سامنے لایا جانا ضروری ہے۔

انہوں نے کہا اگرچہ بھارت پاکستان سے کئی گنا بڑا ملک ہے مگر ہم نے اب تک نفسیاتی طور پر خود کو بھارت کی ہم پلہ قوت کے طور پر برقرار رکھا ہوا ہے لیکن اب اگر پاکستان ایٹمی دھماکہ کرنے میں ناکام رہا تو ہم نہ صرف بھارت کے طفیلی بلکہ امریکہ کے آلہ کار بن کر رہ جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبہ اور امت مسلمہ کے حوالے سے اب بھی فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے، لیکن اگر ہم نے ایٹمی دھماکہ کے سلسلے میں عالمی طاقتوں کا دباؤ قبول کر لیا تو اسلام اور عالم اسلام کے ضمن میں پاکستان کا اہم ترین کردار ختم ہو جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ اگر امریکہ کے دباؤ میں آکر ایٹمی دھماکہ نہ کیا گیا تو امریکہ اور اس کے حواری مغربی ممالک سے ہمیں "مونگ پھلی" اور "لالی پاپ" تو مل جائیں گے، اور بظاہر یہ دور اندیشی اور عافیت کا راستہ نظر آتا ہے، لیکن دھماکہ نہ کرنے کے منطقی نتائج بہت خوفناک ہوں گے۔ پھر نیو ورلڈ آرڈر کے مذموم عزائم کی تکمیل یعنی چین کی ناکہ بندی اور گھیراؤ کی پالیسی میں پاکستان کو امریکی مہرے کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ ملک کئی حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ پاکستان کا نہ صرف اسلامی اور احیائی کردار ختم ہو جائے گا بلکہ پاکستان کے خلاف عالمی طاقتوں کی سازش کی تکمیل کے طور پر ملک کے مزید حصے بخرے ہونے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ایٹمی دھماکہ کرنے کے بارے میں قومی سطح پر بے مثال اور عظیم تر اتفاق رائے اور غیر معمولی کامل یکجہتی پائی جاتی ہے۔ پاکستان کا ایٹمی دھماکہ درحقیقت عالمی دباؤ کو مسترد کرنے کے مترادف ہوگا۔ لہٰذا اس کے لئے "ہمت مرداں" کے ساتھ "مدد خدا" بھی حاصل کی جائے۔ انہوں نے وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف سے کہا کہ ایٹمی دھماکہ کے ضمن میں امریکی دباؤ کو مسترد کرنے کے بعد نفاذ اسلام کے سلسلے میں بھی ہر قسم کے امریکی دباؤ کو مسترد کرنا آسان ہوگا۔ ایٹمی دھماکہ کے حوالے سے مذہبی اور سیاسی جماعتیں حکومت پر اپنا دباؤ بڑھائیں تاکہ حکومت عالمی طاقتوں کے مجوزہ دباؤ کا مقابلہ کر سکے۔ انہوں نے مذہبی سیاسی جماعتوں کے قائدین سے کہا کہ قوم و ملک کو درپیش نازک صورتحال میں محض قومی غیرت و حمیت کے جذبے کی دہائی دینے کی بجائے ملک کی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے قرآن و سنت کی بالادستی کے قیام کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل کرنے کے لئے بھی لائحہ عمل تشکیل دیں۔ ایٹمی دھماکہ کے بعد ممکنہ پابندیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قوم کو پیٹ پر پتھر باندھنے ہوں گے۔ انہوں نے تجویز دی کہ معاشی پابندیاں عائد ہونے کی صورت میں ہر قسم کے بیرونی قرضوں کی ادائیگی بند کر دی جائے۔ اس طرح ملک کو کسی قسم کی غیر ملکی امداد کی ضرورت نہیں رہے گی۔

تصادم کا مرحلۂ ثانی

اِقدام اور چیلنج

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتّب : شیخ جمیل الرحمٰن)

صبرِ محض (Passive Resistance) کے مرحلہ پر اگرچہ انقلابی جماعت کے کارکنوں کو سخت قسم کے تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے' تاہم انقلابی عمل کے لئے یہ مرحلہ نہایت اہم ہے' کیونکہ اس دوران ان کی مظلومیت کی وجہ سے معاشرے کی خاموش اکثریت (Silent Majority) کی ہمدردیاں رفتہ رفتہ اس انقلابی گروہ کے ساتھ ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف خود انقلابی گروہ کو مہلت مل جاتی ہے جس میں انہیں نظم کی پابندی کا خوگر بنایا جاتا ہے اور ان کی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ بلاچون وچرا اطاعتِ امیر کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے بعد جب انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس باطل وفاسد' ظالم واستحصالی اور غلط نظام کے خلاف راست اِقدام کر سکتے ہیں تو اب صبرِ محض کا مرحلہ راست اِقدام میں تحویل ہو جائے گا۔

سورۂ آل عمران کی آخری آیت میں امر کے صیغہ میں فرمایا گیا ہے : ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾ "اے ایمان والو! صبر سے کام لو' باطل کے علمبرداروں کے مقابلہ میں پامردی اور استقامت و ثبات کا مظاہرہ کرو' حق کا بول بالا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جاؤ"۔ یہاں ایک لفظ "صبر" اور دوسرا "مصابرہ" آیا ہے۔ "مصابرت" کا لفظ قرآن مجید مدنی دَور میں استعمال کر رہا ہے' جبکہ مکی دور میں ہمیں قرآن میں صرف صبر کا لفظ ملتا ہے۔ حضور ﷺ کو خطاب کر کے متعدد سورتوں میں مختلف اسالیب

میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی۔ مثلاً : ﴿فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلاَ تَسْتَعْجِلْ لَّھُمْ﴾ (الاحقاف) ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلاَّ بِاللّٰهِ﴾ (ھود) ﴿وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا﴾ (الطور) ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلاً﴾ (المزمّل) چنانچہ حضور ﷺ صبر کی اسی تاکید کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جانب منتقل فرماتے رہے۔ آلِ یاسر رضی اللہ عنہم سے فرمایا : ((اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِر فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃ)) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو' برداشت کرو! اس لئے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے''۔

مکّی دَور میں جو سورتیں اور آیات نازل ہوئیں ان میں بار بار صبر کی تاکید ہے کہ جھیلو! برداشت کرو! ـــــ اور یہ صبر یک طرفہ ہو رہا ہے۔ ابھی اہل ایمان پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور وہ جھیل رہے ہیں۔ انہیں تشدد و مظالم کا ہدف بنایا جا رہا ہے اور وہ برداشت کر رہے ہیں اور کوئی بھی اپنے دفاع میں ہاتھ تک نہیں اٹھا رہا۔ اس لئے کہ ابھی اس کی اجازت نہیں تھی۔ مکی دَور میں قرآن مجید میں صرف ''صبر'' کا لفظ ملے گا' جو یک طرفہ عمل ہے۔ جبکہ مدنی دَور میں یہ لفظ کچھ بدلی ہوئی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اب مصابرہ یا مصابرت کا حکم آتا ہے۔ یہ لفظ باب مفاعلہ سے بنا ہے اور اس باب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں آمنے سامنے دو فریق ہونے لازمی ہیں۔ گویا ''مصابرہ'' کے معنی ہوں گے صبر کا صبر سے ٹکراؤ۔ یعنی وہ اگر تم پر زیادتیاں کر رہے ہیں تو اب تم بھی ان کے خلاف اِقدام کرو۔ معلوم ہوا کہ اب دو طرفہ صبر کا مظاہرہ ہو گا۔ مشرکین کو بھی جھیلنا پڑے گا' انہیں بھی جان کی بازیاں کھیلنی ہوں گی۔ اگر وہ اپنے باطل نظریہ اور فاسد نظام کا تحفظ چاہتے ہیں تو انہیں بھی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ ''مصابرہ'' اسی عمل کا نام ہے کہ صبر کا صبر سے ٹکراؤ اور مقابلہ ہو۔ جس فریق میں قوتِ صبر یعنی برداشت کی طاقت زیادہ ہو گی بازی اس کے حق میں جائے گی۔ اب اسی مرحلے پر معلوم ہو گا کہ اہل حق اور اہل باطل میں سے کون سا فریق زیادہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کر سکتا ہے' کون اپنے مشن (Cause) کے لئے کتنی قربانیاں دے سکتا ہے!۔ صبر جب مصابرت میں بدلتا ہے تو یہ درحقیقت صبر محض (Passive Resistance) کا اِقدام (Active Resistance) میں تبدیل ہو

جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہاد قتال کے مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

موضوع کی اہمیت

انقلابی جدوجہد کا یہ مرحلہ انتہائی اہم ہے' یہ درحقیقت حضور ﷺ کی سیرت کا ایک نہایت نازک موڑ اور لمحہ (Critical Moment) ہے کہ نہج تبدیل ہو رہا ہے' صبرِ محض کی پالیسی ترک کر کے اِقدام کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے اس کو تضاد قرار دے کر اس کا محاکمہ کیا ہے اور اس ظاہری تضاد کو کافی نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ مسٹر منٹگمری وہاٹ نے سیرت مبارکہ پر دو علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کا نام "Mohammad at Makka" اور دوسری کا نام "Mohammad at Madina" ہے۔ اُس نے گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مکہ والے محمد (ﷺ) دراصل مدینہ والے محمد (ﷺ) سے مختلف ہیں۔ اس کے نزدیک مکہ والے محمد ایک داعی ہیں' مبلغ ہیں' مزکّی ہیں' مربّی ہیں۔ غرضیکہ ان حضرات کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے اندر نبوت کے جو اوصاف نظر آتے ہیں وہ مکی دَور کی حد تک حضورؐ میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن مدینہ میں نقشہ کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ وہاں حضور ﷺ کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ آپؐ فوج کے سپہ سالار اور جرنیل ہیں' آپؐ مدینہ کی ریاست کے سربراہ ہیں۔ آپؐ ہی چیف جسٹس کا رول ادا کر رہے ہیں۔ دوسری اقوام سے معاہدے کر رہے ہیں۔ گویا مدینہ میں محمد ﷺ ایک مدبّر سیاست دان کے روپ میں نظر آ رہے ہیں —— مسٹر ٹائن بی (Toyn Bee) کہتا ہے :

> *Muhammad (ﷺ) failed as a Prophet but succeeded as a statesman"*
>
> یعنی "محمد (ﷺ) بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے' لیکن ایک سیاستدان کی حیثیت سے کامیاب رہے" (نعوذ باللہ من ذلک)

گویا منٹگمری وہاٹ کو بھی یہ پورا فکر اسی بات سے ملا ہے۔ یعنی انہیں مکہ والے محمد ﷺ میں تو نبوت کی شان نظر آ رہی ہے۔ اس لئے کہ اُن کے اذہان میں نبیوں کی جو تصویر ہے (مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام) وہی تصویر اُن کو محمد رسول اللہ ﷺ کی مکہ میں نظر آ

رہی ہے۔ لیکن مدینہ میں سیرتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا جو نقشہ ان کو نظر آتا ہے وہ ان کے خیال کے مطابق نبوت والا معاملہ نہیں ہے۔ وہاں تو ان لوگوں کو نبی اکرم ﷺ بحیثیت ایک سیاست دان و مدبّر' ایک سربراہ مملکت اور ایک جرنیل کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ آخر یہ منہج عمل کیسے تبدیل ہوا ہے! وہ تحویلی مرحلہ (Transitory Phase) کب آیا اور کیسے آیا! اور محمد ﷺ نے نظام باطل کے خلاف راست اِقدام کیسے کیا تھا!!

اِقدام کے فیصلے کی اہمیت اور نزاکت

کسی انقلاب کے لئے راست اِقدام (Active Resistance) کا فیصلہ بہت اہم اور نازک (Crucial + Critical) ہوتا ہے۔ اگر راست اِقدام کا فیصلہ قبل از وقت ہو جائے گا تو دُنیوی اعتبار سے انقلاب ناکام ہو جائے گا۔ اگر تعداد معتدبہ نہیں ہے' اگر تربیت خام رہ گئی ہے تو دُنیوی ناکامی کا سامنا ہوگا۔ جیسے کُشتہ میں اگر یک آنچ کی کسر رہ گئی تو بعض اوقات یہی ذرا سی آنچ کی کسر تباہ کن ہو جاتی ہے اور وہ کشتہ مقوئ جسم و جاں بننے کی بجائے ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی طرح اگر تربیت میں خامی اور کمی رہ گئی اور قبل از وقت اِقدام کر دیا گیا تو ناکامی ہو جائے گی' خواہ خلوص و اخلاص کا کتنا ہی ذخیرہ اس جدوجہد کے پیچھے موجود ہو۔ لہٰذا یہ بڑا نازک لمحہ ہوتا ہے اور اس کے صحیح یا غلط ہونے پر انقلاب کے کامیاب یا ناکام ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔

انبیاء و رُسل کا خصوصی معاملہ

جہاں تک جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاء و رُسل کا معاملہ ہے' یہ فیصلے درحقیقت اللہ کی طرف سے وحی جلی یا وحی خفی کے ذریعے سے ہوتے تھے' یا اگر رسولؑ اجتہادی طور پر کوئی قدم اٹھاتے تھے تو اللہ کی طرف سے اس کی تصویب یا اصلاح ہو جاتی تھی۔ لیکن اگر وحی کے ذریعے نہ تصویب ہوئی ہو نہ اصلاح تو گویا رسول کے اس اجتہادی فیصلہ کو اللہ کی طرف سے خاموش توثیق حاصل ہو گئی۔ لہٰذا اس معاملہ میں رسولؑ تو محفوظ و مامون اور معصوم ہیں ــــــ اس ضمن میں حضور ﷺ کی سیرت مطہرہ میں ہمیں سفرِ

طائف کی مثال ملتی ہے' جو حضورؐ کا ایک اجتہادی فیصلہ تھا۔ سن دس نبویؐ میں جب مکہ میں مشرکین نے دار الندوہ میں حضورؐ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا تو حضورؐ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا۔ اس فیصلہ کی تصویب یا اصلاح وحی کے ذریعے نہیں ہوئی ــــــ گویا اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ طائف والے بھی ہمارے رسول (ﷺ) کے صبر و ثبات اور عزیمت کی خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر لیں۔ چنانچہ طائف میں ایک دن میں رحمۃ للعالمین ﷺ کے ساتھ وہ سلوک ہوا جو مکی زندگی کے دس برس میں نہیں ہوا۔ جس کو بیان کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے اور جس کو پڑھتے ہوئے دل کانپ جاتا ہے۔ وہاں دعوتی اعتبار سے حضور ﷺ کے لئے کامیابی کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یہ بات طے شدہ تھی کہ "مدینۃ النبی" بننے کی سعادت یثرب کے حصے میں آنے والی ہے' یہ سعادت طائف کے نصیب میں نہیں تھی۔ حالانکہ غور کیجئے کہ طائف میں دعوت و تبلیغ کے لئے حضور ﷺ بنفس نفیس تشریف لے گئے' لیکن وہاں سے ناکام لوٹنا پڑا اور دوسری جانب صورت یہ ہے کہ آپؐ مکہ میں مقیم ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یثرب کے لئے کھڑکی کھول دی' جہاں سے آکر اولاً چھ اور بعد ازاں ۷۵ افراد نے آپؐ سے بیعت کر کے اسلام قبول کیا۔

گویا یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ دار الہجرت یثرب کو بننا ہے' طائف کو نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ قدم قدم پر نبی اکرم ﷺ کی وحی متلو (یعنی قرآن مجید) اور وحی غیر متلو (یعنی کشف' القاء' الہام اور رویائے صادقہ) کے ذریعے رہنمائی فرما رہا ہے۔ حضورؐ کے کسی اجتہادی عمل پر خاموشی ہے تو یہ گویا اللہ کی طرف سے اس کی توثیق و تائید ہے ــــــ لیکن مابعد کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ نبوت و رسالت کا اتمام و اکمال حضورؐ کی ذات پر ہو گیا۔ اب تاقیام قیامت کسی نوع کا نبی نہیں آئے گا۔ لہٰذا اس کے بعد جو بھی اسلامی احیائی تحریکیں اٹھی ہیں یا اٹھیں گی' ظاہر بات ہے کہ ان کی قیادت انبیاء و رُسل کے ہاتھوں میں نہ رہی ہے نہ رہے گی' بلکہ قیادت کی یہ ذمہ داری رسول اللہ ﷺ کے کسی اُمتی ہی نے ادا کی ہے اور آئندہ بھی یہ کام کسی امتی ہی کے ذریعے ہو گا۔ اور کوئی امتی بھی معصوم عن الخطا نہیں ہے' معصومیت خاصۂ نبوت ہے۔ نبوت ختم ہوئی تو معصومیت

بھی ختم ہوئی۔ حضور ﷺ جہاں خاتم النبیین ہیں وہاں خاتم المعصومین بھی ہیں ــــــ شیعہ مکتبِ فکر کا معاملہ بالکل علیحدہ ہے کہ وہ بزعمِ خویش جن اماموں کو مامور من اللہ مانتے ہیں [illegible]وم عن الخطا بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس امکان کو اپنے ذہن سے بالکل محو کر دیجئے [illegible]جان لیجئے کہ [illegible] تجدید دین اور احیاء اسلام کی جو تحریک بھی برپا ہوگی' اس کے ہر مرحلہ کا معاملہ اجتہادی ہوگا اور اس اجتہاد میں خطا کا امکان رہے گا۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خطا کا امکان نہیں ہے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا وہ اہل سنت والجماعت کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔

تحریکِ شہیدینؒ کی مثال

برِعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں "تحریک شہیدین" کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد' ایک خالص اسلامی تحریک ہونے کے اعتبار سے' تحریک شہیدین کے ہم پلہ کوئی دوسری تحریک نظر نہیں آتی۔ اس تحریک کے قائد سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ تقویٰ' تدیّن اور خلوص و اخلاص کا اتنا بڑا سرمایہ دورِ صحابہؓ کے بعد اسلامی تاریخ میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔ انفرادی سطح پر بڑی بڑی عظیم شخصیتیں ہر دَور میں نظر آتی ہیں۔ مجددینِ اُمت ہیں' ائمۂ اُمت ہیں' محدثین کرام ہیں' فقہاء عظام ہیں۔ انفرادی سطح پر علم' تقویٰ' تدین اور خلوص و اخلاص کے اعتبار سے ان میں سے ہر شخص کوہ ہمالیہ نظر آتا ہے لیکن اجتماعی سطح پر' ایک گروہ اور ایک جماعت کی صورت میں' اتنے متقی و متدین حضرات اور اتنا خالص اسلامی جہاد بالسیف دَورِ صحابہؓ کے بعد کہیں اور نظر نہیں آتا' واللہ اَعلم۔ لیکن وہاں بھی ایک اجتہادی خطا ہو گئی اور قبل از وقت اِقدام ہو گیا۔

حضرت سید احمد بریلویؒ نے اپنے ان ساتھیوں کی بھرپور تربیت کی تھی جن کو ساتھ لے کر وہ سرحد کے علاقہ میں پہنچے تھے۔ لیکن ان کی اصل جدوجہد پشاور اور مردان کے اضلاع سے شروع ہوئی تھی ــــــ وہاں جا کر اِقدام سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں

کی تربیت کی بھی ضرورت تھی۔ یا تو وہاں کے تمام خوانین اور رعایا سید صاحب رحمہ اللہ کو قطعی طور پر اپنا امیر تسلیم کرلیتے اور ان کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت اور جہاد کرلیتے' تب بھی کوئی مضبوط اساس قائم ہو جاتی' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ ایک یا دو قبیلوں کے خوانین نے بیعت کرلی تھی جو کافی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ مقامی لوگوں کی تربیت سے پہلے اور وہاں اپنے آپ کو مستحکم (Consolidate) کرنے سے پہلے' ایک طرف سکھوں کے ساتھ جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ دوسری طرف اسلامی شریعت کی حدود و تعزیرات نافذ کر دی گئیں' جو مقامی لوگوں کے لئے بڑی شاق تھیں۔ اس لئے کہ وہ لوگ ایک مدت سے دین کے صحیح و حقیقی علم سے ناواقف تھے' اور اگرچہ وہ مسلمان تھے لیکن ان میں سے اکثر حقیقی ایمان کے لذت آشنا نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اکثریت نے سید صاحب کے خلاف سازشیں کیں' آپ کو زہر دیا گیا' مجاہدین کے کیمپوں پر شب خون مارا گیا اور بے شمار مجاہدین کو شہید کر دیا گیا۔ آپؒ کے خلاف مخبری کی گئی اور سکھوں کو مجاہدین کے لشکر کی نقل و حرکت اور اس کی قوت و وسائل کی خبریں پہنچائی گئیں۔ الغرض مقامی لوگوں کی اکثریت کی ناپختہ سیرت و کردار اور عدم تربیت کے باعث یہ عظیم اسلامی تحریک دُنیوی اعتبار سے ناکام ہو گئی۔

تحریک شہیدینؒ کی مثال سے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی انقلاب کے لئے تربیت کی کیا اہمیت ہے اور اِقدام کے مرحلے کے لئے صحیح وقت کا تعین کیا اہمیت رکھتا ہے! سید صاحب کا حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے مقامی لوگوں کو سچا اور پکا مسلمان سمجھ کر اقدام کرنا اور سکھوں سے جنگ کا سلسلہ شروع کر دینا خطاءِ اجتہادی ہے اور اہل سنت کے نزدیک خطاءِ اجتہادی پر بھی آخرت کا اجر محفوظ رہتا ہے۔ ایک انسان اپنی امکانی حد تک غور کرنے کے بعد اپنی رائے میں صحیح فیصلہ کر رہا ہے' اس نے سوچ بچار اور غور و تدبر میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اور اس کے بعد اس نے اِقدام کیا ہے تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا اُخروی اجر و ثواب بالکل محفوظ ہے' اس میں قطعاً کوئی کمی نہیں ہوگی' لیکن دُنیوی اعتبار سے وہ جدوجہد اور وہ تحریک ناکام ہو جائے گی۔ یہ بات نہ صرف ماضی بلکہ آئندہ کے لئے بھی ہے۔ بہرحال کسی تحریک میں وہ وقت آتا ہے کہ جب اس کے قائد کو

"اِقدام" کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہو گا کہ پوری طرح سوچ بچار کے بعد استعداد کے مطابق حالات کا پورا جائزہ لے کر اور اپنی جمعیت کی تعداد اور اس کی تربیت کو پوری طرح تول کر اِقدام کا فیصلہ کیا جائے اور اس میں بھی اس کا تمام تر توکّل اللہ ہی کی ذات پر ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہی اصل حامی و ناصر ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست!
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن تحریک کا قائد اور اس کے ساتھی ذہناً اس کے لئے تیار رہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خطا ہو جائے۔ اس لئے کہ اب کوئی نبی نہیں ہے' لہٰذا کوئی معصوم نہیں ہے۔

سیرتِ مطہرہ میں اِقدام کا مرحلہ کب آیا

سیرتِ مطہرہ میں راست اِقدام بالفاظِ دیگر نظامِ باطل کو چیلنج کرنے کا جو مرحلہ آیا ہے اس کا تعلق ہجرت کے متصلاً بعد کے زمانے سے ہے۔ یعنی جیسے ہی ہجرت ہوئی اور حضور ﷺ مکّہ کو خیرباد فرما کر عازمِ مدینہ ہوئے اسی لمحے یہ مرحلہ شروع ہو گیا۔ اس مرحلہ کے لئے قرآن مجید میں متعلقہ آیات سورۃ الحج کی ہیں۔ آیت ۳۹ میں فرمایا : ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُo﴾ یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے قتال کا اِذنِ عام تھا۔ اب تک انہیں حکم تھا کہ ہاتھ بندھے رکھیں' لیکن اب ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے کہ اب انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے۔ یہ آیات اثنائے سفر ہجرت میں نازل ہوئیں۔ سفر میں کم از کم ۲۰ دن لگے ہیں اور ۱۲/ ربیع الاول ۱ھ کو حضورؐ کا مدینہ منورہ میں ورودِ مسعود ہوا ہے۔ اس اعتبار سے ۱۲/ ربیع الاول کی تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہی حضور ﷺ کی تاریخ وفات ہے۔

اب سورۃ الحج کی آیت ۴۱ ملاحظہ ہو :

﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ' وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِo ﴾

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکن و اقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم

کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ اور
تمام معاملات کا انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے۔"

اس آیت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ کرام رضوان اللہ علیہم کو جو تمکّن فی الارض عطا کیا جانے والا تھا اور اس میں جو توسیع ہونے والی تھی اس کے پیش نظر یہ آیت گویا حزب اللہ اور اسلامی انقلاب کے منشور (Manifesto) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے آج کل کوئی سیاسی جماعت الیکشن میں حصہ لیتی ہے تو اپنا ایک منشور شائع کرتی ہے کہ اگر ہمیں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو ہم کیا کریں گے اور ہمارا رویہ کیا ہو گا۔ یہاں یہ Divine Manifesto نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیا جا رہا ہے کہ اے محمد (ﷺ) آپ مدینہ تشریف لے جا رہے ہیں، جہاں آپؐ کا داخلہ ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہو گا۔ تو آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہؓ کے لئے یہ منشور ہے جسے وہاں رُوبعمل لایا جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ کا مدینہ منورہ میں ۱۲/ ربیع الاول ۱ھ کو ورودِ مسعود ہوا۔ چھ مہینے تک تو حضورؐ نے نہ کوئی جوابی کارروائی فرمائی نہ مکّہ کی طرف کوئی اِقدام کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے حالات ایسے بنا دیئے تھے کہ حضورؐ کو خود مدینہ آنے کی دعوت ملی تھی۔ یہاں آکر آپؐ کو دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مدینہ میں اوس و خزرج کے دو بڑے قبیلے آباد تھے۔ دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اور رؤساء رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا چکے تھے اور ان میں سے اکثریت بیعتِ عقبہ ثانیہ کے وقت موجود تھی اور حضورؐ کے دستِ مبارک پر دو سال قبل بیعت کر چکی تھی۔ لہٰذا آپؐ نے استحکام کے لئے چھ ماہ صرف فرمائے ہیں اور اس عرصہ میں کئے جانے والے تین اِقدامات بہت اہم ہیں۔

مدینہ میں حضورؐ کے اِقدامات بغرض استحکام

۱) **مسجد نبویؐ کی تعمیر** : پہلا فوری اِقدام اقامتِ صلوٰۃ سے متعلق تھا۔ اس لئے کہ منشورِ الٰہی کی پہلی شق یہی ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے پہلا کام جو کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھا۔ اس

کے لئے جگہ کا انتخاب کیا گیا' پھر اس کے حصول کے بعد تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ اس تعمیر کا یہ پہلو قابل غور ہے کہ حضور ﷺ اس میں بنفس نفیس شریک رہے ہیں۔ آپؐ نے ایک [illegible] کارکن کی حیثیت سے مسجد نبویؐ کی تعمیر میں حصہ لے کر اپنے آباء و اجداد کی [illegible]نت کی تجدید فرمائی۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھانے کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا ہے : [illegible] اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ بیت اللہ کی دیواریں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے اٹھائی تھیں تو مسجدِ نبویؐ کی تعمیر میں محمد رسول اللہ ﷺ کی توانائیاں اور آپؐ کی محنت کا پسینہ شامل تھا۔

(ii) مواخات : دوسرا اِقدام جو آپؐ نے فرمایا اس کا عنوان مواخات ہے۔ یہ بہت بڑا کام تھا۔ مہاجرین کو مدینہ کی آبادی میں مدغم اور ضم (Integrate) کرنا' تاکہ وہ اس معاشرہ میں علیحدہ طبقہ کی حیثیت سے نہ رہ جائیں بلکہ اس کا ایک جزوِ لاینفک بن جائیں۔ چنانچہ مہاجرین میں جو اہم لوگ تھے ان کے بالکل سگے بھائیوں کی طرح انصار کے ساتھ رشتے کرا دیئے گئے۔ مواخات کا یہ اِقدام داخلی استحکام کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مواخات کا یہ معاملہ سیرتِ مطہرہ کے ابواب [illegible] نہایت اہم باب ہے اور معلوم تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے نتیجے میں انصار نے مہاجرین کے لئے اپنے گھر اور دوکانیں تقسیم کر دیں۔ ایک انصاری صحابیؓ کے بارے میں یہاں تک آتا ہے کہ ان کی دو بیویاں تھیں۔ وہ اپنے مہاجر بھائی کو گھر میں لے گئے۔ چونکہ اُس وقت تک حجاب کا حکم نہیں آیا تھا لہٰذا انہوں نے پیشکش کی کہ ان دونوں میں سے جو آپ کو پسند ہو میں اسے طلاق دیتا ہوں' آپ اس سے نکاح کر لیں۔ اس لئے کہ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے گھر میں دو بیویاں ہوں اور میرے بھائی کا گھر آباد نہ ہو۔

یہ مواخات بھی نہایت انقلابی اہمیت کا حامل اِقدام ہے۔ اس لئے کہ انسان کی سرشت کے اندر جو کمزوریاں ہیں اس میں طبقاتی تفاوت و امتیاز اور کشمکش بہت خوفناک ہوتی ہے۔ اوس و خزرج میں قبائلی و طبقاتی کشمکش اور عصبیت پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اسلام اور پھر رسول اللہ ﷺ کے بنفس نفیس ورودِ سعید نے اس کو ختم کیا۔ لیکن اس کے

باوجود کچھ عرصہ بعد ہی منافقین اور یہود کسی نہ کسی بہانہ سے اس چنگاری کو بھڑکانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اگر مہاجرین اور انصار کا اس طرح ادغام و انضمام نہ کر دیا گیا ہوتا اور ان کے مابین مواخات قائم نہ کر دی گئی ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ بہت سی داخلی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ منافقین اور یہود نے اس کی موقع بموقع کوششیں کیں، لیکن نبی اکرم ﷺ کی فراست، تدبر، معاملہ فہمی اور حکمت نے ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنادیا۔

(iii) <u>یہودی قبائل سے معاہدے</u> : تیسرا اِقدام جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں استحکام کے لئے فرمایا وہ یہودیوں کے ساتھ معاہدوں سے متعلق تھا، جن کے تین قبیلے مدینہ میں آباد تھے اور وہ بہت اہم، باا ثر اور طاقتور تھے۔ مدینہ کے اقتصادی شعبہ پر ان کا بڑا تسلط (Hold) تھا۔ ان کی قلعہ نما گڑھیاں تھیں، جن میں کافی اسلحہ اور ساز و سامان تھا۔ اگرچہ یہود اصل مالکان دہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، مالکانِ دہ تو اوس و خزرج تھے، لیکن سرمایہ، تنظیم اور تعلیم، یہ چیزیں یہود میں بہت زیادہ تھیں اور وہ بہت مؤثر عامل کی حیثیت سے وہاں موجود تھے۔ حضور ﷺ کی دوراندیشی کا یہ شاہکار ہے کہ آپؐ نے مدینہ تشریف لے جاتے ہی فوراً یہود کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ ان سے معاہدہ میں طے پا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے، ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے، اور اگر کبھی مدینے پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کے حلیف کی حیثیت سے ان کا ساتھ دیں گے یا بالکل غیر جانب دار رہیں گے۔ وہ اس معاہدے میں ایسے بندھ گئے کہ وہ کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے۔ اگرچہ بعد میں اسلام کی اشاعت اور استحکام کو دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹتے رہے اور مشرکینِ قریش سے سازباز کر کے پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہے لیکن یہ سب کچھ چوری چوری ہو رہا تھا، وہ علی الاعلان مقابلہ میں نہیں آسکتے تھے۔ مختصراً یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں کا پابند بنانے کے لئے جو اِقدام فرمایا وہ ہر لحاظ سے دوراندیشی اور فراست و ذہانت کا ایک شاہکار تھا۔ اس اِقدام نے اسلامی تاریخ میں نہایت اہم اور مثبت کردار ادا کیا ہے۔

راست اقدام کا مرحلہ

ربیع الاول سے لے کر رمضان ۱ھ کے دوران رسول اللہ ﷺ نے کوئی مہم مدینہ منورہ سے باہر نہیں بھیجی۔ یہ چھ مہینے آپؐ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے اور ہجرت کی وجہ سے اسلامی انقلابی جماعت کے جو دو عناصر وجود میں آگئے تھے، یعنی مہاجرین وانصار، ان کو باہم شیر و شکر کرنے اور بنیان مرصوص بنانے میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد راست اقدام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے ـــــ وہ مرحلہ کیا ہے؟ اس کو صرف تاریخی اعتبار سے سمجھنے کے بجائے نبی اکرم ﷺ کے منہاج انقلاب کے نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہئے۔ حضور ﷺ نے آٹھ فوجی مہمات مکہ کی طرف روانہ فرمائیں، جن میں سے چار میں حضور ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے۔ لہٰذا انہیں غزوات کہا جاتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ وہ غزوات ہیں جو غزوۂ بدر سے پہلے کے ہیں۔ عام طور پر ہمارا تصور اور تاثر یہ ہے کہ پہلا غزوہ غزوۂ بدر رہے۔ پہلی باقاعدہ جنگ یقیناً غزوۂ بدر ہے۔ غَزَا یَغْزُو عربی میں اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہتے ہیں اور اصطلاحاً غزوہ خاص ہو گیا اس مہم کے لئے جس میں نبی اکرم ﷺ بنفس نفیس نکلے ہوں۔ تو ابتدائی چھ ماہ کے بعد چار فوجی مہمات وہ ہیں جن میں حضور ﷺ خود مدینہ سے باہر نکلے، جبکہ چار سرایا ہیں۔ سریہ اُس فوجی مہم کو کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے کوئی مہم بھیجی یا کوئی لشکر روانہ فرمایا اور کسی صحابیؓ کو اس کا سربراہ یا سپہ سالار مقرر فرما دیا، آپؐ خود اس میں شامل نہیں ہوئے۔ ان آٹھ مہموں کے حالات و واقعات کو ہمارے اکثر سیرت نگار اور مورخین نے بمشکل تمام دو یا تین صفحات میں سمیٹ لیا اور اس میں بھی نہایت ایجاز و اجمال سے کام لیا۔ حالانکہ یہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا وہ اہم اور نازک مرحلہ ہے جس میں اقدام اور پیش قدمی اب حضور ﷺ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر صبر محض (Passive Resistance) اب "راست اقدام" (Active Resistance) میں تبدیل ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس راست اقدام کی نوعیت تھی کیا؟ اصل میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے خلاف جو اقدام کیا اس کے دو مقصد سامنے آتے ہیں۔ جدید اصطلاحات کے

حوالہ سے پہلا تکتہ Economic Blockade کا یعنی معاشی ناکہ بندی ہے۔ اہلِ مکہ اور قریش کی معاشی زندگی کا دارومدار تجارت پر تھا۔ مکہ کا اپنا حال بالفاظِ قرآن : "بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ" تھا۔ وہاں کسی نوع کی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو کھانے پینے کی چیزوں کے لئے باہر کی منڈیوں کے محتاج تھے۔ وہاں ایک دانہ تک نہیں اُگتا تھا۔ البتہ ان کے ہاں بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے' جن کا دودھ اور گوشت انہیں حاصل تھا۔ لہٰذا ان کی معیشت کا سارا دارومدار تجارت پر تھا' اور اُس دَور کی مشرقی اور مغربی ملکوں کے مابین تجارت میں قریش کو ایک اہم کڑی اور واسطہ (Link) کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ غور کیجئے کہ آج کل نہر سویز کی کتنی اہمیت ہے۔ اگر یہ کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جائے تو تجارت کا کیا حال ہو جائے گا؟ اگرچہ دوسرے راستے موجود ہیں جو بہت طویل ہیں۔ لیکن آپ اُس زمانے کا تصور کیجئے جس زمانہ میں اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ جنوبی افریقہ سے ہندوستان اور مشرقی ایشیا کے بحری راستے تو پندرھویں صدی عیسوی میں دریافت ہوئے ہیں۔ لہٰذا مشرق و مغرب کی تجارت حضورؐ کی بعثت کے دَور میں عرب کے راستہ سے ہوتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ ہندوستان' انڈونیشیا' ملائیشیا اور دوسرے مشرقی ممالک کا سارا سامان تجارت بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے یمن کے ساحل تک پہنچتا تھا۔ اُدھر مغرب کے ممالک یعنی یونان' اٹلی اور بلقان کی ریاستوں کا سارا سامان تجارت شام کے ساحلوں پر اتر جاتا تھا۔ اس طرح یورپ کے ممالک کا سامان تجارت بحیرۂ روم سے ہو کر اِدھر پہنچتا تھا اور اِدھر بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ہند سے ہو کر مشرقی ممالک و جزائر کا سامان تجارت یمن پہنچ جاتا تھا۔ اب ان کے مابین کاروبار کی جو ساری نقل و حمل (Transfer and Transport) تھی وہ صرف قریش کے ہاتھ میں تھی' جس کا قرآن مجید میں سورۂ قریش میں بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا گیا ہے : ﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ۝ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝﴾ ـــــــ ان کے قافلے سردیوں میں یمن کی طرف جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام کے ساحلوں کی طرف سفر کرتے تھے۔ ایک بڑا تجارتی سفر سردیوں میں اور ایک بڑا تجارتی سفر گرمیوں میں ان کے معمولات میں شامل تھا اور انہیں ان دونوں اَسفار میں مکمل امن حاصل رہتا تھا۔ جبکہ عرب کے دوسرے قبائل کو یہ امن میسر نہ تھا' بلکہ ان کے قافلے اکثر

لوٹ لئے جاتے تھے' کیونکہ عرب کے اکثر قبائل کا پیشہ ہی لوٹ مار' رہزنی اور غارت گری تھا۔ تو کسی اور قبیلہ کا قافلہ شاذ ہی لوٹ مار سے بچ کر نکلتا تھا' سوائے قریش کے' کہ ان کے قافلے کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قریش کعبہ کے متولی تھے اور تمام عرب اللہ کا گھر تسلیم کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ سارے کے سارے قریش کے تو نہیں تھے۔ بلکہ صورت یہ تھی کہ تمام عرب قبائل کے "خدا" قریش کے پاس بطور "یرغمالی" رکھے ہوئے تھے۔ اگر ان کے قافلہ پر کوئی قبیلہ ہاتھ ڈالے تو قریش اس قبیلہ کے "خدا" کی گردن مروڑ سکتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ قریش کے قافلوں کو تحفظ حاصل تھا ـــــــ سورۂ قریش میں آگے فرمایا گیا : ﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ○ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ○﴾ (بدبختو! تمہیں اللہ کے اس گھر کی وجہ سے رزق مل رہا ہے اور تم نے اس کی حرمت کو بٹہ لگا رکھا ہے۔) تم پر تو لازم ہے کہ اس گھر کے مالک اللہ واحد کی عبادت کرو' جس نے تم کو بھوک سے نجات دلا رکھی ہے اور خوف سے محفوظ کر رکھا ہے۔

تو اس منظر کو سامنے رکھئے کہ مغرب و مشرق کی تجارت میں قریش کو بلا شرکتِ غیرے اجارہ داری حاصل تھی' اس وجہ سے کہ یہ کعبہ کے متولی تھے اور کعبہ میں تمام قبیلوں کے بُت رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے قافلوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ لیکن اب حضور ﷺ نے ان پر ہاتھ ڈالنا شروع فرمایا اور آپؐ نے اب ایک قوت ہونے کے اعتبار سے اپنی موجودگی ثابت فرمادی۔ حضورؐ کے اس اقدام کا ایک مقصد تو مکہ کی معاشی ناکہ بندی تھا۔ حضورؐ نے درحقیقت قریش کی رگِ جان (Life-line) پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنا دیا۔ اس طرح ان کی معاش کے لئے ایک خطرہ پیدا فرمادیا۔ قریش کی معاشی ناکہ بندی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا دوسرا مقصد قریش کی سیاسی ناکہ بندی تھا' جس کو کہا جائے گا Isolation of Quresh ـــــ یا Political containment of Quresh۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس علاقے میں جو دوسرے قبیلے آباد تھے ان کے قریش سے معاہدے تھے اور وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ حضور ﷺ نے اس علاقے میں متعدد

سفر کئے جن میں اپنی قوت کا مظاہرہ بھی فرمایا اور دعوت و تبلیغ کا کام بھی کیا۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ بقول اقبال ؎ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد ــــ تو تبلیغ و دعوت کے ساتھ طاقت بھی شامل ہو جائے تو اب یوں سمجھئے کہ جیسے سونے پر سہاگہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں ہجرت کا ذکر آ رہا ہے وہاں حضور ﷺ کو یہ دعا تلقین کی گئی تھی : ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا۝﴾ "اے اللہ! جہاں تو مجھے داخل کرنے والا ہے وہاں میرا داخلہ سچائی اور راست بازی کے ساتھ ہو اور جہاں سے تو مجھے نکال رہا ہے وہاں سے سچائی اور راست بازی کے ساتھ نکال' اور اپنے خاص خزانہ فضل سے قوت و طاقت کے ساتھ میری مدد فرما۔" یہ ہے وہ قوت اور طاقت جو حضورؐ کو مدینہ میں تشریف لانے کے بعد حاصل ہو گئی تھی ــــ تو اب حضورؐ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ نکلتے تھے۔ کسی قبیلہ میں جا کر آپ نے دس بیس دن قیام فرمایا' ان کے ساتھ معاہدے کئے' اول تو ان کو اپنا حلیف بنا لیا ورنہ کم از کم انہیں غیر جانب دار ضرور بنا لیا کہ اگر تمہارا قریش کے ساتھ معاہدہ ہے تو ہمارے ساتھ بھی کرو' ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کرو اور ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرو' بالکل غیر جانب دار ہو جاؤ۔ یہ ہیں حضورؐ کے وہ اقدامات جن کو جدید اصطلاحات کے حوالے سے Isolation and Political containment of Quresh کہا جا سکتا ہے۔

ان مقاصد کے لئے چار سفر تو حضور ﷺ نے بنفس نفیس فرمائے اور چار مہمات ایسی روانہ کیں کہ جن میں آپ شریک نہیں تھے۔ یہاں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ ان مہموں میں آپؐ نے کسی انصاری صحابیؓ کو شامل نہیں فرمایا۔ یہ جملہ مہمات مہاجرینؓ پر مشتمل تھیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصارؓ نے عرض کیا تھا کہ "آپؐ مدینہ تشریف لے آیئے۔ اگر قریش نے آپؐ کی وجہ سے مدینہ پر حملہ کیا تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔" دوسری خاص بات یہ کہ کل ایک سال کے اندر یہ ساری کارروائی عمل میں آ گئی۔ یعنی رمضان ۱ھ سے لے کر رمضان ۲ھ تک کے عرصہ میں حضور ﷺ نے آٹھ

مہمات سرانجام دیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر کم وقت میں کس قدر شدّ و مدّ اور [illegible] و شور کے ساتھ یہ عمل ہوا۔ ایسا نہیں تھا کہ آپؐ نے بکتربند گاڑیوں پر کوئی مہم [illegible] یہ تمام مہمات اونٹوں کے ذریعے یا پیادہ طے کی گئیں۔

[illegible] تا ہے کہ سیرت نگاروں نے غزوۂ بدر سے قبل کی ان مہموں کا بہت ہی سرسری طور پر ذکر کیا ہے اور اس مقام سے ایسے گزر گئے ہیں کہ جیسے یہ سیرت کے غیر اہم واقعات تھے۔ ان کے نزدیک ہجرت کے بعد پہلا قابل ذکر واقعہ غزوۂ بدر ہے' حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ غزوۂ بدر ہوا کیوں؟ غزوۂ بدر سے تو اصل میں حضورؐ کی انقلابی جدوجہد چھٹے اور آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) میں داخل ہوئی ہے۔ لیکن Passive Resistance (یعنی صبر محض) نے ہجرت کے بعد Active Resistance (یعنی راست اقدام) کی صورت کیسے اختیار کی' جس کے نتیجہ میں مسلح تصادم کی نوبت آئی؟ یہ ہے وہ قریباً ڈیڑھ دو سال کی تاریخ جس پر غور و تدبر سے حضور ﷺ کا منہج انقلاب صحیح طور پر سمجھ میں آسکے گا اور یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ حضورؐ کو تلوار کیوں اٹھانا پڑی۔

در حقیقت پہلے چھ مہینوں میں جب کہ نبی اکرم ﷺ نے ابھی کوئی اقدام نہیں فرمایا تھا ایک واقعہ پیش آیا جو بہت اہم ہے۔ رئیس اوس حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مدینہ سے مکہ گئے۔ ابھی تک مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے مابین کھلا اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ مکہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا حلیف امیہ بن خلف تھا جو کبھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آقا ہوا کرتا تھا اور اس نے ان کو بہت ستایا تھا۔ حضرت سعدؓ نے اس کے یہاں قیام کیا اور پھر طواف کے لئے حرم گئے۔ وہاں ابوجہل سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس نے اُمیہ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اُس نے بتایا کہ یہ اوس کے رئیس سعد بن معاذؓ ہیں۔ ابوجہل انؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا اور کہنے لگا "اگر تم اُمیہ کے حلیف نہ ہوتے تو تم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ تم ہمارے دشمنوں اور بے دینوں کو پناہ دو اور خود آکر بیت اللہ کا طواف کرو" ـــــــ اس کے نزدیک تو جناب محمد ﷺ اور آپؐ کے ساتھیؓ' معاذ اللہ' بے دین تھے' کیونکہ انہوں نے قریش کا بت پرستی کا آبائی دین چھوڑ دیا تھا۔ حضرت سعد

بن معاذؓ نے اسی وقت ترکی بہ ترکی جواب دیا "اگر تم نے ہم پر طواف بند کیا تو جان لو کہ ہم تمہارے تجارتی راستوں کو روک دیں گے"۔ یہ واقعہ سیرت النبیؐ میں موجود ہے۔ ان واقعات کی مدد سے حقائق کو سمجھنا ضروری ہے کہ کس طرح انقلاب محمدی ﷺ کا منہاج مختلف مراحل سے گزرا ہے ـــــ حقائق اور واقعات کو اس طرح سمجھنا چاہئے جیسے وہ پیش آئے اور ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان پر غور کرنا چاہئے۔

آنحضورؐ کے منہجِ عمل میں انسانی جدّوجہد کی اہمیت

انقلاب نبویؐ کے ضمن میں ایک حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس میں معجزوں کا دخل بہت کم نظر آتا ہے۔ سیرتِ مبارکہ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح نظر آئے گی کہ حضور ﷺ کے منہج عمل میں انسانی جدوجہد (Human Efforts)' محنت' کوشش' کشاکش' کشمکش' ایثار و قربانی' صبر و مصابرت اور جہاد و استقامت کے عناصر غالب نظر آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سارا عمل زمین پر قدم بقدم چل کر مصائب و شدائد جھیل کر' قربانیاں دے کر انجام دیا گیا ہے۔ انقلاب محمدیؐ کا یہ سارا راستہ اور فاصلہ انسانی سطح پر ان تمام مرحلوں سے گزر کر طے کیا گیا ہے جو ہر انقلابی عمل کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ نبی اکرم ﷺ کے بے شمار حسی معجزات' کرامات اور خرق عادت واقعات ہیں' حضورؐ کے دست مبارک سے متعدد بار عظیم ترین برکات کا ظہور ہوا ہے ـــــ لیکن اس انقلابی جدوجہد میں ان کا کتنا کچھ دخل ہے' اس اعتبار سے کبھی سوچیں اور اس نقطہ نظر سے سیرت مطہرہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ درحقیقت اس میں غالب ترین عنصر انسانی سطح کی جدوجہد کا ہے' جس میں مشکلات ہیں' مصائب ہیں' جور و ستم ہے' تعدی و ظلم ہے' شدائد ہیں۔ خود محبوب ربّ العالمین ﷺ کے لئے قید و بند اور معاشی مقاطعہ ہے' رحمۃ للعالمین ﷺ پر پتھروں کی بارش ہے' جس سے جسم اطہر سے اتنا خون بہا ہے کہ نعلین مبارک پیروں میں جم گئے ہیں۔ زخموں سے چور اور نڈھال ہو کر آپؐ طائف کی گلیوں میں کئی بار گرے ہیں اور ظالموں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پھر کھڑا کر دیا ہے اور

چلنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ سب کچھ خود محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا ہے، لیکن نہ دشمنوں کے ہاتھ شل ہوئے اور نہ وہ زمین میں دھنسائے گئے ــــــ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی بھی ہے اور یہ وہ کہ حضور ﷺ نے ان تمام مراحل سے گزر کر اللہ کا دین عرب پر غالب فرمایا، اب حضورؐ کی اُمت کو اللہ کا یہ دین پوری دنیا پر غالب کرنا ہے ــــــ تو اگر نبی اکرم ﷺ کی یہ جدّوجہد معجزوں کے ساتھ کامیاب اور غالب ہوئی ہوتی تو بعد والوں کے لئے بھی معجزے ہونے چاہئیں تھے، حالانکہ معجزہ صرف انبیاء و رُسل کے ساتھ مختص ہوتا ہے، اُمت کے لئے معجزات نہیں ہوتے۔ یہ بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد وہاں بھی آئی تھی اور جب کبھی بھی حضور ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کی جائے گی، اللہ کی غیبی مدد تب بھی ضرور آئے گی ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور نصرت کا دروازہ بند نہیں ہوا، لیکن معجزہ صرف انبیاء و رُسل کے لئے مختص ہوتا ہے۔ نبوت و رسالت کے اختتام کے ساتھ ہی معجزات کا سلسلہ بھی ختم ہوا، اب جو بھی کوشش اور جدوجہد کرنی ہوگی، وہ زمین پر قدم بقدم چل کر خالص انسانی سطح پر کرنی ہوگی۔ لہٰذا جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت پر یہ حجت قائم فرمادی کہ آپؐ نے بالکل انسانی سطح پر، زمین پر قدم بقدم چل کر، مصائب و شدائد جھیل کر اور ہر طرح کے موانعات سے نبرد آزما ہو کر جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی انقلاب برپا فرمادیا ــــــ بہرحال سعد بن معاذؓ کا مذکورہ بالا قول بھی پیش نظر رہنا چاہئے۔

عبداللہ بن اُبَی کی بدبختی

دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبَی خزرج کا بہت بڑا سردار تھا اور اوس و خزرج کے دونوں قبیلے باہمی مشاورت سے اسے مدینہ کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے لئے تاج بھی تیار ہو گیا تھا۔ اور یہی بات اس شخص کی بدبختی کا اصل سبب بن گئی کہ وہ منافقین کا سردار بن گیا، کیونکہ اس کی بادشاہت کا آئینہ نبی اکرم ﷺ کی مدینہ میں

تشریف آوری کے باعث چکنا چور ہو گیا۔ اب ان بے تاج بادشاہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورودِ مسعود کے بعد کسی کے باتاج بادشاہ بننے کی گنجائش کہاں رہی! وہ ایمان تو لے آیا' کیونکہ دونوں قبیلے ایمان لے آئے تھے' لیکن پہلے ہی دن سے اس کے دل میں نفاق کا بیج جو پڑا تو وہ پروان چڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کے پاس قریش کے خطوط آ رہے تھے کہ تم حضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھ مہاجرین کو مدینہ سے باہر نکالو' تم کھڑے ہو جاؤ' تمہیں اقدام کرنا چاہئے' ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم لشکر لے کر آنے کے لئے تیار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس کی ریشہ دوانیاں ابتدا ہی سے شروع ہو گئی تھیں۔ یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ آپؐ بنفس نفیس چل کر عبداللہ بن اُبی کے پاس تشریف لے گئے۔ حالانکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حضورؐ اس کو طلب فرماتے اور خود انتظار فرماتے ــــــ لیکن نہیں' معاملہ دین کا ہے۔ اس میں کسی کی کوئی ہیٹی نہیں ہو جاتی۔ بقول غالب ؏ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا ــــــ یہاں دربدر جانا پڑتا ہے ــــــ حضورؐ نے خالص دنیوی انداز اور دلیل سے اسے سمجھایا اور فرمایا : دیکھو اگر تم نے کوئی اقدام کیا تو کیا اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ کرو گے؟ حضورؐ اسے سمجھا رہے ہیں کہ تمہارا سارا قبیلہ ایمان لا چکا ہے۔ اگر تم نے اس طرح کی کوئی حرکت کی جو ہمارے علم میں آئی ہے تو اچھی طرح سوچ لو کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا! تمہیں اپنے بھائی بندوں کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی ــــــ اسی وجہ سے اسے کوئی عملی اقدام کرنے کی جرأت نہیں ہوئی' اگرچہ وہ ساری عمر سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرتا رہا' جیسے یہودی کرتے رہے' لیکن اسے کبھی بھی کھلم کھلا سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمّات

اب غزوۂ بدر سے قبل کی آٹھ مہمات کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ رمضان المبارک ۱ھ میں سب سے پہلا سریہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں بھیجا۔ یہ سریہ تیس مہاجرین پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر ساحل بحر تک پہنچ گیا۔ وہاں ابوجہل تین سو کی نفری کے ساتھ کوئی تجارتی قافلہ لے کر جا رہا تھا۔ وہاں دونوں کی

مڈبھیڑ ہو گئی۔ لیکن مجدی بن عمر جہنی ایک شخص تھا جس کا حضور ﷺ سے معاہدہ ہو چکا تھا' وہ بیچ میں پڑ گیا اور اس نے کوئی مسلح تصادم نہیں ہونے دیا۔ لہٰذا کوئی جنگ یا خونریزی نہیں ہوئی۔ ورنہ تیس صحابہ رضی اللہ عنہم کا تین سو مشرکینِ مکہ سے مقابلہ ہوتا۔ گویا ایک اور دس کی نسبت تھی۔ یہ پہلی مہم تھی جو حضورؐ نے رمضان سن ایک ہجری میں بھیجی تھی۔ یہ بات تاریخ کے حوالہ سے سامنے رکھئے۔ اس سریہ کے بارے میں تاریخ میں آیا ہے کہ پہلا جھنڈا جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بلند فرمایا وہ اس سریہ کے لئے تھا جو حضورؐ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا تھا۔

دوسری مہم ایک ماہ بعد ہی شوال ۱ھ میں حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مہاجرین کے ساتھ بھیجی گئی۔ اس کا بھی ابوسفیان کے ایک قافلہ کے ساتھ رابغ کے مقام پر آمنا سامنا ہو گیا اور ٹکراؤ کی نوبت آ گئی۔ رابغ بھی ساحل بحر پر ہے۔ (حج اور عمرہ کرنے والے حضرات اس مقام سے بخوبی واقف ہیں کیونکہ یہ مدینہ کے راستہ میں آتا ہے) بہرکیف اس موقع پر بھی جنگ نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ابھی تک کسی کی طرف سے بھی باقاعدہ اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ حضور ﷺ کا مقصد اصل میں یہ تھا کہ اپنی موجودگی ثابت کر دیں کہ اب یہ تجارتی راستہ تمہارے لئے پہلے کی طرح محفوظ و مامون نہیں ہے کہ بے کھٹکے گزرتے رہو' بلکہ یہ اب ہماری زد میں ہے۔ اس موقع پر پہلا تیر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے چلایا' اگرچہ اس سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ یہاں بھی بیچ بچاؤ ہو گیا اور باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

حضور ﷺ نے تیسرا سریہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیر سرکردگی ذی قعدہ میں بھیجا جو تیس مہاجر صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشتمل تھا۔ اس طرح حضور ﷺ مسلسل ہر ماہ ایک ایک مہم روانہ فرما رہے تھے۔ اس سریہ کے لئے حضور ﷺ نے ضرار کا مقام متعین فرمایا تھا۔ تاریخ میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرما دیا تھا کہ وہاں تک جاؤ' اس سے تجاوز نہ کرنا۔ ان مہموں کا مقصد در اصل قریش کے تجارتی راستوں پر اپنی موجودگی کا اعلان کرنا اور قریش کو ان راستوں کے مخدوش ہونے کی تشویش میں مبتلا کرنا تھا۔ حضورؐ کے یہ اقدامات قریش مکہ کی معیشت کے اعتبار سے نہایت نازک اور پریشان کن

(Critical and Cruical) تھے' کیونکہ ان کے شام کے لئے تجارتی قافلے ان راستوں سے گزرتے تھے۔

اس کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا جن میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ اس سلسلے کا پہلا سفر ۲ھ میں ہوا۔ بنوزمرہ کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا' وہاں حضورؐ نے قیام فرمایا۔ اس سفر کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اپنی موجودگی کا اظہار ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا اس قبیلہ کے ساتھ حلیف ہونے کا معاہدہ طے پا گیا۔ دوسرا سفر ربیع الاول یا ربیع الآخر میں ہوا (اس میں کچھ اختلاف ہے۔) اس میں غزوۂ بواط واقع ہوا' جس میں حضورؐ خود شریک تھے۔ سیرت کی کتابوں میں مقام کا نام اور مہینہ تو موجود ہے لیکن اس کی تفاصیل نہیں ملتیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ کے ایک نہایت اہم سفر کا ذکر کتب سیر میں غزوۂ عشیرہ کے عنوان سے ملتا ہے۔ حضورؐ کا یہ سفر قریباً دو ماہ پر محیط تھا۔ یعنی جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ ۲ھ ـــــــ اور حضورؐ نے یہ سفر اُس قافلے کو روکنے کے لئے اختیار فرمایا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کو جا رہا تھا۔ یہی وہ قافلہ ہے کہ جب واپس آ رہا تھا تو حضورؐ نے اس کو روکنے کا ارادہ فرمایا تو اس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر واقع ہو گیا ـــــــ اس قافلہ کا بھی ایک مخصوص تاریخی پس منظر ہے۔ حضورؐ کی ہجرت سے متصلاً قبل اور بعد مکہ سے مہاجرینؓ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ لیکن اکثر و بیشتر مہاجرین اپنے اہل و عیال کو ساتھ نہیں لا سکے تھے اور وہ مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔ اسی طرح ان کا ساز و سامان اور اثاثہ و سرمایہ بھی مکہ ہی میں رہ گیا تھا۔ اس کے بعد مشرکین مکہ نے دارالندوہ میں یہ طے کیا تھا کہ مہاجرین کی تمام چیزیں ضبط کر لی جائیں اور ان کی فروخت سے ایک بہت بڑا فنڈ قائم کیا جائے' اس تجارت سے ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تشکیل دیا جائے اور اس تجارت سے جو منافع ہو گا اس کو ہم مسلمانوں پر لشکر کشی کے لئے استعمال کریں گے۔ تو گویا یہ محض ایک تجارتی قافلہ نہیں تھا بلکہ آئندہ جو مسلح تصادم ہونے والا تھا اس کے لئے مالی ذرائع فراہم کرنا بھی اول روز سے اس قافلہ کی ترتیب و تشکیل میں پیش نظر تھا ـــــــ یہ خبر مدینہ پہنچ چکی تھی اور بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

حضور ﷺ سے درخواست بھی کی تھی کہ اب ہمیں جنگ کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ ہم جو ساز و سامان اور اثاثہ مکہ میں چھوڑ کر آئے تھے وہ سارے کا سارا قریش نے ضبط کرلیا ہے اور اس کے منافع سے جنگی تیاری ان کے پیش نظر ہے۔

بہرحال نبی اکرم ﷺ اس قافلے کے تعاقب کے لئے نکلے۔ حضورؐ کے ساتھ ڈیڑھ سو مہاجرین اور تیس اونٹ تھے۔ مجاہدین قافلہ کے تعاقب میں ینبوع تک پہنچ گئے۔ لیکن چند دنوں کا فصل پڑ گیا تھا اور قافلہ چند راتیں قبل شام کی طرف نکل چکا تھا' لہٰذا اس کا راستہ روکا نہیں جاسکا۔ البتہ نبی اکرم ﷺ نے وہاں قیام فرمایا اور وہاں آباد قبیلہ بنی مصطلق کے ساتھ مصالحت کی۔ طے یہ ہوا کہ قبیلہ بنی مصطلق کے لوگ غیر جانب دار رہیں گے' نہ تو قریش مکہ کے خلاف مسلمانوں کی مدد کریں گے نہ مسلمانوں کے خلاف قریش مکہ کی۔ یہ غزوہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کا بالواسطہ تعلق غزوۂ بدر سے جڑ جاتا ہے۔

غزوۂ بدر سے متصلاً قبل ایک غزوہ اور ہے جسے غزوۂ بدرِ اولیٰ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک شخص عرض بن شعری نے مسلمانوں پر اپنی ذاتی حیثیت سے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور مدینہ کے قرب و جوار میں لوٹ مار کی اور چند مویشی پکڑ کر لے گیا۔ اس میں قریش کا ہاتھ نہیں تھا۔ حضورؐ نے تعاقب کیا اور آپؐ بدر تک پہنچے' لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ حضورؐ اس سے آگے تشریف نہیں لے گئے اور مراجعت فرمائی۔ چونکہ یہ بھی حضورؐ کا ایک سفر ہے' طاقت اور نفری کے ساتھ' لہٰذا یہ بھی ان غزوات کی فہرست میں شامل ہے۔

مسلح تصادم کا آغاز : واقعۂ نخلہ

اس سلسلہ کا اہم ترین واقعہ نخلہ ہے' جس نے اصل میں مکہ میں آگ لگائی۔ یہ واقعہ سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نام سے سیرت کی کتب میں مذکور ہے۔ اس کا خاص معاملہ یہ ہے کہ حضورؐ نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو ایک بند خط دیا اور فرمادیا کہ مکہ کی طرف جاؤ' اور جب مدینہ سے دو دن کی مسافت طے کرلو تب یہ خط کھولنا' پھر اس میں دیکھنا کہ کیا لکھا ہے' اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا ـــــــ اب آپ اندازہ کیجئے کہ راز

داری (Secrecy) کس درجہ کی ہے! حضورؐ نے اس کو اس درجہ مخفی رکھا ہے کہ خود کمانڈر کو معلوم نہیں ہے کہ وہ مہم کیا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے! بعض روایات میں بارہ صحابہ اور بعض میں آٹھ کی تعداد کا ذکر آتا ہے جو حضرت عبداللہ بن جحشؓ کے ساتھ تھے۔ مدینہ سے دو دن کی مسافت کے بعد انہوں نے خط کھولا تو اس میں ہدایت تھی کہ وادیٔ نخلہ [۱] پہنچو۔ یہ وادیٔ نخلہ کہاں ہے؟ اب ذرا جغرافیہ کو ذہن میں لایئے۔ مکہ جنوب میں ہے' مدینہ شمال میں اور طائف مکہ سے جنوب مشرق میں ہے۔ مدینہ سے وہاں کا فاصلہ کم از کم تین سو میل کا ہے۔ یہاں مہم بھیجنا بغیر کسی اہم منصوبہ کے اور بغیر کسی سوچ سمجھے اقدام کے ممکن نہیں تھا' یہ تمام کارروائی بلا سبب نہیں تھی۔ تو حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو حکم ہوا کہ مکہ اور طائف کے درمیان جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کرو اور قریش کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھو اور ہمیں اس کے بارے میں اطلاعات دیتے رہو۔ یمن کی طرف جانے والے قریش کے قافلے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یمن کا راستہ طائف سے ہو کر گزرتا ہے اور وادیٔ نخلہ طائف اور مکہ کے درمیان واقع ہے۔ جو قافلے شام کو جاتے تھے ان کے راستوں کے متعلق سات مہمات آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں' جو ان راستوں میں اپنی موجودگی ثابت کرنے اور ان کو مخدوش بنانے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ لیکن یہ مہم اس راستہ کے لئے تھی جو طائف سے ہو کر یمن جاتا تھا۔ تو حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو ہدایت کی گئی کہ وادیٔ نخلہ میں جا کر قیام کرو اور قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور ہمیں ان کے بارے میں اطلاعات دیتے رہو۔

حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے جب خط پڑھا تو چونکہ مہم بڑی سخت اور کڑی آپڑی تھی لہٰذا آپؓ نے اپنے ساتھیوں پر واضح کر دیا کہ میں تو جاؤں گا' اس لئے کہ حضورؐ کا حکم ہے' لیکن تم میں سے جو میرا ساتھ دینا چاہے دے' میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن ان سب نے کہا جو حضورؐ کا حکم ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ ان سب نے جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں ایک مختصر سا قافلہ آگیا' جس میں قریش کے کل پانچ افراد شامل تھے' اگرچہ

{۱} وادیٔ نخلہ وہ وادی ہے جہاں ۱۰ نبوی میں سفر طائف سے واپس آتے ہوئے آپؐ نے فجر کی نماز پڑھی۔ اُس وقت جنوں کا ایک گروہ وہاں سے گزرا اور قرآن سن کر ایمان لے آیا۔

وہ سبھی بڑے اونچے گھرانوں کے لوگ تھے۔ متعدد اونٹوں پر لدا ہوا کافی سامان تجارت انکے ساتھ تھا جو وہ طائف سے مکہ لے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ جب وہاں سے گزرا تو مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہم کیا کریں۔ اگرچہ حضورؐ کے خط میں صراحت نہیں تھی کہ حملہ کیا جائے' لیکن ان کی رائے یہ بنی کہ ہمیں حملہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ مقابلہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ والوں میں سے ایک شخص جس کا نام عمرو بن عبداللہ الحضرمی بیان کیا گیا ہے' وہاں قتل ہو گیا۔ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ اگرچہ حضرموت کا رہنے والا تھا لیکن مکہ میں امیہ بن حرب (ابو سفیان کے والد) کا حلیف تھا اور وہاں حلیف کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس تجارتی قافلے میں مغیرہ کے دو پوتے اور ایک آزاد کردہ غلام شامل تھے۔ مغیرہ کے خاندان کا شمار قریش کے چوٹی کے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ بہرکیف مقابلہ کے نتیجہ میں عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ دو افراد جان بچا کر فرار ہو گئے اور بقایا دو کو انہوں نے قیدی بنالیا۔ ان دو قیدیوں اور جو بھی مال غنیمت ہاتھ لگا اس کو لے کر یہ حضرات مدینہ واپس آ گئے۔

اس واقعہ کے متعلق ہمیں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ نے حضرت عبداللہ بن جحش پر کوئی عتاب نہیں فرمایا۔ آپؐ نے مال غنیمت میں سے خُمس بھی قبول فرمالیا۔ جو دو قیدی تھے' ان کا فدیہ قبول کر کے انہیں آزاد فرمادیا۔ ان میں سے ایک قیدی حکم بن کیسان رضی اللہ عنہ وہیں مسلمان ہو گئے۔ مغیرہ کے پوتوں میں سے ایک بھاگ گیا تھا۔ دوسرا جو قید ہوا تھا' فدیہ دے کر چلا گیا۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں رضی اللہ عنہم کو نہ کوئی سرزنش فرمائی اور نہ ہی کوئی وضاحت طلب فرمائی کہ تم نے میرے حکم سے تجاوز کیوں کیا؟ (یہ ایک روایت ہے جسے محمد بن عبدالوہابؒ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے) ـــــ دوسری روایت جو بہت سی کتابوں میں بیان کی گئی ہے' یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا' مال غنیمت قبول نہیں فرمایا' بلکہ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں حملہ کی اجازت نہیں دی تھی' میری ہدایت صرف یہ تھی کہ وہاں قیام کرو' قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور اس کی ہمیں اطلاع دیتے رہو۔ یہ اقدام تم نے خود کیا ہے۔

اس میں ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا تھا' وہ یہ کہ وہ رجب کی آخری تاریخ تھی اور رجب کا مہینہ اشہرِ حُرم میں شامل ہے۔ یعنی ان چار مہینوں میں سے ایک ہے جن میں مشرک و کافر بھی جنگ نہیں کرتے تھے ــــــ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مہم کے ارکان نے مشورہ کیا کہ ہمارے سامنے دو متبادل صورتیں ہیں۔ اگر ہم قافلہ کو چھوڑ دیتے ہیں تو رجب کی حرمت تو بچ جائے گی لیکن پھر یہ حدودِ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور وہاں ان پر حملہ ممکن نہ ہو گا۔ ہم دو حرمتوں کے مابین آ گئے ہیں۔ رجب کی آخری تاریخ تھی۔ رات شروع ہوئی تو رجب بھی ختم اور اشہرِ حُرم بھی ختم ــــــ بہرحال ان کا مشورہ یہ ہوا کہ جنگ کی جائے اور جنگ کا نتیجہ وہ نکلا جو اوپر بیان ہوا۔

اس پوری صورت حال پر غور کرنے کے بعد امکانی نتیجہ یہ ہے کہ اگر حضور ﷺ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا تب بھی یہ بات مسلّم ہے کہ انہیں کوئی سزا نہیں دی۔ کیونکہ صورت حال (Situation) ایسی بن گئی تھی کہ اس میں اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے ہاتھ بندھے رکھتے تو ہو سکتا تھا کہ سب شہید ہو جاتے۔ اس لئے کہ مڈبھیڑ ہوئی ہے' آمنا سامنا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔ واقعہ کی تفاصیل تو نہیں مل سکیں۔ اللہ کرے کہ کچھ باحوصلہ حضرات کمرِ ہمت کس لیں اور متقدمین کی جو بہت سی مستند کتب سیرت موجود ہیں' ان کا تحقیقی مطالعہ کریں اور اس واقعہ کی تفاصیل کو جمع کریں' کیونکہ یہ بہت اہم واقعہ ہے۔

اب یہ جان لیجئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا! مکہ میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں گویا آگ لگ گئی۔ اس لئے کہ صورت واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد پہلا عَلم محمد ﷺ نے بلند فرمایا ــــــ پہلا تیر محمد ﷺ کے جان نثار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے چلا ــــــ اور اب پہلا قتل بھی اصحابِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہم) کے ہاتھوں سے ہو گیا۔ حضورؐ نے حکم دیا تھا یا نہیں' بہرحال بالفعل یہ کام حضورؐ کے آدمیوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اس کی ذمہ داری تو یقیناً آئے گی۔ جماعتی سطح پر تو یہی ہوتا ہے کہ جماعت کا کوئی فرد جب کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری جماعت کے قائد پر آتی ہے۔ یا پھر یہ ہوتا کہ حضورؐ اس سے بالکلیہ براءت کا اظہار فرماتے یا اقدام کرنے والوں

کو سزا دیتے اور مشرکین کے نقصان کی تلافی فرماتے۔ لیکن ایسی کوئی شکل حضورؐ نے اختیار نہیں فرمائی۔ گویا آپؐ نے اپنے اصحابؓ کے اس اقدام کو قبول (Own) فرمالیا ـــــ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ میں چیخ وپکار شروع ہو گئی کہ قتل کا بدلہ قتل' خون کا بدلہ خون! ـــــ مکہ میں جو آگ لگی ہوئی تھی اُس کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ کسی قبائلی معاشرے میں یہ معاملہ کس قدر جذباتی اور اہم ہوتا ہے۔

ایک طرف مکہ میں ہیجان خیز صورت حال تھی' دوسری طرف ابوسفیان کے قافلہ کی واپسی کا وقت آ گیا۔ وہی قافلہ جسے غزوۂ عشیرہ کے موقع پر حضورؐ نے روکنے (intercept کرنے) کی کوشش فرمائی تھی مال واسباب سے لدا پھندا واپس آ رہا تھا۔ تو ابوسفیان کی طرف سے مکہ میں یہ ہنگامی پیغام (S.O.S.Call) پہنچ گیا کہ مجھے خطرہ ہے محمد (ﷺ) کے ساتھیوں سے کہ وہ ہمارے قافلہ کو لوٹ لیں گے۔ لہٰذا مجھے فوراً کمک پہنچائی جائے اور قافلہ کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے ـــــ یہ دونوں باتیں تھیں کہ جن کی بنا پر مکہ میں وہ لوگ جو جنگجو' جوشیلے اور مشتعل مزاج (Hawks) تھے وہ قابو سے باہر ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک دلیل آ گئی تھی۔ اس طرح کے نمایاں اشخاص ابوجہل اور ابوسفیان تھے ـــــ اس کے ساتھ ساتھ مکہ میں ٹھنڈے مزاج' بردبار طبیعت کے حامل اور شریف النفس لوگ (یعنی Doves) بھی موجود تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ خانہ جنگی ہو۔ ان میں نمایاں شخصیتیں عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام کی تھیں۔ آخر الذکر تو بعد میں ایمان لے آئے' جلیل القدر صحابی ہیں' رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ان کی پھوپھی تھیں' اور اس رشتہ سے حضور ﷺ ان کے پھوپھا ہوئے۔ عتبہ بن ربیعہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس نے ہجرت کے بعد قریش سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب تم محمد (ﷺ) کے خلاف کوئی اقدام مت کرو' اب انہیں عرب کے حوالے کر دو۔ اب ان کا عرب سے ٹکراؤ ہو گا' ہم تو بس تماشا دیکھیں گے۔ اگر محمد (ﷺ) جیت جاتے ہیں اور پورے عرب پر ان کا قبضہ و تسلط ہو جاتا ہے تو ہماری ہی جیت ہے۔ آخر وہ قرشی ہیں۔ وہ ہمارے ہی آدمی ہیں ـــــ وہ بڑا دور اندیش' سیاست دان اور مدبر آدمی تھا۔ اس نے مزید کہا کہ "اگر عرب محمد (ﷺ) کو ہلاک کر دیں تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تمہیں

اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے نہیں پڑیں گے"۔ اِس قدر دُور اندیشی کا مشورہ تھا جو عتبہ نے دیا تھا۔ تو عتبہ اور حکیم بن حزام آپس کی خونریزی سے بچنا چاہتے تھے۔ دوسری جانب ابوجہل Hawks کا چیف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فوری اقدام کیا جائے ـــــ اب جب یہ صورت حال پیش آگئی تو یوں سمجھئے کہ ان کے جوشیلے اور جنگ پسند لوگوں کو تقویت حاصل ہوگئی کہ ایک تو ہمارا آدمی عمرو بن عبداللہ الحضرمی وادیٔ نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لہٰذا خون کا بدلہ خون ہوگا اور دوسری طرف ہمارے تجارتی قافلہ کو شدید خطرہ درپیش ہے۔ لہٰذا ان بہانوں سے ایک ہزار جنگجوؤں کا کیل کانٹے سے لیس لشکر مکّہ سے مدینہ روانہ ہوا' جس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر ہوا۔ یہ غزوہ انقلابِ محمّدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا نقطۂ آغاز ہے۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات!!!

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان ذُوالنُّورَین رضی اللہ عنہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

(تیسری قسط)

شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا تاریخی پس منظر

اب ہم شہید مظلوم حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تاریخی پس منظر اور ان اسباب و علل کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں جن کے نتیجے میں یہ سانحہ فاجعہ ظہور پذیر ہوا۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ ہر واقعہ کے کچھ اسباب ظاہری ہوتے ہیں اور کچھ باطنی اور مخفی۔ اور دراصل مؤثر کردار یہ باطنی و مخفی اسباب ہی ادا کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر ظاہری اسباب نظروں کے سامنے ہوتے ہیں لہٰذا ان مخفی اسباب کی طرف توجہ بہت کم مبذول ہوتی ہے بلکہ وہ نظر ہی نہیں آتے۔ آپ تاریخی اعتبار سے اس پر غور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کامیاب فرمایا' آپؐ کو غلبہ عنایت کیا اور آپؐ کے مشن ﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں تکمیل ہوگئی اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے مشن اور اسلام کے پیغام کو لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین باہر نکلے تو جو لوگ مفتوح ہوئے اور جن لوگوں نے شکست کھائی' غور کیجئے کہ وہ کون کون لوگ تھے! یہ دو بڑے بڑے گروہ تھے —— پہلا وہ جس نے مذہبی طور پر اور دوسرا وہ جس نے سیاسی طور پر شکست کھائی۔

مذہبی گروہ میں سے مشرکین عرب کا تو تیاپانچا کردیا گیا۔ ان کے حق میں تو سورۃ التوبہ کی وہ آیات نازل ہوگئیں کہ ان مشرکوں کو چار مہینے کی مہلت ہے' اگر اس کے اندر یہ

ایمان لے آئیں تو اس سرزمین میں رہ سکتے ہیں' اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اگر یہ مشرکین اس چار ماہ کی مہلت سے فائدہ نہ اٹھائیں' یعنی نہ ایمان لے آئیں' نہ ترکِ وطن کریں تو تم ان کو جہاں بھی پاؤ قتل کرو :

﴿ فَإِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ﴾

"پس جب محترم مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ' اور انہیں پکڑو اور گھیرو' اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو!"

اِن آیات نے فیصلہ کر دیا کہ مشرکین عرب کے ساتھ کوئی رُو رعایت اور کوئی نرمی کا معاملہ نہیں ہو گا۔ اب شرک پر ڈٹے رہنے کے سبب سے ان کو تہ تیغ کر دیا جائے گا اور ان پر عذابِ استیصال کی سُنّت اللہ پوری ہو گی' جو اُن قوموں کے لئے مقرر ہے جن کی طرف رسول براہ راست مبعوث کئے جاتے ہیں۔ اور حضور ﷺ ان ہی میں سے اٹھائے گئے تھے اور حضورؐ کی دعوت کے اولین مخاطب یہی لوگ تھے ــــــ لیکن یہود و نصاریٰ کو ایک رخصت دی گئی کہ تم اپنے دین پر قائم رہ سکتے ہو' البتہ تمہیں چھوٹا بن کر اور مغلوب بن کر رہنا ہو گا اور جزیہ ادا کرنا ہو گا :

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ ﴾

"جنگ کرو اہل کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے ہو کر رہیں"۔

یہ رعایت تھی جو اہل کتاب کے ساتھ اسلام نے کی۔ اس رعایت سے اہل کتاب بالخصوص یہود نے غلط فائدہ اٹھایا۔ ان میں جوشِ انتقام پہلے ہی سے موجود تھا' ان کی مذہبی سیادت ختم ہو چکی تھی اور ان کے نام نہاد تقویٰ کا بھرم کھل چکا تھا۔ ان کی حیثیت عرب میں بالکلیہ

مغلوب اور ذمی کی ہو گئی تھی' جس پر جزیہ کی ادائیگی ان کے لئے بڑی شاق تھی۔

اہل کتاب کے ساتھ قرآن مجید میں جو معاملہ کیا گیا ہے' اس کے بھی دو رُخ ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوت میں جزیرہ نمائے عرب میں جو نصاریٰ تھے' ان کی قرآن نے کہیں کہیں تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ ان میں خدا ترس لوگ موجود تھے' ان میں قبولِ حق کی استعداد تھی۔ پھر نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں نصاریٰ سے کوئی مسلح تصادم اور معرکہ بھی پیش نہیں آیا۔ جبکہ یہود کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان پر قرآن میں بڑی شدید تنقیدیں ہوئی ہیں۔ سورۃ البقرہ کے دس رکوعات میں (چوتھے رکوع سے چودھویں رکوع تک) مسلسل ایک قراردادِ جرم ہے جو یہودیوں پر عائد کی گئی ہے۔ پھر ان کے تین قبیلوں کو مدینہ سے نکالا گیا۔ ایک قبیلے کی تعدّی و سرکشی اور بدعہدی کی وجہ سے خود ان کے مقرر کردہ حَکم کے فیصلے کے مطابق ان کے جنگ کے قابل تمام مَردوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ پھر خیبر' جو ان کا مضبوط ترین گڑھ تھا' جہاں مستحکم قلعہ بندیاں تھیں' اور جہاں مدینہ سے نکلے ہوئے تمام یہودی جمع تھے اور وہ ہر طرح کیل کانٹے سے لیس تھے' وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔ لہٰذا سب سے زیادہ زخم خوردہ یہود تھے۔ عیسائی بھی زخم خوردہ تھے لیکن ان کا معاملہ اتنا شدید نہیں تھا جتنا یہودیوں کا تھا۔ لہٰذا انتقام کے لئے سب سے پہلے یہودیوں نے ریشہ دوانیاں اور سازشیں کیں۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جتنا عظیم سازشی ذہن اس قوم کا ہے اور اس میں اس کو جو مہارتِ تامّہ حاصل ہے اس کا کوئی دوسری قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندوؤں کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم بھی بڑا سازشی ذہن رکھتی ہے' تو جدید تحقیق یہ ہے کہ ہندو قوم بھی نسلی اعتبار سے یہودی ہے اور یہ قوم یہودیوں کے گم شدہ قبائل (Lost Tribes of Israil) سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا یہود و ہنود میں جہاں قافیہ ایک ہے وہاں مزاجی کیفیت میں بھی بڑی یکسانیت ہے۔

یہ یہودی سازشی ذہن ہی کا شاخسانہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کے چشمۂ صافی میں سب سے زیادہ گھناؤنا اور عریاں ترین شرک شامل کر دیا گیا اور اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوری اُمت کو بدترین شرک میں مبتلا کر دیا گیا۔ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام

کو باقاعدہ اللہ کا صُلبی بیٹا قرار دے دیا گیا اور ان کو الوہیت میں شریک ٹھہرایا گیا۔ پھر روح القدس کو، جس سے بعض فرقوں کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں اور بعض کے نزدیک حضرت مریم، اقانیم ثلاثہ میں شامل کر کے اس طرح تثلیث کا عقیدہ گھڑا گیا۔ یہ کام اُس انتہائی متعصب یہودی نے انجام دیا جو کہ سینٹ پال کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ اُس نے بظاہر عیسائیت قبول کی اور پھر دین عیسوی کے بخئے ادھیڑ دیئے۔ اسی سازشی ذہن کا پیکرِ کامل یمن کا ایک یہودی عبد اللہ بن سبا تھا، جو بظاہر مسلمان ہوا اور اُس نے مسلمانوں میں شامل ہو کر سازشی ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ اس شخص نے اہل بیت کی محبت کا جھوٹا لیکن دلفریب لبادہ اوڑھ کر مفتوحہ علاقوں کے نو مسلموں میں اپنے کارکنوں کے ذریعے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مہم شروع کر دی اور ان سیدھے سادے نومسلم عوام کی عقیدتوں کا رُخ شخصیت پرستی کی طرف موڑ دیا۔

دوسری جانب سیاسی اعتبار سے دیکھئے، جب اسلام کو عروج حاصل ہوا تو دنیا میں دو عظیم مملکتیں تھیں، ایک سلطنتِ روما، جو تین براعظموں تک وسیع تھی اور یورپ کے اکثر ممالک، مغربی ایشیا کے چند علاقے اور شمالی افریقہ کے تقریباً تمام ممالک قیصر روم کے زیر نگیں یا باج گزار تھے۔ دوسری عظیم سلطنت کسریٰ کی تھی، یعنی ایران۔ خلافتِ راشدہ خصوصاً دورِ فاروقی میں سلطنتِ کسریٰ کی دھجیاں اُڑ گئیں، بلکہ اس کا تو وجود ہی صفحۂ ہستی سے محو ہو گیا۔ یہ نتیجہ تھا اُس گستاخی کا جو خسرو پرویز نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامۂ مبارک کے ساتھ کی تھی، جس کے ذریعے اس کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ حضورؐ نے تو اُسی وقت فرما دیا تھا کہ کسریٰ نے میرا نامہ چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس گستاخی کی اسے نقد سزا تو یہ ملی کہ اسی وقت سے ایران میں محلاتی سازشوں نے سر اٹھایا جن کے نتیجے میں خسرو پرویز قتل ہوا اور یکے بعد دیگرے مختلف افراد تختِ کسریٰ پر متمکن ہوئے ـــــ جبکہ سلطنت روما کی تو صرف ایک ٹانگ ٹوٹی۔ اس کے صرف مغربی ایشیا کے مقبوضات اور شمالی افریقہ میں سے صرف مصر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام کے پرچم تلے آئے۔ یورپ کے جو ممالک قیصر روم کے قبضے میں تھے وہ جوں کے توں باقی رہے اور سلطنتِ روما کی سطوت کافی بڑی حد تک باقی رہی۔ شمالی افریقہ

کے دوسرے مقبوضات دورِ عثمانی میں اسلامی مملکت کے زیرِ نگیں آئے ـــــ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ سلطنت کسریٰ کی تو دورِ فاروقی میں دھجیاں اُڑ گئیں' اس کا تو وجود ہی باقی نہیں رہا ـــــ لہٰذا جہاں تک انتقامی جذبات کا معاملہ ہے تو وہ سب سے زیادہ شدید ایرانیوں کے اندر موجزن تھے۔ اسی سے آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایرانیوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اتنا بغض کیوں ہے! اسی کا مظہر ہے کہ ایران میں جیسے دوسرے اکابر اور اہل بیت کے مقبروں کی شبیہیں اور تصویریں بطور تقدیس چھپتی اور گھروں میں لگائی جاتی ہیں' اسی طرح اُس بدبخت ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کی شبیہیں اور تصویریں فروخت ہوتی ہیں جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسی جلیل القدر شخصیت' خلیفہ راشد اور امیرالمومنین کا قاتل تھا' اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے نیچے یہ عبارت لکھی ہوتی ہے : "قبر مبارک حضرت ابولولو فیروز" ـــــ اِنَّا للّٰہ وِاِنَّا الیہ راجعون۔ اس ناہنجار مجوسی کی قبر کی تقدیس اور اس کے نام کی توقیر صرف اس لئے کہ اس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مبارکہ کا چراغ بجھایا تھا' جو ایران کے حقیقی فاتح تھے۔

اب آپ غور کیجئے کہ اسلام کے خلاف دو طرفہ سازشیں شروع ہوئیں۔ ایک جانب یہودیوں کی طرف سے جو مذہبی سیادت کے لحاظ سے زخم خوردہ تھے اور دوسری جانب ان مجوسیوں کی طرف سے جو چاہے بظاہر مسلمان ہو گئے ہوں لیکن جو سلطنتِ کسریٰ کے پرخچے اڑ جانے کی وجہ سے شکست خوردہ تھے اور آتش انتقام میں جل رہے تھے۔ نتیجتاً مذہبی اعتبار سے انتقام کے سب سے زیادہ شدید جذبات یہودیوں میں تھے اور سیاسی اعتبار سے سب سے زیادہ انتقام کے جذبات ایرانیوں میں تھے۔ یہ دونوں ہی چاہتے تھے کہ اللہ کے دین کے چراغ کو اپنی ریشہ دوانیوں' سازشوں اور افواہوں سے بجھا دیں۔

اس انتقام کی پہلی کڑی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت تھی' اور اس کے ذریعے خلافتِ اسلامی کو سبوتاژ کرنا مقصود تھا' لیکن اسلام کے دشمنوں کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد حالات پر پوری طرح قابو پالیا' بلکہ داخلی امن و امان اور استحکام کے ساتھ تمام شورشیں اور بغاوتیں نہ صرف فرو کر ڈالیں بلکہ فتوحات کا دائرہ وسیع تر ہونے لگا تو اب یہودی سازشی

ذہن اور آگے بڑھا اور اُس نے اپنی وہ خفیہ کارروائیاں تیز کر دیں جن کی داغ بیل عبداللہ بن سبا دورِ صدیقی میں ڈال چکا تھا۔ اس سازشی کام کے لئے اس کو ایران کی زمین سب سے زیادہ سازگار نظر آئی۔ یہاں وہ عنصر بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھا جو بظاہر مسلمان لیکن ذہناً مجوسی اور شاہ پرست تھا اور انتقام کی آگ میں جل رہا تھا' اور وہ سیدھے سادے عوام بھی موجود تھے جن کی گھٹی میں شخصیت پرستی اور ہیرو ورشپ (Heroworship) پڑی ہوئی تھی اور جو ہر بڑے اور ہر مقدس شخص کے اہل بیت کو بھی بڑا اور مقدس سمجھنے کے صدیوں سے خوگر تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن سبا کی سازش پال کی سازش سے کم نہیں تھی۔ لیکن اسلام اللہ کا آخری دین ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی و رسول ہیں' اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہدایت ہے' جسے اللہ نے محفوظ رکھنے کی خود ذمہ داری لی ہوئی ہے : ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ اللہ کی طرف سے ﴿وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ﴾ کا اٹل فیصلہ ہو چکا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت کو مسخ کیا گیا اور دین کا حلیہ بگاڑ دیا گیا تو قرآن نے آ کر تصحیح کر دی اور دین حق مبرہن ہو گیا۔ اگر حضور ﷺ کی شخصیت کو اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کو مسخ کر دیا جاتا تو پھر کون تھا جو اس کی تصحیح کرتا؟ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور ختم المرسلین ہیں لہٰذا حضورؐ کی شخصیت' دین اسلام اور قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی تحفظ عطا ہوا۔ نیز اُمتِ مسلمہ کو یہ فضیلت بھی عطا ہوئی کہ اُمت کے علمائے حق کا مقام حضور ﷺ کے ارشادِ گرامی کے مطابق انبیائے بنی اسرائیل کے مطابق قرار پایا۔ مزید برآں حضورؐ نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ میری اُمت کا ایک گروہ ہر دَور میں حق پر قائم رہے گا ـــــ لہٰذا یہ سازش بالکلیہ کامیاب نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سازش کے وہ گندے اور نجس انڈے بچے تھے جن کے ہاتھوں خلیفۂ ثالث عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور علوی خلافت کا پورا دَور فتنہ و فساد اور خانہ جنگی کی نذر ہو گیا اور اس دَور میں چوراسی ہزار مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں سے شہید ہوئے۔ یہ درحقیقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کا خمیازہ تھا۔ جب کسی حقیقی بندۂ مومن کو ستایا جاتا ہے' جب کسی مؤمن

صادق کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے' جب کسی اللہ والے کے دل کو دکھایا جاتا ہے' جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی محبوب کا ناحق خون بہایا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا غیظ و غضب بھڑکتا ہے اور مختلف صورتوں میں عذابِ الٰہی کا ظہور ہوتا ہے' جس کی ایک بڑی المناک صورت آپس کی خانہ جنگی اور خون ریزی ہوتی ہے' جو ہمیں دورِ علوی میں نظر آتی ہے۔

مظلوم ترین شہادت

اسلام کی تاریخ قربانیوں اور شہادتوں سے بھری پڑی ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ "شہیدِ مظلوم" حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس سے قبل مسلمان کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے' انفرادی طور پر بھی اور میدانِ قتال میں بھی' جہاں انہوں نے کفار کو قتل بھی کیا اور خود شہادت کے مرتبہ عالیہ سے سرفراز بھی ہوئے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وہ پہلے مردِ صالح ہیں جو امامِ وقت' خلیفۂ راشد اور امیر المومنین ہوتے ہوئے خود مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ آپؓ محبوبِ رسولِ خدا ہیں' اور محبوب بھی کیسے کہ جن کے حبالۂ نکاح میں یکے بعد دیگرے حضور ﷺ کی دو صاحبزادیاں آئیں ___ جن کے حسن سلوک سے نبی اکرم ﷺ اتنے خوش تھے کہ یکے بعد دیگرے اپنی چالیس بیٹیاں آپ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دینے کے لئے راضی تھے اور جن کے متعلق حضورؐ نے یہ بشارت دی تھی کہ ((لِکُلِّ نَبِیٍّ رَفِیْقٌ وَرَفِیْقِی یعنی فِی الْجَنَّةِ عُثْمَان)) (ترمذی) یعنی "جنت میں ہر نبی کے ساتھ اس کی اُمت سے ایک رفیق ہوگا اور عثمان (رضی اللہ عنہ) میرے رفیق ہیں' وہ جنت میں میرے ساتھ ہوں گے۔"

وہ بزرگ ہستی انتہائی مظلومیت کی حالت میں قتل ہوئی جو کاتبِ وحی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "بخدا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس بیٹھے ہوتے اور حضورؐ پر اس حال میں وحی نازل ہوتی کہ حضورؐ اپنی پشت سے مجھ پر سہارا لگائے ہوئے ہوتے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرماتے کہ لکھو"۔ چنانچہ کتب سیر میں منقول ہے کہ جب باغیوں کے حملہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا داہنا ہاتھ کاٹا گیا تو آپؓ

نے فرمایا : "یہ وہی ہاتھ ہے جس نے سورِ مفصل کو لکھا تھا" ــــ وہ مبارک شخصیت حالت محصوری میں شہید کی گئی جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اُمت پر یہ احسان فرمایا کہ پوری اُمت کو ایک مصحف پر مجتمع اور متفق کر دیا۔ آج ہم جس قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں وہ اُمت تک بہ کمال و تمام صحت کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی بدولت منتقل ہوا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ آرمینیا اور آذربائیجان کی فتح کے بعد (جو دَورِ عثمانی میں ہوئی تھی) مدینہ تشریف لائے تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عراق و شام میں قراء تِ قرآن کے اندر مسلمانوں کے اختلاف کا ذکر بڑی تشویش کے ساتھ کیا اور کہا "یا امیرالمومنین! یہود و نصاریٰ کی طرح کتاب اللہ میں اختلاف ہونے سے پہلے اس کا تدارک کر لیجیے۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُم المومنین حضرت حفصہ بنتِ عمرفاروق رضی اللہ عنہا سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دَور میں جمع کیا ہوا مصحف منگوا بھیجا اور آپ رضی اللہ عنہ نے اس مصحف کو قریش کی زبان کے موافق لکھوایا' اس لئے کہ قریش کی زبان ہی میں قرآن حکیم نازل ہوا تھا' اور اس مصحف کی نقول تمام بلادِ اسلامیہ میں بھیج دیں۔

وہ معتمد شخصیت مظلومانہ طور پر شہید کی گئی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو' صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اور عمرفاروق رضی اللہ عنہ کو کامل اعتماد تھا اور جو ہر نازک موقع پر مشوروں میں شریک رہے۔ یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ مرض الموت میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے جانشین کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے وصیت لکھوا رہے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لکھوانے سے قبل آپؓ پر غشی طاری ہو گئی' لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا۔ جب غشی دُور ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا "پڑھیے کیا لکھا ہے"۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام سنا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور بہت دعائیں دیں اور کہا "آپ نے عمر کا نام اس لئے لکھ دیا کہ مبادا اس غشی میں میری جان چلی جائے۔"

جنت کے بشارت یافتہ اُس امام وقت کا خونِ ناحق بہایا گیا جن سے احادیث کی معتبر کتابوں میں ایک سو چالیس حدیثیں مروی ہیں' جن میں وہ مشہور حدیث بھی ہے جو صحیح بخاری میں موجود ہے اور ہماری دعوت رجوع الی القرآن میں رہنما اصول کے طور پر

شامل ہے کہ :((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ)) "تم میں بہترین وہ ہے جس نے خود قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا"۔ آپ کو معلوم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری دی ہے کہ جس مؤمنِ صالح نے چالیس حدیثیں یاد کرلیں تو وہ قیامت کے روز علماء کے زمرے میں اٹھایا جائے گا' تو جن کو ایک سو چالیس احادیث نہ صرف یاد ہوں بلکہ انہوں نے آنحضور ﷺ سے سن کر روایت کی ہوں' ان کے مرتبے اور مقام علو کا کیا کہنا!

اُس عالی مقام بزرگ کو شہید کیا گیا جس سے خدا بھی راضی تھا اور رسول اللہ ﷺ بھی راضی تھے۔ چنانچہ مستدرک حاکم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "ایک دن حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میرا شوہر بہتر ہے یا فاطمہ رضی اللہ عنہا کا؟ حضورؐ نے کچھ دیر سکوت فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ "تمہارا شوہر اُن لوگوں میں سے ہے جو خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتے ہیں اور خدا اور رسولؐ ان کو دوست رکھتا ہے" ـــــ پھر حضور ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :"میں تم سے اس سے بھی زیادہ بیان کرتا ہوں' وہ یہ کہ میں (معراج میں) جب جنت میں داخل ہوا اور عثمان کا مکان دیکھا تو اپنے صحابہ میں سے کسی کا ایسا نہیں دیکھا' ان کا مکان سب سے بلند تھا"۔ اس روایت کے ساتھ ہی ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ :"میں کہتا ہوں کہ یہ بلوے پر صبر کرنے کا ثواب ہے"۔

شہادت سے قبل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تقریباً پچاس دن محاصرے کی حالت میں رہے اور اس دوران بلوائیوں نے پانی کا ایک مشکیزہ تک امامِ وقت کے گھر میں پہنچنے نہیں دیا۔ ان مفسدین کی شقاوتِ قلبی دیکھئے کہ اس شخص پر پانی بند کردیا گیا جس نے اپنی جیب خاص سے بئر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ دگرگوں حالات کے باعث اُم المومنین حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس لوگوں کی وہ امانتیں لینے جانا چاہتی تھیں جو آپ کے پاس محفوظ تھیں اور اُم المومنین رضی اللہ عنہا نے پانی کا ایک مشکیزہ بھی ساتھ لے لیا' لیکن باغیوں نے نیزوں کے پھلوں سے مشکیزے میں چھید کردیئے' اُم المومنین رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی کی اور ان کو اندر نہیں جانے دیا۔

یہی واقعہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ان دونوں صاحبزادوں کے ہاتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پانی کی ایک مشک بھیجی۔ ان کا خیال تھا کہ بلوائی کم از کم حسنین رضی اللہ عنہما کا تو لحاظ کریں گے۔ لیکن ظالموں نے ان کی بھی پرواہ نہیں کی اور مشک کو نیزوں سے چھید دیا۔

ایک طبقہ کی طرف سے کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خانوادے کی پیاس کے تذکرے کو اتنا عام کیا گیا' اتنا پھیلایا گیا اور مسلسل پھیلایا جاتا ہے کہ اہل سنت کے ذہنوں پر بھی یہی بات مسلط ہے کہ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پانی بند کر کے جس ظلم اور شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ بلاشبہ یہ انتہائی شقاوت تھی' اس سے انکار نہیں' لیکن اس کے اس قدر چرچے کی اصل غایت یہ ہے کہ عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پچاس دن رات پانی بند رکھنے کے باعث اس امام برحق اور اس کے اہل خاندان پر جو مصیبت گزری تھی وہ مسلمانوں کے اجتماعی حافظے سے محو ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کے عوام تو درکنار اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی یہ معلوم تک نہیں کہ خلفائے راشدین میں سے تیسرے خلیفہ' فضیلت کے لحاظ سے پوری اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تیسرے مقام پر فائز شخصیت' نبی اکرم ﷺ کے دوہرے داماد کس بہیمانہ ظلم و ستم کا نشانہ بنائے گئے تھے۔ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر کتنے دن پانی بند رہا؟ مشہور روایات کے مطابق ۷ محرم الحرام کو تو وہ میدان کربلا میں پہنچے تھے اور ۱۰ محرم کو ان کی شہادت ہو گئی۔ یعنی زیادہ سے زیادہ چار دن پانی بند رہا۔ پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قافلہ دریائے فرات سے کچھ ہی فاصلہ پر مقیم تھا' جہاں تھوڑا سا گڑھا کھودا جائے تو پانی برآمد ہو جاتا ہے' البتہ وہ گدلا اور ناصاف ہوتا ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ گڑھے کھودے گئے اور گدلا پانی فراہم کیا گیا۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تو پچاس دن کے لگ بھگ پانی بند رکھا گیا اور وہ اپنے مکان کے بالاخانے کی بالکونی سے بلوائیوں اور محاصرہ کنندگان سے فریاد کرتے رہے کہ :"میں تم کو خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں' کیا تم جانتے ہو کہ بئرِ رومہ سے کوئی شخص بلا قیمت پانی نہیں پی سکتا تھا' پھر میں نے اس کو خرید کر وقف کر دیا تو امیر و غریب اور مسافر سب اس سے سیراب ہوتے ہیں"۔ لوگوں نے کہا

"ہاں ہم جانتے ہیں"۔ لیکن اس کے باوجود ان ظالموں کی طرف سے امام مظلوم رضی اللہ عنہ کو پانی پہنچنے نہیں دیا گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پیاس کا اتنا چرچا کیا گیا' اس میں اتنی رنگ آمیزی کی گئی اور ان کی پیاس کی مبالغہ آمیز داستان اس لئے گھڑی گئی تاکہ اُمت کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پیاس یاد نہ رہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر مظلومیت کا رنگ اس لئے چڑھایا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومیت آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ ایک واقعہ کو پورے ڈرامائی انداز سے ـــــ جو اپنی جگہ کتنا ہی المناک کیوں نہ ہو ـــــ عوام الناس میں اس طرح پھیلا دیا گیا ہے کہ اب کوئی جانتا ہی نہیں کہ اُمت کے اصل مظلوم شہید حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر ہر سال اس کا اتنا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ گویا تاریخ اسلام میں کوئی اس سے زیادہ المناک اور عظیم سانحہ وقوع پذیر ہوا ہی نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سانحہ کربلا بھی انتہائی المناک تھا اور یہ تاریخ اسلام کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے لیکن ہر واقعے اور سانحے کا ایک مقام اور مرتبہ ہے' اس کو اسی مقام پر رکھنا چاہئے' افراط و تفریط سے عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی 'مسلمان کہلانے والوں کے ہاتھوں شہید ہوئے اور آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت انتہائی قابل افسوس حادثہ ہے' لیکن آپؓ میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ مدمقابل دشمن کو قتل بھی کیا اور مقتول بھی ہوئے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ چاہے ایک کا ایک سو سے مقابلہ ہو' لیکن جب کوئی میدان جنگ میں ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار بھی ہے تو "یَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ" والا معاملہ کسی نہ کسی درجے میں تو درپیش ہے۔ مقابلہ کرنے والا قتل بھی کرتا ہے اور مقتول بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ صورت حال بالکل دوسری ہے ـــــ لیکن ذرا تقابل تو کیجئے میدان کربلا کے میدانِ کارزار کا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریباً پچاس دن کے محاصرے کے بعد شہادت کا۔ وقت کی عظیم ترین سلطنت کا فرمانروا' جس کی حدودِ مملکت کا یہ عالم ہو کہ حضرت ذوالقرنین جیسے عظیم بادشاہ کی سلطنت سے بھی سہ چند ـــــ وہ اگر ذرا اشارہ کردے تو اتنی فوجیں جمع ہو سکتی ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ مصر' شمالی افریقہ' شام و فلسطین' یمن' نجد' حجاز' عراق اور ایران کے جان نثار گورنر' سب ان کے ایک حکم پر لشکرِ جرار کے ساتھ حاضر ہو سکتے تھے ـــــ

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ انتہائی اصرار کرتے رہے کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم ان بلوائیوں' شورش پسندوں' فتنہ گروں اور باغیوں سے نمٹ لیں۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زبان پر ایک حکم تھا کہ "نہیں"۔ اگر اس پیکر صبرو رضا کی زبان سے ایک لفظ بھی اجازت کا نکل جاتا تو بلوائیوں اور باغیوں کی تکہ بوٹی ہو جاتی اور ان کا نام و نشان ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا ـــــ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس آزمائش میں صبرو ثبات' حلم و تحمل اور قوت برداشت کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں۔ انہیں اپنی جان دینا قبول ـــــ اپنی بے حرمتی منظور ـــــ لیکن یہ بات کسی حال میں منظور نہیں کہ ان کی وجہ سے کسی بھی کلمہ گو کے خون کی ایک بوند گرے۔

صبرو تحمل کی عظیم مثال

میں حیران ہوتا ہوں ان لوگوں کی عقل اور سمجھ پر جو کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کمزور طبع تھے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کے بندو! غور کرو' کوئی کمزور آدمی ایسا دیکھا ہے جو ان حالات میں' جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیش آئے' تحمل و حلم اور صبرو ثبات کا بے نظیر مظاہرہ کر سکے۔ جب بلی کی جان پر بن آتی ہے تو وہ پکڑنے والے کے حلقوم پر جھپٹا مارنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اِدھر حال یہ ہے کہ ایک اشارے پر بے شمار جاں نثار جمع ہو سکتے ہیں' جو پسینے کی جگہ خون بہانا اپنے لئے سعادت سمجھتے ہیں۔ کمزور آدمی تو فوراً مشتعل ہو جاتا ہے' کمزور آدمی میں حلم کہاں اور تحمل کہاں؟ ـــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ساری قوت' سارے وسائل اور سارا دبدبہ رکھتے ہوئے بھی اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ چاہے میری جان چلی جائے' میرا خون بہہ جائے' لیکن میں اپنی حفاظت میں کسی کلمہ گو کا خون بہانے کے لئے تیار نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے تو ہمارے ہاتھ باندھ دیئے ہیں' ہم کریں تو کیا کریں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ بلوائیوں کی کل تعداد اٹھارہ سو تھی۔ بعض لوگ تعجب کرتے ہیں کہ عین دارالخلافہ میں اٹھارہ سو نفوس کس طرح پچاس دن محاصرہ کے بعد خلیفہ وقت کو قتل کر گئے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پابند کر دیا تھا کہ میری مدافعت کے لئے تلوار نہیں اٹھائی جائے گی' میں کسی

کلمہ گو کے خون کی چھینٹ اپنے دامن پر برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بلوائی بلاشبہ باغی تھے' منافق تھے' لیکن تھے تو کلمہ گو۔ یاد کیجئے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے گستاخانہ رویہ پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ نہیں عمر! وہ کچھ بھی ہو' اس کو کلمہ کا تحفظ حاصل ہے۔ عین حالت جنگ میں ایک شخص نے اُس وقت جبکہ وہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی تلوار کی زد میں آگیا تھا' کلمہ پڑھ دیا' لیکن انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ انہوں نے وہی کچھ سمجھا جو ایسے موقع پر ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بھی کہا کہ حضورؐ! اس نے تو جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : اے اُسامہ! قیامت کے دن کیا کرو گے جب وہ کلمہ تمہارے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا' جس کی ڈھال ہوتے ہوئے تمہاری تلوار اس شخص کی گردن پر پڑی ——— اِدھر یہ بلوائی کلمہ کی ڈھال لئے ہوئے تھے' اُدھر معاملہ تھا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے' جو ایک طرف "کامل الحیاء والایمان" تھے تو دوسری طرف صبر و ثبات اور حلم و تحمل کی آہنی چٹان تھے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان بلوائیوں کے خون کا ایک چھینٹا تک ڈھونڈے سے کہیں نظر نہ آتا۔ ایسی ہستی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کمزور طبع تھے۔ کمزور طبع شخص تو مایوسی کے عالم میں انتہائی مشتعل (Desperate) ہو جاتا ہے اور وہ کچھ کر گزرتا ہے جو عام حالات میں کسی زور آور اور مضبوط انسان سے بھی بعید ہوتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت کا یہ حصہ گواہی دے رہا ہے کہ آپؓ صبر و استقامت کے ایک پہاڑ تھے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر اسے عام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مغالطوں' غلط فہمیوں اور فریبوں کے پردے چاک ہوں۔

اس ضمن میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں درج کی ہے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ محاصرہ کی حالت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا کہ امیر المومنین! میں آپ کے سامنے تین باتیں پیش کرتا ہوں' ان میں سے کوئی ایک اختیار فرما لیجئے' ورنہ یہ بلوائی آپ کو ناحق قتل کر دیں گے۔ یا تو آپ

باہر نکل کر ان بلوائیوں سے مقابلہ کیجئے' مدینہ میں بہت سے لوگ آپ کے ساتھ ہیں' آپ کو قوت و شوکت حاصل ہے' آپ حق پر ہیں اور یہ باطل پر' لہٰذا یہ بلوائی ہرگز مقابلے میں نہ ٹھہر سکیں گے۔ یا پھر اپنے مکان کی پشت پر ایک نیا دروازہ نکلوا لیجئے اور سواریوں پر سوار ہو کر مکہ مکرمہ چلے جایئے۔ اس طرح یہ لوگ مکہ کی حرمت کی وجہ سے آپ پر دست درازی نہ کر سکیں گے اور آپ قتل سے محفوظ رہیں گے۔ یا پھر آپ شام چلے جایئے جہاں کے لوگ آپ کے وفادار ہیں اور جہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان تینوں تجویزوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ لڑنے کے متعلق تو یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں پہلا خونریز خلیفہ بنوں اور اپنی مدافعت میں مسلمانوں کا خون مسلمانوں کے ہاتھوں بہانے کا سبب بنوں۔ مکہ اس لئے نہیں جاؤں گا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ قریش کے جس شخص کی وجہ سے مکہ میں ظلم ہو گا اس پر نصف عالم کے برابر عذاب ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میں ہی وہ شخص بنوں۔ جبکہ دارالہجرت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب چھوڑ کر شام چلے جانا مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔

ابن سیرینؒ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بلوائیوں کا محاصرہ توڑ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: "انصار دروازے پر موجود ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آپ چاہیں تو ہم دو مرتبہ انصار اللہ بن جائیں"۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "میں قتال کی اجازت نہیں دے سکتا"۔ اسی قسم کی ایک روایت حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ: "انصار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: یا امیرالمومنین! ہم چاہتے ہیں کہ خدا کی دوسری مرتبہ مدد کریں۔ ایک مرتبہ تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تھی' اب دوسری مرتبہ آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا مجھے اس کی ضرورت نہیں' میں اپنے لئے ہرگز خوں ریزی کی اجازت نہیں دوں گا۔ تم واپس چلے جاؤ"۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ مزید کہتے ہیں کہ بخدا اگر وہ لوگ صرف چادروں سے آپ رضی اللہ عنہ کی حفاظت کرتے تو آپ کو بچا لیتے۔ ایسے شخص کے متعلق یہ حکم لگانا کہ وہ کمزور طبع تھے' انتہائی ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ میں پھر یہی عرض کروں گا کہ ایسے لوگوں میں خود عقل نہیں یا وہ دوسرے سب لوگوں کو اتنا بے وقوف سمجھتے ہیں کہ جو بات یہ کہہ دیں وہ باور کر

لی جائے گی۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی سی ساری کوشش کرنے بلکہ اپنی جان دے کر بھی فتنہ کو نہ روک سکے تو ان کی شجاعت' جرأت اور شیر خدا ہونے پر کوئی نقص واقع نہیں ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کیسے کمزور ہو گئے جبکہ انہوں نے بھی اپنا خون صرف فتنہ کو سر اٹھانے کا نہ دینے کی وجہ سے دے دیا۔

میرے نزدیک اس بات کی مسلمانوں میں خوب نشر و اشاعت کی ضرورت ہے کہ ہمارے نزدیک میدان قتال میں کفار کے ہاتھوں شہید ہونے والوں میں پوری اُمت میں سب سے افضل حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں' جن کا اعضاء بریدہ اور مُثلہ شدہ لاشہ اس حال میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں کے سامنے تھا کہ پیٹ چاک اور کلیجہ چبایا ہوا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کو ترجمان وحی صلی اللہ علیہ وسلم نے "سَیِّد الشُّھَدَاء" کا لقب دیا تھا۔ اُمت کی تاریخ میں دوسرا المناک سانحہ ایک مجوسی غلام کے ہاتھوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چراغِ حیات کا گُل ہونا تھا۔ اسی طرح ایک نام نہاد کلمہ گو کے ہاتھوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی امت کے لئے ایک سانحۂ فاجعہ سے کم نہیں —— لیکن مظلومیت کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں سب سے زیادہ المناک' سب سے زیادہ دردناک اور سب سے زیادہ عظیم سانحہ فاجعہ امامِ برحق' خلیفہ راشد امیرالمومنین حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت ان سب کے بعد آتی ہے۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون ناحق ہی تھا جس کی وجہ سے اللہ کا غضب آیا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں چوراسی ہزار مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں شہید ہوئے' خون کی ندیاں بہہ گئیں' فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھی —— مسلمانوں میں ایسا تفرقہ پڑا کہ چودہ سو سال بھی اس کو پاٹ نہ سکے بلکہ وہ ہر دَور میں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میدان کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ذمہ دار بھی دراصل وہی سازشی لوگ تھے جن کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں ۱۸ ذوالحجہ ۳۶ ہجری کو امام مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے' اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر واویلا اور ماتم کرنے والے بھی درحقیقت اکثر و بیشتر وہی لوگ ہیں جن کے دامن خونِ عثمان' خونِ علی اور خونِ حسین رضی اللہ عنہم سے داغدار ہیں۔

(جاری ہے)

اسلامی نظامِ اَخلاق

اور ہماری ذِمّہ داریاں

—— پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف ہزاروی ——

اس جدید سائنسی دور میں انسان کی تمام تر کاوشیں اور جدوجہد سیاسی' معاشی اور تمدنی مسائل کے حل کے لئے ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ مسائل جس قدر آج الجھاؤ کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں اس سے قبل اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس صورت حال نے یہ حقیقت اظہر من الشمس کر دی ہے کہ یہ تمام مسائل ایک بنیادی مسئلہ کی وجہ سے ابھی تک حل نہیں ہو سکے۔ گزشتہ دو صدیوں میں انسانوں نے جس قدر سیاست' معیشت اور علم و ادب کے میدان میں ترقی کی' اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ یہ مسائل کب کے حل ہو جاتے لیکن ان کا حل نہ ہونا اور مسلسل بگڑتی ہوئی صورت اختیار کرتے چلے جانا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جب تک ہم اخلاقی اقدار کو نظر انداز کئے رکھیں گے دنیا میں پائی جانے والی بدامنی' فتنہ و فساد اور لڑائی جھگڑے شدت اختیار کرتے جائیں گے۔ انسان کا اخلاقی کردار ہی وہ واحد سرچشمہ ہے جس سے اس کے معاشی' سیاسی اور تمدنی اعمال کے چھوٹے چھوٹے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب تک اخلاقی بنیاد صحیح نہ ہو گی انسان زندگی میں اطمینان و سکون اور اعمال میں لطافت حسن و جمال کی رعنائی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اسلام ایک ایسا فطرتی ضابطۂ حیات ہے کہ جس نے قیامت تک آنے والی نسل انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ایسے زریں اصول عطا فرمائے ہیں جسے آج تک کوئی جھٹلا نہیں سکا۔ انہی زریں اصولوں میں سے اخلاق ایک ایسا فطری' کامل و مکمل اور ارفع و اعلیٰ نظام ہے جس کی بدولت معاشرہ انسانی ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔

اَخلاق خُلق کی جمع ہے' جس کے معنی و مفہوم کے بارے میں امام راغب اصفہانی

لکھتے ہیں :

"خص الخَلق بالهیئات والاشکال و الصور المدرکة بالبصر
وخص الخُلق بالقوی والسجایا المدرکة بالبصیرة" {۱}

"خَلق ہیئت اور شکل انسانی کے ساتھ خاص ہے اور خَلق کے محاسن کا مشاہدہ نگاہ کرتی ہے' جبکہ خُلق کا لفظ عادت اور خصلت کے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور محاسنِ خُلق کا احساس بصیرت سے ہوتا ہے۔"

خُلق وہ عادات ہیں جو بلا تامل اور بلا تکلف صادر ہوتی ہیں۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں خلق کی تشریح کرتے ہوئے فضائل اخلاق اور رزائل کی وضاحت اس عمدہ انداز سے کی ہے کہ اس سے لفظ خُلق میں پوشیدہ تمام امور واضح ہو جاتے ہیں۔

فالخُلق عبارة عن هیئة فی النفس راسخة عنها تصدر الافعال بسهولة ویسر من غیر حاجة الی فکر و روية فان کانت الهیئة بحیث تصدر عنها الافعال الجمیلة المحمودة عقلاً وشرعًا سمیت تلک الهیئة خُلقا حَسنًا وان کان الصادر عنها الافعال القبیحة سمیت الهیئة التی هی المصدر خُلقا سیئًا۔ {۲}

"خُلق نفس کی اس عادت راسخہ کا نام ہے جس سے سارے افعال بغیر کسی تامل و تردد اور تکلف کے ظاہر ہوتے ہیں اور اگر یہ افعال شرعی اور عقلی لحاظ سے احسن اور رلائق تحسین ہوں تو اس ہیئت یا عادت کو حسن خلق اور اگر قابل مذمت ہوں تو خلق بد کہا جاتا ہے۔"

اخلاق وہ حسن خُلق ہے جس کی بنا پر نفس اچھی عادتوں کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور انسان انبیاء کرام' صدیقین' شہداء' اور صالحین کے نقش قدم پر چلنے لگتا ہے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ نیکی اور گناہ کیا ہے' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((البر حسن الخلق والاثم ماحاک فی صدرک وکرهت ان یطلع علیه الناس)) {۳}

"نیکی حسن خلق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں خلش پیدا کردے اور تو

اس بات کو اچھا نہ جانے کہ لوگ اس بات سے مطلع ہو جائیں۔"

ایک مسلمان کی زندگی میں حسن خلق کی کس قدر اہمیت ہے اس کی وضاحت رسول اکرم ﷺ کی اس حدیث مبارکہ سے ہوتی ہے جو امام ترمذیؒ نے حضرت ابو درداء ؓ کی روایت کردہ حدیث نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا : "قیامت کے روز جب حساب و کتاب ہو گا تو حسن خلق سے زیادہ قابل قدر کوئی چیز نہ ہو گی۔" اس حدیث کو ابو داؤدؒ نے اپنی سنن اور احمد بن حنبلؒ نے مسند میں بھی نقل کیا ہے۔ امام ترمذی کے مطابق اس حدیث کا شمار صحیح احادیث میں ہوتا ہے"{۴}

خود سرکار دوعالم ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد یہ بیان فرمایا :

((بعثت لاتمم حسن الاخلاق)) {۵}

"مجھے حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔"

ایک طرف جہاں اخلاق کی وسعت اور ہمہ گیری کی نشاندہی ہوتی ہے تو دوسری طرف یہ عیاں ہو رہا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا مقصد بنی نوع انسان کو اخلاق کریمانہ سے متصف کرنا ہے۔ قرآن حکیم نے بڑے پیارے انداز میں حبیب خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد کا ذکر مبارک کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

﴿ كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾

(البقرۃ : ۱۵۱)

"جس طرح (من جملہ اور نعمتوں کے) ہم نے تم میں تمہی میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور تمہیں پاک بناتے اور کتاب (یعنی قرآن) اور دانائی سکھاتے ہیں اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔"

اس موضوع و مضمون کو قرآن کریم نے سورۂ آل عمران میں بیان فرمایا اور اسے خداوند کریم کا عظیم احسان قرار دیا کہ ایک ایسا رسول عطا کیا جا رہا ہے جس کی آمد کا مقصود و منشا یہ ہو گا کہ وہ لوگوں کا تزکیہ نفس کرے گا اور انہیں اخلاق عالیہ کی معراج سے متصف فرما کر اشرف المخلوقات کے اعلیٰ منصب پر فائز فرما دے گا۔ خود نبی رحمت ﷺ نے قرآن

کریمہ کی عملی تصویر بن کر لوگوں پر واضح فرمادیا کہ کامیاب اور نفع مند زندگی گزارنے کا راز اسی میں مضمر ہے کہ فضائل اخلاق کو کمال سعادت مندی سے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا جائے۔ اسی طرح انسان صحیح معنوں میں مسجود ملائکہ ٹھہرنے کا حقدار بنتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب رسول اللہ ﷺ کے اخلاق عالیہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؓ نے ارشاد فرمایا : "کان رسول اللہ ﷺ خلقه القرآن"{۶}

نبی رحمت ﷺ کی ساری زندگی اُمت مسلمہ کے لئے سراپا ہدایت و نمونہ ہے۔ قرآن کریم سے لے کر تاریخ کی کتب تک آپ کی حیات مبارک کے نقوش ان میں ثبت ہیں۔ سیرت سرورِ دو عالم ﷺ کا ہر پہلو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی' معاشرتی ہو یا معاشی' غرض تمام پہلو محفوظ ہیں اور اُمت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ آپ ﷺ اخلاق عظیمہ کے مالک تھے۔ خود قرآن کریم کی شہادت موجود ہے ﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ (القلم : ۴) "اور آپ کے اخلاق بڑے (عالی) ہیں۔"

یہاں ان تمام قرآنی آیات اور احادیث رسول معظم ﷺ کو بیان نہیں کیا جا سکتا جن کا تعلق اخلاقیات سے ہے کیونکہ قرآن کریم اور احادیث کا ایک ضخیم حصہ اس موضوع پر مشتمل ہے۔ سرکار دو جہاں ﷺ کی مدنی حیات طیبہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اسلامی مملکت معرض وجود میں آچکی تھی اور ایک مستحکم اسلامی معاشرہ قائم ہو چکا تھا۔ اس اسلامی معاشرہ اور مملکت کی بنیاد میں اخلاقی اقدار کا ایک بڑا حصہ تھا۔ آپؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی کی اخلاقی تربیت کا یہ نتیجہ نکلا کہ صحابہ کے دلوں میں ایک زبردست طاقتور ضمیر بیدار ہو چکا تھا۔ اسی کی بدولت "مواخات مدینہ" کا عملی مظاہرہ ہوا۔ ابھی آپ مکہ مکرمہ میں ہی تھے کہ حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) نے اپنے بھائی کو آپؐ کے حالات اور تعلیمات کا جائزہ لینے کے لئے مکہ بھیجا۔ واپس آکر انہوں نے اپنے بھائی کو آپؐ کی نسبت ان الفاظ میں اطلاع دی : رایته یأمر بمکارم الاخلاق {۷} "میں نے ان کو دیکھا ہے کہ وہ (ﷺ) لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتے ہیں۔"

ہجرت حبشہ کے موقع پر نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں : "اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے' بتوں کو پوجتے

تھے' مُردار کھاتے تھے' بد کاریاں کرتے تھے' ہمسایوں کو ستاتے تھے' بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا' زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے' اسی اثناء میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا' اس نے ہمیں سکھایا کہ ہم پتھروں کو پُوجنا چھوڑ دیں' سچ بولیں' خونریزی سے باز آجائیں' یتیموں کا مال نہ کھائیں' ہمسایوں کو آرام دیں' پاک دامن عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔" {۸}

سورۃ الحجرات میں ان اخلاقی اقدار پر عمل کرنے کو کہا گیا جن کا ذکر سورۃ الممتحنہ کی آخری آیات میں ہے کہ خواتین سے ان باتوں پر بیعت لی جائے کہ وہ ان اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہوں :

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَ كَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ' اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (الممتحنه : ۱۲)

"اے پیغمبر جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی' نہ چوری کریں گی' نہ بدکاری کریں گی' نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی' نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی' نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے خدا سے بخشش مانگو' بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہ مسلمہ امر ہے کہ کوئی معاشرہ اس وقت تک صحت مند معاشرہ نہیں بن سکتا جب تک اس معاشرے کے افراد صالح نہ ہوں۔ افراد کی انفرادی و اجتماعی اخلاقی تربیت اور کردار سازی معاشرے کی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن کریم نے اتنی تفصیل سے ان تمام محاسن اخلاق کا نام لے کر ذکر کیا ہے کہ ان سب کو یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا جس پر عمل پیرا ہو کر ہم صحیح معنوں میں مومن کہلانے کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ سورۃ الفرقان میں "عباد الرحمٰن" کے خصائص کو تفصیلی طور پر بیان فرمایا گیا ہے ——— اور سورۃ البقرۃ کا آغاز ہی اس سے ہو رہا ہے کہ ایک متقی شخص میں کن کن اوصاف کا پایا

جانا ضروری ہے۔

عدل و احسان' صبر و شکر' جرات و بہادری' توکل' اخلاص و صدق' امانت و دیانت' عفو و کرم' نصیحت' حیا' عفت و عصمت' تحمل و بردباری' سخاوت و خیرات' ایفائے عہد' شرم و حیا' حلم و وقار' خوش خلقی و فیاضی' غم خواری و غمگساری' صلہ رحمی' چھوٹوں سے محبت' بڑوں کا احترام' مہمان نوازی' اولوالعزمی و استقلال' پابندی وقت اور تواضع وغیرہ یہ ہیں وہ اعلیٰ وارفع فضائل اخلاق جو انسانی کردار کی بطریق احسن تعمیر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک اعلیٰ ترین نعمت یہ ہے کہ خدا اپنے بندے کو حسن خلق سے نوازدیتا ہے۔ اگر ہر شخص اسلامی نظام اخلاق کی جزئیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا احتساب کرے تو معاشرہ ہر برائی سے پاک ہو سکتا ہے۔ آج اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دینے سے معاشرہ میں کہیں تو عفت و عصمت کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں' کہیں قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ چور بازاری' ذخیرہ اندوزی' فرقہ وارانہ فسادات' دہشت گردی' سفارش و رشوت' اقربا پروری' دروغ گوئی اور ظلم و تشدد نے انسانی آرام و سکون کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ آج ہر کوئی دوسرے کا احتساب کرنے کی بات کرتا ہے لیکن اپنے احتساب کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آجاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔"

قرآن کریم نے فضائل اخلاق کی تعلیمات کے ساتھ وہ اسباب و وجوہات بھی بیان کی ہیں جن کی بدولت انسان اخلاقی اقدار کو پامال کر کے بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک اور بات بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید نے اپنی فصاحت و بلاغت کے بے مثل ہونے کا ایک ثبوت یہ دیا کہ ان تمام وجوہات و اسباب کو ایک ہی آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے :

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۚ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ ﴾

(آل عمران : ١٤)

"لوگوں کو ان کی خواہشات کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان زدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہے' (مگر) یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔"

ان مرغوبات میں سرفہرست عورت ہے۔ حب زن' زر اور جاہ و اقتدار کی طلب نے انسان کو اخلاقی بے راہ روی کا شکار کر دیا ہے۔ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں : "ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" اور "وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ" کہ ایک طرف تو یہ فرمایا کہ دُنیوی زندگی بسر کرنے کے لئے ان اشیاء کا جائز استعمال ضروری ہے اور دوسری طرف فرمایا کہ یہ سب کچھ فانی ہے۔ ایک مومن کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان چیزوں سے نفع حاصل کرے تو رضاء الٰہی کے مطابق اسلامی اخلاقی اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنی تمام دنیوی ذمہ داریوں کو پورا کرے اور صرف انہی چیزوں کی تگ و دو میں نہ لگا رہے بلکہ متاع دنیا کو اخروی نعمتوں کے حصول پر قربان کردے اور اس کی زندگی ﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ﴾ (الانعام : ۱۶۲) کا مظہر بن جائے۔

آج جو لوگ اخلاقی قدروں کو پامال کر رہے ہیں وہ اتنے ہی بے راہ روی کا شکار بنتے جا رہے ہیں۔ تہذیب حاضر کی چمک دمک' مادیت کی دوڑ اور فکری الحاد نے لوگوں کو اخلاقی قدروں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ صرف ایک حیاء کے ختم ہو جانے پر معاشرے کے اندر لاکھوں برائیاں جنم لے رہی ہیں۔ حیا کا پردہ چاک ہونے پر رشوت و سود خوری عام ہو رہی ہے۔ آئے دن اخبارات میں ایسی ایسی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ بار ہا حوا کی بیٹی کی عزت و ناموس کی سر عام دھجیاں اڑائی گئی ہیں' گینگ ریپ کے واقعات عام ہوتے جا رہے ہیں جنہیں سن کر ایک مسلمان لرز جاتا ہے۔ عورتوں نے حیا کا لباس اتار دیا۔ سماجی تقریبات میں شریک عورتوں میں سے جس نے لباس سے پورے جسم کو ڈھانپ رکھا ہو اسے "پینڈو" یا بنیاد پرست کا نام دے کر مذاق

اڑایا جاتا ہے جبکہ نیم عریاں لباس پہننا فیشن اور زندگی کالازمی جزو بن گیا ہے۔ آج بھی پاکستانی معاشرہ قرون اولیٰ کی یاد زندہ کر سکتا ہے اگر ہم قرآن مجید کے اس اصول کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں' فرمایا :

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ' اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ○ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلاَ يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلاَّ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ (النور ۳۰'۳۱)

"(اے نبی!) مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں' یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے' اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ اس سے خبردار ہے اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی آرائش (یعنی زیورات کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہے' اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔"

صرف حیا کو مرد و عورت اپنا لباس بنالیں اور اسلامی نظام اخلاق پر عمل پیرا ہو جائیں تو معاشرہ سے ہزاروں جرائم خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ قتل و غارت کا بازار اس لئے گرم ہے کہ ہمارے اندر برداشت کا مادہ ختم ہو چکا ہے۔ عفو و کرم کا دامن چھوڑنے سے بھائی بھائی کی گردن کاٹ رہا ہے' عصبیت کا شکار ہو کر ایک خاندان دوسرے خاندان کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ انتقام سے فوری طور پر دھاک تو بیٹھ سکتی ہے مگر معاشرہ میں پائیدار امن تو عفو درگزر کے وسیلہ سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہم خود پسندی' تنگ ظرفی فحش کلامی' خیانت' جھوٹ' وعدہ خلافی' احسان فراموشی' غیبت و چغل خوری' غرور و تکبر' حرص و طمع اور نہ جانے کن کن بیماریوں میں مبتلا ہیں۔

وطن عزیز پاکستان کی ترقی و عزت اور حیات اُخروی کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں سرفراز ہونے کے لئے ہمیں ان صفات مذمومہ کا لبادہ اتارنا ہو گا۔ ہر شخص کے فرائض منصبی میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاق عالیہ سے آراستہ کرے۔ جب ہر فرد اپنی اصلاح' احتساب اور ذمہ داریوں کا احساس کرے گا تو پھر ہر طرف خیر و

امن اور سلامتی کا دور دورہ ہوگا۔ پھر ملکی سیاست، معاشی کاروبار، انفرادی کردار، عدالت، معاشرت، شہری زندگی، بازار، مدرسہ، خانگی معاملات، پولیس لائن، چھاونی، میدان جنگ اور بین الاقوامی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کے معاملات خود بخود حل ہو جائیں گے اور ہم پوری طرح ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو اسلامی نظام اخلاق نے ہم پر عائد کی ہیں۔

حوالہ جات

{۱} الراغب الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، مصر، بدون تاریخ الطبع، ص ۱۵۷، ۱۵۸

{۲} ابو حامد محمد بن الغزالی، احیاء علوم الدین، مصر، ۱۹۳۹ء الجزالثالث، ص ۵۲

{۳} الخطیب التبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، دمشق ۱۹۶۱ء الجزء الثانی ص ۶۲۹

{۴} ترمذی محمد ابو عیسیٰ، جامع الترمذی، جلد ۶، ص ۱۱۳ (حدیث نمبر ۲۰۰۳)

{۵} الخطیب التبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، الجزء الثانی ص ۶۳۲

{۶} ابو حامد محمد بن الغزالی، احیاء علوم الدین، الجزء الثانی ص ۴۸

{۷} مسلم بن حجاج، صحیح مسلم (مناقب ابی ذر) مصر جلد دوم ص ۳۴۹

{۸} احمد بن حنبلؒ، المسند، جلد اول ص ۲۰۲، ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت

غلطیوں کی اصلاح کا نبوی طریق کار (۴)

تالیف : علامہ محمد صالح المنجد' مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

لوگوں کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے نبی اکرم ﷺ کے اختیار کردہ مختلف اسلوب

۸) غلطی کرنے والے کے ساتھ جذباتی رویہ اختیار کرنے سے پرہیز :

خاص طور پر جب منع کرتے وقت سختی سے کام لینے کے نتیجہ میں خرابی کا دائرہ وسیع ہونے کا خطرہ ہو۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے اس واقعہ پر غور کریں کہ جب ایک بدّو نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی اس غلطی پر کس ردعمل کا مظاہرہ فرمایا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں : ہم مسجد میں نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضر تھے کہ ایک اعرابی آیا اور مسجد میں (ایک طرف) کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا : "رُک جاؤ' رُک جاؤ"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "اس کا پیشاب نہ روکو' اسے فارغ ہو لینے دو"۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے چھوڑ دیا حتیٰ کہ اس نے پیشاب کر لیا۔ اس کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا : "ان مسجدوں میں پیشاب کرنا یا گندگی پھیلانا درست نہیں' یہ تو اللہ کے ذکر کے لئے' نماز کے لئے اور تلاوت قرآن مجید کے لئے ہوتی ہیں"۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک آدمی کو حکم دیا تو اس نے پانی کا ایک ڈول لا کر اس جگہ پر بہا دیا۔[۱۹]

اَعرابی کی اس غلطی کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے جس قاعدہ پر عمل کیا وہ ہے "آسانی کرنا' مشکل میں نہ ڈالنا"۔ صحیح بخاری میں یہ واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کیا گیا ہے : "ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا' لوگ غصہ میں آ کر اس کو پکڑنے کے لئے بڑھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : اسے چھوڑ دو' اور اس کے پیشاب

پر پانی کا ایک ڈول بہا دو۔ تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو' مشکل میں ڈالنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ [۲۰]

صحابہ کرام ﷢ نے مسجد کو پاک رکھنے کے لئے اور برائی سے منع کرنے کے لئے جوش و جذبہ کا مظاہرہ کیا تھا' جیسے کہ اس حدیث کی مختلف روایات کے الفاظ سے ظاہر ہے' جن میں کچھ الفاظ یہ ہیں : فَصَاحَ بِهِ النَّاسُ "لوگوں نے اسے بلند آواز سے روکا"۔ فَثَارَ اِلَيْهِ النَّاسُ "لوگ غصے سے اس کی طرف بڑھے"۔ فَزَجَرَهُ النَّاسُ "لوگوں نے اسے ڈانٹا"۔ فَاَسْرَعَ اِلَيْهِ النَّاسُ "لوگ تیزی سے اس کی طرف بڑھے"۔ فَقَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ : مَهْ مَهْ "صحابہ کرام ﷢ نے کہا : رُک جاؤ' رُک جاؤ"۔ [۲۱] لیکن نبی اکرم ﷺ کی نظر نتیجہ پر تھی۔ آپؐ نے دیکھا کہ اس معاملہ میں دو صورتیں ممکن ہیں' یا اُس شخص کو پیشاب کرنے سے منع کیا جائے' یا چھوڑ دیا جائے۔ اگر اسے منع کیا گیا تو اس صورت میں یا تو وہ شخص عملاً پیشاب کرنے سے رُک جائے گا' اس طرح پیشاب روکنے سے اسے نقصان پہنچے گا' یا یہ صورت ہوگی کہ اس کا پیشاب ابھی جاری ہوگا کہ وہ لوگوں کے خوف سے بھاگ کھڑا ہوگا' اس طرح نجاست مسجد میں پھیل جائے گی اور اس شخص کا بدن اور کپڑے بھی ناپاک ہو جائیں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ محسوس فرمالیا کہ اسے پیشاب کر لینے دیا جائے تو کم خرابی لازم آئے گی اور یہ چھوٹی برائی ہوگی۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ آدمی غلطی کا ارتکاب شروع کر چکا ہے اور نجاست کا ازالہ پانی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس لئے آپؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا : اسے چھوڑ دو' اسے مت روکو۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس طرح مصلحت اور فائدے کو ترجیح حاصل ہو رہی تھی۔ یعنی چھوٹی خرابی کو برداشت کر کے بڑی خرابی کو روکا جا رہا تھا اور چھوٹے فائدہ کو چھوڑنے کے نتیجے میں بڑا فائدہ حاصل ہو رہا تھا۔

ایک روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے دریافت کیا تھا کہ اس نے یہ کام کیوں کیا۔ طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت عبداللہ بن عباس ﷠ سے روایت کیا ہے' وہ فرماتے ہیں : نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک اَعرابی حاضر ہوا اور مسجد میں آپؐ سے بیعت کی۔ پھر واپس ہوا تو ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور پیشاب کر

دیا۔ لوگوں نے اسے پکڑنا چاہا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "اس کا پیشاب نہ روکو"۔ پھر فرمایا : "کیا تو مسلمان نہیں؟" اس نے کہا : "کیوں نہیں؟" فرمایا : "پھر تو نے ہماری مسجد میں پیشاب کیوں کیا؟" اس نے کہا : "قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپؐ کو حق مبعوث کیا ہے' میں تو اسے عام زمین کی طرح کی زمین سمجھا تھا' اس لئے میں نے یہاں پیشاب کر لیا"۔ پھر نبی اکرم ﷺ کے حکم سے اس کے پیشاب پر پانی کا ڈول بہا دیا گیا"۔ (۲۲)

اس حکیمانہ انداز کے رویہ کا اس اَعرابی کے دل پر گہرا اثر ہوا' جس کا اظہار اس کے اپنے الفاظ سے ہوتا ہے جو ابن ماجہ کی روایت میں مذکور ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی مسجد میں داخل ہوا' جناب رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما تھے۔ اس نے کہا : "اے اللہ! مجھے بخش دے اور محمد ﷺ کو بخش دے' اور ہمارے ساتھ کسی اور کی مغفرت نہ فرمانا"۔ جناب رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا : "تو نے بڑی وسیع چیز (رحمت) کو محدود کر دیا"۔ پھر وہ واپس ہوا' ابھی مسجد کے ایک حصہ میں ہی تھا کہ ٹانگیں پھیلا کر پیشاب کرنے لگا"۔ اس اَعرابی کو جب دین کی سمجھ آگئی تو اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا : "میرے ماں باپ آنحضورؐ پر قربان ہوں' آپؐ اُٹھ کر میرے پاس آئے' پھر مجھے نہ ڈانٹا' نہ برا بھلا کہا۔ فرمایا : "اس مسجد میں پیشاب نہیں کرتے' یہ تو اللہ کے ذکر اور نماز کے لئے بنائی گئی ہے"۔ اس کے بعد آپؐ نے پانی کا ایک ڈول منگوایا جو پیشاب پر بہا دیا گیا"۔ (۲۳)

امام ابن حجر ؒ نے اس حدیث کی شرح میں جو فوائد ذکر کئے ہیں' ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں :

- جاہل کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے' اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کئے بغیر ضروری مسئلہ سمجھایا جائے' جب کہ اس نے یہ غلطی ضد کی بنیاد پر نہ کی ہو' بالخصوص جب کہ اسے تالیف قلب کی ضرورت ہو۔
- اِس واقعہ سے نبی اکرم ﷺ کی شفقت اور حسن خلق کا اظہار ہوتا ہے۔
- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام ؓ کے ذہنوں میں یہ مسئلہ خوب جاگزیں تھا

کہ نجاست سے بچنا ضروری ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ سے اجازت طلب کئے بغیر ہی اسے روکنا شروع کر دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا لازمی ہونا ان کے نزدیک مسلم تھا۔

- اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مانع دور ہوتے ہی خرابی کا ازالہ کرنا چاہئے' کیونکہ اس کے فارغ ہوتے ہی انہیں پانی بہانے کا حکم دے دیا گیا۔ (۲۴)

۹) یہ واضح کر دینا کہ غلطی بہت بڑی ہے :

حضرت محمد بن کعب' حضرت زید بن اسلم اور حضرت قتادہ رحمہم اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی' کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک شخص نے کہا : "ہم نے تو اپنے ان قراء (یعنی رسول اللہ ﷺ اور علماء صحابہ رضی اللہ عنہم) جیسے لوگ کبھی نہیں دیکھے' کھانے پینے کے بے حد شائق' بات کرنے میں انتہائی جھوٹے' اور جنگ کے موقع پر انتہائی بزدل"۔ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا : "تو جھوٹ کہتا ہے' بلکہ تو منافق ہے' میں یہ بات ضرور رسول اللہ ﷺ کو بتاؤں گا"۔ عوف رضی اللہ عنہ یہ بات بتانے کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ان کے پہنچنے سے پہلے قرآن نازل ہو چکا ہے (اور حضور علیہ السلام کو وحی کے ذریعے اس بات کی اطلاع ہو چکی ہے)۔ آنحضرت ﷺ اپنی اونٹنی پر کجاوہ کس کر سوار ہو چکے تھے کہ وہ شخص بھی آ پہنچا' اور کہنے لگا : "اللہ کے رسول! ہم تو گپ شپ کر رہے تھے' ہم تو دل لگی کر رہے تھے' ہم تو اس طرح کی باتیں کر رہے تھے جس طرح مسافر کیا کرتے ہیں تاکہ ہمارا سفر (آسانی سے) طے ہو جائے"۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا : وہ منظر گویا اب بھی میرے سامنے ہے جب اس شخص نے جناب رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی رسی پکڑی ہوئی تھی' اور (راستے کے) پتھر اس کے پاؤں کو زخمی کر رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا : "ہم تو گپ شپ کر رہے تھے' ہم تو دل لگی کر رہے تھے" اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے : ﴿أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ﴾ (التوبہ : ۶۵) "کیا تم اللہ کا' اور اس کی آیات کا اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے تھے؟" آنحضرت ﷺ نہ اس کی طرف توجہ فرماتے تھے' نہ اس سے زیادہ کوئی بات ارشاد

فرماتے تھے۔

ابن جریر نے یہ واقعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' کہ انہوں نے فرمایا : غزوۂ تبوک میں ایک آدمی نے کسی مجلس میں کہا : "ہم نے اپنے اِن قراء (علماء صحابہ) جیسے لوگ کبھی نہیں دیکھے' پیٹ بھرنے کے انتہائی شوقین' زبان کے انتہائی جھوٹے اور جنگ کے موقع پر انتہائی بزدل"۔ مجلس میں موجود ایک صحابی نے کہا : "تو جھوٹا ہے' بلکہ تو منافق ہے' میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاؤں گا"۔ اور قرآن نازل ہو گیا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا : میں نے دیکھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کی رسی کو پکڑے ہوئے (ساتھ ساتھ بھاگ رہا) تھا اور پتھر اسے زخمی کر رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا : "یا رسول اللہ! ہم تو گپ شپ اور دل لگی کر رہے تھے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے

﴿ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ﴾

(التوبہ : ۶۵'۶۶) "کیا تم اللہ کا' اس کی آیات کا اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے تھے؟ معذرت نہ کرو' تم ایمان لانے کے بعد کفر کا ارتکاب کر چکے ہو"۔ (۲۵)

۱۰) غلطی کا نقصان واضح کرنا :

حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سفر کے دوران) کسی مقام پر پڑاؤ کرتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھاٹیوں اور وادیوں میں بکھر جاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "تمہارا ان گھاٹیوں اور وادیوں میں یوں بکھر جانا شیطان کی طرف سے ہے"۔ اس کے بعد (یہ حال ہو گیا کہ) جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مقام پر پڑاؤ ڈالتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے سے اس طرح مل کر بیٹھتے کہ اگر ان پر کپڑا پھیلایا جائے تو سب کو ڈھانک لے۔ (۲۶)

ایک روایت میں صحابی فرماتے ہیں : "اتنا مل کر بیٹھتے تھے کہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر میں اُن پر ایک چادر پھیلاؤں تو سب کو ڈھانک لے"۔ (۲۷)

اس میں جو چیز واضح ہے وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بہت خیال رکھتے تھے اور اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر لشکر کو اپنی فوج کے فائدہ کا بہت خیال

رکھنا چاہئے اور یہ بھی کہ لشکر کے لوگ جب بکھر کر آرام کریں تو اس کی وجہ سے شیطان مسلمانوں کو خوف زدہ کر سکتا ہے اور دشمن کو حملہ کرنے کا حوصلہ ہو سکتا ہے۔ (۲۸)

اور بکھرنے کا یہ نقصان بھی ہے کہ لشکر کے افراد ایک دوسرے کی کماحقہ مدد نہیں کر سکتے۔ (۲۹)

یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ایک ہدایت ارشاد فرمائی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی پوری پوری تعمیل کی۔

غلطی کا نقصان واضح کرنے کی ایک اور مثال حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا روایت کردہ ارشاد نبویؐ ہے : "تم ضرور اپنی صفیں سیدھی کرو' ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اختلاف ڈال دے گا"۔ (۳۰)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا ۔ رسول اللہ ﷺ ہماری صفیں اتنے اہتمام سے سیدھی فرماتے تھے گویا ان کے ساتھ تیر سیدھے کئے جائیں گے (یعنی صفیں تیر سے بھی زیادہ سیدھی ہوتی تھیں)' حتیٰ کہ آپؐ نے محسوس فرمایا کہ ہم نے یہ مسئلہ سمجھ لیا ہے (تب بار بار کہنا چھوڑ دیا)۔ اس کے بعد ایک دن آنحضرت ﷺ (نماز پڑھانے) تشریف لائے' آپؐ تکبیر کہنے ہی لگے تھے کہ آپؐ کی نظر ایک آدمی پر پڑی' جس کا سینہ صف (کے دوسرے افراد) سے آگے نکلا ہوا تھا۔ تب آپؐ نے فرمایا : "اللہ کے بندو! تم ضرور صفیں سیدھی کرو' ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کے مابین اختلاف ڈال دے گا"۔ (۳۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا : "اپنی صفوں کو سیسہ پلائی ہوئی (دیوار کی طرح) کرو (آپس میں فاصلہ چھوڑ کر نہ کھڑے ہوا کرو)۔ اور صفیں قریب قریب بناؤ' اور گردنیں برابر رکھو (آگے پیچھے نہ کھڑے ہو)' قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' میں دیکھتا ہوں صف کے شگافوں میں شیطان اس طرح گھستے ہیں جیسے سیاہ میمنے"۔ (۳۲)

غلطی کرنے والے کو قائل کرنے کے لئے غلطی سے پیدا ہونے والی خرابیوں اور اس کے برے نتائج کی وضاحت بڑی اہم چیز ہے۔ بعض اوقات غلطی کا نتیجہ خود غلطی کرنے والے کے حق میں برا ہوتا ہے۔ بعض اوقات [illegible]

نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پہلی صورت کی مثال سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' جو دوسرے الفاظ سے صحیح مسلم میں بھی مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک آدمی کی چادر ہوا سے اڑنے لگی تو اس نے ہوا پر لعنت بھیجی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "اسے لعنت نہ کرو' وہ حکم کی پابند ہے (یعنی اللہ کے حکم سے چلتی ہے)' جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت بھیجتا ہے جو اس کی مستحق نہ ہو تو لعنت خود اُسی (لعنت بھیجنے والے) پر پڑتی ہے"۔(۳۳)

دوسری صورت کی مثال حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے' جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ کے سامنے دوسرے شخص کی تعریف کی [مسلم کی روایت کے مطابق اس شخص نے کہا تھا : "اے اللہ کے رسول' فلاں معاملے میں رسول اللہ ﷺ کے بعد اُس شخص سے افضل کوئی نہیں (۳۴)"] تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "ارے! تو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی' تو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی" کئی بار فرمایا۔ پھر ارشاد فرمایا : "جس نے اپنے بھائی کی تعریف ضرور کرنی ہو' وہ یوں کہے : فلاں شخص کے بارے میں میرا یہ خیال ہے' اور اللہ اس کا حساب لینے والا ہے' اور میں اللہ کے مقابلے میں کسی کو پاکباز قرار نہیں دیتا۔ میں اسے ایسے سمجھتا ہوں۔ یہ بھی تب کہے اگر اس کے علم میں وہ نیک آدمی ہو"۔(۳۵)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الادب المفرد" میں حضرت محجن اسلمی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ روایت کیا ہے' اس میں صحابی فرماتے ہیں : "حتیٰ کہ جب ہم مسجد میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو نماز پڑھنے اور رکوع و سجود میں مشغول دیکھا تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا : "یہ کون ہے؟" میں اس کی خوب تعریف کرنے لگا' میں نے کہا : "یا رسول اللہ! یہ فلاں صاحب ہیں' یہ ایسے ہیں اور ایسے ہیں" (الادب المفرد کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں : "یہ فلاں صاحب ہیں' یہ تمام اہل مدینہ میں سب سے عمدہ نماز پڑھتے ہیں") آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "بس کر' اسے نہ سناؤ' ورنہ تم اسے ہلاک کر دو گے"۔(۳۶)

صحیح بخاری میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک شخص کو سنا کہ کسی کی تعریف کر رہا ہے اور تعریف میں اسے حد سے بڑھا رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "تم نے اس آدمی کو تباہ کر دیا"۔ یا فرمایا : "تم نے اس کی کمر توڑ دی"۔ (۳۷)

یہاں نبی اکرم ﷺ نے اُس غلط تعریف کرنے والے کو، جو مبالغہ آمیز انداز میں تعریفیں کر رہا تھا، اس کی غلطی کے انجام کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مبالغہ آمیز تعریف کی وجہ سے ممدوح کے دل میں فخر پیدا ہو جائے گا، وہ غرور اور تکبر کی وجہ سے اکڑنے لگے گا۔ ممکن ہے اس تعریف کی وجہ سے اسے جو شہرت حاصل ہو ' وہ اس پر بھروسا کرتے ہوئے عمل میں سستی کا شکار ہو جائے یا تعریف کی لذت محسوس کر کے ریا کاری میں مبتلا ہو جائے، اور اس طرح وہ ہلاک ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی چیز کو ان الفاظ میں بیان فرمایا : ((اَهْلَكْتُمْ)) "تم نے اسے تباہ کر دیا" یا ((قَطَعْتُمْ عُنُقَ الرَّجُلِ)) "تم نے اس کی گردن کاٹ دی" یا ((قَطَعْتُمْ ظَهْرَ الرَّجُلِ)) "تم نے اس کی کمر توڑ دی"۔

اس کے علاوہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تعریف کرنے والا تعریف میں ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کا اسے یقین نہیں ہوتا، اور ایسی بات تاکید کے ساتھ کہہ دیتا ہے جس کو وہ براہ راست معلوم نہیں کر سکتا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ تعریف میں جھوٹ بول دیتا ہے، بعض اوقات ممدوح کے سامنے تعریف میں ریا کاری سے کام لے رہا ہوتا ہے ' اس طرح گناہ اور بڑا ہو جاتا ہے، بالخصوص جبکہ ممدوح ظالم یا فاسق ہو تو اس جرم کی شناعت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ (۳۸)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ تعریف کرنا سرے سے ممنوع ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ نے بعض حضرات کی موجودگی میں ان کی تعریف کی ہے۔ صحیح مسلم کے ایک باب کے عنوان سے یہ مسئلہ خوب واضح ہو جاتا ہے۔ باب کا عنوان یوں ہے : بابُ النَّهي عَنِ المَدحِ اذا کان فیه اِفراطٌ ' وَخِیفَ منه فِتْنَةٌ علَی المَمدُوحِ "تعریف کی ممانعت، جب کہ اس میں مبالغہ ہو اور اس سے ممدوح کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو"۔ (۳۹)

البتہ جو شخص اپنی کوتاہیوں کا معترف ہوتا ہے اسے اس قسم کی تعریف سے نقصان نہیں ہوتا اور جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو وہ اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار

نہیں ہوتا' کیونکہ اسے اپنے صحیح مقام کا علم ہوتا ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے : جب کسی کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے تو اسے چاہئے کہ یوں دعا کرے : اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِی مَالاَ یَعْلَمُوْنَ' وَلاَ تُؤَاخِذْنِیْ بِمَایَقُولُوْنَ' وَاجْعَلْنِی خَیْرًا مِمَّا یَظُنُّوْنَ [۴۰] "اے اللہ! میرے وہ گناہ معاف فرمادے جو ان لوگوں کو معلوم نہیں' اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر میری گرفت نہ فرمانا' اور مجھے ان کے گمان سے بہتر بنادے"۔

۱۱) غلطی کرنے والے کو عملی طور پر تعلیم دینا :

اکثراوقات نظری تعلیم کے بجائے عملی تعلیم زیادہ موثر ہوتی ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ حضرت جبیر بن نفیر اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے پانی منگوایا اور فرمایا : "ابو جبیر! وضو کر لیجئے"۔ ابو جبیر رضی اللہ عنہ نے منہ سے وضو کی ابتدا کی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "ابو جبیر! منہ سے شروع نہ کیجئے' کافر منہ سے شروع کرتا ہے"۔ پھر حضور علیہ السلام نے پانی طلب فرمایا اور اپنے ہاتھ دھو کر اچھی طرح صاف کر لئے۔ پھر تین بار کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا' اور تین بار چہرہ مبارک دھویا' اور دایاں بازو کہنی تک تین بار دھویا' اور بایاں بھی تین بار دھویا' اور سر کا مسح کیا' اور قدم مبارک دھوئے [۴۱]۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب صحابی رضی اللہ عنہ کو یہ بتایا کہ کافر پہلے منہ دھوتے ہیں تو اس کا مقصد ان کے دل میں اس غلطی سے نفرت پیدا کرنا تھا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ کافر بغیر دھوئے ہاتھ پانی میں ڈال دیتا ہے [۴۲] جو صفائی کا اہتمام کرنے کے منافی ہے۔ واللہ اعلم

۱۲) صحیح متبادل پیش کرنا :

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نماز ادا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے : بندوں کی طرف سے اللہ کو سلام' فلاں فلاں کو سلام۔ (ایک روایت میں ہے) جبرائیل کو سلام' میکائیل کو

سلام[۴۳] نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

یوں نہ کہا کرو کہ اللہ کو سلام' اللہ تو خود سلامتی والا ہے۔ بلکہ یوں کہو : اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ' اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ' اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ (تمام قولی' بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اے نبیؐ! آپ پر سلامتی ہو' اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔ ہم پر بھی سلامتی ہو' اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی)۔ جب تم یہ کہو گے تو آسمان اور زمین میں اللہ کے ہر بندے کو یہ دعا پہنچ جائے گی۔ (پھر کہو) اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ' وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)۔ اس کے بعد جو دعا اسے اچھی لگے وہی منتخب کر کے پڑھ لے۔"[۴۴]

اس کی ایک مثال یہ ہے' جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' کہ نبی اکرم ﷺ نے (مسجد کی) قبلہ والی دیوار پر بلغم لگا دیکھا۔ آنحضرت ﷺ کو یہ چیز انتہائی ناگوار ہوئی' حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ آپؐ نے خود اُٹھ کر اپنے ہاتھ سے کھرچ کر دیوار صاف کی اور فرمایا : "جب کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کے ساتھ سرگوشیاں کر رہا ہوتا ہے' اور رب قبلہ کی طرف اس کے سامنے ہوتا ہے لہٰذا کوئی شخص قبلہ کی طرف ہرگز نہ تھوکے' بلکہ بائیں طرف تھوکے' یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوک لے"۔ پھر آپؐ نے اپنی چادر کا ایک کونہ پکڑ کر اس میں تھوکا' اور کپڑے کا ایک حصہ دوسرے پر پلٹ دیا اور فرمایا : "یا اس طرح کر لے"۔[۴۵]

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں : "کوئی شخص اپنے سامنے ہرگز نہ تھوکے' نہ دائیں طرف تھوکے' لیکن بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے تھوک سکتا ہے"۔[۴۶]

ایک اور مثال : حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں برنی کھجوریں (ایک عمدہ قسم کی کھجوریں) لے کر حاضر ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "یہ کہاں سے آئیں؟" حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا : "ہمارے پاس کچھ ادنیٰ قسم کی کھجوریں تھیں' میں نے ان کے دو صاع کے بدلے ایک

صاع یہ کھجوریں لے لیں' تاکہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں کھانے کے لئے پیش کی جائیں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "اوہو! یہ تو عین سود ہے' عین سود ہے! ایسے نہ کیا کرو۔ اگر تم خریدنا چاہو تو (اپنی ادنیٰ) کھجوریں الگ سودے کے طور پر بیچ دو' پھر (ان پیسوں سے) یہ (عمدہ کھجوریں) خرید لو"۔ (۴۷)

ایک روایت میں یوں ہے کہ : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غلام ایک دن تر و تازہ کھجوریں لے کر حاضر ہوا اور نبی اکرم ﷺ کی کھجوریں بارانی زمین میں تھیں' ان میں خشکی محسوس ہوتی تھی۔ نبی ﷺ نے فرمایا : "تمہیں یہ کھجوریں کہاں سے ملیں؟" اس نے عرض کیا : یہ ایک صاع ہم نے اپنی دو صاع کھجوروں کے بدلے خریدا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "ایسے نہ کیا کرو' یہ درست نہیں۔ بلکہ اپنی کھجوریں بیچ دو' پھر جو کھجوریں چاہو خرید لو"۔ (۴۸)

ہم دیکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنے والے بعض علماء جب لوگوں کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرتے ہیں تو ان کے کام میں ایک نقص نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ یہ بات تو واضح کر دیتے ہیں کہ فلاں کام غلط ہے اور فلاں کام حرام ہے' لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اس کی جگہ انہیں کیا کام کرنا چاہئے' یا اس کام کا صحیح طریقہ کار کیا ہے۔ حالانکہ شریعت کا طریقہ یہ ہے کہ لوگ جن حرام طریقوں سے اپنی کوئی غرض پوری کرتے ہیں' شریعت ان کی جگہ ان کا متبادل پیش کرتی ہے۔ مثلاً جب زنا کو حرام قرار دیا گیا تو اس کے ساتھ نکاح کا صحیح طریقہ بتا دیا گیا۔ اسی طرح اگر سود حرام کیا گیا ہے تو اس کی جگہ تجارت کو جائز قرار دے دیا گیا۔ خنزیر' مُردار' کچلی والے جانور اور پنجے سے شکار کرنے والے پرندے حرام قرار دیئے گئے' تو دیگر مویشیوں اور شکار کئے جانے والے جانوروں کو ذبح کر کے کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے علاوہ اگر کسی شخص سے حرام کام کا ارتکاب ہو جائے تو شریعت نے اس کیلئے توبہ اور کفارہ کا راستہ کھلا رکھا ہے' جس کی تفصیلات قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ لہٰذا مبلغ کو چاہئے کہ شریعت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نعم البدل پیش کرے' اور مشکل سے نکلنے کیلئے شرعی حل تلاش کرے۔ (۴۹)

یہاں یہ اشارہ کر دینا مناسب ہے کہ متبادل پیش کرنا بہرحال استطاعت کے مطابق ہی

ممکن ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک کام غلط ہوتا ہے جس سے پرہیز کرنا واجب ہوتا ہے' لیکن حالات کی خرابی کی وجہ سے یا لوگوں کی شریعت سے دوری کی وجہ سے عملاً کوئی مناسب نعم البدل موجود نہیں ہوتا' یا داعی کو بروقت کوئی متبادل یاد نہیں آتا' یا وہ ان چیزوں سے واقف نہیں ہوتا جو صحیح متبادل بن سکتی ہیں۔ ان حالات میں بھی اس کے لئے غلطی پر تنبیہہ کرنا اور برائی سے روکنا ضروری ہے' اگرچہ وہ ان کی توجہ کسی متبادل کی طرف مبذول نہ کرا سکے۔ ایسی صورتحال عام طور پر بعض مالی معاملات اور سرمایہ کاری کے ان طریقوں میں پیش آتی ہے جو غیر مسلم معاشروں میں وجود میں آئے اور پھر اپنی تمام قباحتوں اور خلاف شریعت امور سمیت مسلمانوں کے معاشروں میں رواج پا گئے اور مسلمانوں کی کوتاہی اور کمزوری کی وجہ سے ان کا کوئی شرعی نعم البدل ایجاد کر کے رائج نہیں کیا جا سکا۔ اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ یہ نقص اور کوتاہی ہے اور شریعت میں ان کے متبادل موجود ہیں اور ایسے حل موجود ہیں جن کو اختیار کر کے مسلمان اس مشکل سے نکل سکتے ہیں' خواہ کسی کو ان حلول کا علم ہو یا نہ ہو۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱) سنن ترمذی' حدیث نمبر ۲۰۷۹۶۔ امام ترمذی نے فرمایا : یہ حدیث حسن ہے۔
(۲) فتح الباری' حدیث ۳۵۱۸۔ (۳) صحیح مسلم' حدیث ۲۵۸۴۔ (۴) صحیح بخاری
(۵) صحیح مسلم' حدیث ۲۵۸۴ (۶) ملاحظہ ہو' فتح الباری ۹/ ۱۰۴

(۷) مسند طیالسی' معجم کبیر طبرانی' ۱۹ / ۱۹۴ - حدیث ۴۳۵ - سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث ۲۶۲۳۔

(۸) فتح الباری ۷ ۶۴۴ (۹) سنن ابن ماجہ' طبع عبدالباقی' حدیث ۴۱۲۰۔
(۱۰) صحیح مسلم طبع عبدالباقی' حدیث ۹۷ (۱۱) صحیح مسلم طبع عبدالباقی' حدیث ۹۶
(۱۲) صحیح مسلم' حدیث ۱۶۵۹

(۱۳) جامع ترمذی حدیث ۱۹۴۸۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔
(۱۴) سنن ترمذی' حدیث ۱۱۹۹۔ امام ترمذی نے فرمایا : یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔
(۱۵) صحیح بخاری' حدیث ۱۹۳۶
(۱۶) مسند احمد ۲/ ۵۱۶۔ الفتح الربانی ۱۰/ ۸۹

(۱۷) صحیح بخاری' فتح الباری حدیث ۴۹۹۴

(۱۸) سنن نسائی' کتاب آداب القضاۃ' باب الاستعداء۔ صحیح سنن نسائی حدیث ۴۹۹۹

(۱۹) صحیح مسلم حدیث ۲۸۵ (۲۰) فتح الباری حدیث ۱۳۲۸

(۲۱) جامع الاصول ۷/ ۸۳ تا ۸۷

(۲۲) معجم کبیر طبرانی' حدیث ۱۱۵۵۲۔ ج ۱۱ص ۲۲۰۔ ہیثمی نے فرمایا: اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ (مجمع ۲/۱۰)

(۲۳) سنن ابن ماجہ' طبع عبد الباقی حدیث ۵۲۰۔ صحیح ابن ماجہ حدیث ۴۲۸

(۲۴) فتح الباری' جلد ۱' صفحہ ۳۲۴' ۳۲۵

(۲۵) تفسیر ابن جریر طبری ۱۴/ ۳۳۳۔ اس کی سند حسن ہے۔

(۲۶) سنن ابی داؤد' حدیث ۲۲۸۶۔ امام البانی نے اسے صحیح ابی داؤد میں ذکر کرکے صحیح قرار دیا ہے۔ (حدیث ۲۲۸۸)

(۲۷) مسند احمد' الفتح الربانی ۱۴/ ۴۴۔ (۲۸) دیکھئے عون المعبود۔ ۷/ ۲۹۲

(۲۹) دیکھئے دلیل الفالحین ۶/ ۱۳۰ (۳۰) صحیح بخاری' فتح الباری' ۷/۱

(۳۱) صحیح مسلم' حدیث ۴۳۶۔

(۳۲) سنن نسائی ۲/ ۹۲۔ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (صحیح سنن نسائی' حدیث ۸۵ ج)

(۳۳) سنن ابی داؤد' حدیث ۴۹۰۸۔ صحیح ابی داؤد (حدیث ۴۱۰۲)

(۳۴) صحیح مسلم' حدیث ۳۰۰۰ (۳۵) فتح الباری' حدیث ۲۶۶۲' کتاب الشہادات

(۳۶) صحیح الادب المفرد' حدیث ۱۳۷۔ امام البانی نے فرمایا: "یہ حدیث حسن ہے"۔

(۳۷) فتح الباری' حدیث ۲۶۶۳ (۳۸) فتح الباری ۱۰/ ۴۷۸۔

(۳۹) صحیح مسلم' کتاب الزہد والرقائق (۴۰) فتح الباری ۱۰/ ۴۷۸۔

(۴۱) سنن بیہقی ۱/ ۴۶۔ سلسلہ صحیحہ' حدیث ۲۸۲۰

(۴۲) یہ نکتہ مجھے علامہ شیخ عبدالعزیز بن باز نے بتایا تھا' جب میں نے ان سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا۔

(۴۳) سنن نسائی کتاب التطبیق باب کیف التشہد الاول۔ صحیح سنن نسائی' حدیث ۱۱۱۹۔

(۴۴) صحیح بخاری مع فتح الباری ۸۳۵ (۴۵) صحیح بخاری مع فتح الباری ۴۰۵

(۴۶) صحیح بخاری مع فتح الباری ۴۱۳۔ (۴۷) بخاری و فتح الباری ۲۳۱۲

(۴۸) مسند احمد ۳/ ۶۷

گوشہ خواتین

ماں کی عظمت

—— مختار حسین فاروقی 'ملتان ——

ماہ اپریل میں بچوں کے لئے جتنے رسالے آئے سب نے کسی نہ کسی انداز میں "ماں کی عظمت" کو اجاگر کیا تھا اور یہ جان کر حیرت ہی میں اضافہ ہوا کہ دنیا میں شاید ہی کوئی معقول انسان ہو جو ماں کی عظمت کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ بلکہ تمام مشاہیر و زعماء اقوام عالم یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آج وہ خود عظمت کی جن بلندیوں پر ہیں اُن کو وہاں تک پہنچانے میں ماں کی تربیت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ بات صرف دنیا کی عظیم اور رہنما ہستیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر سلیم الفطرت اور ذی شعور انسان کا ادراک یہیں تک پہنچتا ہے' یا وہ خود تجربات سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں روڈ ٹرانسپورٹ کا جو حال ہے اس کے پیش نظر یہ جملہ آپ کو اکثر لکھا ہوا ملے گا" ماں کی دُعا —— جنت کی ہوا"۔

الحمدللہ یہ اچھی بات ہے کہ ہم لوگ اپنے والدین اور بالخصوص ماؤں کے بارے میں اچھے جذبات رکھیں اور اُن کے احسانات کا تذکرہ کریں —— مگر یہ سوال اپنی جگہ لمحہ فکریہ فراہم کرے گا کہ اچھی مائیں کہاں سے آتی ہیں؟ کیا اچھی مائیں درآمد کی جاتی ہیں؟ کیا اچھی مائیں آسمان سے آتی ہیں؟ کیا اچھی مائیں....؟....؟ جس طرح کہا جاتا ہے کہ آج کا بچہ کل کا باپ ہو گا' اِسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کی بچی کل کی ماں ہو گی۔

چنانچہ جیسے ایک لڑکے کو اچھی تربیت کے ذریعے کل کا ایک ذمہ دار انسان بنایا جا سکتا ہے —— ایک اچھا صنعت کار' کارخانہ دار' ایک وزیر' ایک رہنما' ایک وزیر اعظم' ایک استاد' ایک پروفیسر' ایک انجینئر' ایک ڈاکٹر' ایک منتظم' ایک مصلح' ایک خطیب' ایک مفتی' ایک فقیہ اور ایک سچا مذہبی رہنما اچھی تربیت ہی کا ثمرہ ہو سکتا ہے —— تو یہ بات ہماری آنکھوں سے کیونکر اوجھل ہو جاتی ہے کہ ایک اچھی ماں بھی آج کی

بچوں کی [illegible] اور مثالی تربیت کا ثمرہ ہو سکتی ہے۔

[illegible] ہے کہ آج اچھی ماں کی عظمت کے گُن گائے جا رہے ہیں اور جنہیں اچھی مائیں یا اچھی تربیت میسر آ گئی وہ اپنی قسمت پر نازاں نظر آ رہے ہیں' مگر آج کے بچے کو ایک اچھی تربیت گاہ اور ایک اچھی ماں فراہم کرنے کا بارِ گراں کس کے سر ہے؟ آج کی بچی کو بیس سال بعد ایک مثالی ماں کے روپ میں ڈھالنا کس کی ذمہ داری ہے؟ کیا یہ کام خود بخود ہونا ممکن ہے؟ نہیں' ہرگز نہیں ــــــ اس کے لئے بھی بے حد محنت و مشقت اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

آج کے بڑے آدمی' آج کے منصوبہ ساز' آج کے راہنمایانِ قوم اور آج کے معمارانِ قوم کے ذمہ یہ اجتماعی فرض ہے کہ "ماں کی عظمت" کی بحالی چاہتے ہیں تو ہر شیر خوار بچے کو ایسی ماں کا نمونہ بہم پہنچائیں جو حوصلہ مند' پاک دامن' عفت مآب' صالحہ' خدا ترس' عبادت گزار' اسلام کی شیدا اور قرونِ اولیٰ کی صالح خواتین کا نمونہ ہو۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارا مستقبل شاندار اور محفوظ ہو گا' برائی کا خاتمہ ہو سکے گا اور خیر پھیل سکے گا۔ اچھی اقدار پھلیں اور پھولیں گی اور برائی اور بُری باتوں کا خاتمہ ہو سکے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو آج کے بچے کل بڑے ہو کر اچھی ماؤں سے محرومی کے سبب چور' ڈاکو' اچکے' بے ایمان' راشی' بدمعاش' کرپٹ اور میر جعفر اور میر صادق کے روپ میں قوموں کو فروخت کرنے والے' قوموں کو قرضوں میں جکڑنے والے اور قومی معاملات اور بین الاقوامی معاملات میں کروڑوں اور اربوں روپوں کی کمیشن وصول کرنے والے بن کر سامنے آئیں گے۔

آیئے' ایک لمحے کے لئے سوچتے ہیں کہ جس ماں کی عظمت کے ہر شخص گُن گاتا نظر آتا ہے اس عظیم ماں کے اوصاف کیا ہو سکتے ہیں' اور اگر یہ بات سمجھ میں آ جائے تو دوسرا مرحلہ یہ ہو گا کہ ہم اپنی آئندہ نسل کی خواتین میں یہ اوصاف کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ کسی اچھی بات کا ادراک حاصل کر لینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا بلکہ اصل کام تو اس کو عملی صورت میں ڈھالنا ہے۔

دنیا کی عظیم ہستیاں عظیم ماؤں ہی کی تربیت کا نتیجہ ہیں' تو آیئے عظیم لوگوں کے اپنی

ماؤں کے بارے میں تاثرات سے بات شروع کرتے ہیں۔ جو باتیں متفقہ اور مشترک ہیں
وہ درج ذیل ہیں :

۱) ایک اچھی ماں ایک شفیق عورت ہوتی ہے۔
۲) ایک اچھی ماں ایک حوصلہ مند خاتون ہوتی ہے۔
۳) ایک اچھی ماں ایک سلیقہ شعار خاتون ہوتی ہے۔
۴) ایک اچھی ماں ایک اچھی گھریلو منتظمہ ہوتی ہے۔
۵) ایک اچھی ماں اعلیٰ اقدار پر خود بھی عمل پیرا ہوتی ہے اور اولاد کو ان پر عمل کرنے کے لئے ابھارتی ہے' جیسے سچ بولنا' خدمت خلق کرنا' غریبوں' ضرورت مندوں کی مدد کرنا' ناپ تول میں کمی نہ کرنا' ظلم نہ کرنا' کسی کا حق نہ مارنا' بے حیائی کے کاموں سے احتراز کرنا وغیرہ۔
۶) ایک اچھی ماں باکردار خاتون ہوتی ہے۔
۷) ایک اچھی ماں اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کرنے والی خاتون ہوتی ہے۔
۸) ایک اچھی ماں ایثار و قربانی کا پیکر ہوتی ہے۔
۹) ایک اچھی ماں مصیبتوں اور مشکل حالات کا مقابلہ کرتی ہے اور یہی جذبہ اولاد میں پیدا کرتی ہے۔
۱۰) ایک اچھی ماں ایک اچھی عورت کے روپ میں شوہر کے گھر میں میسر وسائل سے کام لے کر اولاد کی اعلیٰ ترین تربیت کرتی ہے۔
۱۱) ایک اچھی ماں اولاد کی تربیت سے کبھی غافل نہیں رہتی اور اولاد کی تربیت کو چھوڑ کر دوسرے غیر ضروری کاموں پر توجہ نہیں کرتی۔

ہو سکتا ہے کہ اوپر درج گیارہ باتوں میں کچھ تکرار بھی ہو' اور عین ممکن ہے کہ ہر ماں میں تمام خوبیاں نہ پائی جا سکیں' تاہم ایک اچھی ماں کے اوصاف کا بڑا حصہ اوپر درج سطور میں آ گیا ہے۔

اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ آیئے سوچیں کہ کیا ہمارے اِس دَور میں اکثر گھروں میں

ایسی مائیں موجود ہیں؟ بات اکثریت کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔ انسانی معاملات میں سو فیصد نتائج تو قریباً ناممکن الحصول ہوتے ہیں۔ آج کے معاشرے میں آپ دائیں بائیں نظر [illegible] حالات کا جائزہ لیں اور قومی اخبارات کے کچھ دنوں کے تراشے جمع کر لیں تو [illegible] آئے گا اور آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اچھی ماں کے معیار پر اترنے والی خواتین تو شاید ہمارے معاشرے کے ۱۵۔۲۰ فیصد گھروں میں بھی موجود نہیں ہیں۔ کیا ان ۱۵۔۲۰ فیصد گھروں کے تربیت یافتہ بچے معاشرے کے سیلاب بد تمیزی کے آگے بند باندھ سکیں گے؟ یا آئندہ دنوں میں الیکٹرانک میڈیا (ریڈیو' ٹی وی' وی سی آر' ڈِش' کمپیوٹر انٹرنیٹ وغیرہ) کی یلغار کے باعث یہ قلیل تعداد اسی سیلاب عریانی وفحاشی وبے دینی کی نذر ہو جائے گی اور شاید آج سے ۱۵ سال بعد کا تجزیہ نگار یہ لکھنے پر مجبور ہو جائے کہ ہمارے ہاں اچھی اور مثالی ماؤں کا تناسب شاید کم ہو کر ۵ فیصد رہ گیا ہے۔ اعاذنا اللہ مِن ذٰلک

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ آج کے معاشرے میں پرورش پانے والے بچوں کے مستقبل کو مثالی انسانی اور اعلیٰ قدروں پر استوار کرنے کے لئے ہمیں آج کی ماؤں کی کیا تربیت کرنی چاہئے کہ وہ اپنا کردار بھرپور انداز میں ادا کر سکیں' اور آج کے جو بچے اعلیٰ عہدوں تک پہنچ کر اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا کام کریں یا دیگر اعلیٰ انتظامی ذمہ داریاں سنبھالیں تو وہ فخریہ کہہ سکیں کہ میرے اِس مقام تک پہنچنے میں میری والدہ محترمہ کا بڑا حصہ ہے' یا آج کی بچیاں جن کے ہاتھ میں پوری انسانیت کا مستقبل آنے والا ہے وہ جب ذمہ داری کے منصب پر پہنچیں اور اپنے گھروں میں آباد ہو کر ماؤں کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے کے قابل ہوں تو وہ ایک مثالی ماں کا کردار ادا کر سکیں۔ اِن کے لئے کون کون سے طریقے اختیار کیے جائیں یا ان کے نصاب میں کس طرح کی تبدیلیاں کی جائیں کہ وہ اپنے ان فرائض کی احسن طریق پر ادائیگی میں فخر محسوس کر سکیں۔

اس مسئلے کا ایک مشکل پہلو یہ بھی ہے کہ آج کے دور میں بھی ماں کی عظمت کے گُن گانے کے باوصف عملی طور پر دنیا میں عورت (یا ماں) کی تربیت کے لئے کوئی مثبت انداز اختیار نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ عملی طور پر عورت کو ہر پہلو سے نظروں سے گرا کر اور ایک "اشتہاری مواد" کی حیثیت دے کر اس کے اعلیٰ مقام سے دربدر کیا جا رہا ہے اور نتیجہ

کے طور پر آئندہ نسلوں کو اخلاقی قدروں سے عاری بنانے اور اچھے انسانی کردار کی ادائیگی سے بے نیاز کیا جارہا ہے۔ یہ تو آئندہ آنے والا وقت بتائے گا تاہم یہ بات عیاں ہے کہ ؎ "جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا!" کے مصداق ہم نے انتظام کر دیا ہے کہ آئندہ معاشرہ "انسانوں کا معاشرہ" کی بجائے "حیوانوں کا معاشرہ" کہلانے کا زیادہ مستحق ہو گا۔

آج بھی اگر معاشرے کے قلیل لوگوں کو "ماں کی عظمت" اور "ماں کی تربیت" کی قدر و قیمت کا احساس ہے تو غنیمت ہے' اس چنگاری سے محنت و ریاضت اور عرق ریزی سے شعلہ جوالہ پیدا کیا جا سکتا ہے' قطع نظر اس سے کہ یہ کٹھن کام کیسے ہو گا اور کون کرے گا؟ چلو اس کا تذکرہ تو کرتے ہیں اور اس کو عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں' شاید کبھی کوئی "مردے از غیب" سامنے آجائے اور یہ ناممکن بھی ممکن ہو جائے۔ یہ بہرحال حقیقت ہے کہ یہ کام ہونا ضروری ہے اور یہ کام ایک حد تک کئے بغیر مستقبل میں عالمی اسلامی معاشرہ تو کجا انسانی معاشرہ کو برقرار رکھنا بھی next to impossible ہے۔

پانچ نکاتی لائحہ عمل

آج کی بچیوں کو مستقبل کی مثالی ماں کا کردار ادا کرنا ہے۔ اس کے لئے چند ناگزیر باتوں کا تذکرہ نیچے کیا جارہا ہے۔ اندازِ بیان تو بالکل شوخ نہیں ہے' تاہم نفس مضمون میں ایک فطری کشش اور divine beauty ہے جس کی وجہ سے شاید چند سعید روحیں اس کی طرف کھنچ آئیں اور اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے کمرِ ہمت کس لیں۔ وہ چند باتیں جنہیں "پانچ نکاتی لائحہ عمل" کا نام دیا جا سکتا ہے' درج ذیل ہیں :

۱) انسان کو عظمت کا احساس دلانے والی باتوں میں سب سے نمایاں چیز مذہب ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جو انسانوں میں اعلیٰ انسانی قدریں' بے لوث خدمت' آخرت کا اجر و ثواب اور ایک خدائے واحد کا تصور دے کر انسانوں میں یکسانیت اور بھائی چارہ پیدا کرتا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد وحی الٰہی (Divine Revelation) پر ہے۔ اسی وحی الٰہی کے مظہر تورات' انجیل وغیرہ ہیں اور اسی کی ایک شکل قرآن مجید ہے۔ مذہب بالعموم اور

قرآن مجید بالخصوص عظمت انسانی کو اجاگر کرتا ہے' مساوات انسانی کا درس دیتا ہے اور مرد و عورت کی ذمہ داریوں کے فرق کے باوجود شرف انسانی اور جزائے آخرت میں [illegible] کو برابر قرار دیتا ہے۔ اس تصور سے عورت "نیچ ذات" سے بلند ہو کر مردوں کے برابر ہو گی اور اس کو عظمت کا احساس ہو گا اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائے گی۔

حیرت ہے کہ آج عورت کو عظمت کا احساس دلانے والی اس چیز ــــ مذہب' اسلام' قرآن مجید ــــ ہی کو دقیانوسی کہہ کر ترک کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ عورت کو اندھیروں اور پستیوں سے نکال کر عظمتوں اور بلندیوں پر پہنچانے والا اسلام اور قرآن ہی ہے۔ عورتوں کے لئے مذہبی تعلیم صرف قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم نہیں ہے' بلکہ اسے سمجھ کر پڑھنے اور عام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲) اس مقصد کے لئے دوسری اہم چیز تعلیم ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر انسان کو تعلیم کا حق حاصل ہے اور اس میں عورتیں بھی شریک ہیں۔ اسلام اور قرآن مجید اس کا داعی ہے' مگر تعلیم کے نام پر جہالت' بے حیائی' عریانی و فحاشی وغیرہ تعلیم کے تصور کے ساتھ مذاق ہے۔ ایسی تعلیم ازبس ضروری ہے جس میں اعلیٰ انسانی قدروں کی عظمت' اُن کا حصول' بہادری' محنت کی عظمت' پاکبازی' اعلیٰ کردار اور مساوات انسانی کا تذکرہ ہو۔ بالخصوص خواتین کے نصاب میں ایک مثالی ماں کے کردار کو اجاگر کیا جائے۔ اس کے برعکس آج کی تعلیم کے نتیجے میں عورت کو جو پڑھایا جا رہا ہے اس سے وہ نکاح اور گھر گرہستی کو ایک قید تصور کرتی ہے اور نکاح کی زندگی کی بجائے آزاد بلکہ آوارہ زندگی کو ترجیح دیتی ہے۔ یہ تعلیم "ماں کی عظمت" کے تصور کی کامل نفی ہے۔ عورت کی ذمہ داریوں میں گھر کی زندگی' اولاد کی تربیت اور بطور ماں کے بچوں میں اعلیٰ انسانی قدروں کی اہمیت و نشوونما ہی اصل ذمہ داری ہے۔ چنانچہ اس تصور کے منافی تعلیم کے تمام نصاب بیک جنبش قلم ختم کر دینے چاہئیں۔

۳) ایک مثالی ماں کے کردار کے پروان چڑھانے کے لئے تیسری اہم چیز عفت و عصمت کی حفاظت ہے' اور اس کے لئے جیسے علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ؎ "نسوانیتِ

زن کا نگہباں ہے فقط مَرد!" معاشرہ میں معاشی بوجھ کُل کا کُل مَرد پر ڈالا گیا ہے اور عورت کی اصل ذمہ داری گھر کی ملکہ کی حیثیت سے گھریلو معاملات کو انجام دینا اور اولاد کی تربیت و نگہداشت ہی بنتی ہے۔ عفت و عصمت کی حفاظت کا منطقی نتیجہ نکاح کا راستہ اور شادی شدہ زندگی ہے، جس سے عورت کی عفت کی حفاظت بھی مَرد کے ذمہ آتی ہے۔

جنسی اعتبار سے آزاد زندگی اور طلاق یافتہ زندگی عورت کی عظمت کو تار تار کرنے کے مترادف ہے۔ طلاق کی زندگی سے بچوں کی نفسیات پر جو برے اثرات پڑتے ہیں وہ ماں کی عظمت کے اس آفاقی تصور کے منافی ہیں۔ لہٰذا اولاً عورت کو عفت و عصمت کی زندگی گزارنی چاہئے، پھر نکاح کی زندگی گزارنی چاہئے۔ مَردوں کو عورتوں پر ظلم نہیں کرنا چاہئے، تاہم عورت کو بھی گھر کی چار دیواری کے اندر اولاد کی تربیت کا حق ادا کرنا چاہئے۔ ایسا ماحول ہو اور ایسا نظام تعلیم جو اسی نقطہ پر نگاہوں کو مرکوز کر سکے۔

جوان عورتوں کی ملازمت، غیر مَردوں سے آزادانہ میل جول، مخلوط تعلیم، مخلوط اجتماعات، مخلوط دفاتر بالکل ختم کر دینے چاہئیں۔ عورتوں کی بطور ایئر ہوسٹس ملازمت پر پابندی عائد کر دی جائے۔ مَردوں کے ہسپتالوں میں عورت نرسوں کی موجودگی ختم ہونی چاہئے اور عورتوں کو مَردوں کی نگاہوں سے بچانے کے لئے اشتہاروں میں بھی عورت کی تصویر کی اشاعت پر مکمل پابندی عائد کی جانی چاہئے۔ ستر و حجاب کے قرآنی احکام کا نفاذ اس مقصد کے حصول کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے تاکہ بقول علامہ اقبال ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوشِ شبیرے بگیری

اس مقصد کے لئے عورتوں کے مقابلۂ حسن پر بھی پابندی ناگزیر ہے اور بے جا فیشن اور مقابلوں پر بھی قدغن ضروری ہے۔ معاشرے میں سادگی کو رواج دینا ضروری ہو گا۔ البتہ عورتوں کی صحت کے لئے ورزشیں، کھیلیں اور دوسری ضروری ہم نصابی سرگرمیاں، جو "ماں کی عظمت" کے اعلیٰ کردار کے حصول کے لئے کسی حد تک ناگزیر ہیں، حدود و قیود کے ساتھ ان کا جاری رہنا ضروری ہے۔

ایسے اقدامات بھی ضروری ہیں کہ جس سے مَردوں اور عورتوں کا اخلاق خراب نہ ہو کہ مَرد بیوی کو نظرانداز کر کے دوسرے راستے تلاش کرنے پر مجبور ہو اور عورت بھی آزادانہ میل جول کے نتیجے میں غیر مَردوں سے رابطہ رکھنے پر اکسائی جائے۔ اس مقصد کے لئے گندی فلموں پر پابندی ازبس ضروری ہے۔ ٹی وی پر ڈرامے اور مخربِ اخلاق پروگرام یکسر بند کر دینے چاہئیں۔ سنیما' ویڈیو فلمیں بالکل بند کر دی جائیں۔ بے حیا اور فاحشہ عورتوں کے گانے' عشقیہ غزلیں اور دیگر جنسی اکساہٹ کا سبب بننے والے لٹریچر' رسائل اور تصاویر وغیرہ پر سخت پابندی عائد کی جانی چاہئے۔ ڈش انٹینا پر مکمل پابندی عائد ہونی چاہئے تاکہ اخلاقی گندگی کے تمام راستے بند کرنے کے بعد کسی چور دروازے سے یہ گندگی پھر گھروں میں داخل نہ ہو سکے۔

اس کام میں ایسا نہ ہو کہ "عورت کی عظمت" اور "ماں کی عظمت" کے حوالے سے ساری پابندیاں عورتوں پر ہی لگا دی جائیں اور مَرد پہلے کی طرح آزاد رہیں۔ یہ پابندیاں مَردوں کو بھی برداشت کرنا ہوں گی تاکہ ایک اچھا معاشرہ وجود میں آسکے۔ ان جرائم کی مکمل بیخ کنی کے لئے سخت ترین سزائیں نافذ کی جانا ضروری ہوں گی تاکہ اچھی مائیں اور نتیجتاً اچھے بچے معاشرے کا حصہ بن سکیں۔

۴) الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے سادہ زندگی بالخصوص نکاح شادی میں سادگی کی ترغیب دی جائے اور ستر و حجاب کی پابندی کرائی جائے۔ فحش لٹریچر اور مواد پر پابندی کرانے اور بالخصوص روزنامہ اخبارات میں فلمسٹار عورتوں کی بطور ideal تصویروں کی اشاعت کی مکمل بندش کے بعد ــــــ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جہاں طلاق کی شرح ناقابل یقین حد تک کم ہو جائے گی' جس سے بچوں کی تربیت پر بے حد اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔

اس ضمن میں اخبارات کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اخبارات کو اچھے معاشرے کی تشکیل میں اچھی' باکردار' باحیا اور بااخلاق ماؤں کے کردار کو اجاگر کرنا چاہئے۔

۵) مذہب سے وابستگی' تعلیم کی فراوانی' گندے ماحول اور لٹریچر سے گلوخلاصی کے بعد بھی اپنے بچوں اور بالخصوص بچیوں کی صحیح تربیت کے لئے آج کے والدین کا کردار پھر

بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ آج کے والدین بالخصوص مائیں اپنے ماضی سے توبہ کریں' نیکی اور پارسائی کی زندگی بسر کریں (والد بھی لازماً ایسا ہی کریں مگر اس مضمون میں صرف ماؤں کے کردار کا تذکرہ ہے) تو اُن کی سابقہ زندگی کے اثرات سے نئی نسل محفوظ رہ سکتی ہے۔ حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "گناہ سے توبہ کرنے والا انسان (عورت یا مَرد) ایسا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں "۔

اور اچھے گھریلو ماحول کے لئے گناہوں سے توبہ لازمی چیز ہے۔ نئی نسل اور بالخصوص بچیوں کی تربیت میں توبہ بھی ایک موثر ہتھیار کا کام دے سکتی ہے' آزمائش شرط ہے۔

"ماں کی عظمت" کا احساس کرنے کے نتیجے میں مندرجہ بالا پانچ کام ضروری ہیں۔ انفرادی سطح پر یہ لائحہ عمل زیادہ موثر نہیں ہے' لہٰذا اس کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے اور پالیسی ساز اداروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ انسانی مستقبل کے لئے یہ اقدامات کریں۔ عورتوں کو بھی ان کے کردار کی عظمت کا احساس دلایا جائے تاکہ وہ خود بھی خوش دلی سے اس میں شریک ہوں تو ہر گھر ایک جنت ارضی بن سکتا ہے اور اس میں پرورش پانے والے بچے اگلے پچاس سال تک اپنی ماؤں کے احسانات کے گن گاتے رہیں گے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔

ضرورت رشتہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد :	۴۷
شمارہ :	۷
ربیع الاول	۱۴۱۹ھ
جولائی	۱۹۹۸ء
فی شمارہ	-/۱۰
سالانہ زرِ تعاون	-/۱۰۰

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ ' کینیڈا ' آسٹریلیا ' نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب ' کویت ' بحرین ' قطر، عرب امارات ' بھارت ' بنگلہ دیش ' افریقہ ' ایشیا، یورپ ' جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران ' ترکی ' اومان ' مسقط ' عراق، الجزائر ' مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت : 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700۔فون : 03۔02۔5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون : 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن' طابع : رشید احمد چودھری' مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

مطالبۂ تکمیل دستورِ خلافت ـــــ ملک گیر کنونشن کا انعقاد

جون کا پورا مہینہ ملکی و ملی اعتبار سے نہایت بھرپور اور ہنگامہ خیز رہا۔ ۲۸ مئی کے کامیاب ایٹمی تجربے کے بعد جو میاں نواز شریف کے اس جرأت مندانہ فیصلہ کا نتیجہ تھا جس کی پشت پر زبردست عوامی دباؤ اور حالات کا جبر کارفرما تھا' نہ صرف یہ کہ پورے ملک میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی بلکہ پورے عالم اسلام میں پاکستان کی خصوصی حیثیت اور مقام کا اعتراف کرتے ہوئے اس پر خراج تحسین پیش کرنے اور یکجہتی کے اظہار میں بھی کسی بخل سے کام نہ لیا گیا۔ بالخصوص سعودی عرب' ایران اور افغانستان کی حکومتوں کی جانب سے تائیدی بیانات اور تعاون کی یقین دہانیاں نہایت حوصلہ افزا تھیں ـــــ اس موقع پر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' نے جہاں اس جرأت مندانہ فیصلے پر میاں نواز شریف صاحب کو مبارکباد کا پیغام دیا' وہاں ساتھ ہی ملک میں نفاذ شریعت کی خاطر دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کے قیام اور سودی نظام کے فوری خاتمے کا مطالبہ بھی نہایت زوردار انداز میں پیش کیا۔ امیر تنظیم نے یہ مطالبہ ایک نمایاں اخباری اشتہار کی صورت میں حکومت وقت اور عوام کے سامنے رکھا جس میں نفاذ شریعت کیلئے "خالص دینی دھماکہ" کی اصطلاح کو اختیار کر کے اس کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کیا گیا تھا ـــــ الحمدللہ کہ "دینی دھماکہ" کی یہ اصطلاح زبان زدِ خاص و عام ہو گئی اور قریباً تمام مذہبی و دینی طبقات کی جانب سے دینی دھماکے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

اس صورتحال کو سازگار پاتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی نے ۵ جون کے خطاب جمعہ میں یہ خیال پیش فرمایا کہ تنفیذ و نفاذ شریعت کے موضوع پر تمام دینی جماعتوں کا ایک ملک گیر کنونشن بلانا چاہئے تاکہ اس معاملے کو بھی ایک بھرپور عوامی مطالبے کی صورت میں اٹھایا جا سکے۔ امیر تنظیم نے امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد صاحب کو مشورہ دیا کہ جماعت اسلامی چونکہ ایک بڑی جماعت ہے جس کے وسائل بھی زیادہ ہیں اور چونکہ قیام پاکستان کے معاً بعد "مطالبہ دستورِ اسلامی" کی مہم چلانے کی سعادت جماعت اسلامی ہی

کے حصے میں آئی تھی لہٰذا مناسب یہی ہے کہ قاضی صاحب اس کنونشن کا اہتمام کریں اور اس معاملے میں قائدانہ رول ادا کریں۔ محترم قاضی صاحب نے بعض وجوہات کی بنا پر کنونشن کے انعقاد سے معذرت کی۔ تاہم انہوں نے اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کنونشن بلائیں۔ محترم قاضی صاحب کے مشورے سے ۲۸ جون کا دن کنونشن کے لئے مقرر کیا گیا ـــــ تنظیم اسلامی نے ملک کی تمام نمایاں دینی جماعتوں کے سربراہان سے رابطہ کر کے انہیں کنونشن میں شرکت کی دعوت دی اور بحمد اللہ ان کے تعاون سے ۲۸ جون کو یعنی ایٹمی دھماکے کے ٹھیک ایک ماہ بعد' اس ملک گیر کنونشن کا انعقاد عمل میں آیا' جو بہت سے اعتبارات سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کنونشن کی تفصیلی باتصویر روداد تو "ندائے خلافت" کے آئندہ شمارے میں شائع کی جائے گی' تاہم ذیل میں ہم ان دینی جماعتوں کے سربراہان کے نام درج کئے دیتے ہیں جو اس جلسے میں شریک ہوئے اور وسیع و عریض قرآن آڈیٹوریم میں جہاں سامعین کی کثرت کے باعث تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی' موضوع زیر بحث پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور مجوزہ "یک نکاتی" مطالبہ کے حق میں یک آواز ہو کر سرگرم عمل ہونے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں شریک زعمائے ملت میں سے معمر ترین اور بزرگ ترین دینی رہنما مولانا عبد الستار خان نیازی تھے۔ ان کے علاوہ محترم قاضی حسین احمد' مولانا محمد اکرم اعوان' علامہ سید ساجد نقوی' پروفیسر ساجد میر' مولانا مختار گل اور مولانا معین الدین لکھوی نے بھی شرکت فرمائی۔ بنگلہ دیش سے ایک عالم دین مولانا ثمیر الدین غازی پوری بھی بطور مبصر اس جلسہ عام میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔

پریس ریلیز

ایٹمی دھماکے پر تبصرہ اور "دینی دھماکے" کی ضرورت پر

امیر تنظیم اسلامی کا اظہارِ خیال ـــــ (۲۹/ مئی کے خطاب کے اہم نکات)

- اللہ تعالیٰ کا تہہ دل سے شکرادا کرنا مسلمانانِ پاکستان پر واجب ہے کہ اُس نے ملک و قوم کے اعتبار سے اس انتہائی نازک اور اہم موقع پر وزیراعظم پاکستان کو صحیح اور جرأت مندانہ فیصلہ کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائی۔ اللہ کی جناب میں ہدیہ تشکر ادا کرنے کے بعد میاں محمد نواز شریف پوری قوم کی طرف سے مبارکباد اور شکریئے کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے شدید عالمی دباؤ کے باوجود پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کا جرأت مندانہ اقدام اٹھایا۔
- ایٹمی صلاحیت کا کامیاب مظاہرہ کرنے سے پاکستان نے نہ صرف اپنے ازلی اور انتہاپسند دشمن بھارت کا حساب چکادیا ہے بلکہ اسلامی دنیا کی طرف سے "فرض کفایہ" بھی ادا کردیا ہے۔
- یہ درست ہے کہ ایٹمی دھماکوں کے بعد اب ہم پر ہر طرف سے معاشی پابندیاں عائد کردی جائیں گی اور پاکستانی قوم کو سخت اور کٹھن حالات سے گزرنا ہوگا لیکن قرآن کے بیان کردہ اصول کے "سختی کے ساتھ ہی آسانی ہے" کے مطابق اگر اللہ کی مدد ہمارے شاملِ حال رہی تو اسی سختی کے بعد آسانی اور خوشحالی کا دور آئے گا۔
- اللہ کی مدد کے حصول کا یقینی راستہ یہ ہے کہ ملک خداداد پاکستان میں اللہ کے دین کو غالب و نافذ کیا جائے جس کے ابتدائی قدم کے طور پر پاکستان کے دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کو یقینی بنانے کے لئے فوری طور پر دستور میں ضروری ترامیم کی جائیں اور سود کے خاتمہ کا اعلان کیا جائے۔ اس مبارک کام کے لئے اس وقت حالات نہایت سازگار ہیں جن سے فائدہ نہ اٹھانا بہت بڑی غلطی ہوگی۔
- ایٹمی صلاحیت کا حامل پاکستان جو پہلے بھی بعض اعتبارات سے عالم اسلام کی فکری قیادت کے منصب پر فائز تھا اب عسکری و دفاعی لحاظ سے بھی پوری اسلامی دنیا کا قائد بن گیا ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ پاکستان کا تیار کردہ بم درحقیقت "اسلامی بم" ہے، جو وقت آنے پر یہود و ہنود کے گھناؤنے اور مکروہ عزائم کو خاک میں ملادے گا۔
- احادیث نبویہؐ میں بیان کردہ پیشین گوئیوں کے ظہور کا وقت جلد آنے والا ہے اور مشرق وسطیٰ میں ایک بہت بڑی جنگ کی بھٹی عنقریب گرم ہونے والی ہے جس کے آخری مراحل میں یہود

اور مسلمانوں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوں گے۔ یہود کا قائد دجال ہوگا اور مسلمان حضرت مہدی کے زیر قیادت جنگ کریں گے جن کی مدد کے لئے حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوگا چنانچہ بعض احادیث کے مطابق جن دو اسلامی لشکروں کو اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے گا' ان میں سے ایک لشکر وہ ہوگا جو ہندوستان پر حملہ آور ہوگا اور دوسرا اسلامی لشکر وہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کرے گا۔

- یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان اور افغانستان اس مرحلے پر فیصلہ کن رول ادا کر سکیں گے۔ چنانچہ ان کے مابین دوستانہ اور قریبی تعلقات قائم کرنے کے لئے دونوں ممالک کے درمیان کنفیڈریشن قائم کی جائے۔ پاکستان اور افغانستان کی مشترکہ اسلامی افواج نہ صرف بیت المقدس کو اسرائیل کے غاصبانہ قبضے سے آزاد کرائیں گی بلکہ اسلام کے عالمی غلبہ کے لئے بھی ہراول دستہ کا کردار ادا کریں گی۔
- انتہاپسند ہندو جس کی نمائندگی بھارت کی حکمران جماعت بی جے پی کر رہی ہے' پاکستان اور اسلام دشمنی کی آگ میں جل رہا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان نظریاتی جنگ ابھی جاری ہے چنانچہ دو قومی نظریئے کی بنیاد پر قائم ہونے والے ملک کو دینی جذبے کے ذریعے ہی ناقابل تسخیر قوت بنایا جا سکتا ہے۔
- لہٰذا ضروری ہے کہ وزیراعظم نواز شریف ایٹمی دھماکوں کے بعد ملک کو مکمل طور پر اسلامی بنانے کے لئے قرآن و سنت کی بالادستی کا اعلان کر کے "خالص دینی دھماکہ" بھی کریں تاکہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبہ میں اپنا "مجوزہ و موعودہ" کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔
- اگر میاں محمد نواز شریف ایٹمی دھماکہ کر کے امریکی دباؤ مسترد کرنے کی طرح نفاذ اسلام کے ضمن میں بھی عالمی دباؤ کو نظرانداز کر کے پاکستان کو مثالی اسلامی ریاست بنا دیں تو پاکستان ہر لحاظ سے عالم اسلام کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ بن جائے گا۔
- امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی جانب سے عائد کردہ پابندیاں ملک و قوم کے لئے عارضی اور وقتی آزمائش ثابت ہوں گی۔ قومی سطح پر ان مشکلات کو برداشت کرنے سے نہ صرف بے پناہ قومی جذبہ پیدا ہوگا بلکہ قوم کی خوابیدہ اور پوشیدہ صلاحیتیں بھی پروان چڑھیں گی۔ خود کفالت کی منزل کی جانب پیش قدمی کے لئے غیر ملکی "ایڈ" کا بند ہونا ملک و قوم کے لئے بہترین ذریعہ اور غیر معمولی نعمت ثابت ہوگی۔

فریضۂ اقامتِ دین

کی اہمیت اور اس کے لئے

مطلوبہ جماعت کے لازمی اوصاف

امیر تنظیم اسلامی کا ۱۳/ فروری ۹۸ء کا خطاب جمعہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ○ ﴾

(التوبۃ ۱۱۹)

﴿ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ' اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ ﴾

(المجادلۃ ۲۲)

﴿ .. فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ ﴾ (المائدۃ ۵۶)

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○ ﴾ (الصف . ۴)

وعن عمر ﷛ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ((عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَۃَ ' فَاِنَّ الشَّیْطٰنَ مَعَ الْوَاحِدِ وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ)) (رواہ الترمذی)

وعن عبداللّٰہ ابن عمر (رضی اللّٰہ عنھما) قال قال رسول اللّٰہ ﷺ · ((یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ)) (رواہ الترمذی)

وعن الحارث الاشعری ﷺ قال قال رسول اللہ ﷺ :

((اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ ' اَللّٰهُ اَمَرَنِىْ بِهِنَّ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ))

(رواہ احمد والترمذیؒ)

وعَن عُمر ﷺ موقوفًا : ((لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ وَلَا جَمَاعَةَ بِالْاِمَارَةِ ' وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِالسَّمَاعَةِ ' وَلَا سَمَاعَةَ اِلَّا بِالطَّاعَةِ))

او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالٰی عنہ

آج کے موضوع پر گفتگو سے قبل اس سال عید الفطر کے موقع پر باغ جناح کے مختصر خطاب' اسی روز قرآن اکیڈمی کے خطاب جمعہ اور پھر مسجد دار السلام میں گزشتہ جمعہ کے خطاب میں جو باتیں عرض کی گئی تھیں ان کا لبِّ لباب یاد دہانی کے لئے عرض ہے۔

میں نے پاکستان کے خصوصی حالات کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ اس کے مستقبل' اس کی سالمیت اور اس کے وجود کے بارے میں واقعتاً بڑے شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں' جس کے نتیجے کے طور پر وہ شخص جو اولاً اپنے فرائض دینی کا شعور حاصل کر چکا ہو' ثانیاً وہ قیامِ پاکستان کا قائل ہو کہ اس کا قیام ایک درست اقدام تھا اور جو یہ سمجھتا ہو کہ قیامِ پاکستان درحقیقت احیاءِ اسلام کے سلسلے کی ایک کڑی ہے' اس کے لئے لازم ہے کہ "فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ" (دوڑو اللہ کی جانب) کے انداز میں پاکستان میں نظام اسلامی کی جدّوجہد کے لئے کمربستہ ہو جائے اور تن من دھن اس کے لئے وقف کر دے' اور اس کے لئے کسی نہ کسی جماعت میں ضرور شامل ہو۔ میں نے یہ بات موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں کہی تھی اور ان حالات کے پیش نظر میں نے عرض کیا تھا کہ پاکستان کا ہر وہ باشعور مسلمان جسے پاکستان سے محبت ہے' جو تا حال یہ سمجھتا ہو کہ پاکستان کا بننا درست تھا' اسے پاکستان میں نفاذِ اسلام کی جدّوجہد کے لئے کمربستہ ہو جانا چاہئے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مجھ جیسے بھی کچھ لوگ ہیں جنہیں آپ خواہ مجنون یا پاگل کہہ لیں' لیکن جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام عالمی سطح پر اسلام کے غلبے کے لئے اللہ تعالٰی کی ایک طویل تدبیر کی ایک کڑی

ہے۔ جو لوگ بھی اس تصور کے حامل ہوں انہیں تاخیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ حالات بڑی تیزی کے ساتھ دگرگوں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ "فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ" (دوڑو اللہ کی جانب) کے انداز میں اس فرض کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہو جانا چاہئے۔

مزید برآں کراچی میں دورۂ ترجمۃ القرآن کی اختتامی تقریب اور پھر لاہور آ کر رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو میں نے دوبارہ اسی موضوع پر جو خطاب کیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستانی مسلمان ہونے کے ناتے تو ہمارے لئے اب لازم ہے کہ بلا تاخیر کمرِ ہمت کس لیں اور تن من دھن لگانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ لیکن اس سے علیحدہ رہتے ہوئے ماورائے زمان و مکان ہر مسلمان خواہ وہ کہیں بھی ہو' خواہ تنہا ہو' کسی ملک میں اقلیت میں ہو یا اکثریت میں' آج ہے یا سو برس پہلے تھا' زمان و مکان کی تمام حدود و قیود سے ماوراء ہو کر بندۂ مومن کے فرائض اور اس کی دینی ذمہ داری میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ البتہ حالات کے تقاضوں کے اعتبار سے اس میں مزید سنگینی پیدا ہو جائے تو یہ دوسری بات ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ایک بندۂ مومن کا فرض اور اس کی بنیادی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اس حوالے سے عام طور پر میں ایک سہ منزلہ عمارت کا نقشہ اور اس حوالے سے بندۂ مومن کے دینی فرائض کے تین درجے بیان کرتا رہا ہوں۔

i) <u>عبادتِ رب یا بندگیٔ رب</u> : یعنی اپنی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اختیار کی جائے۔

ii) <u>دعوت و تبلیغ</u> : اسی کے لئے مزید اصطلاحات امر بالمعروف و نہی عن المنکر' دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس ہیں۔

iii) <u>اقامتِ دین</u> : یہ اس سلسلے کی بلند ترین منزل ہے۔ یعنی دین کو ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنا۔

بندۂ مومن پر اللہ کا حق

یہ تو میرا عام طور پر بیان کا اسلوب رہا ہے' لیکن ایک اور اعتبار سے یہ بات ایک

نئے انداز سے بیان کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے پہلے ہمیں قرآن مجید کے حوالے سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بندۂ مومن پر اللہ کا حق کیا ہے؟ اس مضمون کے اعتبار سے سورۃ الزمر بہت ہی اہم سورت ہے، جس میں صاف بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی بندگی کرو، اللہ کی عبادت کرو، اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ﴾ "کہہ دیجئے مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کروں اپنی اطاعت کو کلیتہً اس کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ یہی بات سورۃ البیّنۃ میں بایں الفاظ آئی ہے: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ﴾ "انہیں اسی بات کا حکم ہوا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اس کے لئے اپنی پوری اطاعت کو خالص کرتے ہوئے، یکسو ہو کر"۔

اب ظاہر بات ہے اگر ہم اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت خالص کرنا چاہیں لیکن ہم نظام باطل کے تحت سانس لے رہے ہوں تو ہم صرف جزوی طور پر اللہ کی اطاعت کر سکتے ہیں، کلی طور پر نہیں کر سکتے۔ ہماری زندگی کا جو اجتماعی پہلو ہے وہ تو نظام کے تابع ہے، بلکہ نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ ہمارا عدالتی نظام، ہمارا قانونی نظام، ہمارا معاشی نظام، ہماری معاشرتی اقدار سب کی سب ہمارے اختیار میں نہیں ہیں، وہ اُس نظام کے تابع ہیں جو اِس وقت یہاں قائم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص بہت بڑھ کر کوشش کر رہا ہو گا تو بھی دس فیصد اللہ کی اطاعت کر رہا ہو گا۔ ہماری زندگی کا باقی ۹۰ فیصد اجتماعی نظام کے تحت ہے۔ چنانچہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کو قائم کیا جائے، ورنہ "مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ" والی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

سورۃ الزمر سے اگلی سورت سورۃ المؤمن میں دعا کا یہ تصور دیا گیا ہے: ﴿فَادْعُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ﴾ یعنی "پس اللہ کو پکارو، اس کے لئے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔" دعا عبادت کا جوہر ہے۔ ایک حدیث میں دعا کو عبادت کا مغز اور دوسری میں اسے عین عبادت قرار دیا گیا ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ)) اور ((اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَۃُ))۔ یہ مضمون قرآن مجید کی جن چار سورتوں میں آیا ہے وہ چار سورتیں ایک سیریز میں آئی ہیں، سورۃ الزمر، سورۃ المومن، حٰمٓ السجدۃ (یا سورۂ فُصِّلت) اور پھر سورۃ الشوریٰ۔ ان سورتوں

میں ایک ترتیب اور تدریج کے ساتھ اس مضمون کا ارتقاء ہوا ہے۔ سورۃ الزمر میں' جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اس کی بندگی کرنے کا حکم ہوا ﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ اور سورۃ المومن میں فرمایا :
﴿ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ یعنی اللہ سے دعا کرنی ہے تو پہلے اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرو۔ یہ طرز عمل قابل قبول نہیں ہے کہ دعا تو اللہ تعالیٰ سے کر رہے ہیں جبکہ اللہ کے لئے ہماری اطاعت صرف جزوی اطاعت ہے' باقی پوری زندگی میں ہم غیر اللہ اور طاغوت کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اس صورتحال میں دعا ہمارے منہ پر دے ماری جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ۱۹۷۱ء میں ہمارے سامنے آئی تھی جب یہاں مساجد میں کئی روز تک مسلسل قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی رہی۔ مزید برآں حرمین الشریفین میں پاکستان کی حفاظت اور سالمیت کی خاطر دعائیں مانگی جاتی رہیں' لیکن وہ ساری دعائیں پوری دنیا کے مسلمانوں کے منہ پر دے ماری گئیں اور پاکستان دولخت ہو گیا اور تاریخ کی عظیم ترین شکست کی صورت میں کلنک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر لگ گیا۔ اس لئے کہ دعا کرنے والے "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" نہیں تھے۔ ان کی اطاعت اللہ کے لئے خالص نہیں تھی۔

سورۃ المومن کے بعد سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون "دعوت الی اللہ" ہے۔ ارشاد ہوا : ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ "اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور عمل صالح پر کاربند رہے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں"۔ دعوت الی اللہ کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ اس کا سب سے پہلا نکتہ ہی اللہ کی توحید ہو۔ جس کی مثال سورۂ یوسف میں آئی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں اپنے ساتھیوں سے گفتگو اور تبلیغ کا ایک موقع ملا تو پہلی بات ہی یہ کہی: ﴿ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ . اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ' اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ' ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ﴾ "اے میرے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟.... حکم (فیصلے' حکومت اور حاکمیت) کا حق کسی کا نہیں ہے سوائے اللہ کے' اور اُس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کی جائے۔ یہی

سیدھا اور پختہ طریق زندگی ہے"۔ چنانچہ دعوت الی اللہ کا اصل جوہر بندگیٔ رب کی دعوت ہے۔ اور اس کے لئے لازم ہے کہ انسان ان دو منزلوں سے گزر چکا ہو۔ یعنی اس کی دعا بھی "مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ" ہو اور اس کی عبادت بھی "مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ" ہو۔

اگلی سورت سورۃ الشوریٰ میں اس مضمون کی اعلیٰ ترین سطح بیان ہوئی ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ "کہ دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ"۔ یہ توحید کا بلند ترین تقاضا ہے کہ اجتماعی نظام کی سطح پر توحید کو قائم کرنا' اور دین کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے برپا کرنا۔ تو یہ ہے اللہ کا ہم پر حق۔

اُمت پر رسول اللہ ﷺ کا حق

اس کے بعد ہم پر دوسرا بڑا حق اللہ کے رسول ﷺ کا ہے' جن کے ذریعے سے ہمیں ہدایت موصول ہوئی' جن کی محنتوں اور مشقتوں اور ان کے ساتھیوں کی قربانیوں کے صدقے میں آج ہم نماز پڑھتے ہیں' روزہ رکھتے ہیں اور انہی کی جدوجہد کی بدولت آج ہم مسلمان ہیں۔ آنحضور ﷺ کا جو حق ہم پر ہے وہ آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں بیان فرمایا تھا کہ میں صرف تمہارے ہی لئے نبی یا رسول بن کر نہیں آیا' میں تو پوری دنیا کے لئے' پوری نوع انسانی کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم میں دو ٹوک الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ "اے نبیؐ ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے"۔ لہٰذا آپؐ نے اپنے الوداعی خطبہ میں یہ ذمہ داری اُمت کے سپرد فرما دی۔ آپؐ نے حاضرین سے گواہی بھی لی۔ پوچھا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) کیا میں نے (اللہ کا پیغام) پہنچا دیا یا نہیں؟ اس پر پورے مجمع نے بیک زبان کہا: "اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔" ایک روایت میں اس سے بھی زیادہ تفصیل آئی ہے: "اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ" یعنی اے نبی! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق رسالت ادا کر دیا' حق امانت ادا کر دیا۔ اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور ساری گمراہیوں کے پردے چاک کر کے ہدایت کی روشنی کو مبرہن کر دیا۔ آپ ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی

اٹھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ!)) "اے اللہ تو بھی گواہ رہ"۔ یہ مان رہے ہیں کہ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد حاضرین سے فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) "پس جو موجود ہیں اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اسے ان تک پہنچائیں جو موجود نہیں ہیں"۔ اس پہنچانے کی ذمہ داری کے کم سے کم دو تقاضے ہیں۔

پہلا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید کی دعوت ہر فردِ نوعِ بشر تک پہنچا دینا' یہ اُمت کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ قرآن کا پہنچا دینا رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے پیغام کا پہنچا دینا ہے۔ سورۃ الانعام میں فرمایا گیا: ﴿ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ "(اے نبی ان سے کہہ دیجئے) یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں خبردار کر دوں اور جس تک یہ پہنچ جائے۔" اور اسے پہنچانے والے کون ہوں گے؟ اس کے لئے آپؐ کا واضح حکم ہے: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) اسی طرح آپؐ کا دوسرا ارشاد گرامی ہے ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) "پہنچا دو میری طرف سے خواہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو۔" یہ حکم ہر خاص و عام کے لئے ہے۔

دوسرا تقاضا یہ ہے کہ کم سے کم کسی ایک ملک میں اللہ کا نظام عملاً قائم کر کے دنیا کو دکھا دیا جائے کہ یہ ہے دینِ حق جسے محمدؐ رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے۔ اس طرح پوری دنیا کو دعوت دی جائے کہ آؤ اپنی آنکھوں سے دیکھو' یہ ہے اللہ کا دین' یہ ہے اس کی سیاست' یہ ہے اس کی معاشی زندگی' یہ ہے اسلامی اخوت' یہ ہے مسلم برادری' یہ ہے اسلامی قانون' یہ ہے اسلامی مساوات اور عدالت میں برابری' یہ ہے کفالتِ عامہ کا نظام۔ اگر یہ ہم نہیں دکھا سکتے تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا وہ حق ادا نہیں ہو سکتا جو ہمارے ذمہ ہے۔ یہ دو تقاضے ہیں جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کے حق کی ادائیگی کے لئے پورے کرنے ہیں۔ یہ تمام تقاضے جا کر اس نقطے پر مرکوز ہو رہے ہیں کہ دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کیا جائے۔

اُمتِ مسلمہ کے ذِمّے نوعِ انسانی کا حق

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حق کے بعد حقوق العباد کا معاملہ آتا ہے۔ ان میں

سے ایک حقوق تو وہ ہیں جو ہم عام طور پر گنتے ہیں۔ یعنی حقوق الوالدین' حقوقِ زوجین' اولاد کے حقوق اور پڑوسی کے حقوق وغیرہ' لیکن ہمیں ذرا بڑے پیمانے پر جائزہ لینا چاہئے کہ اُمت کے ذمے نوع انسانی کے بالعموم حقوق کیا ہیں؟ وہ یہ کہ نوع انسانی کو جبر و تشدد اور ظلم و استحصال کی تمام زنجیروں سے آزاد کر کے وہ عادلانہ نظام زندگی جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اس کی برکتوں سے بہرہ ور کرنے کی سعی و جہد کرنا۔ اگر یہ ہم نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کا جو حق ہم پر عائد ہوتا ہے پورا نہیں ہوگا۔ جیسے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا: ﴿ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ یعنی بنی اسرائیل کو یہ بشارت دی گئی تھی کہ جب محمد ﷺ آئیں گے تو منجملہ ان کی بہت سی شانوں اور خصوصیات کے' ایک یہ بھی ہوگی کہ نوعِ انسانی کے اوپر جو بوجھ لدے ہوئے ہوں گے اور ان کی گردنوں میں جو طوق پڑے ہوئے ہوں گے وہ انہیں ان سے نجات دلائیں گے۔ یہ ان کا فرضِ منصبی ہوگا۔ وہ نوع انسانی سے اس ظلم و استحصال' جبرواستبداد اور اس فرق و تفاوت کا خاتمہ کر دیں گے کہ کوئی پیدائشی طور پر گھٹیا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر اونچا ہے۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ برہمن تو اونچا ہی رہے گا چاہے اپنے سیرت و کردار کے حوالے سے وہ کتنا ہی گھٹیا کیوں نہ ہو اور شودر نیچا ہی رہے گا چاہے سیرت و کردار کے اعتبار سے وہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے۔ انسانوں کے مابین یہ مستضعفین اور مستکبرین کی تقسیم ختم ہوگی کہ کچھ لوگ ہیں کہ جو اختیارات اور حکومت کے مناصب سنبھال کر بیٹھ گئے' اور کچھ لوگ وہ ہیں جنہیں دبا دیا گیا ہے اور انہیں اظہار خیال کی آزادی بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک طرف Haves ہیں اور دوسری طرف Have nots ـــــ ایک طرف استحصال ہو رہا ہے تو دوسری طرف دولت کے انبار لگے ہیں۔ ﴿ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ ﴾ کے برعکس دولت صرف امیروں کے مابین گردش کر رہی ہے۔ دولت کی تقسیم کا نظام ایسا نہیں ہے کہ معاشرے کے تمام طبقات تک ان کا حصہ رسدی منصفانہ انداز سے پہنچ رہا ہو۔ یہ ظلم بلکہ ہر نوع کے ظلم کا خاتمہ بندۂ مومن کے فرائض میں شامل ہے۔

قرآن میں قیامِ عدل وقسط کی اہمیت

بدقسمتی سے یہ تیسری شے وہ ہے جو بہت چھپی ہوئی ہے۔ پہلی باتیں تو آپ نے بہت مرتبہ سنی ہوں گی۔ ہم نے خاص مذہبی تصورات اپنے ذہنوں میں راسخ کئے ہوئے ہیں' جبکہ دین اور فرائض دینی کا یہ پہلو ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کو نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید کے نزدیک اس کی اہمیت کیا ہے۔

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں "قَائِمًا بِالْقِسْطِ" کا لفظ آیا ہے : ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ "اللہ نے خود اس بات کی گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے' اور یہی گواہی فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ عدل و انصاف کا قائم کرنے والا ہے۔" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے جو ننانوے نام بتائے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام "العَدل" ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا واحد نام ہے جو مصدر کے طور پر آیا ہے۔ باقی کوئی نام مصدر پر نہیں ہے' کوئی اسم الفاعل ہے' کوئی فَعَّال کے وزن پر ہے اور کوئی فَعُول کے وزن پر۔ "العَدل" کا مفہوم ہم اپنے الفاظ میں بیان کریں گے تو وہ ہوگا : مجسّم عدل' سراپا عدل۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے لئے "مجسّم" اور "سراپا" کے الفاظ مناسب نہیں ہیں' لیکن چونکہ ہمارا ذخیرہ الفاظ محدود ہے لہٰذا ہم بات کو سمجھنے کے لئے ان الفاظ کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔

آگے چلئے' اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو کیوں بھیجا؟ کتابیں کیوں نازل کیں؟ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں فرمایا : ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ "ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی (یہ کوئی ہمارا مشغلہ یا مشق بیکار نہ تھی بلکہ) اس لئے کہ لوگ عدل پر قائم ہوں"۔ یہ ہے مقصد انبیاء و رسل کی بعثت اور انزالِ کتب کا۔ اسی طرح حضور ﷺ کے بارے میں سورۃ الشوریٰ میں فرمایا گیا : ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (اے نبی ڈنکے) کی چوٹ کہہ دیجئے کہ میں صرف واعظ بن کر نہیں آیا' میں صرف معلم'

مربی ‘ مبلغ اور مزکی بن کر نہیں آیا ہوں) ”مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں۔“

اس سے آگے چلئے ‘ حضور ﷺ کی اُمت کے لئے کیا ذمہ داری معین کی گئی ہے۔ سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ کی دو آیات فصاحت و بلاغت اور صنعتِ لفظی کے اعتبار سے بہت نمایاں مثال ہیں۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ میں فرمایا : ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ ﴾ ”اے اہل ایمان! پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ ‘ اللہ کے گواہ بن کر“۔ یہ کس سے کہا جا رہا ہے؟ ہمیں یہ تو یاد ہے کہ ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ ہم پڑھ رہے ہیں ‘ لیکن یہ کس سے خطاب ہے کہ اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ! اللہ نے جو نظامِ عدل و قسط دیا ہے اس کو برپا کرنے کے لئے پوری طاقت کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ! یہ مجھ سے اور آپ سے کہا جا رہا ہے۔ سورۃ المائدہ میں یہی حکم ترتیب بدل کر دیا گیا ہے : ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ﴾ ”اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری طاقت کے ساتھ اللہ کے لئے ‘ انصاف کے گواہ بن کر!“ اللہ کے لئے کھڑا ہونا چہ معنی دارد؟ مراد ہے اللہ کے نظام کو قائم کرنے کے لئے عدل و قسط کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ یہ ہے ہمارا حقوق العباد کا تصور۔

قرآن مجید کا ہم پر اہم ترین حق

اور یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ جو کتاب ہمیں دی گئی ہے ‘ یعنی قرآن کریم ‘ اس کا ہم پر کیا حق ہے؟ اگرچہ اس کا حق یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھو ‘ اس پر تدبر کرو ‘ اس پر غور کرو لیکن اس کا سب سے آخری حق اسے قائم کرنا ہے۔ جس طرح اہلِ کتاب سے فرمایا گیا : ﴿ قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ ﴾ (المائدہ : ۶۸) ”(اے نبی ان سے) کہہ دیجئے : اے کتاب والو تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو (تمہاری کوئی حقیقت نہیں ‘ تمہارا منہ نہیں ہے کہ ہم سے مخاطب ہو سکو ‘ ہم سے دعا کرو) جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف

تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔" اب یہاں "کتاب" کی جگہ "قرآن" رکھ کر دیکھئے : ﴿يٰاَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا الْقُرْاٰنَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ "اے اہل قرآن' تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک تم قرآن کو قائم نہ کرلو اور جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے رب کی طرف سے ۔اُس وقت تک تمہارا منہ نہیں ہے کہ ہم سے بات کرو۔

وطنِ عزیز کی سالمیت کا تقاضا

حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا : ((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ)) یعنی "دین تو نام ہی وفاداری اور خیر خواہی کا ہے"۔ پوچھا گیا : لِمَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ "اے اللہ کے رسول! کس کی وفاداری اور کس کی خیر خواہی؟" آنحضور ﷺ نے فرمایا : ((لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ)) "اللہ' اس کی کتاب اور اس کے رسول کے ساتھ وفاداری اور مسلمانوں کے قائدین اور عوام کی خیر خواہی"۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ ہم پر اللہ کا حق کیا ہے' اس کی کتاب کا حق کیا ہے' اللہ کے رسول کا حق کیا ہے اور عام انسان کا حق کیا ہے؟ ان سب کو جمع کیجئے تو یہ سب حقوق ایک حق پر آکر جمع ہو جاتے ہیں' اور وہ حق یہ ہے کہ اللہ کے دین کو قائم کیا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ دو پہلو واضح ہونے ضروری ہیں کہ اللہ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری کی سب سے اونچی منزل یہ ہے کہ اس کے دین کی اقامت کے لئے تن من دھن لگا دیا جائے۔ اور آج پاکستان کی سالمیت' بقا' وقار اور عزت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس میں اللہ کے دین کو نافذ کیا جائے۔ اس کشتی میں ہم سوار ہیں اور اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر یہ باقی ہے تو ہمارا وجود بھی ایک علیحدہ تشخص کے ساتھ باقی ہے۔ اس کی عزت ہے تو ہماری عزت ہے' اس کی ذلت ہماری ذلت ہے' یہ کشتی ڈوبتی ہے تو ہم ڈوبتے ہیں —— اور جان لیجئے کہ اس کشتی کے استحکام کے لئے بلکہ اس کے وجود اور بقا کے لئے سوائے اسلام کے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے بھی لازم ہے کہ جس شخص کو بھی شعور حاصل

ہے وہ اس فرض کی ادائیگی کے لئے تن من دھن لگانے کا فیصلہ کرلے اور کسی نہ کسی جماعت میں شامل ہو جائے۔

التزامِ جماعت کی ضرورت واہمیت

یہاں میں چاہتا ہوں کہ کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت کی بھی وضاحت کردوں' یعنی عقلاً اور نقلاً اس کا جواز اور اس کا لزوم کیا ہے! آپ اپنے طور پر سمجھئے کہ کیا انفرادی طور پر پورا نظام زندگی تبدیل کر دینا ممکن ہے؟ کیا انقلابی جدوجہد انفرادی طور پر ممکن ہے' یا اس کے لئے کسی جماعت کی ضرورت ہے؟ اگر صرف فرد یہ کام کر سکتا تو ہر نبی ضرور یہ کام کر کے دنیا سے جاتا' کیونکہ تمام نبی معصوم تھے' ہر نبی کو ہر آن اللہ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی ملتی رہتی تھی۔ لیکن نبی کے ہاتھوں بھی یہ کام ہوا ہے تو اُس وقت جب نبی کو ایک جماعت میسر آگئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی جب قوم نے صاف جواب دے دیا کہ ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ﴾ (جایئے آپ اور آپ کا رب جا کر لڑیں' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) تو یہ کام چالیس برس تک کے لئے وہیں رک گیا اور سزا کے طور پر ان کے بارے میں یہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ ﴿ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ﴾ "تو اب یہ سرزمین چالیس برس تک ان پر حرام ہے' یہ زمین میں مارے مارے پھرتے رہیں گے۔" ان چالیس سالوں کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کا انتقال ہو گیا اور ان کی زندگی میں فلسطین میں اسلامی ریاست قائم نہیں ہو سکی۔ چنانچہ یہ بات بالکل منطقی اور عقلی طور پر مسلم ہے کہ ایک منظم جماعت کے بغیر اقامت دین یعنی دین کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد ممکن نہیں ہے۔

قرآن وحدیث سے لزومِ جماعت کے دلائل

اب ہم دیکھتے ہیں کہ نقلی اعتبار سے لزوم جماعت کی کیا اہمیت ہے۔ یعنی دین کا وہ پہلو جو منقول ہوا ہے۔ ہمارا دین اللہ سے منتقل ہوا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ جبرائیل

ﷺ۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے منتقل ہوا صحابہ کرام ؓ کو، ان سے تابعین کو، تابعین سے تبع تابعین کو۔ اس طرح یہ دین منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ قرآن بھی منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اور حدیث بھی۔ تو یہ ہے نقل کی بنیاد پر۔ ایک ہے عقل کی بنیاد پر کسی شے کا سمجھنا۔ اس اعتبار سے ہم نے یہ بات سمجھ لی کہ نظام کی تبدیلی ایک جماعت کے بغیر ممکن نہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب وسنّت یعنی نصوص کے اعتبار سے اس کی کیا اہمیت ہے۔

سورۃ التوبہ آیت ۱۱۹ میں ارشاد ہے : ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾ "اے اہل ایمان اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور صادق اہل ایمان کے ساتھ ہو جاؤ"۔ صادقین کون ہیں؟ یہ جاننے کے لئے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ ملاحظہ ہو، فرمایا : ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ ﴾ "مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے، اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں، حقیقت میں یہی لوگ سچے ہیں"۔ ایسے لوگوں کے ساتھ شامل ہونا، ان کی معیت اختیار کرنا اللہ کا حکم ہے۔ اسی طرح سورۃ المجادلہ میں کچھ اوصاف بیان کئے گئے اور اس کے بعد فرمایا گیا : ﴿ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ؕ ﴾ "یہی اللہ کی پارٹی ہیں"۔ ﴿ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ ﴾ "آگاہ ہو جاؤ فلاح پانے والے تو وہی ہوں گے جو حزب اللہ میں شامل ہوں گے۔" گویا فلاح حقیقی کے مستحق وہی ہوں گے جو اس حزب اللہ میں شامل ہوں گے۔ سورۃ المائدہ کی آیت کا یہ ٹکڑا بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ ﴿ فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ ﴾ پس یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب آ کر رہے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم مغلوب کیوں ہیں ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

ہماری پالیسیاں کہیں اور کیوں طے ہوتی ہیں۔ کیوں کہا جا رہا ہے کہ امریکہ نے افغانستان میں اپنی پسند کی حکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور پاکستان اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتا،

اس لئے کہ پاکستان کو دبانے کے لئے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک موجود ہیں' وہ جو چاہیں اس سے منوا سکتے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ پارٹی اگر اللہ کی نہیں ہوگی تو یہی حالت ہوگی کہ ہماری پالیسی' ہماری قسمتوں کے فیصلے کوئی اور کرے گا۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت ملاحظہ کیجئے۔ یہ سورۃ الصف کی آیت ۴ ہے : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ "اللہ تعالیٰ کو تو محبوب ہیں اپنے وہ بندے' وہ صاحب ایمان لوگ جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں اس طرح صفیں بنا کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔" چنانچہ نہ صرف جماعت' بلکہ ایسی مضبوط اور ایسی منظم جماعت درکار ہے جو بنیانِ مرصوص ہو۔ جیسے دیوار بنا کر اس کے شگافوں کو پُر کیا جاتا تھا اور سیسہ پگھلا کر درزوں میں ڈال دیا جاتا تھا تا کہ وہ دیوار مضبوط ہو جائے۔

اب احادیث نوٹ کیجئے۔ ترمذی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ' وَاِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ' فَاِنَّ الشَّيْطٰنَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ اَبْعَدُ)) "(مسلمانو!) تم پر جماعت کی حیثیت سے رہنا لازم ہے' اور تم علیحدہ علیحدہ رہنے سے بچو' اس لئے کہ اکیلے آدمی کے ساتھ شیطان آ کر لگ جاتا ہے جبکہ دو سے وہ دور ہو جاتا ہے۔" گویا ایک اکیلا دو گیارہ۔ یہ ہے وہ بات جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے کہ شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے دور رہتا ہے۔ دو افراد مل کر جماعت کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک امام اور ایک مقتدی' یا ایک امیر اور ایک مامور پر مشتمل جماعت ہو جائے گی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے امام ترمذی ہی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) "اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور مدد جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔

اس موضوع پر تیسری حدیث جو کہ اس موضوع پر جامع ترین حدیث ہے' حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ مسند احمد بن حنبل اور جامع ترمذی دونوں میں آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ((اِنِّيْ اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ)) "(مسلمانو!)

میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے"۔ (وہ پانچ چیزیں کیا ہیں) ((بِالْجَمَاعَةِ' وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ' وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) "التزامِ جماعت کا' سننے اور اطاعت کرنے کا' اور ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔" یعنی جماعت کی شکل میں رہو۔ اور جماعت بھی سمع و طاعت والی کہ سنو اور اطاعت کرو۔ یہ جماعت وہ ہو گی جو ہجرت اور جہاد کے مراحل سے گزرے گی تو اللہ کا دین غالب ہو گا۔

اس موضوع پر چوتھی حدیث موقوف حدیث ہے' یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ صحابیٔ رسولؐ کے قول کو اثر کہتے ہیں اور رسول ﷺ کا قول خبر کہلاتا ہے۔ صحابی کا قول بھی حدیث شمار کی جاتی ہے لیکن یہ موقوف حدیث ہوتی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِالْاِمَارَةِ' وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِالسَّمَاعَةِ وَلَا سَمَاعَةَ اِلَّا بِالطَّاعَةِ)) "کوئی اسلام نہیں ہے جب تک کہ جماعت نہیں' اور کوئی جماعت نہیں جب تک کہ امیر نہ ہو"..... لوگ کہہ دیتے ہیں کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک جماعت ہیں' لیکن یہ تو بتائیے کہ ان کا امیر کون ہے؟ اگر امیر نہیں ہے تو جماعت نہیں ہے۔ یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم ایک اُمّت ہیں' ایک ملت ہیں' بھائی بھائی ہیں۔ اگرچہ وہ بھائی بھائی بھی کہاں ہیں' یہ باتیں صرف کہنے کی ہیں' ورنہ ہر پہلو سے معاملہ تباہ کن ہے۔ لیکن بالفرض اگر انہیں ایک جماعت مان بھی لیا جائے تو بھی اس حدیث کی رُو سے یہ ایک جماعت قرار نہیں پاتے۔ اس لئے کہ ان کا کوئی امیر نہیں ہے۔ ((وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِالسَّمَاعَةِ)) "اور (احکام کی) سماعت کے بغیر امارت نہیں ہے"۔ یعنی امارت کا فائدہ کیا ہوا اگر امیر کا حکم نہیں سن رہے۔ اور سننے کے لئے ظاہر بات ہے رُسل و رسائل کے جو ذرائع بھی میسر ہیں ان کے ذریعے اپنے آپ کو نظم سے منسلک رکھنا پڑے گا تاکہ امیر کا حکم آپ تک پہنچ جائے۔ مثلاً جماعت کے اجتماعات ہیں' جماعت کی مطبوعات ہیں' جماعت کے سرکولرز آ رہے ہیں۔ ان سب کے ساتھ مسلسل رابطہ ضروری ہے ؎ پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ! درخت کا پتّا اگر درخت کے ساتھ جڑا ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہے جڑ کے ذریعے سے جو غذا زمین سے آ رہی ہے وہ پتّے تک پہنچ رہی ہوتی ہے' لیکن پتّا اگر ایک دفعہ درخت سے علیحدہ ہو جائے تو اب اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسی طرح فرمایا:

((وَلَا سَمَاعَةَ اِلَّا بِالطَّاعَةِ)) "اور اطاعت کے بغیر سماعت کی کوئی حیثیت نہیں"۔ یہ چاروں چیزیں بالکل منطقی طور پر جڑی ہوئی ہیں جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واضح کر دیا۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر بیان کی ہوگی۔ اس لئے کہ کوئی صحابی رسولؐ اتنی بڑی بات اپنی طرف سے نہیں کہہ سکتے جب تک کہ انہوں نے وہ بات حضور ﷺ سے نہ سنی ہو۔

یہ ہے التزامِ جماعت کا معاملہ کہ جو عقلاً اور نقلاً مسلّم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس پر زور دے رہا ہوں کہ انسان کسی بھی جماعت میں شامل ہو جائے۔

ایک عذر اور اس کا جواب

لوگ عموماً ایک عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ اتنی جماعتیں ہیں' کوئی جماعت کچھ کہتی ہے' کوئی کچھ کہتی ہے' ہم کیا کریں؟ میں نے اپنی ان تمام گزشتہ تقاریر میں ایک بات کہی ہے' اُسی کو دہرا رہا ہوں کہ اس وجہ سے آپ بریٔ الذمہ نہیں ہو جائیں گے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں علاج کہاں سے کراؤں' جگہ جگہ تو ڈاکٹر بیٹھے ہیں' فلاں بھی ڈاکٹر ہے' فلاں بھی ہے۔ کبھی آپ نے اس طرح سوچا ہے کہ میں علاج کیوں کراؤں؟ جوتا خریدتے ہوئے کبھی کوئی اس طرح نہیں سوچتا کہ میں جوتا کیوں خریدوں؟ گلی گلی میں تو جوتوں کی دکانیں ہیں' پتہ نہیں کسی دکان سے اچھا جوتا ملتا بھی ہے یا نہیں۔ اِس دکان سے خریدوں تو کہیں اس کے تلووں کے اندر گتہ ہی نہ ہو' اس لئے ننگے پیر چلنا ہی بہتر ہے۔ ایسا تو کوئی شخص بھی نہیں سوچتا۔

اسی طرح ہر شخص طے کرلے کہ مجھے کسی جماعت میں شامل ہونا ہے اور جو مناسب جماعت آج مل جائے گی اسی میں شامل ہونا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ مزید غور و فکر جاری رکھا جائے۔ جب اس سے بہتر جماعت مل جائے تو انسان اس میں شامل ہو جائے۔ لیکن عصبیت کی پٹی آنکھوں اور کانوں پر نہ بندھنے دے کہ چاہے اس سے بہتر جماعت نظر آ رہی ہو لیکن اب چونکہ کافی عرصہ ان کے ساتھ گزارا ہے' ان سے تعلقات قائم ہو گئے ہیں' ان کے ساتھ میل جول ہے' ان سے رشتہ داریاں بھی ہو گئی ہیں' کاروباری تعلقات

بھی ہو گئے ہیں' اس لئے ان سے چمٹے رہو' جبکہ ذہن اور قلب پر منکشف ہو چکا ہو کہ کوئی دوسری جماعت اس مقصد کے لئے بہتر کام کرنے والی موجود ہے۔ اگر اس کی جماعت وہ مقصد پورا نہیں کر رہی جس کے لئے وہ اس میں شامل ہوا تھا تو اس جماعت کے ساتھ رہ کر وہ جو بھی قربانی دے گا' جان و مال کا انفاق کرے گا' اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ بلکہ سب کچھ صفر سے ضرب کھا کر صفر ہو جائے گا۔ لہٰذا غور کرتے رہیں' سنیں' دیکھیں' اپنے دماغ کے کمپیوٹر کو بھی ورک کرنے دیں کہ ؎ "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!" جب بھی محسوس ہو کہ کوئی دوسری جماعت بہتر ہے تو اس میں شامل ہو جائیں۔ اس لئے کہ اب نبی کی جماعت کوئی نہیں ہے۔ نبی کی جماعت سے علیحدہ ہونا مُرتد ہو جانا ہے اور مُرتد کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اب نبی تو کوئی نہیں ہے' اب تو سب کے سب اُمتی ہیں' کسے باشد' کوئی بھی شخص ہو' مولانا مودودی ہوں یا مولانا الیاس' یا مولانا حسین احمد مدنی ہوں' یہ سب اُمتی تھے' اور ان کی قائم کردہ جماعتیں نبیوں کی قائم کردہ جماعتیں نہیں تھیں۔ اب تمام جماعتوں کے داعی بھی اُمتی ہیں اور شامل ہونے والے بھی اُمتی ہیں۔ آیت مبارکہ ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾ میں وارد شدہ الفاظ "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" اب جماعت سازی کا جزوِ لازم ہیں۔

یہی بات ہم کہتے ہیں کہ ہماری جماعت مسلمانوں کی ایک جماعت ہے' ہمارے نزدیک اقامتِ دین کا طریق کار یہ ہے' ہمارے اصول یہ ہیں' ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ رہنمائی ملی ہے اور ہم اس طریقے پر کام کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ آ جایئے' ہمارے اعوان و انصار بنئے! اگر ہم سے اتفاق نہیں ہے تو کوئی بات نہیں' کسی اور جماعت میں شامل ہو جایئے۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۵ کے نصف آخر میں وارد شدہ الفاظ میں یہ رہنمائی موجود ہے کہ تمام جماعتیں جو دین کے لئے کام کر رہی ہیں ان کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا انداز اختیار کرنا چاہئے۔ فرمایا : ﴿ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ﴾ "اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔" ﴿ لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ﴾ "ہم جو عمل کر رہے ہیں (وہ صحیح ہے یا غلط ہے) اس کا نتیجہ ہم بھگتیں گے۔ (جزاء ملے گی تو ہمیں' سزا ملے

گی تو ہمیں) اور آپ جو بھی عمل کر رہے ہیں اس کا جو بھی نتیجہ ہو گا وہ آپ کے ذمہ ہو گا۔" ﴿ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ﴾ "ہمیں آپس میں حجت بازی (دلیل بازی، بحث و نزاع) کی کوئی ضرورت نہیں ہے" ﴿ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ﴾ "اللہ تعالیٰ ہمیں جمع کر دے گا"۔ اور اس کی حکمت اور اصل بنیاد یہ ہے کہ اگر آپ ایک ہی مرکز کی طرف بڑھ رہے ہیں تو چاہے مختلف سمتوں سے مختلف راستوں سے آ رہے ہیں لیکن اپنی منزل مقصود سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بہت سے لوگ فیصل آباد کے گھنٹہ گھر تک پہنچنا چاہتے ہیں تو وہ چاہے کسی بازار سے چلے جائیں گھنٹہ گھر پہنچ جائیں گے۔ لاکھوں لوگ جو ہزاروں قافلوں کی صورت میں ۹ ذوالحجہ کو منیٰ سے چلتے ہیں وہ سب کے سب عرفات پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا مختلف دینی جماعتوں کی صورت میں جتنے بھی قافلے چل رہے ہیں اگر اللہ کے دین کے لئے چل رہے ہیں تو "اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا" کے مصداق آج نہیں تو کل ان کی جدّوجُہد کے ثمرات جمع ہو جائیں گے۔ اور بفرض محال اگر اس دنیا میں جمع ہونا نصیب نہ ہوا تو ایک دن تو آنا ہے جب ہم سب اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا : ﴿ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ "اور لوٹنا تو اسی کی طرف ہے۔"

مطلوبہ جماعت کے لازمی اوصاف

اب میں آپ کے سامنے اپنا حاصلِ مطالعہ رکھنا چاہتا ہوں کہ یہ جماعت کیسی ہونی چاہئے، تاکہ تلاش میں آپ کو مدد مل سکے۔ آپ میری ان باتوں پر خوب غور و خوض کیجئے۔ اگر قابلِ قبول ہوں تو قبول کریں۔ اگر کوئی شے نظر آئے کہ صحیح نہیں ہے تو اسے رد کر دیجئے۔ میرے نزدیک اس جماعت میں چار لوازم ہونے چاہئیں جو آپ کو اسے تلاش کرتے ہوئے پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

پہلی بات یہ کہ وہ جماعت واضح اور اعلانیہ طور پر پورے دین کو قائم کرنے کے لئے قائم ہوئی ہو، فرقہ وارانہ جماعت نہ ہو، محض کوئی بہبود عوام کا کام کرنے والی نہ ہو۔ اگرچہ یہ سارے کام اچھے ہیں، مثلاً آپ خدمت خلق کے کام کرنے کے لئے کوئی ادارہ بنا لیتے ہیں تو یہ ایک اچھا کام ہے۔ آپ صرف دعوت و تبلیغ کا کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ

بھی اچھا کام ہے۔ صرف تدریس و تعلیم کا علمی کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ بھی اچھا کام ہے۔
لیکن میں آپ کی راہنمائی اُس جماعت کی طرف کر رہا ہوں جس کا مقصد اور منزل واضح طور پر اللہ کے دین کو قائم کرنا ہو' یہ اس کی شرطِ اول ہونی چاہئے۔

دوسرے یہ کہ وہ جماعت نہایت منظم ہونی چاہئے۔ یہ سمع و طاعت کے نظم پر مبنی ہو۔ اس کی اہمیت میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ البتہ اس نظم کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں' جن میں سے ایک میرے نزدیک بہتر ہے' تاہم دوسری بھی جائز ہے۔ ان دونوں صورتوں کی وضاحت میں آگے بیان کروں گا۔

تیسری چیز یہ کہ وہ جماعت واضح طور پر بیان کرے کہ اس کا طریقہ کار کیا ہے اور وہ کس طور سے منہجِ نبویؐ سے مستنبط ہے! ہر کام کے لئے ہر طریقہ صحیح نہیں ہے' ہر راستہ کسی ایک ہی منزل کی طرف نہیں جاتا۔ آپ نے منزل معین کی ہے تو راستہ بھی وہ تلاش کیجئے جو اس منزل تک پہنچانے والا ہو۔ اور اگر منزل اللہ تعالیٰ کے دین کا غلبہ ہے' جیسے کہ رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوا تو اس کے لئے طریقہ بھی وہی ہو گا جو محمدِ عربی ﷺ نے اختیار کیا تھا۔ جیسا کہ امام مالکؒ نے فرمایا تھا : لَا یَصْلُحُ آخِرُ هٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا "اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر صرف اسی طریقے پر جس پر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی ہے۔" امام مالکؒ کا یہ قول حضرت ابوبکرؓ کے قول سے مستنبط ہے۔ انہوں نے جب حضرت عمرؓ کو اپنے جانشین کی حیثیت سے نامزد کیا' تو اس موقع پر خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں خلافت کے بارے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے : ((اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ لَا یَصْلُحُ آخِرُہٗ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُہٗ)) "دیکھو یہ جو خلافت کا معاملہ ہے اس کا آخری حصہ بھی اسی طرح اصلاح پذیر ہو گا جس طرح پہلا حصہ ہوا تھا۔"
یعنی حدیث میں جو خبر دی گئی ہے کہ اس دنیا کے خاتمے سے قبل پوری دنیا پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہو کر رہے گا' اس آخری حصے کا وجود میں آنا اسی طریقے سے ممکن ہو گا جس طریقے سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا پہلا حصہ وجود میں آیا۔ یعنی طریقہ محمدی ﷺ۔ تو پہلی بات یہ ہے کہ مقصد واضح ہونا چاہئے کہ ہمیں دین کو قائم کرنا ہے۔ فرقہ واریت یا کوئی سیاسی کھیل پیش نظر نہ ہو۔ اسی طرح محض درس و تدریس یا محض دعوت و

تلقین نہیں بلکہ اقامت دین یعنی دین کے غلبے کی جدوجہد اس جماعت کا مقصد تاسیس ہو۔ دوسرے یہ کہ منظم سمع وطاعت والی جماعت ہو۔ تیسرے یہ کہ طریقہ کار بالکل واضح ہونا چاہئے۔ اس ضمن میں ایک بات میں عرض کروں گا کہ نبی کو تو یہ حق تھا کہ آپ آنکھیں بند کر کے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیجئے اور بے چون وچرا اس کی اطاعت کیجئے' جیسے کہ عربی زبان میں کہا جاتا ہے : دُرْ مَعَ الْحَقِّ حَيْثُ دَارَ "حق کے ساتھ گھوم جاؤ جیسے وہ گھومے"۔ چونکہ نبی "الحق" ہوتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ گھوم جایئے۔ اس نے اگر مدینے میں جا کر سولہ مہینے بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی ہے تو اُدھر ہی رخ کرو' اور اگر اس نے اپنا رخ موڑ لیا تو تم بھی اپنا رخ موڑ لو۔ اس سے آپ پوچھ نہیں سکتے کہ اگلی منزل کیا ہے' اس لئے کہ وہ نبی ہے' وہ اللہ کا رسول ہے' اس کو اللہ کی طرف سے ہر وقت راہنمائی مل رہی ہے۔ لہٰذا وہ جو فیصلہ کرے اس کے مطابق چلنا ضروری ہے۔ آپ نے جب پہچان لیا کہ یہ اللہ کے نبی یا رسول ہیں اس کے بعد آپ اپنے آپ کو ان کے ساتھ منسلک کر لیجئے' وہ جدھر موڑیں مڑ جایئے' لیکن کسی غیر نبی کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ کہے کہ آنکھیں بند کر کے میری پیروی کرو' میں جو کہوں گا وہ کرو۔ نہیں' ہرگز نہیں! وہ جس طریقے پر کام کرنا چاہتا ہے پہلے اسے واضح کرے۔ وہ بتائے تو سہی کہ اس کے پیش نظر طریقہ کار کیا ہے' اس کی منزل کیا ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ یہ طریقۂ کار محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سیرت' آپؐ کے منہاج اور آپؐ کے طریقہ کار سے کیا مناسبت رکھتا ہے۔ اگر اس میں کہیں کوئی تبدیلی ہے' کہیں کوئی اجتہاد کیا گیا ہے تو کیوں کیا گیا ہے! کیا حالات میں واقعتاً کوئی واضح تبدیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اجتہاد کی ضرورت پیش آئی؟ یہ معین کیا جانا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ سمع وطاعت والی جماعت کے معانی تو اپنے آپ کو امیر کے حوالے کر دینا ہے : "اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" سنو اور اطاعت کرو۔ اس لئے لازم ہے کہ واضح طور پر معلوم ہو کہ اس کا طریقۂ کار کیا ہے' وہ کس نہج پر کام کر رہی ہے اور سیرت رسولؐ سے وہ کس طور مستنبط ہے؟

چوتھی اور آخری بات یہ کہ اس کی قیادت کو دیکھئے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں یا نہیں؟ کم از کم فرائض کے پابند اور حرام سے مجتنب ہیں یا نہیں؟ ان کی زندگی

کیا گواہی دیتی ہے؟ کہیں دین کے پردے میں دنیاوی کاروبار تو نہیں ہو رہا؟ جائیدادیں تو نہیں بنائی جا رہی ہیں؟ یہ سب کچھ ٹھونک بجا کر دیکھ لیا جائے۔ اس لئے کہ اس جماعت کا معاملہ جس میں سمع و طاعت کا نظام ہوتا ہے' جس میں آپ نے اپنا تن من دھن لٹانا ہے' عام سیاسی جماعتوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے اس کے لئے آپ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہو گا' ٹھونک بجا کر دیکھنا ہو گا تب اس کا ساتھ دیا جائے۔ ان چار اعتبارات سے جائزہ لے کر جس جماعت کے اوپر بھی آپ کی نگاہ ٹک جائے اس میں شامل ہو جائیں' آپ کی ایک رات بھی بغیر جماعت کے بسر نہ ہو۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہ بات مجھ پر زمانۂ طالب علمی میں اتنی واضح ہو چکی تھی کہ میں نے شعوری طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ اب میری زندگی کی ترجیح اول اقامتِ دین کی جدوجہد ہے۔ اُس وقت میں اسلامی جمعیت طلبہ میں تھا۔ جب میرا میڈیکل کا رزلٹ نکل آیا اور میں پاس ہو گیا تو میں نے فوری طور پر جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دے دی اور اس میں یہ الفاظ تحریر کئے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی کی ایک رات بھی بغیر جماعت کے گزرے۔ درخواست دائر کرنے میں پندرہ دن کا وقفہ اس لئے ہو گیا تھا کہ میں ابھی طے نہیں کر پایا تھا کہ آیا مجھے منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں رہنا ہے یا لاہور میں رہائش پذیر ہونا ہے' اور میں اپنی درخواست رکنیت کہاں دائر کروں۔ جیسے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں نے منٹگمری میں رہنا ہے تو وہاں جاتے ہی میں نے درخواست دے دی اور کہا کہ جماعت اسلامی مجھے اپنا رکن بنانے میں بے شک کچھ وقت لے لے' لیکن میں آج سے اپنے آپ کو جماعت کے نظم کا پابند سمجھتا ہوں۔ یہ حقائق مجھ پر زمانہ طالب علمی میں واضح ہو گئے تھے اور وہی حقیقت میں آج آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

سمع و طاعت کے دو نظام

اب میں وہ بات بیان کرتا ہوں جسے میں نے تھوڑا ملتوی کیا تھا کہ سمع و طاعت کا نظام دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو سمع و طاعت کی بیعت کے حوالے سے ہے۔ بیعت سمع و طاعت کسی ایک فرد کے ہاتھ پر شخصی بیعت ہوتی ہے کہ میں آپ پر اعتماد کرتے ہوئے آپ

کا ساتھی بنتا ہوں' آپ جو حکم کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اندر دیں گے میں اس کی اطاعت کروں گا۔ یہ طریقہ قرآن مجید اور حدیث نبویؐ میں مذکور ہے' اور سیرت النبیؐ سے ثابت ہے۔ شخصی بیعت کا یہی طریقہ اُمت کے اندر کم از کم تیرہ سو برس تک چلتا رہا۔ اُمت کی تاریخ میں کوئی ایسا اجتماعی ادارہ وجود میں نہیں آیا جو اس بیعت پر مبنی نہ ہو۔ سیرت نبویؐ میں بیعتِ عقبہ اولیٰ' بیعتِ عقبہ ثانیہ اور بیعتِ رضوان بہت معروف ہیں۔ پھر خلافت بیعت پر قائم ہوئی۔ خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کی تو بھی بیعت کی بنیاد برقرار رہی۔ اور جب خلافت کا نظام بگڑنے لگا تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس بگاڑ کو روکنے کے لئے میدان میں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوفیوں نے آپ رضی اللہ عنہ سے بیعت کر کے پھر اسے توڑ دیا' اس کا وبال ان پر آئے گا' حضرت حسینؓ پر اس کا کوئی الزام نہیں۔ ہزارہا لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لئے حضرت مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ پھر حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حجاز میں اسلامی حکومت بیعت کی بنیاد پر قائم کی تھی۔ پھر ہمارے ہاں اصلاح نفس اور تزکیہ و ارشاد کے لئے صوفیانہ نظام قائم ہوا تو وہ بھی بیعت کی بنیاد پر۔ وہ بیعتِ ارشاد کہلاتی ہے۔ پچھلی صدی میں جتنے جہاد ہوئے وہ بھی بیعت کی بنیاد پر ہوئے۔ ہندوستان میں عظیم ترین جہاد سید احمد بریلویؒ سے بیعت کی بنیاد پر ہوا۔ مہدی سوڈانی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تو بیعت کی بنیاد پر۔ لیبیا کے سنوّسی نے اٹلی کے خلاف بغاوت کی تو بیعت کی بنیاد پر۔ تو یہ طریقہ تو ہے منصوص' مسنون اور ماثور —— لیکن میرے نزدیک اگر ایک جماعت خواہ دستوری بنیاد پر بنی ہو' اگر وہ منظم ہو تو وہ بھی اس تقاضے کو پورا کرتی ہے' اور یہ نظم جماعت بھی جائز اور مباح ہے۔ گویا کہ وہ دستوری بیعت ہے' جو ایک شخص سے نہیں' بلکہ دستور سے ہے۔ اس جماعت میں شامل ہونے والے اس کے دستور کا حلف اٹھا رہے ہیں کہ وہ اس کے پابند ہوں گے' دستور کی رو سے جو امیر ہو گا اس کا حکم مانیں گے' اسی دستور کی رو سے وہ اپنی کوئی شوریٰ منتخب کریں گے' اس شوریٰ کی اکثریت کا جو فیصلہ ہو گا اسے مانیں گے۔ دستوری نظم جماعت میں کسی شخص سے بیعت نہیں ہوتی' بلکہ دستور سے بیعت ہوتی ہے۔ تو میں اس وقت دستوری جماعت کو بھی بیعت پر مبنی قرار دے رہا ہوں' لیکن وہ دستوری بیعت ہے شخصی بیعت نہیں' جبکہ

قرآن و سنت' سیرتِ مطہرہ اور مسلمانوں کی پوری تاریخ میں جو بیعت ہمیں ملتی ہے وہ شخصی بیعت ہے' اور اس کے لئے بھی میں چاہتا ہوں کہ عقلاً اور نقلاً دونوں طریقوں سے وضاحت کر دوں۔

شخصی بیعت کے لئے نقلی دلیل

نقول کے حوالے سے صرف ایک حدیث پیش کر رہا ہوں۔ یہ مسلم شریف کی روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ منقول ہوئے ہیں : ((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) "جو (مسلمان) اس حالت میں فوت ہوا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں تھا وہ ایک طرح سے جاہلیت کی موت مرا"۔ ذرا "بیعت کا قلادہ" کے الفاظ پر غور کیجئے۔ جیسے کسی نے بکری کے گلے میں رسی باندھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہے' بیعت بھی وہی شے ہے۔ آپ نے جس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے گویا کہ اپنی گردن اس کے ہاتھ میں دے دی ہے کہ وہ جو حکم دے گا (معروف کے دائرے کے اندر) ماننا پڑے گا۔ پس جو مر گیا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں تھا تو وہ اسلام کی موت نہیں مرا' بلکہ جاہلیت کی موت مرا ہے۔

شخصی بیعت کی عقلی دلیل

اور عقلاً یہ سمجھ لیجئے کہ ہر تحریک چاہے وہ تحریک آزادی ہو جب کبھی بھی راست اقدام (action) کے مرحلے پر آتی ہے تو اس میں آمر (dictator) معین کئے جاتے ہیں۔ کانگریس ابتدا سے ایک بہت بڑی جمہوری جماعت تھی' لیکن جب انہوں نے راست اقدام یعنی سول نافرمانی کا فیصلہ کیا تو اس مرحلے پر ڈکٹیٹر مقرر ہوتے تھے۔ کیونکہ ایسے مراحل میں جب تک ایک شخص کی اطاعت نہ ہو کامیابی ممکن نہیں' بلکہ انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اس مرحلے میں مشورے کرنا اور پھر اس کے تقاضے پورے کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً جماعتی دستور کی رو سے شوریٰ کے اجلاس کے لئے پندرہ دن پہلے نوٹس بھیجا جانا ضروری ہے' اگر نوٹس نہیں بھیجا گیا تو گویا کہ اجلاس غیر دستوری ہو گیا۔ فلاں قاعدہ پورا

نہیں ہوا تو اجلاس کے فیصلے کی قانونی حیثیت مشکوک ہو گئی۔ لیکن جب اصل بھٹی دہکتی ہے، یعنی جب کبھی مقابلہ شروع ہو جاتا ہے اور راست اقدام (active resistance) کا مرحلہ آتا ہے تو پھر یہ دستوری تقاضے پورے نہیں کئے جاتے، بلکہ طے کیا جاتا ہے کہ فلاں کی حیثیت ڈکٹیٹر کی ہے۔ اگر یہ مرگیا تو اس کی جگہ دوسرا ہو گا اور دوسرا بھی مرگیا تو تیسرا ہو گا۔ یہ بات ہمیں سیرتِ نبویؐ میں بھی نظر آتی ہے۔ حضور ﷺ نے غزوۂ موتہ میں معین کر دیا تھا کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ امیر ہوں گے، اگر یہ شہید ہو جائیں تو جعفر طیار رضی اللہ عنہ ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ امیر ہوں گے جو کہ انصاری صحابی تھے۔ اس کے بعد آپ خاموش رہے۔ جب تینوں شہید ہو گئے تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے افواج کی کمان سنبھالی۔ تو گویا ڈکٹیٹر کا معین ہونا ان مراحل میں ضروری ہوتا ہے۔ ڈکٹیٹر دراصل امیر ہی ہوتا ہے، لیکن ہمارے ہاں یہ لفظ گالی بن گیا ہے۔ ورنہ آپ غور کیجئے، لفظ "آمر" ڈکٹیٹر کے لئے آتا ہے اور امیر کسے کہتے ہیں؟ عربی زبان میں آمر "ا م ر" مادہ سے اسم فاعل، جبکہ امیر صفتِ مشبّہ ہے۔ اسم فاعل اور صفتِ مشبّہ کا فرق یہ ہے کہ اسمِ فاعل میں کسی صفت کا عارضی ہونا بھی ممکن ہے۔ ایک شخص جب پانی پی رہا ہے تو وہ "شارب" ہے۔ اس کی یہ صفت مستقل تو نہیں ہے۔ میں کوئی کام کر رہا ہوں تو اِس وقت میں فاعل ہوں۔ لیکن جب کوئی صفت مستقلاً کسی کی سیرت کا جزو بن جاتی ہے تو اب وہ فَعِیل کے وزن پر آتی ہے۔ گویا کہ آمریت جس شخص کے وجود میں مستقل ہو جائے گی وہ "امیر" کہلاتا ہے۔ لیکن ہم لفظ امیر تو استعمال کر لیتے ہیں لیکن جمہوریت کا ہمارے ذہنوں پر جو بخار چڑھا ہوا ہے اور مغربی تصورات نے ہمارے دماغوں کے اندر کچھ چیزیں جو ٹھونک ٹھونک کر راسخ کر دی ہیں، اس وجہ سے اس تصور کو ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ورنہ درحقیقت "آمر" میں آمریت کی صفت اگر مستقل ہو جائے تو وہ امیر ہے۔ حضور ﷺ کا حکم ہے کہ اگر دو یا تین افراد بھی کہیں سفر پر جا رہے ہوں تو اپنے آپ میں سے ایک کو امیر بنالیں۔

امیر اور مامورین کا باہم رشتہ کیا ہے؟ مامورین مشورہ ضرور دیں گے لیکن فیصلہ امیر کے ہاتھ میں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حضور ﷺ کا ہر فیصلہ اور ہر حکم واجب الاطاعت

تھا، لیکن اب کوئی امیر ایسا نہیں ہو گا جس کا ہر حکم واجب الاطاعت ہو۔ یہ دیکھا جائے گا کہ کوئی حکم شریعت کے دائرے سے باہر تو نہیں ہے، شریعت کے خلاف تو نہیں۔ اگر خلافِ شریعت ہے تو نہیں مانیں گے، اگر اس کے دائرے کے اندر اندر ہے تو خواہ تنگی ہو خواہ آسانی ہو، خواہ طبیعت آمادہ ہو خواہ اس کے لئے خود پر جبر کرنا پڑے، خواہ دوسروں کو ترجیح دی جائے، حالات مناسب ہوں یا مخدوش، ہر حال میں اطاعت کرنی ہے۔ صرف ایک استثناء ہے کہ امیر کا حکم اگر شریعت کے خلاف ہو تو "لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ" کے مصداق اسے نہ تو سنا جائے گا اور نہ ہی مانا جائے گا۔

بہرحال یہ ہیں وہ خصائص جو آپ کو کسی جماعت میں تلاش کرنے چاہئیں۔ ان کو آپ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ ان تمام خصوصیات کو سامنے رکھ کر جس جماعت پر بھی آپ کا دل مطمئن ہو اس میں شامل ہو جائیں۔

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

میں پھر عرض کروں گا کہ اگر آپ پر فرائضِ دینی کا تصور واضح ہو گیا ہو اور آپ کو پاکستان کی بقا کسی بھی درجے میں عزیز ہو تو پھر اس میں تاخیر نہ کریں۔ ہر شخص کمربستہ ہو جائے اور ﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کے انداز میں کسی نہ کسی جماعت میں شریک ہو جائے۔ البتہ اپنے کانوں اور آنکھوں کو کھلا رکھے۔ مزید غور و فکر جاری رکھے۔ اگر بعد میں کوئی بہتر جماعت سامنے آئے تو اس میں شامل ہو جائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَات

عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

"تم میں بہترین وہ ہے جس نے خود قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا"

ایمانیاتِ ثلاثہ

اصل حاصل اور باہمی تعلق

رحمت اللہ بٹر' ناظم تربیت

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ' كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ' لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ' وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ' غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (البقرۃ ۲۸۵)

لفظی معنی : ایمان امن سے بنا ہے اور اس کا حاصل بھی انسان کا داخلی امن ہے 'یعنی تسکین قلبی۔ انسان کو ایمان تبھی حاصل ہوتا ہے جب اس کائنات کے حقائق تک اس کی رسائی ہو جائے۔ اس کے لئے مالک کائنات نے اس کی ہدایت و رہنمائی کا بندوبست کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ' مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ' وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (الشوریٰ ۵۲)

"اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک رُوح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تم نہ تو قرآن کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو 'لیکن ہم نے اس (قرآن مجید) کو نور بنایا ہے کہ اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک آپ (اے محمد ﷺ) سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔"

اصطلاحی معنی : "تصدیقٌ بما جاء بهِ النبیُّ صلی اللّٰہ علیه وسلم" (اُس شے کی تصدیق کرنا جو نبی اکرم ﷺ لے کر آئے ہیں)

ایمان دو اجزاء ترکیبی کا مجموعہ ہے۔ نورِ فطرت 'نورِ وحی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح میں نور فطرت ودیعت کیا ہے۔ یعنی اسے یہ شعور دے کر بھیجا ہے کہ اس کا رب اللہ

ہے اور اسے اپنے رب کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ نورِ وحی آکر انسان کے اس شعور کی تصدیق بھی کرتا ہے' اس کی تفاصیل بھی بتاتا ہے اور آیات انفسی و آیات آفاقی کے ذریعے وہ یقین پیدا کر دیتا ہے جو تسکین قلبی کے لئے ضروری ہے۔

بنیادی طور پر ایمان کی تین شاخیں ہیں :

۱) ایمان باللہ

علمی و نظری لحاظ سے اصل ایمان' ایمان باللہ ہی ہے اور ایمان بالقدر بھی اسی کا حصہ ہے۔ جب ایمان کی اجمالاً تشریح کی جائے گی تو صرف اسی ایمان کا ذکر آئے گا۔ چنانچہ "ایمان مجمل" کے الفاظ ہیں :

"آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ"

یعنی "میں ایمان لایا اللہ پر جیساکہ وہ اپنے اسماء حسنٰی اور صفات کے حوالے سے ہے' اور میں نے اس کے تمام احکام قبول کئے' زبان سے گواہی دے کر اور دل سے تصدیق کرتے ہوئے"۔ یہی ایمان انسان کی زندگی کا مقصد معین کرتا ہے اور اسے وہ روشنی عطا کرتا ہے کہ جس سے کائنات کی تمام ظلمات اور پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کا معاملہ اُس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جو راہ مستقیم پر گامزن ہو۔ جیسے سورۃ الملک میں فرمایا گیا :

﴿ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

"بھلا وہ شخص جو اپنے چہرے کے بل گھسٹ رہا ہو وہ راہ یافتہ ہے یا وہ جو سیدھا ایک سیدھی راہ پر گامزن ہو؟"

جیساکہ اوپر بیان ہوا کہ اللہ کا ماننا وہی معتبر اور کار آمد ہے جو اس کے اسماءِ حسنٰی اور صفات کے حوالے سے ہو۔ وگرنہ صرف یہ جان لیناکہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جس نے اس کو پیدا کیا کافی نہیں ہے' کیونکہ یہ بات تو چار و ناچار ہر ایک کو ماننی پڑتی ہے اور دنیا کے تمام فلاسفہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کارخانہ لامتناہی کے لئے کوئی عِلّت العِلل

ناگزیر ہے۔ تاہم ان کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ اب یہ کائنات خود بخود کام کر رہی ہے اور اسباب وعلل کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

ایمان باللہ کا اصل حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف خالق کائنات مانا جائے بلکہ یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ اب بھی یہ کائنات اُسی کے انتظام و اختیار میں ہے اور جہاں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہو رہا ہے اسی کے اذن سے ہو رہا ہے۔ وہی اس کائنات کا بادشاہ اور مالک ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا اور ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اگرچہ اس نے اس کائنات کو کچھ طبعی قوانین (Physical Laws) کے تحت حرکت دی ہے' لیکن وہ پورا پورا اختیار رکھتا ہے کہ جب چاہے کسی قانون کو معطل کر دے یا اس کو بدل دے' یا کسی قوت کی تاثیر کو ختم کر دے۔ گویا وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے۔

یہ ساری کائنات اسی کے دائرہ اختیار میں ہے اور اسی نے ہر چیز کا اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔ اس کا علم مَاکَانَ وَمَایَکُوْنُ (جو کچھ ہو چکا اور جو ابھی ہونے والا ہے) پر محیط ہے اور یہاں کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جو اس کی منشاء کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ بھی کر سکے

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴾

"تم کسی چیز کی خواہش بھی نہیں کر سکتے مگر یہ کہ جو اللہ چاہے' کیونکہ وہ علم والا اور حکمت والا ہے۔" (الدھر : ۳۰)

موت و حیات کا یہ سلسلہ خود بخود نہیں چل رہا بلکہ وہی ہے جو ہر چیز کو حیات بخشتا ہے اور وہی ہے جو اس پر موت طاری کرتا ہے' اور اسے اس کا پورا اختیار ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا بیماریوں میں دوا اور جنگ میں ڈھال کا استعمال خدائی تقدیر کو ٹال سکتا ہے؟ (یعنی اگر نہیں ٹال سکتا اور وہی کچھ ہوتا ہے جو تقدیر الٰہی میں ہے تو اس کا فائدہ؟) اس پر آپؐ نے فرمایا: "میرے صحابہ' تم ان اسباب کو تقدیر سے خارج کیوں سمجھتے ہو؟ تقدیر میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ دوا کرو گے تو شفایاب ہو گے' اور سپر استعمال کرو گے تو دشمن کے وار سے بچ جاؤ گے"۔ چنانچہ اسباب و وسائل بھی حیطۂ تقدیر میں داخل ہیں۔ اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث ملاحظہ ہو :

قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا فَقَالَ: ((يَا غُلَامُ، احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، وَاِذَا سَاَلْتَ فَاسْاَلِ اللّٰهَ، وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ))

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں کہ میں ایک دن آنحضور ﷺ کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا کہ آپؐ نے فرمایا: "اے بچے! تو اللہ کی (حدود کی) حفاظت کر اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا، تو اللہ (کے احکام) کی حفاظت کر تو اس کو اپنے سامنے پائے گا، اور جب بھی مانگنا ہو تو اللہ سے مانگ اور جب کسی مدد کی ضرورت ہو تو اللہ سے مدد طلب کر، اور اچھی طرح جان لے کہ اگر تمام لوگ اس پر اکٹھے ہو جائیں کہ تمہیں کوئی نفع پہنچائیں تو ہرگز نفع نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے تیرے لئے مقدر کر رکھا ہے اور اگر سارے لوگ مل کر تمہارا کوئی نقصان کرنا چاہیں تو وہ تجھے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے تیرے لئے لکھ رکھا ہے، (جان لو) قلم اٹھا لئے گئے ہیں اور رجسٹر خشک ہو گئے ہیں۔"

یعنی اللہ نے جن چیزوں کو معین کر دیا ہے اب انہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہ ہے اللہ کے اختیار، اس کی قدرت اور علم کا تصور جو قرآن مجید دیتا ہے اور اللہ کو اسی طور پر ماننے کا نام ایمان ہے۔

آج کے مادی دور میں اللہ تعالیٰ کی اس معرفت میں کمی واقع ہوئی ہے اور انسان کا سارا انحصار کائنات کے وسائل پر ہو گیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کائنات کی تمام اشیاء میں جو تاثیر ہے وہ ان کی ذاتی اور مستقل ہے اور وہ خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے اور اسے پکارنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان چیزوں کی تاثیر اس کے اختیار کے تحت نہیں ہے۔ اور یہی وہ فتنہ دجالیت ہے جس کے بارے میں تمام انبیاء و رسل اپنی امتوں کو خبردار کرتے رہے کہ مبادا وہ اس میں ملوث ہو جائیں۔ اور

اسی فتنے کے بارے میں آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اس فتنہ میں ملوث انسان اگر دن کو مومن ہو گا تو رات کو کافر ہو جائے گا اور رات کو مومن ہو گا تو دن کو کافر ہو جائے گا۔ اس لئے کہ وسائل کے حصول کے لئے وہ اللہ کے حضور حاضر ہونے کی بجائے ان ہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھے گا اور ان کی خاطر ایمان سے تہی دامن ہو جائے گا۔

آج عالم اسلام کے تمام ممالک کا یہی نقشہ نظر آ رہا ہے کہ ان کے اربابِ بست و کشاد کو اللہ تعالیٰ کے مالک الملک اور قاضی الحاجات ہونے پر یقین کی بجائے اصل اعتماد امریکہ بہادر اور عالمی مالیاتی اداروں پر ہے کہ وہ ان سے مدد کا حصول اپنی قومی زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور ان کے کہنے پر حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا رہے ہیں اور ان کی فرمانبرداری میں اللہ کی صریحاً نافرمانی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ گویا جو اصل حقیقت ہے اس سے آنکھیں بند ہیں اور جو دھوکہ اور دجل و فریب ہے اس پر پورا اعتماد ہے۔ اللہ کی بجائے کائنات، رُوح کی بجائے جسم خاکی اور حیات اُخروی کی بجائے حیاتِ دُنیوی توجہات کا مرکز و محور بن چکے ہیں۔

قرآن مجید انسان سے جس ایمان کا مطالبہ کرتا ہے اور جسے ایمان واقعی قرار دیتا ہے وہ تو اللہ کو مالک الملک، مختار مطلق اور تمام اشیاء پر قہار ہونے کا یقین ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی

﴿ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ۝ ﴾ (المائدہ ۱۲۰)

"اللہ ہی کی بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس پر بھی، اور وہی ہے جو ہر چیز پر اختیار رکھتا ہے"۔

﴿ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝ ﴾ (الانعام ۱۴)

"کہہ دیجئے : کیا میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو مددگار سمجھوں حالانکہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور وہ ہر کسی کو کھانا کھلاتا ہے اور خود کھانا نہیں

کھاتا۔ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے سامنے سر تسلیم خم کروں اور تاکید کی گئی ہے کہ شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤں"۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۚ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۝ ﴾

"اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے' وہی زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور وہی مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟" (الانعام:۹۶)

اور یہی وہ ایمان باللہ ہے جو مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ یقین عطا کرے تا کہ اس کی طرف رجوع ہو۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۝ ﴾ (یونس: ۳۱' ۳۲)

"ان (اللہ کے علاوہ دوسروں پر انحصار کرنے والوں) سے پوچھئے کون ہے جو تمہیں رزق مہیا کرتا ہے آسمان اور زمین سے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہے؟ اور کون نکالتا ہے زندہ کو مُردہ سے اور نکالتا ہے مُردہ کو زندہ سے اور کون ہے جو نظم عالم کی تدبیر کرتا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو اللہ ہی ہے۔ بس فرما دیجئے: تو کیا تم (اس کی نافرمانی سے) بچتے نہیں؟ بس یہ ہے تمہارا مالک حقیقی۔ پھر حق کے علاوہ تو گمراہی ہی ہوتی ہے' آخر یہ تم کہاں بھٹکتے پھرتے ہو؟"

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَاَنَّ رُوحَ الْاَمِينِ نَفَثَ فِي رَوْعِي اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا ' اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوا الطَّلَبَ ' وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اِسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ فَاِنَّهُ يُدْرَكُ

مَا عِنْدَ اللّٰهِ اِلاَّ بِطَاعَتِهٖ) (بیھقی عن عبداللّٰہ بن مسعود ﷺ)

"رُوح الامین نے یہ بات میرے جی میں ڈال دی ہے کہ کوئی نفس نہیں مرتا جب تک اپنا رزق مکمل نہ کرلے (جو اللہ نے اس کے لئے ماں کے پیٹ ہی میں مقرر کر دیا تھا) پس تم اللہ کی نافرمانی سے بچو اور طلب میں جائز راستہ اختیار کرو اور کہیں کم رزق تمہیں حرام میں طلب پر مجبور نہ کردے' کیونکہ جو اللہ کے پاس ہے وہ اس کی فرمانبرداری کے ذریعہ طلب کرنا چاہئے"۔

وعَن سَلمان ﷺ قال سَمِعتُ رَسُولَ اللّٰہ صَلَی اللّٰہُ عَلَیہ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: ((مَنْ غَدَا اِلَی الصَّلٰوۃِ الصُّبْحِ غَدَا بِرَاْیَۃِ الْاِیْمَانِ وَمَن غَدَا اِلَی السُّوْقِ غَدَا بِرَاْیَۃِ اِبْلِیْسَ)) (ابن ماجہ)

"حضرت سلمان فارسی ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو شخص صبح کرتا ہے نماز سے (یعنی اللہ کے سامنے اپنی عبدیت ظاہر کرنے اور اسی سے مانگنے سے) تو اس نے ایمان کے جھنڈے تلے صبح کی اور جو صبح ہی صبح (نماز پڑھے بغیر) بازار چلا گیا روزی حاصل کرنے کے لئے (یعنی وہ روزی رساں دکان و کاروبار ہی کو سمجھ رہا ہے) تو اس نے شیطان کے جھنڈے تلے صبح کی"۔

ایمان بالقدر کے بارے میں یہ جان لیں:

عن ابی الدَّرْدَاء ﷺ قَالَ قَالَ رَسُول اللّٰہ ﷺ ((اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ حَقِیْقَۃٌ وَمَا بَلَغَ عَبْدٌ حَقِیْقَۃَ الْاِیْمَانِ حَتّٰی یَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَہٗ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَہٗ وَمَا اَخْطَاَ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیبَہٗ))

(احمد و طبرانی)

حضرت ابوالدرداء ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور بندہ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ وہ یہ بات جان لے کہ اسے جو کوئی (مصیبت وغیرہ) پہنچی ہے وہ اس سے چوکنے والی نہ تھی اور جو کوئی چوک گئی ہے وہ اسے پہنچنے والی نہ تھی"۔

(جاری ہے)

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان ذُوالنُّورَین رضی اللہ عنہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

(آخری قسط)

سانحۂ عظیم

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے چند یوم قبل حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (جو اسلام سے قبل ایک جیّد یہودی عالم تھے) نے محاصرین سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اجازت طلب کی۔ چونکہ اس بلوے میں اصل سازشی ذہن تو یہودیوں کا کام کر رہا تھا للہٰذا بلوائیوں نے یہ گمان کیا کہ یہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کوئی گستاخی کر کے آئیں گے' للہٰذا انہوں نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو اجازت دے دی۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ مجھے اپنے پاس رہنے کی اجازت دیجئے کیونکہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ ظالم اب آپ کو شہید کئے بغیر نہ ٹلیں گے۔ میری تمنا ہے کہ میں بھی آپ کی مدافعت میں شہید ہو جاؤں ـــــ اس کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ روایات میں محفوظ ہیں کہ : "میرا جو حق تم پر ہے' میں اس کا واسطہ دے کر تم سے کہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ' میرے ساتھ نہ رہو"۔ وہ حق کیا تھا؟ اس کی تفصیل موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کبھی ان کے ساتھ کوئی حسن سلوک کیا ہو' اس کا واسطہ دیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد امیر المومنین ہونے کی وجہ سے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پر جو آپؓ کی اطاعت واجب تھی' اس کا واسطہ دیا ہو ـــــ بہرحال ناچار حضرت عبداللہ بن سلام واپس چلے گئے۔ باہر بلوائی منتظر تھے کہ وہ آ کر ہمیں بتائیں گے کہ کس طرح وہ حضرت عثمان کی دل

آزاری کر کے آئے ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن سلام نے بلوائیوں کے سامنے کھڑے ہو کر خطبہ دیا کہ : "لوگو! باز آجاؤ۔ امام وقت کے خون میں اپنے ہاتھ نہ رنگو۔ میں تم کو خبردار کرتا ہوں کہ کبھی اللہ کا کوئی نبی شہید نہیں کیا گیا' جس کی پاداش میں کم از کم ستر ہزار لوگ قتل نہیں ہوئے اور کبھی کسی نبی کا خلیفہ شہید نہیں کیا گیا اِلا آنکہ اس کی شہادت کے بعد کم از کم ۳۵ ہزار لوگ قتل نہیں ہوئے ــــ دیکھو! باز آجاؤ' میں سچ کہتا ہوں کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی"۔ بلوائی کچھ اور توقع کر رہے تھے' لیکن جب انہوں نے یہ بات سنی تو شور مچا دیا کہ "یہ یہودی جھوٹ کہتا ہے"۔ انہوں نے پھر کہا "خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہہ رہا' بلکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اللہ کی کتاب تورات کے حوالے سے کہہ رہا ہوں! اب بھی باز آجاؤ' ورنہ تمہاری اس حرکت سے جو فتنے کا دروازہ کھلے گا' اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے"۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ "اے عثمان! اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اِس اُمت پر خلیفہ مقرر کرے اور منافق اس بات کی کوشش کریں کہ اللہ کے پہنائے ہوئے اس کرتے کو اتار دو تو اس کو ہرگز نہ اتارنا" ــــ حضورؐ نے تین بار تاکید فرمائی۔ چنانچہ عین شہادت کے دن جب بلوائیوں کی طرف سے اُشتر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ آپ خلافت چھوڑ دیں اور لوگوں سے کہہ دیں کہ تم کو اختیار ہے جس کو چاہو خلیفہ بنالو! ورنہ یہ لوگ آپ کو قتل کر ڈالیں گے' تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "میں خلافت نہیں چھوڑ سکتا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جس جامہ کو خدا مجھے پہنائے گا میں اس کو کبھی نہیں اتاروں گا" ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابن ماجہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں ایک وقت صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تخلیہ میں بلا کر ان سے کچھ باتیں کیں۔ اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا چہرہ متغیر ہوتا چلا گیا ــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام ابو سہلہ نے بیان کیا کہ شہادت سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ میں صابر رہوں۔

وقتِ آخر

اس کامل الحیاء والایمان کے اعطاء اور تقویٰ کی عین شہادت کے دن والی شان بھی دیکھئے۔ اُس وقت آپ رضی اللہ عنہ کے پاس بیس غلام تھے ' ان سب کو یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ میرا تو آخری وقت آ گیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ساری عمر کبھی شلوار نہیں پہنی تھی ' لیکن جب معلوم ہو گیا کہ وقت آخر قریب ہے تو اس خیال سے کہ مبادا اس ہنگامے میں عریاں ہو جاؤں ' شلوار منگائی اور پہنی۔ روایت میں الفاظ آئے ہیں کہ "وَشَدَّھَا" کہ اس کو خوب کس کر باندھا ' تاکہ شہید ہونے کے بعد ستر نہ کھلنے پائے اور اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے الفاظ "وَاَکْثَرُھُمْ حَیَاءً عُثْمَانُ" کو کہیں بٹہ نہ لگ جائے۔ شلوار پہنی اور پھر قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا پہلا قطرہ سورۃ البقرہ کے ان الفاظ پر گرا ﴿فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ﴾ "ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے" ___ اس طرح وہ پیشینگوئی پوری ہوئی جس کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ :"میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا ' اتنے میں عثمان رضی اللہ عنہ آ گئے۔ آپؐ نے فرمایا : اے عثمان! تم سورۃ البقرہ پڑھتے ہوئے شہید کئے جاؤ گے اور تمہارے خون کا قطرہ آیت فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ پر گرے گا۔ تم پر اہل مشرق و مغرب یورش کریں گے اور ربیعہ و مضر (دو قبیلے) کے لوگوں کے برابر تمہاری شفاعت قبول ہو گی اور تم قیامت میں بے کسوں کے سردار بنا کر اٹھائے جاؤ گے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مزید پیشین گوئیاں

صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب کہ ایک مرتبہ آپؐ باغ میں تھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما تشریف لا چکے تھے تو) تیسری بار دروازے پر دستک سن کر مجھ سے فرمایا کہ عثمان کے لئے دروازہ کھول دو اور ان کو ایک بلوے میں صابر رہنے پر جنت کی خوشخبری سناؤ"۔

حضرت کعب بن عجزہ رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ میں مروی ہے کہ :"ایک دن رسول اللہ

ﷺ نے فتنوں کا ذکر کیا اور ان کا قریب ہونا بیان کیا۔ اتنے میں ایک صاحب اپنا سر لپیٹے ہوئے نکلے جس سے ان کا منہ چھپا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اُس دن حق پر ہو گا۔ میں نے لپک کر ان صاحب کے ہاتھ پکڑ لئے اور ان کا چہرہ کھول کر حضورؐ کی طرف کرتے ہوئے عرض کیا "یہی؟" آپؐ نے جواب میں فرمایا "ہاں یہی" ـــــ یہ صاحب حضرت عثمان ﷺ تھے"۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی بیان کیا ہے۔

استیعاب میں ہے کہ زرارہ بن نخعی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے اپنا خواب بیان کیا کہ "میں نے دیکھا کہ ایک آگ نکلی جو میرے اور میرے بیٹے کے درمیان حائل ہو گئی"۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ آگ وہ فتنہ ہے جو میرے بعد ہو گا۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہؐ! فتنہ کیسا؟ حضورؐ نے فرمایا : "آگ وہ فتنہ ہے جس میں لوگ اپنے امام کو قتل کر ڈالیں گے، جس کے بعد آپس میں خوب لڑیں گے، مسلمان کا خون مسلمان کے نزدیک پانی کی طرح خوشگوار ہو گا، برائی کرنے والا اپنے آپ کو نیک گمان کرے گا"۔ آنحضور ﷺ اس ارشاد میں "امام" سے مُراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ ان کی شہادت کے بعد ہی مسلمانوں میں آپس میں خونریزی ہوئی۔

ترمذی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک فتنہ کا ذکر کیا اور اس موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس میں یہ مظلوم شہید ہوں گے"۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ عنقریب فتنہ و اختلاف ہو گا۔ ہم نے کہا آپ ہم کو کیا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ امین یعنی عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کا ساتھ اختیار کرنا"۔

شہادت عثمان رضی اللہ عنہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم کے تاثرات

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ سے قبل وفات پا چکے تھے، لیکن ان کے غلام ابو سعید سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ "خدا کی قسم اگر لوگ عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیں گے تو ان کا جانشین نہیں ملے گا"۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے (یکے از عشرہ مبشرہ) شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کہا : "اگر تمہارے

اس معاملہ سے جو تم نے عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا ہے' خدا کا عرش اپنی جگہ سے مل جاتا تو بعید نہیں تھا۔"

عالم اولین و آخرین یعنی حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ : "لوگوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے اپنے اوپر ایسے فتنے کا دروازہ کھول لیا ہے جو قیامت تک بند نہ ہو گا۔ اب جو تلواریں کھنچ گئی ہیں وہ قیامت تک میانوں میں بند نہ ہوں گی" ـــــ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حسرت سے کہا کرتی تھیں کہ : "باغیوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا حالانکہ وہ سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے اور اللہ سے ڈرنے والے تھے"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کا ایک قول مروی ہے۔ محمد بن حاطب سے روایت ہے کہ کوفہ میں ایک مجلس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ : "لوگ عثمان کے حق میں کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنوں کی پاسداری کی اور بری طرح حکومت کی اور لوگوں نے ان سے بدلہ لیا ہے' جبکہ میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ جب عنقریب حاکم عادل کے پاس جائیں گے تو وہ ان کا فیصلہ کر دے گا' ان کے لئے آگ ہو گی"۔ محمد بن حاطب کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پھر مجھ سے کہا کہ : "اے محمد بن حاطب! جب تم مدینہ جاؤ اور لوگ تم سے عثمان کی بابت دریافت کریں تو کہنا کہ خدا کی قسم وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی قرآن نے یہ صفت بیان کی ہے : ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (جبکہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا' ایمان لائے اور عمل صالح کیا' پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے۔ پھر تقویٰ اختیار کیا اور خوبی کے ساتھ اس کا حق ادا کیا' اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے) ـــــ

روایات میں یہ واقعہ بھی نقل ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے اَبان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آپؓ نے ابان کو مخاطب کر کے کہا "میں اُمید کرتا ہوں کہ میں اور تمہارے والد ان لوگوں میں سے ہیں جن کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی : ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝﴾ (ان کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہو گی اسے ہم نکال دیں گے' وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔)

مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اکثر کہا کرتے تھے کہ : "یاالٰہی! تو خوب جانتا ہے کہ میں عثمان کے خون سے بری ہوں اور عثمان کے قتل کے دن میرے ہوش اُڑ گئے تھے" ـــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ : "لوگوں نے عثمان کے قتل کے بعد مجھ سے بیعت کرنا چاہی' میں نے کہا بخدا مجھے ان لوگوں سے بیعت لیتے شرم آتی ہے جنہوں نے اس شخص کو قتل کرڈالا جس کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "کیا میں اس سے شرم نہ کروں جس سے ملائکہ شرم کرتے ہیں" پس میں بھی خدا سے شرم کرتا ہوں۔ لوگ چلے گئے۔ جب عثمان رضی اللہ عنہ دفن ہو گئے اور اُمت بغیر خلیفہ کے رہ گئی' اہل مدینہ نے بھی بیعت کے لئے اصرار کیا تو میں نے بیعت لے لی اور اُس وقت میں نے کہا : اے اللہ عثمان (رضی اللہ عنہ) کا بدلہ مجھ سے لے لے یہاں تک کہ تو راضی ہو جا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کہا کہ "خدا کی قسم جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ۔ بخدا اب قریش میں اس کثرت سے موت اور قتل واقع ہو گا کہ اگر کوئی ہرن اپنے مسکن میں جائے گا تو وہاں بھی کسی قرشی کے جوتے پڑے ملیں گے"۔

حبر الامہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ : "اگر سب لوگ قتل عثمان پر متفق ہو جاتے تو ان پر مثلِ قومِ لوط پتھر برستے۔"

حضرت حماد بن سلمہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ : "عثمان رضی اللہ عنہ جس دن خلیفہ بنائے گئے اس دن وہ سب سے افضل تھے اور جس روز شہید کئے گئے اس دن وہ خلافت والے دن سے زیادہ اشرف تھے۔ ان سے زیادہ افضل و اشرف روئے زمین پر کوئی نہیں تھا۔ اور مصحف کے بارے میں وہ ویسے ہی سخت تھے جیسے ابو بکرؓ قتال مُرتدین اور مانعین زکوٰۃ کے بارے میں شدید تھے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما شہادت عثمان رضی اللہ عنہ پر اتنے دل گرفتہ اور آزردہ خاطر تھے کہ انہوں نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ ان سے مروی ہے کہ شہادت کے دن عثمان صبح اٹھے تو کہا کہ : "میں نے آج رات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا' آپؐ نے

فرمایا : "اے عثمان آج تم روزہ میرے ساتھ افطار کرو"۔۔۔ چنانچہ عصر کی نماز کے بعد جمعہ کے دن روزے کی حالت میں حضرت عثمان شہید ہوئے' رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ!

قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ میں سے چند ایک کا عبرتناک انجام

ابو قلابہ سے مروی ہے کہ : میں نے شام کے بازار میں ایک آدمی کی آواز سنی جو "آگ آگ" چیخ رہا تھا۔ میں قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر ٹخنوں سے کٹے ہوئے ہیں اور دونوں آنکھوں سے اندھا منہ کے بل زمین پر پڑا گھسٹ رہا ہے اور "آگ آگ" چیخ رہا ہے۔ میں نے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے کہا کہ "میں ان لوگوں میں سے ہوں جو عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھسے تھے۔ جب میں ان کے قریب گیا تو ان کی اہلیہ چیخنے لگیں' میں نے ان کے منہ پر طمانچہ مارا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا تجھے کیا ہو گیا ہے' عورت پر ناحق ہاتھ اٹھاتا ہے۔ خدا تیرے ہاتھ پاؤں کاٹے' تیری دونوں آنکھوں کو اندھا کرے' اور تجھے آگ میں ڈالے! مجھے بہت خوف معلوم ہوا اور میں نکل بھاگا۔ اب میری یہ حالت ہے جو تم دیکھ رہے ہو' صرف آگ کی بددعا باقی رہ گئی ہے۔"

نافعؒ سے مروی ہے کہ : "ایک بلوائی نے شہادت کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عصا لے کر اس کو اپنے گھٹنے سے توڑ ڈالا تھا' اس کی پوری ٹانگ گل گئی" —— یزید بن حبیب سے مروی ہے کہ : "جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر چڑھائی کر کے گئے تھے ان میں سے اکثر پاگل ہو کر مرے۔"

واقفِ اسرارِ نبویؐ یعنی حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ "جب بلوائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف چلے تو لوگ ان کے پاس آئے اور کہا کہ بلوائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف گئے ہیں' آپ کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا بخدا یہ لوگ ان کو شہید کر دیں گے۔ لوگوں نے پوچھا ۔ شہید ہونے کے بعد کیا ہو گا؟ انہوں نے کہا : خدا کی قسم عثمان رضی اللہ عنہ جنت میں جائیں گے اور ان کے قاتلین کے لئے دوزخ ہے' جس سے ان کو کسی طور چھٹکارا نہیں ملے گا۔"

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا خواب

روایات میں آتا ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما (جن کو بلوائیوں نے اس وقت زخمی کر دیا تھا جب وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو محاصرے کی حالت میں پانی پہنچانا چاہتے تھے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں خطبہ بیان کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اس خطبے میں انہوں نے اپنا ایک خواب بیان کیا۔ اس خواب سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم اسباب میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی ایک تو ظاہری شکل ہوتی ہے اور ایک باطنی حقیقت ہوتی ہے ___ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ·

"لوگو! میں نے کل رات ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت لگی ہوئی ہے۔ پروردگارِ کائنات اپنے عرش پر متمکن ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور عرش کا ایک پایہ پکڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آتے ہیں اور حضورؐ کے شانۂ مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آتے ہیں اور وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ___ پھر اچانک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس حال میں اس عدالت میں آتے ہیں کہ ان کا کٹا ہوا سر ان کے ہاتھوں میں رکھا ہوتا ہے اور وہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں فریاد کناں ہوتے ہیں کہ اے پروردگار! اپنے ان بندوں سے جو تیرے آخری نبی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں اور جو خود کو مسلمان کہتے ہیں، پوچھا تو جائے کہ مجھے کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا؟ میرا آخر کیا گناہ تھا، کون سا جرم تھا جس کے بدلے میں میرا سر کاٹا گیا؟"

اس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

"عثمان رضی اللہ عنہ کی اس فریاد پر میں نے دیکھا کہ عرشِ الٰہی تھرایا اور آسمان سے خون کے دو پرنالے جاری کر دیئے گئے جو زمین پر خون برسانے لگے۔"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اس بیان کے بعد لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے (جو اس خطبہ کے

(باقی صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ کیجئے)

فکرِ عجم

عہدِ قاچاریہ

فکری اور سیاسی تبدیلیوں کا دور

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۱۰)

ڈاکٹر ابو معاذ

نادر شاہ کے بعد ایران ایک بار پھر خانہ جنگی اور طوائف الملوکی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ بالآخر ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۶ء) میں قاچاریوں نے ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ یہ لوگ قفقازی ترک تھے اور سالور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ شاہ اسماعیل صفوی کے باپ کے مرید تھے اور انہوں نے حصول حکومت کی جدوجہد میں صفویوں کی مدد کی تھی۔ اسی قبیلے کے ایک شخص فتح علی خان کو شاہ طہماسپ دوم نے اپنا نائب السلطنت بنا لیا تھا' جو نادر شاہ کے ہاتھوں قتل ہوا' کیونکہ نادر کا خیال تھا کہ شاہ طہماسپ فتح علی کے زیر اثر ہے۔ فتح علی خان کے دو بیٹے تھے' محمد حسین خان اور محمد حسن خان۔ محمد حسن خان نے نادر شاہ سے ڈر کر مشرقی ترکوں کے ہاں پناہ لے لی تھی۔ اُن دونوں مازندران (طبرستان) کا حاکم نادر شاہ کا بھتیجا عادل شاہ تھا (جو بعد میں اس کا جانشین بنا)۔ عادل شاہ نے محمد حسن خان کے دونوں بیٹوں کو اپنے ہاں بلوا لیا۔ محمد خان کو اس نے قوت مردانگی سے محروم کروا دیا جس پر وہ "آغا" کے لقب سے مشہور ہوا کیونکہ شاہی حرم کے خواجہ سرا کو آغا کہا جاتا تھا۔ اِسی آغا محمد خان نے قاچاری حکومت کی بنیاد رکھی۔

آغا محمد خان قاچار

آغا محمد خان نے خاندان زند کے دارالحکومت کرمان پر یلغار کر کے وہاں پر انسانی سروں کا مینار تعمیر کیا۔ پھر اس نے اصفہان' کردستان' عراق عجم اور آذربائیجان کو فتح کر لیا۔ بعد میں اس نے تحریص و تدبیر کے حربوں سے کام لیتے ہوئے افشار قبیلے کے سردار علی

خان افشار والی آذر بائیجان کو اپنے ہاں بلوایا اور اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔
پھر اپنے بھائیوں کو قتل کرنے یا ملک سے بھگانے میں کامیاب ہونے کے بعد جارجیا (گرجستان) پر ہلہ بول دیا۔ جارجیا اُن دنوں ایران کا صوبہ تھا' جس کے حکمران ہراکلیوس دوازدہم نے ایران کی داخلی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر نیازمندی اور خاموشی سے زار روس سے دوستی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ محمد خان نے ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۵ء) میں ساٹھ ہزار کی فوج کے ساتھ تفلیس (تبلیسی) پر حملہ کر دیا اور شہر میں داخل ہو کر اہل شہر کو قتل کروا دیا' کلیساؤں کو نیست و نابود کیا اور پادریوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ سولہ ہزار افراد کو قیدی بنایا۔ پھر گنجہ کی جانب پیش قدمی کی اور اس پر بھی قبضہ کر لیا۔

اب اس نے شاہ اسماعیل صفوی کے مزار سے لائی ہوئی تلوار زیب کمر کی اور تاج شاہی سر پر رکھا۔ خود کو صفویوں کا سیاسی جانشین اور شیعہ مذہب کا حامی اور سرپرست قرار دیا اور اعلان کیا کہ امام غائب کے ظاہر ہوتے ہی وہ حکومت ان کے سپرد کر دے گا کیونکہ یہ بادشاہت اس کے پاس امام دوازدہم کی امانت ہے۔ جلد ہی اس نے خراسان پہ قبضہ کر کے نادر شاہ کے خاندان کے آخری فرد شاہ رخ کو گرفتار کر لیا۔ اُس وقت شاہ رخ کی عمر ساٹھ برس تھی۔ اس کے سر پر پگھلا ہوا سیسہ ڈالا اور اورنگ زیب کا مشہور ہیرا چھین کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آخر کار یہ ظالم بادشاہ خود اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

فتح علی شاہ

آغا محمد خان قاچار کا بھتیجا فتح علی شاہ قاچار ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۷ء) میں بادشاہ بنا۔ اس کا زمانہ بغاوتوں اور شورشوں کا تھا۔ اس کے زمانے میں روسیوں نے ایران سے جارجیا چھین لیا۔ اس نے انگریزی سفیر کپتان میلکم کے توسط سے ۱۸۰۰ء میں سلطنت برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت افغانوں پر دباؤ' فرانسیسیوں سے تجارتی مراعات کی واپسی اور انگریزوں کے لئے ایران کی بندرگاہوں کا آزادانہ استعمال شامل تھا۔ ساتھ ہی انگریزوں کو ایران میں برآمدات کی آزادانہ اجازت دے دی گئی تھی۔ اس دوران

نپولین نے بھی ایرانیوں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی جس کا مثبت جواب نہ ملا۔ ۱۸۰۳ء میں روس نے ایران سے طویل جنگ چھیڑ دی جو دس برس تک جاری رہی۔ ۱۸۰۵ء میں نپولین بھی روس سے نبرد آزما ہو گیا۔ بالآخر ۱۸۰۷ء میں فتح علی قاچار نے نپولین سے اس کے روس سے دشمنی کے مد نظر ایک اہم دفاعی معاہدہ کر لیا' جس میں انگریزوں کے خلاف ممکنہ مہم جوئی کے دوران ہندوستان پر حملہ کے موقع پر تعاون کا وعدہ بھی شامل تھا۔

اب فرانس کے ساتھ دفاعی معاہدے کے بعد انگریز بھی ایران میں متحرک ہو گئے اور انہوں نے ۱۸۰۸ء میں سرہار فورڈ جونز کو ایران بھجوایا۔ اس دوران فتح علی شاہ بھی نپولین کے رویہ سے مایوس ہونے لگا تھا۔ حکومت برطانیہ نے ایران سے ایک لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ سالانہ کی امداد کا وعدہ کیا۔ بعد ازاں ۱۸۱۱ء میں سرگور اوسلے تہران میں برطانیہ کا سفیر مقرر ہوا۔

ایران اور روس کی طویل جنگ بالکل آخری معرکہ پر ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۲ء) میں ختم ہوئی اور اس کے نتیجے میں ایران کے بہت سے علاقوں پر روس قابض ہو گیا۔ پھر قراباغ کے ضلع گلستان میں روس کے ساتھ بدنام زمانہ "معاہدہ گلستان" پر دستخط ہوئے جس کے تحت ایران دربند' باکو' شروان' شوش' قراباغ اور طائش سے دستبردار ہو گیا۔ اسی طرح گرجستان (جارجیا)' داغستان' منگریلیا' ایمرشیا اور ابحازیہ کے علاقے روس کو تفویض ہو گئے اور ایران کا ان خطوں پر کوئی حق باقی نہ رہا۔ جب تمام متنازعہ علاقے روس کو مل گئے تو مسئلہ خود بخود ختم ہو گیا' مگر ایران میں ہر طرف مایوسی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ داخلی شورشوں اور عوام کے اکسانے پر فتح علی پھر روس پر حملہ آور ہوا تاکہ مسلمانان قفقاز کی مدد کر سکے۔ لیکن روسی بڑھتے ہوئے تبریز پر قابض ہو گئے۔ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں روس سے مصالحت کے لئے "ترکمن چائی" کا معاہدہ ہوا جس کے تحت ایروان' نحجوان اور نواحی سرسبز و شاداب علاقے روسیوں کو مل گئے۔

فتح علی قاچار کی چار سو بیگمات اور دو سو ساٹھ بچے تھے اور وہ رعایا کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک روا رکھتا تھا۔ ہر طرف بے چینی اور پریشانی کا دور دورہ تھا اور ملک شکست و

ریخت سے دو چار ہو رہا تھا۔ اسی بے چینی نے بعد میں قومی اصلاحی تحاریک کو جنم دیا جو ناصرالدین کے زمانے میں پروان چڑھیں۔

اِسی زمانہ میں شیخ محمّد بن عبدالوہاب نے نجد سے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ شیخ نے اپنی تعلیم اصفہان اور بصرہ سے مکمل کی تھی۔ وہ نجد کے صدر مقام درعیہ کے شہزادہ ابن سعود اور اس کے بیٹے عبدالعزیز کی مدد سے ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں کربلا پر حملہ آور ہو گیا اور وہاں پر پانچ ہزار مرد و زن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایرانی مورخوں کے مطابق انہوں نے امام حسین کے روضہ کی ضریح توڑ دی اور مزار کی نفیس اشیاء گراں بہا جواہرات، سونے اور چاندی کی قندیلیں اور سونے کی اینٹیں لوٹ لیں۔ فتح علی شاہ قاچار نے والیِ بغداد سلیمان پاشا کو تلقین کی کہ وہ ضروری اقدامات کرے۔ تھوڑی مدت کے بعد سلیمان پاشا فوت ہو گیا تو عبدالعزیز کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہو گیا اور ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) تک نجد کے آس پاس کے علاقے اُس کے تسلط میں آ گئے۔ اب اس نے مسقط پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ سلطان مسقط نے وہابیوں کے خلاف ایرانیوں سے مدد مانگی۔ ایرانی لشکر وہاں پہنچا، پھر وہاں سے چل کر درعیہ (نجد) کی طرف کوچ کیا جہاں محمّد علی پاشا والیِ مصر کے ساتھ مل کر عبدالعزیز اور محمّد بن عبدالوہاب کے مشترکہ لشکر کا مقابلہ کر کے انہیں شکست فاش سے دو چار کیا۔

محمّد شاہ قاچار

فتح علی شاہ کے بعد اس کا پوتا محمّد شاہ پسر عباس مرزا ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں ایران کا بادشاہ بنا۔ اسے حصول حکومت میں انگریزوں اور روسیوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس نے مشہور ماہر سیاست اور مشہور نثر نگار قائم مقام وزیر اعظم کو مروا دیا۔ اس نے انگریزوں سے بے اعتنائی برتی اور ۱۸۳۸ء میں انگریزوں نے ایران میں اپنا سفارت خانہ بند کر دیا۔ ایرانیوں نے ہرات کا ناکام محاصرہ کیا اور پھر انگریزوں کے خلیج فارس میں بڑھتے ہوئے دباؤ کے تحت، وہاں سے محاصرہ اٹھا لیا۔ پھر خراسان میں بغاوت ہوئی۔ محمّد شاہ کے زمانے کے کچھ واقعات بہت اہم ہیں جو بعد میں ایران میں فکری انقلاب کا پیش

خیمہ ثابت ہوئے۔ اس کے وزیر اعظم حاج مرزا آقاسی کی سخت گیری اور ظالمانہ مالیاتی نظام کے سبب محب وطن اور آزادی کے متوالے ملوکیت کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ اس نے اس تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور انہیں چن چن کر مروایا۔ اس طرح انہیں انقلاب کی راہ دکھلائی۔

محمد شاہ قاچار نے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں اسماعیلیوں کے امام خلیل اللہ کے صاحبزادے آغا خان محلاتی نے حاجی مرزا آقاسی (وزیر اعظم) کے معاندانہ رویہ کے پیش نظر علم بغاوت بلند کیا اور کرمان کے قلعہ بام کو فتح کر لیا۔ جلد ہی حاکم کرمان فیروز مرزا نے یہ قلعہ واپس لے لیا۔ بالآخر آغا خان مایوسی کے عالم میں ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں ایران کو خیرباد کہہ کر ہندوستان میں بمبئی کے شہر میں قیام پذیر ہو گئے۔ پرنس کریم آغا خاں انہی کی اولاد سے ہیں۔

اسی دوران ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں حاکم بغداد نجیب پاشا (جو عثمانیوں کا نمائندہ تھا) نے کربلا میں اہل تشیع کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس واقعہ پر حکومت ایران نے عثمانیوں سے سخت احتجاج کیا۔ انگریز اور روسی مصالحت کے لئے آگے بڑھے اور بالآخر ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت عثمانیوں نے محمرہ (موجودہ بوشہر) شہر اور بندرگاہ 'جزیرۃ الخضر اور شط العرب کے مشرقی ساحل کو واگزار کر کے ایران کے حوالے کر دیا اور حکومت ایران سلیمانیہ کے علاقوں سے دستبردار ہو گئی۔ ایران کو خلیج فارس کے راستے جہاز رانی میں کامل آزادی نصیب ہو گئی' ایران کے بلجیم' سپین اور برطانیہ سے تجارتی معاہدے طے پائے اور یورپی ممالک سے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے۔

اسی دوران شیراز کے باشندے علی محمد باب نے ایک نیا مذہب پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ امام وقت کا نمائندہ اور مبشر ہے۔ اس کی چرب زبانی سے متاثر ہو کر مایوس ایرانی باشندوں نے اس کی طرف توجہ دی۔ اس طرح اس کے حلقۂ اثر میں اضافہ ہو تا گیا۔

ناصرالدین شاہ قاچار

اس نے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) سے ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) تک پورے طمطراق سے نصف

صدی تک ایران پر حکومت کی۔ اس کے عہد میں ایران میں تیزی سے سیاسی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس نے محلاتی سازشوں اور داخلی یورشوں کا قلع قمع کر کے حکومت کو مستحکم کیا۔ مرزا تقی امیر نظام جیسے وزیر باتدبیر نے اس زمانہ میں اصلاحات کا آغاز کیا اور مرکزی طاقت میں اضافہ کر کے امراء اور مجتہدین کی طاقت کو کم کیا' لیکن حاسدین کی کوششوں سے یہ وزیر قید ہوا اور ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں قتل کروا دیا گیا۔

اسی دوران خوارزم (جو ایران کا حصہ تھا) کے حکمران نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور محمد امین خان شاہ خوارزم مرو پر لشکر کشی کرنے کے بعد سرخس پر حملہ آور ہوا۔ بالآخر قید ہوا اور ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں قتل کروا دیا گیا۔ اسی دوران روسیوں نے ایران پر ایک بار پھر ہلہ بول دیا۔ روسی خوقند اور بخارا کو فتح کرنے کے بعد بحیرۂ یورال تک چڑھ دوڑے اور پھر خوارزم پر قابض ہو گئے۔ ایرانی ہرات کی جانب بڑھے تو انگریزوں نے ایک بار پھر ایرانی سواحل خصوصاً خرم شہر کی بندرگاہ پر حملہ کر دیا اور پھر ایک معاہدہ کے تحت ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں آخر کار ایران ہمیشہ کے لئے ہرات پر اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گیا۔ اسی دوران بلوچستان کی مستقل حد بندی ہوئی اور ایران اور برطانوی ہند میں ۱۸۶۴ء میں یہ علاقہ تقسیم کر دیا گیا۔ اسی طرح سیستان ایران اور افغانستان میں تقسیم ہو گیا۔ پھر ایران اور ترکیہ کی حد بندی بھی مکمل ہوئی۔ اس کے عہد میں ٹیلی گراف کا مربوط نظام قائم ہوا۔ پھر ایک انگریز رائٹر کو ۱۸۷۲ء میں ریل چلانے' کان کنی اور بینک کا ٹھیکہ دیا گیا مگر امراء کی مخالفت کے باعث یہ ٹھیکہ منسوخ کرنا پڑا۔ بحیرہ کارون میں انگریزوں کو جہاز رانی کا ٹھیکہ ملا' مٹی کے تیل کی وسیع پیمانے پر دریافت ہوئی' اہواز سے اصفہان تک پختہ سڑک تعمیر کی گئی۔ امپیریل بینک آف پرشیا اور روسی بینک قائم ہوئے۔

اب ہم قاچاری عہد میں علماء کرام کی سرگرمیوں اور اصلاحی تحریکوں کا جائزہ لیں گے' جن کے نتیجہ میں ایران میں بیداری کی لہر اٹھی اور ایران ازمنہ تاریک سے نکل کر شعور اور بیداری کے دور میں داخل ہو گیا۔

بابی مذہب اور بہائی عقائد

اس مذہب کا بانی علی محمد باب تھا۔ ۱۸۲۰ء میں شیراز میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ عطار تھا مگر اس نے علی محمد کو کربلا میں مذہبی تعلیم کے حصول کے لئے بھجوایا۔ ۲۴ برس کی عمر میں اس نے ایرانی عوام میں پیدا ہونے والی بے چینی اور بے اطمینانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باب (یعنی امام غائب کا دروازہ) ہونے کا اعلان کیا۔ اسی برس اس نے حج کیا اور پھر واپسی پر بوشہر میں اپنا مذہب پیش کیا۔ وہاں سے کچھ کامیابی حاصل کر کے شیراز واپس آیا۔ لوگوں کی سخت مخالفت کے باعث وہاں سے اصفہان آ گیا۔ حکومت وقت نے اسے قید کر کے شمالی علاقے کے شہر ماکو میں نظر بند کر دیا۔ آخر کار علماء کے فتوے کی رُو سے تبریز میں ۱۸۵۰ء میں مروا دیا گیا۔

باب کے عقائد کی رُو سے خدا ایک ہے اور باب خدا کا آئینہ ہے۔ اس نے اسلامی شریعت کی تنسیخ کا اعلان کرتے ہوئے اپنی شریعت کے آغاز کا اعلان کیا اور کہا کہ میرے پیرو کاروں کو اب مسلمان نہ کہا جائے۔ دن میں ایک نماز اور سال میں انیس روزے قرار دیئے۔ آزادی نسواں کو نئے مذہب کا اہم رکن قرار دیا اور شخصی آزادی کا تصور پیش کیا۔ جبر و استبداد سے پسے ہوئے عوام جو کہ امام کے ظہور کے منتظر تھے' اس سے متاثر ہونے لگے اور اس کی تحریک دُور دُور تک پھیلنے لگ گئی۔ ۱۸۵۰ء میں اس کے حامیوں نے یزد شہر پر قابض ہونا چاہا مگر ناکام رہے' پھر کرمان کا رخ کیا' پھر وزیر اعظم امیر نظام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا جس کا راز افشاء ہو گیا اور کئی بابی تختہ دار کی زینت بنے۔ قزوین کے نواحی قصبہ زنجان کے ملا نے بابی مذہب اختیار کر لیا۔ بابی آہستہ آہستہ دہشت گردی کی زیر زمین سرگرمیوں میں ملوث ہونے لگے۔ ۱۸۵۲ء میں ایک بابی نے بادشاہ ناصر الدین پر بندوق سے حملہ کیا مگر نشانہ چوک گیا اور حملہ آور قاتل دھر لیا گیا۔ پھر بابیوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس تحریک میں ایک مشہور شاعرہ طاہرہ قرۃ العین کا کردار طلسماتی حد تک اہم ہے۔ اس کا نام نقطہ زرین تاج تھا اور اسے باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ یہ شاعرہ حسن و جمال'

علم و فہم، دانش و تدبر اور شعر و سخن کا پیکر تھی۔ طاہرہ قزوین کے مشہور عالم دین حاجی ملا صالح کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے چچا ملا محمد کے بیٹے سے بیاہی گئی تھی۔ ملا محمد مجتہد تھا۔ طاہرہ نے حدیث، تفسیر، اصول و فقہ کے علاوہ فلسفہ اور الہیات کی تعلیم پائی تھی۔ طاہرہ معاشرے پر روا رکھی جانے والی بے جا پابندیوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی اور آزادی نسواں کا تصور پیش کیا۔ سب سے پہلے اپنے گھرانے کے افراد سے الجھی اور خفیہ طور پر باب کو خط لکھ کر اپنے افکار کا اظہار کیا۔ باب کے جواب میں اپنے سوالات کا جواب پا کر وہ اس کی پیرو کار بن گئی۔ اپنے سسرال سے ناطہ توڑ کر وہ کربلا چلی گئی۔ کچھ عرصہ بغداد میں بھی مقیم رہی اور وہاں پر علماء سے مناظرے کیے۔ وہاں کے عثمانی ترک گورنر نے اسے واپس ایران بھجوا دیا اور واپسی پر اپنے میکے میں ٹھہر گئی۔ جمعہ کے خطبہ کے موقع پر اس کا چچا مجتہد ملا محمد ایک بابی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ پھر جب اہل شہر نے شور و غوغا بلند کیا تو وہ چپکے سے تہران آ گئی۔ یہاں سے طاہرہ بغداد چلی گئی اور پھر تہران آئی۔ وہاں سے سرکردہ بابیوں کی کانفرنس میں بیدشت کے مقام پر شریک ہوئی۔ وہاں پر اس نے اپنا حجاب اتارا اور مشہور تقریر کی۔ اس کے بعد وہ گرفتار ہوئی۔ بادشاہ کے چھوڑنے کے باوجود وہ ۱۲۶۴ھ (اگست ۱۸۵۲ء) میں علماء کے ایک فتوے کی رُو سے قتل کروا کے تہران میں ایک اندھے کنویں میں پھنکوا دی گئی۔

اس کی زندگی کے حالات مشہور بابی مولفہ مارتھا روٹ (جو امریکی خاتون تھی) نے طاہرہ نامی انگریزی کتاب میں قلمبند کیے ہیں۔ یہ خاتون انیسویں صدی کے آخر میں قزوین آئی تھی اور وہاں سے طاہرہ کے احوال زندگی اور غزلیات جمع کر کے ہندوستان آئی جہاں اس کی ملاقات بلبل ہند سروجنی نائیڈو سے ہوئی اور سروجنی نائیڈو نے اس سے علامہ اقبال کیلئے طاہرہ کی کچھ فارسی غزلیات نقل کیں۔ علامہ اقبال نے ان غزلیات کے مطالعے کے بعد جاوید نامہ میں اس کا ذکر ان بے چین روحوں میں کیا ہے جو جنت تک تو نہ پہنچ پائیں مگر حیات جاوید پا گئیں اور اُسکی غزل نقل کی جس کا مطلع درج ذیل ہے ؎

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ روبرو
شرح دہم غم ترا نقطہ بہ نقطہ مو بہ مو

باب کی وفات کے بعد مرزا یحییٰ صبح ازل اس کا جانشین بنا جس کے بڑے بھائی نے بہاء اللہ کے لقب سے بہائی مذہب کا آغاز کیا اور خود امام زمانہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ لوگ حکومت ایران کی سختیوں کے باعث بغداد، کردستان ہوتے ہوئے استنبول چلے گئے اور وہاں سے ادرنوپل کے مقام پر گوشہ نشین ہو گئے۔ یہیں پر بہاء اللہ سے ملاقات کرنے کیلئے مشہور انگریز خاور شناس (orientalist) محقق ڈاکٹر جی ای براؤن آیا اور بہاء اللہ سے اپنی تاریخی ملاقات کا حال لکھا۔ بہاء اللہ کے بیٹے عبد البہاء نے وہاں سے ارض فلسطین کا رخ کیا اور انگریزوں کے وہاں پر قابض ہونے کی راہ ہموار کی۔ (ناچیز کے سلسلہ ہائے مضامین میں، جو صراط مستقیم برمنگھم میں چھپے ہیں، بابی اور بہائی مذہب پر سیر حاصل مواد موجود ہے۔)

قاچاری عہد اور شیعہ علماء

قاچاری عہد میں دینی علماء کو گراں قدر جاگیریں عطا ہوئیں اور یہ لوگ بھی شاہی نوازشات کے نتیجہ میں ایران کے جاگیردارانہ طبقہ میں شامل ہو گئے۔ پھر ان کی سرکاری سرپرستی میں درجہ بندی ہوئی۔ طالب علم "طلاب" کہلائے۔ فارغ التحصیل ہونے والے علماء کچھ عرصہ کے بعد "ثقۃ الاسلام" کہلائے اور سینئر علماء "حجت الاسلام" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ان سے بلند پایہ لوگ "آیت اللہ مجتہد" کہلوائے اور پھر قم کے مذہبی حلقہ سے ایک عہد میں دس "آیت اللہ العظمیٰ" منتخب ہوتے تھے جو مرجع تقلید کہلانے لگے۔ اس طرح عوام سے لے کر آیت اللہ العظمیٰ تک ایک منظم اور مربوط مذہبی نظام کا ادارہ قائم ہو گیا جس کا تنظیمی نظم و ضبط عیسائیت کے کلیسائی نظام کی طرح بے نظیر معلوم ہوتا ہے۔ ایران کے وہ علاقے جو شیعہ آبادی پر مشتمل تھے اور روس کے قبضہ میں چلے گئے تھے (مثلاً آذربائیجان) وہاں بھی یہ نظام ابھی تک رائج ہے۔ اسی طرح عراق عرب جو بعد کے ادوار میں سلطنت عثمانی کا حصہ بن گیا، وہاں کے شیعہ حلقہ میں بھی یہی نظام باقی رہ گیا۔

فتح علی شاہ قاچار کے دور میں علماء کا اقتدار اور اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ امیر نظام

کے بعد مرزا آقا خاں وزیر مقرر ہوا تو اس نے علماء و مجتہدین سے انتہائی قریبی تعلق استوار کر لئے۔ اسی دوران بادشاہ ناصرالدین بار بار یورپ کے سفر پر جاتا رہا اور وہاں سے واپس آکر اپنے ملک میں اصلاحات نافذ کرنے کے درپے ہوا۔ اس نے اپنے دوروں کے اخراجات سے ملک کو مالی طور پر سخت زیر بار قرض کر دیا۔ یورپ کے دوروں کے باعث علماء بھی شاہ سے بددل ہونے لگے۔ حسین خان وزیر اعظم کے خلاف بھی ایرانی علماء اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ کافروں کا تمدن ملک میں رائج کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ شاہ کے غیر ملکی دوروں کا انتظام کرتا ہے۔ بالآخر حسین خان کو وزارت سے علیحدہ کر کے اسے آذربائیجان کی حکومت سونپ دی گئی۔

اس دوران عوام میں بیداری کی لہر دوڑی تو علماء نے پینترا بدلتے ہوئے عوام کا ساتھ دینے کی بجائے شاہ کا ساتھ دیا اور جس کسی شخص کو کیفر کردار تک پہنچانا مقصود ہوتا اسے بہائی کہہ کر قابل گردن زدنی قرار دے دیا جاتا۔ تہران کے خطیب (امام جمعہ) کا نکاح بادشاہ کی ایک بیٹی سے ہوا تھا۔ ایک مشہور عالم دین مرزا آقا خاں کرمانی جنہیں جلاوطنی کی زندگی گزارنا پڑی وہ لکھتے ہیں کہ اس دور کے ملا کے لئے کسی بھی بے گناہ شخص کا خون بہانا ایک معمولی سی بات تھی۔ کوڑے مارنا' سنگسار کروانا اور گردن اڑا دینا قانونی قرار دے دیئے گئے تھے۔ اسی طرح ایک منحرف عالم دین شیخ زنجانی کے بقول ملا لوگ بہائی اور کافر کی اصطلاحات وسیع پیمانے پر استعمال کرتے تھے اور ایسے الزامات لگا کر وہ تاجروں' دوکانداروں اور کسانوں کو ختم کروا کے ان کی دولت پر قابض ہو جاتے تھے۔ اس طرح دینی مدرسوں کے طلبہ اور علماء کا کردار پولیس کے سپاہیوں سے بھی بدتر ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں جب آزادی رائے اور آزاد پریس کا ملک میں مطالبہ ہوا تو حاج ملا علی نے تہران سے وزیر اعظم کو ایک خط میں خبردار کیا کہ آزادی رائے صرف ظاہری طور پر ہی خوبصورت دکھائی دیتی ہے مگر درحقیقت اس کی اپنی قباحتیں ہیں' یہ بالآخر شاہ' مذہبی علماء اور عمائدین سلطنت کی کردار کشی کے لئے استعمال ہو گی' یہ بات بادشاہت کے مفادات کے منافی ہے کہ ہر کسی کو اپنی مرضی کی بات کہنے کا حق دے دیا جائے۔ (بحوالہ ہمانا طق' روحانیت و آزادیہائے دیموکراتیک ۶ مارچ ۱۹۸۲ء) یہ علماء کے مکمل اور مسلسل تعاون

کا نتیجہ تھا کہ ایران میں ۱۹۲۴ء تک قاچاری عہد قائم رہ سکا۔

بقول ڈاکٹر علی شریعتی کے یہ تمام حربے صفوی شیعیت کی نشانیاں تھیں جو حکومتوں نے اپنے تحفظ کے لئے ایک جالے کی طرح عوام کے اِرد گرد سیاہ شیعیت کی صورت میں بُن رکھا تھا۔ اپنے انتہائی آغاز کے دور سے صفوی شیعیت نے شیعہ مذہب کے سب سے اہم اصول یعنی رواداری کے برعکس سنی عوام پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ آپ کے بقول اصلی شیعیت جو حضرت علی ؓ کی میراث ہے وہ آزادی اور انقلاب کا راستہ دکھاتی ہے اور صفوی ظلم واستبداد کے باوجود اس کا وجود برقرار رہا ہے۔

ہرچند کہ علماء کو عمومی طور پر عوام میں ایک اہم مقام حاصل رہا مگر آہستہ آہستہ بیدار ذہنوں نے اور متبادل راستے بھی اپنانا شروع کر دیئے۔ پھر ایک موقع آیا جب وہ روایتی علماء سے ہٹ کر ایک روشن فکر مفکر سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ (جنہیں ایران میں جمال الدین اسد آبادی کہا جاتا ہے) کی قیادت میں متحرک ہو گئے اور اسی طرح اسلامی افکار کی وضاحت کے لئے آنے والے وقتوں میں انہوں نے علامہ اقبال (جنہیں وہ مولانا محمد اقبال لاہوری) کہتے ہے اور ڈاکٹر علی شریعتی کا اثر قبول کیا۔

سنی علماء کے بارے میں سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ وہ معاشی اور سیاسی طور پر آزاد نہیں ہیں اور معاشی اعتبار سے اولوالامر (یعنی حکومت وقت) کے محتاج ہیں، اس لئے وہ سنی دُنیا میں براہ راست عوام کے پاس جاتے ـــــ مگر شیعہ دُنیا میں انہیں معلوم تھا کہ علماء کسی حد تک خود مختار ہیں اور وہ براہ راست عوامی فنڈ یا دیگر ذرائع سے کسب معاش کرتے ہیں اس لئے براہ راست ان سے رابطہ کیا جائے۔ شیعہ دُنیا کے باضمیر علماء نے وقت آنے پر ان کا ساتھ بھی دیا اور ان کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے بے مثال قربانیاں دیں۔

سید جمال الدین افغانیؒ

سید جمال الدین اسد آبادی انتہائی صاحب بصیرت اور بیدار مغز انسان تھے۔ آپ دُنیائے اسلام کا دورہ کرتے ہوئے ترکی چلے گئے جہاں آپ نے فرسودہ اور قدیم روایات

سے ہٹ کر قرآن پاک کی بیباک انداز میں تشریح کرنا شروع کردی' مگر اسی روشن فکری کی پاداش میں ۱۸۷۳ء میں شیخ الاسلام فہمی کے حکم سے ملک بدر کردیئے گئے۔ اس سے قبل آپ نے حال ہی میں معرض وجود میں آنے والی استنبول یونیورسٹی میں مذہب اور سائنس کے عنوان سے لیکچر دیئے تھے۔ شیخ الاسلام نے ان خطبوں کو خلاف اسلام و پیغمبر اسلام قرار دیتے ہوئے آپ کی ملک بدری کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ وہاں سے مجبوراً لندن چلے گئے اور پھر جامعۃ الازھر کے شیخ محمد عبدہ کے ہمراہ ۱۸۸۳ء میں پیرس میں مقیم ہو گئے' جہاں سے "عروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ایک مجلے کا آغاز کیا جو اپنی انقلابی تحریروں کے باعث بیشتر اسلامی ممالک میں ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سنی دنیا میں خلیفہ (سلطان عثمانی) کو اولوالامر کا درجہ دے کر اس کی اطاعت کو لازمی قرار دیا جاتا تھا' مگر سید جمال الدین نے کہا کہ اسلام افراد کو سیاست و حکومت میں مطیع نہیں بلکہ شریک بناتا ہے۔ آپ کے نزدیک سیاست اور مذہب کا امتزاج وقت کا تقاضا تھا۔ آپ نے اسلام کو ایک ایسی طاقت قرار دیا جو اندرونی جبر و استبداد اور بیرونی سامراجیت سے تحفظ فراہم کرتی ہے۔ آپ کے بقول اسلام ایک جدید سائنسی مذہب ہے جو تحرک' سعی و عمل' وفاداری اور عزم و ہمت سے عبارت ہے۔ یہ تعمیر و ترقی کا مذہب ہے اور بددیانتی کا قلع قمع کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا ان کی حالت نہیں بدلتا جو خود بدلنا نہ چاہتے ہوں۔ آپ کی تعلیم یہ تھی کہ اسلام سب مسلمانوں کے لئے ہے اور وہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس پر عمل پیرا ہوں۔

پہلی بار آپ ترکی میں ناصرالدین قاچار سے ملے۔ شاہ نے آپ کو ایران آنے کی دعوت دی' لیکن جونہی اسے آپ کے جذبات کا احساس ہوا اس نے ۱۸۸۶ء میں آپ کی ملک بدری کا حکم دے دیا۔ پھر میونخ میں آپ سے شاہ کی ملاقات ہوئی اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ شخص بیرون ملک زیادہ خطرناک ہے' ۱۸۸۹ء میں شاہ انہیں اپنے ہمراہ ایران لے آیا۔ تہران پہنچتے ہی آپ کے عقیدت مند آپ کے گرد جمع ہونے لگے۔ بادشاہ نے بھی آپ کو اپنے قرب کے مواقع فراہم کئے اور کئی اہم سیاسی امور میں آپ سے مشورے لینے لگا۔

شاہ نے مارچ ۱۸۹۰ء میں تمباکو کا ٹھیکہ ایک انگریز کمپنی کو پندرہ ہزار پاؤنڈ اسٹرلنگ سالانہ کے عوض دے دیا۔ اس طرح تمباکو کے نرخ خود انگریز مقرر کر سکتے تھے اور عوام سے اونے پونے داموں تمباکو لے کر اسے کھلے بازار میں مہنگے داموں فروخت کر سکتے تھے۔ سید جمال الدین نے اس معاہدے کے خلاف رائے عامہ بیدار کی اور مختلف مقامات پر عوامی جلسوں میں تقریریں کر کے عوام کو اس کے خلاف اکسایا۔ اگرچہ یہ اجارہ داری کا معاہدہ عوام کی نگاہوں سے خفیہ رکھا گیا تھا مگر ایک بڑی تعداد میں عوام اس کاروبار سے وابستہ تھے۔ علاوہ بریں معاہدے کی رُو سے انگریزوں کو ہر مقام پر اپنے کارندے لانے اور بغیر تلاشی دیئے اپنی حفاظت کی غرض سے ہر قسم کا اسلحہ لانے کی آزادی بھی دے دی گئی تھی۔ پھر عوام کے روزمرہ استعمال کی چیز یعنی تمباکو کو استعمال سے قبل کافروں نے ہاتھ لگانا تھا۔

اس موقع پر سید جمال الدین کا خیال تھا کہ علماء کی اکثریت فکری اور عملی جمود کا شکار تھی اور وہ قرآن پاک کے مفاہیم کی وسعتوں کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھی۔ تاہم کچھ صاحب بصیرت علماء بھی موجود تھے۔ ایسے علماء' روشن فکر اہل دانش اور عوام کی مدد سے سید جمال الدین نے ایک انقلابی تحریک کو منظم کرنا شروع کیا۔ آپ کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ ایک فردِ واحد جو آمر مطلق بنا بیٹھا تھا اور خود کو شاہ کہلاتا تھا' اسلامی افکار کی رُو سے اس نے عوام الناس کے حکومت کرنے اور شخصی آزادیوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رکھا تھا۔ سید جمال الدین کا یہ واضح موقف تھا کہ ایران کے غریب عوام غربت و افلاس اور جبر و استبداد کا شکار تھے اور شاہ نے اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے ایران اور اس کا جملہ مالیاتی نظام بیرونی سامراجی قوتوں کے ہاتھوں گروی رکھ دیا تھا۔ ایران میں پہلی بار آپ ہی نے شہنشاہیت کے خاتمے کا نعرہ (مرگ بر شاہ) لگایا۔

آپ کی مقبولیت کے خوف سے تہران میں موجود برطانوی مشن کے دباؤ پر بادشاہ نے آپؒ کو بالآخر تہران چھوڑنے کا حکم دیا تو آپ تہران کے نواح میں شاہ عبدالعظیمؒ کے مزار پر چلے گئے جہاں کی پرامن فضا میں پوری دلجمعی اور آزادی سے آپ اپنی عملی تحریک جاری رکھ سکتے تھے۔ آپ کی تحریک کی مقبولیت کے باعث عوام نے جوق در جوق شاہ

عبدالعظیم کے مزار پر جانا شروع کر دیا اور سید جمال الدینؒ کی تقاریر کے باعث عوام کا غیظ و غضب بڑھتا گیا۔ شاہ نے اس مقام کے تمام ترتقدس کو پامال کرتے ہوئے آپ کو اپنی فوج کے سپاہیوں کے ذریعے مزار کی حدود سے باہر نکالا اور ایران چھوڑنے کا حکم دیا۔ آپ ۱۸۹۱ء میں لندن پہنچے اور اگلے دو برس وہیں پر مقیم رہے۔ لندن میں آپ نے اپنی تحریک جاری رکھی اور مسلسل اپنے پمفلٹ اور کتابچے وہاں سے ایران بھجواتے رہے۔ آپ کے پیروکاروں نے شاہ کے خلاف اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ خود جمال الدین افغانی بھی حکومت کے کارندوں کو خطوط لکھ کر صورت حال واضح کرتے رہے۔ شاہ کو تحریر شدہ ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو :

> "تم روزِ قیامت رسول اللہ ﷺ کو کس طرح چہرہ دکھا سکو گے جن کے امتیوں پر تم نے مصائب کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ چند پاؤنڈوں کی خاطر تم نے غریب عوام کو ان کی محنت شاقہ کے ثمر سے محروم کر رکھا ہے جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکتے تھے۔ تم نے ان کے نوالے چھین کر کفار اور منکرین پیغمبرؐ کی جیبیں بھر دی ہیں"۔

آپ کے ایک حامی مرزا علی رضا کو جب تہران میں گرفتار کیا گیا تو حکومت کی جانب سے ایک خط برطانوی دفتر خارجہ کو لکھا گیا جس کے مطابق مرزا علی رضا کی خفیہ تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سید جمال الدین کا پیروکار ہے اور وہ ہندوستانی عوام کی انگریزوں کے ہاتھوں ذلت سے متاثر ہے۔ اس کے بعد اس خط میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ ان تمام واقعات کے پیچھے دو عوامل کارفرما ہیں۔ ایک تو جدید تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور دوسرے روایتی ملا۔ پہلا طبقہ شاہ کے ظلم و ستم اور مالیاتی بددیانتی کو عوام کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے جبکہ دوسرا طبقہ (علماء) یہ کہہ رہا ہے کہ مومنوں کو کفار کے پنجہ استبداد میں دیا جا رہا ہے۔ علماء کے بقول بینک ' کانیں ' تمباکو اور سڑکیں انگریزوں کو بیچی جا رہی ہیں جو بالآخر عوام کا غلہ اور پھر ان کی خواتین بھی چھین کر لے جائیں گے۔

عوامی بغاوت اور تمباکو کا مسئلہ : آیت اللہ شیرازی کا فتویٰ

اب عوام بپھرے ہوئے شیروں کی طرح باہر نکل آئے۔ سب سے پہلے شیراز کے

لوگوں (جو سب سے زیادہ تمباکو پیدا کرنے والے صوبہ فارس کا دارالحکومت تھا) نے شہر کے دروازے پر قبضہ کر کے برطانوی کمپنی کے کارندوں کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ پھر اصفہان کے تمباکو کے اہم تاجروں نے برسرعام اپنے تمباکو کے ذخائر کو جلا دیا۔ تہران کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ مشہور عالم جناب مرزا حسن آشیانی کو جلاوطنی کا حکم ملا ہے تو شہر میں قیامت برپا ہو گئی۔ ایران کی تاریخ میں پہلی بار خواتین بھی مظاہروں میں شامل ہو گئیں۔ مظاہرین مسجد شاہ کی جانب بڑھے تو وہاں کے خطیب نے منبر پر کھڑے ہو کر عوام کو پرامن رہنے اور منتشر ہونے کی اپیل کی۔ عوام نے امام کو منبر سے نیچے کھینچ کر مارا پیٹا اور نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ خواتین مظاہرین نے دو شاہی کارندوں کو مار مار کر نڈھال کر دیا' ایک شخص نے شاہی خاندان کے فرد یعنی ریجنٹ کو چھرا گھونپ دیا۔ سرکاری عمارات اور ریجنٹ کے گھر کو نشانہ بنا کر عوام شاہی تنصیبات پر ٹوٹ پڑے۔ وہاں سے ان پر شاہی پولیس نے فائرنگ کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ تمباکو تو ایک بہانہ تھا' گویا عوام عرصۂ دراز سے اس دن کے منتظر تھے جب وہ شاہ کے خلاف اپنے غیظ وغضب کا اظہار کر سکتے۔

یہ خبر جب سید جمال الدین کو پہنچی تو آپ نے اُس وقت کے واحد مرجع تقلید آیت اللہ حسن شیرازی کو ایک خط لکھا جو اُن دنوں عراق کے ایک چھوٹے سے قصبے سامرہ میں مقیم تھے۔ اس خط کے مندرجات سے ایک اقتباس کچھ یوں ہے :

> "آج کا ایران آپ جیسے عظیم مذہبی رہنما کی تائید اور رہبری کا منتظر ہے۔ اس ملک کا بادشاہ غدار ہے۔ اس کا وزیر اعظم امین السلطان غاصب' بے دین اور ظالم ہے اور وہ حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔ مذہبی علماء کے احکام کی صریحاً خلاف ورزی کرتا ہے' شراب پیتا ہے' سیدوں کو برا کہتا ہے' کفار کا دوست اور مسلمانوں کا دشمن ہے' غیر ملکی کفار کے فاسد ارادوں میں برابر کا شریک ہے' ایک غیر ملکی کمپنی کو اس نے تمباکو کا ٹھیکہ دے رکھا ہے اور شاہ کہتا ہے کہ یہ ایک محدود وقت یعنی صرف پچاس برس کے لئے ہے۔ غیر ملکی بینک کے قیام کا اختیار بھی غیروں کو دے دیا گیا ہے۔ اِدھر انگریز ایران کا سودا کر رہے ہیں اُدھر روس اب خراسان کو چھیننے کی سوچ رہا ہے۔ شاہ نے اپنی اغراض اور

ہوس کاری کے لئے قرضے لے رکھے ہیں' ملک کے صوبے نیلام ہو چکے ہیں' آپ مشاہیر اسلام کے سربراہ ہیں۔ اگر آپ نے رہنمائی نہ کی تو یہ ملک اغیار کے ہاتھوں بک جائے گا۔ یہاں کے سب علماء آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔"

بالآخر آیت اللہ شیرازی کی طرف سے فتویٰ جاری ہو گیا۔ اس فتوے کی رُو سے تمباکو کا استعمال اور انگریزوں سے تمباکو کا کاروبار خدا' رسول اور امام وقت سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ اس فتوے کے جاری ہوتے ہی شاہی انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی۔ لوگوں نے اپنے حقے توڑ دیئے۔ اس فتوے کا یہ اثر ہوا کہ جب بادشاہ نے حقہ طلب کیا تو اس کی بیگمات اور نوکروں نے اس موقف کی بنا پر شاہ کو حقہ پیش کرنے سے انکار کر دیا کہ ایسا کرنا مرجع تقلید کے فتوے کی خلاف ورزی ہو گا۔ تمباکو کے بارے میں تمام امور معطل ہو گئے۔ (اسی کامیابی کے بعد گاندھی نے ترک موالات کا سوچا تھا۔) لوگوں نے ایک اور فتویٰ بھی شائع کر دیا کہ اگر ۴۸ گھنٹے میں یہ معاہدہ منسوخ نہ ہوا تو پھر جہاد شروع ہو جائے گا۔ عوام بلووں پر اتر آئے اور مسلح تصادم کی نوبت آ گئی۔ شاہ کو یہ معاہدہ بالآخر منسوخ کرنا پڑا۔

حال ہی میں تحقیقات کی رو سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ فتویٰ جعلی تھا اور تہران کے تمباکو کے تاجروں نے خود ہی فتویٰ لکھ کر شائع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ہما ناطق (جنہوں نے سید جمال الدین" پر ڈاکٹریٹ کی ہے) اور ڈاکٹر شریعتی کے قریبی ساتھی اور تہران یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد تھے' لکھتے ہیں کہ بہت سے علماء جن میں شیخ حسن کربلائی بھی شامل تھے اور جنہوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا' وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ فتویٰ ایران کے تمباکو کے مایوس اور پریشان حال تاجروں نے خود ہی گھڑ لیا تھا۔ اس فتویٰ کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ خود آیت اللہ العظمیٰ بھی اس کی تردید نہ کر سکے۔

ہرچند کچھ علماء اس تحریک میں شامل ہوئے لیکن اکثر علماء نے اس سے لاتعلقی جاری رکھی۔ عوام کے شبینہ خطوط اُن دنوں اکثر اوقات لوگوں میں تقسیم ہوتے رہتے تھے۔ ایک ایسے خط میں یہ لکھا ہے کہ "آپ لوگ اس لئے ملا بنے پھرتے ہیں کہ آپ کو عوام نے چندے دے دے کر اس مقام پر پہنچایا ہے اور انہی کے خرچ پر آپ لوگوں نے تعلیم

حاصل کی ہے۔ مزدور، کسان اور تاجروں کے خون پسینے کی کمائی اس لئے آپ پر صرف نہیں ہوئی کہ آپ خاموش تماشائی بن جائیں۔ آپ لوگ عوام کا کیوں ساتھ نہیں دیتے؟" یہ فتویٰ کہیں سے بھی آیا ہو بہرحال عوامی تحریک کو اس موقع پر مذہبی تائید حاصل ہوگئی۔ یہ ثابت ہوگیا کہ ایران کی ہروہ سیاسی تحریک جسے مذہبی تائید حاصل ہو اس کی کامیابی کے روشن امکانات ہوا کرتے ہیں۔

تمباکو کے معاہدے کی تنسیخ پر برطانوی کمپنی نے ہرجانے کا دعویٰ کردیا۔ چنانچہ پانچ لاکھ پاؤنڈ کی خطیر رقم برطانوی امپریل بینک سے چھ فیصد سالانہ سود پر قرض لے کر ادا کی گئی، اور عوام پر اس کا بوجھ بھی آپڑا۔ علماء نے یہ سمجھ لیا کہ معاملہ ختم ہوگیا ہے، اس لئے وہ دوبارہ خاموش ہوگئے۔ یہ مالی نقصان ایک طرف رہا، لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ عوام کی مرضی کے خلاف ایران میں کوئی کام بھی ممکن نہیں ہوگا۔

سید جمال الدینؒ کا ایک اور خط

لندن سے آپ نے علماء کو لکھا کہ بادشاہ اب آپ کو اور عوام کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ اپنی فوج اور پولیس کو یورپی کرائے کے افسروں اور فوجیوں کی مدد سے منظم کر رہا ہے اور اگر اسے موقع مل گیا تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ یہ خط جو آیت اللہ حسن شیرازی اور دیگر علماء کو لکھا گیا اس کے کچھ مندرجات اس طرح ہیں۔

> "اے مذہبی رہنماؤ! آپ کا فتویٰ سامنے آنے سے اسلام کی عظمت زندہ ہوگئی ہے۔ اس عظیم روحانی طاقت کے سامنے اہل مغرب ٹھہر نہیں سکے۔ یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آپ عوام کے لئے ایک مضبوط حصار ہیں۔ لیکن امر افسوس یہ ہے کہ وہ ظالم (بادشاہ) اب بھی برسر اقتدار ہے۔ اب وہ علماء کو صوبوں سے جلاوطن کر رہا ہے۔ فوج اور پولیس کی استعماری خطوط پر تنظیم نو کر رہا ہے۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ شاہ کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے توپوں، بندوقوں یا فوج کی ضرورت ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ خدا نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ لوگوں کے پاس عظیم قوت ہے۔ آپ کے فتویٰ نے سب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ آپ کا ایک لفظ سنتے ہی عوام آج کے فرعون کو نیست و نابود کردیں گے۔ ایک شخص جس نے

مسلمانوں کا خون چوسا ہے' ان کی ہڈیاں توڑی ہیں اور قوم کو اقوام عالم میں ذلیل و رسوا کروا دیا ہے' یہ اس ملک و قوم کو اغیار کو سونپنے کے در پے ہے جو مذہب کی عظمت کی علامت رہا ہے۔ آج وزراء' کمانڈر' فوج' عوام اور ظالموں کے اپنے بچے آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ آپ کا وہ ایک لفظ سننے کے منتظر ہیں جس کے بعد وہ اسے تاج و تخت سے محروم کر کے رکھ دیں گے۔"

اس خط میں کئی ایسی اندرونی سرکاری معلومات شامل تھیں جو شاہ کے قریبی کارندوں نے خفیہ طور پر سید جمال الدین کو بہم پہنچائی تھیں۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ تھا کہ آرمی کے افسروں اور جوانوں میں غیر ملکی افسروں کی شمولیت کے باعث بددلی پھیل رہی ہے اور وہ شاہ کے خلاف کسی وقت بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔

اسی دوران تہران میں موجود برطانوی سفارت خانے نے ایک خط ۱۸۹۲ء میں وزرات خارجہ کو تحریر کیا جس میں درج تھا کہ

"سید جمال الدین نے علماء کو ایک خط لکھا ہے جس میں بادشاہت کے خلاف واضح الفاظ میں غیظ و غضب اور نفرت کا احساس ہوتا ہے اور ہمیں (برطانیوں کو) ڈر ہے کہ اس خط سے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔ حتیٰ کہ خود شاہ بھی اس خط کے مندرجات سے پریشان ہے اور اسے خوف ہے کہ کہیں ایران میں انارکی نہ پھیل جائے۔ اس خط کا اہم پہلو یہ ہے کہ شاہ کو سخت پریشانی اس امر پر ہے کہ بہت سے سرکاری راز بھی اس میں مندرج ہیں"۔

افسوس اس امر کا ہے کہ سید جمال الدین کے اس خط کا علماء پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا اور یہ لوگ مصلحتاً خاموش رہے۔ تمباکو کی تحریک کے بعد ان کے سامنے شاید اور کوئی مقصد ایسا نہیں تھا جس کے نام پر وہ عوام کو متحرک کر سکیں۔ علاوہ بریں وہ عوام کے سیاسی' سماجی اور اقتصادی مسائل کا واضح انداز میں حل پیش کرنے سے بھی قاصر تھے جن سے ایران انیسویں صدی کے نصف آخر میں دوچار تھا۔ اجتہاد کا استعمال محدود پیانے پر تھا اور وہ بھی صرف معمولی شرعی مسائل کے حل تک۔ روشن فکر دانشوروں کی سوچ کو ابھی اسلامی اجتہاد کے دائرے میں لانا ابھی باقی تھا۔ اجتہاد کی ان نئی جہتوں کا ادراک علماء کو خاطر خواہ حد تک ابھی تک نہیں ہو سکا تھا۔

تاہم سید جمال الدین کا اثر و رسوخ اسلامی دنیا پر بڑھتا رہا کیونکہ انہوں نے بادشاہت کے قدیم اور مستحکم ادارے کو نہ صرف غیر اسلامی کہہ کر چیلنج کیا تھا بلکہ مغربی استعمار کی لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال کا توڑ بھی پیش کیا تھا۔ اب سید جمال الدین علماء کی بجائے براہ راست عوام کی جانب متوجہ ہونا شروع ہو گئے تھے اور آپ کو آخری زندگی میں یہ خیال بھی آگیا تھا کہ ان کے لئے کیا ہی بہتر ہو تا کہ وہ اسلامی افکار کی رُو سے ملت اسلامیہ کے سیاسی اور معاشی مسائل کے حل کا ادراک پیش کر سکتے۔ اب وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار اعلیٰ سے ایک شخص کی علیحدگی سے بھی مسائل حل نہیں ہوتے جب تک فکری اور سماجی انقلاب برپا نہ کیا جائے۔ آپ نے تحرک' جدوجہد اور عمل کا راستہ پیش کیا اور آپ کے بقول آپ نے وہ بیج بوئے جن کا ثمر بعد میں ظاہر ہونا تھا۔

ناصرالدین قاچار کا انجام

شاہ ناصرالدین قاچار ۱۸۹۶ء (۱۳۱۳ھ) میں اپنی تخت نشینی کا پچاسواں سال (گولڈن جوبلی) منانے والا تھا اور اس جشن میں ابھی تین دن باقی تھے کہ وہ مزار شاہ عبدالعظیمؒ میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے آیا۔ سید جمال الدین کے ایک پیروکار مرزا رضا کرمانی نے عین اس جگہ جہاں سے سید جمال الدین کو گھسیٹ کر باہر لایا گیا تھا شاہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ "اس (شاہ) نے اُس عظیم انسان (سید جمال الدین) کو جو پیغمبر اسلام کے خاندان سے تھے شاہ عبدالعظیم کی مقدس چار دیواری سے اس ذلت سے گھسیٹ کر نکالا تھا کہ ان کی شلوار بھی تار تار ہو گئی تھی۔ انہوں نے سچائی بیان کرنے کے علاوہ کیا کہا تھا؟ انہوں نے سوئے ہوئے لوگوں کو جگایا تھا اور بلند مقاصد کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا تھا۔ لیکن میں اس خدائے واحد کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو سید جمال الدین اور کل دنیا کا خالق ہے کہ میرے ارادۂ قتل کا علم میرے اور ان کے سوا کسی کو نہ تھا۔ سید اب قسطنطنیہ میں ہیں' جایئے اور اگر ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو کچھ کیجئے۔"

دراصل جمال الدین افغانی نے انقلاب کی راہ ہموار کر دی تھی اور لوگوں کو

آزادی کی جدوجہد کا درس دے دیا تھا۔ علامہ اقبال نے جمال الدین افغانی کی زبانی اپنی کتاب "جاوید نامہ" میں کیا عظیم پیغام دیا ہے:

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز
عالمے در انتظارِ قُم ہنوز

(ایک تصوراتی جہان ہماری سوچوں کے دریچوں میں چھپا ہوا ہے۔ یہ جہان "قُم باذن اللہ" کے حکم کا منتظر ہے۔)

عالمے بے امتیازِ خون و رنگ
شام او روشن تر از صبح فرنگ

(یہ جہان رنگ اور نسل کے امتیازات سے خالی ہے اور اس کی شامیں بھی یورپ کی صبحوں سے زیادہ روشن ہیں۔) جس سے مراد یہ ہے کہ اس کا ادنیٰ ترین پہلو بھی یورپ کی آزاد فضاؤں سے بہتر ہے۔

عالمے پاک از سلاطین و عبید
چوں دلِ مومن کرانش ناپدید

(یہ جہان بادشاہوں اور غلاموں سے پاک ہے۔ اور مومن کے دل کی مانند اس کی وسعتیں بے پناہ ہیں۔)

عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر
تخم او افگند در جانِ عمرؓ!

(یہ جہان اتنا خوبصورت ہے کہ اس پر ایک نظر پڑتے ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جان میں نئے ولولوں کے بیج بکھر گئے تھے۔)

لایزال و وارداتش نو بنو
برگ و بارِ محکماتش نو بنو

(اس جہان پر کبھی زوال نہیں آسکتا اور اس میں نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے ثمرات اور اس کے محصولات نئے سے نئے ہوتے ہیں۔)

باطنِ او از تغیر بے غمے
ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

(اس کا راز اس تبدیلی میں ہے جو بغیر کسی کشت و خون یا غم کے رونما ہوتی ہے اور اس کے ظاہر میں ہر لمحے نئے سے نئے انقلابات آتے رہتے ہیں۔)

اندرونِ تست آں عالم نگر
می دہم از محکماتِ او خبر!

(اچھی طرح دیکھ' یہ جہان تم میں پوشیدہ ہے۔ غور کرو تو میں تمہیں اس کے ثمرات اور اسرار کی خبر دے سکوں۔)

دراصل افغانی کے اثرات اگلی صدی پر مرتب ہوئے جب اقبال اور شریعتی نے آپ کی پیروی میں ایک نئے ولولے سے مشرق کو روشناس کروایا۔

علامہ اقبال حضرت جمال الدین افغانی (رحمہما اللہ) کے وحدتِ ملتِ اسلامی (Pan Islamism) کے تصور سے بھی بے حد متاثر ہوئے۔ جاوید نامہ میں ایک آسمانی مقام پر مولانا روم سے پوچھتے ہیں :

من نیابم از حیات ایں جا نشاں
از کجا می آید آوازِ اذاں؟

(مجھے اس سرزمین پر زندگی کا کوئی نشان تو نظر نہیں آرہا مگر یہ اذان کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟)

گفت رومی ایں مقامِ اولیاست
آشنا ایں خاکداں با خاکِ ماست

(مولانا روم نے فرمایا "یہ اولیائے کرام کا مقام ہے اور یہ دھرتی ہماری سرزمین سے وابستہ ہے")

رفتم و دیدم دو مَرد اندر قیام
مقتدی تاتاری و افغاں امام

(ہم وہاں پہنچے تو دو حضرات کو نماز میں حالت قیام میں پایا۔ امامت کے فرائض افغانی (جمال الدین) انجام دے رہے تھے اور مقتدی ایک تاتاری (سعید حلیم پاشا) تھے۔)

قراءتِ آں پیر مَردے سخت کوش
سورۂ والنجم و آں دشت خموش

(اس خاموش صحرا کی وسعتوں میں اس سخت کوش بزرگ کی سورۃ النجم کی قراءت نے ایک سرور اور ولولہ پیدا کر رکھا تھا۔)

ایرانیوں نے سید جمال الدین کی بابت کہے گئے علامہ اقبال کے ان اشعار کی روشنی میں تصاویر (paintings) بھی تیار کر رکھی تھیں۔ اصلی تصویر جناب عبدالحمید عرفانی کے پاس تھی جسے وہ علامہ اقبال کے اشعار کی وضاحت کے لئے اکثر و بیشتر سرورق پر طبع کیا کرتے تھے۔ یہ تصویر انقلابِ اسلامی سے پہلے ایران میں بہت مقبول ہوا تھا۔ (جاری ہے)

بقیہ : شہیدِ مظلوم

وقت موجود تھے) شکایتاً کہا کہ آپ نے سنا' حسن کیا بیان کر رہے ہیں؟ کیونکہ یہ خواب تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا' قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ اسے کیسے گوارا کرتے ـــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ "حسن وہی بیان کر رہے ہیں جو انہوں نے دیکھا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ خون کے یہ دو پرنالے درحقیقت جنگِ جمل اور جنگِ صفین کی صورت رواں ہوئے تھے۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون ناحق پر اللہ کے غضب کی دو نشانیاں تھیں جس کی خبر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پہلے دے چکے تھے کہ : "اللہ کا کوئی نبی شہید نہیں کیا گیا مگر اس کے بعد ستر ہزار لوگ قتل ہوئے اور کسی نبیؑ کا کوئی خلیفہ شہید نہیں کیا گیا مگر اُس کے بعد پینتیس ہزار لوگ مقتول ہوئے"۔ لیکن یہاں معاملہ چوراسی ہزار کا ہے جو ان دونوں جنگوں میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے زوال اور المناک انجام پر کہا تھا کہ ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المؤمنیں!

یہاں مستعصم کی بجائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امیرالمومنین کا نام رکھ لیجئے تو اس شعر میں آپ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خواب کی تعبیر نظر آجائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی ہزاروں رحمتیں نازل ہوں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

غلطیوں کی اصلاح کا نبویؐ طریق کار (۵)

تالیف : علامہ محمد صالح المنجد، مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

لوگوں کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے

نبی اکرم ﷺ کے اختیار کردہ مختلف اسلوب

۱۳) غلطی سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتانا :

حضرت ابو امامہ نے اپنے والد حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے اُن کا ایک واقعہ روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ مقام جُحفہ کی وادی خرّار میں پہنچے تو وہاں حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ غسل کرنے لگے۔ ان کا رنگ گورا تھا اور جلد بہت خوش رنگ تھی۔ قبیلہ بنو عدی بن کعب کے ایک صاحب حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے انہیں غسل کرتے ہوئے دیکھا تو کہا : ایسی جلد تو میں نے کبھی کسی پردہ نشین لڑکی کی بھی نہیں دیکھی (یعنی کتنا خوبصورت رنگ ہے)۔ اس پر حضرت سہل رضی اللہ عنہ تو وہیں زمین پر گر پڑے۔ کسی نے آکر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا : "یا رسول اللہ! کیا آپ سہل رضی اللہ عنہ کو دیکھیں گے، اللہ کی قسم! وہ تو سر بھی نہیں اٹھاتے، انہیں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا (سخت بخار ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "کیا تم اس کے بارے میں کسی کو قصور وار سمجھتے ہو؟" صحابہ نے کہا: عامر بن ربیعہ نے انہیں (کپڑے اتارے ہوئے) دیکھا تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے عامر رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا، اور انہیں سرزنش فرمائی۔ ارشاد فرمایا: "ایک آدمی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے؟ اگر تجھے ایک چیز اچھی لگی تھی تو تو نے برکت کی دعا کیوں نہ دی؟" پھر فرمایا: "اس کے لئے اپنے اعضاء دھوؤ"۔ انہوں نے ایک برتن میں چہرہ، ہاتھ، کہنیاں، گھٹنے، پاؤں اور تہبند کے اندر والا حصہ دھو کر (وہ پانی) دے دیا۔ وہ پانی حضرت سہل رضی اللہ عنہ پر

ڈالا گیا۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس کو نظر لگی ہو' کوئی شخص پانی اس کے پیچھے کی طرف سے اس کے سر اور کمر پر ڈال دے۔ پھر برتن بھی اس کے پیچھے ہی الٹا کر کے رکھ دے۔ چنانچہ حضرت سہل رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسے ہی کیا گیا تو وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ (۵۰)

موطأ امام مالک میں بھی حضرت ابو امامہ سے یہ واقعہ مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں :
"میرے والد حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے وادی خزار میں غسل کیا۔ انہوں نے جبہ پہنا ہوا تھا۔ جب انہوں نے (غسل کرنے کے لئے) جبہ اتارا تو عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے۔ سہل رضی اللہ عنہ کا رنگ گورا اور جلد خوش رنگ تھی۔ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "اس جیسی جلد تو کبھی کسی کنواری لڑکی کی بھی نہیں دیکھی"۔ سہل رضی اللہ عنہ کو وہیں بخار چڑھ گیا' اور بخار بھی زور کا چڑھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے آکر عرض کیا "سہل رضی اللہ عنہ کو بخار ہو گیا ہے اور وہ آپ کے ساتھ نہیں جا سکیں گے"۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سہل رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے عامر رضی اللہ عنہ کی بات بتائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے) فرمایا : "ایک شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے؟ تو نے برکت کی دعا کیوں نہ دی؟ نظر یقیناً حق ہے' اس کے لئے وضو کرو"۔ عامر رضی اللہ عنہ نے ان کے لئے وضو کیا۔ چنانچہ سہل رضی اللہ عنہ ٹھیک ٹھاک ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ (۵۱)

اس واقعہ میں مندرجہ ذیل فوائد ہیں :

— جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو تکلیف پہنچنے کا سبب بنا ہو' تربیت کرنے والا اس پر ناراضگی کا اظہار کر سکتا ہے۔
— غلطی سے نقصان پہنچتا ہے اور بعض اوقات کوئی غلطی کسی کی جان بھی لے سکتی ہے۔
— ایسی تدبیر بتانا' جس سے مسلمان کو پہنچنے والے نقصان یا تکلیف کا سدِّ باب ہو جائے۔

۱۴) غلطی کرنے والے کو براہ راست مخاطب کرنے کے بجائے عمومی وضاحت پر اکتفا کرنا :

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "کیا وجہ

ہے کہ کچھ لوگ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں؟" حضور ﷺ نے اس بارے میں سختی سے تنبیہہ فرمائی' حتیٰ کہ ارشاد فرمایا: "وہ ضرور ضرور اس حرکت سے باز آ جائیں' ورنہ ان کی آنکھیں چھین لی جائیں گی"۔ (۵۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو خریدنے کا ارادہ کیا۔ ان کے مالکوں نے اس شرط پر بیچنے پر رضامندی ظاہر کی کہ وِلاء (۵۳) ان لوگوں کی ہو گی۔ جب نبی اکرم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے لوگوں میں کھڑے ہو کر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر فرمایا: "کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ ایسی شرائط عائد کرتے جو اللہ کی کتاب (یعنی شریعت) میں نہیں ہیں؟ جو بھی شرط اللہ کی کتاب میں نہیں وہ کالعدم ہے' اگرچہ سو شرطیں ہوں۔ اللہ کا فیصلہ زیادہ درست ہے اور اللہ کی (بیان کی ہوئی) شرط زیادہ پختہ ہے۔ (قانون یہ ہے کہ) ولاء اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرے۔" (۵۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کیا' اور اس کی اجازت دی' لیکن کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کیا۔ نبی اکرم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے خطبہ دیا۔ اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: "کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اس کام سے بچتے ہیں جو میں کرتا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں اللہ کے بارے میں ان سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں (کہ کونسا کام اللہ کو پسند ہے اور کون سا نہیں) اور ان سب سے زیادہ اللہ کا خوف رکھتا ہوں"۔ (۵۵)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں قبلہ کی طرف بلغم لگا دیکھا۔ آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے چہرے کی طرف تھوک دیتا ہے؟ کیا کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے آ کر اس کے چہرے پر تھوک دیا جائے؟ جب کسی کو بلغم پھینکنا ہو تو بائیں طرف اپنے پاؤں کے نیچے پھینکے' ورنہ اس طرح کر لے۔" (حدیث کے راوی قاسمؒ نے بتایا کہ صحابی نے کپڑے میں تھوک کر اسے مسل کر بتایا)۔ (۵۶)

سنن نسائی میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے صبح کی نماز پڑھی اور اس میں

سورۂ روم کی تلاوت کی' آپ ؐ کو قراءت میں التباس ہو گیا۔ جب حضور علیہ السلام نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا : "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور وضو اچھی طرح نہیں کرتے؟ قرآن میں یہی لوگ ہمیں مشابہ ڈالتے ہیں"۔ (۵۷)

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن میں مشترک چیز یہ ہے کہ غلطی کرنے والے کو شرمندہ نہ کیا جائے۔ غلطی کرنے والے کو براہ راست مخاطب نہ کرنے اور اشارہ سے اس کی غلطی واضح کرنے کے اس اسلوب میں بہت سے فائدے ہیں' جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں :

۱) غلطی کرنے والے کی طرف سے منفی رد عمل کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اس طرح شیطان اس کے انتقامی جذبات کو ہوا دے کر انتقام کی طرف مائل نہیں کر سکتا۔

۲) اس اسلوب کو زیادہ قبول کیا جاتا ہے اور دل پر اس کا زیادہ گہرا اثر ہوتا ہے۔

۳) اس سے غلطی کرنے والے کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔

۴) غلطی کرنے والے کے دل میں نصیحت کرنے والے کی قدر و منزلت اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ تعریض کے اس اسلوب کا مقصد یہ ہے کہ غلطی کرنے والے کو رسوا کئے بغیر مسئلہ سمجھا دیا جائے' لہٰذا یہ اسلوب اس وقت استعمال کرنا چاہئے جب اس کی غلطی عام لوگوں سے پوشیدہ ہو۔ لیکن اگر اکثر لوگوں کو اس کا علم ہو' اور اسے معلوم ہو کہ اکثر لوگ یہ بات جانتے ہیں' تو اس صورت میں یہ اسلوب سخت زجر و توبیخ کا حامل اور غلطی کرنے والے کے لئے سخت تکلیف دہ بن جاتا ہے' بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ کاش اسے براہ راست تنبیہہ کر دی جاتی' اور اس کے ساتھ یہ اسلوب اختیار نہ کیا جاتا۔ اس کی تاثیر میں اس سے بھی فرق پڑتا ہے کہ بات کہنے والا کون ہے؟ اور کس کے سامنے بات کی جا رہی ہے؟ اور بات نصیحت اور خیر خواہی کے انداز سے کہی گئی ہے یا تنگ کرنے کے انداز سے؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بالواسطہ کلام کا یہ انداز تربیت کا ایسا انداز ہے جس سے غلطی کرنے والے کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی' بشرطیکہ اسے استعمال کرتے ہوئے

حکمت سے کام لیا جائے۔

۱۵) غلطی کرنے والے کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنا

یہ طریقہ بعض خاص حالات میں ہی استعمال کیا جا سکتا ہے' اور اس کے لئے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کے بہت زیادہ منفی اثرات نہ ہوں۔ نبی اکرم ﷺ سے اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے پڑوسی کی شکایت کی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "جاؤ' صبر کرو"۔ وہ دو تین دفعہ شکایت لے کر حاضر ہوا تو آپ ؐ نے فرمایا : "جاؤ' اپنے گھر کا سامان راستے میں ڈال دو"۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ (گزرنے والے) لوگ اس سے پوچھتے' وہ وجہ بتا دیتا۔ لوگ پڑوسی کو برا بھلا کہتے' اللہ اس کے ساتھ یوں یوں کرے۔ آخر پڑوسی نے آکر اسے کہا : (اپنے گھر میں) واپس آجاؤ' آئندہ مجھ سے کوئی ایسی حرکت نہیں ہوگی جو تمہیں ناگوار ہو۔[۵۸]

اس کے برعکس ایک دوسرا اسلوب ہے' جو اور قسم کے حالات میں' اور دوسرے قسم کے افراد کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غلطی کرنے والے کو عام لوگ ناجائز طور پر تنگ نہ کریں۔ اس کی وضاحت آئندہ نکتہ سے ہوتی ہے۔

۱۶) غلطی کرنے والے کے خلاف شیطان کی مدد کرنے سے پرہیز :

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایک آدمی تھا' اس کا نام تو عبداللہ تھا' لیکن حمار کے لقب سے معروف تھا۔ وہ (دل لگی کی باتیں کر کے) آنحضرت ﷺ کو خوش کر دیا کرتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے شراب نوشی کی سزا کے طور پر کوڑے بھی مارے تھے۔ ایک بار (پھر) اسے حاضر کیا گیا۔ (کیونکہ اُس نے پھر شراب پی لی تھی) آنحضرت ﷺ کے حکم سے اسے کوڑے مارے گئے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا : اے اللہ! اس پر لعنت کر' اسے کتنی بار (اس جرم میں پکڑ کر) لایا جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا : "اسے لعنت نہ کرو' جہاں تک مجھے علم ہے وہ اللہ اور اس کے رسول

سے محبت رکھتا ہے"۔ (۵۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی کو حاضر کیا گیا جو نشے میں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے مارا جائے۔ ہم میں سے کسی نے اسے ہاتھ سے مارا' کسی نے جوتے سے مارا' کسی نے کپڑے سے مارا۔ جب وہ (سزا پا کر) واپس ہوا' تو (حاضرین میں سے) کسی نے کہا : "اسے کیا ہے؟ اللہ اسے رسوا کرے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو۔" (۶۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی کو حاضر کیا گیا جس نے شراب پی تھی۔ آپؐ نے فرمایا : "اسے مارو"۔ صحابی فرماتے ہیں : "ہم میں سے کسی نے اسے ہاتھ سے مارا' کسی نے جوتے سے' کسی نے کپڑے سے۔ جب وہ (سزا پا کر) واپس ہوا تو کسی نے کہا: "اللہ اسے رسوا کرے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یوں نہ کہو' اس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو"۔ (۶۱)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسے ڈانٹ ڈپٹ کرو"۔ لوگ اس سے کہنے لگے : تو اللہ سے نہ ڈرا؟ تو نے اللہ کا خوف نہ کیا؟ تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم نہ آئی؟ پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس روایت میں ہے: "یوں کہو: اے اللہ اسے بخش دے' اے اللہ اس پر رحم کر"۔ (۶۲)

ایک روایت میں ہے : جب وہ واپس ہوا' تو لوگوں میں سے کسی نے کہا: اللہ تجھے رسوا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایسے نہ کہو' اس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو' بلکہ یوں کہو: بلکہ اللہ تجھ پر رحم کرے"۔ (۶۳)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب کسی گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے تو اس وقت بھی وہ مسلمان رہتا ہے' اور اس کے دل میں بنیادی طور پر اللہ اور اس کے رسول کی محبت باقی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے ایمان اور اللہ سے محبت کا انکار درست نہیں' نہ اسے ایسی بد دعا دینی درست ہے جس کے نتیجہ میں اس کے خلاف شیطان کو مدد ملے' بلکہ اس کے لئے ہدایت' مغفرت اور رحمت کی دعا کرنی چاہئے۔

۱۷) غلط کام سے رُک جانے کو کہنا :

ایک بڑی اہم چیز یہ بھی ہے کہ غلطی کرنے والے کو غلطی کرتے چلے جانے سے منع کر دیا جائے' تاکہ وہ مزید غلطیوں کا مرتکب نہ ہو' اور برائی سے روکنے کا فریضہ بلا تاخیر انجام پا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے (کسی بات میں) یوں کہہ دیا: "قسم ہے میرے باپ کی"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "رک جایئے' جو شخص اللہ کے سوا کسی چیز کی قسم کھاتا ہے' وہ شرک کرتا ہے۔"(۶۴)

سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن نبی اکرم ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک آدمی لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آگے بڑھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "بیٹھ جا' تو نے (دوسروں کو) تکلیف پہنچائی ہے"۔(۶۵)

امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں ڈکار لی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "اپنی ڈکار روکو' جو لوگ دنیا میں زیادہ پیٹ بھرتے ہیں' قیامت کے دن وہ زیادہ دیر تک بھوکے رہیں گے۔"(۶۶)

ان احادیث میں غلطی کرنے والے کو براہ راست یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کام سے رک جائے' اور باز رہے۔

۱۸) اصلاح کے لئے غلطی کرنے والے کی رہنمائی :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد کے لئے کئی انداز اختیار فرمائے ہیں' جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں :

○ غلطی کرنے والے کی توجہ غلطی کی طرف مبذول کرانا' تاکہ وہ خود ہی اصلاح کرلے۔

اس کی ایک مثال حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا روایت کردہ ایک واقعہ ہے۔ وہ جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے' دیکھا کہ

ایک شخص مسجد کے درمیان میں انگلیوں میں انگلیاں ڈالے اپنے خیالات میں کھویا ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اُسے اشارہ سے متنبہ کیا' اسے اپنی غلطی کی سمجھ نہ آئی۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: "جب کوئی شخص نماز پڑھے تو اسے اپنی انگلیوں میں انگلیاں نہیں ڈالنا چاہئیں۔ یہ عمل شیطان کی طرف سے ہے۔ اور آدمی جب تک مسجد میں رہتا ہے' وہ باہر جانے تک نماز ہی میں ہوتا ہے۔"(۶۷)

○ غلط کام کو دوبارہ صحیح طریقے سے انجام دینے کا حکم 'بشرطیکہ یہ ممکن ہو :

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: جناب رسول اللہ ﷺ مسجد میں ایک طرف تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا' نماز پڑھی' پھر آکر آنحضرت ﷺ کو سلام عرض کیا۔ آپ نے فرمایا : "وعلیکم السلام' جا کر دوبارہ نماز پڑھو' تم نے نماز نہیں پڑھی"۔ اُس نے جا کر دوبارہ نماز پڑھی' پھر (نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں) حاضر ہوا اور سلام کہا۔ آپ نے فرمایا: وعلیکم السلام' جا کر دوبارہ نماز پڑھو' تم نے نماز نہیں پڑھی"۔ دوسری یا تیسری دفعہ میں اُس نے عرض کیا : اللہ کے رسول! مجھے سکھا دیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو تو (اچھی طرح سنوار کر) کامل وضو کر' پھر قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ اکبر کہہ' پھر تجھے جو قرآن یاد ہے اس میں سے جو آسان معلوم ہو پڑھ لے' پھر رکوع کر' حتیٰ کہ تو اطمینان سے رکوع کر لے۔ پھر سر اٹھا حتیٰ کہ تو سیدھا کھڑا ہو جائے' پھر سجدہ کر حتیٰ کہ اطمینان سے سجدہ کر لے' پھر سر اٹھا' حتیٰ کہ اطمینان سے بیٹھ جائے' پھر سجدہ کر' حتیٰ کہ اطمینان سے سجدہ کر لے' پھر سر اٹھا حتیٰ کہ اطمینان سے بیٹھ جائے' پھر پوری نماز میں اسی طرح کر۔"(۶۸)

قابل توجہ امور :

○ نبی اکرم ﷺ اپنے اردگرد کے لوگوں کے کاموں کو توجہ سے ملاحظہ فرماتے تھے' تاکہ انہیں تعلیم دے سکیں۔ نسائی کی روایت میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے :

"ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ اسے دیکھ رہے تھے لیکن ہمیں محسوس نہ ہوا۔ جب وہ (نماز سے) فارغ ہوا تو اُس نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کو سلام عرض کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جاکر دوبارہ نماز پڑھو' تم نے نماز نہیں پڑھی... الخ" لہٰذا تربیت دینے والے میں یہ خوبی ہونی چاہئے کہ اپنے ساتھیوں کے افعال سے غافل نہ ہو۔

○ تعلیم کی حکمت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ غلطی کرنے والے کو وہی کام دوبارہ کرنے کو کہا جائے۔ ممکن ہے وہ اپنی غلطی سمجھ جائے اور خود ہی اس کی اصلاح کرلے' بالخصوص جبکہ غلطی واضح ہو جو اس جیسے شخص سے نہیں ہونی چاہئے۔ ممکن ہے وہ بھول گیا ہو اور دوبارہ کرتے ہوئے اسے یاد آجائے۔

○ اگر غلطی کرنے والا اپنی غلط خود نہ سمجھ سکے تو تفصیل سے بیان کر دینا ضروری ہے۔

○ جب کوئی شخص کسی مسئلہ کو جاننے کی خواہش کرے' اس کے بارے میں سوال کرے' اور اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہو' اس وقت مسئلہ بتانے سے اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور زیادہ پختگی سے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر سوال کئے بغیر اور شوق پیدا ہوئے بغیر معلومات دی جائیں تو اس قدر فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

تعلیم کے بہت سے ذرائع ہیں' استاد حالات کے مطابق کوئی بھی مناسب ذریعہ اختیار کرسکتا ہے۔

غلط کام کو دوبارہ نئے سرے سے صحیح انداز سے کرنے کا حکم دینے کی ایک اور مثال صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' انہوں نے فرمایا: مجھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ایک آدمی نے وضو کیا' اس کے پاؤں پر ایک ناخن برابر جگہ خشک رہ گئی۔ نبی کریم ﷺ نے اسے دیکھ لیا اور فرمایا: "واپس جاکر اچھی طرح وضو کرو"۔ وہ واپس گیا (اور وضو کیا) پھر نماز پڑھی۔ (۶۹)

ایک اور مثال سنن ترمذی کی حدیث ہے جو حضرت کلدہ بن حنبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' کہ حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کچھ دودھ' کھیس (۷۰) اور ضغابیس (۷۱) دے کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ حضور ﷺ اس وقت وادی کے بلند حصے میں تشریف فرما تھے۔ حضرت کلدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں سلام کئے اور اجازت لئے بغیر اندر

حضور ﷺ کے پاس پہنچ گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "واپس جاؤ' اور کہو : السلام علیکم 'کیا میں اندر آجاؤں؟"(۷۲)

○ غلطی کی اصلاح کے لئے ممکن تلافی کا حکم دینا :

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "کوئی مرد کسی نامحرم عورت کے ساتھ اکیلا نہ رہے"۔ ایک آدمی نے اُٹھ کر عرض کیا: یارسول اللہ! میری عورت حج کے لئے روانہ ہو گئی ہے اور میں نے فلاں غزوہ میں نام لکھوا دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "واپس جا کر اپنی بیوی کے ساتھ حج ادا کر"۔(۷۳)

○ غلطی کے آثار کی اصلاح :

سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا : "میں ہجرت کی بیعت کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں' اور اپنے والدین کو روتے چھوڑ کر آگیا ہوں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "واپس جاؤ' اور جس طرح انہیں رُلایا ہے' اسی طرح انہیں ہنساؤ"۔ (۷۴)

○ غلطی کا کفّارہ ادا کرنا :

بعض غلطیاں ایسی ہیں جن کا ازالہ ناممکن ہے۔ شریعت نے ان کے اثرات ختم کرنے کے لئے دوسرے طریقے مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ کفارہ کی ادائیگی بھی ہے۔ کفارے کی بہت سی قسمیں ہیں' مثلاً قسم کا کفارہ' ظہار کا کفارہ' قتل خطا کا کفارہ' رمضان کے روزہ کے دوران ازدواجی اختلاط کا کفارہ' وغیرہ۔

(جاری ہے)

حواشی

(۵۰) مسند احمد ۳/۴۸۶۔ ہیثمی نے فرمایا: "احمد کے راوی صحیح کے راوی ہیں"۔ (مجمع ۵/۱۰۷)۔

(۵۱) موطا امام مالک' حدیث ۱۹۷۲ (۵۲) صحیح بخاری' حدیث ۵۰۷

(۵۳) آزاد کرنے والے اور آزاد ہونے والے کا باہمی تعلق "ولاء" کہلاتا ہے۔ آزاد ہونے کے بعد

غلام اسی خاندان کا فرد شمار کیا جاتا ہے جس خاندان سے آزاد کرنے والے کا تعلق ہو۔ چنانچہ آزاد ہونے والا جب فوت ہو' تو اگر اس کا کوئی وارث نہ ہو تو یہی آزاد کرنے والا اس کا وارث ہوتا ہے۔

(۵۴) یہ واقعہ صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر مروی ہے۔ دیکھئے فتح الباری:۲۶۳۶

(۵۵) فتح الباری : ۲۱۰۱ (۵۶) صحیح مسلم' حدیث ۵۵۰

(۵۷) سنن نسائی' ۲/۱۵۶۔ اس سے ملتے جلتے الفاظ میں مسند احمد ۳/ ۴۷۳ میں بھی مروی ہے۔

(۵۸) سنن ابوداؤد' کتاب الادب باب حق الجوار' حدیث ۵۱۵۳۔ صحیح ابی داؤد' حدیث ۴۲۹۳

(۵۹) صحیح بخاری۔ فتح الباری : ۶۷۸۰ (۶۰) صحیح بخاری۔ فتح الباری : ۶۷۸۱

(۶۱) صحیح بخاری۔ فتح الباری : ۶۷۷۷

(۶۲) سنن ابی داؤد' کتاب الحدود' باب الحد فی الخمر ۴/ ۱۲۰' حدیث ۴۴۷۸۔ محدث البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے : صحیح سنن ابی داؤد' حدیث ۳۷۵۹

(۶۳) مسند احمد۔ تحقیق احمد شاکر ۲/ ۳۰۰' حدیث ۳۷۹۷۔ احمد شاکر نے فرمایا: اس کی سند صحیح ہے۔

(۶۴) مسند احمد ۱/ ۴۷۔ احمد شاکر نے فرمایا: اس کی سند صحیح ہے۔ (حدیث ۳۲۹)۔

(۶۵) سنن ابی داؤد' حدیث ۱۱۱۸۔ صحیح ابی داؤد حدیث ۹۸۹

(۶۶) سنن ترمذی' حدیث ۲۴۷۸۔ سلسلہ احادیث صحیحہ' حدیث ۳۴۳

(۶۷) مسند احمد ۳/ ۵۴۔ ہیثمی نے فرمایا: اس کی سند حسن ہے (مجمع ۲/ ۲۵)۔

(۶۸) یہ حدیث صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں مروی ہے۔ یہاں ذکر کردہ الفاظ صحیح بخاری کی حدیث ۱۲۵۱ کے مطابق ہیں۔

(۶۹) صحیح مسلم' حدیث ۲۴۳

(۷۰) گائے بھینس وغیرہ کا گاڑھا گاڑھا دودھ جو بچہ پیدا ہونے پر تین روز تک نکلتا ہے۔ (پنجابی: بوہلی)

(۷۱) کھیرے یا ککڑی کی قسم کی ایک چھوٹی چیز۔

(۷۲) سنن ترمذی' حدیث ۲۷۱۰۔ صحیح سنن ترمذی' حدیث ۲۱۸۰

(۷۳) فتح الباری : ۵۲۳۳

(۷۴) سنن نسائی ۷/ ۱۴۳۔ امام البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (صحیح سنن نسائی : ۳۸۸۱)
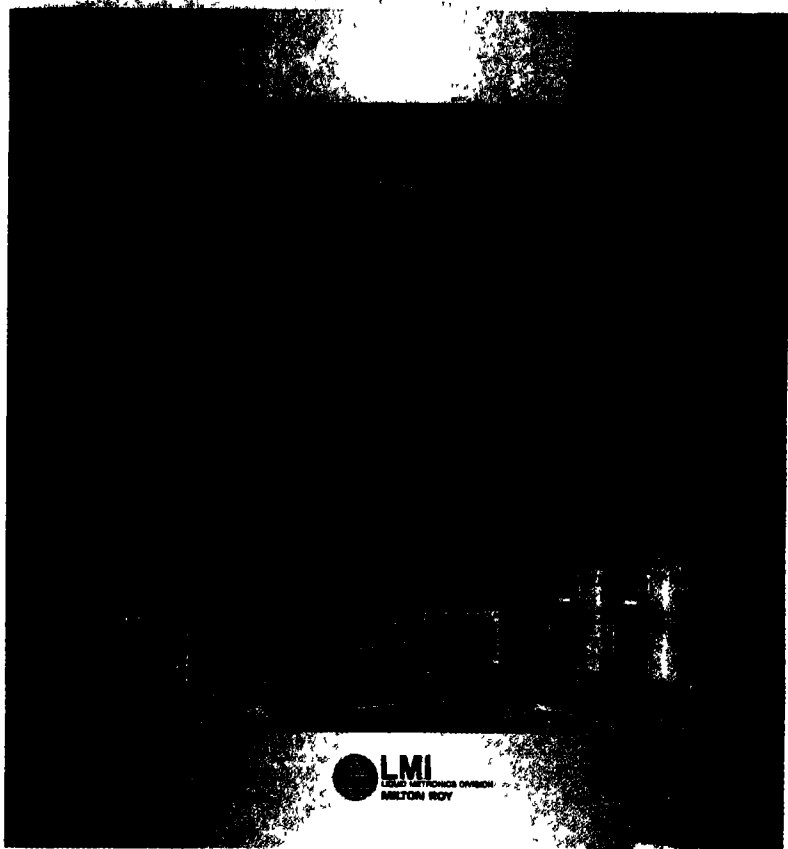
LMI

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد : ۴۷
شمارہ : ۸
ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
اگست ۱۹۹۸ء
فی شمارہ -/۱۰
سالانہ زرتعاون -/۱۰۰

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت : 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون۔ 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون : 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع : رشید احمد چودھری، مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

۱۴ جولائی کو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف سے ان کی رہائش گاہ (اے بلاک' ماڈل ٹاؤن) پر ملاقات کی۔ اس موقع پر امیر تنظیم کے ساتھ ان کے نائب ڈاکٹر عبدالخالق بھی موجود تھے جبکہ میاں نواز شریف کے ساتھ ان کے بھائیوں' والد یا مصاحبین میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ گویا اگر اسے ون ٹو ون ملاقات کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ امیر تنظیم نے اپنے مدعا کو بہتر اور مربوط طور پر پیش کرنے کی غرض سے اسے تحریری صورت میں ڈھال لیا تھا جسے اس ملاقات کے موقع پر وزیر اعظم کو پڑھ کر سنا دیا گیا اور جہاں ضروری خیال کیا گیا زبانی وضاحت بھی کر دی گئی۔ اور پھر وہ تحریر ایک مکتوب کی صورت میں بطور یادداشت' وزیر اعظم کی خدمت میں پیش بھی کر دی گئی تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے ـــــ وزیر اعظم کے نام یہ مکتوب "ندائے خلافت" کے گزشتہ شمارے میں من و عن شائع کر دیا گیا تھا' تاہم "میثاق" کے ان قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر کہ جو "ندائے خلافت" کے مستقل قاری نہیں ہیں' زیر نظر شمارے میں بھی اسے شامل اشاعت کر دیا گیا ہے۔

ہمیں اندازہ ہے کہ ہمارے رفقاء و احباب اس ملاقات کا پس منظر جاننے کے لئے بے چین ہوں گے۔ اس ملاقات کے مقصد اور پس منظر کو مختصر ترین الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ ملاقات تکمیل دستور خلافت مہم کے ضمن میں "اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے" کا مظہر تھی ـــــ پچھلے سال فروری میں میاں نواز شریف کے برسراقتدار آنے کے بعد امیر تنظیم کی ان سے یہ چوتھی ملاقات ہے۔ اس سے پہلے کی تین ملاقاتوں کی کسی قدر تفصیل "ندائے خلافت" یا "میثاق" کے ذریعے احباب تک یقیناً پہنچ چکی ہو گی۔ ہم یہاں اجمالاً عرض کئے دیتے ہیں کہ ان ملاقاتوں کا آغاز نہایت غیر متوقع طور پر ہوا۔ گزشتہ انتخابات میں مسلم لیگ کی نہایت غیر معمولی کامیابی اور اس کے نتیجے میں میاں نواز شریف کے برسراقتدار آنے کے بعد امیر تنظیم اسلامی نے اپنے خطاب جمعہ میں بدلے ہوئے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے نئی حکومت کو جو مشورے دیئے ان میں یہ بات بہت زور دے کر کہی کہ پاکستان کی خالق جماعت ہونے کی مدعی مسلم لیگ کو ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے پچاس سال بعد

اب ۱۹۹۷ء میں ایک بار پھر جو بھاری مینڈیٹ اور غیر معمولی عوامی حمایت حاصل ہوئی ہے اس پر ہدیۂ تشکر کے طور پر میاں نواز شریف صاحب کو چاہئے کہ وہ ملک میں شریعت کے نفاذ اور دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کو یقینی بنانے کی خاطر فوری طور پر ضروری ترامیم کروائیں تاکہ کم از کم دستوری و آئینی سطح پر اسلامی ریاست کے قیام کے ناگزیر تقاضے پورے کئے جا سکیں اور گزشتہ نصف صدی سے ہم مسلمانان پاکستان اللہ تعالیٰ سے جس بدعہدی کے مرتکب ہو رہے ہیں اس کے ازالے کا سامان کیا جا سکے ـــــ اس خطاب جمعہ کا آڈیو کیسٹ امیر محترم نے میاں نواز شریف کے والد بزرگوار میاں محمد شریف کو اس درخواست کے ساتھ بھجوا دیا کہ اگر مناسب سمجھیں تو وہ اس خطاب کو سن کر اپنے بیٹوں یعنی میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کو ان کی اس ذمہ داری کی جانب متوجہ کریں اور انہیں اس بارے میں ضروری رہنمائی دیں ـــــ کیسٹ بھجوائے جانے کے چند ہی دنوں بعد میاں محمد شریف صاحب اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ امیر تنظیم سے ملاقات کے لئے قرآن اکیڈمی تشریف لے آئے کہ جو باتیں آپ کیسٹ کے ذریعے ہم تک پہنچانا چاہتے ہیں' ان کو آپ سے براہ راست سننے اور سمجھنے کے لئے ہم حاضر ہو گئے ہیں۔

یہ بلاشبہ ایک بہت ہی غیر متوقع معاملہ تھا۔ اس پہلی ملاقات میں جو قریباً نصف گھنٹے پر محیط تھی' امیر تنظیم نے اپنے موقف کو مختصراً لیکن جامع انداز میں معزز مہمانوں کے سامنے رکھا اور انہیں یاد دلایا کہ اپنے پچھلے دور حکومت میں بھی انہوں نے نفاذ شریعت کے لئے آئینی ترمیمی بل لانے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کے ایفاء کی نوبت نہیں آ سکی تھی' لہٰذا اب اس حوالے سے ان پر دُہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس ملاقات کے قریباً دو ماہ بعد جب کہ ملک میں اچانک فرقہ وارانہ دہشت گردی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آٹے کے سنگین بحران نے ایوان حکومت میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی' میاں محمد شریف صاحب ایک بار پھر تینوں بیٹوں کے ساتھ امیر تنظیم سے ملاقات کے لئے قران اکیڈمی تشریف لے آئے۔ اس بار ان حضرات نے امیر محترم کی بات کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور انہماک سے سنا۔ اس بار گفتگو یک طرفہ نہیں تھی بلکہ دونوں بھائی' میاں نواز شریف اور شہباز شریف نہ صرف یہ کہ گفتگو میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہوئے بلکہ بعض معاملات کی مزید وضاحت کے لئے انہوں نے امیر تنظیم سے سوالات بھی کئے۔

ان دونوں ملاقاتوں کو امیرِ تنظیم نے اس پر محمول کیا کہ وزیراعظم پاکستان اور وزیر اعلیٰ پنجاب ملاقات کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ تین سعادت مند بیٹے (تیسرے بیٹے عباس شریف ہیں جو زیادہ معروف نہیں) اپنے بزرگ والد کی خواہش کے احترام میں ان کے ساتھ امیر تنظیم سے ملاقات کے لئے ان کے غریب خانے پر چلے آئے تھے۔ بہرکیف امیر تنظیم کے نزدیک ان حضرات کا یوں ملاقات کے لئے آنا غیر متوقع بھی تھا اور خوش آئند بھی۔ چنانچہ اس سازگار صورتحال کو دیکھتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی نے خود بھی تنظیم کے ایک وفد کے ہمراہ وزیراعظم سے باضابطہ ملاقات کا فیصلہ کیا اور وزیراعظم ہاؤس میں میاں نواز شریف صاحب اور ان کے قریبی ساتھیوں سے ملاقات کے موقع پر تنظیم کی جانب سے ایک تحریری یادداشت پیش کی جس میں سود کے خاتمے اور دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کی قیام کے لئے دستوری ترامیم کے مطالبے کو نہ صرف یہ کہ معین الفاظ میں پیش کیا گیا تھا بلکہ مجوزہ ترامیم کو بھی مرتب صورت میں قانونی زبان میں پیش کیا گیا تھا۔ اس موقع پر تنظیم کے وفد جس کی سربراہی امیر تنظیم کر رہے تھے اور وزیراعظم اور ان کی کابینہ کے افراد کے مابین بھرپور گفتگو ہوئی۔ امیر تنظیم نے ان کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب اور ہر اشکال کا مناسب حل پیش کیا۔ یہاں تک کہ راجہ ظفرالحق سے مخاطب ہو کر وزیراعظم کو کہنا پڑا کہ "راجہ صاحب! اب ترمیمی بل لانے کی تیاری کیجئے"۔ یہ بات وزیراعظم سے تنظیم کے وفد کے سامنے راجہ ظفرالحق صاحب سے دوبار کہی لیکن اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اس معاملے میں جب کوئی ٹھوس پیش رفت حکومت کی جانب سے سامنے نہ آئی' یہاں تک حکومت نے اپنے اقتدار کو مزید مستحکم کرنے کی خاطر تو دو بار دستور میں ترمیم منظور کروالی لیکن قرآن و سنت کی بالادستی کے لئے ترمیمی بل لانے کی توفیق انہیں نہ ہوئی تو امیر محترم پر بھی اس حوالے سے کسی قدر مایوسی اور رنج کے جذبات غالب آنے لگے جن کی عکاسی ان کے خطابات و تقاریر میں بھی ہوتی رہی۔

آج سے دو ماہ قبل بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے جواب میں جب پاکستان نے امریکہ کے شدید ترین دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے اور عالمی طاقتوں کی خواہشات کے علی الرغم ایٹمی دھماکہ کرنے کا تاریخ ساز فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں پاکستان کامیاب ایٹمی تجربے کرکے ایٹمی طاقتوں کی صف میں شامل ہو گیا تو ایک بار پھر امید کے چراغ روشن ہوئے۔ یہ امید دو اعتبارات سے

تھی۔ ایک یہ کہ امیر محترم کے ان افکار و خیالات کو اس کے ذریعے تقویت پہنچی کہ مشیت ایزدی میں اسلام کے عالمی غلبہ کے ضمن میں پاکستان کے ذمے کوئی اہم رول ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر ایٹمی معاملے میں میاں نواز شریف امریکہ کے شدید ترین دباؤ کو مسترد کر کے عوامی مطالبے کو اہمیت دیتے ہوئے ایک غیر معمولی قدم اٹھا سکتے ہیں تو اب وہ شریعت کے نفاذ اور قرآن و سنت کی بالادستی کے لئے بھی بیرونی اور اندرونی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے "خالص دینی دھماکہ" کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ چنانچہ ایٹمی دھماکے کے دو روز بعد اس خیال کو ایک اخباری اشتہار کی صورت میں بڑے پیمانے پر عام کرتے ہوئے امیر تنظیم نے میاں نواز شریف سے مطالبہ کیا کہ وہ اللہ کا نام لے کر یہ دینی دھماکہ بھی اب کر ڈالیں!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایٹمی دھماکوں کے بعد پورے پاکستان میں ایک نیا جوش و خروش اور اک ولولہ تازہ دیکھنے میں آیا۔ شریعت کے نفاذ اور قرآن و سنت کو سپریم لاء بنانے کا یہ ایک نہایت موزوں اور مناسب موقع تھا ـــــ چنانچہ اسی ضمن میں امیر تنظیم نے صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ سے بھی ایک تفصیلی ملاقات کی اور اس ضمن میں انہیں ان کی ذمہ داری یاد دلاتے ہوئے دستوری ترمیم کے بعد پیدا ہونے والے ممکنہ مسائل کے بارے میں صدر پاکستان کے بعض اشکالات کا قابل عمل حل بھی پیش کیا جس سے صدر محترم نے اتفاق کیا۔

نواز شریف صاحب سے یہ حالیہ ملاقات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس موقع پر چونکہ امیر تنظیم نے اپنے خیالات کو تحریری صورت میں منضبط کر لیا تھا اور وہ تحریر اب ایک اہم ریکارڈ کے طور پر محفوظ ہے اور زیر نظر شمارے میں شائع بھی کر دی گئی ہے لہٰذا قارئین و احباب کے لئے یہ جاننا بہت آسان ہو گیا ہے کہ امیر تنظیم کا وزیر اعظم پاکستان سے مطالبہ کیا ہے' امیر تنظیم کی ان کے ساتھ بار بار کی ملاقاتوں میں کون کون سے موضوعات زیر بحث آتے رہے' وزیر اعظم پاکستان کے بارے میں امیر تنظیم کی رائے کیا ہے اور ان کی ان ملاقاتوں کا پس منظر اور غرض و غایت کیا ہے!! ـــــ ہمارے نزدیک فرمان نبویؐ "الدین النصیحۃ" کا تقاضا یہ ہے کہ حکمرانوں کو بھی نصح و خیر خواہی کے جذبات کے ساتھ وہ مشورہ دیا جائے جس میں دین کی سربلندی اور ملک و ملت کے مفاد کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی اخروی عافیت بھی پیش نظر ہو۔ امیر تنظیم کا مذکورہ مکتوب اسی امر کا شاہد عادل ہے۔ OO

قانون تحفظِ ناموسِ رسالتؐ

تاریخی پس منظر اور مخالفت کے اسباب

امیر تنظیم اسلامی کے ۱۰ جولائی ۹۸ء کے خطابِ جمعہ کی تلخیص

مرتب: نعیم اختر عدنان

میری آج کی گفتگو کا موضوع قانون تحفظ ناموس رسالت ہے' جسے عرف عام میں قانون توہین رسالت کہا جاتا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ گزشتہ دنوں مجھے ایک صاحب کی طرف سے رقعہ ملا تھا جس میں توہین رسالت کے حوالے سے سوال کیا گیا تھا۔ اسے پڑھ کر فوری طور پر ۹۱ء میں بننے والا توہین رسالت کا قانون ذہن میں آیا' جس کے بارے میں نہ صرف اندرون ملک عیسائی اقلیت نے شدید احتجاج کیا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی مغربی حکومتوں کی جانب سے تاحال احتجاج جاری ہے۔ مگر بعد ازاں جب میں نے اس رقعے کو غور سے پڑھا تو اس میں زیر بحث موضوع سے ہٹ کر سوال کیا گیا تھا۔ رقعہ کی عبارت یہ ہے :

> "محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' امیر تنظیم اسلامی' السلام علیکم!
> توہین رسالتؐ کیا ہے؟ کیا حضور ﷺ کے ارشادات کی نفی توہین رسالت کے ضمن میں نہیں آتی؟ اگر آتی ہے تو کیا حکومت وقت سودی نظام جاری رکھ کر توہینِ رسالتؐ کا ارتکاب نہیں کر رہی؟ حضور ﷺ نے اپنے آخری خطبہ حجتہ الوداع میں سود کو حرام قرار دیا ہے' اگر ہم اس نظام کے خلاف جدوجہد نہ کریں تو کیا ہم بھی توہین رسالتؐ کا جرم کرنے والوں میں شامل نہ ہوں گے؟ آپ اپنا موقف واضح طور پر سمجھا دیں"۔

توہین رسالت کے قانون کے حوالے سے یہ مسئلہ کافی عرصہ سے زیر بحث رہا ہے مگر

میں نے اس مسئلہ پر کبھی گفتگو نہیں کی' تاہم اب میں اس کی کی تلافی کرتے ہوئے اس موضوع پر اپنے نقطۂ نظر کو مرتب انداز میں واضح کر رہا ہوں۔ اس رقعہ میں اٹھائے گئے استفسار کے پس منظر میں جو چیز مضمر ہے اسے سمجھنا ضروری ہے۔ ایک کفر حقیقی ہے اور دوسرا کفر قانونی' جس کے ارتکاب سے کوئی شخص مرتد قرار پاتا ہے۔ کفر حقیقی کیا ہے؟ اسے بعض احادیث کی روشنی میں سمجھئے! حدیث کی رو سے ((مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ)) "جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اُس نے کفر کیا"۔ لیکن اس فرمان نبویؐ کا یہ مطلب نہیں کہ تارک نماز قانونی طور پر کافر ہو گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ((مَا اٰمَنَ بِالْقُرْاٰنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ)) "جس شخص نے قرآن کی حرام کردہ کسی شے کو اپنے لئے حلال ٹھہرالیا اس کا قرآن مجید پر کوئی ایمان نہیں"۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ایسا شخص مرتد ہو گیا ہے؟ اسی طرح حضور ﷺ نے تین مرتبہ قسم کھا کر ارشاد فرمایا ((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ' وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ' وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) "خدا کی قسم! وہ شخص ایمان نہیں رکھتا" اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ کون اے اللہ کے رسول ﷺ؟ آپؐ نے فرمایا: ((اَلَّذِیْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ)) "جس کا پڑوسی اس کی ایذارسانی سے چین میں نہیں ہے"۔ پڑوسی کے ساتھ برا سلوک نہ شرک ہے' نہ کفر اور نہ ہی کبیرہ گناہ ہے' بلکہ یہ ایک اخلاقی برائی ہے' کج خلقی ہے۔ لیکن اس شخص کے اس رویئے پر حضور ﷺ نے اس کے عدم ایمان کی تین دفعہ قسم کھائی تو کیا ایسا شخص کافر ہے؟۔

یہ بڑا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ تھا جسے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الفقہ الاکبر" میں بڑی عمدگی سے حل کیا ہے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا البتہ دین کی کسی بنیادی چیز کے انکار سے کفر لازم آتا ہے۔ جیسے نماز کا انکار کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے مگر تارک صلوۃ کافر نہیں ہوتا۔ محض کفر حقیقی کا مرتکب قانوناً مرتد نہیں ہوتا' البتہ گناہگار ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے صوفیاء کے حلقے میں ایک قول مشہور ہے جس سے اس معاملے کے انتہائی پہلو کی عکاسی ہوتی ہے کہ "جو دم غافل سو دم کافر"۔ گویا کفر حقیقی کی آخری حد یہ ہے کہ انسان کا جو سانس بھی غفلت میں گزرتا ہے وہ گویا ایک طرح کے کفر میں گزرتا ہے۔ اسی طرح ایک شرک فی العقیدہ کا معاملہ ہے اور

ایک شرک فی العمل ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح کا معاملہ نفاق کا بھی ہے' ایک نفاق قلبی ہے اور دوسرا نفاق عملی یا فعلی ہے۔ یعنی ایک شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس میں ایک طرح کا نفاق موجود ہے لیکن اسے آپ عقیدے کا نفاق نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح ناموس رسالتؐ کی توہین کا معاملہ ہے۔ ایک توہین رسالتؐ ظاہری اور قانونی ہے' اور ایک حقیقی اور عملی ہے اگرچہ اس میں نیت شامل نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضور ﷺ کی سب سے بڑی توہین یہ ہے کہ آپؐ کے احکامات سے سرتابی کی جائے۔ آپؐ کی نافرمانی بھی آپ کی توہین ہی کے مترادف ہے۔ حضور ﷺ کے فرمان کو پس پشت ڈال کر من مانی کرنا اللہ تعالیٰ اور حضورؐ پر ایمان کے منافی ہے! لیکن اس کے باوجود قانونی اعتبار سے فرق و امتیاز اپنی جگہ موجود رہے گا۔ ایک معاملہ قابل دست اندازی پولیس جرم کا ہے' جبکہ بعض اخلاقی جرائم ہوتے تو بہت بڑے ہیں مگر یہ قانون کی زد میں نہیں آتے' جیسے غیبت کا گناہ ہے۔ اخلاقی سطح پر جرم اور قانونی سطح پر جرم کے مابین فرق تو رہے گا۔ چنانچہ توہین رسالتؐ کا قانونی اطلاق صرف کسی ایسے قول' فعل یا ظاہر و باہر عمل پر ہو گا جس سے حضور ﷺ کی توہین کا پہلو نکلتا ہو اور اس امر کے شواہد بھی موجود ہوں کہ ایسا بدنیتی سے کیا گیا ہے۔ غیر شعوری طور پر توہین رسالتؐ کا ارتکاب قابل معافی ہے جو توبہ کرنے سے معاف ہو جائے گا۔ لیکن اگر شواہد سے یہ ثابت ہو جائے کہ کسی شخص کی طرف سے جان بوجھ کر اور شعوری طور پر اس کی تحریر و تقریر یا فعل کے ذریعے توہین رسالتؐ کا ارتکاب کیا گیا ہے تو ایسے شخص پر توہین رسالتؐ کے قانون کا یقیناً اطلاق ہو گا۔

جہاں تک حقیقی توہین رسالتؐ کا تعلق ہے پوری اُمت مسلمہ اسلامی نظام نافذ نہ کر کے توہین رسالتؐ کے جرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔ دُنیا کا کونسا ملک ایسا ہے جس میں نظام مصطفیٰ ﷺ قائم ہے؟ اگرچہ سعودی عرب' ایران اور افغانستان میں چند اسلامی قوانین نافذ ہیں مگر اسلام کا نظام حیات تو کسی ایک ملک میں بھی نافذ نہیں ہے۔ پوری دُنیا کے کسی ایک ملک میں بھی اسلامی نظام کا نافذ نہ کرنا گویا حضور ﷺ کی توہین کے ارتکاب کے

مترادف ہے۔ مزید برآں اُمت کی عظیم اکثریت انفرادی سطح پر بھی اس جرم کی مرتکب ہو رہی ہے۔ البتہ کچھ لوگ ضرور ایسے موجود ہیں جنہوں نے دین کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے اور حضور ﷺ کی سنتوں پر عمل پیرا ہیں۔ ذرا غور فرمایئے وہ مسلمان جو "شیو" بناتا ہے وہ محمد رسول ﷺ کے ایک واضح حکم کی حکم عدولی و نافرمانی کا ارتکاب کر رہا ہے گویا وہ روزانہ اپنے عمل سے حضور ﷺ کے حکم کی توہین کر رہا ہے۔ اُس نے محض زمانے کے ایک فیشن اور چلن کی وجہ سے حضور ﷺ کے حکم اور عمل دونوں کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ داڑھی رکھنا تو تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے' خود حضور ﷺ کا قول و عمل اس پر شاہد ہے۔ آپؐ نے فرمایا "داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کترواؤ"۔ یہ حضور ﷺ کا واضح حکم ہے۔ داڑھی رکھنا سنت مؤکدہ ہے جس کو ترک کرنا یقیناً آپؐ کے حکم کی توہین ہے۔ لیکن یہ توہین عموماً شعور اور ارادہ کے ساتھ نہیں ہوتی لہٰذا اسے عمل کی کوتاہی کا نام ہی دیا جا سکتا ہے!

قانون توہین رسالتؐ کا تاریخی پس منظر

پاکستان میں توہین رسالتؐ کے مرتکب لوگوں کو سزا دینے کے لئے قانون سازی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے قانون تحفظِ ناموسِ رسالت کی منظوری کا باقاعدہ مطالبہ ۱۹۸۳ء میں ہوا۔ لاہور میں مشتاق راج نامی وکیل نے انگریزی زبان میں HEAVENLY COMMUNISM نامی کتاب لکھی جس میں اُس نے اللہ تعالیٰ' حضور ﷺ اور اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا۔ اس کتاب پر پورے ملک میں زبردست احتجاج کیا گیا تو مجبوراً حکومت نے نقص امن کے خطرے کی وجہ سے اس وکیل کو دفعہ 295(A) کے تحت گرفتار کر لیا۔ ۱۹۸۴ء میں وفاقی شرعی عدالت میں جناب اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ کی طرف سے شریعت پٹیشن دائر کی گئی جس میں کہا گیا کہ توہین رسالتؐ کو قابل گرفت جرم قرار دیا جائے اور اس کی سزا موت مقرر کی جائے۔ اس اہم مسئلے پر پورے ملک میں بحث و تمحیص شروع ہو گئی۔ اسی دوران انسانی حقوق کے حوالے سے شہرت حاصل کرنے والی خاتون ایڈووکیٹ مسماۃ عاصمہ جیلانی نے اپنی تقریر میں حضور ﷺ

کے لئے نامناسب الفاظ استعمال کئے۔ اس خاتون نے "اُمی" کے لئے "Illiterate" کا لفظ استعمال کیا' جو یقیناً توہین آمیز ہے۔ ایک اور خاتون مرحومہ آپا نثار فاطمہ 'جو دین کی پرجوش مبلغہ ار اُس وقت ایم این اے تھیں (محترمہ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی خواہر نسبتی بھی تھیں) انہوں نے ۱۹۸۷ء میں قومی اسمبلی میں باقاعدہ ایک "بل" 295(C) کے نام سے پیش کیا۔ اس بل کو قومی اسمبلی نے باقاعدہ بحث کے بعد منظور کر لیا۔ اس قانون کے مطابق توہین رسالتؐ کے جرم کے مرتکب شخص کے لئے عمر قید اور سزائے موت پر مبنی دو سزائیں مقرر کر دی گئیں۔ اس پر جناب اسماعیل قریشی نے شرعی عدالت میں ایک اور پٹیشن دائر کر دی کہ توہین رسالتؐ کے جرم پر عمر قید کی سزا درست نہیں ہے' اس قانون میں ترمیم کر کے توہین رسالتؐ کی سزا بطور حد صرف "موت" مقرر کی جائے۔ لہٰذا ۱۹۹۱ء میں (C)295 کی حیثیت سے پورے ملک میں توہین رسالتؐ کا قانون لاگو ہو گیا جس کے خلاف بین الاقوامی سطح پر احتجاج کیا جا رہا ہے۔ امریکی صدر کلنٹن اور پوپ پال تک کو اس قانون سے پریشانی لاحق ہے۔ تحفظ ناموس رسالتؐ کے قانون کی منظوری جناب اسماعیل قریشی کا اصل کارنامہ ہے۔

اسی طرح کا معاملہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اٹھنے والی ختم نبوت کی تحریک کے نتیجے میں اُس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اس قادیانی مسئلے کو نہایت عمدہ طریقے سے قومی اسمبلی کے ذریعے حل کر دیا۔ اگرچہ اس سے قبل مختلف عدالتی کیسوں میں قادیانیوں کے خلاف کفر کے فیصلے ہو چکے تھے مگر اس معاملہ کو قانونی حیثیت قومی اسمبلی کے فیصلے کے ذریعے حاصل ہوئی۔ اسی طرح تحفظ ناموس رسالتؐ کا قانون وفاقی شرعی عدالت کی ہدایت پر قومی اسمبلی کے ذریعے نافذ العمل ہوا ہے۔

قانون تحفّظِ ناموسِ رسالتؐ کی اصل حکمت

قانون تحفظ ناموس رسالتؐ کی حکمت کیا ہے اور یہ دُنیا کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا؟' اسے واضح کرنا بہت ضروری ہے۔ بڑا اہم سوال ہے کہ پوری دُنیا آخر اس قانون کو

سمجھنے سے کیوں قاصر ہے؟ اسی طرح اسلام کا ایک قانون "قتلِ مرتد" کا ہے جو موجودہ دُنیا کے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ دُنیا میں مقبول عام تصورات میں سے ایک تصور آزادی کا ہے۔ یعنی ہر شخص کو آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ وہ جو چاہے عقیدہ رکھے اور جب چاہے اپنے مذہب کو بدل لے' جبکہ اسلامی ریاست میں اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنے والے مرتد کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح اظہارِ رائے کی آزادی کا معاملہ بھی ہے۔ ایک شخص اپنے مطالعہ اور غور و فکر سے جو بھی رائے پیش کرنا چاہے اُسے اس کی آزادی حاصل ہونی چاہئے' وہ اگر رشدی کی طرح پیغمبر ﷺ کی زندگی پر کیچڑ اچھالنا چاہے تو اسے اس کا بھی حق حاصل ہے۔ آج کی دُنیا میں رائج ان نظریات کا اصل سبب کیا ہے؟ اسے جاننا بہت ضروری ہے۔

دُنیا میں یہ مقبول عام تصورات یہودیوں کی طویل جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ سیکولرزم کا نظریہ یہ ہے کہ دین اور ریاست دو الگ چیزیں ہیں' ریاست کا کوئی تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں ہوگا۔ اگرچہ دُنیا کی ہر ریاست کا ایک سرکاری مذہب تو ہوتا ہے' مثلاً آج سیکولرزم کا سب سے بڑا علمبردار امریکہ ہے' لیکن عیسائیت امریکہ کا سرکاری مذہب ہے۔ امریکہ میں سرکاری تعطیلات عیسائی مذہب کے حوالے سے ہی ہوتی ہیں' اگرچہ وہاں بھی قانون سازی کی سطح پر انجیل یا تورات کے کسی حکم سے ریاست امریکہ کو کوئی بحث اور سروکار نہیں ہے۔ سیکولرزم کے نظریات پر مبنی نظام گزشتہ دو سو برس سے دُنیا میں رائج ہے' یہ خود بخود نافذ نہیں ہوا۔ خدا' رام اور "God" کو عبادت گاہوں تک محدود کر کے اور اسے ایوان حکومت اور ایوان عدالت سے دیس نکالا دے کر "No Admission" کا بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ ملکی قانون کو قانون ساز اسمبلی کے ممبران کی اکثریت سے منظور کرا لیا جاتا ہے اور عدلیہ بھی کسی آسمانی وحی کی قطعاً پابند نہیں ہوتی۔ گویا سیکولرزم کے تحت انسانی زندگی میں مذہب کی حیثیت محض ایک ضمیمے کی رہ گئی ہے' جبکہ انسان کی اجتماعی زندگی کا اصل نظام رائج الوقت سیکولر نظام کے تحت چل رہا ہے اور سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام' دیوانی اور فوجداری قانون سب سیکولرزم کے تابع ہیں۔ گویا دُنیا کا ۹۹ فیصد نظام لادینیت پر چل رہا ہے۔ اجتماعی زندگی سے تمام مذاہب کے

عمل دخل کو یکسر اور کلی طور پر ختم کر دیا گیا ہے اور انہیں انفرادی زندگی تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اس صورتحال میں اگر مذہب کے چھوٹے سے دائرے اور گوشے میں تبدیلی بھی واقع ہو جائے تو آخر کونسا بڑا فرق واقع ہو جائے گا؟ کوئی شخص پہلے ہندو یا عیسائی تھا اور اب مسلمان ہو گیا تو اس سے ملک کے نظام میں تو کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا سیکولرزم کے تحت مذہب تبدیل کرنے کی آزادی بھی دی جاتی ہے اور بانیانِ مذاہب کی ذات پر ہر قسم کی ہرزہ سرائی کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "Son of God" قرار دیتے ہیں جبکہ یہودی انہیں "Son of man" قرار دیتے ہیں۔ گویا ہر ایک کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہے۔

یہ سب کچھ یہودی سازش کی کرشمہ سازی ہے۔ یہودی بہت چھوٹی سی قوم ہے' پوری دنیا میں یہود کی تعداد ۱۳ یا ۱۴ ملین سے کسی طرح بھی زائد نہیں ہے جن میں سے ۳۵ لاکھ یہودی اسرائیل میں آباد ہیں۔ اتنی ہی تعداد میں یہودی امریکہ میں آباد ہیں' جبکہ باقی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ پوری دنیا کا کنٹرول حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر سیاست کا رشتہ مذہب سے برقرار رہے تو یہود کو اپنے پیش نظر مقاصد میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں نہایت قلیل اقلیت کیا کر سکتی ہے؟ لہٰذا یہود نے سیاست اور مذہب کے باہمی رشتے کو منقطع کر دیا۔ اس ضمن میں جو آرڈر آف الیومیناٹی (Order of Illuminati) تشکیل دیا گیا تھا اس کا "insignia" آج بھی ایک ڈالر کے نوٹ پر موجود ہے۔ یہود نے سیکولرزم کو دنیا میں بڑی طویل محنت کے بعد رائج کیا ہے۔ یہودی مذہب غیر تبلیغی مذہب ہے' وہ کسی دوسرے مذہب کے پیرو کار کو یہودی بناتے ہی نہیں' کیونکہ یہودیت نسل پر مبنی ہے۔ اس لئے ان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ عیسائیت میں تفریق پیدا کر دیں جیسے مسلمانوں میں عبداللہ بن سبا نامی ایک یہودی نے تفریق پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ یہود نے عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ اور کیتھولک میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم سے پہلے عیسائیوں کے عہد اقتدار میں سود کی مکمل ممانعت تھی' لیکن پروٹسٹنٹ کے ذریعے یہودیوں نے سود کو جائز کروا لیا۔ اس سودی نظام کی وجہ سے آج جس طرح پوری دنیا کی معیشت عالمی مالیاتی اداروں کی گرفت میں ہے

اسی طرح ڈیڑھ صدی قبل یورپی ممالک کی معیشت پر یہودی گرفت مسلط ہو چکی تھی۔ علامہ اقبال نے اپنے سفر یورپ میں اسی صورتحال کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ ع "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے"۔ سیکولرزم کا نظریہ مذہب اور ریاست کی جدائی کا نام ہے جسے اقبال نے یوں بیان لیا ہے

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری' ہوس کی وزیری

دیگر مذاہب کے برعکس اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ مکمل دین اور نظام زندگی ہے۔ لہٰذا کوئی بھی ایسی شے جو اس نظام کو نقصان پہنچاتی ہو ' اس کا سدباب ضروری ہے۔

مسئلۂ ارتداد اور مرتد کی سزا

ارتداد کا مسئلہ کیا ہے؟ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مدینے کے یہود نے جب دیکھا کہ جو شخص ایک دفعہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتا ہے' پھر اس سے علیحدہ ہی نہیں ہوتا تو انہوں نے سوچا کوئی ایسی چال چلنی چاہئے جس سے اسلام کی دھاک اور ساکھ مجروح ہو جائے۔ چنانچہ بعض یہودی صبح اسلام لاتے اور شام کو مرتد ہو جاتے تاکہ لوگوں کو اسلام سے متنفر کیا جاسکے۔

اسلام اگر محض ایک مذہب ہوتا تو مسلمانوں کے لئے ترک اسلام کے راستے کو کھلا رکھنے سے کوئی فرق واقع نہ ہوتا' لیکن اسلام تو درحقیقت ایک مکمل ریاستی نظام بھی ہے لہٰذا ارتداد کا فتنہ اسلامی ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے نہایت مؤثر ہتھیار ثابت ہوتا۔ چنانچہ اس فتنے کا سدباب کرنے کے لئے "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" کا حکم جاری کر دیا گیا۔ پس اسلامی ریاست کی حدود میں کوئی مسلمان اگر مرتد ہو جاتا ہے تو وہ واجب القتل ہے۔

قتل مرتد کی سزا ان لوگوں کی سمجھ میں کیسے آئے جو مذہب اور ریاست کو جُدا سمجھتے ہیں' جبکہ اسلامی ریاست کی بنیاد ہی مذہب ہے۔ لہٰذا مذہب سے بغاوت درحقیقت اسلامی

ریاست سے بغاوت کے مترادف ہے۔ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اگر ریاست کے نظریہ ہی کو کمزور کر دیا جائے تو پھر خود ریاست ہی کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔

اسلام کا نظام حیات' اس کا سارا قانونی ڈھانچہ رسالت و نبوت محمدی ﷺ پر استوار ہے۔ ایک شخص بہت پکا موحد بھی ہو اور اس کے اخلاق بھی اچھے ہوں لیکن اگر وہ آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کو تسلیم نہیں کرتا تو وہ عقیدۂ توحید کے باوجود غیر مسلم قرار پائے گا۔ کوئی شخص کتنا ہی متقی' عابد' زاہد اور پرہیز گار کیوں نہ ہو جب تک رسالت محمدی ﷺ کا قلادہ اس کی گردن میں نہیں ہو گا' وہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

دین تو نام ہی محمد ﷺ کا ہے' شریعت کا سارا وجود ہی آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسلام کا پورا نظام محمد ﷺ کی شخصیت کے گرد گھومتا ہے۔ اگر اس تعلق کو مجروح کر دیا جائے تو گویا اسلام کی پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔

حضور ﷺ کے ساتھ ایک بندۂ مومن کے رشتے اور تعلق کے بارے میں فرمایا گیا کہ ان پر ایمان لاؤ' ان کی اطاعت کلی کرو اور تمام انسانوں سے بڑھ کر انہیں محبوب سمجھو۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اُس کے والد سے' اس کی اولاد سے' یہاں تک کہ تمام انسانوں سے۔ بدقسمتی سے آج ایمان کی یہ شرائط بھی امت کی عظیم اکثریت کے ذہنوں سے نکل چکی ہیں اور عمومی تصور یہ ہے کہ عید میلاد مناؤ' نعتیں پڑھو' جلسے کر لو' سیرت کانفرنسیں کر لو ــــــ مگر جہاں تک اتباع رسول' اطاعت رسولؐ اور محبت رسولؐ کا معاملہ ہے اس سے اُمت بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔ ایک ہے محبت جس کا تعلق دل سے ہے جبکہ اطاعت کا تعلق عمل سے ہے جو نظر آتا ہے۔ ایک اور ضروری شے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب و احترام ہے جسے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب میں بیان کیا گیا ہے۔ بقول شاعر ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اسلامی ریاست یا اسلامی معاشرے کی دو بنیادیں ہیں' ایک قانونی اور دوسری جذباتی۔ قانونی بنیاد کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات سے سرتابی نہ کی جائے' ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مسلمان فرد ہو یا ریاست دونوں قرآن و سنت کے دائرے کے اندر اندر آزاد ہیں' لیکن انہیں ان حدود سے تجاوز کی اجازت نہیں ہے۔ جبکہ حضور ﷺ کا ادب و احترام اسلام کے نظام معاشرت اور اسلامی تہذیب میں یک رنگی اور تسلسل کا ضامن ہے۔ اسلامی معاشرے کے استحکام کے لئے ایک ستون اگر دستوری و قانونی فراہم کرتا ہے تو دوسرا ستون حضور ﷺ سے جذباتی محبت اور آپ کا اتباع ہے۔ اگر حضور ﷺ کا ادب و احترام اور آپ کی اتباع کا جذبہ کمزور پڑ جائے تو اسلامی تہذیب کی بنیاد ختم ہو کر رہ جائے گی۔

اکبر کے وضع کردہ دین الٰہی کے اندر بھی یہی فتنہ مضمر تھا۔ اُس وقت یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ دین کی اصل توحید ہی ہے' رسالت وغیرہ کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ اس سے اُمت محمدیہ ﷺ کا تشخص ختم ہو رہا تھا۔ اس فتنے کی سرکوبی کے لئے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہوئے۔ بقول اقبال ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

شیخ احمد سرہندیؒ حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب میں اتباع سنت پر جس قدر زور دیا گیا ہے اس کا عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اگر توہین رسالتؐ کا قانون موجود نہ ہو تو اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ ہماری معاشرتی اور ملی زندگی کے جذباتی مرکز و محور کو منہدم کر دیں۔ اس سے مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ چنانچہ علامہ اقبال مرحوم نے "ابلیس کا پیغام اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" بایں الفاظ نقل کیا ہے ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
رُوح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

قادیانی فتنے کی سرکوبی کا اصل ذریعہ

غیر مسلم قرار دیئے جانے کے باوجود قادیانی فتنے کا پوری طرح سدباب نہیں ہو سکا اور یہ فتنہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ خفیہ طور پر اب پاکستان میں بھی مسلمانوں کو قادیانی بنایا جا رہا ہے۔ پوری دُنیا میں قادیانی اُمت کا بول بالا ہے۔ قادیانی جماعت کے سربراہ کے خطبات سیٹلائٹ پر نشر ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم پاکستان میں "half way" تو چلے گئے کہ ہم نے انہیں غیر مسلم قرار دے دیا مگر اس فتنے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے "قتل مرتد" کی سزا نافذ نہیں کی۔ قتل مرتد کے قانون کے نفاذ کے بعد جو مسلمان قادیانی ہو گا تو وہ مرتد شمار کیا جائے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ جب تک "قتل مرتد" کی سزا کا نفاذ نہیں کیا جاتا' اُس وقت تک قادیانی فتنے کا سدباب نہیں ہو سکتا۔ غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد قادیانی ٹولے نے مظلومیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور پوری دُنیا میں انسانی حقوق کے حوالے سے انہوں نے اپنے لئے ہمدردی حاصل کر رکھی ہے کہ پاکستان میں ہمیں مسلم تسلیم نہیں کیا جاتا' ہمیں کلمہ پڑھنے سے روکا جاتا ہے' ہمیں مساجد کی تعمیر کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے کئی مواقع پر مجلس عمل ختم نبوت کے ذمہ دار حضرات سے بھی کہا ہے کہ جب تک آپ "قتل مرتد" کا قانون منظور کرانے کے لئے مورچہ بند نہیں ہوں گے اُس وقت تک قادیانی فتنے کو روکنا ناممکن ہے۔

جناب اسماعیل قریشی پوری ملت اسلامیہ کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی کوششوں سے ملکی قانون میں توہین رسالتؐ کے جرم کے لئے سزائے موت (Capital Punishment) نافذ کروا دی۔ تو کیا توہین رسالت کے قانون کی طرح پاکستان میں "قتل مرتد" کی سزا نافذ نہیں ہو سکتی؟۔ غالباً مجلس عمل ختم نبوت بھی عالمی فضا اور رجحان کے زیر اثر "قتل مرتد" کی سزا کی نفاذ کا مطالبہ کرنے کی جرأت نہیں کر رہی۔

پاکستان میں قانون ناموس رسالت کی جو مخالفت ہو رہی ہے وہ بظاہر عیسائی کر رہے ہیں مگر حقیقت میں اس کے پس پردہ قادیانی لابی سرگرم عمل ہے۔ عالمی سطح پر بھی قادیانی متحرک ہیں۔ قادیانی عیسائیت کے آلہ کار بن چکے ہیں اور عیسائیت یہود کی آلہ کار ہے۔ گویا توہین رسالتؐ کے قانون کی مخالفت اصل میں یہودی سازش ہے۔ یہود نے عالم عیسائیت کو مفتوح کر لیا ہے اور برطانیہ' فرانس' امریکہ کی سرپرستی کی وجہ سے دنیا میں یہود کا ڈنکا بج رہا ہے۔ قادیانیوں کو یہ تشویش لاحق ہے کہ اگر پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی جانب مزید پیش رفت ہوئی تو یہاں "قتل مرتد" کا قانون بھی نافذ ہو جائے گا۔ گویا پاکستان میں نفاذ اسلام قادیانیوں کیلئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

قادیانی حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ آنجنابؑ نے کشمیر میں آکر وفات پائی ہے اور کشمیر میں ان کی قبر بھی موجود ہے۔ گویا قادیانی حضرت مسیحؑ کے نہ تو رفع سماوی کے قائل ہیں اور نہ ان کی دوبارہ آمد کے۔ مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی اس بات کا مدعی تھا کہ خود میں مثیل مسیح ہوں۔ مرزا قادیانی نے کہا کہ مسیح علیہ السلام دوبارہ نہیں آئیں گے' بلکہ ان کی سی صفات رکھنے والا شخص آئے گا اور وہ میں ہی ہوں۔ اس حوالے سے دیکھئے کہ عقائد کے ضمن میں قادیانیوں کا عیسائیوں سے کس قدر بُعد ہے جبکہ اس حوالے سے مسلمانوں کا عیسائیوں سے بہت زیادہ قرب ہے۔ اگر اس کے باوجود وہ قادیانیوں کے آلۂ کار بنیں تو یہ بہت افسوسناک بات ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین OO

"فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے' دل یا شکم!"

وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف کے نام

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا خط

جو ۱۳ جولائی کو وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کے موقع پر پیش کیا گیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترمی میاں محمد نواز شریف صاحب' وزیر اعظم پاکستان

وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضٰی!

(اللہ ہمیں اور آپ کو ہر اس کام کی توفیق عطا فرمائے جو اسے پسند اور محبوب ہو!)

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!!

سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ملاقات کا موقع عطا فرمایا۔ اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ملاقات کو میرے لئے' آپ کے لئے' اور ملک وملت کے لئے مفید بنائے' آمین!

امابعد ـــــ آپ کی خدمت میں حاضری کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ اولاً آپ سے دریافت کروں کہ جب آپ گزشتہ سال دو مرتبہ اپنے والد ماجد اور دونوں برادران کے ساتھ میری قرآنی خانقاہ میں تشریف لائے' اور پھر ایک بار میں ایک وفد کے ساتھ پرائم منسٹر ہاؤس اسلام آباد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' تو ان مواقع پر آپ نے دستور پاکستان میں قرآن وسنت کی بلا استثناء بالادستی کے لئے ضروری ترامیم اور سود کے انسداد کے ضمن میں جن عزائم کا اظہار فرمایا تھا ان کی تعمیل میں تاحال تاخیر کیوں ہوئی؟ ـــــ

اور ثانیاً آپ سے بصد دست بستہ درخواست کروں کہ اب بلا تاخیر ان دونوں کاموں کو سرانجام دے کر عظیم "دینی دھاکہ" کر گزریے اور اس میں کسی لیت ولعل کو راہ نہ پانے دیجئے!

ع "ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا - اور درویش کی صدا کیا ہے!"

اس ضمن میں دستوری ترامیم کا ایک مسودہ ہم نے بھی آپ کی خدمت میں اسلام آباد کی ملاقات کے موقع پر پیش کیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کے پہلے دورِ وزارت عظمیٰ کے دوران' مولانا عبدالستار نیازی صاحب نے جو اس وقت وفاقی وزیر امور مذہبی تھے' ایک نفاذ شریعت گروپ قائم کیا تھا اور اس نے بھی دستوری ترامیم کا ایک مفصل خاکہ مرتب کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ ان چیزوں کی موجودگی میں اب کوئی دقت باقی نہیں رہی ہے۔ آپ نے اسلام آباد والی ملاقات میں دو مرتبہ راجہ ظفرالحق صاحب سے خطاب کر کے فرمایا تھا کہ "راجہ صاحب! پھر دستوری ترامیم کی تیاری کیجئے!" براہ کرم اب اس میں مزید تاخیر نہ کریں اور راجہ صاحب ہی کے ذمہ یہ کام لگا دیں' وہ چاہیں تو لاہور کے جناب محمد اسمٰعیل قریشی ایڈووکیٹ اور کراچی سے چیف جسٹس (ر) ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں' پھر موجودہ صدر مملکت عالی جناب محمد رفیق تارڑ صاحب اور جسٹس خلیل الرحمٰن صاحب بھی تعاون اور نگرانی فرما سکتے ہیں!

اسی طرح انسداد سود کے لئے جو کمیٹی آپ نے راجہ صاحب ہی کی سرکردگی میں بنائی تھی وہ عرصہ ہوا کہ اپنا کام کر کے رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کر چکی ہے۔ قرآن اکیڈمی کی ملاقات میں آپ کے والد ماجد مدظلہ' نے زور دے کر فرمایا تھا کہ "انسداد سود کا کام ایک سال میں مکمل کیا جائے"۔ اب تو ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے۔ خدا کے لئے اس معاملے میں بھی جرأت ایمانی اور ہمت مردانہ سے کام لیجئے۔ اور کم از کم اس رپورٹ کی Implementation کا تو فوری طور پر آغاز فرما دیجئے۔ اللہ آپ کو اس کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے!

ظاہری اعتبار سے تو مجھے آپ سے اس وقت یہی دو باتیں کہنی ہیں جن کے ضمن میں

کچھ مزید گزارشات میں زبانی عرض کردوں گا۔

لیکن زیادہ گہرائی میں اور خالص ذاتی سطح پر مجھے آپ سے ایک بات اور عرض کرنی ہے جس کے لئے پہلے ایک تمہید ضروری ہے۔

وہ تمہید یہ ہے کہ اس مملکت خداداد پاکستان میں' قائداعظم اور خان لیاقت علی خان کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو اشخاص کو عظیم مواقع عطا فرمائے لیکن وہ دونوں ان سے فائدہ اٹھانے اور ان کا حق ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہے : ایک ذوالفقار علی بھٹو جسے موقع ملا تھا کہ وہ اس ملک کا کم از کم ماوزے تنگ بن سکتا تھا جس سے ملک سے جاگیرداری اور بڑی زمینداریوں کی لعنت دور ہو جاتی اور قوم اور ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتے' لیکن چونکہ وہ خود بڑا جاگیردار تھا اور اس جاگیرداری کی کھال سے باہر نہ آسکا' لہٰذا خود بھی ناکام ہوا اور ملک و ملت کے لئے بھی مجموعی طور پر شدید نقصان کا باعث بنا ـــــ دوسری شخصیت مرحوم ضیاء الحق صاحب کی تھی' جنہیں قدرت نے موقع دیا تھا کہ وہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ جو بالاتفاق پہلے مجدد ملت اسلامی تھے' کا مقام و مرتبہ حاصل کر لیتے لیکن انہوں نے بھی بعض Half hearted بلکہ Quarter hearted قدم تو اٹھائے لیکن کوئی فیصلہ کن اقدام نہیں کیا۔ جس کے نتیجے میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔

میرے نزدیک اب اس سلسلے کی تیسری شخصیت آپ ہیں! آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک جانب تو اندرون ملک عظیم مینڈیٹ دلوا دیا۔ اور دوسری جانب بھارت کے جوہری دھماکوں کے جواب میں مجبوراً دھماکے کرا کے یکدم پورے عالم اسلام کی قیادت کا منصب عطا کر دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ ؎ "یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے۔ پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!" کے مصداق یہ کلی طور پر آپ کی ہمت و عزیمت کا امتحان ہے کہ آپ اس عظیم مقام اور مرتبہ کا حق ادا کرتے ہیں یا نہیں!

اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ نہ صرف قرآن حکیم اور

احادیث نبویہ (ﷺ) بلکہ کتب سابقہ (یعنی تورات اور انجیل) اور سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود اور موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمد ﷺ کی تاریخ کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہود کے آخری خاتمے اور اسلام کے عالمی غلبے کا دور زیادہ دور نہیں ہے' اور اس کے ضمن میں مشیت اور تدبیر خداوندی نے پاکستان کو خاص رول عطا کیا ہے —— اور اس وقت عالمی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پیشینگوئیوں کا ذکر احادیث میں ہے ان کے لئے بین الاقوامی سطح پر سٹیج تیار ہو چکا ہے۔ (اس موضوع پر اگر آپ پسند فرمائیں تو میں آپ کی کسی مخصوص نشست میں' جس میں آپ کے والد ماجد مدظلہ بھی موجود ہوں حاضر ہو کر تفاصیل بیان کر سکتا ہوں! فی الحال اپنی ایک تالیف حاضر خدمت کر رہا ہوں۔)

اس تمہید کی ایک تیسری جہت یہ ہے کہ پاکستان اس وقت جس تشویشناک بلکہ خوفناک صورت حال سے دوچار ہے اس کے پیش نظر مستقبل قریب کے حالات مندرجہ ذیل Scenarios میں سے کوئی سی صورت اختیار کر سکتے ہیں :

۱۔ ایک یہ کہ امریکہ ہمیں مالی اعتبار سے پوری طرح ڈوبنے نہ دے بلکہ تھوڑی تھوڑی مدد کے ذریعے زندہ رکھے۔ البتہ اس کے عوض ہم سے اپنے حسب دلخواہ فیصلہ کرانے کی کوشش کرے جن میں جوہری پروگرام کا خاتمہ یا انجماد اور کشمیر کے مسئلے کا کوئی امریکہ اور بھارت اور بھارت کے مابین متفق علیہ حل کے علاوہ بھارت سے کھلی تجارت شامل ہوں گے —— اور آپ خوب جانتے ہیں کہ ان مسائل پر پاکستان کے عوام بالخصوص پنجاب (جو آپ کی سب سے بڑی طاقت ہے!) کے عوام کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں' پھر اپوزیشن میں متعدد قوتیں ایسی موجود ہیں جو اس صورت حال کو Exploit کر سکتی ہیں۔ الغرض یہ کوئی اچھا سیناریو نہیں ہے!

۲۔ دوسرے یہ کہ امریکہ ہماری مدد کو بالکل نہ آئے' یا ہم اس کی شرائط کو قبول نہ کر سکیں اور ملک میں مالیاتی بحران کسی انارکی' یا Chaos کی شکل اختیار کر لے' جس سے انقلاب کا نعرہ لگانے والی قوتیں فائدہ اٹھائیں۔ اس صورت میں یہ

"Free for all" والی بات ہوگی۔ جس کے نتیجے کے بارے میں پیشگی کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ اور خیر سے زیادہ شر کا اندیشہ ہے!

۳۔ ایک تیسری رائے بھی ہے جو بھارت اور پاکستان کے جوہری دھماکوں سے بھی قبل لندن سے شائع ہونے والے ایک جریدے (Impact) میں شائع ہوئی تھی —— اور وہ یہ کہ امریکہ آپ سے بھی اسی طرح Disillusioned ہو چکا ہے جیسے بے نظیر سے —— اور جنرل جہانگیر کرامت کو دورۂ امریکہ کی دعوت اور وہاں ان کو بہت غیر معمولی Protocol دیا جانا اسی قسم کی بات ہے جیسے ۱۹۵۷ء میں جنرل محمد ایوب خان کو امریکہ بلا کر ان کی پیٹھ تھپکی گئی تھی جس کے نتیجے میں ۵۶ء کے دستور کا دستور یہ سمیت بستر لپیٹ دیا گیا تھا۔ واللہ اعلم! (آج کے "جنگ" میں ارشاد احمد حقانی صاحب کا کالم قابل توجہ ہے!)

۴۔ ایک چوتھی اور نہایت تابناک اور روشن صورت یہ ہے کہ آپ خود ایک عظیم انقلابی لیڈر کا رول اختیار کر کے سامنے آئیں —— کشکول گدائی کو واقعتاً اور کلیتاً توڑ کر پھینک دیں، اولاً سود کی اقساط، اور بالآخر کل قرضوں کی ادائیگی سے انکار کر دیں، اور Sanctions کے نتیجے میں جو سختیاں آئیں انہیں برداشت کرنے کے لئے ایک انقلابی جذبہ پاکستان کے عوام کے اندر پیدا کریں۔ یہ چوتھی صورت مشکل اور ایثار طلب تو ہے لیکن ناممکن نہیں!

لیکن پاکستان کے عوام میں وہ انقلابی جذبہ پیدا کرنے کے لئے جس سے ایثار اور قربانی کی نئی داستانیں رقم ہو سکیں دو چیزیں بالکل ناگزیر ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے لئے کم از کم دستور کی سطح پر جملہ تقاضے بتمام و کمال پورے کر دیئے جائیں —— جس سے اسلامی قانون کی تدوین اور تنفیذ کا کام سہولت کے ساتھ اور تدریجاً ہوتا چلا جائے۔ پاکستان کے موجودہ دستور میں پورا اسلام بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے چور دروازے بھی ہیں جن کی بنا پر وہ مؤثر طور پر نافذ نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے پاکستان کا موجودہ دستور

منافقت کا پلندہ ہے۔ جس کی تطہیر لازمی ہے۔ جس کے ضمن میں آپ سے گفتگوئیں بھی ہو چکی ہیں اور اس عرضداشت کے آغاز میں بھی تذکرہ ہو چکا ہے۔

اس کے ساتھ پاکستانی معیشت کی تطہیر کے لئے بھی دو اطراف سے کام کرنے کی ضرورت ہے' ایک انسداد سود' اور دوسرے جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ۔ پہلے کام کے سلسلے میں راجہ ظفرالحق صاحب کی تیار کردہ سفارشات پر عمل سے آغاز کیا جا سکتا ہے' دوسرے کام کا آپ نے اپنے ایجنڈے میں اعلان کیا تب' لیکن اس کے لئے خالص دینی اساس ضروری ہے اور وہ دو میں سے ایک ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ دونوں کے نزدیک مزارعت مطلقاً حرام ہے' لہٰذا صرف خود کاشت رقبے لوگوں کے پاس رہ سکتے ہیں' اور دوسری اور زیادہ انقلابی بات یہ کہ حضرت عمرؓ کے اجتہاد اور اس پر اجماع کی رُو سے پاکستان کی اراضی افراد کی ملکیت یعنی "عشری" نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت یعنی "خراجی" ہیں لہٰذا ملک و ملت کی مصلحت کے پیش نظر بالکل نیا بندوبست اراضی کیا جا سکتا ہے جس کی رو سے کاشتکار براہ راست بیت المال کو خراج ادا کرے گا!

بہرحال یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ پاکستانی قوم میں انقلابی جذبہ اور ایثار اور قربانی کا مادہ صرف دین و مذہب کے حوالے سے پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے مندرجہ بالا اقدامات لازمی ہیں!

۱۔ پاکستان کے عوام میں انقلابی جذبہ اور ایثار و قربانی کا مادہ پیدا کرنے کی دوسری شرط لازم یہ ہے کہ آپ ایک روشن مثال بن کر سامنے آئیں! یعنی جس طرح ذوالفقار علی بھٹو جاگیرداری کی کھال میں بند ہو کر رہ گیا تھا' اسی طرح آپ بھی سرمایہ داری اور صنعت کاری کے حصار میں بند نہ ہو جائیں۔ بلکہ اس خول سے اس طرح باہر آ جائیں کہ آپ کا یہ ذاتی انقلاب روز روشن کی طرح عیاں ہو! حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ بھی خلافت کی ذمہ داری سے قبل نہایت خوش شکل' خوش پوش اور خوش خوراک انسان تھے' اور شہزادوں کی طرح ناز و نعم میں پلے تھے۔ لیکن خلافت کا بوجھ کندھے پر آنے کے بعد ان کی زندگی میں جو انقلاب آیا وہ ہماری تاریخ کا ایک

نہایت روشن اور تابناک باب ہے۔ اور اس وقت دست قدرت نے اپنی خصوصی مشیت و حکمت کے تحت آپ کو داخلی اور بین الاسلامی و عالمی سطح پر جس مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے' نجی اور ذاتی سطح پر آپ کی اور آپ کے خاندان کی کیفیت میں یہ انقلاب بین الاقوامی ہی نہیں عالمی اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ آپ کا یہ انقلاب بالکل واضح اور Transparent ہو۔

آپ کے اور آپ کے خاندان کے مالی حالات کی تفاصیل ظاہر ہے کہ اس ملک کے عوام کے علم میں تو نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ملک کے جن صاحب ثروت لوگوں سے آپ تعاون اور ایثار کی اپیلیں کر رہے ہیں' ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں سے تو آپ کے حالات پوشیدہ نہیں ہیں۔ لہٰذا جب تک آپ اپنا سب کچھ ملک کے حوالے کر کے فقر محمدیؐ کی روش اختیار نہیں کریں گے اور اپنے شکم پر دو پتھر بندھے ہوئے لوگوں کو نہیں دکھا سکیں گے' کوئی دوسرا شخص بھی حقیقی ایثار اور قربانی کے لئے تیار نہیں ہو گا! میں آپ سے یہ باتیں یہ جانتے ہوئے عرض کر رہا ہوں کہ یہ کام آسان نہیں' بہت مشکل ہے' لیکن اگر نبی اکرمؐ کے وصال کے لگ بھگ نصف صدی بعد عمر ابن عبدالعزیزؒ جیسی شخصیت پیدا ہو سکتی تھی اور بہت بعد کے زمانے میں نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ جیسے درویش حکمران شرق اوسط میں اور ناصرالدین محمودؒ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے بادشاہ ہندوستان میں پیدا ہو سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کی ایک تازہ مثال پیدا نہ کر سکیں —— جبکہ صاف نظر آ رہا ہو کہ اگر آپ یہ مرحلہ طے کریں تو ملک و ملت اور دین و مذہب کا نہایت شاندار مستقبل سامنے ہو گا —— اور اگر خدانخواستہ نہ کر سکیں تو جو تینوں Scenarios میں نے بیان کئے ان میں سے کسی سے بھی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی!

اب اگر اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو اس چوتھے ممکنہ راستے کے لئے کھول دے تو میں نہایت ادب سے اور ڈرتے ڈرتے عرض کروں گا کہ ان حقائق کے پیش نظر کہ حکومت اور اقتدار بھی آنی جانی چیزیں ہیں' پھر یہ دنیا اور مافیہا ہی نہیں کل کائنات فانی ہے اور

حیات دنیوی سے زیادہ ناقابلِ اعتبار شے اور کوئی نہیں' آپ ہمت کریں اور اللہ کا نام لے کر:

۱۔ رائیونڈ فارم اور اس کے جملہ متعلقات کو قوم کے حوالے کر کے اپنی ماڈل ٹاؤن کی رہائش گاہوں پر اکتفا کریں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ خود یہ رہائش گاہیں بھی معمولی نہیں ہیں بلکہ اس ملک میں شاید چند سو لوگ ہی ایسے ہوں جن کے پاس ایسی رہائش گاہیں موجود ہوں۔

۲۔ اگر بیرون ملک آپ کی اور آپ کے خاندان کی کوئی جائداد ہے تو اسے بھی بیچ کر رقم خود انحصاری فنڈ میں داخل کر دیں —— اور اگر کوئی سرمایہ وہاں جمع ہے تو اسے بھی واپس لا کر اسی فنڈ میں شامل کر دیں۔

۳۔ اپنے خاندان کے پاس صرف وہی انڈسٹریز رہنے دیں جن کے ذمہ کوئی قرض نہ ہو اور نہ صرف یہ کہ حساب بے باق ہو بلکہ دیگر جملہ معاملات بھی شیشے کی طرح صاف ہوں —— اور آئندہ اپنے کاروبار میں ہرگز کسی توسیع کی صورت اختیار نہ کریں۔

۴۔ اپنے تمام ساتھیوں اور دوستوں سے تو ظاہر ہے کہ آپ اس درجہ قربانی کا مطالبہ نہیں کر سکتے لیکن اب سب کے معاملات کو Transparent ہونا ضروری ہے۔ حال ہی میں ایک بہت بڑے منی چینجر اور سینیٹر سیف الرحمٰن صاحب کے بھائی کے جو معاملے زبان زد خواص و عوام ہو گئے ہیں ان سے آپ کی Credibility متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی!

میں نے آج سے بارہ تیرہ سال قبل جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے قمری حساب سے چالیس برس ہو گئے تھے "استحکام پاکستان" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی (اس کا بھی ایک نسخہ حاضر خدمت ہے!) جس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اب تک پاکستان کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو انگریزی دور میں پیدا ہونے کے ناتے غلامی کا داغ اٹھائے ہوئے تھے اب ان شاء اللہ پاکستان کی وہ نسل سامنے آئے گی جس نے دنیا میں پہلا سانس بھی آزادی کی فضا میں لیا ہے' لہٰذا اُمید ہے کہ اب حالات میں تبدیلی آئے گی۔

میری یہ اُمید فوری طور پر تو پوری نہ ہوئی لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پورے ہونے کا وقت آ گیا ہے ــــــ اب یہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے کہ یہ مرحلہ کس کے ہاتھوں سر ہوتا ہے! تاہم جو مقام اور مرتبہ آپ کو اور آپ کے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے فروری ۹۷ء کے عام انتخابات کے ذریعے عطا فرمایا ہے ــــــ اور جو مرتبہ و مقام پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے ایٹمی دھماکوں کے ذریعے عطا کر دیا ہے' ان کے پیش نظر آپ کی خدمت میں یہ گزارشات پیش کرنے کی جرات کر رہا ہوں۔ آگے

ع "فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے' دل یا شکم!"

میری پوری زندگی اس پر گواہ ہے کہ میں نے نہ کبھی امراء اور صاحب ثروت لوگوں کے گھروں پر حاضری دی ہے' نہ ہی سرکار دربار کے کبھی چکر لگائے ہیں' سوائے ۸۲ء کے ان دو ماہ کے جبکہ میں نے مرحوم ضیاء الحق صاحب کی دعوت پر ان کی شوریٰ میں شرکت اختیار کر لی تھی ــــــ تاہم اگر میرے اس عریضے کے بعد آپ کسی معاملے کی وضاحت کے لئے مجھے طلب فرمائیں تو جب بھی حکم دیں گے سر کے بل حاضر ہو جاؤں گا۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین!

فقط والسلام

ڈاکٹر اسرار احمد

LMI
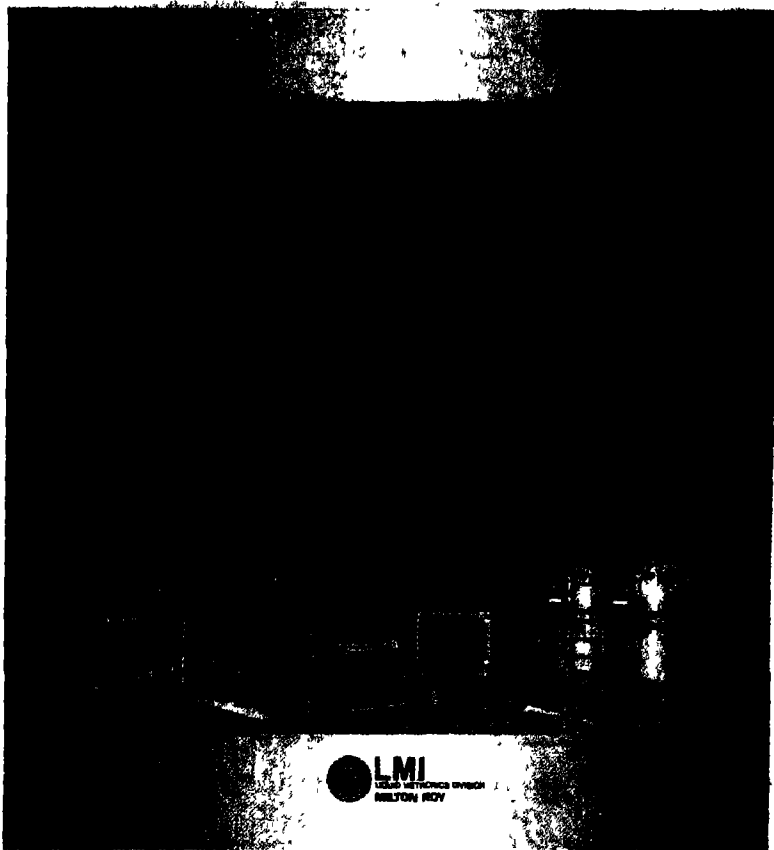
تصادم کا آخری مرحلہ
مسلح کشمکش
یعنی
قتال فی سبیل اللہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن)

ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے جا کر حضور ﷺ نے چھ ماہ داخلی استحکام میں لگائے اور اس کے بعد رمضان اھ میں مہمات بھیجنے کا اقدام فرمایا۔ غزوۂ بدر رمضان ۲ھ میں ہوا ہے۔ اس سے قبل ڈیڑھ سال کے اندر حضور ﷺ نے آٹھ مہمات بھیجی تھیں' جن میں ایک غزوۂ ذوالعشیرہ بہت اہم ہے اور دوسرا وادیِ نخلہ کا فیصلہ کن واقعہ۔ یہ دونوں واقعات غزوۂ بدر کا اصل سبب بنے ہیں۔ غزوۂ بدر سے حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا اندرون عرب آخری اور چھٹا مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed conflict) شروع ہوا ہے۔

مذکورہ بالا دو واقعات کی وجہ سے مکہ میں Hawks کی بن آئی اور ایک ہزار جنگجوؤں کا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکل کھڑا ہوا۔ ابو سفیان کی عدم موجودگی میں قریش کی سرداری عتبہ بن ربیعہ کے پاس تھی' لہٰذا اس لشکر کا سپہ سالار بھی وہی تھا۔ ابو جہل' اُمیہ بن خلف' نضر بن حارث' عقبہ بن ابی معیط' شیبہ بن عتبہ اور بہت سے وہ

لوگ جو اہل ایمان کے خون کے پیاسے تھے' سب کے سب نکلے۔ اس لشکر کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ سرداران قریش میں سے سوائے ابولہب کے اور کوئی پیچھے نہیں رہا۔ ابولہب بزدل انسان تھا۔ اس نے اپنی جگہ ایک Mercenary یعنی کرائے کا فوجی بھیج دیا کہ میری طرف سے یہ لڑے گا۔ اس شخص میں انسانیت کا کوئی جوہر نہیں تھا' وہ بخیل اور بزدل شخص تھا' اس کی اپنے معاشرہ کے اندر کوئی عزت نہیں تھی' لوگ اسے غزال زریں کا چور سمجھتے تھے۔ چونکہ یہ کعبہ کے بیت المال کا متولی تھا اور وہاں سے چڑھاوے کے طور پر آیا ہوا سونے کا ہرن چوری ہو گیا تھا تو یہ اس غزال زرین کا چور مشہور ہو گیا تھا۔ پس ابولہب کے سوا قریش کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں بچا کہ جس کے تمام سربر آوردہ لوگ اس لشکر میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ البتہ ابوسفیان رہ گئے تھے جو قافلہ کے ساتھ تھے۔ ان کو بھی ابوجہل نے پیغام بھیج دیا کہ اپنی نفری اور سازوسامان کے ساتھ ہم سے آ کر مل جاؤ۔ لیکن ابوسفیان دھیمے مزاج کے حقیقت پسند انسان تھے' محض جذباتی انسان نہیں تھے۔ انہوں نے دو احتیاطیں کیں۔ ایک طرف مدد کے لئے مکہ پیغام بھیج دیا' اور دوسری طرف جب ان کو معلوم ہوا کہ محمد ﷺ کچھ لوگوں کے ساتھ قافلہ کا قصد فرما رہے ہیں تو انہوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ چنانچہ وہ بدر کی طرف آئے ہی نہیں' بلکہ بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہو کر نکل گئے۔ انہیں ابوجہل کا پیغام مل بھی گیا تھا کہ لشکر کے ساتھ آکر شامل ہو جاؤ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ نہیں' میں براہ راست مکہ جا رہا ہوں۔

غزوۂ بدر سے قبل مشاورت

صحیح و معتبر ترین روایات کے مطابق مدینہ میں حضور ﷺ نے کسی جنگ کا اعلان کیا نہ تیاری فرمائی۔ بلکہ پیش نظر صرف یہ تھا کہ جو قافلہ آ رہا ہے اسے روکنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بغیر کسی خاص اہتمام اور تیاری کے نکل کھڑے ہوئے۔ یاد رہے کہ غزوۂ ذوالعشیرہ میں شامل ڈیڑھ سو افراد تمام مہاجرین ہی تھے' جبکہ غزوۂ بدر میں صرف ساٹھ یا تراسی (۸۳) مہاجرین ساتھ تھے۔ تعداد کے متعلق دونوں روایات موجود ہیں۔ اگر حضور ﷺ کے پیش نظر جنگ کا پروگرام ہوتا تو آپ خصوصی انتظام فرماتے اور تعداد

زیادہ ہوتی۔ پھر یہ پہلی بار ہوا کہ انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ساتھ نکلے' بلکہ تعداد میں وہ زیادہ تھے۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں بھی مشورہ کیا تھا اور پھر مدینہ کے باہر بھی ایک مجلس مشاورت منعقد فرمائی' لیکن مدینہ کی مشاورت میں جنگ کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا لہٰذا آپؐ نے کسی سے تاکیداً نہیں فرمایا کہ ساتھ چلو۔ انصارؓ بھی خود اپنی مرضی سے ساتھ ہو گئے تھے' حضورؐ کی طرف سے کوئی خصوصی ترغیب نہیں تھی۔

آپؐ جب مدینہ سے کچھ دور پہنچے تو آپؐ کو معلوم ہوا کہ مکہ سے ایک ہزار افراد پر مشتمل کیل کانٹے سے لیس لشکر سوئے مدینہ نکل پڑا ہے اور منزل پر منزل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اب یہ دو طرفہ معاملہ ہو گیا کہ شام کی طرف سے قافلہ آ رہا ہے اور جنوب سے لشکر چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اب یہاں مدینہ سے باہر مشاورت ہوئی جو اہم ترین مشاورت ہے۔ قرآن مجید ایسے معاملات کو عموماً اختصار سے بیان کرتا ہے' لہٰذا سورۃ الانفال کی آیات کے بین السطور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حضور ﷺ نے ازراہ مشورہ ہی یہ بات پیش کی ہو گی کہ "مسلمانو! ایک قافلہ شمال سے آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف تیس یا پچاس محافظ ہیں' مال تجارت بہت ہے' اور ایک لشکر جنوب سے آ رہا ہے جو کیل کانٹے سے لیس ہے' اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا وعدہ کر لیا ہے' بتاؤ کدھر چلیں؟ ان حالات میں کچھ لوگوں نے اپنی مخلصانہ سوچ کے مطابق تجویز کیا کہ حضورؐ قافلہ کی طرف چلئے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہو گی کہ قافلہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پچاس کی نفری ہے' وہ آسانی سے قابو میں آ جائیں گے' ساز و سامان تجارت بھی بہت ہاتھ لگے گا اور اسلحہ بھی' جو آئندہ جنگ میں کام آئے گا۔ لیکن حضور ﷺ جیسے کچھ منتظر سے تھے۔ تب لوگوں نے اندازہ کیا کہ منشائے مبارک کچھ اور ہے' حضور ﷺ کا اپنا رجحان طبع کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر مہاجرین نے تقریریں شروع کیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں' جو آپ کا ارادہ ہو' بسم اللہ کیجئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تقریر کی' لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی تقریر کی' لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے حضورؐ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ بھی مہاجرین

میں سے تھے' انہوں نے کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے کہ "حضورؐ جو آپؐ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجئے۔ ہمیں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجئے جنہوں نے اپنے نبی سے یہ کہہ دیا تھا کہ ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝﴾ (پس آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) آپؐ بسم اللہ کیجئے' ہم آپؐ کے ساتھ لڑیں گے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعہ آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے"۔ لیکن حضور ﷺ پھر بھی کچھ انتظار کی کیفیت میں تھے۔

اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خیال آیا کہ حضورؐ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ کون سے سعدؓ ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کا قول یہی ہے۔ ایک روایت ہے کہ یہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ میرا رجحان غالب یہی ہے کہ یہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ انصارؓ کے دو قبیلے تھے' خزرج اور اوس ـــــ خزرج کا قبیلہ تعداد میں اوس سے تین گنا تھا اور اس کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ خزرج ہی کی ایک شاخ کا سردار تھا عبداللہ بن اُبی' جو منافق اعظم تھا' اور پورے قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ چنانچہ سردار کی طرف سے کسی رائے کا اظہار گویا پورے قبیلہ کی طرف سے اظہارِ رائے کے مترادف تھا۔ اَوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ بہرحال ان دونوں میں سے کسی نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ "حضورؐ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے...." اس خیال کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ حضورؐ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ (یثرب) تشریف لانے کی جو دعوت قبول کی تھی تو اس میں یہ طے ہوا تھا کہ "اگر قریش مدینہ پر حملہ کریں گے تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں"۔ گویا انصار اس معاہدہ کی رُو سے اس کے پابند نہیں تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ قافلہ کا راستہ روکنا اور بات ہے اور باقاعدہ ایک لشکر جرار سے جا ٹکرانا یہ بالکل دوسری بات ہے۔ حضرت سعدؓ کو فوراً خیال آ گیا کہ ہو نہ ہو حضور ﷺ ہماری تائید کے منتظر ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے اپنی تقریر میں کہا :

"اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ" یعنی حضورؐ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپؐ کی

تصدیق کی ہے' ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ (اُس وقت معاہدے میں کیا طے ہوا تھا' کیا نہیں ہوا تھا اِس وقت وہ بات غیر متعلق ہے) آپؐ جو بھی حکم دیں گے سر آنکھوں پر سِرْ بِنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ.. "اے اللہ کے رسول (ﷺ) لے چلئے ہم کو جہاں بھی لے جانا ہو۔ خدا کی قسم اگر آپؐ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں ڈال دیں گے۔ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو یمن کے آخری کونے کا شہر ہے) اور اس کے لئے ہم اپنی سواریوں کو دبلا کر دیں گے۔"
حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک کھل اٹھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس جماعت میں حضور ﷺ کی بیعت ثانوی چیز تھی۔ اس کی اصل بنیاد تو یہ تھی کہ جو آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کی تصدیق کرے وہ اس جماعت میں شامل ہے۔ جس نے بھی آپؐ کو اللہ کا رسول مانا ہے اُس پر آپؐ کی اطاعت لازم ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا○﴾ (النساء: ٦٥) "سو تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں پھر تیرے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کریں"۔ ایمان کہاں رہ جائے گا اگر حضورؐ کا حکم نہ مانیں؟ لہٰذا اُس وقت حضرت سعد بن عبادہ یا حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہما) نے بڑی پیاری' بڑی بنیادی اور اصولی بات کہی تھی کہ: "اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ" اس بات سے حضور ﷺ کا چہرۂ انور کھل اُٹھا۔ گویا آپؐ انصار کی رائے معلوم کرنے کے منتظر تھے۔

اِس مشاورت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے پیش قدمی فرمائی اور پھر بدر پہنچ کر جب معلوم ہو گیا کہ قریش کا لشکر وادی کے دوسرے سرے تک پہنچ چکا ہے تو وہاں آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کے لئے فرمایا۔ وہاں کا ایک واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض تجربہ کار حضرات نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر یہاں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ وحی کی بنا پر ہے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' لیکن اگر یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ جنگی مہارت اور حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اِس مقام

کے بجائے دوسرے مقام پر کیمپ ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ نے ان حضرات کی رائے کو قبول فرمایا۔ جہاں تک خالص دُنیوی امور کی تدابیر اور تجرباتی علوم کا تعلق ہے' جس طرح تابیر النخل کا معاملہ تھا' تو ان میں آپؐ نے ہمیشہ ہمیش کے لئے امت کے لئے یہ ہدایت و تعلیم دے دی ہے کہ "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ" یعنی اپنے دنیوی معاملات میں تم بہتر جانتے ہو۔ پھر نبی اکرم ﷺ کا مزاج ہی ایسا تھا کہ آپؐ دنیوی تدابیر کے معاملہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودنے کا فیصلہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر فرمایا تھا۔

حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ کی آخری کوشش

جنگ سے ایک رات قبل خبر پہنچ گئی کہ ابو سفیان کا قافلہ بچ کر نکل گیا ہے۔ اب مکہ میں چہ میگوئی شروع ہوئی کہ اب جنگ کا کیا فائدہ ہے؟ ہم تو اپنے قافلہ کی حفاظت کے لئے آئے تھے۔ اس صورت حال سے Hawks کے مقابلہ میں Doves کے ہاتھ میں پھر ایک دلیل آگئی کہ ہمارا مقصد تو قافلہ کی حفاظت تھا' قافلہ بچ کر نکل گیا' پھر جنگ کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ قریش کے دو گھرانے بنو زہرہ اور بنو عدی یہ کہہ کر لشکر کو چھوڑ کر چلے گئے کہ اب ہمیں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ حکیم بن حزام عتبہ کے پاس گئے جو اِس لشکر کا سپہ سالار تھا اور اس سے کہا: عتبہ! تم اِس وقت نیکی کا ایک ایسا کام کر سکتے ہو کہ تاریخ میں تمہارا نام لکھا جائے کہ تم نے بہت بڑا کام کیا۔ عتبہ کے استفسار پر انہوں نے وہی تجویز رکھی کہ ہمارا قافلہ بچ کر نکل چکا ہے' اب اس ہونے والی خونریزی کو تم روک سکتے ہو۔ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ حرب بن امیہ کا حلیف تھا۔ اگر تم اس کی دیت یا خون بہا ادا کر دو تو وہ مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ قافلہ بچ کر نکل ہی چکا ہے۔ اس طرح جنگ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ عتبہ بن ربیعہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ بہت مناسب تجویز ہے۔ وہ خود اسی مزاج کا آدمی تھا۔ لیکن وہ جو Hawks کا سرغنہ ابو جہل موجود تھا' فی الاصل تو اس کو سمجھانا مقصود تھا۔ چنانچہ دونوں اس کے پاس گئے اور اسے قائل

کرنے کی کوشش کی۔ عتبہ نے کہا کہ دیکھو خونریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ہمارا قافلہ بچ کر چلا گیا ہے' عمرو کا خون بہا میں ادا کر دیتا ہوں۔ اب ابو جہل کی چالاکی دیکھئے۔ اس نے ایک تو عتبہ کو بزدلی کا طعنہ دیا اور کہا کہ تم اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر گھبرا گئے ہو (یاد رہے کہ عتبہ کے بڑے بیٹے حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے' جو سابقون الاولون میں سے تھے' جبکہ عتبہ کا دوسرا بیٹا اس کے ساتھ تھا)۔ ابو جہل نے مزید نمک پاشی کرتے ہوئے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ محبت پدری تمہیں بزدل بنا رہی ہے کہ بیٹا مدمقابل ہے' اسی لئے تم جنگ ٹالنا چاہتے ہو۔ اس کا عتبہ نے وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر ایک باغیرت و باحمیت انسان کو دینا چاہئے۔ اُس نے کہا کل کا دن بتا دے گا کہ بزدل کون ہے!۔ وہ اس طعنہ کو برداشت نہیں کر سکا۔

ابو جہل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کے بھائی کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو ہم تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ کل لے سکتے ہیں' لیکن یہ صلح پسند لوگ آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو۔ اُس شخص نے عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنے کپڑے پھاڑے' بالکل عریاں ہو گیا اور شور مچا دیا: واعمرواہ' واعمرواہ۔ اسے قبائلی زندگی میں Blood Cry (خونی چیخ) کہتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ مشتعل کرنے والا نعرہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے لشکر میں آگ سی لگ گئی۔ الغرض مشرکین کے کیمپ میں آخری رات تک یہ کشمکش جاری رہی۔ لیکن بالآخر فیصلہ ہو گیا کہ بہر صورت کل جنگ ہو گی۔ چنانچہ دوسرے دن جنگ ہوئی۔

مشرکین کی دُعائیں

مشرکین مکہ میں سے دو اشخاص کی غزوۂ بدر شروع ہونے سے متصلاً قبل رات کی دُعائیں کتب تاریخ میں نقل ہوئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی شب کو دُعا کی۔ مشرکین میں سے ایک ابو جہل اور دوسرے نضر بن حارث کی دُعا تاریخ میں منقول ہوئی ہے۔ وہ دونوں مشرک تھے' اللہ کے منکر نہیں تھے۔ قرآن میں بار بار آتا ہے کہ جب تم پر کوئی مشکل وقت آپڑتا ہے تو تم اپنی دیویوں اور من گھڑت معبودوں کو بھول جاتے ہو اور

صرف اللہ کو پکارتے ہو۔ یہ دلیل آپ کو قرآن میں متعدد بار مل جائے گی۔ چنانچہ ابو جہل کی غزوۂ بدر کی رات کی دُعا منقول ہے : "اَللّٰھُمَّ اَقْطَعُنَا لِلرَّحِمِ وَ اَتَانَا بِمَا لَا نَعْرِفُ فَاَحِنْهُ الْغَدَاۃَ" یعنی "اے اللہ (محمدؐ) ہم میں سب سے زیادہ رحمی رشتے کاٹنے والا ہے' اور ایسی چیز لے آیا ہے جس سے ہم واقف ہی نہیں ہیں۔ پس کل تو اسے ہلاک کر دیجو!" یہ اس شخص کی پکار ہے جس کی گھٹی میں قوم پرستی' نسل پرستی' قبائل پرستی پڑی ہوئی تھی۔ جناب محمد ﷺ کے خلاف قریش کا سب سے بڑا الزام یہی تھا کہ انہوںؐ نے آکر اپنی دعوت و تبلیغ کی بدولت ہمیں تقسیم کر دیا' ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا' بھائیوں کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا' ہماری جو قوت تھی وہ اس طور پر پراگندہ ہو گئی' ہمارے رحمی رشتے محمدؐ نے منقطع کر دیئے۔

اور نضر بن حارث کی جو دُعا منقول ہوئی ہے اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کی شخصیتیں اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں اور جن کی سوچ اس قدر غلط ہو چکی تھی کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم محمدؐ (ﷺ) کے ساتھیوں سے بہتر جماعت ہیں۔ اس کی دُعا منقول ہوئی ہے کہ : "اَللّٰھُمَّ انْصُرْ خَیْرَ الْحِزْبَیْنِ" یعنی یہ جو دو حزب بالمقابل آ گئے ہیں' اے اللہ! ان میں سے بہتر جماعت کی مدد فرمائیو۔ غور کیجئے اس مشکل گھڑی میں دونوں اَللّٰھُمَّ کہہ رہے ہیں۔

غزوۂ بدر کے موقع پر آنحضور ﷺ کی دُعا

دوسری طرف اسی رات کو حزب اللہ کے لشکر میں گھاس پھونس کی اس جھونپڑی میں جو آپؐ کے لئے بنائی گئی تھی' رحمۃٌ للعالمین' خاتم النبیّین' سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے طویل ترین سجدہ کیا' جس میں طویل ترین دُعا کی۔ اس دُعا میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اے اللہ! کل اگر یہ لوگ یہاں شہید ہو گئے تو پھر قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اور تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا' اب اس کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ حضور ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا؟ اس لئے کہ آپؐ آخری نبی اور رسول ہیں اور آپؐ کے بعد تاقیامِ قیامت کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے بارگاہ رب العزت میں

مزید عرض کیا: بارِ الٰہا! میں نے اپنی چودہ برس کی کمائی میدان میں لا کر ڈال دی ہے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تلوار لئے پہرے پر کھڑے تھے جس وقت حضورؐ سر بسجود تھے۔ (۱) جب حضرت ابو بکرؓ نے یہ الفاظ سنے تو انہوں نے عرض کیا: "حسبُک حسبُک یارسول اللّٰہ" اے اللہ کے رسول! بس کیجئے' بس کیجئے' یقیناً اللہ آپؐ کی مدد فرمائے گا۔ اس پر حضور ﷺ نے سر مبارک اٹھایا اور زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾ "گویا اللہ کی طرف سے خوشخبری تھی کہ "اس جمعیت کو شکست ہو کر رہے گی اور یہ پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے۔"

سیرتِ نبویؐ سے متعلق بعض اہم نکات

بہرحال اس غزوۂ بدر سے انقلابِ نبویؐ کا چھٹا اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ Active Resistance کے مرحلہ میں اقدام حضور ﷺ کی جانب سے ہوا۔ لیکن پہلی باقاعدہ جنگ جو ہوئی ہے وہ غزوۂ بدر ہے۔ اس معاملہ میں اس بحث میں پڑنے کی بجائے کہ جنگ کس نے شروع کی' کس نے نہیں کی' آیا اسلام میں صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے یا جارحانہ جنگ یعنی خود حملہ میں پہل کرنا بھی درست ہے' غور طلب بات یہ ہے کہ جناب محمد ﷺ باطل کا قلع قمع کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے یا باطل کو Acknowledge اور تسلیم کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے؟ حق کبھی باطل کو تسلیم اور برداشت کر سکتا ہے؟ اس کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے کہ حق کے نام لیوا بے حمیت اور بے غیرت ہو گئے ہوں' ان کو زندگی زیادہ عزیز ہو گئی ہو تو وہ حق کو مغلوب دیکھ سکتے ہیں۔ ورنہ غیور' باحمیت' حق

---

(۱) اس موقع پر ایک بات یاد آ گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آنجنابؓ کے فرزندگان میں سے کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں سب سے زیادہ شجاع' دلیر اور بہادر کون تھا؟ —— سوالی کا خیال تھا کہ آنجنابؓ اپنا نام لیں گے۔ لیکن حضرت علیؓ نے جواب دیا وہ شخص کہ جس کو نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ بدر سے پہلے والی شب کو اپنی جھونپڑی پر پہرے کے لئے معین فرمایا تھا' یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ (مرتب)

کے ماننے والے اور حق کے علمبردار' باطل کا وجود کبھی گوارا نہیں کر سکتے! حق کے پاس اگر طاقت ہو تو وہ یقیناً جارح ہو گا۔ صرف ایک فرق ذہن میں رکھیے۔ کسی فرد (individual) کو نہ کبھی پہلے اپنا دین بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے' نہ آئندہ کیا جائے گا۔ اس کے لئے قرآن حکیم کی نص موجود ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ "دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے۔ بیشک ہدایت کی راہ گمراہی سے جدا ہو کر روشن اور واضح ہو چکی ہے"۔ لیکن باطل کا غلبہ گوارا نہیں کیا جائے گا۔ ملک میں تشریعی نظام (Law of the Land) بہر صورت اللہ کا قائم و نافذ ہو گا: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلاَّ لِلّٰهِ﴾۔ اگر اہل حق میں کوئی غیرت و حمیت ہے تو وہ حق کا بول بالا کرنے' اسے غالب کرنے اور باطل کو مٹانے' اسے سرنگوں کرنے کی جدوجہد کے لئے تن' من' دھن سب کچھ لگا دیں گے۔ اس راہ میں جان دینے اور سر کٹانے سے زیادہ دنیا میں ان کو کوئی شے محبوب نہیں ہو گی۔ اقبال نے بڑا پیارا شعر کہا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

یعنی باطل تو یہ چاہے گا کہ یہ صورت برقرار رہے کہ دو متضاد فکری نظام پُر امن طریق پر پہلو بہ پہلو رہیں۔ اس لئے کہ اسے تو اس طرح اپنے وجود اور بقاء کی ضمانت (Lease of Existance) ملتی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ حق و باطل کے مابین Peaceful co-existance خود باطل ہے۔ حق اسے کیسے گوارا کر لے گا؟ ــــــ چنانچہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مکہ میں بھی تصادم کا آغاز جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے کیا جب آپؐ نے یہ نعرہ لگایا: لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ ــــــ جس نے ان کے عقائد کی نفی' ان کے نظام کی نفی' ان کے رسم و رواج کی نفی' ان کے رذائل اخلاق کی نفی' ان کے معاشرتی نظام کی نفی' معاشرتی اونچ نیچ کی نفی' نسل پرستی کی نفی' آباء پرستی کی نفی' ہوائے نفس کی نفی کر دی۔ یوں سمجھئے کہ اس کلمۂ توحید کی زد سے باطل نظریات کا کوئی پہلو اور گوشہ نہیں بچ سکتا' اور ہر چیز کی نفی اس کلمہ میں موجود ہے۔

ہجرت کے بعد اقدامات بھی حضور اکرم ﷺ نے کئے۔ وادیٔ نخلہ جیسے دور دراز

مقام پر مہم بھیجی۔ ابو سفیان کا قافلہ جا رہا تھا تب بھی اس میں خلل اندازی کرنے کے لئے حضورؐ بنفس نفیس ڈیڑھ سو مہاجرین کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکلے۔ مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ ابو سفیان کا قافلہ جب واپس آ رہا تھا تو ایسے ہی خبر اُڑ گئی کہ حضورؐ شاید اس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دو تین مہینے پہلے خود محمد ﷺ اس قافلے کو intercept کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ وہ تو ایک دن رات کا فصل پڑ گیا کہ قافلہ بچ کر نکل گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ شبلی مرحوم نے غزوۂ ذوالعشیرہ کا ذکر تک نہیں کیا اور واقعہ نخلہ کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہمارے سیرت نگاروں نے خواہ مخواہ ایسی باتیں لکھ دی ہیں ـــــ میرے نزدیک شبلی مرحوم ہمدردی کے لائق ہیں۔ اس لئے کہ ان کا دور انگریز کا دور تھا جب مستشرقین کی طرف سے اسلام پر پے بہ پے حملے ہو رہے تھے اور کہا جا رہا تھا کہ ع "بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!" لہٰذا انہوں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ وادیٔ نخلہ کا واقعہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس واقعے نے مکہ میں جوشِ انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔

فرار نہیں ہجرت!

ایک اور غلط فہمی بھی دُور ہو جانی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ مکہ سے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ جان بچا کر نہیں بھاگے تھے۔ جس کسی کا بھی یہ تصور ہو وہ اس کی اصلاح کر لے۔ ہمارے کچھ تجدد پسند دانشور مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہو کر ایسا تصور رکھتے ہیں۔ یہ حضرات ہجرت کے واقعہ کا ذکر Flight to Madinah یعنی "مدینہ کی طرف فرار" کے الفاظ سے کرتے ہیں' وہ اسے ہجرت نہیں کہتے۔ ہجرت اور فرار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق اس تصور کا ذرا سا شائبہ بھی کسی کے ذہن میں ہو تو وہ اسے کھرچ دے' ورنہ وہ اپنے ایمان کی خیر منائے۔ یہ بالکل ویسے ہے جیسے سورۃ الانفال میں آیا ہے کہ جنگ میں پیٹھ دکھا دینا بہت بڑا جرم اور ناقابل معافی گناہ ہے' سوائے اس کے کہ پینترا بدلنا ہو' یا یہ کہ پیچھے جو نفری ہے اس تک پہنچ کر پھر حملہ کرنا مقصود ہو۔ تو

ہجرت در حقیقت باطل کے خلاف پینترا بدلنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک متبادل مرکز (Alternate Base) کی حیثیت سے پہلے طائف کا انتخاب کیا تھا' لیکن طائف والوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خوش قسمتی اور سعادت یثرب کے لئے رکھی تھی' چنانچہ اہل یثرب چل کر گئے اور جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دے آئے' بلکہ اس کی منظوری لے آئے۔ اب حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس گھڑی کی اجازت ملنے کا انتظار تھا جس گھڑی ہجرت کرنا تھی۔ جوں ہی اجازت آئی حضور ﷺ عازم ہجرت ہوئے اور سوئے یثرب کوچ فرمایا۔ لیکن حضور ﷺ یہاں کھجوروں کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام فرمانے نہیں آئے تھے' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

ٹھنڈی چھاؤں سب کو پسند آتی ہے' لیکن حضور ﷺ تو غزوۂ بدر سے پہلے بنفس نفیس چار مہموں میں تشریف لے گئے۔ حضورؐ نے تو ٹھنڈی چھاؤں میں آرام نہیں کیا۔ ابتدائی چھ مہینے ایسے ضرور ہیں جس میں حضور ﷺ نہ خود کسی غزوے کے لئے تشریف لے گئے نہ کوئی سریہ بھیجا' لیکن یہ چھ ماہ حضور ﷺ نے داخلی استحکام میں صرف فرمائے۔ اقامت صلوٰۃ اور اجتماعات مسلمین کے لئے مسجد نبویؐ کی تعمیر کی' انصار و مہاجرین میں مواخات قائم فرمائی اور آس پاس کے قبائل سے معاہدے کئے۔ ان کاموں کو سنبھالنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فوراً اقدامات کا آغاز فرما دیا۔ تو یہ ہے اقدام (Active Resistance) جس کا آغاز نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہوا' جس کے نتیجہ میں آخری اور چھٹے مرحلے یعنی مسلح تصادم کا جو سلسلہ شروع ہوا غزوۂ بدر اس کا آغاز ہے۔ یوم البدر ۱۷/ رمضان المبارک ۲ھ ہے۔

ابو جہل سے ایک بات اور بھی منسوب ہے کہ اس نے دعاء کی تھی کہ "اے اللہ! اس جنگ کو یوم الفرقان بنا دے" اور اللہ تعالیٰ نے اس دن کو واقعتاً حق و باطل میں امتیاز کرنے والا دن بنا دیا اور سورۃ الانفال میں اس کو یوم الفرقان ہی قرار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ

ہجرت اور غزوۂ بدر ہی دین اللہ کے بالفعل غلبہ کی تمہید بنے۔

غزوۂ بدر کا معرکۂ کارزار

اس خبر کے بعد کہ ابوسفیان کا قافلہ خیروعافیت سے نکل پہنچ گیا ہے' عتبہ بن ربیعہ نے حکیم بن حزام کی تجویز پر یہ کوشش کی تھی کہ جنگ ٹل جائے' اس پر ابوجہل نے اسے طعنہ دیا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو مدمقابل دیکھ کر تمہاری ہمت جواب دے رہی ہے اور محبت پدری سے مغلوب ہو کر تم یہ تجویز لے کر آئے ہو کہ جنگ نہ ہو۔ یہ ایسا طعنہ تھا جو عتبہ کو گھائل کر گیا اور اس طرح صلح جو لوگوں (Doves) کی جانب سے جنگ کو ٹالنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ چنانچہ اگلی صبح جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو لے کر نکلا اور مبارزت طلب کی۔ اہل ایمان کے لشکر سے تین انصاری صحابی رضی اللہ عنہم مقابلہ کے لئے نکلے۔ عتبہ نے چیخ کر پوچھا : "مَن انتم؟ مَنِ القوم؟" ——— انہوں نے اپنے نام بتائے۔ عتبہ نے کہا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو' ہم تم سے لڑنے نہیں آئے۔ پھر چیخ کر پکارا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری توہین نہ کرو' ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لئے انہیں بھیجو جو ہمارے برابر کے ہیں' جو ہمارے مدمقابل ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر باپ کے مقابلہ میں بیٹا یعنی عتبہ کے مقابلے میں حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے نکلنا چاہا' لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روک دیا۔ پھر حضرت حمزہ' حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب' تین صحابی رضی اللہ عنہم مقابلہ کے لئے نکلے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو جلد ہی واصل جہنم کر دیا' لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا ولید بن عتبہ سے شدید مقابلہ ہوا۔ دونوں کا بیک وقت ایک دوسرے پر کاری وار ہوا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ گر پڑے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے' ولید کو ختم کیا اور حضرت عبیدہ کو جو جاں بلب تھے' اٹھا کر لے آئے۔ انہوںؓ نے کہا مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لے چلو۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے متعلق فرمائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہیں یقیناً جنت ملے گی" تو ان

کے چہرہ پر بشاشت آئی اور ان کی زبان سے نکلا کاش! آج ابو طالب زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ میں نے ان کی بات سچ کر دکھائی ہے کہ اپنی جان حضورؐ پر نچھاور کر دی ہے۔ بات یہ تھی کہ جب مشرکین مکّہ کا جناب ابو طالب پر شدید دباؤ پڑتا تھا کہ تم اور بنو ہاشم محمدؐ (ﷺ) کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ تاکہ ہم ان سے نمٹ لیں یعنی (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کو قتل کر دیں تو عام طور پر جناب ابو طالب اُس وقت ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ : "تم محمدؐ (ﷺ) پر اس وقت تک قابو نہیں پاسکو گے جب تک انؐ کی حفاظت میں ہمارا بچہ بچہ کٹ کر مر نہ چکے گا۔"

حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتقال میدان بدر میں نہیں ہوا بلکہ فتح کے بعد جب اسلامی لشکر مدینہ منورہ واپس جا رہا تھا تو راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی قبر میدان بدر سے آگے مدینہ منورہ کے راستے میں ہے۔

بہرحال ۱۷/ رمضان المبارک سن دو ہجری میں میدان بدر میں باقاعدہ اور ذو بدو جنگ کی صورت میں اندرون عرب انقلاب محمدیؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے چھٹے اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا آغاز ہو گیا۔ اس غزوہ میں قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے ابو سفیان اور ابولہب کے علاوہ باقی قریباً تمام ہی کھیت رہے۔ واضح رہے کہ ابو سفیان چونکہ تجارتی قافلے کے ہمراہ تھے 'لہٰذا وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ابولہب بھی جنگ میں شریک نہیں تھا اور اُس نے اپنی جگہ کرائے کا فوجی بھیج دیا تھا۔ قریش کے کل ستر سربرآوردہ لوگ مقتول ہوئے۔ ابو جہل مارا گیا۔ عتبہ بن ربیعہ 'اُس کا بھائی اور بیٹا قتل ہوئے۔ اسی طرح نضر بن حارث ' امیہ بن خلف ' عقبہ بن اُبی معیط جیسے مشرکین جو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خون کے پیاسے تھے 'گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے گئے۔

سُنّت اللہ کا ظہور

غزوۂ بدر میں مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں قریش کی شرمناک ہزیمت اور ان کے ستر(۷۰) سربرآوردہ لوگوں کا کھیت رہنا اصل میں یہ عذاب الٰہی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ

رہی ہے کہ جب وہ کسی قوم یا ملک کی طرف کسی رسول کو بھیجتا اور وہ قوم انکار پر اس درجہ آڑ جاتی تھی کہ رسول کی جان لینے کے درپے ہو جائے' یہاں تک کہ رسول کو وہاں سے ہجرت کرنی پڑے' تو رسول اور ان کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد اس قوم پر عذاب کا آنا لازم ہوتا تھا۔ رسول اور ان کے اصحاب کو بچا لیا جاتا تھا اور پوری قوم ہلاک کر دی جاتی تھی۔

البتہ عذاب الٰہی کی صورتیں اور نوعیتیں مختلف رہی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ پوری قوم کو ایک عظیم طوفان باد و باراں کے ذریعہ غرق کر دیا گیا۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ معاملہ ہوا اور کہیں ایسا ہوا کہ پوری کی پوری قوم کو ان کی بستیوں کے اندر ہی ختم کر دیا گیا جیسے قوم لوط' قوم عاد اور قوم ثمود کی بستیاں : ﴿تُدَمِّرُ کُلَّ شَیْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُهُمْ﴾ کہیں ایسا ہوا کہ اہل تمرد کو زمین میں دھنسا دیا گیا جیسے قارون کے ساتھ معاملہ ہوا' اور کہیں ایسا بھی ہوا کہ کفار و مکذبین کے سربر آوردہ اور چیدہ چیدہ لوگوں کو ان کی بستیوں سے باہر نکالا گیا اور ان کو عذاب الٰہی نے ملیا میٹ کر دیا' جیسے آل فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکالا گیا اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ سورۃ العنکبوت میں ان چاروں انواع کے عذاب کا ذکر بایں الفاظ فرمایا گیا ہے :

﴿فَکُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ' فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا' وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ' وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ' وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا﴾

"آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی' اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا' اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا' اور کسی کو غرق کر دیا...."

آل فرعون کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس سے ملتا جلتا معاملہ قریش مکہ کے ساتھ کیا گیا۔ یہاں اسی سنت اللہ کا ظہور ہمیں صرف اس فرق کے ساتھ ملتا ہے کہ آل فرعون کو تو سمندر میں غرق کر دیا گیا لیکن قریش کے جو نامی گرامی سردار نبی اکرم ﷺ کو ایذا پہنچاتے

رہے تھے' جو حضور ﷺ کے خون کے پیاسے تھے' جو توحید کی انقلابی دعوت کے شدید مخالف تھے' ان سب کو میدان بدر میں کھینچ لایا گیا اور انہیں اہل ایمان کے ہاتھوں قتل کرا دیا گیا۔ اسی سنت اللہ کی جانب اشارہ سورۃ الانفال کی آیت ۱۷ کے آغاز میں ہے کہ ﴿فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ﴾ "(اے مسلمانو!) تم نے ان (مشرکین مکہ) کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے۔"

ابولہب میدان میں نہیں آیا تھا' لیکن عذاب الٰہی سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے کچھ ہی دنوں بعد وہ مکہ کے اندر ہی پلیگ جیسی کسی بیماری میں مبتلا ہو کر نہایت عبرت ناک موت سے دوچار ہوا۔ اس کا تمام جسم سڑ گیا تھا اور اس میں شدید تعفن پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے بھی اس کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ اس کی نعش کو لکڑیوں سے دھکیل دھکیل کر ایک گڑھے میں دفن کر دیا۔

پس دراصل غزوۂ بدر میں صنادید مشرکین کی ہلاکت اس سنت اللہ کے مطابق دُنیوی عذابِ الٰہی تھا جو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی تکذیب اور ان کو دیس سے نکلنے پر مجبور کرنے والے کفار و مکذبین کے لئے طے کر رکھا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تیرہ حضرات نے میدان بدر میں جام شہادت نوش فرمایا' اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ جو زخمی تھے' واپسی کے سفر میں اثنائے راہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے چودہ افراد نے اپنے رب کے حضور جان کا نذرانہ پیش کر دیا' جبکہ کفار و مشرکین کے ستر صنادید خاک و خون میں مبتلا ہو کر واصل جہنم ہوئے۔ مزید یہ کہ ستر مشرکین کو اہل ایمان نے قید کر لیا۔

غزوۂ بدر کے اثرات

غزوۂ بدر کے نتیجہ میں پورے عرب میں' خاص طور پر بدر کے قریب کے علاقہ پر اہل ایمان کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور اس طرح اس غزوہ میں فتح و کامرانی کی بدولت دعوت توحید اور اسلامی تحریک کی انقلابی جدوجہد کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ پورے عرب میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر جناب محمد

ﷺ کے تین سو تیرہ قریباً نہتے اور بے سرو سامان ساتھیوں سے شکست کھا گیا ــــــ یہ نفوس قدسی جنگ کے ارادے سے تو نکلے ہی نہیں تھے' یہ تو اولاً صرف ابو سفیان کے قافلہ کا راستہ روکنے کے لئے نکلے تھے۔ مدینہ سے روانگی کے وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک ہزار کے مسلح لشکر سے مڈ بھیڑ ہو جائے گی ــــــ سیرت نبویؐ پر جناب محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ کے صاحبزادے شیخ عبد اللہ کی تالیف "مختصر سیرة الرسول ﷺ" میں یہ واقعہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت صرف اس قافلہ پر یورش کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا جو مال تجارت لے کر شام سے واپس آ رہا تھا' لہٰذا کوئی نفیر عام نہیں تھی' کوئی اعلان جنگ نہیں تھا۔ قافلہ کے ساتھ محافظوں کی تعداد کا اندازہ کر کے حضور ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ یہ تو مدینہ سے باہر نکل کر حضور ﷺ کو خبر ملی کہ قافلہ پر مسلمانوں کی یورش کے ارادہ کی خبر قریش کو مل چکی ہے اور قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ خبر ملنے کے بعد حضور ﷺ نے مشورہ فرمایا کہ قافلہ کی طرف چلیں یا لشکر کی طرف! اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن حضرات نے قافلہ کی طرف چلنے کا مشورہ دیا تھا تو اصل میں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم جنگ کے لئے تو تیار ہو کر نکلے ہی نہیں' نہ ہم نے اس اعتبار سے اپنی نفری بنائی ہے اور نہ ہی اس کے لئے ساز و سامان ساتھ لیا ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ غزوۂ ذوالعشیرہ میں ڈیڑھ سو مہاجرینؓ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے' جبکہ غزوۂ بدر کے موقع پر صرف تریسٹھ یا تراسی مہاجرین حضور ﷺ کے ہمراہ تھے۔ گویا مہاجرین کی نفری بھی پوری نہیں تھی۔ لہٰذا یہ رائے نہ تو بزدلی کی بنیاد پر تھی اور نہ منافقت کی بنیاد پر' بلکہ جو بھی احوال و اسباب تھے ان کی بنیاد پر صحیح تھی کہ ہم اس ارادہ سے نہیں نکلے' لہٰذا قافلہ کی طرف چلنا بہتر اور مناسب ہو گا۔ لیکن حضور ﷺ کا منشا کچھ اور تھا۔ حضور ﷺ اللہ کی مشیت کے مطابق چاہتے تھے کہ فیصلہ ہو جائے : ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ "کہ جو مرے وہ دلیل کے ساتھ مرے اور جو جئے وہ دلیل کے ساتھ جئے۔"

اب عالم عرب میں جب یہ خبر پہنچی کہ قریش کی ایک ہزار کی جمعیت تین سو تیرہ

مسلمانوں سے شکست کھائی اور غزوۂ بدر کے میدان میں ان کے ستر بڑے بڑے سورما کھیت رہے تو عالم عرب میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ غزوۂ بدر میں سرداران قریش کے جسم اس طرح کٹ کر گرے ہوئے تھے جس طرح سورۃ الحاقہ میں قوم عاد کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ﴿فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ۝﴾ یعنی مشرکین مکہ میدان بدر میں ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے۔ ابوجہل میں ابھی جان باقی تھی جب نبی اکرم ﷺ نے پاس آکر اس کی گردن پر اپنا پاؤں مبارک رکھا اور فرمایا: ((هٰذَا فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ)) "یہ شخص اس اُمت کا فرعون ہے۔" پس اس فتح سے اہل ایمان کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ایک طرف ان کا حوصلہ (Morale) بہت بلند ہوا تو دوسری طرف تمام عرب پر مسلمانوں کی ہیبت اور رعب پڑ گیا۔ لہٰذا غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں کے تیرہ ماہ شادمانی اور مسرت کے گزرے اور اس دوران اسلام کی دعوت کے اثرات میں وسعت پیدا ہوئی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اب کچھ کچے اور ضعف ارادہ کے حامل لوگ بھی آکر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ اس سے پہلے تک تو معاملہ یہ تھا کہ جو آتا تھا وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دعوت اسلام قبول کرنے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہو جائیں گی اور اسے کن کن خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسے ہر لمحہ جان ہتھیلی پر رکھنی ہوگی' اس راہ میں مشکلات کے پہاڑ آئیں گے' مصائب و شدائد سے سابقہ پیش آئے گا۔ لیکن بدر کی فتح سے جب صورت حال بدل گئی تو کچھ کچے اور ناپختہ لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ۝۝

دُعا کی اہمیت و فضیلت

—— کرنل (ر) محمد یونس ——

انسان اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے' اس دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اگر وہ ہمیں زندہ نہ رکھے تو ہم ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا اس کی بندگی و عبادت کی تاکید اس لئے نہیں کی جاتی کہ اللہ کو اس کی احتیاج ہے' بلکہ اس لئے کہ اسی پر ہماری دنیوی اور اخروی کامیابی کا انحصار ہے۔ چنانچہ سورۂ فاطر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۝﴾

"لوگو' تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو بے نیاز اور بڑی خوبیوں والا ہے۔"

یعنی اللہ ہر چیز کا مالک ہے' ہر ایک سے مستغنی اور بے نیاز ہے' کسی کی مدد کا محتاج نہیں' آپ سے آپ محمود اور اپنی ذات میں کامل ہے' کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے' بہر حال حمد و شکر اور تعریف کا استحقاق اسی کو پہنچتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ اس کا تعلق تمام تر اس کی عنایت اور رحمت پر مبنی ہے۔ تمام بنی نوع انسان مجموعۂ حاجات ہیں' اس لئے ہر وقت حاجت مند ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں سے بھی مستفید ہوتے ہیں اور مصائب و آلام سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر حاجت کے پورا ہونے کے لئے' ہر ضرورت کے انتظام و انصرام کے لئے' ہر دکھ درد سے نجات پانے کے لئے' ہر نازل شدہ وبال سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے اور ہر نازل ہونے والی بلا کے ٹل جانے کے لئے ایک مومن کا طرزِ عمل اللہ اور صرف اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ چنانچہ دُعا کی اہمیت و ضرورت و منفعت کو اجاگر کرنے کے لئے قرآن مجید میں متعدد آیات وارد ہوئی ہیں :

۱۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا :

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۝﴾

(البقرة : ۱۸۶)

"اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں تو (آپ میری طرف سے فرمادیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کی دُعا' جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ سو ان کو چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ رشد وہدایت پاجائیں۔"

۲۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا :

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ' اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ○ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ' اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ○ ﴾ (الاعراف ۵۵' ۵۶)

"تم لوگ اپنے پروردگار سے دُعا کیا کرو گڑگڑاتے ہوئے (یعنی اظہار تَذَلُّل کے ساتھ) اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے' اور تم اللہ ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ (یعنی اس کی معصیت اور نتیجتاً اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہوئے) یقیناً اللہ کی رحمت نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔"

دوسرے لفظوں میں بقول اقبال ؂

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

۳۔ سورۃ المومن میں فرمایا :

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ' اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ○ ﴾ (المومن ۶۰)

"اور فرمایا تیرے رب نے کہ پکارو مجھ کو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں (جس میں دُعا کرنا بھی شامل ہے) وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔"

۴۔ سورۃ النمل میں مذکور ہے :

﴿ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْءَ... ﴾

(النمل : ۶۲)

"کون ہے جو ایک بے قرار (بے کس و بے بس) شخص کی دُعا قبول فرماتا ہے جبکہ وہ اسے پکارتا ہے' اور اس کی مصیبت دور فرماتا ہے..."

اس سلسلے میں تفسیر ابن کثیر میں بحوالہ حافظ ابن عساکر ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک شخص کرایہ پر مسافروں کو اپنی خچر کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص اس کے ساتھ سوار ہوا۔ سفر کے دوران جب وہ جنگل میں ایک دوراہے پر پہنچے تو مسافر نے اس طرف چلنے کو کہا جس طرف مسافروں کی آمدورفت نہ تھی۔ خچر والے نے کہا میں اس راستے سے واقف نہیں ہوں۔ مسافر نے کہا اس راستہ سے منزل قریب تر ہے' لہٰذا اس پر چلو۔ خچر والا بیان کرتا ہے کہ چلتے چلتے ہم ایک لق و دق بیابان میں پہنچے جہاں ایک گہری وادی تھی اور اس میں بہت سے مقتول پڑے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر وہ بولا' خچر کو ذرا روک' میں اترنا چاہتا ہوں۔ خچر رکتے ہی وہ اترا اور ایک چھری نکال لی اور مجھے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ میں بھاگا' اس نے پیچھا کیا۔ میں نے اس کو اللہ کی قسم دلائی اور کہا میری جان چھوڑ دے اور خچر اور تمام اسباب لے لے۔ وہ کہنے لگا کہ وہ چیزیں تو میری ہو ہی چکی ہیں' میں تو تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کو اللہ کا خوف دلایا اور قتل مسلم کی سزا یاد دلائی مگر اس نے ایک نہ مانی۔ جب میں عاجز آ گیا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ کہنے لگا اچھا جلدی سے پڑھ لے۔ میں نماز کے لئے کھڑا ہوا' نماز میں قرآن پڑھنا چاہتا تھا' مگر ایک لفظ بھی زبان پر نہ آتا تھا۔ میں حیران کھڑا تھا کہ اب کیا کروں اور ادھر وہ تقاضا کر رہا تھا کہ جلدی کرو۔ اسی حالت میں اللہ جل شانہ نے یہ آیت میری زبان پر جاری فرما دی :

﴿ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْءَ ﴾

اس آیت کا میری زبان سے نکلنا تھا کہ اچانک ایک گھوڑ سوار وادی کی گہرائی سے ایک نیزہ ہاتھ میں لئے ہوئے نکلا اور اس سرعت اور مہارت سے نیزہ مسافر پر برسایا کہ اس کے دل سے پار ہو گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے گھوڑ سوار کو اللہ کی قسم دی اور پوچھا

کہ بچّہ بتا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں اُس ذات کا بھیجا ہوا ہوں جو بے قرار کی دُعا قبول فرماتا ہے اور اس کی مصیبت دور فرماتا ہے۔

۵۔ اہل ایمان کی تعریف میں جو امید و بیم کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں' سورۃ السجدۃ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ (السجدۃ : ۱۱)

"ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید باندھے ہوئے پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

۶۔ سورۃ الانبیاء میں حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا :

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ' وَّكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ ﴾ (الانبیاء ۹۰)

"بلاشبہ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے سر فگندہ رہنے والے تھے" (یعنی عاجزی کرنے والے تھے۔)

۷۔ اس کے بعد سورۃ المومن میں ارشاد ہے :

﴿ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (المومن ۔ ۶۵)

"وہ زندہ و جاوداں ہے' اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' لہٰذا تم اسی کو پکارو اس کی معبودیت کا خالص اعتقاد رکھتے ہوئے۔ تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو رب العالمین ہے۔"

۸۔ اللہ کے سوا کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مخلوق کو کسی بات کا اختیار نہیں ہے۔ مختار کل صرف اللہ تعالیٰ ہے' اس کے فیصلے کو کوئی الٹ نہیں سکتا اور اس کی عطا کو کوئی روک نہیں سکتا۔ چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے :

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۚ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ ﴾
(الحدید : ۲۲)

"کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں کو لاحق ہوتی ہے' مگر قبل اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں' ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے' یقیناً یہ کام اللہ کے لئے آسان ہے۔"

۹۔ مزید برآں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾ (فاطر ۲)

"اللہ لوگوں کے لئے جو رحمت کھول دے تو پھر اس کا روکنے والا کوئی نہیں' اور جس کو وہ روک لے اس کے بعد اسے جاری کرنے والا کوئی نہیں' اور وہ غالب حکمت والا ہے۔"

۱۰۔ علاوہ ازیں سورۂ یونس میں ارشاد فرمایا :

﴿ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۚ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (یونس ۱۰۶۔ ۱۰۷)

"اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو مت پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر تو نے ایسا کیا تو ظالموں میں شمار ہوگا۔ اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو دور کر سکے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ فرمالے تو اس کے فضل کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنا فضل پہنچا کے رہتا ہے' اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

۱۱۔ سورۃ القصص میں ارشاد ہے :

﴿ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا

وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ○﴾ (القصص : ۸۸)

"اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ ساری کائنات میں اسی کی فرمانروائی ہے اور اسی کی طرف تم سب کی واپسی ہے۔"

احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام

کتب احادیث میں متعدد ایسی احادیث شریفہ ملتی ہیں جن میں دُعا کی اہمیت، ضرورت اور فضیلت بتائی گئی ہے اور دُعا نہ کرنے کی مذمت فرمائی گئی ہے۔

(۱) دُعا سراپا عبادت ہے :

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ" کہ دُعا ہی عبادت ہے، اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی : ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ○﴾ دوسرے لفظوں میں دُعا سراپا عبادت ہے۔ (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)

(۲) دُعا عبادت کا مغز ہے :

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ" یعنی دُعا عبادت کا مغز ہے۔ (رواہ الترمذی)

(۳) دُعا مومن کا ہتھیار ہے :

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ وَعِمَادُ الدِّيْنِ وَنُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یعنی دُعا مومن کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون ہے اور آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ (مستدرک حاکم)

چونکہ دُعا کی بدولت بڑی بڑی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں، شیطانی حملوں سے پناہ حاصل

ہوتی ہے' دشمنوں پر فتح یابی نصیب ہوتی ہے اور ظالموں سے نجات ملتی ہے' اس لئے اس کو مومن کا ہتھیار قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا رکن توحید ہے اور موحد ہونے کا سب سے زیادہ عملی ثبوت نماز اور دُعا ہیں' کیونکہ دونوں اظہارِ بندگی اور عجز و انکساری کا مظہر ہیں۔ لہٰذا دونوں کو عِمَادُ الدِّيْنِ کہا۔ چونکہ سب علوم کا سرچشمہ ذات باری تعالی ہے اور اس کا فرمان ہے : ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ لہٰذا وہ اپنے مومن بندوں کے دلوں کو رہنمائی عطا فرماتا ہے۔ اسی لئے دُعا کو آسمانوں اور زمین کی روشنی قرار دیا گیا ہے۔

(۴) اللہ کے ہاں دُعا سے بڑھ کر کوئی چیز بزرگ و برتر نہیں :

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور فخر عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "لَيْسَ شَيْءٌ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ" یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی چیز دُعا سے بڑھ کر بزرگ و برتر نہیں (رواہ الترمذی وابن ماجہ)۔

جب یہ معلوم ہو چکا کہ دُعا عبادت کا مغز اور جوہر ہے اور عبادت ہی انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے تو یہ بات خود بخود متعین ہو گئی کہ انسانوں کے اعمال میں دُعا ہی سب سے زیادہ محترم اور قیمتی اثاثہ ہے' جو اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کو کھینچنے کی سب سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔

(۵) جو کوئی اللہ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں :

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "مَنْ لَّمْ يَسْاَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ" (الترمذی)۔ یعنی جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ جل شانہ اس پر غصہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسا رحیم و کریم ہے اور اپنے بندوں پر اتنا مہربان ہے کہ جو بندہ اس سے نہ مانگے وہ اس سے ناراض ہوتا ہے اور مانگنے والے پر اسے پیار آتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بندے کا سب سے عزیز اور قیمتی عمل دُعا اور سوال ہے۔

(۴) دُعا کی مقبولیت اور نافعیت :

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "اِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِالدُّعَاءِ" یعنی دُعا ان حادثات و مصائب میں بھی نافع ہوتی ہے جو نازل ہو چکے ہیں اور ان میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئے۔ پس اے اللہ کے بندو دُعا کا اہتمام کرو (رواہ الترمذی)۔

مطلب یہ ہے کہ جو بلا اور مصیبت ابھی تک نازل نہیں ہوئی بلکہ اس کا صرف اندیشہ ہے' اس سے حفاظت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہئے' ان شاء اللہ کار آمد ہو گی اور جو بلا یا مصیبت نازل ہو چکی ہے اس کے دفعیہ کے لئے بھی دُعا کرنی چاہئے' ان شاء اللہ نافع ہو گی اور اللہ تعالیٰ وہ مصیبت دور فرما کر عافیت نصیب فرمائیں گے۔

(۷) دُعا سے عاجز مت بنو :

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : "لَا تَعْجِزُوْا فِي الدُّعَاءِ فَإِنَّهُ لَنْ يُّهْلِكَ مَعَ الدُّعَاءِ اَحَدٌ" یعنی دُعا کرنے سے عاجز نہ بنو کیونکہ دُعا کے ساتھ ہوتے ہوئے کوئی شخص ہلاک نہ ہو گا۔

در حقیقت دُعا میں سستی کرنا بڑی محرومی ہے۔ لوگ دشمنوں سے نجات کے لئے اور طرح طرح کی مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے بہت سی تدبیریں کرتے ہیں' مگر دُعا نہیں کرتے جو آسان ترین اور ہر انسانی تدبیر سے بڑھ کر مفید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو جائز تدبیروں کو چھوڑنے کی ترغیب دی جا رہی ہے بلکہ یہاں مقصود سب سے بڑی اور بہتر تدبیر کی طرف متوجہ کرنا ہے' جو دُنیا کی زندگی میں بھی نافع ہے اور آخرت میں بھی اجر و ثواب دلانے والی ہے۔ ہدایت اللہ سے مانگو' دین و دُنیا کی خیر اللہ سے مانگو' تمام آفات و اوجاع سے حفظ و امان کے لئے' انشراح خاطر و دفع امراض کے لئے' غرضیکہ ہر چھوٹی بڑی حاجت روائی کے لئے اللہ جل شانہ کے حضور درخواست کرتے رہو۔ ہر خیر کی دُعا مانگنے میں لگے رہو تو ان شاء اللہ خیر ہی خیر سامنے آئے گی۔

(۸) سب کچھ اللہ سے مانگو :

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :
"لَيَسْئَلَنَّ اَحَدُكُمْ رَبَّهٗ حَاجَتَهٗ اَوْ حَوَائِجَهٗ كُلَّهَا حَتّٰى يَسْاَلَهٗ شِسْعَ نَعْلِهٖ اِذَا انْقَطَعَ وَحَتّٰى يَسْاَلَهُ الْمِلْحَ" یعنی تم میں سے ہر شخص اپنے رب سے ضرور اپنی حاجت کا سوال کرے۔ یہاں تک کہ جب چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو بھی اسی سے مانگے اور نمک کی حاجت ہو تو وہ بھی اسی سے طلب کرے۔

(۹) جس کیلئے دُعا کا دروازہ کھل گیا اس کیلئے رحمت کے دروازے کھل گئے :

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "مَنْ فُتِحَ لَهٗ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَآءِ فُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ وَمَا سُئِلَ اللّٰهُ شَيْئًا يُعْطٰى اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ اَنْ يُّسْاَلَ الْعَافِيَةَ" (رواہ الترمذی) یعنی تم میں سے جس کے لئے دُعا کا دروازہ کھل گیا اس کے لئے رحمت کے دروازے کھل گئے اور اللہ کو دُعاؤں اور سوالوں میں سب سے محبوب یہ ہے کہ بندے اس سے عافیت کی دُعا کریں۔ لہٰذا کوئی دُعا اللہ تعالیٰ کو عافیت کی دُعا سے زیادہ محبوب نہیں۔

تمام دنیوی و اخروی اور ظاہری و باطنی آفات و بلیات سے سلامتی اور تحفظ کی دُعا ہی اپنی کامل عاجزی اور سراپا محتاجی کا اظہار ہے' اور یہی کمال عبدیت ہے۔ اور جس کو دُعا کی حقیقت نصیب ہو گئی اور اللہ سے مانگنا آگیا اس کے لئے رحمت کے دروازے کھل گئے۔ دُعا کی حقیقت دراصل ان دُعائیہ الفاظ کا نام نہیں جو زبان سے ادا ہوتے ہیں بلکہ انسان کے قلب اور اس کی روح کی طلب و تڑپ ہے۔ اور حدیث پاک میں اس کیفیت کے نصیب ہونے ہی کو رحمت کے دروازے کھل جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سنن ترمذی اور صحیح حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح یا شام کبھی یہ کلمات ترک نہیں فرماتے تھے' یعنی :

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ' اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ۔ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَاٰمِنْ رُوعَاتِیْ' اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وعَنْ یَمِیْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ' وَاَعُوْذُ بِعَظْمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ))

"اے اللہ! میں دُنیا اور آخرت میں تجھ سے عافیت کا طلب گار ہوں۔ اے اللہ! میں اپنے دین و دُنیا میں اور اپنے اہل و مال میں تجھ سے معافی اور امن کا خواستگار ہوں۔ اے اللہ! میری برہنگیوں کی ستر پوشی فرما اور بے چینیوں کو چین سے بدل دے۔ اے اللہ! آگے پیچھے' دائیں بائیں اور اوپر سے میری نگہداشت فرما اور میں اس بات سے تیری عظمت کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں ناگہاں نیچے سے ہلاک کر دیا جاؤں یعنی زمین میں دھنسا دیا جاؤں۔" (ابو داؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ' مسند احمد' مصنف ابن ابی شیبہ' صحیح ابن حبان' مستدرک حاکم۔)

(۱۰) قبولیت دُعا:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَدْعُوْ بِدَعْوَةٍ لَیْسَ فِیْهَا اِثْمٌ وَلَا قَطِیْعَةُ رَحْمٍ اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ بِهَا اِحْدٰی ثَلَاثٍ' اِمَّا اَنْ یُّعَجِّلَ لَهٗ دَعْوَتَهٗ وَاِمَّا اَنْ یَّدَّخِرَهَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ وَاِمَّا اَنْ تَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا' قَالُوْا اِذًا نَكْثُرُ' قَالَ اللّٰهُ اَكْثَرُ))

"جو مومن بندہ کوئی دُعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ کی بات نہ ہو اور نہ قطع رحمی ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ضرور عطا ہوتی ہے' یا تو جو اس نے مانگا ہے وہی اس کو ہاتھ کے ہاتھ عطا کر دیا جاتا ہے' یا اس کی دُعا کو آخرت کے لئے ذخیرہ کر دیا جاتا ہے' یا آنے والی کوئی مصیبت اور تکلیف اس دُعا کے حساب میں روک دی جاتی ہے" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ

تب تو ہم بہت زیادہ دُعائیں کریں گے اور کمائی کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔"

جو لوگ دُعاؤں میں مصروف رہتے ہیں ان پر اللہ کی بڑی رحمتیں ہوتی ہیں' برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اول تو ان پر مصیبتیں آتی ہی نہیں' اگر آتی بھی ہیں تو معمولی نوعیت کی۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے : "اَنَا لَا اَحْمِلُ هَمَّ الْاِجَابَةِ اِنَّمَا اَحْمِلُ هَمَّ الدُّعَآءِ فَاِذَا اُلْهِمْتُ الدُّعَآءَ كَانَتْ اِجَابَتُهٗ مَعَهٗ"۔ یعنی مجھے قبولیت دُعا کی نہیں دعا کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ (اس لئے کہ) جب مجھے دُعا کرنے کی توفیق حاصل ہو گئی تو قبولیت بھی اس کے ساتھ خاص ہو جائے گی۔

(۱۱) دُعا تقدیر کو بدل دیتی ہے :

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَآءُ وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُمَرِ اِلَّا الْبِرُّ)) (رواہ الترمذی) "یعنی تقدیر کو دعا کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بدلتی اور عمر کو نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بڑھاتی۔"

یہاں یاد رکھئے کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں' ایک مبرم اور دوسری معلق۔ تقدیر مبرم تو اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہوتا ہے' اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا' مگر تقدیر معلق بعض اسباب کی بنا پر بدل جاتی ہے۔ چنانچہ نیکی سے عمر میں اضافے کا تعلق بھی تقدیر معلق سے ہے' یعنی تقدیر میں مذکور ہوتا ہے کہ فلاں شخص اگر فلاں کام کرے گا تو اس کی عمر اتنی ہو گی ورنہ اتنی ہو گی۔

(۱۲) اللہ دُعا کے لئے اٹھے ہاتھوں کی لاج رکھتا ہے :

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ۔ "اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيمٌ يَّسْتَحْيِي مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اَنْ يَّرُدَّ صِفْرًا" ۔ (رواہ الترمذی) یعنی تمہارا پروردگار غایت درجہ حیادار اور کریم ہے۔ وہ اپنے بندہ سے حیا کرتا

ہے کہ جب بندہ اس کی طرف دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھائے تو وہ اسے خالی ہاتھ واپس کر دے۔

(۱۴) سختی کے زمانہ میں قبولیت دُعا کا خواہشمند فراخی کے وقت کثرت سے دُعا مانگے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ((مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّسْتَجِيْبَ اللّٰهُ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِي الرَّخَاءِ))(رواہ الترمذی) یعنی جس شخص کے لئے یہ بات خوشی کا باعث ہو کہ سختی اور تنگی کے وقت اللہ تعالیٰ اس کی دُعا قبول فرمائے تو اسے چاہئے کہ خوش حالی کے زمانہ میں کثرت سے دُعا کیا کرے۔

اس حدیث پاک میں قبولیت دُعا کے لئے ایک بہت بڑا گُر بتا دیا گیا ہے کہ آرام و راحت اور صحت و تندرستی کے زمانہ میں جو شخص دُعا پر کاربند رہے گا تو اس کے لئے اللہ جل شانہٗ کی طرف سے یہ انعام ہو گا کہ جب کبھی وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو گا' یا کسی مصیبت سے دوچار ہو گا' یا کسی مرض میں گرفتار ہو گا اور اُس وقت دُعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس وقت اس کی دُعا ضرور قبول فرمائیں گے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب بندہ چین اور خوشی کے زمانہ میں دُعا کرتا رہتا ہے پھر جب کوئی مشکل درپیش ہو تو اس وقت بھی دُعا کرتا ہے تو فرشتے بھی اس کی سفارش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو جانی پہچانی آواز ہے' ہمیشہ یہاں پہنچتی رہتی ہے۔ اور جب کوئی شخص آرام و راحت کے زمانہ میں اللہ پاک کو بھول جاتا ہے بلکہ ذکر و دُعا کی بجائے بغاوت اور سرکشی پر کمربستہ ہو جاتا ہے تو یہ طرز عمل بے رخی اور بے غیرتی کا ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کی مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ﴾ (یونس : ۱۲)

"اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی اور بیٹھے بھی اور کھڑے بھی۔ پھر جب ہم اس کی وہ تکلیف دور کر دیتے ہیں تو پھر اس

طرح گزر جاتا ہے گویا اس نے ہم کو اس سے پہلے اس تکلیف کے ہٹانے کے لئے پکارا ہی نہ تھا جو اسے پہنچی۔"

(۱۴) دُعا کرتے رہنے والے اور اللہ سے امید لگائے رکھنے والے کے لئے بخشش کی ضمانت دی گئی ہے بشرطیکہ اس نے شرک نہ کیا ہو:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((يَا ابْنَ آدَمَ اِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَاكَانَ فِيكَ وَلاَ اُبَالِي' يَا ابْنَ آدَمَ لَوْبَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ وَلاَ اُبَالِي' يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ اَتَيْتَنِي بِقِرَابِ الْاَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِي لاَ تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَاَتَيْتُكَ بِقِرَابِهَا مَغْفِرَةً))

(رواۃ الترمذی)

"اے آدم کے بیٹے! بے شک جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور مجھ سے امید رکھے گا میں تیرے وہ سب گناہ بخشتا رہوں گا جو تیرے ذمہ ہیں' اور میں کچھ پرواہ نہیں کرتا ہوں۔ اے بنی آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کے بادلوں کو پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرے تو میں تجھے بخش دوں گا اور میں کچھ پرواہ نہیں کرتا ہوں۔ اے انسان اگر تو اتنے گناہ لے کر میرے پاس آئے جس سے ساری زمین بھر جائے پھر مجھ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنایا ہو تو میں اتنی ہی بڑی مغفرت سے تجھ کو نوازوں گا جس سے زمین بھر جائے۔"

اس حدیث پاک کے ذریعے سے مومن بندوں کے لئے شہنشاہ عالم کی طرف سے معافی اور مغفرت کا اعلان عام نشر کیا گیا ہے۔ بس بندہ عجز و انکساری اور رقت و ندامت قلبی کے ساتھ مولائے کائنات و خالق موجوات کی بارگاہ میں مضبوط امید کے ساتھ مغفرت کا سوال کرتا رہے۔ اتنے سے عمل پر اللہ تعالیٰ نے سب کچھ بخش دینے کا وعدہ فرمایا ہے

بشرطیکہ موحد ہو اور کسی قسم کے شرک میں ملوث نہ ہو۔ اسی لئے مولانا رومؒ نے فرمایا ؎

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما
ایں را نہایتے ست نہ آں را نہایتے

خداوند قدوس کی بخشش گناہوں کے انبار کو نہیں دیکھتی بلکہ خطا کا احساس گناہ کا اعتراف اور اصلاح احوال کا عزم ہی کافی ہے اور یہی توبہ کا مفہوم ہے۔

(۱۵) تھک کر دُعا مانگنا نہ چھوڑو :

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((اِذَا دَعَا اَحَدُکُمْ فَلَا یَقُلِ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِی اِنْ شِئْتَ وَلٰکِنْ لِیَعْزِمْ وَلْیُعَظِّمِ الرَّغْبَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَتَعَاظَمُهٗ شَیْءٌ اَعْطَاهُ)) (رواہ مسلم) یعنی جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے تو اس طرح نہ کہے کہ اے اللہ مجھے بخش دے اگر تو چاہے۔ بلکہ بلا کسی شک کے جزم و یقین کے ساتھ اور پوری رغبت کے ساتھ مانگے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جو چیز عطا کرتا ہے وہ اس کے لئے مشکل نہیں ہوتی۔

(۱۶) دُعا میں عجلت کی ممانعت :

دعا بندے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے حضور عرضداشت ہے جو مالک کل اور قادر مطلق ہے' چاہے تو یک لخت اور یک مشت سائل کی درخواست پوری کر دے۔ اور بعض اوقات تو اللہ تعالیٰ فی الفور عطا بھی فرما دیتا ہے۔ لیکن بسا اوقات اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ظلوم و جہول بندے کی خواہش کی ایسی پابندی نہ کی جائے کیونکہ خود اس بندے کی مصلحت اسی میں ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ انسان کے ضمیر میں جلد بازی ہے لہٰذا جب اس کی مانگ فوراً عطا نہیں ہوتی تو وہ مایوس ہو کر دعا کرنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ یہ انسان کی وہ غلطی ہے جس کی وجہ سے وہ دعا کی قبولیت کا استحقاق کھو بیٹھتا ہے۔ گویا اس کی جلد بازی اس کی محرومی کا باعث بن جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((یُسْتَجَابُ لِاَحَدِکُمْ مَالَمْ یَعْجَلْ فَیَقُوْلُ قَدْ

دَعَوْتُ رَبِّی فَلَمْ یَسْتَجِبْ لِی)) (رواہ البخاری و مسلم) یعنی "تمہاری دعائیں اس وقت تک قابل قبول ہوتی ہیں جب تک جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ جلد بازی یہ ہے کہ بندہ کہنے لگے کہ میں نے اپنے رب سے دعا کی تھی مگر وہ قبول ہی نہیں ہوئی۔" مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی جلد بازی اور مایوسی کی وجہ سے قبولیت کا استحقاق کھو بیٹھتا ہے۔

(۱۷) وہ دُعائیں جن کی ممانعت کی گئی ہے :

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((لَا تَدْعُوا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ وَلَا تَدْعُوا عَلٰی اَوْلَادِکُمْ وَلَا تَدْعُوا عَلٰی اَمْوَالِکُمْ' لَا تُوَافِقُوا مِنَ اللّٰہِ سَاعَۃً یُسْئَلُ فِیْھَا عَطَاءٌ فَیَسْتَجِیْبَ لَکُمْ)) (رواہ مسلم)۔ یعنی تم کبھی اپنے حق میں یا اپنی اولاد اور مال و جائداد کے حق میں بد دُعا نہ کرو۔ مبادا وہ وقت دعا کی قبولیت کا ہو اور تمہاری دُعا اللہ تعالیٰ قبول فرمالے اور نتیجتاً خود تمہارے اوپر یا تمہاری اولاد یا مال و جائداد پر کوئی آفت آجائے۔ (جاری ہے)

ایمانیات ثلاثہ

اصل حاصل اور باہمی تعلق

رحمت اللہ بٹر' ناظم تربیت

(گزشتہ سے پیوستہ)

۲) ایمان بالرسالت

یہ ایمان تین اجزاء پر مشتمل ہے : ایمان بالملائکہ' ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل۔

ایمان بالملائکہ : یہ ایمانیات کا جزو لازم ہے' اس لئے کہ فرشتوں کو نہ ماننے کی وجہ سے یہ گمراہی پیدا ہوتی ہے کہ پھر ہدایت کا وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے انبیاء و رُسل تک اللہ کا پیغام اور اس کا کلام پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرشتوں کا انکار کیا گیا تو قرآن مجید کو نبی اکرم ﷺ کا کلام قرار دے دیا گیا۔ ماضی قریب میں اس کی مثالیں سرسید احمد خان اور مولانا فضل الرحمٰن (ڈائریکٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی) کے نظریات ہیں۔

فرشتے اصل میں نوری مخلوق ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا اتنا مشاہدہ ہے کہ وہ باوجود اختیار رکھنے کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ ان میں سے کچھ مقربین بارگاہ الٰہی ہیں اور ان کے گل سرسبد روح الامین حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے کلام اللہ کو اللہ تعالیٰ سے وصول کیا اور پھر اسے روح محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے محمد رسول اللہ ﷺ سے ان کی ملاقات کا ذکر خاص طور پر کیا ہے کہ (ملکی صورت میں) آپؐ نے ان کو دو بار دیکھا ہے' تاکہ قرآن مجید کے راوی اول سے ملاقات ثابت ہو' اور پھر ان کی صفات بیان کی ہیں کہ وہ کریم بھی ہیں اور امین بھی' ذو قوۃ بھی ہیں اور شدید القویٰ بھی۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کا پیغام انبیاء و رُسل تک پوری امانت داری سے پہنچایا ہے۔

ایمان بالکتب : ایمان بالرسالت کا دوسرا جزو ایمان بالکتب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے جو وعدہ فرمایا تھا کہ میری طرف سے نوع انسانی کے لئے ہدایت آتی رہے گی ﴿ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی ﴾ یہ اس کی تعمیل ہے اور قرآن مجید صراحت سے بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو کتب ہدایت دے کر بھیجیں جو ان کی قوام ان کے دور کے لئے ہدایت و رحمت تھیں۔ آخری کتاب قرآن مجید کو "الھدٰی" بنا کر بھیجا جو تمام انسانوں کے لئے ﴿ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی ﴾ ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تاکہ وہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنی رہے۔

ایمان بالرسل : ایمان بالرسالت کا تیسرا جزو ایمان بالرسل ہے، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت بنی نوع انسان تک پہنچائی۔ وہ اس ہدایت کو انسانوں تک ہمیشہ یہ کہہ کر پہنچاتے رہے کہ "اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" اور "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" یعنی چونکہ یہ ہدایت انسانوں کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہے اس لئے پہلا ایمان لانے والا اور پہلا فرمانبردار میں خود ہوں۔

قانونی لحاظ سے یہ ایمان اہم ترین ایمان ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر دنیا میں انسانوں کی پہچان ہوتی ہے۔ گویا یہی ایمان انسانوں کا تشخص معین کرتا ہے کہ کون کس گروہ / امت سے تعلق رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو تمام امتیں کسی نہ کسی صورت میں اللہ اور آخرت کو مانتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ علیحدہ علیحدہ کیوں ہیں؟ صرف ایمان بالرسالت کی بنیاد پر! اور اللہ تعالیٰ رسولوں کو اس لئے مبعوث فرماتا ہے تاکہ وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق لوگوں کے لئے صراط مستقیم معین کریں، یعنی انہیں اللہ کی عطا کردہ ہدایت کے مطابق رہنمائی بھی کریں اور ان کے لئے اسوۂ حسنہ بھی فراہم کریں۔ قرآن حکیم کی آیت مبارکہ پر دوبارہ غور فرمایئے :

﴿ وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۙ ﴾ (الشوریٰ ۵۲)

"اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے

(قرآن مجید) بھیجا ہے۔ آپ نہ تو کتاب کو جانتے تھے نہ ایمان کو' لیکن ہم نے اس (قرآن مجید) کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں' اور بے شک (اے محمدؐ) آپ سیدھا راستہ دکھاتے ہیں"۔

اور فرمایا :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلاَ تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ ﴾ (محمد . ۳۳)

"اے ایمان والو! کہا مانو اللہ کا اور کہا مانو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اور اپنے اعمال باطل نہ کرو"۔

اور فرمایا : ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ "جس نے رسول کی پیروی کی اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی" ـــــ مزید فرمایا : ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ "اور ہم کسی رسول کو بھیجتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے"۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا :

((مَنْ اَطَاعَ مُحَمَّدًا فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصٰى مُحَمَّدًا فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَ مُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ)) (رواه البخاری)

"جس نے محمد (ﷺ) کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے محمد (ﷺ) کی نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی' اور محمد (ﷺ) ہی لوگوں کے درمیان پہچان ہیں (یعنی کون سیدھی راہ پر ہے اور کون اللہ کا نافرمان ہے)"

اور اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا ((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) "جو کوئی کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے تو وہ اسی میں سے ہے"۔ چنانچہ مسلمان وہی ہو گا جو مسلمانوں کی سی شکل و صورت' رہن سہن اور معاملات اختیار کرے۔ اور فرمایا: ((مَنْ اَحَبَّ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) "جو کسی (قوم کے طرز زندگی) سے محبت رکھتا ہے وہ انہی میں سے ہے"۔ چنانچہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرنے والا ہے وہی ہے جس کو رسول اللہ ﷺ کا طریقہ زندگی پسند ہے۔ یعنی سنت رسول اللہ پر عمل پیرا ہے۔ جیسے فرمایا گیا :

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ

ذُنُوْبَكُمْ ' وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (آل عمران : ۳۱)

"فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت چاہتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"۔

اور آپ ؐ نے فرمایا : ((مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ اَحَبَّنِيْ وَمَنْ اَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِي فِي الْجَنَّةِ)) "جس کو میری سنت پیاری ہے اس کو مجھ سے محبت ہے اور جس کو مجھ سے محبت ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا"۔

کسی سے محبت کا دعویٰ تو کیا جائے ' لیکن پھر اس کی پیروی نہ کی جائے ' یا اس کی نافرمانی کی جائے تو یہ بڑی تعجب کی بات ہے۔ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں :

فَاِنَّ الْقَلْبَ اِذَا ذَاقَ طعمَ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَالْاِخلَاصِ لهُ لم يكن شي ءٌ قطّ اَحلٰی من ذٰلک وَلا اَلَذُّ ولاَ اَمتَعُ ولاَ اَطيَبُ وَالانسانُ لا يترُک محبوبًا الاَّ بِمَحبوبِ اُخَرَ ' وَالسُّنَّةُ سَفِينةُ نُوحٍ مَن رَكِبَها نَجا وَمَن تَخلَّفَ عنها غَرِقَ

"جب دل اللہ کی بندگی (محبت + اطاعت) کا ذائقہ چکھ لیتا ہے اور اس کے لئے خالص ہو جاتا ہے تو اس کے نزدیک کوئی چیز اس سے زیادہ میٹھی 'لذیذ' فائدہ مند اور پاکیزہ نہیں رہتی اور انسان کسی پسندیدہ چیز کو ہمیشہ کسی دوسری محبوب چیز ہی کے لئے چھوڑتا ہے۔ اور نبی اکرم ﷺ کی سنت تو نوح علیہ السلام کی کشتی ہے ' جو اس میں سوار ہو گا نجات پا جائے گا اور جو اس سے پیچھے رہ گیا تو وہ تو غرق ہو گیا"۔

ہر شخص کو اپنی زندگی کے معمولات ' اپنے پسندیدہ تمدن اور معاشرت کا جائزہ لینا چاہئے کہ اس کی پسند و ناپسند کا معیار کیا ہے۔ جو بھی اس کا پسندیدہ طرز زندگی ہے اصل میں وہی اس کا محبوب و مطاع ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے محبت اور آپؐ کی اطاعت ہی کا نام اصل اتباع ہے اور یہی ایمان بالرسول کا تقاضا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) یعنی "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اپنے والدین ' اپنی اولاد اور باقی تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں"۔ اور فرمایا :

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبِعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))

"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس دین کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں"۔

اور سچ کہا ہے کہ کسی شاعر نے

تَعْصِیْ الالٰہَ واَنتَ تَظْهَرُ حُبَّهٗ ھذا لَعَمْرُكَ فِی القیاسِ بَدِیعٌ
لَو کانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ اِنَّ المُحِبَّ لِمن یُحِبُّ مُطاعٌ

"تو اپنے معبود کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے ساتھ محبت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ تیری جان کی قسم یہ تو قیاس میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کی بات مانتا ہے"۔

نبی اکرم ﷺ نے اسی لئے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے مشابہت سے منع کیا' تاکہ اُن کی پہچان اور ان کا تشخص معین ہو جائے اور کسی شخص کو دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ وہ کون ہے اور کس امت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہی پیمانہ ہے جس کو آپ ﷺ نے دوٹوک الفاظ میں بیان فرمایا :

((کُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی - قِیْلَ وَمَنْ یَاْبٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ . مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی))

"میرے تمام اُمتی جنت میں جائیں گے سوائے اس کے کہ جو (خود ہی جنت میں جانے سے) انکار کر دے۔ پوچھا گیا: بھلا جنت میں جانے سے کون انکار کرے گا؟ تو آپؐ نے فرمایا: "(میری امت میں سے) جو کوئی میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں جائے گا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو گویا اس نے (خود جنت میں جانے سے) انکار کر دیا"۔

اور عجیب حال ہے آپؐ کے اُمتیوں کا' کہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی توڑ کر کر رہے ہیں اور ساری زندگی رسول اللہ ﷺ کے نہ ماننے والوں کی طرز پر زندگی بسر کر رہے ہیں' لیکن کہتے یہ ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ بہت محبوب ہیں۔ مسلمانوں کی اس روش پر علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا ؎

(باقی صفحہ ۹۷ پر)

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

مرتب : حافظ محبوب احمد خان

موت ایک ایسا راز ہے جس کے سامنے انسان کی کوئی دلیل کارگر نہیں ہے اور موت و زندگی کا یہ کھیل جاری ہے 'مگر انسان شاہی میں فقیری کو' صحت میں بیماری کو' زندگی میں موت کو' جوانی میں بڑھاپے کو' روشنی میں تاریکی کو اور خوبصورتی میں بدصورتی کو یاد نہیں رکھ سکتا' کیونکہ بھولنا اس کی فطرت میں ہے۔ وہ بھولتا رہا ہے اور بھولتا رہے گا کہ موسیٰ ہو یا فرعون 'گدا ہو یا فقیر' خوبصورت ہو یا بدصورت' جوان ہو یا بوڑھا' مریض ہو یا صحت مند' مرد ہو یا عورت موت نے بالآخر سب کو مٹانا ہے۔ انسان نے سد مارب' اہرام مصر' تاج محل جیسی عظیم الشان عمارات بنائیں جنہوں نے صدیوں زمانہ کے تغیر و تبدل کا مقابلہ کیا مگر بالآخر فنا ہی اُن کا مقدر رہے۔ جب ہم تاریخ سے رجوع کرتے ہیں تو سینکڑوں اقوام کے واقعات و آثار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قرآن کریم' جس میں انسانوں کیلئے کامل ہدایت ہے' کم و بیش پچیس تیس اقوام کا ذکر عبرت و نصیحت کیلئے کرتا ہے۔ اور اگر ایک قوم کا تذکرہ اختصار سے ملتا ہے تو ایک قوم کے بارے میں ہمیں سینکڑوں آیات بھی ملتی ہیں جن سے اُس قوم کے عروج و زوال کا فسانۂ عبرت ہمارے سامنے آتا ہے' جس میں اگر ہم غور کریں تو یقیناً ہم اپنے لئے راہنمائی پائیں گے۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اقوام کی زندگی میں ہر عروج ایک زوال کا سبب بنا اور ہر زوال نے ایک عروج کو جنم دیا۔ قابیل کا مخالف ہابیل تھا تو ابراہیم علیہ السلام کے مدمقابل نمرود تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون آیا تو طالوت کا مقابلہ جالوت نے کیا۔ روشنی و تاریکی کے اسی سفر میں ہمیں رحمۃ للعالمین محمد عربی ﷺ بھی نظر آتے ہیں اور ابوجہل و ابولہب بھی۔ اگر ایک طرف روشنی کے مینار خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ' موسیٰ بن

نصیر، عمر بن عبد العزیز، محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی، یوسف بن تاشفین عنظرآتے ہیں تو دوسری جانب عبداللہ بن سبا، ابن علقمی، جعفر و صادق جیسی ننگ انسانیت شخصیات دکھائی دیتی ہیں۔ سب نے زندگی گزاری ہے مگر کچھ نے موت کی حقیقت کو جان کر اور کچھ نے اس حقیقت کو بھلا کر۔ بقول علامہ اقبال ؒ

پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!

زندگی اور موت کی یہ کشمکش صدیوں سے جاری ہے اور ہمیشہ سے انسانوں میں بہت ہی کم لوگ ایسے رہے ہیں جو فلسفۂ موت و حیات کو سمجھ کر زندگی گزارنے والے ہوتے ہیں۔
ایک عرب شاعر مجھے اور آپ کو مخاطب کرکے یہی حقیقت اس طرح بیان کرتا ہے:

تَزَوَّدْ مِنَ التَّقْوىٰ فَاِنَّكَ لَا تَدْرِیْ اِذَا جَنَّ لَيْلٌ هَلْ تَعِيشُ اِلَى الْفجرِ
وَكَمْ مِنْ فَتًى اَمْسٰى وَاَصْبَحَ ضاحِكًا وقد نُسِجَتْ اَكْفَانُهُ وَهُوَ لَا يَدْرِیْ
وَكَمْ مِنْ صِغَارٍ يُرْتَجٰى طُوْلُ عُمْرِهِمْ وَقَدْ اُدْخِلَتْ اَجْسَامُهُمْ ظُلْمَةَ الْقَبْرِ
وَكَمْ مِنْ عرُوْسٍ زَيَّنُوْهَا لِزَوْجِهَا وَقَدْ قُبِضت اَرْوَاحُهُمْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ
وَكَمْ مِنْ صَحِيْحٍ مَاتَ مِنْ غَيْرِ عِلَّةٍ وَكَمْ مِنْ سَقِيْمٍ عاش حِينًا مِنَ الدَّهْرِ
لَا تَرْكَنَنَّ اِلَى الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا فَالمَوتُ لَا شَكَّ يُفْنِيْنَا وَيُفْنِيْهَا
وَاعْمَلْ لِدَارِ غَدٍ رِضْوَانُ حَارِنُهَا وَالجَارُ اَحْمَدُ وَالرَّحْمٰنُ نَاشِيْهَا
قُصُوْرُهَا ذَهَبٌ وَالمِسْكُ طِيْنُهَا وَالزَّعْفَرَانُ حَشِيْشٌ نَبَتَ فِيْهَا

(۱) "اے مخاطب تو تقویٰ کو زادِ راہ بنالے کیونکہ تجھے پتہ نہیں کہ جب رات آئے گی تو تو نے فجر تک زندہ رہنا ہے یا نہیں۔ (۲) پس بہت سے نوجوانوں نے ہنستے ہوئے صبح اور شام کی جبکہ ان کے کفن تیار ہو چکے اور انہیں پتہ بھی نہیں۔ (۳) اور بہت سے بچے جن کی لمبی عمر کی اُمیدیں کی جاتی ہیں ان کے جسم قبر کے اندھیرے میں ڈال دیئے گئے۔ (۴) اور بہت سی دلہنوں کو ان کے خاوندوں کے لئے سجایا جاتا ہے اور قدر کی رات میں ان کی روحیں پرواز کر جاتی ہیں۔ (۵) اور بہت سے تندرست آدمی بغیر بیماری کے مرجاتے ہیں اور بہت سے بیمار طویل زمانہ زندہ رہ لیتے ہیں۔ (۶) نہ جھکنا دُنیا کی طرف اور دُنیا کی چیزوں کی طرف، کیونکہ موت بلاشک ہمیں فنا کر دے گی اور اس دُنیا کو بھی فنا کر دے گی۔"

(۷) عمل کر کل کے اُس گھر کے لئے جس کا ضامن رضوان نام کا فرشتہ ہے اور نبی پاک احمد ﷺ اہل جنت کے پڑوسی ہیں اور رحمٰن جنت کے خالق ہیں۔
(۸) اس کے محل سونے کے ہیں اور جنت کی مٹی کستوری ہے' زعفران گھاس کی جگہ ہے جو وہاں اُگتی ہے"۔

دُنیا میں انسان مال جمع کرتا ہے اور ماں باپ' اولاد' بیوی کے لئے جیتا ہے مگر ہر لمحے اس کو یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جانے کب یہ سب چھوٹ جائے اور اسے ان سب کو داغ مفارقت دینا پڑے۔ یہی چیزیں انسان کو دُنیا میں مشغول رکھتی ہیں اور اپنے رب سے غافل کر دیتی ہیں۔ اہل بصیرت حضرات اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہ تصور اُنہیں دُنیا کی محبت اور دلچسپیوں اور تعلق باری تعالیٰ کے درمیان "توازن" رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر انسان اپنی توجہ مکمل طور پر دُنیا پر ہی لگا دے اور اس میں بہت سامال و دولت اور شہرت و ناموری بھی کما لے تب بھی اس مال و دولت کو قرآن کریم نے خسارے کی تجارت قرار دیا ہے۔ یہ آیت مبارکہ اسی راز کو بیان کرتی ہے :

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾

(التوبۃ ۲۴)

"اے نبیؐ کہہ دو کہ اگر تم کو تمہارے ماں باپ' بیٹے بیٹیاں' بہن بھائی' زن و شوہر' قوم و قبیلہ اور وہ مال جو تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے خسارہ کا تم کو ڈر لگا رہتا ہے اور وہ محل جن میں بسنا تم کو اچھا معلوم ہوتا ہے (وہ سب) زیادہ پیارے ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور راہ خدا میں جہاد کرنے سے تب تم منتظر رہو کہ اللہ تمہارے لئے اپنا کوئی فیصلہ لے آئے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کی راہنمائی نہیں کیا کرتا"۔

ن تمام چیزوں سے محبت جن کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں ہوا ہے' اگرچہ ایک فطری میلان ہے' اسی لئے رب العالمین نے جو فاطر فطرت ہے ان سب کے ساتھ انسانی محبت کی نفی

نہیں فرمائی اور نہی نہیں کی' بلکہ تفریق درجات کے سبق کی تعلیم دی ہے۔
قرآن کریم میں جگہ جگہ دنیوی لذات کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ ان کا ہیچ اور فانی ہونا یقینی ہے اور یہ کہ تمام عیش و عشرت کے سامان محض چند روزہ ہیں اور عالم جاودانی کے مقابلہ میں خواب کی مانند ہیں۔ ارشاد ربانی ہوتا ہے :

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ' ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۝ ﴾

(آل عمران ۱۴)

"لوگوں کے لئے نفسانی خواہشوں کی محبت کو زینت دی گئی ہے' جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کئے ہوئے خزانے سونے چاندی کے اور نشان زدہ گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی' یہ دُنیا کی زندگی کا فائدہ ہے' اور لوٹنے کا اچھا ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے"۔

ایک عرب شاعر بہت خوبصورت انداز میں زندگی کی ناپائیداری بیان کرنے کے بعد انسان کو اعمال صالح کی طرف اس طرح راغب کرتا ہے :

يَا مَنْ بِدُنْيَاهُ اشْتَغَلْ قَدْ غَرَّهُ طُولُ الامَلْ
اَلْمَوْتُ يَأْتِي فَجْأَةً وَالْقَبْرُ صَنْدُوْقُ الْعَمَلْ
اَللَّيْلُ مَهْمَا طَالَ لَا بُدَّ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ وَالْعُمْرُ مَهْمَا طَالَ لَابُدَّ مِن دُخُولِ الْقَبْرِ
يَا ذَالَّذِيْ وَلَدَتْكَ اُمُّكَ بَاكِيًا وَالنَّاس حولَكَ يَضْحَكُوْنَ سُرُوْرًا
اِحرِصْ عَلٰى عَمَلٍ تَكُونُ بِهٖ مَتٰى يَبْكُونَ حَولَكَ ضَاحِكًا مَسْرُوْرًا
إِذَا الْمَرْءُ لَمْ يَلْبَسْ ثِيَابًا مِنَ التُّقٰى تَقَلَّبَ عُرْيَانًا وَاِنْ كَانَ كَاسِيًا
وَخَيْرُ لِبَاسِ الْمَرْءِ طَاعَةُ رَبِّهٖ وَلَا خَيْرَ فِيْمَنْ كَانَ لِلّٰهِ عَاصِيًا
عِشْ رَاضِيًا وَاهْجُرْ دَوَاعِي الْاَلَمْ وَاعْدِلْ مَعَ الظَّالِمِ مَهْمَا ظَلَمْ
نِهَايَةُ الدُّنْيَا فَنَاءٌ فَعِشْ فِيْهَا كَرِيْمًا وَاعْتَبِرْهَا عَدَمْ
اَلدُّنْيَا سَاعَةٌ فَاجْعَلْهَا طَاعَةٌ وَالنَّفْس طَمَاعَةٌ فَالْزِمْهَا الْقَنَاعَةَ
يَا نَفْسُ تُوْبِي فَإِنَّ الْمَوْتَ قَدْ حَانَا وَاعْصِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْهَوٰى مَا زَالَ فَتَّانَا

"اے وہ شخص جس کا مشغلہ ہی دُنیا ہے اور اس کو دھوکا دیا لمبی امید نے' موت

بھی اچانک آئے گی اور قبر عمل کا صندوق ہو گی۔ رات جتنی بھی لمبی ہو جائے فجر ضرور طلوع ہو گی' عمر جتنی بھی لمبی ہو جائے قبر میں جانا ضرور ہے۔ اے انسان جب تیری ماں نے تجھے جنا تھا تو تو رو رہا تھا اور لوگ تیرے ارد گرد ہنستے تھے گویا تیرا مذاق اڑایا گیا۔ پس تو ایسے طریقے سے عمل کر کہ جب وہ روئیں تیرے مرنے کے دن تو تو ہنس رہا ہو۔ جب آدمی تقویٰ کے کپڑے نہ پہنے تو ننگا ہی پلٹے گا اگرچہ اس نے کپڑے پہنے ہوں اور آدمی کا بہترین لباس اپنے پروردگار کی اطاعت ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ دُنیا میں بخوشی زندگی گزار اور تکلیف دہ سب کام چھوڑ' اور ظالم جب ظلم کرے اس کے ساتھ انصاف کر۔ دُنیا کا انجام فنا ہے سو اس میں زندگی گزار شرافت کے ساتھ اور دُنیا کو نہ ہونے کے برابر سمجھ۔ دُنیا ایک گھڑی ہے اس کو نیکی سے پر کرنا چاہئے اور نفس بہت لالچی ہے اس کو گزارے کا عادی بنانا چاہئے۔ اے نفس تو توبہ کر لے کیونکہ موت کا وقت قریب آ گیا ہے اور خواہش کی نافرمانی کر کیونکہ خواہش ہمیشہ فتنہ میں ڈالنے والی ہے"۔

دُنیا ایک امتحان گاہ ہے' اس میں انسان کو مختلف قسم کے حالات پیش آتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی ہے۔ مکہ میں آزمائش و ابتلاء کا دَور ہے اور ہجرت مدینہ ان کے عروج کا آغاز ہے۔ اسی طرح تمام انسانوں میں غربت و امارت' خوشی و غمی میں بھی اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ جو امارت میں دوست ہوتے ہیں وہ غربت میں نہیں۔ خوشیوں میں شریک ہونے والے غمی میں شریک نہیں ہوتے۔ جب آپ دولت مند ہوتے ہیں تو لوگ آپ کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں' اس کے برعکس صورت میں لوگ دُور بھاگتے ہیں۔ بقول شاعر :

إِذَا قَلَّ مَالِي فَمَا خِلٌّ يُصَاحِبُنِي ۔۔۔ وَفِي الزِّيَادَةِ كُلُّ النَّاسِ خُلَّانِي

وَكَمْ مِنْ عَدُوٍّ لِأَجْلِ الْمَالِ صَادَقَنِي ۔۔۔ وَكَمْ مِنْ صَدِيقٍ لِأَجْلِ الْمَالِ عَادَانِي

رَأَيْتُ النَّاسَ قَدْ مَالُوا إِلَى مَنْ عِنْدَهُ مَالٌ ۔۔۔ وَمَنْ لَا عِنْدَهُ مَالٌ فَعَنْهُ النَّاسُ قَدْ مَالُوا

رَأَيْتُ النَّاسَ قَدْ ذَهَبُوا إِلَى مَنْ عِنْدَهُ ذَهَبٌ ۔۔۔ وَمَنْ لَا عِنْدَهُ ذَهَبٌ فَعَنْهُ النَّاسُ قَدْ ذَهَبُوا

رَأَيْتُ النَّاسَ مُنْفَضَّةٌ إِلَى مَنْ عِنْدَهُ فِضَّةٌ ۔۔۔ وَمَنْ لَا عِنْدَهُ فِضَّةٌ فَعَنْهُ النَّاسُ مُنْفَضَّةٌ

"جب میرا مال کم ہو تو کوئی میرا دوست نہیں رہتا' جب زیادہ ہو تو لوگ میرے

دوست ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہی دشمن ہیں جو مال کی وجہ سے میرے دوست بن گئے
اور کتنے ہی دوست ہیں جو مال کی وجہ سے میرے دشمن بن گئے۔ میں نے لوگوں
کو دیکھا کہ وہ مال والے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور جس کے پاس مال نہ ہو اس
سے بھاگتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لوگ اس کے پاس جاتے ہیں جس کے پاس سونا
ہو اور جس کے پاس سونا نہ ہو وہاں سے دُور بھاگتے ہیں۔ میں نے لوگوں کو دیکھا
کہ جس کے پاس چاندی ہو اس کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں اور جس کے پاس
چاندی نہ ہو تو وہاں سے دور بھاگتے ہیں"۔

اسلام اس بات پر زور دیتا ہے انسان اپنی خواہشات کو اسلام کے مطابق ڈھالے۔
سو ہوشیار اور سمجھدار آدمی وہی ہے جو دُنیا میں اللہ جل شانہ کی مرضی کے مطابق زندگی
گزارے اور سب گناہوں سے ہر حال میں بچے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت
سے نہ ڈرے۔

فقیہ عمار الیمنی نے اہرام مصر کے بارے میں کہا ہے :

خَلِیْلَیَّ مَا تَحْتَ السَّمَاءِ بَنِیَّۃ
مُمَاثِلٌ فِی اِتْقَانِهَا هَرْمَیْ مِصْرَ
بِنَاءٌ یَخَافُ الدَّهْرُ مِنْهُ وَكُلٌّ مَا
عَلَی ظَاهِرِ الدُّنْیَا یَخَافُ مِنَ الدَّهْرِ
تَنَزَّهُ لِمَرفی فِیْ نَدِیْعِ بِنَاءِ هَا
وَلَم یَتَنَزَّهُ فِی الْمُرَادِ بِهَا فِکْرِیْ

"دوستو! آسمان کے نیچے کوئی عمارت ایسی نہیں جو اپنے استحکام میں مصر کے دو
ہرموں کے مشابہ ہو۔ یہ ایسی عمارت ہے جس سے زمانہ بھی ڈرتا ہے حالانکہ
روئے زمین کی دوسری چیزیں زمانے سے ڈرتی ہیں۔ میری آنکھ اس عجیب و
غریب عمارت کو دیکھ کر محظوظ ہوتی ہے لیکن یہ عمارت جس مقصد کے لئے بنائی
گئی ہے 'اُس کے تصور سے میرا ذہن محظوظ نہیں ہوتا"۔

انسان دُنیا میں ہمیشہ زندہ رہنے کا طالب رہا ہے' یہ خواہش انسان کی سب سے بڑھی ہوئی
خواہشات میں سے ایک ہے۔ قرآن کریم نے انسان کی اس معاملے میں رہنمائی کی ہے کہ

اگر آپ ابدی زندگی چاہتے ہیں تو جس ہستی نے آپ کو بنایا ہے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کیجئے اور اس کے احکام کی تنفیذ و تکمیل کے لئے دُنیا میں جہاد کیجئے۔ کامیابی و کامرانی آپ کا مقدر بنے گی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ ﴾ (التوبہ ۱۱۱)

"بلاشبہ اللہ نے مومنین سے خرید لیا ہے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس کے عوض کہ انہیں جنت ملے گی۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں سو (کبھی) مار ڈالتے ہیں اور (کبھی) مار ڈالے جاتے ہیں۔ اس پر (ہماری طرف سے) سچا وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں' اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہے؟ سو تم خوشی مناؤ اپنی اس تجارت پر جس کا تم نے سودا کیا ہے' اور یہی بڑی کامیابی ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا غایت درجہ کرم ہے کہ ہماری جان و مال کا مالک ہونے کے باوجود ہم کو ان کے بدلے میں جنت عطا فرما رہے ہیں' ورنہ ہماری جان اور ہمارا مال ہماری ملکیت تو نہیں ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ستر شرفائے مدینہ نے آکر نبی اکرم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی تو ان کے ایک سردار عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ اپنے اور اپنے رب کی طرف سے شرطیں بیان فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے رب کی طرف سے تو یہ شرط ہے کہ اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور میری طرف سے شرط یہ ہے کہ جس طرح اپنے جان و مال کی حفاظت کرتے ہو اس طرح میری بھی حفاظت کرو۔ وہ بولے اچھا تو پھر ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا جنت۔ وہ لوگ بول اُٹھے کہ یہ سودا تو بڑے نفع کا ہوا۔ ہم نہ اس تجارت کو توڑیں گے اور نہ اس کے توڑنے کی درخواست کریں گے!

متذکرہ بالا وعدہ اُمت محمدیؐ کے ایک ایک مجاہد سے قیامت تک طے ہو چکا ہے۔

اور ہمارے لئے تو یہ وعدہ ہی کافی ہے کہ اس کا کرنے والا کوئی اور نہیں خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو اپنے وعدہ کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ اور وعدہ کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اس میں انسان کی سب سے بڑی خواہش یعنی ابدی زندگی کی خوشخبری بھی دی گئی ہے۔ اس آیت میں مذکور تورات اور انجیل کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تجارت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی کیا تھا مگر انہوں نے دُنیا کی تجارت کو اس عظیم تجارت پر ترجیح دی اور اس بڑی کامیابی کو ٹھکرا کر خسارے والی تجارت کو اپنایا۔ قرآن کریم میں سورۃ البقرہ میں اس تجارت کو اپنانے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کو مُردہ بھی نہ کہا جائے کیونکہ وہ زندہ ہیں اور ہم اس کا شعور نہیں رکھتے ہیں :

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ ﴾ (البقرہ ۔ ۱۵۴)

"اور ان کو مُردہ نہ کہو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے"۔

لیجئے قرآن کریم نے ہماری اس "خواہش" کا مسئلہ تو حل کر دیا ہے اور ہمارے سامنے ابدی زندگی کا راستہ اور ہماری اس خواہش کے حصول کا ذریعہ بیان کرتے ہوئے اس کی تکمیل کا سامان کر دیا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم ان راستوں میں سے کس کا انتخاب کرتے ہیں؟

مآخذ :

(۱) جہان دیدہ، جسٹس محمد تقی عثمانی

(۲) ترجمہ احوال الجنۃ واھوال النار، محمد عتیق الرحمٰن

(۳) تفسیر ماجدی، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

غلطیوں کی اصلاح کا نبویؐ طریق کار (۶)

تالیف : علامہ محمد صالح المنجد   مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

لوگوں کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے
نبی اکرم ﷺ کے اختیار کردہ مختلف اسلوب

۱۹) جہاں غلطی ہو' اس پر تنبیہ کر کے باقی عمل کو قبول کرنا :

بعض اوقات کوئی بات یا کوئی کام سارے کا سارا غلط نہیں ہوتا' اس صورت میں حکمت کا تقاضا ہے کہ صرف اتنی چیز کو غلط کہا جائے جو غلطی پر مشتمل ہے' پوری بات یا سارے عمل کو غلط قرار نہ دیا جائے۔ اس کی دلیل صحیح بخاری کی وہ حدیث ہے جو حضرت رُبَیِّع بنت مُعَوِّذ بن عَفراء (رضی اللہ عنہا) سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب میری رخصتی ہوئی تو نبی اکرم ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ آپؐ میرے پاس اس طرح بیٹھ گئے جس طرح تم (۷۵) بیٹھے ہوئے ہو۔ ہماری کچھ بچیاں دف بجانے لگیں اور جنگ بدر میں ہمارے جو بزرگ جاں بحق ہوئے تھے' ان کے بارے میں شعر پڑھنے لگیں۔ اس دوران ایک لڑکی نے یہ شعر پڑھا: وَفِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ (ہم میں وہ نبی ہے جو کل کو پیش آنے والے حالات سے باخبر ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ بات چھوڑ دے' اور جو کچھ تو پہلے کہہ رہی تھی' وہی کہتی رہ۔"(۷۶)

ترمذی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس بات سے خاموش رہ' اور وہ بات کہہ جو تو اس سے پہلے کہہ رہی تھی۔"(۷۷)

ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ بات نہ کہو' جو کچھ کل ہونے والا ہے اسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔"(۷۸)

اس رویئے کے نتیجے میں غلطی کرنے والے کو اصلاح کرنے والے کے عدل و انصاف کا احساس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے غلطی کرنے والا اس کی تنبیہہ کو آسانی سے قبول کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگ غلطی دیکھ کر اس قدر غضب ناک ہوتے ہیں کہ وہ اس کی صحیح اور غلط پر مشتمل پوری بات کو غلط کہہ کر رد کردیتے ہیں جس کی وجہ سے غلطی کرنے والا بھی اپنی غلطی تسلیم کرکے اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتا۔

بعض اوقات غلطی اُن الفاظ میں نہیں ہوتی جو کہے گئے ہیں، بلکہ جس موقعہ پر وہ الفاظ کہے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہوتا۔ جیسے جب کسی کی وفات ہو جاتی ہے تو تعزیت کے لئے آنے والوں میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ فاتحہ پڑھیں اور تمام حاضرین سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں۔ دلیل کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن ہی پڑھا ہے کوئی کفریہ کلام تو نہیں پڑھا۔ تو ایسے لوگوں کے لئے یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ ان کے عمل میں جو غلطی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس موقعہ پر ایک عبادت کے طور پر فاتحہ کی تخصیص کرلی ہے حالانکہ اس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، اور بدعت یہی تو ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسی نکتہ کی طرف توجہ دلائی تھی جب ان کے قریب ایک شخص کو چھینک آئی اور اُس نے کہا. اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ والسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ تو ابن عمرؓ نے فرمایا "یہ تو میں بھی کہتا ہوں کہ سب تعریف اللہ کے لئے (الحمد للّٰہ) اور رسول اللہ (ﷺ) پر سلام ہو (والسلام علی رسول اللّٰہ)، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس طرح کہنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ہر حال میں الحمد للہ کہیں۔"(۷۹)

۲۰) حق دار کو حق دلانے کے ساتھ ساتھ غلطی کرنے والے کے مقام کا احترام برقرار رکھنا:

امام مسلم نے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا "خاندان حمیر سے تعلق رکھنے والے ایک صحابی نے (جنگ کے دوران) دشمن کے ایک آدمی کو قتل کیا۔ انہوں نے مقتول کا سامان لینا چاہا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں وہ سامان دینے سے انکار کردیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس فوج کے سپہ سالار تھے۔ حضرت عوف

بن مالک رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ حضور علیہ السلام نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے فرمایا : "آپ نے اُسے اس کا لوٹ کا سامان دینے سے کیوں انکار کیا؟" انہوں نے کہا: "یا رسول اللہ! میں نے محسوس کیا کہ یہ بہت زیادہ ہے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اسے وہ سامان دے دیجئے"۔ اس کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ حضرت عوف رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو انہوں نے حضرت خالدؓ کی چادر کھینچی' اور (حمیری صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے) کہا: میں نے تجھ سے جو کچھ کہا تھا' وہ کام رسول اللہ ﷺ سے کروا دیا نا؟ جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سنی تو غضبناک ہو گئے۔ فرمایا۔ "خالد! اسے نہ دینا' خالد' اسے نہ دینا' کیا تم میرا لحاظ کر کے میرے (مقرر کردہ) امیروں کو چھوڑ نہیں سکتے؟ تمہاری اور ان کی مثال تو ایسے ہے جیسے ایک آدمی کو اونٹوں یا بکریوں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی' اُس نے ان کا خوب اچھی طرح خیال رکھا۔ پھر ان کو پانی پلانے کے وقت کا خیال رکھا' اور انہیں (بروقت) حوض پر لے گیا' انہوں نے پانی پینا شروع کیا تو صاف پانی پی لیا اور گدلا پانی چھوڑ دیا۔ تو صاف پانی تو تم لوگوں کے لئے ہے اور گدلا پانی ان (سالاروں) کے لئے ؟"(۸۰)

امام احمد رحمہ اللہ نے اس سے زیادہ تفصیل سے یہ واقعہ روایت کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہم شام کی طرف جہاد کے لئے گئے' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ہمارا امیر مقرر کیا گیا۔ عوف فرماتے ہیں: حمیر کی امدادی فوج کا ایک آدمی ہمارے ساتھ آملا۔ وہ ہمارے خیمہ میں آگیا۔ اس کے پاس صرف ایک تلوار تھی اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ایک مسلمان نے ایک اونٹ ذبح کیا' اُس نے کسی نہ کسی طرح اس کی کھال کا ڈھال کی شکل کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا۔ اُس نے اسے زمین پر بچھا کر آگ جلا کر خشک کر لیا۔ پھر ڈھال کی طرح اُس کو ایک دستہ لگا دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ دشمنوں سے ہماری مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ ان میں رومی بھی تھے اور قضاعہ قبیلے کے عربی بھی۔ انہوں نے ہم سے بڑی شدید جنگ کی۔ ان کی فوج میں ایک رومی سرخ گھوڑے پر سوار تھا' جس کی کاٹھی پر سونا لگا ہوا تھا' اس کی پیٹی پر بھی بہت سونا لگا ہوا تھا' اور تلوار بھی ایسی ہی تھی۔ وہ مسلمانوں پر حملے کرنے لگا اور اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔ مسلمانوں کی

امدادی فوج کا وہ مجاہد اس رومی کی تاک میں رہا' حتی کہ جب وہ اس کے پاس سے گزرا تو اس پر پیچھے سے حملہ کردیا' اس کی تلوار گھوڑے کی ٹانگ پر لگی' وہ آدمی گر گیا۔ مجاہد نے اس پر تلوار کے وار کر کے اسے قتل کر دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی' تو اس نے اپنے سامان کا مطالبہ کیا (جو مقتول کافر سے حاصل ہوا تھا)' لوگوں نے گواہی دی کہ اسی نے اس رومی کو قتل کیا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے کچھ سامان دیا' باقی روک لیا۔ جب وہ حضرت عوف رضی اللہ عنہ کے خیمے میں آیا تو یہ بات بتائی۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: دوبارہ ان کے پاس جایئے' وہ باقی سامان بھی دے دیں گے۔ وہ دوبارہ گیا' لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کا مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور فرمایا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ ہے کہ سلب (مقتول کا ذاتی سامان) قاتل کے لئے ہوتا ہے؟ خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ یہ سامان اس کے لئے بہت زیادہ ہے۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی (یعنی جب بھی خدمت نبوی میں حاضر ہوا) تو یہ واقعہ ضرور عرض کروں گا"۔ جب وہ مجاہد مدینہ آیا تو حضرت عوف رضی اللہ عنہ کے کہنے پر اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد رضی اللہ عنہ کو بلا لیا۔ (جب وہ آئے تو) عوف رضی اللہ عنہ (مجلس میں) بیٹھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "خالد! آپ نے اس شخص کو اس کے مقتول کا سامان کیوں نہیں دیا؟" انہوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میرے خیال تھا کہ وہ بہت زیادہ ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ اسے دے دیجئے"۔ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر) خالد رضی اللہ عنہ عوف رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو عوف رضی اللہ عنہ نے ان کی چادر کھینچی اور (حمیری صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے) کہا: میں نے تیرے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بات عرض کی تھی' اس کا تجھے فائدہ پہنچ جائے گا"۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غضبناک ہو کر فرمایا: "خالد! اسے نہ دینا۔ کیا تم میرا لحاظ کر کے میرے (مقرر کردہ) امیروں کو نہیں چھوڑ سکتے؟ تمہاری اور ان (امراء) کی مثال تو ایسے ہے جیسے کسی شخص کو اونٹ یا بکریاں چرانے کی ذمہ داری سونپی گئی' اس نے انہیں چرایا' پھر ان کو پانی پلانے کے لئے اچھی جگہ تلاش کی'

پھر انہیں (وہاں بنے ہوئے) حوض پر لے گیا' انہوں نے پانی پینا شروع کر دیا' اور (سارا) صاف پانی پی لیا مگر گدلا پانی چھوڑ دیا۔ (تمہاری حالت بھی یہی ہے کہ) صاف پانی تو تمہارے لئے ہے اور گدلا ان کے لئے"۔ (۸۱)

ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت خالد بنٹھ سے اجتہادی غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے قاتل کو زیادہ سلب نہیں دیا' تو نبی اکرم ﷺ نے حق دار کو اس کا حق دیئے جانے کا حکم دے کر اس غلطی کا ازالہ کر دیا۔ لیکن حضور ﷺ نے جب یہ سنا کہ حضرت عوف بنٹھ نے حضرت خالد بنٹھ کا مذاق اُڑاتے ہوئے حمیری صحابی سے کہا کہ میں نے تجھ سے جو کچھ کہا تھا' کیا میں نے وہ کام رسول اللہ ﷺ سے کروا دیا یا نہیں؟ تو آنحضرت ﷺ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اور حضرت عوف بنٹھ نے حضرت خالد بنٹھ کی چادر کھینچی تھی جب وہ ان کے پاس سے گزر رہے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "خالد! اسے مت دینا"۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ امیر اور قائد پر اعتماد بحال رکھا جائے' کیونکہ لوگوں میں ان کے مقام کو قائم رکھنے میں واضح فوائد موجود ہیں۔ (جاری ہے)

بقیہ : ایمانیات ثلاثہ

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

ایمان بالرسالت کا تقاضا خود رسول اللہ ﷺ کے الفاظ میں یہ ہے :

((یَاَیُّھَا النَّاسُ لَیْسَ مِنْ شَیْئٍ یُقَرِّبُکُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ وَیُبَاعِدُکُمْ مِّنَ النَّارِ اِلاَّ قَدْ اَمَرْتُکُمْ بِہٖ ' وَلَیْسَ مِنْ شَیْئٍ یُقَرِّبُکُمْ اِلَی النَّارِ وَیُبَاعِدُکُمْ مِنَ الْجَنَّۃِ اِلاَّ قَدْ نَھَیْتُکُمْ عَنْہُ)) (بیہقی' و رزین' عن ابن اسود بنٹھ)

"اے لوگو! کوئی چیز نہیں ہے جو تمہیں جنت سے قریب کرے اور دوزخ سے دور مگر وہی جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے' اور کوئی چیز نہیں جو تمہیں دوزخ کے قریب کرے اور جنت سے دور مگر وہی جس سے میں نے تمہیں روکا ہے"۔

(جاری ہے)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد : ۴۷

شمارہ : ۹

جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ

ستمبر ۱۹۹۸ء

فی شمارہ ۱۰/-

سالانہ زر تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ 'کینیڈا' آسٹریلیا 'نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب 'کویت' بحرین 'قطر — 17 ڈالر (600 روپے)
  عرب امارات 'بھارت' بنگلہ دیش 'افریقہ' ایشیا
  یورپ 'جاپان
- ایران 'ترکی' اومان 'مسقط' عراق — 10 ڈالر (400 روپے)
  الجزائر 'مصر'

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ' مرکزی انجمن' طابع: رشید احمد چودھری' مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

وطن عزیز میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سیاسی رُت میں بھی تغیر و تبدل کے آثار نمایاں ہیں۔ تبدیلی کی ہوا میں تیزی اور شدت صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ بھاری مینڈیٹ خود اپنے ہی بوجھ تلے سسکتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ حکومت جو صرف تین ماہ قبل ۲۸ مئی کے ایٹمی دھماکے کے بعد سیاسی طور پر نہایت مستحکم اور مضبوط و توانا نظر آتی تھی اور جس سے ٹکر لینا خود پاش پاش ہونے کے مترادف سمجھا جاتا تھا' آج سیاسی اعتبار سے شدید ضعف و اضمحلال کا شکار اور عبرت کا نشان بنی ہوئی ہے ـــــ میاں نواز شریف کو بر سر اقتدار آئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ ہی دن ہوئے ہیں۔ گزشتہ سال فروری کے انتخابات میں مسلم لیگ کی بے مثال کامیابی پر ملک بھر میں جشن کا سماں تھا۔ انتخابی میدان میں پیپلز پارٹی کی بد ترین شکست پر اہل پاکستان کی ایک عظیم اکثریت نے سکھ کا سانس لیا کہ اس کے سابقہ دور حکومت میں لوٹ مار کے تمام سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے تھے اور بے نظیر حکومت کا مزید ملک و قوم پر مسلط رہنا لوگوں کیلئے اعصاب شکن ثابت ہو رہا تھا۔ اس تناظر میں عوام نے کھلے دل کے ساتھ نواز شریف کی حکومت کا خیر مقدم کیا اور لاتعداد نیک اور خوشنما توقعات حکومت سے وابستہ کرلیں۔ میاں نواز شریف نے بھی قومی اسمبلی میں اپنی "بروٹ میجارٹی" پر اکتفا نہیں کی' بلکہ اپنے اقتدار کو مزید استحکام بخشنے اور اسے ناقابل شکست بنانے کیلئے دستورِ پاکستان میں پے بہ پے دو ترامیم کے ذریعے نہ صرف یہ کہ صدر پاکستان کے خصوصی اختیارات جو آٹھویں ترمیم کے نتیجے میں انہیں حاصل تھے' سلب کر کے ان کا وہ ڈنک ہمیشہ کے لئے نکال دیا جو کسی بھی وقت ان کے اقتدار کے لئے خطرہ بن سکتا تھا بلکہ ارکان اسمبلی کے بھی پر کاٹ کر انہیں "ربڑ سٹمپ" بنا دیا۔ اپوزیشن تو اول روز سے نہایت کمزور و ناتواں تھی ہی' لہٰذا میاں نواز شریف بلا شرکت غیرے ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن کر کوس لمن الملک بجانے لگے۔

توقع یہ تھی کہ "عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا" کے مصداق وطن عزیز میں سالہا سال سے جاری سیاسی عدم استحکام کو اب استحکام نصیب ہو جائے گا اور دم توڑتی ہوئی

ملکی معیشت کو سانس لینا نصیب ہو گا اور وہ از سر نو ٹھوس بنیادوں پر استوار کی جا سکے گی۔ عوام کو یہ حسن ظن بھی تھا کہ نئی حکومت مہنگائی کے جن کو واپس بوتل میں بند کرنے اور بڑھتی ہوئی دہشت گردی کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جائے گی ـــــ مگر افسوس کہ یہ ساری توقعات نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ حکمران طبقے کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی' اہم ملکی امور میں اپوزیشن تو کجا اپنے پارٹی ارکان اور سیاسی حلیفوں سے بھی مشورہ نہ کرنے کی عادت بد' غلط اور نامناسب فیصلوں پر اصرار اور سب سے بڑھ کر اللہ کے دامن کو تھامنے کی بجائے دائیں بائیں سے سہارے تلاش کرنے کی کوشش کے نتیجے میں ہر آنے والا دن نواز شریف حکومت کے لئے عوامی حمایت میں کمی کا پیغام لایا ـــــ گزشتہ ڈیڑھ سال کے دوران متعدد بار موجودہ حکومت کو مختلف اعتبار سے جھٹکے لگے اور وہ عدم استحکام کا شکار ہوئی۔ کبھی آٹے کے بحران کے حوالے سے' کبھی چیف جسٹس کے ساتھ ناروا طور پر سینگ پھنسانے کے نتیجے میں اور کبھی حکومت مخالف سیاسی اتحادوں کی تشکیل اور ان کی ریلیوں کے حوالے سے' لیکن تین ماہ قبل شدید ترین عوامی دباؤ کے مقابلے میں امریکہ کے شدید دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے ایٹمی دھماکہ کرنے کا جرأت مندانہ فیصلہ میاں نواز شریف کے لئے سیاسی اعتبار سے نہایت مبارک ثابت ہوا اور ان کا عوامی مقبولیت کا گرتا ہوا گراف یکلخت انتہائی بلندیوں کو چھونے لگا اور موجودہ حکومت ایک بار پھر ایک ناقابل شکست قوت کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی ـــــ غور طلب بات یہ ہے کہ پچھلے تین ماہ کے اندر اندر یہ عوامی حمایت اور مقبولیت عرش سے گر کر فرش تک کیوں آ گئی؟ آج ہر جانب سے نواز شریف سے استعفے کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ قبل ازیں کالا باغ ڈیم کے حوالے سے تینوں چھوٹے صوبے پنجاب اور مرکزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں ایم کیو ایم نے حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر کے سندھ میں حکومت کو شدید سیاسی ضعف سے دوچار کیا اور اب افغانستان پر کروز میزائلوں کے ذریعے امریکی حملے کے ضمن میں حکومت کے متضاد بیانات کے حوالے سے استعفا کا مطالبہ زور پکڑتا دکھائی دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ ایٹمی دھماکہ کرنے اور امریکی دباؤ کو خاطر میں نہ لانے کی سزا

ہے جو نواز شریف حکومت کو ملی ہے یا یہ کہ برسراقتدار طبقے کی اپنی نااہلی' ناقص حکمت عملی اور غلط فیصلوں کا نتیجہ ہے کہ جو اس صورت میں سامنے آیا ہے ـــــ ہم حکومت کی نااہلی اور ناقص حکمت عملی کو خارج از امکان قرار نہیں دیتے' لیکن ہمارے نزدیک اس مخدوش صورتحال کا اصل سبب یہ ہے کہ عالمی دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے ایٹمی دھماکے کا فیصلہ کرنا فی الحقیقت عالمی طاقتوں کے سے ٹکر لینے کے مترادف تھا۔ ان قوتوں سے مقابلے کے لئے ضروری تھا کہ حکومت' کائنات کی عظیم ترین طاقت یعنی اللہ کا سہارا اور اس کی نصرت و تائید حاصل کرتی جس کا واحد راستہ یہ تھا کہ ملک سے سودی نظام کے خاتمے کا اعلان اور دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کے لئے ضروری ترمیم کرکے دستورِ پاکستان کو منافقت سے پاک اور صحیح معنوں میں اسلامی دستور بنایا جاتا ـــــ امیر تنظیم اسلامی نے ایٹمی دھماکے کے دو ہی روز بعد جس اخباری اشتہار کے ذریعے میاں نواز شریف صاحب سے "دینی دھماکہ" کرنے کا مطالبہ کیا تھا اس میں دینی دھماکہ کرنے سے گریز کے خوفناک نتیجے اور انجام سے بھی متنبہ کر دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ امیر تنظیم اسلامی اور بعض دیگر زعمائے ملت کے بار بار توجہ دلانے کے باوجود حکومت نے اس معاملے میں مسلسل لیت و لعل کی روش جاری رکھی' نتیجہ سب کے سامنے ہے ـــــ اس صورتحال میں میاں نواز شریف کے لئے اصلاح اور بہتری کا واحد راستہ وہی ہے جس کی نشاندہی امیر تنظیم اسلامی بار بار کر چکے ہیں۔ شنید ہے کہ حکومت نے قومی اسمبلی میں قرآن و سنت کی بالادستی کے حوالے سے ترمیمی بل لانے کے لئے سنجیدہ کوشش کا آغاز کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ قدم "بعد از خرابی بسیار" اٹھایا جا رہا ہے لیکن ہم ہر حال میں اس کا خیر مقدم کریں گے۔ میاں نواز شریف اگر اب بھی ان اقدامات کے ذریعے اللہ کا دامن تھام لیں تو ان کی دنیا اور آخرت دونوں سنور سکتے ہیں' بصورت دیگر اشخاص کا برسراقتدار آنا یا محروم ہونا اتنا اہم نہیں ہوتا' ملک و قوم کا مستقبل زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور پاکستان کا مستقبل بہرطور اسلام کے ساتھ وابستہ ہے!○○
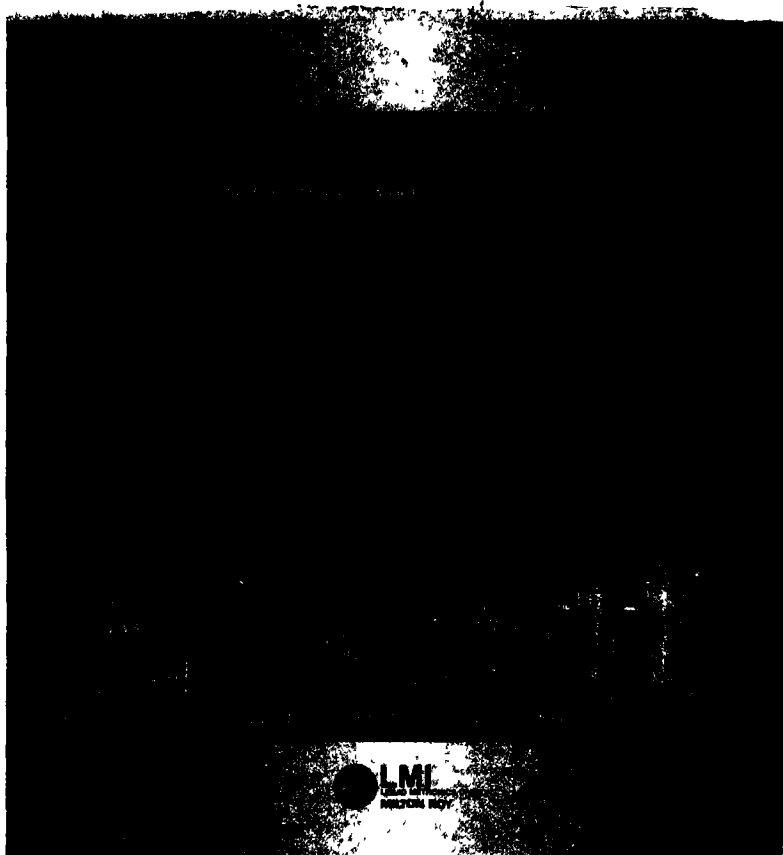
LMI
MILTON ROY

مسلح تصادم

اُحد ـ و ـ احزاب

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن)

غزوہ اُحد

غزوۂ بدر رمضان المبارک ۰۲ھ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ تیرہ ماہ بعد شوال ۰۳ھ میں مشرکین مکہ کے ایک لشکر جرار نے مدینہ پر چڑھائی کردی جو جوشِ انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت ان کے سینوں میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن حضرات کو قبائلی زندگی کا کچھ تجربہ ہے اور جنہیں عرب کے انتقامی جذبات و احساسات سے کچھ واقفیت ہو اور جنہوں نے ان کی اس دور کی شاعری اور خطبات پڑھے ہوں وہ کچھ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اُس وقت ان کی زندگی کس طور پر اجیرن ہوگئی تھی۔ مکہ والوں نے غزوۂ بدر کے بعد ایک دن بھی چین و آرام میں نہیں گزارا۔ انتقامی جذبات لاوے کی طرح ہر دل میں کھول رہے تھے۔ ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک مقتولین بدر کا انتقام نہیں لے لیا جائے گا نہ خوشبو لگاؤں گا نہ چارپائی پر سوؤں گا۔ اسی طرح اس ایک سال کے دوران ہندہ کا جو حال رہا ہے وہ بھی ناقابل تصور ہے' جس کا باپ مارا گیا' چچا مارا گیا' بھائی مقتول ہوا۔ یہ ہندہ ابوسفیان کی بیوی' عتبہ کی بیٹی اور حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ' جو سابقون الاولون میں سے ہیں' کی بہن ہیں۔ ہندہ بھی فتح مکہ کے موقع پر ایمان لے آئی تھیں اور مومنہ صادقہ ثابت ہوئیں۔

قریش کی پیش قدمی اور حضور ﷺ کی مشاورت

بہرحال اب جو لشکر مدینہ پر چڑھ دوڑا تھا وہ تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ قریش اپنی اور اپنے حلیفوں کی جو ممکنہ قوت اور طاقت جمع کر کے لا سکتے تھے وہ لے کر میدان میں آ گئے۔ اس موقع پر بھی نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک مشاورت منعقد فرمائی کہ اس موقع پر کیا حکمت عملی اختیار کیا جائے' جبکہ تین ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کرنے آ رہا ہے۔

حضور ﷺ کی ذاتی رائے تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عجیب اتفاق ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی رائے بھی یہی تھی۔ آخر جھوٹا انسان ہر موقع پر تو جھوٹ نہیں بولتا' کبھی وہ سچ بھی بولتا ہے۔ عبداللہ بن ابی مدینہ کا رہنے والا تھا' لہٰذا وہ اپنے حالات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس طرح کی صورت حال میں مدینہ والے محصور ہو کر مدافعت کیا کرتے تھے تاکہ مرد گلیوں میں دُوبدو لڑیں اور عورتیں اوپر سے دشمن پر پتھراؤ کریں۔ اس طرح گویا کہ ان کی دوہری طاقت روبکار آ جاتی تھی۔ چنانچہ انہی مصلحتوں کے پیش نظر عبداللہ بن ابی کی رائے بھی یہ تھی کہ ہمیں کھلے میدان میں جنگ کرنے کے بجائے محصور ہو کر اپنی مدافعت کرنی چاہئے۔ بعض قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا رجحان بھی یہی تھا۔

لیکن ایک تو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات کھلے میدان میں جنگ کرنے کے حامی تھے' جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی نام شامل ہے ـــــ اب یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے تھا کہ اسی جبل اُحد کے دامن میں ان کی شہادت ہونی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے خصوصی جوش و خروش کا مظاہرہ ہو رہا تھا کہ ہمیں محصور ہو کر نہیں بلکہ مردانہ وار دُوبدو جنگ کرنی چاہئے' ہمیں تو شہادت درکار ہے ـــــ دوسرے یہ کہ نوجوانوں کی طرف سے بھی یہی مطالبہ تھا' خاص طور پر ان کی طرف سے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے' کیونکہ غزوۂ بدر کے موقع پر نفیرعام تو تھی ہی نہیں۔ اُس وقت نبی اکرم ﷺ اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم جو نکلے تھے وہ جنگ کے ارادے سے تو نکلے ہی نہیں تھے۔

تو اندازہ کیجئے کہ جو لوگ اس غزوہ میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے ان کے سینوں میں کتنی حسرت ہوگی کہ وہ کتنی بڑی سعادت سے محروم رہ گئے۔ لہٰذا ان کا جوش و خروش بھی دیدنی تھا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کرنی چاہئے۔ پھر اس تیرہ ماہ کے عرصہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے' ان کے ذہنوں میں ہو سکتا ہے یہ بات ہو کہ جب تین سو تیرہ اہل ایمان نے بدر میں اتنی بڑی فتح حاصل کی ہے تو اللہ کی مدد آخر یہاں بھی تو ہمارے شامل حال ہوگی' لہٰذا فتح تو ہمیں ہونی ہی ہونی ہے' ہم اپنے دامن پر یہ داغ کیوں گوارا کریں کہ ہم نے مَردوں کی طرح کھلے میدان میں جا کر جنگ نہیں کی۔ پس یہ مختلف اسباب تھے جن کی وجہ سے محسوس ہوا کہ زیادہ لوگوں کی خواہش ہے کہ کھلے میدان میں جنگ ہو۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمادیا کہ کھلے میدان ہی میں مقابلہ کیا جائے گا۔ اس طرح جماعتی زندگی کا ایک اہم اصول سامنے آگیا۔ مشورہ اور اس کی اہمیت سامنے آگئی۔ اگرچہ اسلامی نظم جماعت میں فیصلہ کا آخری اختیار امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے' وہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہوتا' لیکن تدبیر کے معاملہ میں اپنے ساتھیوں کی دلجوئی کے لئے اور ان کے اندر ایک باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے امیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بعض مواقع پر اپنے ساتھیوں کا احترام کرتے ہوئے ان کی رائے کے مطابق فیصلہ دے' جیسا کہ حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے سامنے آتا ہے۔ البتہ یہ طرزِ عمل صرف تدبیر کے معاملہ میں اختیار کیا جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ نص میں' یعنی ایسے معاملے میں جہاں اللہ اور اس کے رسول کا صریح حکم موجود ہو یہ طرزِ عمل ہرگز اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ تدبیر کے معاملہ میں بھی یہ بات ذہن نشین رہے گی کہ گو تدبیر ہماری ہے لیکن مآل کار تمام معاملات کا اختیار تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' جو وہ چاہے گا نتیجہ اس کے مطابق ظاہر ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کی اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ فرمادیا کہ کھلے میدان میں جنگ ہوگی۔ اس کے بعد غیر معمولی واقعہ یہ ہوا کہ نبی اکرم ﷺ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔ جب آپؐ باہر تشریف لائے تو آپؐ نے زرہ زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ماتھا ٹھنکا

—— قبل ازیں حضور ﷺ نے خواب بھی دیکھا تھا کہ ایک گائے ذبح ہوئی ہے' اور بھی چند باتیں خواب میں ایسی دیکھی تھیں جن کی بنا پر حضور ﷺ کو اندازہ تھا کہ میدان اُحد میں چند غیر معمولی اور ناخوشگوار واقعات ظہور پذیر ہوں گے۔ حضور ﷺ کو زرہ پہنے دیکھ کر لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں' آپ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کیجئے اور انتظام فرمائیے۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں' یہ فیصلہ برقرار رہے گا۔ نبی کو یہ زیبا نہیں ہے کہ ہتھیار باندھنے کے بعد بغیر جنگ کئے انہیں اتار دے۔

قریباً یہی بات سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں فرمائی گئی ہے جو گویا حضور ﷺ کے اس طرزِ عمل کی توثیق میں نازل ہوئی —— یہ بات متفق علیہ ہے کہ سورۂ آل عمران کا بیشتر حصہ غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہوا ہے —— محولہ بالا آیت میں بالکل وہی نقشہ ہے جس پر حضور ﷺ نے عمل فرمایا تھا۔ گویا جو کام نبی اکرم ﷺ نے اپنے ذاتی اجتہاد سے کئے' بعد میں اللہ کی طرف سے قرآن مجید میں ان کی توثیق آگئی —— وہ آیت مبارکہ یہ ہے کہ :

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾

"اے نبی (ﷺ)! یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر بڑا فضل و کرم اور بڑی رحمت ہے کہ آپ اپنے ان ساتھیوں کے حق میں بڑے نرم ہیں (جو ان کی دلجوئی فرماتے ہیں)۔ اگر آپ کہیں سخت دل اور تُند خُو ہوتے تو یہ لوگ منتشر ہو گئے ہوتے (آپ کے پاس سے چھٹ گئے ہوتے)"۔ اقبال نے اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے ایک شعر میں سمو دیا ہے کہ ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

یہ خوئے دلنوازی جناب محمد رسول اللہ ﷺ میں بتمام و کمال موجود تھی۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس اسلوب سے فرمائی : ﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ﴾ "پس آپ ان کی خطاؤں سے درگزر کیجئے' ان کے لئے استغفار بھی کرتے رہا کیجئے اور ان سے معاملات میں مشورہ بھی لیجئے"۔ ﴿ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ "پس جب آپ فیصلہ کریں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے"۔ یعنی پھر فیصلوں کا بار بار بدلنا درست نہیں۔ آیت کا

اختتام ہوتا ہے ان عظیم ترین الفاظ مبارکہ پر : ﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ﴾ ”بلاشبہ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے“۔ جن کو اللہ محبوب قرار دے‘ ان سے خوش بخت و خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے!

اُحد کی جانب کوچ اور منافقین کا طرزِ عمل

نبی اکرم ﷺ نے ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ سے جبلِ اُحد کی جانب کوچ فرمایا‘ لیکن راستے ہی میں عبداللہ بن ابی تین سو افراد کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے کر چلا گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا اور ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم ساتھ کیوں دیں اور اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالیں؟ اب آپ اندازہ کیجئے کہ مدنی دور کے قریباً ڈھائی سال کے اندر اندر جنگ کے قابل مسلمانوں کی کل نفری کا لگ بھگ ایک تہائی حصہ منافقین پر مشتمل ہو چکا تھا۔ معاملہ کی نزاکت کا اندازہ کیجئے کہ جو تین سو واپس چلے گئے ان کے منافق ہونے میں تو کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے علاوہ کمزور اور ضعف ایمان والے اور بھی تھے۔ یہ جو سات سو افراد رہ گئے تھے‘ ان میں بھی تھے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ دامنِ اُحد میں پہنچ کر مدینہ کے دو خاندانوں کے افراد نے کم ہمتی کے باعث واپس لوٹنا چاہا —— سورۂ آل عمران میں اس کا ذکر بھی موجود ہے : ﴿ اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا ﴾ ”یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ ڈھیلے پڑ گئے تھے (کمزوری دکھانے والے تھے) لیکن اللہ ان کا مددگار تھا“۔ وہ ان کا پشت پناہ تھا‘ اس نے ان کو سنبھال لیا اور وہ میدان میں ڈٹے رہے —— چنانچہ یہ دونوں گروہ بعد میں کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ”مِنْکُمْ“ قرار دیا ہے۔ یعنی امتِ محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی میں شامل قرار دیا ہے اور اپنی ذاتِ سبحانہ کو ہمارا ولی‘ دوست اور پشت پناہ فرمایا ہے —— البتہ اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ ان دو گروہوں میں کمزوری پیدا ہوئی تھی اور ان کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ لیکن تھے وہ بہرحال اصحابِ ایمان! جب ہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا۔ لیکن جو محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر راستہ ہی سے عبداللہ بن ابی کے ساتھ واپس مدینہ چلے گئے‘ ظاہر ہے ان کے نفاق میں کوئی شک

نہیں ہو سکتا۔ گویا ایک ہزار میں سے تین سو کی نفری منافقین پر مشتمل تھی۔

فوری فتح

بہرحال جنگ شروع ہوئی اور پہلے ہی ہلے میں اللہ کی مدد و نصرت آئی اور بالکل بدر کا سا نقشہ سامنے آ گیا۔ کہاں وہ تین ہزار کا لشکر اور کہاں یہ سات سو افراد! قریش کے ساتھ دو سو گھوڑوں کا رسالہ تھا۔ عرب کے اس دور کے حالات کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات تھی۔ واضح رہے کہ میدان بدر میں ان کے پاس سو گھوڑے تھے اور اہل ایمان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے' ایک حضرت مقداد بن الاسود اور ایک حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے پاس۔ اسی طرح قریش کے ساتھ سات سو اونٹ تھے جبکہ نبی اکرم ﷺ کے لشکر کے ساتھ ستر تھے۔ اسی کے متعلق حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام کی ایک نظم "بدر کی فریاد" میں بڑے پیارے انداز میں یہ نقشہ کھینچا ہے :

ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے' نہاتے غسل فرماتے

نبی اکرم ﷺ کی جنگی حکمت عملی

اُحد میں قریش کی جو فوج آئی تھی ان کے ساتھ دو سو گھڑ سواروں کا دستہ تھا اور ان پر خالد بن ولید بن مغیرہ سپہ سالار تھے ــــــ نبی اکرم ﷺ نے اُحد پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھا اور اس کے دامن میں صفیں بنوائیں۔ سامنے مشرکین تھے۔ جبل اُحد کے ساتھ ایک دَرہ ایسا تھا کہ اُحد کے پیچھے سے چکر لگا کر اس دَرہ سے گزر کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ ہو سکتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اِدھر سے حملہ نہ ہو جائے اور کہیں ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپے جانے والا معاملہ نہ ہو جائے' اس دَرہ پر پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں تعینات فرمایا۔ حضور ﷺ نے نہایت تاکیدی اسلوب سے فرمایا کہ تم لوگوں کو یہاں سے نہیں ہلنا۔ اگر ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم یہ دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم لوگ یہاں سے نہ ہٹنا۔ آپ اس تاکید اور شدت کا اندازہ کیجئے جو اس حکم میں نظر آتی ہے۔

ایک خوفناک غلطی

بہر حال جنگ ہوئی تو پہلے ہلے ہی میں مشرکین کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں نے ان کا پیچھا شروع کیا۔ چند کفار کا تعاقب کر رہے تھے اور چند مال غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے تھے۔ ادھر جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم درہ پر تعینات تھے ان میں اختلاف رائے ہو گیا۔ ان پچاس تیراندازوں میں سے اکثر نے کہا کہ چلو ہم بھی چلیں، مال غنیمت جمع کریں، اب تو فتح ہو گئی ہے۔ ان کے کمانڈر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہرگز نہیں، حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہاں سے نہ ہلنا، لہٰذا میں کسی کو اجازت نہیں دیتا"۔ لیکن ہوا یہ کہ اکثر نے اپنے کمانڈر کی بات نہ مانی اور اس درے کو چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی غلطی کے باعث فتح شکست میں بدل گئی۔

یہاں یہ سمجھ لیجئے کہ اس غلطی کی نوعیت کیا تھی۔ ان حضرات نے جو درے کو چھوڑ گئے اپنے نزدیک غالباً یہ تاویل کی ہو گی کہ حضور ﷺ نے تو شکست کی صورت میں اتنا زور دیا تھا کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا۔ اب تو فتح ہو گئی ہے، لہٰذا اب یہاں سے ہلنے میں کیا ہرج ہے۔ درہ میں متعین سب کے سب مومنین صادقین تھے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے غلطی خلوص سے بھی ہو جاتی ہے، نیک نیتی سے بھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میری تعبیر یہ ہے کہ ان سے تاویل میں غلطی ہوئی ہو گی۔ واللہ اعلم!

نظم کی اہمیت

درہ چھوڑ کر چلے جانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصل غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے مقامی امیر کی حکم عدولی کی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جو اس دستہ کا امیر ہے وہ تو اجازت نہیں دے رہا۔ چلئے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے حکم کی تاویل کر لی۔ لیکن یہاں ان کے اور حضور ﷺ کے مابین ایک لوکل کمانڈر موجود ہے جس کو محمد رسول اللہ ﷺ نے امیر مقرر فرمایا ہے ـــــ اس امیر کی تو نافرمانی ہو گئی! ڈسپلن (Discipline) تو بہر حال ٹوٹ گیا! نظم کی اہمیت کے بارے میں بیعت عقبہ ثانیہ کے وہ الفاظ یاد کیجئے جو حضرت عبادہ

بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ اپنی اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ سند کے اعتبار سے حدیث کے صحیح ہونے کا اس سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے۔ حدیث یہ ہے :

((عَنْ عُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ قَالَ بَايَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ' وَعَلَى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا' وَعَلَى اَنْ لاَ نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهُ' وَعَلَى اَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا' لاَ نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لاَئِمٍ))

"حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کہ ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے' خواہ مشکل ہو خواہ آسان' خواہ ہماری طبیعت کو خوش گوار لگے خواہ ناگوار ہو' خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے۔ اور جس کو بھی ہم پر امیر بنا دیا جائے گا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں' اور ہم حق بات کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں اور اللہ کے معاملہ میں (حق کہنے سے) کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈریں گے۔"

ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ بنفس نفیس تو موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ آپؐ کسی مہم پر کسی لشکر کو بھیجتے تھے تو اس کا ایک کمانڈر یا امیر مقرر فرما دیتے۔ اب وہ امیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ہے' اور معروف میں سمع و طاعت کے اعتبار سے اس کا حکم بالکل اسی طرح مانا جائے گا جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مانا جائے گا۔ یہی Army Discipline ہے۔ اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت بایں الفاظ موجود ہے :

((مَنْ اَطَاعَنِي فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ' وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ' وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِي فَقَدْ اَطَاعَنِي وَمَنْ عَصَى اَمِيْرِي فَقَدْ عَصَانِي))

اور بعض احادیث میں "امیری" کی جگہ "الامیر" کا لفظ ہے۔ یعنی :

((وَمَنْ يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِي وَمَنْ يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِي))

(بخاری و مسلم)

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی

کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے میرے معین کردہ امیر کا کہنا مانا' اس نے میرا کہا مانا اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔

اسلام کا نظم جماعت

اسلامی جماعت کا نظم ملاحظہ ہو کہ پچاس کی نفری میں سے کمانڈر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور ایسے چودہ حضرات مزید بھی تھے جنہوں نے اپنے کمانڈر کے حکم کے مطابق جگہ نہیں چھوڑی' لیکن پینتیس افراد وہاں سے چلے گئے۔ سات سو کی نفری میں پینتیس پانچ فی صد ہوتے ہیں' لیکن پانچ فی صد اشخاص کی یہ غلطی جس کو آپ indiscipline کہیں گے' یعنی نظم کو توڑا گیا' اس کی کتنی بڑی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس سے نظم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ یہ امت ناقہ بے زمام بن گئی ہے' سمع و طاعت کا نظام کہیں قائم نہیں ہے۔ اور جب نظام ہی نہ ہو تو امت سمع و طاعت اور نظم کی خوگر بنے تو کیسے بنے! ہر شخص انانیت کا شکار ہے! کوئی دوسرے کو امیر مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرے! یہ جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔

آج ہماری اُمت مسلمہ میں انتشار کی جو انتہا ہے ذرا اس کو سامنے رکھئے اور یہ واقعہ نوٹ کیجئے۔ کیا (معاذ اللہ) اس میں حضور ﷺ کی کوئی غلطی تھی؟ ہرگز نہیں! صرف پینتیس صحابہ کرام ؓ نے حضور ﷺ کے ایک حکم کی غلط تاویل کرلی تھی' لیکن اپنے کمانڈر کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے یقیناً ڈسپلن توڑ دیا تھا۔ نظم کی خلاف ورزی کی تھی اور موجود الوقت امیر کی نافرمانی کی تھی ـــــ اس کی سزا کیا ملی! یہ کہ خالد بن ولید جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے ان کی عقابی نگاہ نے تاڑ لیا کہ وہ دَرہ خالی ہے۔ اصل جنگ تو پیدل فوج (Infantry) کی ہوتی تھی' وہ مار کھا چکی تھی۔ بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اب انہوں نے اُحد کی پشت کا چکر کاٹا اور دو سو گھڑسواروں کا دستہ لے کر اس درہ سے مسلمانوں کی پیٹھ سے جو حملہ آور ہوئے تو یکلخت جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ درہ پر صرف پندرہ تیرانداز رہ گئے تھے' ان کے لئے دو سو گھڑسواروں کو اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے یا تلواروں سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ پچاس کی نفری برقرار رہتی تو خالد بن ولید کا اپنے دستہ کے ساتھ درہ کو

کراس کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہاں پندرہ کے پندرہ اصحاب رسولؐ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم!

صورت حال بدل گئی

خالد بن ولید کے اس عقبی حملہ نے مسلمانوں کو سراسیمہ کردیا۔ ان کی صفیں تو پہلے ہی درہم برہم تھیں، کچھ لوگ کفار کا پیچھا کر رہے تھے اور اکثر مال غنیمت اکٹھا کر رہے تھے۔ بھاگنے والے کفار نے جب خالد بن ولید اور ان کے دستہ کے لوگوں کے نعرے سنے تو انہوں نے پلٹ کر زوردار حملہ کردیا۔ اب مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آگئے اور فتح شکست سے بدل گئی۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۲ میں اس صورت حال پر تبصرہ موجود ہے :

﴿ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾

"(مسلمانو! تم اپنی شکست کا اللہ کو کوئی الزام نہیں دے سکتے) اللہ نے تو (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا، جبکہ (ابتداء میں) تم اس کے حکم سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ مگر جب تم ڈھیلے پڑے (تم نے کمزوری دکھائی) اور تم نے معاملہ میں اختلاف کیا، اور تم (اپنے امیر کی) حکم عدولی کر بیٹھے، بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی (یعنی فتح) جو تمہیں محبوب تھی —— اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے —— تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔"

درے پر متعین تیراندازوں نے اپنے مقامی امیر کی جو حکم عدولی کی تھی تو یہ اصل میں محمد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی تھی، کیونکہ عبداللہ بن جبیرؓ کو حضور ﷺ نے پچاس

تیر اندازوں کے دستہ پر امیر اور کمانڈر مقرر کیا تھا۔ لہٰذا نظم کے اعتبار سے کمانڈر کی نافرمانی خود حضورؐ کی نافرمانی ہو گئی۔ بعض مفسرین نے "مَاتُحِبُّوْنَ" سے مراد مال غنیمت کی چاہت لی ہے اور بعض نے سورۃ الصف کی آیت ۱۳ کے اس حصہ سے کہ : ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ استدلال کرتے ہوئے وہ فتح مراد لی ہے جو پہلے ہلے میں اہل ایمان کے لشکر کو حاصل ہو گئی تھی۔ میں اس آخرالذکر رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔

حکم عدولی کی سزا

غزوۂ اُحد کی فتح کا شکست میں بدلنا در حقیقت فشل 'تنازع فی الامر اور معصیتِ امیر کے جرم کی پاداش میں اللہ کی طرف سے سزا تھی۔ تصور کیجئے کہ سزا کتنی کڑی تھی کہ سات سو میں سے ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ یعنی دس فیصد نفری شہید ہو گئی' حالانکہ خطاء صرف پانچ فی صد کی تھی۔ پھر شہداء میں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسے کیسے جان نثار اور کیسے کیسے ہیرے اور موتی تھے جو کیسی کیسی محنت سے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کئے تھے۔ ان ہی میں اَسَدُ اللّٰهِ وَاَسَدُ رَسُوْلِهٖ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ہیں' ان ہی میں المُقرِی یعنی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں کہ جن کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم قرآنی سے مدینہ منورہ میں اسلامی انقلاب آیا اور اوس و خزرج کے قبیلوں کے اکثر لوگ دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ مہاجرین و انصار میں سے اڑسٹھ (۶۸) دوسرے مجاہدین فی سبیل اللہ اور جان نثارانِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے جام شہادت نوش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مجروح ہوئے' دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ خود کی دو کڑیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک میں اس طور سے گھس گئیں کہ نکالنے کے لئے زور لگایا تو نہیں نکلیں۔ پھر دوسرے اصحابؓ نے بمشکل ان کو نکالا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی بھی طاری ہوئی۔ کفار نے ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نرغے میں لے لیا اور تیروں کی بارش برسائی۔ جان نثاروں نے اپنے جسموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنایا کہ جو تیر آئیں وہ ہمارے سینوں میں ترازو ہوں' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک تک نہ پہنچیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بڑے ماہر

تیر انداز تھے۔ حضور ﷺ ان کو تیر دیتے اور فرماتے جاتے "سعد تم پر میرے ماں باپ قربان، تیر چلاتے جاؤ" ـــــ صرف حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہی وہ خوش بخت صحابی ہیں جن کے لئے حضور ﷺ نے یہ محبت بھرا کلمہ ارشاد فرمایا۔

الغرض مسلمانوں کو بڑی کھلی شکست ہوئی۔ افراتفری پھیلی۔ نبی اکرم ﷺ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی۔ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ بہرحال ان حالات میں سیرت نگاروں کے سامنے ایک عجیب ساسوال اور مسئلہ آتا ہے کہ اس صورت حال میں قریش واپس کیوں چلے گئے! ایک حدیث شریف کے مطابق انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہوتا ہے، وہ اسے جس طرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ اس نے قریش کے دل پھیر دیئے۔ ورنہ وہ اس پوزیشن میں آ گئے تھے کہ اُحد میں موجود تمام مسلمانوں کا صفایا کر دیتے۔ بہرحال بعض ذرائع سے اس کی یہ توجیہہ ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے۔ اگرچہ خالد بن ولید رئیس لشکر ابوسفیان سے اصرار کر رہے تھے کہ ہمیں پہاڑ پر چڑھ کر اس معاملہ کو ختم کر دینا چاہئے، اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے چکا دینا چاہئے، لیکن ابوسفیان بڑے حقیقت پسند، زیرک اور حالات کا بہت صحیح صحیح جائزہ لینے اور ان پر نظر رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ نہیں، اس لئے کہ مسلمان بلندی پر ہیں، وہاں سے تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ ہو گی تو ہمارا بہت جانی نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہرحال ہم نے بدلہ لے لیا ہے، یہی بہت ہے۔

نعروں کا تبادلہ

ابوسفیان نے دامن کوہ سے نعرہ لگایا کہ محمد (ﷺ) زندہ ہیں یا فوت ہو گئے؟ حضورؐ خاموش رہے۔ اِدھر سے تین بار اسی نعرے کی تکرار ہوئی۔ تیسرے نعرے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا، انہوں نے نعرہ کا جواب نعرہ سے دیا کہ "اے دشمنِ خدا! رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں"۔ پھر ابوسفیان نے کہا: "دیکھو یہ یوم بدر کا بدلہ ہے جو آج ہم نے چکا لیا"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا: "تمہارے مقتول جہنم میں ہیں جبکہ ہمارے شہداء جنت میں ہیں"۔ ابوسفیان نے پھر نعرہ لگایا "اعلُی ھُبَل"۔ اس موقع پر ہمیں یہ ملتا ہے کہ

مشرکین نے کسی بُت کا نعرہ لگایا۔ یہ دراصل خوشی کا موقع تھا۔ ورنہ جب مشکل کا وقت ہوتا تھا تو مشرکین بھی صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے۔ یہاں تو انہیں فتح ہوگئی تھی اسی لئے ابوسفیان نے نعرہ لگایا "اعلٰی ھُبَل" ۔ حضور ﷺ نے فرمایا جواب دو۔ "اَللّٰہُ اَعَزُّ وَاَجَلُّ" مسلمانوں نے اِدھر سے یہ نعرہ بلند کیا۔ اُدھر سے ابوسفیان پھر پکارا "لنا عُزّٰی وَلا عُزّٰی لکُمْ" (ہمارے لئے تو عزّیٰ ہے جس کا سایہ ہمارے سروں پر ہے' تمہارے لئے کوئی دیوی نہیں ہے)۔ حضور ﷺ نے فرمایا جواب دو "اَللّٰہُ مَوْلَانا وَلَا مَوْلٰی لکُمْ" (اللہ ہمارا مولا ہے' ہمارا پشت پناہ اور مددگار ہے' تمہارا کوئی مولا نہیں)۔ پھر ابوسفیان نے یہ کہہ کر اپنے لشکر کو ساتھ لے کر واپس ہوگئے کہ "اگلے سال یہیں پھر مقابلہ کیلئے ملاقات ہوگی"!

غزوۂ اُحد کی شکست کے اثرات

غزوۂ اُحد کے بعد کے دو سال نبی اکرم ﷺ اور اہل ایمان کے لئے نہایت پریشان کن اور تکلیف دہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اہل عرب پر مسلمانوں کے رعب' ہیبت اور دھاک کی جو فضا بن گئی تھی وہ بہت حد تک ختم ہوگئی۔ اب عین مدینہ کے قریب آکر قریش جو اتنا بڑا چرکہ لگا گئے تو اس سے ایک تو مسلمانوں کے دل زخمی تھے۔ ان کا حوصلہ (Morale) اب اتنا اونچا نہیں رہا جتنا غزوۂ بدر کے بعد ہوگیا تھا۔ دوسرے گردوپیش کے مشرکین کے قبائل پر مسلمانوں کی جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ باقی نہیں رہی' بلکہ وہ اسلامی انقلاب کی دعوت و تحریک کے مقابلہ میں دلیر ہوگئے اور ان کی طرف سے مخالفت و مزاحمت کے اندیشے پیدا ہوگئے۔

اللہ کی طرف سے تسلّی و تشفّی

ان تمام ناموافق و نامساعد حالات میں اہل ایمان کی تسلی کے لئے فرمایا گیا : ﴿ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ﴾ مسلمانو! کیوں دل شکستہ ہوتے ہو' اگر تمہیں چرکہ اور زخم لگا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی چرکہ اور زخم لگ چکا ہے۔ انہوں نے تو ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ میدان بدر میں اپنے ستر مقتول چھوڑ کر گئے تھے اور ستر قیدی۔ اس کے باوجود وہ تین ہزار کی نفری لے کر مدینہ پر چڑھائی کیلئے آگئے۔ تم کیوں

ہمت ہار رہے ہو؟ کیوں تنگ دل ہو رہے ہو؟ ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ "یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں"۔ گھبراؤ نہیں : ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ "دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔" یہ تو تمہاری غلطی تھی جس پر غزوۂ اُحد میں تمہیں شکست کی صورت میں سزا دے کر ہم نے تمہیں سبق سکھایا ہے۔ ورنہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری پشت پر نہیں ہے، تمہارا مددگار اور حامی نہیں ہے۔ یہ تو ابھی اندرونِ عرب کا معاملہ ہے، تمہیں تو ابھی قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو تہ و بالا کرنا ہے۔ اگر آج تمہارا نظم اور ڈسپلن ڈھیلا رہا تو آئندہ کیا ہو گا۔ لہٰذا سبق سکھانا ضروری تھا۔ تمہارے اندر اس کے بغیر نظم کی اہمیت کا احساس کہاں سے آتا! اگر اللہ چاہتا تو اس خطا کو نظر انداز (Condone) کر دیتا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ تمہاری اس خطا کے باوجود تمہیں فتح دے دیتا۔ لیکن اس طرح تمہاری اس موقع کی کمزوری اور غلطی کی اصلاح نہ ہوتی، بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوتا۔ لہٰذا ایک وقتی سی شکست کی صورت میں ہم نے تمہیں متنبہ کر دیا کہ اپنی صفوں (Ranks) کا جائزہ لے لو، جہاں جہاں کمزوریاں ہیں انہیں دور کرنے کی فکر کرو، اپنی جمعیت کو اور مضبوط کرو، جو نئے نئے لوگ مشرف بایمان ہوئے ہیں ان کی تربیت کی کمی کو دور کرو تا کہ یہ بھی اسی طرح کندن بن جائیں جیسے مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین اور السابقون الاولون انصار —— تمام اہل ایمان کو نظم کی پابندی کا خوگر بناؤ۔ تم یہ سب کچھ کر لو تو تم سے استخلاف اور تمکّن فی الارض کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پختہ وعدہ ہے :

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾ (النور . ۵۵)

غزوۂ احزاب

غزوۂ اُحد کے بعد کے دو سالوں کے عرصہ میں تشویش اور خوف کی حالت رہی، جو

غزوۂ خندق کے موقعہ پر اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچی۔

رمضان المبارک ۰۲ھ میں غزوۂ بدر ہوا۔ پھر شوال ۰۳ھ میں معرکۂ اُحد پیش آیا۔ ذیقعدہ ۰۵ھ میں یعنی دو سال اور ایک ماہ بعد اب قریش اور دیگر قبائل جن میں یہود بھی شامل تھے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ عرب میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا لشکر جمع نہیں ہوا تھا۔ بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے جمع ہو گیا۔ جنوب سے قریش آ گئے۔ مشرقی جانب سے کئی قبائل آ گئے جن میں بنو فرازہ اور بنو غطفان بھی تھے جو نجد کے علاقے کے بڑے جنگ جُو اور خونخوار قبیلے تھے۔ شمال سے وہ یہودی قبائل حملہ آور ہو گئے جو خیبر میں آباد تھے۔ اس طرح ان قبائل نے مدینہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں کھینچا گیا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں غزوۂ احزاب کا ذکر پورے دو رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے۔

مدینہ پر یلغار کا نقشہ

کفار و مشرکین کی ہمہ جہت یلغار اور کمزور ایمان والوں اور منافقین کے خوف و بے اطمینانی کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے : ﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ﴾ "یاد کرو جب لشکر آ گئے تھے تم پر تمہارے اوپر سے بھی اور تمہارے نیچے سے بھی" ـــــ چونکہ مدینہ سے مشرق کی طرف اونچائی ہوتی چلی جاتی ہے' اسی لئے اس علاقہ کو نجد کہتے ہیں' جس کے معنی ہیں اونچائی والا علاقہ۔ لہٰذا جو مشرق سے آئے ان کے لئے "مِنْ فَوْقِكُمْ" کے الفاظ آئے ـــــ اور مغربی ساحل کی طرف ڈھلان اور اترائی ہے۔ چنانچہ قریش اور ان کے حلیف مغرب یعنی نیچائی اور اتار کے راستہ سے آئے۔ لہٰذا ان کے لئے "مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" فرمایا گیا۔ مزید برآں مدینہ کے شمال مغرب کی جانب سے یہودی قبائل جمع ہو کر آ گئے تھے ـــــ اس کٹھن موقع پر منافقین اور کمزور ایمان والوں کی کیفیت اسی آیت میں آگے ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ : ﴿ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ ﴾ "اور یاد کرو جب آنکھیں (وحشت و حیرت سے) پھرنے لگیں اور (خوف و ہراس سے) دلوں کا یہ حال

تھا کہ وہ گویا گلوں میں آ اٹکے ہیں اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے" ـــــ یہ تبصرہ ہے اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے اس امتحان پر جو غزوۂ احزاب کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا ـــــ راقم کی رائے ہے کہ ذاتی طور پر نبی اکرم ﷺ پر سب سے سخت دن "یوم طائف" گزرا ہے اور مسلمانوں پر بحیثیت جماعت سب سے سخت اور شدید ایام غزوۂ احزاب کے گزرے ہیں۔

غزوۂ اُحد کے موقع پر تین سو افراد تو بطورِ منافقین منظرِعام پر آچکے تھے۔ اب غزوۂ احزاب تک ان کی تعداد کتنی ہوگی' واللہ اعلم۔ بہرحال قرآن مجید سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ان کی معتدبہ تعداد موجود تھی۔ ان کے دل ہمارے محاورہ کے مطابق بلیوں اچھل رہے تھے اور ان کو ہرچہار طرف موت نظر آرہی تھی۔ اور بظاہر احوال بچنے کی کوئی شکل سامنے نہیں تھی۔

میں جب بھی غزوۂ احزاب کا ذکر کرتا ہوں تو جناب نعیم صدیقی کا یہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

ہدایت کا ایک چراغ تھا جو مدینہ میں روشن تھا اور اس کو بجھانے کے لئے اتنی بڑی بڑی آندھیاں آرہی تھیں کہ الامان والحفیظ!

منافقین کی کیفیت

امتحان یقیناً شدید تھا۔ نتیجتاً منافقین کے دلوں میں جو خبث' نجاست اور گندگی تھی' وہ اس ابتلاء و آزمائش کو دیکھ کر ان کی زبانوں پر آگئی' جس کا ذکر قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کیا ہے : ﴿ وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ "اور جب کہنے لگے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سب فریب تھا ـــــ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو دھوکا دے کر مروا دیا گیا۔ ہم سے تو کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں

تمہارے قدموں میں ہوں گی' جبکہ اس وقت حالات یہ ہیں کہ ہم رفع حاجت کے لئے بھی باہر نہیں جا سکتے۔ کھانے کو کچھ نہیں۔ ہمارے باغات حملہ آوروں نے اجاڑ دیئے۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہے' اندر کوئی چیز نہیں ہے۔ فاقوں پر فاقے آ رہے ہیں۔ غضب کی سردی نے الگ زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ منافقین کی یہ وہ باتیں ہیں جو ان کے دلوں سے اچھل کر زبانوں پر آ گئیں۔ ان باتوں کا تذکرہ سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور کتب احادیث میں ملتا ہے۔

اہلِ ایمان کی کیفیات

ادھر مؤمنین صادقین کی کیفیت کیا تھی؟ ملاحظہ ہو : ﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ﴾ "اور حقیقی مومنین کا اُس وقت حال یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہی تو وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی"۔

یہ کون سا وعدہ ہے جس کی طرف یہ صادق القول مومنین اشارہ کر رہے ہیں؟ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش و امتحان اور ابتلاء کے وعدوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ العنکبوت کی آیات ۲۔۳ میں فرمایا :

﴿ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ ﴾ (العنکبوت : ۲۔۳)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!"

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۵ میں فرمایا :

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ○ ﴾ (البقرة ۱۵۵)

"اور ہم البتہ تم کو خوف و خطر اور بھوک اور مال و جان اور فصلوں کی تباہی میں مبتلا کر کے تمہارا امتحان لیں گے' جو ان حالات میں صبر کریں تو ان کو (اے نبیؐ) بشارت دے دیجئے۔"

چنانچہ غزوۂ احزاب کے مصائب کو دیکھ کر مومنین صادقین کے ذہن ان پیشگی تنبیہات کی طرف منتقل ہو گئے اور ان کی زبانوں پر فی الفور آ گیا: ﴿ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾

خندق کی تیاری کا عجیب نقشہ

غزوۂ احزاب میں کفار و مشرکین کے لشکروں کا محاصرہ خاصا طول پکڑ گیا اور اس دوران اہل مدینہ پر بڑے ہی سخت قسم کے حالات پیش آئے۔ جب خندق کھودی جا رہی تھی تو نبی اکرم ﷺ بھی اس کام میں بنفس نفیس شریک تھے اور پتھر اٹھا اٹھا کر خندق سے باہر پھینک رہے تھے۔ چونکہ ان دنوں شدید قحط کا عالم تھا لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے پیٹوں پر چادروں کے ساتھ کس کر پتھر باندھ رکھے تھے تاکہ کمریں دوہری نہ ہو جائیں۔ اس لئے کہ شدید بھوک کی وجہ سے معدہ تشنج میں آتا ہے۔ تو دراصل یہ اس معدے کو بہلانے کی ایک شکل ہے کہ اگر اس پر بھاری بوجھ باندھ دیا جائے تو اس کو وہ بھوک کا تشنج (Hunger Pain) نہیں ہو گا۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کرتے اٹھا کر اپنے پیٹ دکھائے اور عرض کیا کہ حضور ﷺ اب فاقہ ناقابل برداشت ہو رہا ہے' ہم نے اسی لئے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے اپنا کرتہ اُٹھا کر دکھایا تو وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

یہ دراصل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ مدینہ منورہ کے دفاع کے لئے خندق کھودی جائے۔ عرب تو جانتے ہی نہیں تھے کہ خندق کس بلا کا نام ہے۔ پرانی جنگوں میں دفاع کے جو طریقے اختیار کئے جاتے تھے ان میں شہر پناہ کے گرداگرد خندق

کھودنے کا رواج بھی تھا۔ اہل ایران دفاع کے اس طریقہ سے بخوبی واقف تھے۔ ایران اور روم کی تو کئی سو سال سے جنگ چل رہی تھی۔ تاریخ دونوں کے مابین جھولا جھول رہی تھی۔ کبھی رومی ایران کے دار السلطنت مدائن تک چڑھ دوڑتے تھے تو کبھی ایرانی ان کو ایشیائے کوچک میں دھکیل دیتے تھے۔ جب مدینہ میں خبر پہنچی کہ تین اطراف سے کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے چلا آرہا ہے تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ مدینہ کو پشت پر رکھتے ہوئے خندق کھودی جائے تاکہ خندق کی وجہ سے دشمن براہ راست مدینہ پر یورش نہ کر سکیں۔ چنانچہ خندق کھودنے کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ یہ سخت سردی کا موسم تھا۔

روایات میں خندق کی کھدائی کے وقت دو اشعار کا ذکر ملتا ہے۔ محبتِ الٰہی میں سرشار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے سالارِ اعظم جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کی کھدائی کے لئے اس سنگلاخ زمین پر جراتِ مومنانہ اور ہمتِ مردانہ کے ساتھ کدالیں چلا رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرب لگاتے ہوئے کورس کے انداز میں کہتے جاتے تھے :
"اَللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّاعَیْشُ الْاٰخِرَۃِ" اے اللہ آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے' آخرت کا عیش ہی اصل عیش ہے۔ گویا ان کے نزدیک اس وقت کی کلفتیں' تکالیف اور مصائب ہیچ ہیں' انہیں تو آخرت کی فوز و فلاح چاہئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دے رہے تھے : "فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ" اے اللہ! پس تو بخشش فرما دے ان انصار و مہاجرین کی!

دوسرا شعر جس کا تذکرہ روایات میں ملتا ہے وہ نظم جماعت کی اساس و بنیاد بیعت کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ترانہ کے انداز میں کدالوں کی ضرب کے ساتھ یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا!

"ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جہاد کی بیعت کی ہے۔ اب یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جس وقت تک جان میں جان ہے۔"

جسم و جان کا تعلق منقطع ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ جب تک یہ تعلق باقی ہے جہاد جاری رہے گا۔ یہ ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کی وہ شان جس کی بنیاد بیعت ہے۔

نصرتِ الٰہی

اللہ تعالٰی نے اپنی خصوصی مدد اور نصرت و تائید سے اہل ایمان کو اس نرغہ اور محاصرہ سے نجات دلائی جو بیس دن تک جاری رہا تھا۔ ایک شب بہت زبردست آندھی آئی جس سے کفار و مشرکین کے لشکر تلپٹ ہو گئے۔ اکثر خیمے اکھڑ کر آندھی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے۔ بڑے بڑے چولہوں پر جو بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں' وہ الٹ گئیں۔ ان چولہوں کی وجہ سے ان کے خیموں میں آگ لگ گئی۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک غیبی تدبیر تھی جس سے ان کے حوصلے اس درجہ پست ہو گئے کہ صبح تک تمام لشکر منتشر ہو چکا تھا۔ تمام قبائل اپنے اپنے علاقوں کی طرف کوچ کر گئے ـــــ اسی کا ذکر ہے سورۃ الاحزاب کی آیت ۹ میں :

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ ﴾ (الاحزاب ۹)

"اے اہل ایمان! اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہوا' جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے ان پر بھیج دی ہوا (آندھی) اور (فرشتوں کی) وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں۔ اور اللہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھنے والا ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اور تدابیر بھی اختیار فرمائی تھیں' لیکن ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس غزوۂ احزاب کے ذریعہ سے اللہ تعالٰی کو اہل ایمان کا امتحان لینا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دینا مقصود تھا' تاکہ نظر آجائے کہ کون کتنے پانی میں ہے! سب جان لیں کہ کون ان میں سے منافق ہیں اور کون وہ ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش اور سخت سے سخت امتحان میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں!! ـــــ جب یہ امتحان ہو گیا تو مدمقابل دشمنوں کے لئے ایک آندھی اور فرشتوں کا ایک

لشکر کافی تھا۔ کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر اللہ کی قدرت کے مقابلہ میں تو پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ بارہ ہزار کیا بارہ لاکھ کا لشکر بھی ہوتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک آندھی نے معاملہ تلپٹ اور تتر بتر کر دیا اور کفار و مشرکین جو ایک زبردست جمعیت کی شکل میں بڑے ارمانوں اور بڑی تیاریوں کے ساتھ دور دراز کا سفر کر کے ہدایت کے چراغ کو بجھانے آئے تھے ایک ہی رات میں منتشر ہو گئے۔ معاملہ ختم ہو گیا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح مسلمانوں نے دیکھا تو میدان خالی تھا۔

نبی اکرم ﷺ کا تاریخی ارشاد

اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے جو تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کتنی دُور رَس نگاہ اور کتنی بصیرت و فراست عطا فرمائی تھی۔ کسی انقلابی رہنما کے لئے یہ وصف (Quality) اشد ضروری ہے کہ وہ حالات پر صحیح صحیح نگاہ رکھے ــــــ چند اصولوں کو جان لینا اور ان کو بیان کرتے چلے جانا ہی سب کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی صلاحیت اور نگاہ دور رس کی بھی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ حالات کی نبض پر بھی ٹھیک ٹھیک ہاتھ ہو۔ صحیح اندازہ ہو کہ حالات کا رخ کیا ہے' وہ کدھر جا رہے ہیں! صحیح صحیح تشخیص (Assessment) ہو کہ ہم کتنے پانی میں ہیں اور ہمارا دشمن کتنے پانی میں ہے! اس کی طاقت کیا ہے! اس کے اور ہمارے اثرات کا تناسب کیا ہے! ظاہر بات ہے کہ ایک انقلابی عمل میں ان سب امور پر گہری نگاہ رکھنی ناگزیر ہے۔ اگر صرف ایک خانقاہ ہے تو اور اس میں لوگوں کی تربیت کرنی ہے تو اس کے لئے بھی ایک خاص صلاحیت درکار ہے۔ لیکن اس میں ان چیزوں پر نگاہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح ایک دار العلوم ہے' جہاں درس دینا ہے' قرآن پڑھانا ہے' حدیث و فقہ پڑھانی ہے تو ان کاموں کے لئے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہے' مگر وہاں بھی مذکورہ بالا امور پر نظر ہونی ضروری نہیں ہے ــــــ لیکن انقلابی عمل میں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اس امر پر نگاہ ہو کہ انقلابی دعوت اور تحریک کو

مختلف مراحل سے گزار کر کامیابی تک کیسے پہنچا دیا جائے!۔ یہ شے دگر ہے۔ اس کے لئے اور قسم کی صلاحیتیں چاہئیں۔ اس کی ایک عظیم مثال ہے جو غزوۂ احزاب کے متصلاً بعد سیرت مطہرہ میں نظر آتی ہے۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر' جس کا دوسرا نام غزوۂ خندق بھی ہے' اگرچہ قریش بارہ ہزار کا لشکر لے آئے تھے' اور عرب کی حد تک اُس وقت تک کی تاریخ میں اتنا بڑا لشکر پہلی بار جمع ہوا تھا' لیکن اب جو یہ لشکر منتشر ہوا اور بھیڑ چھٹی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کو ان الفاظ میں خوش خبری سنا دی کہ : ((لَنْ تَغْزُوكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) "اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے"۔ میرے نزدیک سورۃ الصف بھی اسی موقع پر نازل ہوئی ہے جس میں یہ آیت مبارکہ موجود ہے : ﴿ وَأُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ "اور (اے مسلمانو!) ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے' یعنی اللہ کی مدد' تو وہ آیا ہی چاہتی ہے اور اب فتح دور نہیں ہے (تمہارے قدموں کو چومنے والی ہے) اور اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت سنا دیجئے" ـــــ نبی اکرم ﷺ نے جو یہ الفاظ فرمائے کہ : ((لَنْ تَغْزُوكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) تو راقم کے نزدیک یہ الفاظ حضور ﷺ نے سورۃ الصف کے اس حکم ﴿ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کے امتثال امر میں فرمائے تھے۔ واللہ اعلم!

نبی اکرم ﷺ کو بخوبی اندازہ تھا کہ قریش نے کتنی محنتوں اور کوششوں سے اس عظیم لشکر کی تیاری کی ہو گی اور اپنے حلیف قبائل کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کیا ہو گا۔ بنو غطفان' بنو فرازہ اور خیبر کے یہود کے قبائل کو آمادہ کرنے کے لئے کتنی سفارتیں بھیجی ہوں گی' کتنی خط و کتابت کی ہو گی اور اس کام کے لئے پیامبری کے سلسلہ میں کتنے سوار دوڑائے ہوں گے ـــــ یہ سارے پاپڑ بیل کر قریش نے اتنی طاقت جمع کی تھی اور اسے لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے' لیکن نتیجہ کیا نکلا! یہ کہ بے نیل و مرام واپس جانا پڑا' ساری محنتیں اور کوششیں اکارت گئیں۔ اتنی بڑی جمعیت ـــــ لیکن قدرتِ الٰہی کے سامنے

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

غلطیوں کی اصلاح کا نبوی ؐ طریق کار (۷)

تالیف : علامہ محمد صالح المنجد، مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

یہاں ایک اشکال پیش آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب قاتل سلب کا مستحق تھا تو آنحضرت ﷺ نے اس کا حق کیوں روک لیا؟

امام نوویؒ نے اس اشکال کے دو جواب دیئے ہیں۔

۱) ممکن ہے نبی اکرم ﷺ نے بعد میں قاتل کو مقتول کا سامان (سلب) دلوا دیا ہو۔ اس کو سلب دلوانے میں تاخیر کا مقصد اسے اور عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کو تنبیہ کرنا تھا، کیونکہ انہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بارے میں نامناسب الفاظ استعمال کئے اور اس طرح لشکر کے قائد اور انہیں قائد مقرر کرنے والے کے احترام کے منافی رویہ اختیار کیا۔

۲) ممکن ہے سلب کے مالک نے اپنی خوشی اور اختیار سے اپنا وہ حق چھوڑ دیا ہو، اور اسے عام مسلمانوں کا حق قرار دے دیا ہو۔ اس کا مقصد حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی دل شکنی کا ازالہ تھا، اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ لوگوں کے دلوں میں امیروں کا احترام قائم رہے۔

جس شخص کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کیا گیا ہو، اس کا مقام بحال کرنے کی ایک اور مثال مسند احمد کی یہ حدیث ہے جو حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا اور انہیں سلام کہا، انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ جب وہ آگے گزر گیا تو اہل مجلس میں سے ایک شخص بولا: "اللہ کی قسم! میں تو اس (گزرنے والے) آدمی سے اللہ کے لئے نفرت کرتا ہوں"۔ اہل مجلس نے کہا: "اللہ کی قسم! تو نے بہت بری بات کہی۔ ہم ضرور اسے بتائیں گے" (اس کے بعد انہوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو کہا) "اے فلاں! اٹھ کر اسے بتا"۔ ان کے بھیجے ہوئے آدمی نے اس سے مل کر اسے یہ بات بتائی۔ وہ شخص وہیں سے واپس ہو کر جناب رسول اللہ ﷺ کی

خدمت میں پہنچ گیا اور عرض کیا : "اے اللہ کے رسول! میں مسلمانوں کی ایک مجلس کے پاس سے گزرا' ان میں فلاں شخص بھی موجود تھا' میں نے انہیں سلام کیا' انہوں نے جواب دیا۔ جب میں آگے گزر گیا' تو ان میں سے ایک آدمی نے مجھ تک پہنچ کر مجھے بتایا کہ فلاں نے کہا ہے: اللہ کی قسم! میں اس آدمی سے اللہ کے لئے نفرت کرتا ہوں۔ اسے بلا کر دریافت کیجئے وہ مجھ سے کس بنیاد پر بغض رکھتا ہے"۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا اور اس سے وہ بات دریافت کی جو اس شخص نے بتائی تھی۔ اُس نے اعتراف کیا اور کہا "اللہ کے رسول! میں نے واقعی یہ بات کہی ہے"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تو اس سے کیوں بغض رکھتا ہے"۔ اُس نے کہا: "میں اس کا ہمسایہ ہوں اور اس سے خوب واقف ہوں۔ اللہ کی قسم! میں نے اسے اس (فرض) نماز کے سوا کوئی نماز پڑھتے نہیں دیکھا' جو ہر نیک و بد پڑھتا ہی ہے"۔ اُس آدمی نے کہا: "اے اللہ کے رسول! اس سے دریافت کیجئے کیا میں نے کبھی نماز وقت سے تاخیر کر کے پڑھی ہے؟ یا کبھی بری طرح سے وضو کیا ہے؟ یا نماز کے رکوع سجود صحیح انداز سے ادا نہیں کیے؟" رسول اللہ ﷺ نے اس (شکایت کرنے والے) سے پوچھا تو اُس نے کہا: "جی نہیں"۔ پھر کہا۔ "اللہ کی قسم! یہ مہینہ (رمضان) جس میں نیک و بد سب روزے رکھتے ہیں' اس کے علاوہ میں نے اسے کبھی روزہ رکھتے نہیں دیکھا"۔ اُس نے کہا "یا رسول اللہ! کیا اس نے کبھی دیکھا ہے کہ میں نے رمضان میں روزہ چھوڑا ہو؟ یا اس کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کی ہو؟" رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تو اُس نے کہا: "جی نہیں"۔ پھر کہا: "اللہ کی قسم! میں نے اسے کبھی کسی سائل کو کچھ دیتے نہیں دیکھا' نہ کسی نیکی کے کام میں فی سبیل اللہ خرچ کرتے دیکھا ہے' سوائے اس زکوٰۃ کے جو ہر نیک و بد ادا کرتا ہے"۔ اُس نے کہا: "یا رسول اللہ! اس سے پوچھئے کیا میں نے زکوٰۃ میں سے کبھی کوئی چیز چھپائی ہے؟ یا اس کی ادائیگی میں لیت و لعل کی ہے؟" رسول اللہ ﷺ نے اس سے یہ بات پوچھی تو اُس نے کہا: "جی نہیں"۔ پھر آنحضرت ﷺ نے شکایت کرنے والے سے فرمایا : "جاؤ' کیا معلوم وہ تم سے بہتر ہو۔"[۸۲]

یہ بات بہت اہم ہے کہ غلطی کرنے والا جب اپنی غلطی سے رجوع کر کے توبہ کر لے تو پھر اس کے مقام و مرتبہ کا [illegible] رکھا جائے' تاکہ وہ راہ راست پر قائم رہ کر

لوگوں کے ساتھ حسب معمول زندگی گزار سکے۔ وہ مخزومی خاتون جس کا ہاتھ چوری کے جرم میں کاٹ دیا گیا تھا' اس کے واقعہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بھی فرمایا ہے: "بعد میں وہ خاتون اچھے انداز سے تائب ہو گئیں اور انہوں نے شادی کر لی۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آیا کرتی تھیں' تو انہیں جو کام ہوتا میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کر دیا کرتی تھی۔"(۸۳)

۲۱) مشترکہ غلطی میں فریقین کو تنبیہ کرنا:

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غلطی میں دونوں فریق شریک ہوتے ہیں' اور جس شخص کے حق میں غلطی ہوئی ہوتی ہے خود وہ بھی غلطی پر ہوتا ہے' اگرچہ ایک فریق کی غلطی دوسرے سے زیادہ ہو۔ اس صورت میں غلطی سے تعلق رکھنے والے دونوں فریقوں کو تنبیہ یا نصیحت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال درج ذیل ہے:

حضرت عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "خالد! جنگ بدر میں شریک ہونے والے ایک آدمی کو تکلیف نہ پہنچاؤ' اگر آپ اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر دیں تو اس کے عمل (کے برابر ثواب) کو نہیں پہنچ سکتے"۔ انہوں نے عرض کیا: "لوگ مجھے نامناسب باتیں کہہ دیتے ہیں' تو میں بھی جواب دے دیتا ہوں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "خالد کو تکلیف نہ پہنچاؤ' وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے جو اُس نے کافروں پر مسلط کر دی ہے۔"(۸۴)

۲۲) غلطی کرنے والے سے متأثرہ فریق سے معذرت کا مطالبہ کرنا:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: عرب لوگ سفر میں ایک دوسرے کی خدمت کیا کرتے تھے۔ (ایک سفر میں) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک آدمی تھا' جو اُن کی خدمت کرتا تھا۔ (ایک بار ایسا ہوا کہ) وہ دونوں سو گئے' جب جاگے تو اس شخص نے ابھی ان کے لئے کھانا تیار نہیں کیا تھا۔ ان حضرات میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: "یہ شخص بہت سوتا ہے"۔ پھر اسے جگایا اور کہا: "جناب

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنا: ابو بکر اور عمر سلام عرض کرتے ہیں اور سالن مانگ رہے ہیں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ان دونوں کو سلام کہنا اور انہیں بتانا کہ وہ سالن کھا تو چکے ہیں"۔ (جب انہیں یہ پیغام ملا تو) وہ فوراً گھبرائے ہوئے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: "اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کی خدمت میں سالن کے لئے آدمی بھیجا تو آپ نے ارشاد فرمایا: وہ سالن کھا چکے ہیں، ہم نے کون سا سالن کھالیا ہے؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے، اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، مجھے تمہارے دانتوں میں اس کا گوشت نظر آرہا ہے۔" (یعنی جس کی غیبت کی تھی، اس کا گوشت دانتوں میں لگا ہوا ہے۔) ان دونوں نے عرض کیا: "ہمارے لئے مغفرت کی دعا فرمایئے"۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وہی تمہارے لئے بخشش کی دعا کرے۔"(۸۵)

۲۳) غلطی کرنے والے کو متاثرہ فریق کی فضیلت یاد دلانا، تاکہ وہ نادم ہو کر معذرت کرلے:

جب حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہو گئی تھی، تو نبی اکرم ﷺ نے ایسے ہی کیا تھا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "صحیح" کی "کتاب التفسیر" میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ بات چیت ہو رہی تھی کہ (کسی بات کی وجہ سے) عمر رضی اللہ عنہ ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئے، اور غصے کی حالت میں ان کے پاس سے چلے آئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے پیچھے آئے اور ان سے درخواست کی کہ ان کے لئے اللہ سے بخشش کی دعا کریں، انہوں نے یہ بات نہ مانی، بلکہ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم بھی خدمت اقدس میں حاضر تھے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے (انہیں دیکھتے ہی) فرمادیا: "تمہارے اس ساتھی کا تو (کسی سے) جھگڑا ہو گیا ہے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے طرز عمل پر ندامت محسوس ہوئی، وہ آئے اور سلام کر کے نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھ گئے اور

جناب رسول اللہ ﷺ کو پوری بات بتائی۔ آنحضرت ﷺ کو غصہ آگیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہنا شروع کردیا: "یارسول اللہ! بخدا' میری ہی زیادہ غلطی تھی"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم لوگ میرا لحاظ کر کے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑ سکتے؟ کیا تم لوگ میرا لحاظ کر کے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑ سکتے؟ میں نے کہا: لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغام رساں بن کر آیا ہوں۔ (اُس وقت) تم سب نے کہا: آپ غلط کہتے ہیں اور ابوبکر نے کہا: آپ نے سچ فرمایا"۔ (۸۶)

صحیح بخاری ہی میں کتاب المناقب میں بھی یہ واقعہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: میں نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ آگئے' انہوں نے اپنے کپڑے کا کنارہ پکڑا ہوا تھا حتیٰ کہ ان کا گھٹنا ظاہر ہو رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "تمہارے ساتھی کا جھگڑا ہو گیا ہے"۔ (اتنے میں وہ حضور ﷺ تک آپہنچے) انہوں نے سلام کیا۔ اور کہا: "میرے اور ابن خطاب کے درمیان کچھ بات چیت ہو گئی' میں جلد بازی میں انہیں کچھ کہہ بیٹھا' پھر مجھے ندامت ہوئی' میں نے انہیں کہا کہ مجھے معاف کر دیں' انہوں نے انکار کر دیا' تب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں"۔ اللہ کے رسول ﷺ نے تین بار فرمایا: "ابوبکر! اللہ تیری مغفرت فرمائے"۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ندامت محسوس ہوئی' وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے اور پوچھا: "یہاں ابوبکر ہیں؟" گھر والوں نے کہا: "جی نہیں"۔ وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک پر غصہ کے آثار ظاہر ہوئے حتیٰ کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ڈر گئے۔ انہوں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دوبارہ کہا: "یارسول اللہ! اللہ کی قسم! میری غلطی زیادہ تھی"۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "اللہ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا۔ تم لوگوں نے کہا: آپ غلط کہتے ہیں۔ ابوبکر نے کہا: حضورؐ سچے ہیں۔ اُس نے اپنی جان اور مال کے ساتھ میری دلجوئی کی۔ تو کیا تم میرے لئے میرے ساتھی سے درگزر کر سکتے ہو؟" آپؐ نے دوبار یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ اس کے بعد کبھی کسی نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دل نہیں دکھایا۔" (۸۷)

حواشی

(۷۵) یعنی حضرت خالد بن ذکوان جنہیں حضرت ربیع رضی اللہ عنہا یہ واقعہ سنا رہی تھیں۔

(۷۶) فتح الباری حدیث ۵۱۴۷

(۷۷) امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ سنن ترمذی حدیث ۱۰۹۰

(۷۸) سنن ابن ماجہ طبع عبدالباقی حدیث ۱۸۷۹۔ صحیح سنن ابن ماجہ حدیث ۱۵۳۹

(۷۹) سنن ترمذی حدیث ۲۷۳۸ (۸۰) صحیح مسلم مع شرح نووی ۱۲/۶۴

(۸۱) الفتح الربانی کی ترتیب مسند الامام احمد ۱۴/۸۴

(۸۲) مسند احمد ۵/۴۵۵۔ ہیثمی نے فرمایا: اس کے راوی ثقہ ہیں (مجمع ۱/۲۹۱)

(۸۳) صحیح مسلم حدیث ۱۶۸۸

(۸۴) معجم کبیر طبرانی حدیث ۳۸۰۱۔ ہیثمی نے فرمایا: اس کے راوی ثقہ ہیں (مجمع ۹/۳۴۹)۔

(۸۵) سلسلہ احادیث صحیحہ حدیث ۲۷۰۸۔ انہوں نے خرائطی کی مساوی الاخلاق اور ضیاء کی المختارہ کا حوالہ دیا ہے۔ نیز تفسیر ابن کثیر سورۃ الحجرات ۷/۳۶۳ طبع دار الشعب

(۸۶) فتح الباری: ۴۶۴۰ (۸۷) فتح الباری: ۳۶۶۱

ایمانیاتِ ثلاثہ

اصل حاصل اور باہمی تعلق

رحمت اللہ بٹر' ناظم تربیت

(گزشتہ سے پیوستہ)

۳) ایمان بالمعاد (ایمان بالآخرۃ)

یہ وہ ایمان ہے جو انسان کے عمل پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ آخرت کا ماننا وہی قابلِ قبول ہے جو اُن تفاصیل کے ساتھ مانا جائے جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں۔ یہی وہ ایمان ہے جو انسان کی مدہوشی کو دور کرتا ہے اور اسے اپنے کردار و اعمال کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لئے انبیاء ورسل کی دعوت کا آغاز اسی ایمان سے ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا ﴿ یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرْ○ قُمْ فَاَنْذِرْ○ ﴾ "اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے' اٹھو اور (لوگوں کو محاسبۂ اخروی سے) خبردار کرو!" اگر یہ ایمان صحیح نہ ہو تو پھر ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت صرف علم الکلام اور نعت خوانی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور بات ٹیبل ٹاک سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہی حقیقت ہے کہ جس کو قرآن مجید نے صرف تین آیات میں بیان کر دیا ہے۔ سورۃ العلق میں فرمایا:

﴿ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ○ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى○ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى○ ﴾

"ہرگز نہیں' انسان سرکشی پر اتر آتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا تیرے رب ہی کی طرف ہے"۔

انسان جب دیکھتا ہے کہ اس کے اخلاقی اعمال کا اس دُنیا میں کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا اور اس کی کوئی پکڑ نہیں ہو رہی تو وہ اپنی حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔ چنانچہ ظلم کرتا ہے'

دوسروں کا مال ہڑپ کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے۔ اسے اپنی حدود میں پابند کرنے والی ایک ہی بات ہے کہ اسے یقین دلایا جائے کہ اس کی پیشی اس کے مالک کے سامنے ہونے والی ہے جہاں اسے اپنا حساب خود پیش کرنا ہو گا اور اسے اپنے کئے کی جزاء و سزا مل کر رہے گی۔ جب اللہ کے سامنے پیش ہونے کے تصور میں کجی آتی ہے یا یہ گمان کرلیا جاتا ہے کہ کوئی پیشی نہیں ہے تو انسان مادر پدر آزاد ہو کر دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے اور اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

قرآن مجید میں ایسے انسانوں کی مختلف اقسام کا ذکر ہوا ہے جو یا تو آخرت کے انکاری ہیں اور اسی وجہ سے بے خوف ہو کر گناہ و زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں' یا پھر کچھ ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جو آخرت کو مانتے تو ہیں لیکن بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے محاسبہ نہیں ہو گا کیونکہ ان کی ایک خاص حیثیت ہے یا وہ کسی پہلو سے خاص سلوک کے مستحق ہیں۔ اور نتیجتاً ان کا آخرت کو ماننا بھی انکار ہی کے مترادف ہو جاتا ہے' اس لئے کہ وہ ماننا ان کے سیرت و کردار پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ سورۃ القیامہ کی پہلی دو آیات میں منکرین آخرت کے نظریات کی تردید فرما کر اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ قیامت واقعی اور شدنی ہے اور وہاں نیکی و بدی کا بدلہ بھی لازماً مل کر رہے گا۔ چنانچہ فرمایا : ﴿ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾ ''نہیں' میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی!'' آیت مبارکہ کے آغاز میں وارد ہونے والے حرف ''لاَ'' میں تین قسم کے لوگوں کے خیالات کا ابطال ہے' جو سمجھتے ہیں کہ قیامت نہیں ہو گی۔

۱) قرآن مجید نے بعض لوگوں کا نظریہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾ (الجاثیہ ۲۴)

''یہ لوگ کہتے ہیں : نہیں ہے ہماری زندگی مگر صرف دنیا کی اور ہم (یہیں) جیتے اور مرتے ہیں اور گردش زمانہ کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو (کوئی اور ہستی زندگی دینے والی اور موت طاری کرنے والی نہیں کہ جس کے سامنے پیش ہونا ہو)۔ درحقیقت ان کو اس کا کچھ علم نہیں' بلکہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں

کرتے ہیں"۔

۲) دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ دوبارہ اٹھایا جانا اور زندہ کر دینا محال ہے جبکہ ہمارا گوشت گل سڑ جائے گا اور ہماری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو کر خاک میں مل جائیں گی۔ ان کا نظریہ ان الفاظ میں بیان ہوا:

﴿ اَیَعِدُکُمْ اَنَّکُمْ اِذَا مِتُّمْ وَکُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّکُمْ مُّخْرَجُوْنَ○ هَیْهَاتَ هَیْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ○ اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ○ ﴾ (المومنون . ۳۵-۳۷)

"کیا یہ (نبی) تمہیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی ہو جاؤ گے اور بس ہڈیاں رہ جائیں گی تو اس وقت تم کو (زمین سے) نکال لیا جائے گا۔ بعید بالکل بعید ہے یہ بات جس کا تمہیں وعدہ دیا جا رہا ہے۔ زندگی تو یہی ہماری دُنیا کی زندگی ہے، اسی میں ہم مرتے اور جیتے ہیں، اور ہم ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے"۔

یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ○ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ○ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ○ ﴾ (الماعون ۱-۳)

"بھلا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جو جزاء و سزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کے لئے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا"۔

واقعہ یہ ہے کہ جب اسے جزاء و سزا کا یقین ہی نہیں ہے تو کیوں نہ کمزور کے مال سے فائدہ اٹھائے؟ اور وہ کیوں کسی کو کھانا کھلائے یا کھلانے کے لئے کہے؟ ایسا شخص تو بیوقوف کہلائے گا کہ جہاں سے وہ مال لے سکتا ہو نہ لے اور اپنی آسائش کا سامان مہیا نہ کرے۔ وہ بھلا ایثار کیوں کرے جبکہ اسے ستائش کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔

۳) منکرین آخرت کا تیسرا گروہ مترفین کا ہے یعنی صاحب ثروت، صاحب اقتدار، مال و دولت والے، جاگیردار اور سرمایہ دار وغیرہ۔ ان کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ

كٰفِرُوْنَ ○ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ○ ﴾

(سبا ۳۴: ۳۵)

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اُس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں"۔

سورۂ حٰم السجدہ (آیت ۵۰) میں اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا:

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ﴾

"(انسان کی ناشکری کا عالم یہ ہے کہ) اگر ہم اس کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں اس تکلیف کے بعد جو اسے آئی ہو تو کہہ اٹھتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا، اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی، اور اگر (بفرض محال) میں واقعی اپنے مالک کی طرف لوٹا دیا گیا تو میرے لئے اس کے پاس بھی بہتری ہے (میں وہاں بھی مزے کروں گا)"۔

یہ لوگ دُنیا کو اتنا پائیدار مانتے ہیں کہ انہیں اس کے ختم ہونے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ان کے دماغوں میں دوسرا خناس یہ سماجاتا ہے کہ دُنیا میں مجھے جو مال و دولت سے نوازا گیا ہے تو یہ میری قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے ہے اور یہ میرا استحقاق ہے۔ بالفرض اگر آخرت ہوئی بھی تو وہاں اس دُنیا سے بھی بڑھ کر بھلائیاں میری منتظر ہوں گی اور وہاں مجھے بہت کچھ ملے گا، اس لئے کہ میں بڑا باصلاحیت اور خوش قسمت شخص ہوں۔

اس فکری غلطی کو سورۂ کہف میں دو آدمیوں کی مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے جو دوست تھے۔ ان میں سے ایک کو اللہ نے دو باغ دے رکھے تھے اور دوسرے کے پاس دُنیا کا مال و متاع نہ تھا۔ غریب دوست نے باغ والے کو یاد دلایا کہ اللہ نے تم پر اس قدر احسان کیا ہے تو تم اس کے شکر گزار بنو، تم پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں وہ ادا کرو اور آخرت کے محاسبے کو سامنے رکھو۔ دوسرا شخص مال و متاعِ دُنیا پا کر اللہ اور آخرت کو فراموش کر چکا تھا۔ چنانچہ اس کا روگ اس کی زبان پر آگیا، جب وہ مکالمہ کرتے ہوئے

اس کے باغ میں پہنچ گئے :

﴿ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا○ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا○ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا○ ﴾ (الکہف ۳۴-۳۶)

"پس اس نے اپنے (ناصح) ساتھی سے کہا کہ میں مال و دولت میں بھی تجھ سے بڑھ کر ہوں اور نفری کے اعتبار سے بھی تجھ سے طاقتور جتھہ اور جماعت رکھتا ہوں۔ پھر وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا کہ میں یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو گا' اور نہ یہ توقع کرتا ہوں کہ قیامت کبھی برپا ہو گی۔ تاہم اگر میں کبھی اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی گیا تو وہاں ضرور اس سے بھی اچھی جگہ پاؤں گا"۔

حالانکہ اس دُنیا کے مال و متاع کی اصل حیثیت یہ ہے کہ یہ آزمائش کے لئے ہے۔ اور اسی آزمائش کے لئے اللہ نے یہ اونچ نیچ پیدا کی ہے' تاکہ وہ پرکھ لے کہ کون شکر ادا کرنے والا ہے اور کون ناشکرا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا :

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ○ ﴾ (الزخرف ۳۲)

"ہم نے ان کے درمیان سامان زندگی بانٹا ہے اس دُنیا کی زندگی میں' اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر برتری دے رکھی ہے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے سکیں' اور آپ کے رب کی رحمت (قرآن مجید) بدرجہا بہتر ہے اُس (مال و متاع) سے جو یہ جمع کر رہے ہیں"۔

سورۃ القیامہ کی دوسری آیت کے طرزِ استدلال میں بھی انسانوں کے تین قسم کے گروہوں کے خیالات کی نفی کی گئی ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو قیامت کو مانتے تو ہیں لیکن انہوں نے روزِ جزاء کے بارے میں ایسے نظریات گھڑ لئے ہیں کہ بالفعل محاسبۂ اُخروی کا

تصور کالعدم قرار پاتا ہے یا انہیں یہ دھوکہ ہو گیا ہے کہ ان سے باز پرس نہیں ہو گی اور وہ تو بس بخش دیئے جائیں گے۔ چنانچہ فرمایا گیا ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ "نہیں! (تمہارے خیالات درست نہیں ہیں) میں تو قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی" جو تمہیں ہر وقت احساس دلاتا ہے کہ نیکی نیکی ہے اور برائی برائی ہے' لہٰذا ان کو ایک جیسا خیال نہیں کیا جاسکتا' بلکہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ نکل کر رہے گا۔

محاسبۂ اخروی کے انکار کی بنیادیں

۱) نسلی امتیاز : بعض انسانوں کو یہ زعم ہے کہ چونکہ وہ کسی خاص نسل سے تعلق رکھتے ہیں' انبیاء و رُسل یا اولیاء اللہ کی اولاد سے ہیں' اس لئے ان سے باز پرس نہیں ہو گی اور انہیں بخش دیا جائے گا۔ ان میں سرفہرست تو یہود ہیں لیکن اُمت مسلمہ میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں۔ قرآن مجید میں یہود کا قول نقل ہوا ہے : ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ "ہم تو اللہ کے بیٹوں کی مانند ہیں اور اس کے چہیتے"۔ اس لئے کہ ہم انبیاء و رُسل کی اولاد ہیں اور ہزاروں نبی ہماری نسل سے آئے ہیں۔ چنانچہ ﴿سَيُغْفَرُ لَنَا﴾ "ہمیں تو بخش ہی دیا جائے گا"۔ یا ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ "ہمیں تو آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن"۔ اور وہ بھی ہمارے اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ بڑوں سے جو نافرمانی ہو گئی تھی اس کی پاداش میں شاید بنی اسرائیل کو چند دن عذاب دے دیا جائے ——— حالانکہ جن کی اولاد ہونے کی بنا پر انہیں یہ مغالطہ لاحق ہوا ہے انہوں نے تو ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "امام الناس" کا اعزاز بخشا تو آپؑ نے التجاء کی : ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ "اور میری ذریت کے لئے بھی یہی وعدہ ہے؟" تو جواب ملا تھا : ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ "میرا وعدہ ظلم کرنے والوں کے لئے نہیں ہے"۔ قرآن حکیم میں یہودیوں کے مذکورہ بالا دعویٰ کے جواب میں فرمایا گیا ﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾ "پوچھئے پھر کیوں اللہ تعالیٰ تمہیں (دُنیا میں) عذاب دیتا ہے تمہارے گناہوں پر' بلکہ تم بھی انسان ہو ان (انسانوں) میں سے جن کو اس نے پیدا کیا ہے"۔ دیکھا جائے تو اگر اس بنیاد پر جزاء و سزا نہ ہونے کا معاملہ ہو تو پھر تو پوری نوع

انسانی ہی آخر پیغمبر کی اولاد ہے' لہٰذا اللہ کی چہیتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا انسانوں سے تعلق اور تقرب ان کے رنگ و نسل کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ان کی ذمہ داریوں اور سیرت و کردار کے اعلیٰ ہونے سے ہے' جیسے اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا گیا :

﴿ قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾

"اے اہل کتاب! تم کسی بنیاد پر نہیں ہو (یعنی تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے) جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہیں کرتے اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے"۔

۲) شفاعت باطلہ : بعض لوگ یہی کافی سمجھتے ہیں کہ چونکہ وہ کسی رسول یا نبی کی اُمت میں پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے ماننے والے ہیں لہٰذا وہ نبی یا رسول ان کو بخشوا لیں گے یا ان سے نسبت کی وجہ سے انہیں بخش دیا جائے گا۔ اس معاملے میں سب سے بڑے مغالطے میں تو عیسائی ہیں کہ جنہوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے تھے اور وہ سولی چڑھ کر اپنے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ دے گئے' لہٰذا اب ان کے ماننے والے سب بخشے ہوئے ہیں۔

اُمت مسلمہ میں بھی شفاعت باطلہ کا یہی تصور در آیا ہے' اور وہ یہ ہے کہ انبیاء و رُسل اور اولیاء اللہ کو اختیار ہو گا کہ جسے چاہیں گے بخشوا لیں گے' حالانکہ قرآن مجید میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ شفاعت کا سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے :

﴿ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۚ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

"فرما دیجئے: ساری شفاعت کا اختیار اللہ کا ہے' اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے' پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے"۔

اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنے اختیار سے یہ حق عطا کر دے' لیکن قرآن مجید کی رو سے یہ اختیار دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ جیسے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا :

﴿ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴾

"اُس روز (کسی کی) سفارش کچھ فائدہ نہ دے گی مگر اس شخص کی جس کو اللہ اجازت دے اور اس کی بات کو سُننا پسند کرے"۔

یعنی جن کے لئے وہ راضی ہو گا ان ہی کے لئے کوئی شخص اس کے اذن سے شفاعت کر سکے گا' کیونکہ وہی جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے۔

﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ۝ ﴾

"وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم پر احاطہ نہیں کر سکتے"۔

قرآن مجید میں جہاں بھی سفارش کا اثبات ہے کہ اُس کے اذن سے شفاعت ہو گی وہاں اللہ کے علم کا لازماً ذکر ہے' تاکہ سفارش کا جو تصور انسانوں کے ذہن میں ہے اس کا مغالطہ نہ رہے۔ دُنیا میں اگر کسی کی جائز سفارش بھی کی جاتی ہے تو وہ اس شخص کی بے علمی کی بنیاد پر کی جاتی ہے جس کے پاس سفارش کی جائے۔ مثلاً کسی کے پاس کسی کی ملازمت کے لئے جائز سفارش کریں تو یہی کہا جاتا ہے کہ بھائی! جس صلاحیت کا آدمی آپ کو درکار ہے وہ تمام خوبیاں اس آدمی میں موجود ہیں' آپ اسے نہیں جانتے' میں بخوبی جانتا ہوں' اس لئے آپ سے سفارش کر رہا ہوں کہ اسے اپنے پاس ملازم رکھ لیں' یہ اس کا استحقاق رکھتا ہے۔ اسی طرح کسی جج کے پاس کسی کی بے گناہی کی سفارش ہو تو وہ بھی اسی بنیاد پر ہوتی ہے کہ جج صاحب! آپ جائے وقوعہ پر موجود نہ تھے' میں وہاں موجود تھا اور میں جانتا ہوں کہ یہ شخص بے گناہ ہے' لہٰذا اس کے بارے میں میری سفارش مان لیجئے۔ لیکن آخرت میں ایسی کسی سفارش کی گنجائش نہ ہو گی کیونکہ جس کے حضور شفاعت پیش کرنی ہے وہ خود تمام انسانوں کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔

دُنیا میں ایک سفارش تعلقات کی بنیاد پر بھی ہوتی ہے۔ انسان رشتہ داری اور دوستی جیسے تعلقات کی بنا پر بعض لوگوں کی بات کو ٹال نہیں سکتا۔ درحقیقت اس کے پیچھے اصل طاقت انسان کی احتیاج ہی ہوتی ہے کہ اسے دُنیا میں انہی لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے کام لینا ہوتا ہے' اس لئے اسے بعض لوگوں کی دلجوئی کی خاطر یا ان کا دباؤ قبول کرتے ہوئے سفارش ماننی پڑتی ہے۔ لیکن جان لیجئے اللہ تعالیٰ ان

تمام احتیاجات سے پاک ہے جن کے بارے میں انسانی ذہن سوچ سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ کے دوست بھی ہیں' اس کے حبیب بھی ہیں اور خلیل و کلیم بھی ہیں' لیکن اس کی دوستی کسی احتیاج کی بنیاد پر نہیں ہے کہ اگر ان کی بات نہ مانی تو وہ آڑے وقت میں اس کے کام نہ آئیں گے یا اگر وہ ناراض ہو گئے تو اُسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کی شان یہ ہے :

﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا ○ ﴾

"کہہ دیجئے کل شکر اور تمام تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے کسی کو اولاد نہیں بنایا اور نہ ہی اس کی بادشاہت میں اس کا کوئی ساجھی ہے اور نہ اس کا کوئی دوست کسی کمزوری کی بنا پر ہے۔ اس کی کبریائی کو مانو جیسے وہ (خود) بڑا ہے"۔

قرآن مجید شفاعت باطلہ کے اس تصور کی کلی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے دو مرتبہ فرمایا گیا

﴿ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ○ ﴾

"اس دن سے اپنا بچاؤ کر لو جب کوئی نفس کسی نفس کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے فدیہ قبول ہو گا اور نہ اس کو (اپنے اختیار سے) کوئی سفارش ہی فائدہ دے گی اور نہ انہیں کوئی اور مدد مل سکے گی"۔

پھر اس اُمت کو مخاطب کر کے بھی یہی بات فرمائی گئی

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَّالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ ﴾

"اے ایمان والو! خرچ کرو اس میں سے جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے (مال' صلاحیت و مہلت عمر) اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس دن نہ کوئی خرید و فروخت ہو سکے گی' نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور (اس دن کو اس طور پر) نہ ماننے والے ہی در اصل ظالم ہیں"۔

یعنی جو اس دن کو اس طور پر سامنے رکھ کر زندگی نہیں گزارے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ وہ کسی سہارے کی بنیاد پر عمل میں تو کوتاہی کرے گا لیکن وہ سہارا اس دن اسے نہ مل سکے گا۔ اور یہی بات ہے جو نبی اکرم ﷺ نے اپنی اُمت کو ان الفاظ میں فرمادی :

((كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلاَّ مَنْ اَبٰى)) قِيْلَ وَمَنْ يَّاْبٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ ((مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى))

"میرے سب اُمتی جنت میں داخل ہوں گے سوائے ان کے جو (جنت میں داخل ہونے سے) انکار کر دیں گے"۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: "اے اللہ کے رسول ﷺ بھلا (جنت میں جانے سے) کون انکار کرے گا؟ آپ نے فرمایا: (میری اُمت میں سے) جو کوئی میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خود (جنت میں داخل ہونے سے) انکار کر دیا"۔

۴) اللہ کی شانِ کریمی کے حوالے سے خود فریبی کا شکار ہونا : کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ بہت رحیم و کریم ہے، وہ بڑا نکتہ نواز ہے، لہٰذا وہ تو بس بخش ہی دے گا۔ ہمارے ہاں آج کل قوال حضرات یہی نکتے بیان کر کے لوگوں کو بے عمل بنا رہے ہیں اور انہیں دھوکہ دے رہے ہیں کہ اللہ بہت کریم ہے، رحیم ہے وہ تو بس بخشنے کے لئے بہانے ڈھونڈے گا، اس لئے جو جی چاہے کرو، وہ بخش ہی دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ صبح اٹھ کر نہ تو نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہیں، بلکہ صبح سویرے ایک قوالی سن لیتے ہیں اور پھر سارا دن اسی نشے میں مست گزار دیتے ہیں۔ یہی وہ تصور ہے جس کا ذکر سورۃ الانفطار میں کیا گیا ہے :

﴿ يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ○ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ○ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ○ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ○ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ○ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ○ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ○ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ○ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ○ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ○ وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ○ ﴾

"اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے اس کریم رب کے بارے میں دھوکے میں رکھا' جس نے تجھے پیدا کیا' تیرے اعضاء درست کئے' تجھ کو (مناسب) اعتدال پر بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھے ترتیب دیا؟ ہرگز نہیں' بلکہ (اصل مرض یہ ہے کہ) تم جزاء و سزا کو جھٹلانا چاہتے ہو۔ حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں' لکھنے والے معزز (فرشتے)' وہ جانتے ہیں جو تم کر رہے ہو۔ (اور وہ یہ ریکارڈ اس لئے بنا رہے ہیں کہ) بیشک نیکو کار نعمتوں والی جنت میں جائیں گے اور بدکار جہنم میں جائیں گے اور پھر اُس سے غائب نہ ہو پائیں گے۔ آپ کو کیا خبر کہ وہ جزاء و سزا کا دن کیسا ہو گا؟ اور پھر آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ یوم الدین کیسا ہے؟ وہ دن ایسا ہو گا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رکھے گا' اور اس دن تمام تر اختیار اللہ ہی کا ہو گا"۔

حقیقت یہ ہے کہ نیک اور بد ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اور کراماً کاتبین نے جو اعمال نامے تیار کر رکھے ہیں وہ اس لئے کہ ان کی بنیاد پر نیکو کاروں کو جزاء ملے اور بدکاروں کو سزا۔ اور اس پر خود تمہارا نفس لوّامہ گواہ ہے۔

حقیقت حال

قرآن مجید قیامت کے بارے میں جو مثبت تصور اجاگر کرتا ہے اور جس پر یقین کرنا ہی ایمان کا تقاضا ہے' وہ یہ ہے ۔

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

"اے ایمان والو! اللہ کی نافرمانی چھوڑ دو اور چاہئے کہ ہر نفس اس پر نظر رکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا آگے بھیجا ہے' اور دیکھو واقعی اللہ کی نافرمانی چھوڑ دو' بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے"۔

یعنی جب تم مان چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا ہے' قرآن مجید تمہاری ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے اور وہ یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور قیامت کا دن جزاء و سزا کا دن ہو گا تو تمہیں اللہ کی نافرمانی چھوڑ دینی چاہئے اور تمہیں

ہر وقت اس چیز کا فکر دامن گیر رہنا چاہئے کہ میں نے اپنی اس زندگی کے لئے آگے کیا بھیجا ہے؟ کیونکہ وہاں ہر انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اُس نے آگے بھیجا ہو گا' اور اس کے بارے میں وہ ہستی خوب باخبر ہے جس کے سامنے پیشی ہے اور جس نے جزاء و سزا کا فیصلہ فرمانا ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو سورۃ القیامہ میں بھی ان الفاظ میں بیان کیا گیا: ﴿ يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴾ "اس دن آگاہ کر دیا جائے گا ہر انسان کو کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا"۔ اور سورۃ النّبا میں فرمایا گیا: ﴿ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۝ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ ﴾ "ہم نے تم کو عنقریب آنے والے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے' جس دن ہر انسان دیکھ لے گا کہ اس کے ہاتھوں نے آگے کیا بھیجا تھا' اور کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا"۔ اس لئے کہ اس نے آگے کچھ بھیجا ہی نہیں ہو گا اور وہ اسی پاداش میں پکڑ لیا جائے گا۔ پھر اسی حقیقت کو سورۃ النازعات میں مزید واضح فرما دیا گیا:

﴿ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ ﴾

"اور جس وقت آ جائے گی وہ بڑی آفت' اس دن انسان یاد کرے گا کہ اس نے کیا بھاگ دوڑ کی تھی۔ اور جہنم ہر دیکھنے والے کے سامنے رکھ دی جائے گی۔ پس جس نے سرکشی کی ہو گی (اپنے حقوق سے بڑھ کر لیا ہو گا اور اپنی حدود سے آگے بڑھ گیا ہو گا) اور دُنیا کی زندگی کو ترجیح دی ہو گی پس جہنم اس کا ٹھکانہ ہو گا۔ اور جو ڈر گیا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے اور اس نے اپنے نفس کو اس کی خواہشوں سے روکے رکھا' پس اس کا ٹھکانہ جنت ہو گا"۔

یہی وہ دن ہے جس دن وہ انسان پکار اٹھے گا جس نے اس دن کو سامنے رکھ کر زندگی نہ گزاری ہو گی ﴿ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴾ "کہے گا: اے کاش میں نے کچھ آگے بھیجا

ہو تا اپنے زندگی کے لئے "۔ یعنی اس دن معلوم ہو جائے گا کہ اصل زندگی تو یہ ہے۔

ہماری اس دُنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی کا معاملہ ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ہمیں سعودی عرب یا امارات کا ویزا مل جائے۔ تو جسے بھی ویزا ملتا ہے ایک مدت معین تک کے لئے ملتا ہے۔ وہ آدمی وہاں جا کر کماتا بہت ہے لیکن خرچ کم سے کم کرتا ہے' اور اپنی ساری بچت وہاں بھیجتا ہے جہاں سے آیا ہے۔ حالانکہ اس کی محنت وہاں صرف ہو رہی ہے جہاں وہ آیا ہوا ہے' لیکن وہاں وہ پاؤں پسارنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ یہاں میں ایک مدت معین تک کے لئے آیا ہوں اور مجھے مستقل طور پر وہیں رہنا ہے جہاں سے میں آیا ہوں۔ چنانچہ وہ اپنی ساری بچت اپنے وطن بھیج کر وہاں گھر بنواتا ہے' پراپرٹی خریدتا ہے اور بچت جمع کرتا ہے۔ تو یہی تصور ہے جو قرآن مجید ہمیں دیتا ہے کہ تمام لوگ اس دُنیا میں ایک معین مدت تک کے لئے ویزے دے کر بھیجے گئے ہیں اور انہیں مستقل طور پر رہنا وہیں ہے جہاں سے یہ گئے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی فوت ہو جائے تو ہم یہی حقیقت یہ کہتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ "بیشک ہم اللہ ہی کی ملکیت ہیں اور بیشک اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔ اور پھر تمام لوگوں کو وہی کچھ ملے گا جو انہوں نے اس دُنیا کی زندگی میں بچت کر کے آگے بھیجا ہو گا۔ اور جو شخص اس دُنیا میں آ کر اس حقیقت کو بھول جائے کہ میں یہاں ویزا پر آیا ہوا ہوں اور اسی کو اپنا وطن سمجھ لے' اسی زندگی کو اصل زندگی سمجھ لے اور تمام عمر اسی زندگی کو سنوارنے کے لئے لگا دے تو قرآن حکیم ایسے شخص کو ناکام ترین شخص قرار دیتا ہے۔ اس کا ذکر سورۂ کہف کے آخری رکوع کی آیات میں کیا گیا ہے' جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اس سورت کی پہلی دس آیات اور آخری رکوع کی آیات کو حفظ کرے گا تو وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔ فرمایا :

﴿ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ

الْقِيٰمَةِ وَزْنًا٥ ذٰلِكَ جَزَآءُ هُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْآ اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا٥﴾

"کہہ دو کہ کیا ہم تمہیں آگاہ کریں کہ کمائی کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون لوگ ہیں؟ (انہوں نے بھرپور زندگی گزاری ہو گی' دُنیا کمانے کے لئے دن رات ایک کر دیا ہو گا) وہ لوگ کہ جن کی ساری بھاگ دوڑ اسی دُنیا کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے بہت اچھا کام کیا (دُنیا میں بہت جائیداد بنالی اور بزعم خود کامیاب زندگی گزاری)۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا (جس کے بارے میں قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ آخرت میں وہی کچھ ملے گا جو کما کر آگے بھیجا ہو گا اور اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے) پس ان کی کمائی (دُنیا میں جو کچھ جمع کیا تھا) وہ تو اکارت گئی (کیونکہ وہیں رہ گئی) پس ہم ان کیلئے قیامت کے دن ترازو بھی نہیں لگائیں گے۔ ان کی سزا جہنم ہو گی' اسی پاداش میں کہ انہوں نے کفر کیا اور اللہ کے رسولوں اور اس کی آیات کو مذاق ہی سمجھتے رہے"۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ان آیات کو صرف دورِ نبویؐ کے کافروں پر منطبق کر کے اپنے آپ کو اس سے بری سمجھتے ہیں' حالانکہ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں اس دُنیا کے لئے کھپا دی ہیں اور ہم نے تو اللہ کی کتاب سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں ﴿الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا٥﴾ "جن کی آنکھیں ہمارے ذکر (قرآن مجید) سے بند رہیں اور انہوں نے سننے کی بھی طاقت نہ رکھی"۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس روش سے بچائے اور اسے واقعی قرآن مجید کی دی ہوئی ہدایت پر یقین عطا کرے تاکہ وہ آخرت کے لئے توشہ آگے بھیجنے کی طرف اپنی پوری توجہ دے اور وہاں پر کامیابی حاصل کرے۔ آمین!

عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ

"تم میں بہترین وہ ہے جس نے خود قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا"

دُعا کی اہمیت و فضیلت

کرنل (ر) محمد یونس

(دوسری قسط)

قبولیتِ دعا کے خاص اوقات اور مواقع و مقامات

۱۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((ثِنْتَانِ لَا تُرَدَّانِ' الدُّعَاءُ عِنْدَ النِّدَاءِ وَعِنْدَ الْبَأْسِ حِيْنَ يَلْحَمُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا)) وَفِي رِوَايَةٍ ((وَوَقْتِ الْمَطَرِ)) یعنی "دو وقت کی دُعا رد نہیں ہوتی' ایک تو اذان کے وقت کی دُعا اور دوسرے جنگ کے موقع پر جب ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہوں" اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ "بارش کے وقت"۔

اذان کے وقت دُعا کرنے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ اذان کے شروع ہوتے وقت بھی دعا کی جا سکتی ہے اور اذان کے درمیان بھی۔ نیز اذان کے اختتام پر بھی دُعا کی مقبولیت کا وعدہ ایک روایت میں آیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا : یا رسول اللہؐ بے شک اذان دینے والے ہم سے فضیلت میں بڑھے جا رہے ہیں۔ ہم کو یہ فضیلت کیسے حاصل ہو؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "تم اسی طرح کہتے جاؤ جیسے مؤذن کہتا ہے' پھر جب اذان کا جواب ختم ہو جائے تو اللہ سے سوال کرو' جو مانگو گے دے دیا جائے گا"۔ (رواہ ابوداؤد)

۲۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے : ((لَا يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ)) یعنی اذان اور اقامت کے درمیانی وقفہ میں دُعا رد نہیں کی جاتی اور ضرور قبول ہوتی ہے۔

۳۔ لیلۃ القدر میں۔

۴۔ یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ' پورا دن۔ ۵۔ رمضان المبارک کا پورا مہینہ۔

۶۔ جمعہ کی شب 'یعنی جمعرات اور جمعہ کی درمیانی رات۔
۷۔ جمعہ کا پورا دن' خاص طور پر امام کے خطبہ کے لئے بیٹھنے سے ختم نماز تک اور بعض کے نزدیک عصر کی نماز کے بعد غروب آفتاب تک۔
۸۔ فرض نماز پڑھنے کے بعد دُعا قبول ہوتی ہے۔
۹۔ ختم قرآن کے بعد دُعا قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : ((مَنْ صَلّٰی صَلٰوۃً فَرِیْضَۃً فَلَہٗ دَعْوَۃٌ مُسْتَجَابَۃٌ وَمَنْ خَتَمَ الْقُرْاٰنَ فَلَہٗ دَعْوَۃٌ مُسْتَجَابَۃٌ)) یعنی "جس نے فرض نماز پڑھی اس کے لئے مقبول دُعا ہے اور جس نے قرآن ختم کیا اس کے لئے مقبول دُعا ہے"۔
۱۰۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
((اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّہٖ وَھُوَ سَاجِدٌ' فَاَکْثِرُوا الدُّعَاءَ)) یعنی "بندہ اپنے رب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہو' لہٰذا سجدہ میں دُعا کثرت سے کیا کرو"۔
۱۱۔ روزانہ رات کا آخری تہائی حصہ قبولیت دعا کے بہترین اوقات میں سے ہے۔
۱۲۔ علامہ جزری رحمہ اللہ نے حصن حصین میں اوقات اجابت میں "عند اقامۃِ الصلٰوۃ" کا بھی ذکر کیا ہے۔
۱۳۔ وقت مغرب 'یعنی سورج غروب ہوتے وقت (روزانہ)۔

مکہ مکرمہ میں اجابت دُعا کے خاص مقامات :

۱۔ کعبہ شریف یعنی بیت اللہ پر نظر پڑتے وقت۔
۲۔ طواف کرتے ہوئے۔ ۳۔ ملتزم سے چمٹ کر۔
۴۔ میزاب یعنی بیت اللہ کے پرنالہ کے نیچے 'جو حطیم میں گرتا ہے اور اس کو "میزابِ رحمت" کہتے ہیں۔
۵۔ بیت اللہ کے اندر۔ ۶۔ زمزم کے کنوئیں کے پاس۔

۷۔ صفا پر۔ ۸۔ مَروَہ پر۔

۹۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے۔

۱۰۔ مقام ابراہیمؑ کے پیچھے۔

۱۱۔ میدان عرفات میں۔

۱۲۔ مزدلفہ میں ۱۳۔ منیٰ میں۔

۱۴۔ تینوں جمرات کے قریب جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں (ملا علی قاریؒ کے مطابق)

۱۵۔ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان' نیز غارِ ثور' دارِ ارقم اور غارِ حراء بھی مقامات اجابت دعا میں شامل ہیں۔

کن لوگوں کی دعائیں بارگاہ الٰہی میں جلد قبول ہوتی ہیں :

احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مندرجہ ذیل لوگوں کی دعائیں خاص طور پر قبول ہوتی ہیں :

۱۔ مجبور و لاچار اور بے بس لوگ جنہیں لوگ خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

۲۔ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگ اگرچہ وہ گنہگار ہوں یہاں تک کہ اگرچہ کافر ہی ہوں۔

۳۔ باپ کی دعا اولاد کے لئے۔ ۴۔ ہر نیکو کار آدمی کی دعا۔

۵۔ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والی خدمت گار اولاد کی دعا اپنے ماں باپ کے لئے۔

۶۔ مسافر کی دعا۔

۷۔ روزہ دار کی دعا روزہ افطار کرنے کے وقت۔

۸۔ ایک مسلمان کی اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا۔ اور یہ دعا تمام دعاؤں میں سب سے جلدی قبول ہونے والی دعا ہے۔

۹۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب جہنم سے آزاد کردہ بندے جن میں سے ہر ایک کی دن رات میں ایک ایک دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

۱۰۔ مریض کی دعا

۱۱۔ حاجی کی دُعا یہاں تک کہ وہ اپنے گھر واپس آجائے۔

۱۲۔ امام عادل کی دُعا۔ ۱۳۔ مجاہد کی دُعا۔

۱۴۔ اگر کوئی شخص ایسے جنگل بیابان میں ہو جہاں اللہ کے سوا کوئی دیکھنے والا نہ ہو وہاں کھڑے ہو کر وہ نماز پڑھے اور پھر دُعا کرے تو اس کی دُعا رد نہ ہوگی۔

۱۵۔ اگر کوئی مجاہد میدان جہاد میں دشمن کی فوج کے سامنے ہو اور اس کے ساتھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں مگر وہ دشمن کے نرغہ میں ثابت قدم رہا ہو اور اس حال میں دُعا کرے تو اس کی دُعا رد نہ ہوگی۔

۱۶۔ وہ آدمی جو رات کے آخری حصہ میں بستر چھوڑ کر اللہ کے حضور میں کھڑا ہو اور پھر دُعا کرے تو اس کی دُعا ضرور قبول ہوگی۔

دوسروں سے دُعا کی درخواست کرنا:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کے لئے جانے کی اجازت چاہی ' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمادی اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا : ((لَا تَنْسَنَا یَا اُخَیَّ مِن دُعَائِكَ)) (رواہ ابوداؤد والترمذی)۔ یعنی "اے بھیّا اپنی دُعاؤں میں ہم کو مت بھولنا"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ اس کے عوض ساری دنیا مل جانے سے بھی مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوسروں سے دُعا کی درخواست بھی مستحسن فعل ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ جس سے دُعا کے لئے کہا جائے وہ دُعا کی درخواست کرنے والے سے افضل ہو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دُعا کے لئے فرمایا تو ثابت ہوا کہ اکابر کو بھی اپنے چھوٹوں سے دُعا کے لئے کہنا چاہئے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ غائب کے لئے جو دُعا کی جائے بہت جلد قبول ہوتی ہے اور جس سے دُعا کے لئے درخواست کی جاتی ہے وہ بعض اوقات ایسے حال یا اشغال میں ہوتا ہے جن میں دُعا کرنا باعث قبولیت ہوتا ہے۔ جیسے حج یا عمرہ کے لئے جانے والے سے یا مسافر سے یا مریض سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنے لئے دُعا کرنے کا فرما کر دوسروں سے دُعا کرانے کی مستقل ترغیب فرما

دی۔

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "یمن سے جہاد کے لئے آنے والی جماعتوں میں قبیلہ بنی مراد سے ایک شخص اویس نامی آئے گا۔ اللہ کے ہاں اس کا یہ مرتبہ ہے کہ اگر اللہ پر کسی بات کی قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم کو ضرور سچا کردے۔ لہٰذا اگر تم سے ہو سکے تو اس سے اپنی مغفرت کے لئے دعا کرا لینا"۔

جس سے دُعا کی درخواست کی جائے اُسے تکلف نہیں کرنا چاہئے اور نہ تواضع کو آڑ بنا کر معذرت کرے۔ دُعا قبول فرمانے والا تو اللہ ہے۔ ذرا سی زبان ہلانے سے دعا کرنے والے پر کیا بوجھ پڑتا ہے۔ دُعا کی درخواست مسترد کرکے لوگ اپنا ثواب بھی کھوتے ہیں اور دُعا کی درخواست کرنے والے کی دل شکنی بھی ہوتی ہے۔ ہم لوگ دُعا کے بہت زیادہ محتاج ہیں' لہٰذا اللہ کے نیک بندوں سے دُعا کی درخواست کرتے رہنا چاہئے۔ کیا پتہ ایسے لوگوں کی دُعاؤں سے ہی بیڑا پار ہو جائے۔

آدابِ دُعا اور شرائطِ قبولیت

دُعا مانگنے کے بعض آداب رُکنیت کے درجے کو پہنچتے ہیں اور بعض شرائط کے درجے کو کچھ مامورات ہیں اور کچھ منہیات۔

رکن : رکن وہ امر ہے جس پر دُعا کے دُعا ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار ہے۔ مثلاً اخلاص' کہ اس کے بغیر دُعا' دُعا ہی نہیں ہوتی۔

شرط : وہ چیز ہے جس پر دُعا کی قبولیت موقوف ہوتی ہے۔ اگر وہ نہ پائی جائے تو دُعا قبول ہی نہ ہو اگرچہ کتنے ہی اخلاص سے کی جائے۔ مثلاً محرمات (حرام غذا' حرام لباس اور حرام کمائی) جن سے اجتناب لازم ہے۔

مامورات : مامورات وہ پسندیدہ امور و اعمال اور پسندیدہ صورتیں ہیں جو دُعا کو زیادہ موثر اور قابل قبول بنا دیتی ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے ان کا حکم فرمایا ہے۔ مثلاً دُعا

کے لئے دو زانو بیٹھنا اور قبلہ رُخ ہونا کیونکہ یہ اللہ کی طرف توجہ اور ادب و احترام کی علامات ہیں۔ مگر دُعا کی قبولیت ان پر موقوف نہیں ہے۔ ان کے بغیر بھی دل سے نکلی ہوئی دُعا ان شاء اللہ قبول ہو جائے گی۔ بلکہ کسی بھی حالت میں جب بندہ اخلاص اور حضور قلب کے ساتھ اللہ رب العزت کی طرف متوجہ ہو گا اور دل ہی دل میں التجا کرے گا تو اپنے رب کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

منہیات : وہ ناپسندیدہ امور یا دُعا کی وہ صورتیں ہیں جو دُعا کے مناسب یا اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں۔ مثلاً دُعا مانگتے وقت آسمان کی طرف نظر اٹھانا یا تکتے رہنا دُعا کی وہ ناپسندیدہ صورت ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ صورت اللہ کے ادب و احترام کے لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔

آدابِ رکنیت :

۱۔ اللہ جل شانہ کی طرف خلوص دل سے متوجہ ہونا اور یہ یقین رکھنا کہ صرف وہی دُعا قبول کرتا ہے اور وہی مشکل کشا ہے۔

۲۔ پورے یقین کے ساتھ قطعی طور پر اور بغیر کسی تردد اور تذبذب کے دُعا مانگنا۔ نیز دُعا اپنی طرف سے کسی چیز پر موقوف نہ کرنا۔ مثلاً یہ نہ کہے کہ اے اللہ اگر تو چاہے تو میرا قرض ادا کر دے بلکہ اس طرح دُعا مانگے کہ اے اللہ میرا قرض ادا فرما دے یا میرے قرض کی ادائیگی کے اسباب مہیا فرما دے۔ یعنی اپنی طرف سے عزم اور قطعیت کے ساتھ اللہ کے حضور میں اپنی مانگ رکھے۔ بے شک اللہ وہ کرے گا جو وہ چاہے گا۔ کوئی ایسا نہیں جو زور ڈال کر اس سے کوئی کام کرا سکے۔

۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا رہے کیونکہ اس کے بغیر دُعا قبول نہیں ہوتی۔

آدابِ شرائط :

۱۔ کھانے ' پینے ' پہننے اور کمانے کے ذرائع میں حرام سے بچنا۔

۲۔ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دُعا نہ مانگنا۔

۳۔ جو چیز روزِ اول سے ہو چکی ہے اس کے خلاف دُعا نہ مانگے۔ مثلاً یہ کہ الٰہی تو مجھے عورت سے مرد یا مرد سے عورت بنادے۔

۴۔ دُعا میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ مثلاً کسی ناممکن امر کی دُعا نہ کرے۔

۵۔ قبولیتِ دُعا کے لئے جلد بازی نہ کرے۔ مثلاً یہ نہ کہے کہ دُعا پوری ہونے میں ہی نہیں آتی یا میں نے دُعا کی تھی مگر قبول ہی نہیں ہوئی۔

آدابِ مامورات (مستحبات) :

۱۔ دُعا مانگنے سے پہلے کوئی نیک عمل کرنا۔ مثلاً صدقہ دینا یا دو رکعت نماز حاجت پڑھنا۔

۲۔ پاک صاف ہونا' باوضو ہونا۔

۳۔ دُعا کے لئے دو زانو بیٹھنا اور قبلہ رُخ ہونا۔

۴۔ دُعا مانگنے سے پہلے اور آخر میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفات عالیہ کا واسطہ دینا —— چنانچہ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا' وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَآئِهٖ' سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ ○ ﴾ "اور اللہ ہی کے لئے اچھے اچھے نام ہیں' لہٰذا اس کو اس کے انہی ناموں سے پکارو' اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں (یعنی اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں) ان لوگوں کو ان کے کئے کی سزا ضرور ملے گی)"۔

اس پر عمل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس مقصد یا جس حاجت کے لئے دُعا کی جائے پہلے اس سے مناسبت رکھنے والے اسماء حسنیٰ کا تذکرہ کریں اور ان کی وساطت سے دُعا کریں۔ مثلاً اگر اپنی معافی اور مغفرت کی دُعا کرنی ہے تو یوں کہیں :

يَااَللّٰهُ يَا رَحْمٰنُ يَا رَحِيْمُ يَا غَفَّارُ يَاعَفُوُّ يَا غَفُوْرُ يَاوَدُوْدُ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ يَاغَفُوْرُ يَاغَفُوْرُ يَاغَفُوْرُ۔

۵۔ اسی طرح دُعا کے اول و آخر میں نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام بھیجنا' جو دُعا کو قوتِ پرواز عطا کرے گا۔

۶۔ دونوں ہاتھ پھیلانا' کندھوں تک اٹھانا' کھلا رکھنا اور ان کا رُخ آسمان کی طرف رکھنا' کیونکہ دُعا کا قبلہ آسمان ہے اور جب دُعا سے فارغ ہوں تو دونوں ہاتھوں کو منہ پر پھیر لینا۔ یہ مسنون طریقہ ہے' اس میں دُعا کی قبولیت پر ایمان و یقین کا مظاہرہ ہے اور رحمت خداوندی کے نزول پر اعتماد کی طرف اشارہ ہے کہ رحمتِ خداوندی میرے چہرے سے شروع ہو کر مکمل طور پر مجھے گھیرے ہوئے ہے۔

۷۔ حضور اقدس ﷺ سے جو دُعائیں احادیث میں منقول ہیں انہی کو اختیار کرنا کیونکہ وہ تمام ضروریات و حوائج جن کے لئے انسان دُعا مانگتا ہے ان سب کے لئے آپ ﷺ نے دُعائیں تعلیم فرمادی ہیں۔

۸۔ جان' مال اور آل اولاد کے لئے کسی وقت بھی بد دُعا نہ کریں' ہمیشہ عافیت کا سوال کرتے رہیں۔

۹۔ دُعا اپنی ذات سے شروع کریں اور پھر اپنے ماں باپ کے لئے اور تمام مومنین و مومنات اور مسلمین و مسلمات کے لئے' درجہ بدرجہ دُعا مانگیں۔

۱۰۔ ایک ہی مقصد کے لئے تین بار دُعا مانگیں۔ قبولیت کا اثر معلوم ہو یا نہ ہو' دُعا کو کبھی ترک نہ کریں۔

۱۱۔ اپنی تمام حاجات' چاہے وہ کتنی ہی معمولی ہوں یا بہت بڑی کیوں نہ ہوں اللہ ہی سے مانگیں۔

۱۲۔ دُعا سوچ سمجھ کر مانگیں۔ غفلت میں دُعا مانگنا بے ادبی ہے' اور یاد رکھیں کہ اللہ اس شخص کی دُعا قبول نہیں کرتا جس کا دل دُعا کے وقت اللہ سے غافل اور بے پرواہ ہو۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ)) (رواہ الترمذی)

۱۳۔ دُعا کے اختتام پر آمین کہنا۔ دُعا کو آمین پر ختم کرنے کی اہمیت کے بارے میں حضرت ابی زہیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک رات ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ باہر نکلے۔ چلتے چلتے ایک شخص کے پاس پہنچے تو نہایت لجاجت کے ساتھ دُعا کر رہا تھا۔ حضور ﷺ اس کی دُعا سنتے رہے' پھر فرمایا اس نے قبولیت کو واجب کر دیا اگر ختم کر لے۔ حاضرین میں

سے کسی نے پوچھا کہ کس چیز پر ختم کرے؟ فرمایا: آمین کے ساتھ ختم کرے۔ کیونکہ اگر آمین کے ساتھ دُعا ختم کی تو اس نے قبولیت واجب کر دی۔ جن صاحب نے حضور ﷺ سے سوال کیا تھا وہی دُعا کرنے والے کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ اپنی دُعا کو آمین سے ختم کرے اور قبولیت کی خوشخبری سن لے۔ لہٰذا یاد رکھئے کہ دعا و آمین پر ختم کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔

آمین کے معنی کے ضمن میں اکثر حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کے معنی ہیں اِستَجِبْ یعنی اے اللہ قبول فرما۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ میری امید کو پوری فرما' محروم نہ فرما۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو دُعا مانگی جائے آمین اس کی تاکید ہے۔ اگر مجلس میں ایک آدمی دُعا کرے اور حاضرین آمین کہیں تو یہ بھی مستحب ہے' اس طرح آمین کہنے والے دُعا میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں دُعا کرنے والے کو چاہئے کہ جمع کے الفاظ استعمال کرے تاکہ دُعا میں سب شامل ہو جائیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

(یہ مقالہ تنظیم اسلامی لاہور شرقی کے زیر اہتمام
منعقدہ شب بسری کے پروگرام میں پڑھا گیا)

بقیہ : منہجِ انقلابِ نبویؐ

اس کی حیثیت کیا تھی! اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیج دی اور ان کے تمام ارماں ملیا میٹ ہو گئے۔ حضور ﷺ کو اندازہ تھا کہ اس ہزیمت سے قریش کے حوصلے اس قدر پست ہو گئے ہیں کہ اب قریش یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے متعلق سوچیں۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اہل ایمان کو بشارت سنا دی کہ اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ نہیں کر سکتے' بلکہ اب تم چڑھائی کر کے جاؤ گے' اب پیش قدمی تمہاری طرف سے ہو گی۔ اب جنگ کے لئے اقدام ہماری طرف سے ہو گا جو اب تک قریش کے ہاتھ میں تھا۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ○○

ایران میں پارلیمانی انقلاب

آئین سازی اور پارلیمانی جمہوریت کا آغاز

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانان عجم (۱۱)

ڈاکٹر ابو معاذ

مظفر الدین قاچار

اس بادشاہ نے ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) سے ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۷ء) تک ایران پر تاریخ کے نازک دور میں حکومت کی۔ وہ اپنی تخت نشینی کے وقت تبریز سے انگریزوں اور روسیوں کی معیت میں تہران آیا' اور ان کے زیر سایہ اپنی کٹھ پتلی حکومت کا آغاز کیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سلیم الفطرت اور شریف آدمی تھا۔ اس نے ملک کی بدترین اقتصادی بدحالی کے پیش نظر روسیوں سے بھاری قرضے لئے اور وائسرائے ہند لارڈ کرزن کی ایران میں آمد کے بعد یہاں انگریزوں کے مزید قونصل خانے کھلے اور برطانوی ہند سے تجدید تعلقات ہوئی۔ ہرچند کہ بادشاہ بذات خود تو ایک شریف انسان تھا لیکن وہ مفاد پرست امراء اور مشیروں میں گھرا ہوا تھا۔ ملک کا بجٹ مسلسل خسارے میں جا رہا تھا۔ عمال حکومت بد دیانت تھے' تاجر ذخیرہ اندوزی کرتے رہتے تھے اور محلاتی سازشیں عروج پر تھیں۔ کہنے کو تو ایران ایک آزاد ملک تھا لیکن داخلی اور خارجی اعتبار سے انگریزوں اور روسیوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

انقلاب

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' سید جمال الدین افغانی کے مزارِ شاہ عبدالعظیم میں قیام اور پناہ لینے کے بعد وہ جگہ سیاسی اعتبار سے اہمیت اختیار کر گئی تھی اور ناصرالدین

قاچار کو بھی وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک کا دور ایران میں روشن دماغی اور فکری احیاء کا دور تھا۔ بیرون ملک سے کئی فارسی اور عربی جرائد اور مجلات ایران میں کسی نہ کسی طرح سے پہنچ جاتے تھے۔ میلکم خان کا رسالہ "قانون" اور مؤید الاسلام کا رسالہ "حبل المتین" بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ نیز "حکمت" اور "اختر" کا ایران کی ذہنی بیداری میں اہم کردار ہے۔ حاجی زین العابدین کا "سیاحت نامہ ابراہیم بیگ" میں مؤلف نے اس دور کے ایران کے الم ناک حالات کو دلچسپ فکاہی پیرائے میں پیش کیا ہے۔

عوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر علماء اور مجتہدین میں سے کچھ لوگ میدان میں اتر گئے تھے۔ اسی دور میں ایک خفیہ تنظیم "اصلاح طلبان" قائم ہوئی' جس کے سرپرست حجتہ الاسلام سید محمد طباطبائی تھے۔ واعظ حضرات نے منبروں پر خطبات کے دوران مظالم کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً جمال الدین واعظ اصفہانی کی آتش بیانی نے قوم کے جذبات کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وزیر اعظم عین الدولہ نے علماء و مجتہدین کو انتقامی کاروائیوں سے ڈرایا دھمکایا۔ جب عین الدولہ کی وزارت عظمیٰ سے علیحدگی کا عوامی مطالبہ زور پکڑ گیا تو مقتدر سادات' علماء اور تجار کو بر سر عام تختہ دار پر لٹکایا جانے لگا تھا۔

ان حالات میں ایران کے متعدد تاجر' جیّد علماء مثلاً سید عبد اللہ بہبانی اور سید طباطبائی کے ہمراہ احتجاجاً مسجد شاہ (تہران کی جامع مسجد) میں دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ پولیس کی طرف سے ان لوگوں کا محاصرہ کر لیا گیا اور ان کی رسد بند کر دی گئی۔ اب کچھ لوگ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل کر قم چلے گئے اور حضرت معصومہ کے مزار میں جا بیٹھے۔ اسی دن سید محمد طباطبائی اور سید عبد اللہ بہبانی وہاں سے نکل کر اپنے اعزہ و اقارب کے ہمراہ شہر "رے" میں شاہ عبد العظیم کے مزار کی عمارت میں بیٹھ گئے۔ رفتہ رفتہ دیگر علماء' تاجر اور طلبہ بھی اس جگہ جمع ہو گئے۔ ان لوگوں کی مدد ولی عہد شہزادہ محمد علی مرزا نے بھی کی جو عین الدولہ کی وزارت عظمیٰ کا مخالف تھا۔ بادشاہ نے ہر طرح سے یہ دھرنا ختم کروانے کی کوششیں کیں اور جب وہ بار آور نہ ہو سکیں تو ایک فرمان تحریر کروا کے اپنے دستخطوں

نے ان لوگوں کے ہاں بھجوا دیا کہ ان کے دونوں مطالبے تسلیم کر لئے گئے ہیں' وزیر اعظم کو بر طرف کر دیا گیا ہے اور عدالت خانہ قائم کر دیا گیا ہے۔ مظاہرین شاہی سواریوں میں بٹھا کر پوری شان و شوکت سے تہران لائے گئے اور خود بادشاہ نے بنفسہ ان کا خیر مقدم کیا۔ پوری قوم نے اس موقعہ پر "فتح ملت" کے نام سے ایک شاندار جشن منایا۔ لیکن جلد ہی حسب عادت بادشاہ اپنے اس وعدے سے مکر گیا اور فرمان پر عمل کرنے میں پس و پیش سے کام لینے لگا۔

عوام علماء کی قیادت میں ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور فارس و خراسان کے صوبوں میں خوفناک بلوے شروع ہو گئے۔ عین الدولہ نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی اور گرفتار شدگان کو نادر شاہ کے بنائے ہوئے قلعہ کلات میں قید کر دیا۔ ہر چند سید محمد طباطبائی اور سید عبداللہ بہبانی نے شاہ کو ایک خط کے ذریعے اس کا وعدہ یاد دلایا مگر اس نے مزید سختی شروع کر دی۔ ان دونوں علماء نے دوبارہ منبروں پر آکر ملوکیت کے استبدادی حربوں کی مذمت شروع کر دی۔ علماء کے علاوہ "انجمن مخفی" اور "کتاب خانۂ ملی" نے بھی اپنی حریت پسندانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ یورپ سے چھپ کر ایران آنے والے فارسی مجلّات کا لہجہ بھی بتدریج تلخ تر ہونے لگا۔

عین الدولہ نے آپ کی انقلابی سرگرمیوں سے سیخ پا ہو کر آقا سید جمال الدین واعظ اصفہانی کو شہر بدر کر دیا جو قم میں پناہ گزین ہو گئے۔ ایک اور عالم دین شیخ محمد کو بھی تذلیل کے ساتھ شہر بدر کر دیا' جنہیں گدھے پر بٹھا کر جب شاہی پولیس کے سپاہی لے جا رہے تھے تو عوام کے ایک مشتعل ہجوم نے سپاہیوں کو آلیا۔ انہوں نے شیخ محمد کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ لوگوں نے کوٹھری کا دروازہ توڑنا چاہا تو سپاہیوں نے اندھا دھند فائرنگ کر دی جس کے نتیجہ میں پندرہ افراد مارے گئے مگر عوامی مزاحمت کے نتیجہ میں سپاہی بھاگ نکلے' لوگوں نے شیخ محمد کو آزاد کروا لیا اور عبدالمجید شہید (جس نے دروازہ توڑنے میں پہل کرتے ہوئے گولی کھائی تھی) کا جنازہ شہر کی گلیوں اور بازاروں سے گزارا گیا اور لوگوں کا غیظ و غضب اپنے عروج پر جا پہنچا۔

اب آزادی خواہوں نے اسے ایک محفوظ مقام سمجھ کر قم کی جانب ہجرت کرنا

شروع کی۔ یہ ایران کی تاریخ میں "ہجرت کبریٰ" کہلاتی ہے۔ اس دوران چار ہزار افراد نے کچھ عرصہ کے لئے برطانوی سفارت خانہ میں بھی پناہ لئے رکھی۔ مظاہرین کا اب یہ مطالبہ تھا کہ ملک میں جمہوریت قائم کردی جائے اور بادشاہت صرف آئینی طور پر باقی رہ جائے۔ ان مطالبات کی بادشاہ نے سخت مزاحمت کی۔ اس دوران سرکاری عہدیدار بھی جدوجہد آزادی میں شریک ہو گئے اور شاہی فوج میں بھی بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ آخر کار ۵/ اگست ۱۹۰۶ء کو تمام عوامی مطالبات تسلیم کر لئے گئے' اور ایران میں آئینی بادشاہت کے ساتھ پارلیمانی جمہوریت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ آئین کے تحت لوگوں کو ہر طرح کی مذہبی اور سماجی آزادی کی ضمانت مل گئی۔ نئے آئین کے تحت اکتوبر ۱۹۰۶ء میں پہلی پارلیمنٹ قائم ہو گئی جو تیس برس سے ستر برس کی عمر کے افراد کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہوئی تھی۔ یکم جنوری ۱۹۰۷ء کو مظفرالدین قاچار نے باقاعدہ طور پر پارلیمنٹ کا افتتاح کیا۔ جمہوری دستور عطا کرنے کے جلد ہی بعد یہ بادشاہ' ۲۳ ذی قعد ۱۳۲۴ھ (۸ جنوری ۱۹۰۷ء) کو وفات پا گیا۔

شاہ کے آخری ایام کے دوران یہ محسوس ہونے لگا کہ اب ایران سے مطلق العنان بادشاہت اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی ہے اور بادشاہ کا کردار آئینی ذمہ داریوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جبکہ تمام انتظامی اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل ہو چکے ہیں' عوام کو شخصی آزادیاں مل چکی ہیں اور ملک میں قرآن و سنت کی بالادستی قائم ہو چکی ہے۔ مگر جلد ہی یہ تمام امیدیں خاک میں مل گئیں اور ایران ایک بار پھر ایک تاریک دور میں داخل ہو گیا۔

محمد علی شاہ قاچار

اس بد فطرت بادشاہ نے ۱۳۲۴ھ تا ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۹ء) کے مختصر عرصہ کے لئے ایران پر حکومت کی۔ اس بادشاہ نے مجلس (پارلیمنٹ) کو ختم کرنا چاہا اور آئینی بادشاہت کی بجائے ملکی معاملات میں شاہی مداخلت مسلسل جاری رکھی۔ اس وجہ سے ایران میں ایک مرتبہ پھر سے بدامنی پھیلنے لگی۔ اصفہان' شیراز اور تبریز میں فسادات کی

آگ بھڑک اٹھی اور تبریز میں فوج کو بھجوایا جانے والا سرکاری اسلحہ لوٹ لیا گیا۔ کرمان شاہ میں شاہ کے بھائی سالار الدولہ نے قسمت آزمائی کرتے ہوئے تاج و تخت کے حصول کے لئے مسلح بغاوت کر دی اور تین دن کی جنگ کے بعد ناکام ہو کر اپنی جان بچانے کی غرض سے برطانوی قونصل خانے میں پناہ گزین ہو گیا۔

اس ناعاقبت اندیش بادشاہ نے عوام اور جمہوریت کے خلاف استبداد اور مخالفت کا سلسلہ جاری رکھا۔ مجلس یعنی پارلیمان میں سید عبداللہ بہبہانی' سید محمد طباطبائی اور سید جمال الدین واعظ نے حق گوئی و بیباکی کا سلسلہ جاری رکھا' مسجدوں کے منبروں سے بھی صدائے حق بلند ہوتی رہی اور ہر بار بادشاہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے مجلس میں آکر یہ عہد کرتا رہا کہ وہ دستور کا وفادار رہے گا' مگر پھر واپس جاتے ہی وہ مکر جاتا اور اپنے استبداد کا از سرنو آغاز کر دیتا۔

۱۵/ دسمبر ۱۹۰۸ء کو شاہ نے مکرو فریب سے کام لیتے ہوئے تمام اراکین مجلس کو شاہی محل میں بلوایا اور منتخب وزیر اعظم ناصر الملک کو گرفتار کروا دیا۔ غنڈوں کو لوٹ مار کی کھلی اجازت دے دی تاکہ حریت پسندوں کو سزا دلائی جاسکے۔ شاہ نے پہلے اس خیال کا اظہار کیا کہ مجلس (پارلیمنٹ) کو توڑ دیا جائے مگر عوام کے ممکنہ غم و غصہ کے پیش نظر اس نے مشہور عالم دین سید جمال الدین واعظ' ملک المتکلمین' تقی زادہ اور مشیر الدولہ کی رکنیت ختم کرنے کا عندیہ دیا۔ اب تبریز' رشت' قزوین' مشہد' اصفہان اور کرمان کے لوگوں نے اجتماعی طور پر مجلس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اہل تبریز نے تمام غیر ملکی سفارت خانوں کو تار دے کر مطلع کیا کہ وہ بادشاہ کے تمام ظالمانہ اقدامات کی زبردست مذمت کرتے ہیں اور آذربائیجان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کو پیغام بھیجا کہ اگر انہوں نے مجلس کو نقصان پہنچایا تو ان کے گھر جلا دیئے جائیں گے اور ان کے اہل خاندان کو قتل کر دیا جائے گا۔ قزوین سے مسلح دستے تہران آنا شروع ہوئے اور تبریز سے ایک ہزار مسلح افراد تہران کے لئے روانہ ہوئے تاکہ وہ حریت پسندوں کے ساتھ مل کر شاہی استبداد اور غیر ملکی غلبے کے خلاف مزاحمت کرسکیں۔

اس دوران روس اور برطانیہ میں ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت برطانیہ اور

روس نے ایران میں اپنے اثر و نفوذ کے علیحدہ علیحدہ زون بنالئے اور ایران کو اس فیصلے میں کسی طرح سے بھی شریک نہیں کیا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ایران کو تقسیم کر کے یہ دونوں ملک آپس میں مفتوحہ خطے کی صورت میں بانٹنا چاہتے ہوں۔

اب بادشاہ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ہر چند کہ مجلس نے اس کی مذمت کی اور اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا مگر شاہ کو شک صرف اراکین مجلس پر ہی رہا۔ اس نے روسیوں کے ذریعے مظاہرین پر گولیاں چلوائیں اور بہانے بہانے سے عوامی رہنماؤں کو شہر کے باہر ایک باغ میں بلوا کر گرفتار کروالیا۔ اب بادشاہ نے عوام کو عبرتناک سبق سکھانے کے لئے روس کی مسلح افواج سے مدد لینے کی ٹھان لی۔ روسی کرنل لیاخوف کی سرکردگی میں ملک بھر میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور مسجد سپہ سالار میں موجود مجتہدین کے اجتماع کو منتشر کرنے کے لئے روسی فوج نے دباؤ ڈالا۔ جب یہ کوششیں بار آور نہ ہوئیں تو اب بادشاہ نے ایوان مجلس پر زبردست بمباری کروائی جس میں روسی بریگیڈ اور دوسرے مسلح دستوں نے حصہ لیا۔ متعدد اراکین مجلس شہید ہو گئے۔ بعض نمائندے مجبوراً برطانوی سفارت خانے کی عمارت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بہبہانی اور طباطبائی جیسے عظیم علماء گرفتار ہوئے۔ سید جمال الدین واعظ اصفہانی قبرستان جاتے ہوئے راستے میں مارے گئے۔ ملک المتکلمین اور مرزا جہانگیر تختہ دار پر چڑھا دیئے گئے۔ بالآخر اس خوفناک کارروائی کے نتیجہ میں تہران پر کرنل لیاخوف کا قبضہ ہو گیا۔

اب آزادی کے بچے کھچے متوالوں نے مجبوراً تبریز کا رخ کیا اور وہاں پر عوامی بغاوت ہو گئی جس کی قیادت ستار خاں اور سالار ملی باقر خان نے کی۔ شاہ کی فوج نے عین الدولہ کی قیادت میں اس اہم تاریخی شہر کا بھی محاصرہ کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد روسیوں اور انگریزوں کی مداخلت پر یہ محاصرہ اٹھالیا گیا۔

اب اصفہان سے صمصام السلطنت نجف علی خان بختیاریوں کا لشکر لے کر تہران کی جانب روانہ ہوا۔ اہل رشت نے محمد ولی خاں سپہ دار اعظم کی قیادت میں علم آزادی بلند کیا اور بختیاری سردار حاجی علی قلی خان سردار اسعد نے اپنے لشکر کے ہمراہ کوچ کر کے صمصام الدولہ کے ہاتھ مضبوط کئے۔ اب اس متحدہ فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے روسی اور

انگریز تیاریاں کرنے لگے۔ روسی افواج آذربائیجان کے دارالحکومت باکو میں جمع ہو گئیں اور تین ہزار روسی فوجی بحیرہ خزر (Caspian) کی بندرگاہ انزلی پر اتر گئے۔ روسی افواج اور انگریزوں کے تہران پہنچنے سے پہلے ہی آزادی کے متوالوں نے صمصام الدولہ کی قیادت میں تہران کی شاہی افواج کو شکست سے دوچار کر دیا۔ عوام کے غیظ و غضب سے بچ کر بادشاہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۹ء کو روسی سفارت خانے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

اب بچے کھچے اراکین مجلس (پارلیمنٹ) نے اپنا خصوصی اجلاس بلوا کر شاہ کو تاج و تخت سے معزول کرکے اس کے بارہ سالہ بیٹے احمد شاہ کو بادشاہ بنانے کا اعلان کر دیا۔

احمد شاہ قاچار

اس ناعاقبت اندیش بادشاہ کا عہد حکومت ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) تا ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴ء) تک محیط تھا۔

اب بادشاہ نابالغ تھا' خزانہ خالی تھا' ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی' انگریز اور روسی ایران پر نگاہیں لگائے کھڑے تھے اور ہر ممکنہ مداخلت سے باز نہیں آتے تھے۔ اس دوران مجلس (پارلیمنٹ) میں بھی پھوٹ پڑ چلی تھی' ایک گروہ انتہاپسندوں کا اور دوسرا اعتدال پسندوں کا تھا۔ انگریز فوجیں جنوبی ایران میں گھس بیٹھی تھیں۔

اس دوران روسیوں کی مدد سے معزول بادشاہ محمد علی قاچار نے ۱۹۱۱ء میں استر آباد آ کر دوبارہ ایران پر قبضہ کرنا چاہا مگر وہ بری طرح شکست کھا کر یورپ کی جانب چلا گیا۔

اسی دوران امریکی مالی ماہرین نے شوسٹر کی قیادت میں ایران میں مالیاتی نظام کی اصلاح کرنا چاہی تو روسیوں نے سخت احتجاج کیا۔ بالآخر روسیوں نے اپنے ہراول دستے تہران بھجوا دیئے اور ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں اپنی فوج ایک بار پھر بحیرۂ خزر کی بندرگاہ انزلی پر اتار دی۔ ادھر برطانوی حکومت ہندوستان نے بھی شاہی رسالے کے دو دستے شیراز بھجوا دیئے۔ اب حکومت روس نے مطالبہ کیا کہ شوسٹر کو معزول کیا جائے اور آئندہ برطانوی اور روسی سفیروں کے مشورے کے بغیر حکومت ایران کوئی غیر ملکی مشیر مقرر نہ کرے۔

مجلس (پارلیمنٹ) نے غیر ملکی استعماری طاقتوں کے یہ تمام مطالبات پوری جرأت کے ساتھ مسترد کر دیئے۔ ادھر علماء نے ایک فتویٰ جاری کیا جس کے تحت انگلستان اور روس کی ہر طرح کی درآمدات ممنوع قرار دے دی گئیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ زمانہ برصغیر میں گاندھی کی ترک موالات سے پہلے کا دور تھا' فرق صرف یہ تھا کہ ایران میں ایسی تحریک کا محرک علماء کا ایک فتویٰ تھا۔ اس موقع پر شوسٹر نے اپنی کتاب "اختناق فارس (Strangling of Persia) میں لکھا ہے کہ ایران میں روسی افواج کے اترتے ہی مَردوں کے ساتھ ساتھ ایرانی عورتیں بھی ہر قربانی کے لئے تیار ہو گئیں۔ وہ اگرچہ اَن پڑھ تھیں مگر وطن کی آزادی کی قدر و قیمت سے پوری طرح باخبر تھیں۔ وہ ہر روز اپنے گھریلو اخراجات سے کچھ رقم بچا کر دفاعی فنڈ میں جمع کرواتی تھیں۔ جب جوان مَردوں کے دلوں پر خوف و ہراس طاری تھا اور مجلس کے اراکین کے پاؤں بھی ڈگمگا رہے تھے' ایک بار تین سو عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈال کر اور چادروں میں پستول چھپا کر اچانک مجلس میں آگئیں' یہاں انہوں نے نقاب پھاڑ ڈالے اور پارلیمنٹ کے اراکین کو دھمکی دی کہ اگر تم نے ملت کی شرافت اور حریت کی پاسداری نہ کی تو ہم تمہیں گولی مار کر خود بھی خودکشی کرلیں گی۔

بالآخر روسیوں نے مجلس کو محاصرے میں لے لیا اور اپنے استعماری شرائط من و عن تسلیم کرنے پر دباؤ ڈالا گیا جو مجبوراً تسلیم کرلی گئیں اور شوسٹر کو ایران سے واپس امریکہ بھجوا دیا گیا۔

یہ تمام تر شرمناک مطالبات تسلیم ہونے کے باوجود روسیوں نے تبریز پر فوجی یلغار کردی۔ بے گناہ عورتوں' بچوں اور مَردوں کو سخت ایذائیں دے دے کر قتل کر دیا گیا۔ عین عاشورہ کے دن ایک متدین عالم دین ثقۃ الاسلام کو دو مجتہدین اور پانچ ایرانی افسروں سمیت تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ گیلان میں دارالحکومت رشت اور بندرگاہ انزلی میں بھی نہتے عوام کے خون کی ہولی کھیلی گئی۔ بعد میں ۱۹۱۲ء میں مشہد میں عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ حضرت امام رضاؑ کے روضے کے بیرونی حصوں کو زبردست نقصان پہنچا اور متعدد بے گناہ زائرین شہید ہوئے۔

ایران ابھی تباہ حالی سے دوچار ہی تھا کہ جنگ عظیم اول کے منحوس سائے پوری دنیا پر منڈلانے لگے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایران متحارب جنگی قوتوں کے مفادات کی زد میں تھا۔ جرمنوں نے بوشہر میں ۱۸۹۷ء سے اپنا قونصل خانہ کھول رکھا تھا۔ انہوں نے حکومت ایران کی اجازت سے تہران میں ایک کالج بھی کھول لیا جہاں جرمن استاد تعلیم دیتے تھے۔ علاوہ بریں انہوں نے اپنے کچھ تجارتی اڈے بھی قائم کر لئے۔ جنگ سے پہلے ایران میں روسیوں کا ایک قاذق بریگیڈ تھا جس میں آٹھ ہزار سپاہی اور افسر تھے اور اس کا صدر مقام تہران تھا۔ مالیاتی وصولی کے لئے ژاندارمری کے نام پر سویڈن کی سات ہزار فوج بھی ایران میں موجود تھی جو شاہراہوں کا تحفظ بھی کیا کرتی تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر صوبہ فارس میں مقیم تھے۔ ایران کے اپنے فوجی دستوں کی اپنے ہی ملک میں کوئی عسکری اہمیت نہیں تھی۔

ہر چند کہ ایران اپنے طور پر اس جنگ میں غیر جانبدار رہا مگر جلد ہی اپنے جغرافیائی حالات اور داخلی کمزوریوں کی وجہ سے جنگ عظیم کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ روسی اور ترک ایران کے شمال مغربی علاقوں پر قابض ہو گئے اور روسیوں نے تو زبردست تیزی دکھاتے ہوئے ۱۹۱۶ء میں اپنے زیر اثر علاقہ میں ریلوے کی پٹڑی بھی بچھا دی۔ وہ تبریز جیسے اہم شہر پر قابض ہو گئے۔ مغربی علاقہ خوزستان میں قدرتی تیل کی ایک اہم پائپ لائن جو ۱۵۰ میل لمبی تھی اور کوہ تفتون سے اہواز کے راستے ابادان تک بچھائی گئی تھی یہ انگریزوں کی ملکیت تھی۔ ترکوں نے اس کو تباہ کرنے کے لئے ایران کی حدود میں فوج کشی کر دی، مگر چند ایک ابتدائی فتوحات کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں پسپا ہو گئے۔

اب جرمنوں نے بھی ایران پر توجہ مبذول کر دی۔ انہوں نے ایران میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لئے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ لوگوں میں جدید اسلحہ بانٹا اور پیشہ ور لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ قبائلیوں کو پراپیگنڈے اور پیسے کے زور پر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ۱۹۱۵ء میں ترکوں نے کرمان شاہ کی طرف پیش قدمی کی تو کرمان شاہ کے قونصل جنرل نے اپنی پراپیگنڈہ مہم تیز کر دی۔ اس دوران اصفہان میں ایک جرمن تاجر ایرانی لباس میں ملبوس ہو کر آیا اور اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے علماء اور عوام کو

یقین دلایا کہ جرمن قوم حلقہ بگوش اسلام ہو چکی ہے اور ان کا بادشاہ قیصر ولیم ایک حاجی ہے۔ ان بہروپے جرمنوں نے عیسائیوں کے خلاف پراپیگنڈہ بھی شروع کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں وہاں کا روسی نائب قونصل لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا اور برطانوی قونصل جنرل پر بھی حملہ ہوا جس میں وہ سخت زخمی ہو گیا۔ انگریز اور روسی بھاگ کر اہواز آ گئے۔ سویڈن کے دستے بھی جرمنوں کے حامی تھے۔ جنوبی ایران میں جرمنوں نے استحکام حاصل کرنے کے بعد تہران کی جانب توجہ دی۔ روسیوں نے بھی اپنی افواج جرمنوں کو بھگانے کے لئے بھیجیں۔ جرمن اہلکاروں نے شاہ عبدالعظیم کے مزار کے احاطے میں احمد شاہ کو بلوایا۔ شاہ مسلسل گومگو کی کیفیت میں تھا، کبھی انگریزوں اور روسیوں کی سنتا کبھی جرمنوں کی، مگر اس نے بالآخر تہران میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایران کو مسلسل اپنی سیاسی، فوجی اور انتظامی کمزوریوں کی سزا مل رہی تھی اور متحارب طاقتوں نے اسے اپنی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ اس دوران ایران پر کبھی ترک آ دوڑتے کبھی روسی اور کبھی انگریز۔ جنوب میں انگریز ملیشیا ساؤتھ پرشین رائفلز (South Persian Rifles) کی مدد سے ایک بار پھر انگریزوں نے علاقے میں امن و امان قائم کیا۔ جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فتح سے ایران کی جان تو چھوٹ گئی مگر برسرپیکار قوتوں کی بار بار فوج کشی کے نتیجہ میں یہ ملک تباہی و بربادی سے ہمکنار ہو گیا۔

عہد قاچاری میں اسلامی تحریکوں کا احیاء

گزشتہ صفحات میں سیاسی اور انتظامی حالات کچھ زیادہ ہی تفصیل سے پیش کئے گئے۔ ایک تو یہ ایران کے ماضی قریب کے تاریخی واقعات ہیں جن کو سمجھے بغیر ایران کے ذہن و فکر کا ادراک کچھ مشکل ہے۔ علاوہ بریں یہ حالات وہاں کی تہذیب و تمدن کے اہم ارتقائی دور سے متعلق ہیں جس کو سمجھے بغیر قارئین ایران پر اسلام کے حالیہ اثرات کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتے۔ اب ہم خالصتاً مذہبی اور فکری نوعیت کے امور کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

اولاً : قاچاری دور ایران میں عمومی طور پر بے چینی، مایوسی اور پریشانی کا دور

تھا۔ مایوس عوام حالت یاس و فقر میں مذہب ہی کی جانب دیکھتے تھے اور اپنی مدد کے لئے خدا کو پکارتے تھے۔ ایران کا یہ دور یورپ کے عہد بیداری (Renaissance) سے مماثلت رکھتا ہے، جہاں تاریک دور سے روشنی کی طرف سفر ہوتا ہے۔ ابھی تک ایران پر مذہبی علماء اور مجتہدین کا گہرا اثر و نفوذ قائم تھا بلکہ ان کی سماجی حیثیت مزید مستحکم ہو چکی تھی۔ صفوی دور کے غیر ملکی شیعہ علماء کی بجائے اب ایرانی علماء کے اقتدار کا دور دورہ تھا۔ ان کا مقصد اب صفوی طرز کی شیعیت کی تبلیغ ہی نہیں بلکہ ایک مایوس قوم کی سچی رہنمائی کرنا بھی تھا۔ ابتدائی عہد یاس والم میں جب علماء ابھی تک سرگرم نہیں ہوئے تھے اور ابھی سیاسی امور کی بابت اپنی رہنمائی سے لاتعلق تھے تو ایرانی عوام امام غائب کے ممکنہ ظہور کی جانب اپنی نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اس عقیدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بابیت اور بہائیت کی ترویج ہوئی اور ان لوگوں کی کامیابی کے پس منظر مایوس اور تاریک حالات میں عوام کا قنوطیت اور امید کا جذبہ تھا۔ طاہرہ قرۃ العین کی صورت میں ہم آزادیٔ نسواں کی متحرک اور جاندار مگر ایک گمراہ کن صورت بھی دیکھتے ہیں۔

ثانیاً: شاہی استبداد سے نجات کے لئے عوام ایک عرصۂ دراز سے روز مکافات کے منتظر تھے، ایک بار پھر وہ اُمید بھری نظروں سے خدا کی جانب دیکھ رہے تھے۔ انہی حالات میں خدا اور بندے کے تعلقات کا نیا رخ پیش کرتے ہوئے سید جمال الدین اسد آبادی (افغانی) نے جدوجہد اور تحرک کے لئے اسلام کا روشن پہلو اجاگر کیا اور اپنی انتھک مساعی سے عوام کو میدان عمل میں لے آئے۔ لوگوں نے جان و مال کی قربانیاں دیں اور پھر یہ ثابت ہو گیا کہ مذہبی فتویٰ آنے کے بعد عوام کے دلوں میں جوش و جذبہ کئی گنا بڑھ سکتا ہے۔ ہرچند کہ حضرت آیت اللہ حسن شیرازی کا فتویٰ من گھڑت ہی سہی، اس کے نتیجہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایرانی سیاست پر مذہب کی گہری چھاپ پڑ گئی تھی اور علماء و مجتہدین کو واضح طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اب مزید مصلحت سے کام لینے کی بجائے اعلیٰ عوامی قیادت کی اہلیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ احمد شاہ کے زمانہ میں انگریزوں اور روسیوں کی درآمدات کا بائیکاٹ کرنے کے لئے بھی علماء کے فتویٰ نے اہم رول ادا کیا۔ یہی اسلوب بعد میں گاندھی نے اپنی تحریک ترک موالات میں اپنایا اور

علماء کی تائید کے لئے اپنی تحریک کو تحریک خلافت سے وابستہ کرلیا۔ سید جمال الدین نے جس نہج پر ایرانی قوم کوڈالا وہ بعد میں اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ثالثاً : ہرچند کہ علماء کی اکثریت روایتی امور کی انجام دہی میں مشغول رہی مگر کچھ باہمت علماء مرد میدان بھی ثابت ہوئے۔ جن علماء نے شاہ کا ساتھ دیا انہیں منہ کی کھانا پڑی تھی۔ یہ چیز ہم تمباکو کی تحریک کے موقع پر مسجد شاہ کے امام جمعہ کی عوام کے ہاتھوں بننے والی درگت میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح علماء کرام نے تحریک مشروطیت میں اہم کردار ادا کیا اور مجلس (پارلیمنٹ) میں بھی حق گوئی کے ریکارڈ قائم کئے اور پھر وقت پڑنے پر اپنی جان کی قربانیاں بھی دیں۔ ان واقعات نے علماء و مجتہدین میں بے پناہ اعتماد پیدا کیا' ان کا مطالعہ وسیع ہوا' وہ عوام کے مسائل اور خارجی و داخلی حالات سے آگاہ ہوئے۔ اس طرح وہ محراب و خانقاہ سے باہر نکل کر میدان عمل میں اتر آئے۔

رابعاً : اسی دور میں عوام کی اسلام سے گہری وابستگی اور ان کی فطری سادگی کا علم ہوتا ہے۔ جرمنوں نے انگریزوں اور روسیوں کے خلاف (پہلی جنگ عظیم میں) یہ عجیب و غریب پراپیگنڈہ کیا تھا کہ پوری جرمن قوم مسلمان ہو چکی ہے۔ اس طرح جرمنوں کے زیر اثر ایرانی روسیوں اور انگریز سفار تکاروں پر انہیں عیسائی سمجھتے ہوئے پل پڑے۔ عوام کو بادشاہوں نے بیرونی دنیا کے حالات سے قطعاً بے خبر رکھا ہوا تھا اور ایرانی قوم تاریخ کی بدترین جہالت کے دور سے گزر رہی تھی۔ سید جمال الدین اور دیگر لوگوں نے بیرون ملک سے جو تحریری مواد ایران بھجوانا شروع کیا تھا اس نے قومی بیداری کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔ انقلاب جمہوریت کے بعد نوے کے قریب اخبارات اور مجلات ایران میں چھپنا شروع ہوئے۔ عوام کو خارجی حالات اور اپنے مسائل اور ان کے حل سے آگاہی نصیب ہوئی۔

خامساً : مذہبی مقامات کو سیاسی مراکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ہر مشکل وقت میں لوگ بڑی تعداد میں درگاہ حضرت عبدالعظیم' تہران کی مسجد شاہ' قم میں مزار حضرت معصومہ اور دیگر مذہبی مراکز میں دھرنا مار کر مظاہرے کرنے لگے۔ اسی طرح علماء کے گھر اور خانقاہیں مظلوم عوام کی پناہ گاہوں میں تبدیل ہو گئیں۔ یہ سلسلہ بعد کے ادوار میں بھی

جاری رہا۔

سادساً : شاہی دربار کا رعب اور ہیبت ختم ہونے لگا اور بادشاہوں کا روایتی دبدبہ اور ولولہ مشکوک ہو تا گیا۔ ناصرالدین قاچار جیسا طویل المدت بادشاہ سید جمال الدین کے ایک مرید کے ہاتھوں مارا گیا۔ محمد علی قاچار مجلس کے ہاتھوں معزول ہوا۔ ایران میں شاہ کی ذات جو خدا کا عکس سمجھی جاتی تھی وہ اس دیومالائی مقام سے محروم ہوتی چلی گئی اور عوام میں بادشاہت، شاہی افواج اور دیگر ایجنسیوں سے ٹکرانے کا عزم اور حوصلہ پیدا ہو گیا۔

سابعاً : اس دور میں کچھ علماء شاہ کے بدستور وفادار اور روایتی تصورات کے امین بھی بنے رہے۔ ان کی وجہ سے آزادی کی تحریکوں کو کئی بار نقصان بھی پہنچا۔ علماء نے مجلس پر دباؤ ڈالا کہ عورتوں کو ووٹ کا حق نہ دیا جائے۔ شیخ فضل اللہ جیسے عالم نے مجلس (پارلیمنٹ) کی جانب سے پیش کردہ اصلاحات کی مخالفت کی۔ اسی طرح پریس کی آزادی کی بھی مخالفت کی گئی۔ شیخ فضل اللہ کے بقول پریس کی آزادی سے مخرب اخلاق لٹریچر عام ہو جائے گا اور والٹیر جیسے فرانسیسی مصنف کی رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی سے پُر کتب بھی چھپ جائیں گی۔ مجلس کے لوگ ہمارے مذہبی فنڈ ریلوے اور کارخانوں کی تنصیب میں خرچ کریں گے۔ یہ لوگ ایسی آزادیاں دینا چاہتے ہیں جن کی رُو سے دنیا کے تمام لوگ برابر ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کی بیویاں بھی تبدیل کر سکیں گے۔ یہ آزادی، مساوات اور اخوت زندہ باد تو کہتے ہیں، یہ لوگ آخر کیوں اسلام اور قرآن زندہ باد کا نعرہ نہیں لگاتے؟ افراسیابی اور دہقانی کی کتاب "طالقانی اور تاریخ" کے مندرجات کے مطابق ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ آئینی انقلاب کے پیچھے بہائیوں کا ہاتھ ہے جو آزادانہ طور پر اپنے کافرانہ عقائد کی ترویج کرنا چاہتے ہیں۔

علماء کے اس موقف سے شہ پا کر اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے جاگیردار اور قبائلی سردار بھی بادشاہ کی حمایت اور پارلیمنٹ کی مخالفت میں اتر آئے۔ ان تمام استحصالی طبقوں کے اتحاد کے باعث آئین کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ روسی اور برطانوی استعمار نے ایران پر اپنے دانت گاڑ دیئے اور عوام الناس شاہی جبر و استبداد کا شکار ہو کر رہ گئے۔

امام شامل رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ حکومت

اظہار احمد قریشی

پہلے امام غازی محمد صاحب عملی جہاد اور تبلیغ میں اس قدر مصروف رہے کہ انہوں نے باقاعدہ حکمرانی نہیں کی۔ دوسرے امام حمزہ بیگ کے ہاں حکمرانی کا آغاز ہوا۔ ہوتے ہوتے تیسرے امام حضرت شامل صاحب ۱۸۵۵ء کے لگ بھگ پورے اور باقاعدہ حکمران بن گئے۔ ان کا اندازِ حکمرانی اور طرزِ حکومت پیش کیا جاتا ہے۔

انتظامی ڈھانچہ

سارے انتظامی ڈھانچے کی چوٹی پر حضرت امام شامل تھے۔ ان کے پاس تمام دنیوی اور مذہبی اختیارات تھے۔ وہ اپنے لئے امیر المومنین کا لقب استعمال کرتے تھے۔ اصولی طور پر امام صاحب کے اختیارات شریعت کے دائرے تک محدود تھے۔ وہ شریعت کے احکام کی وضاحت کرنے والے بھی سب سے بڑے خود ہی تھے۔

حضرت امام صاحب چیف جسٹس بھی تھے۔ انہوں نے ہفتہ کے دو دن لوگوں کی شکایات سننے کے لئے وقف کئے ہوئے تھے۔ فیصلے اکثر اوقات موقع پر ہی کر دیئے جاتے تھے۔ جب ضروری ہوتا تو امام صاحب متعلقہ افسر یا آبادی کو خط لکھ دیتے کہ فیصلہ پر عمل درآمد کرائیں۔ کسی افسر کے خلاف شکایت حق پر مبنی ہوتی تو اس افسر کی سرزنش کی جاتی اور اسے ہدایت کی جاتی کہ وہ شکایت رفع کرے۔

امام صاحب کی سیاسی' انتظامی' مذہبی اور عدالتی مصروفیات میں مدد کیلئے ۱۸۴۲ء میں ایک دیوان بنایا گیا۔ اس میں امام صاحب کے چند معتمد ترین اشخاص تھے۔ دیوان میں باہمی مشاورت اور بلند ترین سطح کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس سے امام صاحب پر سے روز مرہ کی مصروفیات کا بوجھ کم ہو گیا۔

فوجی انتظامیہ کی ریڑھ کی ہڈی نائب حضرات تھے۔ ان کا تقرر امام صاحب کسی خاص علاقہ یا خاص آبادی یا بعض اوقات متعدد خاص آبادیوں پر کرتے تھے۔ ہر آبادی کو امام صاحب نائب کی تقرری سے مطلع کرتے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں چار نائب تھے جبکہ ۱۸۵۶ء میں ان کی تعداد ۳۳ تھی۔

نائب حضرات کو تفویض کردہ اختیارات اور ان کے ماتحت علاقہ کی وسعت کا معاملہ مختلف نائبوں کے لئے مختلف ہوتا۔ عام طور پر ایک نائب اپنے تحت علاقہ کا پورا انتظام سنبھالتا تھا۔ امن و امان اس کی ذمہ داری تھی۔ خاص طور پر نائب کے ذمہ ٹیکس جمع کرنا' شرعی عدالتوں کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانا اور اپنے ماتحتوں پر امام صاحب کے فوجی اور انتظامی قوانین کے مطابق نگرانی جیسے فرائض ہوتے تھے۔ سب سے اہم یہ کہ نائب اپنے علاقے کا فوجی کمانڈر ہوتا تھا جو اپنے لوگوں کو میدان جنگ میں لے جاتا تھا۔ چنانچہ وہ لوگوں کو تیاری کی حالت میں رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ نائب کے ماتحت دبیر (Dibirs) اور معظوم ہوتے تھے جو نائب کے علاقے کے مختلف حصوں کا انتظام کرتے تھے۔ ان کے تحت گاؤں کے بزرگ ہوتے تھے۔ معظوم حضرات ایک سو آدمیوں کو کنٹرول کرتے تھے جبکہ نائب کے تحت کئی سو (عام طور پر ۵۰۰ آدمی) ہوتے تھے۔

جب انتظامیہ زیادہ پیچیدہ ہو گئی اور کنٹرول مشکل ہو گیا تو امام صاحب نے تجربہ کیا کہ نائبوں کو مختلف درجات میں رکھا جائے۔ آخر کار ۱۸۴۵ء کے بعد مدیر کا عہدہ قائم کیا گیا۔ مدیر متعدد نائبوں کے اعمال کی نگرانی کرتا تھا اور ان نائبوں کو یا ان نائبوں کے آدمیوں کو جنگ میں لے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مدیر وہ تمام کام اپنی جائے رہائش کی آبادی میں انجام دیتا تھا جو کہ ایک نائب کرتا تھا اور جو امام صاحب اپنی رہائش کی آبادی میں کرتے تھے۔ نائبوں اور مدیروں پر کنٹرول کرنے' ان کی رپورٹوں کو چیک کرنے اور آزاد اطلاعات حاصل کرنے کے لئے امام صاحب کے پاس محاسب حضرات تھے جو اپنی شخصیت اور اپنا عہدہ ظاہر کئے بغیر دورے کرتے تھے اور امام صاحب کو ان کے افسران کی حرکات سے باخبر رکھتے تھے۔ بعض اوقات چند نائبوں کی کارگزاریوں کی کھلے طور پر چیکنگ کی جاتی تھی۔ ایسے لوگوں کو امام صاحب پیشگی اطلاع کر دیتے تھے۔

امام صاحب اور ان کے سینئر افسران کے درمیان خط و کتابت خصوصی تیز رفتار پوسٹل سروس سے ہوتی تھی۔ ان پیغامبروں کے لئے ہر جگہ حکم تھا کہ ان کو تازہ دم گھوڑے دیئے جائیں اور کھانا اور سونے کی جگہ دی جائے۔ اس طرح ہر رپورٹ یا حکم بعید ترین مقام پر بھی دو یا تین دن میں پہنچ سکتا تھا۔

نائبوں کو شریعت کے مطابق سزا دینے کا اختیار نہیں تھا بلکہ انہیں اس سے منع کر دیا گیا تھا۔ ان معاملات کے لئے ہر نائب کے پاس ایک مفتی اور چند قاضی ہوتے تھے۔ ہر قاضی کے ذمہ ایک مسجد اور ملحقہ آبادی تھی۔ قاضی کو شریعت کے مطابق فیصلے کرنے ہوتے تھے' مسجد میں نماز پڑھانی ہوتی تھی' خطبہ دینا ہوتا تھا اور عمومی طور پر بستی کے لوگوں کو شریعت کے مطابق چلانے کے کام

کرنے ہوتے تھے۔ ہر مفتی اپنے نائب جتنے علاقے کا ذمہ دار تھا۔ مفتی کو قاضی نامزد کرنے ہوتے تھے اور ان کی کارگزاری پر نگاہ رکھنی ہوتی تھی اور ان کے فیصلوں پر تنقیدی نگاہ ڈالنی ہوتی تھی۔ ان کے سوالات کے جواب دینا ہوتے تھے اور کسی معاملے میں لوگ مفتی کی جانب رجوع کریں تو مفتی کو فیصلہ دینا ہوتا تھا۔ یہ بھی مفتی کا فرض تھا کہ وہ شریعت سے ہٹ کر کوئی کام ہو تو اس کو از خود یا نائب کو اطلاع دے کر اس کی معرفت صحیح کروائے۔

مفتی اور قاضی اپنے اعمال میں امام صاحب کی ہدایات اور شریعت کے بارے میں امام صاحب کی وضاحتوں کے پابند تھے۔ مفتی اور نائب کا باہمی تعلق یعنی ایک دوسرے کے مقابل پوزیشن مکمل واضح نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جزوی طور پر آزاد تھے۔ اس سے بعض مواقع پر مفتی صاحبان اپنے نائبوں کی مخالفت کر سکتے تھے۔ اس صورت حال میں امام صاحب کو موقع مل جاتا تھا کہ وہ دونوں کی حرکات پر نگاہ رکھ سکیں اور صورت حال کے تقابلی مطالعہ سے صحیح معلومات حاصل کر سکیں۔

فوجی انتظامات

بہت ہی کم لوگ فوجی خدمات سے مستثنیٰ تھے۔ چند گاؤں کے لوگ بڑی ضروری اقتصادی مصروفیات کے سبب لڑائی میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ یہ لوگ نمک اور شورا بناتے تھے۔ باقی تقریبا سب مرد جنگجو تھے اور لڑائی کے لئے تیار رہتے تھے۔ چنانچہ امام صاحب کے پاس آغاز ہی سے ایک تیار' سریع الحرکت فوج تھی۔ امام صاحب نے ان لوگوں کا ڈسپلن بہتر بنانے اور ان کے ہتھیار اور دیگر سامان مع خوراک کے معیار مقرر کرنے کی کوشش کی۔ امام صاحب کے احکام کے مطابق نائب حضرات اور دوسرے کمانڈر اس بات کو یقینی بناتے تھے کہ ۱۵ اور ۵۰ سال کی عمر کے درمیان سب مردوں کے پاس گولہ بارود اور خوراک کی ایک مقررہ مقدار اور ضرورت کا دوسرا سامان اور کپڑے موجود ہوں۔ جنہیں گھوڑا میسر تھا انہیں گھوڑے پر لڑائی لڑنی ہوتی تھی۔ نائب حضرات کا فرض تھا کہ ان گھوڑوں کی صحت کی خوب دیکھ بھال ہو۔

یہ جنگجو امام صاحب کی فوج کی اکثریت تھے۔ کسی مہم کے ملحقہ علاقے میں ہر مرد فوجی ڈیوٹی پر آ جاتا تھا۔ دوسرے علاقوں سے یہ کوٹے کے مطابق بلائے جاتے تھے۔ یہ کوٹا ہر مہم کے لئے امام صاحب مقرر کرتے تھے' جو مردوں کی تعداد فی گھریا فی ڈیرہ کے حساب سے مقرر ہوتا تھا۔ اس قسم کی فوج کے چند بالکل ظاہر نقصانات ہوتے ہیں۔ باقاعدہ ڈسپلن کی کمی' لڑائی کے وقت مستقل مزاجی میں کمی' لوگوں کا اپنے گھروں سے دور جا کر لڑنے کے جذبہ میں کمی' فصلوں کے موسم میں ان لوگوں کی

کمیابی یا نایابی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان لوگوں کی وفاداریاں زیادہ تر اپنے قبیلہ کے لئے تھیں نہ کہ امام صاحب یا مشترکہ مفاد کے لئے۔ چنانچہ مستقل فوج کی ضرورت آغاز سے ہی محسوس کی جا رہی تھی۔

پہلے دو اماموں کے پاس ایک مستقل مرکزی دستہ تھا جس میں چند سو جاں نثار لوگ تھے جو ہر جگہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کو امام شامل نے منظم کیا اور وہ ان کو نائبی مرید کہتے تھے تاکہ یہ لوگ صوفی مرید یعنی طریقت کے مرید سے ممتاز رہیں۔ امام شامل کے بیٹے کی گواہی کے مطابق ان نائبی مریدوں کی تعداد قریباً چار سو تھی۔ ان میں سے ایک گروپ ۱۲۰ نائبی مرید معہ ۱۲ کمانڈرز' جو دس دس پر ہوتے تھے' پر مشتمل ہوتا۔ یہ لوگ امام صاحب کے باڈی گارڈ تھے۔ باقی لوگ نائبوں اور مدیروں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ ان نائبوں اور مدیروں کے لئے مرید باڈی گارڈ بھی ہوتے تھے اور قابل بھروسہ ملازم بھی' جن کو خصوصی اہم کاموں پر بھیجا جاتا تھا۔

نائبی مرید صاحبان نڈر ہونے کے سبب بڑے مشہور تھے۔ یہ مکمل وفادار تھے اور امام صاحب اور اپنے نائبوں کی کامل اطاعت کرتے تھے اور اس میں اپنی جان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ان مرید صاحبان کا اگرچہ کوئی خاص عزت کا مقام نہیں ہوتا تھا لیکن ان کا رعب بہت تھا۔ ان کا کل خرچ' اسلحہ' گھوڑے' کپڑے اور گھر کا خرچ امام صاحب' نائب اور مدیر دیتے تھے۔

یہ مرید کتنے بھی پر رعب ہوتے تھے لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ امام شامل صاحب نے ۱۸۳۰ء کی دہائی میں ہی اس سے بڑی باقاعدہ فوج کی بنیادیں رکھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۴۰ء کی دہائی کے آغاز میں ہر دس گھروں کے ذمہ یہ لگایا گیا تھا کہ وہ ایک گھوڑ سوار مہیا کرے۔ یہ گھوڑ سوار "مرتزق" کہلاتے تھے۔ یہ ہر دوسرے کام سے آزاد ہوتے تھے۔ ان کا اور ان کے گھروالوں کا کل خرچ اور ان کے کھیتوں اور جانوروں کی دیکھ بھال بقایا نو گھرانوں کے ذمہ تھی۔ "مرتزق" لوگ دل و جان سے فوجی خدمات بشمول پہریداری' دورے اور دشمن کے لئے جال بچھانے کے کام اپنے گاؤں سے ملحقہ علاقے میں انجام دیتے تھے۔ یہ "مرتزق" الگ الگ یونٹوں میں ہوتے تھے اور الگ الگ ہی لڑتے تھے۔

"مرتزق" لوگوں کی وجہ سے متعدد مسائل کا بہت اچھا حل نکل آیا۔ اس سے ایک بڑی اور ہمہ وقت تیار قوت فراہم ہو گئی جس سے روسیوں سے یا اندرونی باغیوں سے [illegible] سکتا تھا اور مجاہدین کے خزانہ پر بار نہیں پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں کی بھی بڑی تعداد وجود میں آگئی جن کو امام صاحب کی حکومت سے فائدے تھے اور وہ امام صاحب کی حکومت [illegible]

خواہشمند تھے۔ چنانچہ ان لوگوں پر اپنے اپنے دیہات کے لوگوں کو کنٹرول کرنے کے لئے اعتماد کیا جا سکتا تھا۔

اس گھوڑ سوار فوج کے علاوہ امام صاحب نے باقاعدہ پیدل فوج بھی بنائی۔ یہ غالباً ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ ہوا۔ اس پیدل فوج کے بارے میں دستاویزات سے بہت کم معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کو "نظام" کہتے تھے' یہ نام "نظام الجدید" سے اخذ کیا گیا جو سلطنت عثمانیہ اور محمد علی کے ہاں استعمال ہو تا تھا۔ ایسا معلوم ہو تا ہے کہ "نظام" امام شامل کی رہائش کے ملحقہ ہی ہوتے تھے اور مکمل طور پر امام صاحب کے ماتحت تھے۔ جبکہ "مرتزق" نائبوں کے ماتحت ہوتے تھے۔ "نظام" کو صرف ایک مرتبہ ہی روسیوں سے لڑایا گیا اور یہ مکمل شکست کھا گئے۔ اس کے باوجود اور روسیوں کی جانب سے ان کا مذاق اڑانے کے باوجود یہ "نظام" بڑے کار آمد ثابت ہوئے ہوں گے یا کم از کم انہوں نے امام صاحب کے احکام اپنے علاقے میں تسلیم کروانے میں بڑا کردار ادا کیا ہو گا۔

داغستان کے پہاڑی لوگ قدیم زمانے سے بارود بناتے تھے۔ امام شامل نے اپنی ضروریات کے لئے بارود بنانے کے تین کارخانے بنائے۔ ان میں سے ایک پانی کی طاقت سے چلتا تھا۔ پہاڑی لوگوں نے کچھ توپوں کے گولے اور کچھ بم بھی بنائے' لیکن یہ بہت گھٹیا قسم کے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہاڑوں میں سیسہ (lead) دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ اکثر شیل جو وہ استعمال کرتے تھے روسیوں سے قبضہ کئے ہوئے تھے۔ بعد میں امام صاحب نے راکٹ بنانے اور استعمال کرنے بھی شروع کر دیئے۔

۱۸۴۲ء میں امام صاحب نے اپنا توپ خانہ بھی بنانا شروع کر دیا جو انہوں نے ۱۸۴۹ء میں روسیوں کے خلاف استعمال کیا اور بڑی تباہی پھیلا دی۔ شروع میں توپ خانہ صرف روسی فوج سے چھینی ہوئی توپوں پر مشتمل ہو تا تھا۔ بعد میں امام صاحب نے خود اپنی توپوں کی ڈھلائی شروع کر دی۔ لیکن ان کا معیار اچھا نہیں تھا۔ دونوں طریقوں سے امام صاحب نے چند درجن توپیں جمع کر لیں۔ روسی فوج کے بھگوڑوں نے امام صاحب کی توپوں کے استعمال کرنے اور مرمت وغیرہ کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ امام صاحب نے توپ خانے کے استعمال کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ چنانچہ خاص خاص سڑکیں پختہ کی گئیں تاکہ توپیں تیز رفتاری سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جا سکیں۔

روسی لوگ پہاڑی لوگوں کے توپ خانہ کے ماہرانہ استعمال کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان توپوں کے نشانے بڑے صحیح ہوتے تھے اور خاص طور پر یہ بہت تیز رفتاری سے ادھر ادھر لے جائے

جاتی تھیں۔ روسیوں نے بہت زور لگایا کہ امام صاحب کی کوئی توپ لڑائی کے دوران قبضہ میں لے لیں۔ لیکن ان کی یہ کوششیں عام طور پر ناکام ہو جاتی تھیں۔ البتہ پہاڑی لوگوں نے توپ خانہ کم ہی استعمال کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ امام صاحب نے اس زبردست ہتھیار کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں ہی رکھا۔ ان کے بس چند ایک ہی ماتحت افسران' عام طور پر مدیر حضرات کے پاس ایک ایک یا دو دو توپیں تھیں۔ باقی سب توپیں امام صاحب کی رہائش کے نزدیک رکھی جاتی تھیں۔

امام صاحب کے پاس چند انجینئر بھی تھے جو قلعہ بندیاں تعمیر کرتے' سڑکیں بناتے اور ضرورت پڑنے پر سڑکوں کو توڑتے بھی تھے۔ روسی بہت سخت حیران ہوئے کہ ان لوگوں نے ۴۹ ـ ۱۸۴۷ء کے بڑے بڑے محاصروں کے دوران روسیوں کی سرنگیں بنانے کی کوششوں کو ناکام بنادیا۔

اسی زمانے سے پہاڑی لوگوں کے اولین فوجی ہسپتال لوگوں کے علم میں آئے۔ پہلی دفعہ خصوصی مقامات مقرر کئے گئے کہ وہاں زخمیوں کا علاج کیا جائے گا۔ ان لوگوں کا علاج رواجی طریقوں کے مطابق تھا۔ اس طریق علاج کے متعلق روسی لوگ کہتے تھے کہ یہ اس وقت کی یورپین دواؤں سے کہیں زیادہ اثر کرتا تھا۔

زیادہ ہمرنگی اور زیادہ ڈسپلن کی خاطر امام صاحب نے خاص رنگوں کے کپڑے اپنی باقاعدہ فوج اور اسی طرح اپنے تمام کمانڈروں اور افسروں کے لئے رائج کئے۔ کمانڈروں اور لڑائی میں بہادری دکھانے والوں کے لئے امتیازی نشان رکھے گئے۔ یہ ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ کیا گیا۔ اسی طرح شرم دلانے کے لئے خصوصی نشان رکھے گئے جو بزدلوں کے لباس میں شامل ہوتے تھے۔ اسی طرح ڈسپلن کی خلاف ورزی یا فوجی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سزائیں مقرر تھیں۔

مالی معاملات

خزانہ یعنی بیت المال امام شامل صاحب کا شروع کیا ہوا نہیں تھا' یہ انہیں سابقہ اماموں سے ملا تھا۔ البتہ امام شامل کے تحت مالی معاملات منظم کئے گئے۔ مختلف مدات سے مندرجہ ذیل آمدنی ہوتی تھی۔

۱۔ ٹیکسوں سے: دو سب سے بڑے ٹیکس شرعی خراج یعنی زمین کا ٹیکس اور زکوٰۃ تھے۔ شرعی خراج صرف چند گاؤں پر لگایا گیا تھا جو یہ ٹیکس اس سے قبل جاگیرداروں کو چراگاہ کی زمین پر دیا کرتے تھے۔ یہ ٹیکس نقدی کی صورت میں ہوتا تھا۔ زکوٰۃ نقدی اور جنس دونوں صورتوں میں وصول کی جاتی تھی۔ امام شامل کے خزانچی کے

بیان کے مطابق کم سے کم سالانہ آمدنی خراج سے ۴۵۰۰ چاندی کے روبل اور زکوٰۃ سے ۳۲۰۰ چاندی کے روبل' ۳۲۰۰ بھیڑیں اور ۵۲۳۱۰۲ پیمانے اناج کے ہوتے تھے۔ لیکن عام طور پر یہ تعداد اس سے زیادہ بلکہ دوگنی تک ہوتی تھی۔ جو سات گاؤں فوجی خدمات سے مستثنیٰ تھے وہ نمک اور شورے کا مقررہ مقدار کا کوٹا خزانہ کو دیتے تھے اور اپنا سارا ابقایا مال امام صاحب کو مقررہ قیمت پر دینے کے پابند تھے۔

بعض اوقات امام صاحب خصوصی غیر معمولی ٹیکس نافذ کرتے تھے جو کسی خاص مہم کے لئے خوراک کی ضرورت کی بناء پر ہوتا تھا۔ یہ خصوصی ٹیکس ۱۸۴۰ء کے عشرے کے اخیر اور ۱۸۵۰ء کے عشرے کے آغاز میں بار بار لگے اور لوگ ان سے بہت نالاں ہو گئے۔

۲۔ خمس : مال غنیمت کا پانچواں حصہ جو شریعت کے مطابق حکمران کا حصہ ہوتا تھا۔ یہ غالباً آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ اس پانچویں حصہ میں ہر چیز شامل ہوتی تھی۔ سامان' جانور' قیدی اور قیدیوں کا زر فدیہ۔ ۱۸۵۲ء کی مثال لیجئے' اس سال خزانہ کو خمس کی آمدنی ۱۵۲۳۰ چاندی کے روبل ہوئی۔

۳۔ لوگوں سے وصول شدہ تمام جرمانے خزانے میں جاتے تھے۔ جو لوگ وارث چھوڑے بغیر انتقال کر جاتے ان کی جائیداد خزانے میں داخل ہو جاتی تھی۔

۴۔ اوقاف کی زمینوں کی کل آمدنی جو مساجد اور اماموں پر خرچ ہوا کرتی تھی اب خزانے میں جانے لگی۔

۵۔ ایک خاص ذریعہ یہ تھا کہ ہر گھر سے چاندی کے تین روبل سالانہ لئے جاتے تھے۔ یہ رقم امام شامل کے کہنے کے مطابق ان کے ذاتی اخراجات پر صرف ہوتی تھی۔

امام صاحب اپنے اخراجات میں مقدور بھر شریعت کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوشش کی جاتی تھی کہ ہر ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ عام طور پر شریعت کی مقرر کردہ مدات پر ہی صرف ہو۔ ہر ذریعہ آمدنی کا الگ الگ حساب رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ انتظامی معاملات سے آمدنی یعنی جرمانے' وراثت' ضبطیاں یا ان کا کچھ حصہ مساجد اور علماء پر خرچ ہوتا تھا۔ ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کا کچھ حصہ نائبوں کے اختیار میں ہوتا تھا کہ اسے وہ اپنے اور اپنے مریدوں کی

ضروریات پر خرچ کریں۔ اس بات کا فیصلہ امام صاحب کرتے تھے کہ ٹیکسوں کی آمدنی کا کتنا حصہ نائبوں کی صوابدید پر رہے' اگرچہ نائب حضرات کو آمدنی کے دیگر ذرائع بھی میسر تھے۔
خمس کا پانچواں حصہ سیدوں کے لئے مخصوص تھا' جو ان ۲۷ مردوں کے درمیان برابر تقسیم کیا جاتا تھا جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی اولاد میں سے ہیں۔ باقی ۴/۵ حصہ کے اخراجات میں کچھ ردوبدل کیا گیا اگرچہ کوشش کی گئی کہ یہ خرچ خیراتی اور فوجی ہی رہیں۔ خمس کا بڑا حصہ روسی فوج سے بھگوڑے ہو کر آنے والوں کی ضروریات پر صرف ہوتا تھا۔
امام شامل کے بیان کے برعکس کہ زکوٰۃ کا مصرف مکمل طور پر علماء کے ہاتھ میں اور ان کی صوابدید پر تھا۔ امام صاحب خود بھی اس کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اگرچہ زکوٰۃ کے شرعی مصارف میں سے کچھ دوسرے ذرائع سے پورے ہو جاتے تھے لیکن پوری کوشش کی جاتی تھی کہ زکوٰۃ کو خیراتی کاموں کے لئے وقف رکھا جائے۔ زکوٰۃ کے مصارف میں مہاجرین کی دیکھ بھال اور ان کی مدد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہ وہ مسلمان تھے جو روسی علاقے سے بھاگ کر امام صاحب کے علاقے میں آباد ہو جاتے تھے۔

شریعت اور نظام

نقشبندیہ خالدیہ لوگوں کا اولین مقصد نفاذ شریعت تھا۔ چنانچہ امام شامل نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت قوت صرف کی۔ امام صاحب کی نافذ کردہ شریعت مقامی عادات و رسوم کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے نافذ کی گئی تھی اور اسی طرح بدعات کا صفایا بھی مقصود تھا' جو روسیوں کے ساتھ میل ملاپ کی وجہ سے رواج پا گئی تھیں۔ شریعت کا مطلب مسلمانوں کی کل زندگی گزارنے کا طریقہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سگریٹ اور شراب ممنوع تھیں۔ عورتوں کے لباس شریفانہ ہونے ضروری تھے۔ عورتوں کے لئے لازم تھا کہ وہ اپنے لباس کے نیچے لمبی شلوار پہنیں اور اپنے سروں اور چہروں کو ڈھانپیں۔ ناچ اور گانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ بہت کوششیں کی گئیں کہ تمام خونی دشمنیوں کا فیصلہ شریعت کے مطابق کر لیا جائے اور جو رواجی قوانین ان کے متعلق تھے ان کو ختم کر دیا جائے۔ عمومی اور بار بار دہرائے جانے والی ہدایات یہ تھیں کہ مذہبی اور انتظامی امور کے افسران سرعام شریعت کے احکام پر عمل کرائیں۔ چنانچہ سب مردوں کی جمعہ کی نماز میں شمولیت ہو اور سب لوگ روزے رکھیں۔
امام صاحب نے صرف شریعت ہی نافذ نہیں کی بلکہ مساجد میں روایتی سکول قائم کئے گئے' جہاں بچوں اور بڑوں کو اچھے مسلمان بننا سکھایا پڑھایا جاتا تھا۔ امام شامل اپنے ماتحت افسران کو بار بار

تاکید کرتے تھے کہ وہ آبادی کو مذہبی تعلیمات سے روشناس کرائیں' انہیں نماز پڑھنا اور قرآن مجید کو صحیح پڑھنا سکھائیں۔

امام شامل مانتے تھے کہ شریعت میں کچھ خلا ہیں اور کئی مقامات پر تشریح کی ضرورت ہے۔ امام صاحب خود عالم تھے اور ایک صوفی شیخ تھے اور ایسے ان کے ساتھ کئی ان کے ماتحت افسران میں تھے۔ چنانچہ امام شامل شریعت کے مقامات کی تشریح کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ ان معاملات میں اور دیگر انتظامی امور میں ان کی ہدایات اور ان کے بنائے ہوئے قواعد اصل میں قانون سازی ہوتی تھی اور "نظام" کہلاتی تھی۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے ہاں رائج "قانون" کے ہم پلہ تھی۔

۱۸۴۰ء کی دہائی کے اختتام تک امام صاحب کے اس طرح کے قوانین کی صرف ایک نقل لوگوں کے علم میں تھی۔ اس سے روسی تاریخ دان ۱۸۴۷ء کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں کہ یہ "نظام" اس سال میں بنا۔ اس کے بعد نئی دستاویزات شائع ہوئیں جن میں "نظام" کی دوسری نقلیں بھی شائع ہوئیں۔ اس سے قطعی واضح ہے کہ "نظام" ۱۸۴۲ء میں بھی موجود تھا۔

"نظام" کے تحت جو مختلف قواعد تھے وہ مندرجہ ذیل قسموں پر مشتمل تھے ۔

سب سے زیادہ ہدایات انتظامی اور فوجی امور سے متعلق تھیں۔ ۱۸۴۲ء میں ہی نائب حضرات فوجی جرائم پر امام شامل کے جاری کردہ مجموعہ قوانین کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور غالباً یہ نام "نظام" آغاز میں صرف انہی امور کے متعلق تھا۔ ان قواعد میں مختلف افسروں اور کمانڈروں کے اختیارات اور ذمہ داریاں' ان کے آپس کے معاملات پر وضاحت' فوجی ڈسپلن کے امور کی وضاحت' فوجی چالیں اور مختلف سزاؤں کی تفصیل تھی۔ سزائیں جسمانی بھی ہوتی تھیں اور مالی بھی۔ لیکن بہت دفعہ ان قوانین کی خلاف ورزی پر عہدہ میں تنزل ہوتا تھا۔

قوانین کی دوسری قسم عام طور پر غیر مذہبی نوعیت کی تھی۔ جیسے بغیر اجازت جنگل کاٹنے اور روسیوں سے ملنے کی ممانعت' تفلس کے ٹکسال سے بنے ہوئے چھوٹے روسی سکول کو تسلیم کرنے کی ہدایت جن کو پہاڑی لوگوں نے استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

تیسری قسم کے قوانین وہ تھے جو شریعت یا شریعت کی مخصوص تشریح بیان کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ جو مقابل کی فوج ہتھیار ڈال دے اس کو جان کی امان دے دی جائے اور باقیوں کو قتل کر دیا جائے۔ اسی طرح شادی' طلاق' وراثت اور دلہنوں کے حق مہر جیسے قوانین بھی رائج کئے گئے تھے۔

عام طور پر امام شامل ایسی سزاؤں کے حق میں تھے جن سے مجرموں کی حوصلہ شکنی ہو' یا جرمانے یا دونوں۔ چنانچہ عام سزائیں کوڑے' جرمانے' قید اور عوام کے سامنے تذلیل ہوتی تھی۔

اس کی ایک اچھی مثال سگریٹ پینے اور ناچنے کی سزائیں ہیں۔ دونوں قسم کے مجرم قید کئے جانے سے پہلے گدھے پر سوار کرا کے بستی میں گھمائے جاتے تھے۔ ان کے منہ گدھے کی دم کی جانب ہوتے تھے۔ ایک کی ناک میں سموکنگ پائپ ہوتا تھا تو دوسرے کے منہ پر تارکول کا لیپ کیا ہوتا تھا۔

قید کی سزا کا بہت اثر ہوتا تھا اور یہ سزا بہت عام دی جاتی تھی۔ قیدی ایک چھوٹے گڑھے میں رکھا جاتا تھا جس کے اوپر ایک جھونپڑی ہوتی تھی۔ امام صاحب اور ان لوگوں کا' جنہیں اس میں رہنے کا تجربہ ہوا' کہنا یہ تھا کہ یہ قبر کی مانند ہے۔ اس کے علاوہ قیدی کو اپنے اور اپنے نگران چوکیداروں کے کھانے کا خرچ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ایسی قبر میں چند دن گزارنا سخت سے سخت مجرم کی ہمت کے جواب دینے کے لئے کافی تھا۔

آخری اور پانچویں قسم ان قوانین کی تھی جو شریعت تو نہیں تھی لیکن شریعت سے ہی اخذ کئے ہوتے تھے۔ ان کا مقصد اسلامی طرز زندگی کو مستحکم کرنا اور نافذ کرنا تھا۔ چنانچہ گانے کی ممانعت کے علاوہ تمام گانے بجانے کے آلات ممنوع قرار دیئے گئے۔ صرف ایک چھوٹا سا ڈھول مستثنیٰ رکھا گیا۔ اسی طرح شراب کو ممنوع کرنے کے علاوہ امام صاحب نے ایک ایسے علاقے کو انگوروں کی فروخت ممنوع قرار دے دی جنہیں شراب بنانی آتی تھی۔

اس قسم کے قوانین میں کچھ قوانین شادی سے متعلق تھے۔ چیچنیوں کے ہاں دلہن کا مہر بہت زیادہ رائج تھا' چنانچہ بہت زیادہ مرد اور عورتیں غیر شادی شدہ رہ جاتے تھے۔ امام صاحب نے کنواری لڑکی کا زیادہ سے زیادہ مہر ۲۰ چاندی کے روبل اور بیوہ یا طلاق شدہ عورت کا مہر دس چاندی کے روبل مقرر کر دیا۔ امام صاحب اس پر بھی مطمئن نہیں ہوئے اور وہ بار بار اپنے نائبوں کو ہدایت دیتے تھے کہ جو لڑکیاں بالغ ہو جائیں ان کی شادیاں کرا دی جائیں۔ اسی طرح بیوگان کی بھی شادیاں کرائی جائیں۔ امام صاحب کا مقصد اخلاق درست رکھنا تھا نہ کہ آبادی میں روز افزوں اضافہ' جیسا کہ روسیوں کا خیال تھا' اگرچہ آبادی میں اضافہ کی بھی امام صاحب کے نزدیک اہمیت تھی۔

ان تمام اقدامات کا آبادی پر بہت بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ ۴۳ - ۱۸۴۲ء کے دوران ہی روسی نامہ نگاروں نے یہ لکھا کہ پہاڑی لوگوں خصوصاً چیچنیوں کے رویہ اور اخلاق بہت بہتر ہو گئے ہیں۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد :	۴۷
شمارہ :	۱۰
جمادی الاخریٰ	۱۴۱۹ھ
اکتوبر	۱۹۹۸ء
فی شمارہ	۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون	۱۰۰/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ 'کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر، عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' افریقہ' ایشیا' یورپ' جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران' ترکی' اومان' مسقط' عراق، الجزائر' مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت : 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700۔فون : 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون : 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ 'مرکزی انجمن' طابع : رشید احمد چودھری' مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

سانحۂ ارتحال

ماہنامہ "میثاق" کے معزز رکن ادارۂ تحریر اور ہمارے قابل احترام بزرگ، شیخ جمیل الرحمٰن کے صاحبزادے میاں خالد جمیل کا گزشتہ ماہ قضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کچھ عرصہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی خطاؤں سے درگزر فرماتے ہوئے انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے، بالخصوص محترم شیخ جمیل الرحمٰن کو صبر و ہمت کے ساتھ اس صدمے کو جھیلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

ماہ گزشتہ کے دوران دو واقعات پے بہ پے ایسے ہوئے کہ جنہوں نے وقتی طور پر ملک و قوم کو درپیش دیگر تمام مسائل و معاملات کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ پہلا واقعہ جو ہمارے نزدیک بہت سے اعتبارات سے نہایت خوش آئند ہے پندرھویں ترمیم پر مشتمل شریعت بل کے مسودہ کا قومی اسمبلی میں پیش کیا جانا ہے کہ جس کی راہ تکتے تکتے ہماری نگاہیں تھک ہار کر پتھرانے کو تھیں۔ شریعت بل کے منظرعام پر آتے ہی ملکی سیاسی فضا یکدم بدل گئی۔ قبل ازیں ملک کے قریباً تمام دینی و سیاسی عناصر کی جانب سے موجودہ حکومت کے خلاف کسی نہ کسی حوالے سے احتجاجی اور اختلافی آوازیں اٹھ رہی تھیں، شریعت بل کے اعلان کے ساتھ ہی تمام دینی طبقات کی جانب سے تائید و حمایت کی آوازیں نہایت بلند آہنگ کے ساتھ سنائی دینے لگیں۔ بعض دینی سیاسی جماعتوں نے اس بل کے ساتھ جزوی اختلاف ظاہر کرتے ہوئے اس کی مشروط حمایت کا اعلان کیا لیکن اکثر و بیشتر جماعتوں اور رجال دین نے اس کی پرزور تائید کی اور نہ صرف یہ کہ میاں نواز شریف کو بھرپور تعاون کا یقین دلایا بلکہ مجوزہ پندرھویں ترمیم کے مخالفین کیلئے سخت ترین الفاظ کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا۔ اپوزیشن پارٹیز نے البتہ مجوزہ آئینی ترمیم کی شدید مخالفت کی اور یہ موقف اختیار کیا کہ اس ترمیم کے ذریعے میاں نواز شریف درحقیقت نفاذِ شریعت کی آڑ میں اپنے لئے غیر معمولی اختیارات حاصل کرنا چاہتے ہیں ـــــ بہرکیف شریعت بل کے حوالے سے قومی اخبارات میں اس کی حمایت اور مخالفت میں بیانات کی وہ ہاہا کار مچی کہ دیگر تمام ملکی و بین الاقوامی مسائل دب کر رہ گئے۔ بیان بازی کی گرما گرمی ابھی جاری تھی کہ اچانک سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مسئلہ بھی کچھ اس شان سے اٹھا کہ نہ صرف یہ کہ شریعت بل کے حوالے سے بیانات کی گرد اچانک بیٹھ گئی بلکہ یوں محسوس ہونے لگا کہ تمام ملکی و قومی مسائل بھی اسی ایک مسئلہ پر موقوف ہو کر رہ گئے ہیں۔

تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے معاملہ کو سردست التوا میں ڈال دیا گیا ہے (سی ٹی بی ٹی کے ضمن میں تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا موقف پریس ریلیز کی شکل میں زیر نظر شمارہ میں شامل کر دیا گیا ہے)۔ اگرچہ شریعت بل کے ضمن میں حکومتی حلقوں کی جانب سے جس جوش و خروش کا مظاہرہ شروع ہوا تھا وہ اب بہت حد تک سرد مہری میں بدل چکا ہے اور مخالفین کا یہ الزام بھی ایک حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ شریعت بل کا شوشہ دراصل سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے لئے راہ ہموار کرنے کی خاطر کھڑا کیا گیا تھا، تاہم اب توقع ہے کہ شریعت بل کا معاملہ ایک بار پھر

گرم ہو گا' لہٰذا مناسب ہو گا کہ اس مجوزہ پندرھویں آئینی ترمیم کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کے موقف کو وضاحت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ امیر تنظیم نے ۳۱/اگست کو لاہور پریس کلب میں پریس کانفرنس کے موقع پر اس بارے میں حسب ذیل بیان جاری فرمایا تھا :

— دستور پاکستان میں مجوزہ پندرھویں ترمیم میں قرآن اور سنت کو پاکستان کا سپریم لاء قرار دینا نہایت خوش آئند اور لائق صد مبارکباد ہے!

— لیکن اس کی تنفیذ کے لئے ازمنہ وسطیٰ کے سلاطین کا سا انداز اختیار کرنا ہرگز درست نہیں!

— بلکہ اس کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ :

۱) مجوزہ دفعہ ۲۔ ب میں موجودہ دستور کی دفعہ ۲۲۷ کے الفاظ بھی شامل کر دیئے جائیں ' اور اس کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کو خواہ ختم کر دیا جائے خواہ اسے حکومت کے مشاورتی ادارے کی حیثیت سے باقی رکھا جائے۔

۲) وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار پر عائد جملہ تحدیدات ختم کر دی جائیں۔

۳) وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شرعی اپیلیٹ بنچ کے جج صاحبان کی حیثیت جملہ اعتبارات سے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان کے مساوی بنائی جائے ——— اور ان دونوں عدالتوں میں عالم ججوں کی تعداد بڑھائی جائے۔

— معاشرے میں "معروف" کے فروغ اور "منکر" کے استیصال کیلئے پوری قانون سازی دستور میں طے شدہ طریقہ کار یعنی نیشنل اسمبلی اور سینٹ کی سادہ اکثریت کی رائے سے کی جائے۔ اور دستور میں ترمیم کیلئے موجودہ طریق کار برقرار رہنا چاہئے!

— اسلام دین فطرت ہے اور اس کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز ایسی نامعقول نہیں ہے جو دستور میں طے شدہ قانون سازی کی چھلنیوں میں سے نہ گزر سکے!

— ہمارا مقصد (علامہ اقبال اور قائداعظم کے فرمودات کے مطابق) پاکستان کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید اسلامی فلاحی ریاست بنانا ہے۔ اور جدید ریاست کی مشین (STATE-CRAFT) میں مقننہ ' انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین ربط و تعلق اور توازن و تحدید کا معاملہ نہایت اہم بھی ہے ' اور حد درجہ لطیف اور نازک بھی۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا کر دینا خواہ وہ کتنی ہی اچھی نیت سے کیوں نہ ہو ' پورے نظام کو درہم برہم کر سکتا ہے۔

— میاں نواز شریف نے دستور میں پندرھویں (مجوزہ) ترمیم کو ایک ایسے پیکج کی شکل دے کر جس میں کتاب و سنت کو سپریم لاء قرار دینے کے ساتھ ایک ناگزیر جزو کے طور پر دستور کی دفعہ ۲۳۹ میں ترامیم کو بھی شامل کر دیا گیا ہے ' تقریباً وہی صورت پیدا کر دی ہے جو مرحوم ضیاء الحق صاحب

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

سلسلۂ تقاریر ——— منہج انقلابِ نبوی ؐ ——— خطاب ہفتم

اندرونِ عرب تکمیلِ انقلاب کی تمہید '

فراستِ نبوی ؐ کا شاہکار اور فتحِ مبین

یعنی

صلح حدیبیہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن)

حضور ؐ کا خواب

غزوۂ احزاب کے اگلے ہی سال ۰۶ھ میں رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان ؓ عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی اشارہ اور حکم سمجھ کر اعلان عام کرا دیا کہ ہم عمرہ کے لئے جائیں گے' جو ہمارے ساتھ جانا چاہیں وہ چلیں۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُس وقت حضور ﷺ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے' وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ گویا موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اگرچہ عمرہ کی نیت سے جا رہے تھے' لیکن قریش کے نزدیک تو یہ ایک نوع کی چڑھائی تھی۔ وہ عمرہ کے لئے اہل ایمان کو مکہ میں داخل ہونے دیں تو گویا یہ ان کے لئے اپنی رہی سہی ساکھ اور بچا کھچا وقار بھی ہمیشہ کے لئے خود اپنے ہاتھوں خاک میں ملانے کے مترادف تھا۔ یہ تو ان کے لئے ایک نوع کی شکست تھی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے دیتے۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی

کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔ حضور ﷺ کے ساتھ چلنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات میں چودہ سو سے لے کر دو ہزار تک کی تعداد کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم زیادہ تر روایات کے مطابق تعداد چودہ سو تھی۔ ذوالحلیفہ کا مقام مدینہ سے تقریباً سات آٹھ میل باہر ہے۔ یہاں سے عمرہ یا حج کے لئے احرام باندھنے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں حضورؐ اور آپؐ کے تمام ساتھیوں رضی اللہ عنہم نے عمرہ کا احرام باندھا اور ہدی (قربانی) کے جو جانور ساتھ تھے ان کے گلوں میں پٹے ڈال دیئے گئے' جو اِس بات کی علامت تھی کہ یہ جانور قربانی کے ہیں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر آپؐ نے مکّہ کی طرف سفر جاری رکھا' حتیٰ کہ حدیبیہ کے مقام پر جا کر پڑاؤ کیا۔ اسی مقام پر نبی اکرم ﷺ اور مشرکین قریش کے مابین وہ صلح ہوئی جو تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کے نام سے موسوم ہے اور جسے قرآن حکیم نے سورۃ الفتح میں "فتح مبین" قرار دیا ہے : ﴿ اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ﴾

اہل مکّہ کا ردِّ عمل

نبی اکرم ﷺ نے ادھر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ فرمایا' اُدھر جب قریش کے علم میں آ گیا کہ حضورؐ عمرہ کے ارادہ سے تشریف لائے ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو کسی صورت بھی مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ بلکہ انہوں نے اپنے تمام حلیفوں کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سب آ کر قریش کی مدد کریں تاکہ سب مجتمع ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ محمد (ﷺ) کا راستہ روک سکیں۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ بدیل بن ورقہ خزاعی قبیلہ بنو خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے' جو مکّہ اور مدینہ کے مابین آباد تھا۔ اس قبیلہ کا کچھ دوستانہ تعلق قریش کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بدیل بن ورقہ کو اس کام کے لئے مامور کیا کہ وہ مکّہ والوں کی خبر لا کر دیں کہ صورت حال کیا ہے! انہوں نے آ کر خبر دی کہ قریش نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے اور ان کا عزمِ مصمم ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی آپؐ کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضور ﷺ نے ان سے

فرمایا کہ تم مکہ جا کر ہماری طرف سے قریش سے کہو کہ ہمارا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے' ہماری کسی سے لڑنے بھڑنے کی کوئی نیت نہیں ہے' ہم محض عمرہ کے لئے آنا چاہتے ہیں' اور قریش کو سمجھاؤ کہ انہیں پہلے بھی ان جنگوں کے سلسلہ نے بہت نقصان پہنچایا ہے' اب بہتر یہی ہے کہ ہمارے اور ان کے مابین کچھ عرصہ کے لئے صلح ہو جائے اور قریش ہمیں عرب کے دوسرے قبائل سے نمٹنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں تاکہ ہم بقیہ عرب کے ساتھ اپنے معاملات طے کر لیں۔ اسی میں خیر ہے' اسی میں ہماری اور ان کی بہتری ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں پُرامن طور پر عمرہ ادا کرنے دیں اور مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیں۔

بدیل بن ورقہ حضورؐ کے اس پیغام کے ساتھ مکہ پہنچے۔ وہاں ایک بڑی چوپال میں جا کر' جہاں قریش کے بڑے بڑے گھرانوں کے سردار جمع تھے' انہوں نے کہا کہ میں محمد (ﷺ) کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں' اگر آپ حضرات اجازت دیں تو عرض کروں! —— انہوں نے یہ انداز شاید اس لئے اختیار کیا ہو گا کہ پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ قریش مکہ کا رجحان (mood) کیا ہے! چنانچہ ان میں Hawks (یعنی مشتعل مزاج اور جنگجو لوگوں) نے تو فوراً کہا کہ ہم نہ تو کوئی بات سننے کے لئے تیار ہیں اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت اور حاجت ہے۔ مگر Doves (یعنی صلح پسند افراد) نے کہا کہ نہیں! ہمیں بات سننی چاہئے اور بدیل سے کہا سناؤ کہ محمد (ﷺ) کہتے کیا ہیں! انہوں نے حضور ﷺ کا پیغام من و عن سنا دیا۔

عروہ بن مسعود ثقفی کا مدبرانہ رویہ

اُس وقت طائف کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی بھی وہاں موجود تھے۔ مکہ اور طائف کو جڑواں شہروں (Twin Cities) کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے مابین رشتہ داریاں بھی بہت تھیں اور مکہ کے اکثر رؤسا کی جائیدادیں اور باغات بھی طائف میں کثرت سے تھے۔ اس موقع پر ان ثقفی سردار عروہ بن مسعود [1] نے کھڑے ہو کر کہا "اے قریش! کیا میں تمہارے لئے باپ کی مانند نہیں ہوں اور کیا تم

(۱) عروہ بعد میں ایمان لے آئے تھے اور انہیں صحابی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ (مرتب)

میرے بچوں کی مانند نہیں ہو؟" مجلس کے شرکاء نے کہا "ایسا ہی ہے"۔ پھر انہوں نے کہا "کیا تمہیں مجھ پر اعتماد ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا تمہاری بہتری کے لئے کہوں گا؟" لوگوں نے جواب میں کہا کہ "ہاں ہمیں اس پر بھی اعتماد ہے" ـــــ تو انہوں نے کہا "مجھے اجازت دو کہ میں محمد (ﷺ) کے پاس جاؤں اور ان سے بات چیت کروں"۔ لوگوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔

عروہ بن مسعود کی نبی اکرم ﷺ سے گفت و شنید

حدیبیہ میں جہاں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا پڑاؤ تھا' عروہ وہاں آئے۔ وہ بہت ہی زیرک' دانا اور مدبر انسان تھے' آخر ثقیف کے سردار تھے' جو قریش کے بعد سب سے معزز قبیلہ شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر لشکر کے ماحول اور نظم و ضبط کا ایک اندازہ قائم کرنے کے لئے بھرپور جائزہ لیا۔ پھر وہ نبی اکرم ﷺ کے خیمہ میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلے تو انہوں نے خوفزدہ کرنے کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا :

"محمد! (ﷺ) ایک طرف قریش اور ان کے حلیف ہیں' ان کی پوری قوت مجتمع ہے ـــــ اور ان کا فیصلہ ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے' وہ اس پر تلے ہوئے ہیں۔ اب تم دیکھ لو کہ اگر جنگ ہوئی اور بالفرض تم نے مکہ والوں کو ختم کر دیا تو کیا یہ کوئی اچھی بات ہو گی؟ اس سے پہلے کیا کسی شریف انسان کی ایسی مثال موجود ہے کہ اس نے اس طرح اپنے ہی قبیلہ کو ختم کر دیا ہو؟ اور اگر معاملہ برعکس ہوا تو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ جو جمعیت ہے وہ تو مختلف قبائل سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے (گویا کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا والا معاملہ ہے)۔ شکست اور ہزیمت کی صورت میں یہ سب تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے' ان میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ کھڑا نہیں رہے گا۔"

عروہ بن مسعود کے پیش نظر چونکہ قبائلی نظام تھا اور وہ جانتے تھے کہ قبائل تو عموماً قبائلی حمیت کے تحت لڑتے تھے' چنانچہ انہوں نے یہ بات اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے۔ ان کو عروہ بن

مسعود کی اس بات پر طیش آگیا۔ ان ؓ کی زبان سے عروہ کے لئے ایک عریاں گالی نکل گئی اور انہوں ؓ نے کہا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم ہم ان کو چھوڑنے والے نہیں ہیں"۔ گالی سن کر عروہ نے پوچھا' یہ کون ہیں۔ بتایا گیا کہ یہ ابوبکر ؓ ہیں تو عروہ نے کہا "ان کا مجھ پر ایک احسان ہے۔ ورنہ آج میں انہیں اس گالی کا جواب دیتا۔"

اس کے بعد عروہ نے نبی اکرم ﷺ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ گستاخانہ انداز اختیار کیا کہ بار بار حضور ؐ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔ وہ شاید یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ حضور ؐ کے بارے میں آپ ؐ کے ساتھیوں کا طرز عمل کیا ہے! ـــــــ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بحیثیت محافظ وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے عروہ کی بار بار کی یہ حرکت دیکھ کر اپنی تلوار کا دستہ ان کے ہاتھ پر مارا اور کہا کہ آئندہ یہ ہاتھ حضور ؐ کی ریش مبارک تک بڑھا تو قطع ہو جائے گا' واپس نہیں جا سکے گا ـــــــ بہرحال عروہ یہ گفتگو کرکے اور ایک اندازہ قائم کرکے واپس مکہ چلے گئے۔

عروہ کا قریش کے سامنے اپنے تأثرات کا اظہار

مکہ پہنچ کر عروہ بن مسعود نے قریش کے سرداروں کے سامنے جو رپورٹ پیش کی اس سے ان کے اس تاثر کا اندازہ ہوتا ہے جو اہل ایمان کے لشکر کے نظم و ضبط' ان کے جوش و خروش اور ان کی فدائیانہ کیفیات کو دیکھ کر ان کے دل و دماغ پر مترتب ہوا تھا۔ انہوں نے کہا:

> "اے قریش کے لوگو! دیکھو' میں قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں گیا ہوں' میں نے ان کے دربار دیکھے ہیں' ان کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھا ہے' لیکن خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو اس کی اپنی قوم میں ایسا محترم نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (ﷺ) کو اپنے اصحاب میں دیکھا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جو لوگ محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں ان کو جتنی محبت محمد (ﷺ) سے ہے اور جتنی عقیدت و توقیر اور عزت محمد (ﷺ) کی ان کے دلوں میں ہے' اور اپنے دین کی جو حمیت اور فدایانہ جذبہ ان کے دلوں میں ہے' وہ مجھے پوری زندگی میں کہیں بھی دیکھنے میں نہیں

آیا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ جب محمد (ﷺ) وضو کرتے ہیں تو لوگ انؐ کے وضو کا پانی تبرک کے طور پر لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اگر وہ تھوکتے ہیں یا ان کے دہن سے بلغم نکلتا ہے تو لوگ اسے جھپٹ لیتے ہیں اور اس کو اپنے ہاتھوں اور چہروں پر مل لیتے ہیں۔ یہ محبت میں نے کسی قوم میں اپنے سردار اور قائد حتیٰ کہ کسی بادشاہ تک کے لئے نہیں دیکھی۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم ان سے مت بھڑو' ان سے جنگ کا ارادہ ترک کر دو اور مصالحت کر لو۔ "

قریش کے جوشیلے افراد کا ردعمل

عروہ کے اس اظہارِ خیال پر وہاں بڑا شور و غوغا ہوا کہ ہم مصالحت کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہم محمد (ﷺ) کو کسی صورت بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ محمد (ﷺ) کو واپس جانا پڑے گا ورنہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ انہوں نے یہی پیغام اپنے دو دو سرے اشخاص کے ذریعے حضور ﷺ کے پاس بھیجا' لیکن کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی۔ فریقین میں سے کوئی بھی اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوا اور تناؤ (Tension) کی کیفیت بر قرار رہی۔

مصالحت کے لئے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے مساعی

نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر مقیم ہونے کے بعد بدیل بن ورقہ خزاعی کے ذریعے پہلا پیغام بھیجا تھا' جس کے نتیجہ میں پہلے عروہ بن مسعود حضورؐ کی خدمت میں گفتگو کے لئے آئے تھے اور اس کے بعد قریش کے چند مشتعل مزاج (Hawks) لوگ آپؐ کے پاس آئے' لیکن ان کا رویہ مصالحانہ نہیں تھا' بلکہ جارحانہ اور رعب ڈالنے والا تھا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے خود سلسلہ جنبانی شروع کرنے اور اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو مکہ والوں کے پاس افہام و تفہیم کے لئے بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرا خیال ہے آپ مکہ جائیں اور قریش سے مصالحت کی کوشش کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضورؐ اب مکہ میں میرا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں ہے جس کی امان و حمایت میں' میں مکہ میں داخل ہو سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے

دیکھتے ہی بغیر بات چیت کے قتل کر دیں۔ لہٰذا میں تجویز کرتا ہوں کہ میری بجائے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بھیجئے۔ ان کا قبیلہ بنو امیہ بہت مضبوط ہے۔ ان کے بہت سے قریبی رشتہ دار بھی وہاں موجود ہیں جن میں سے کسی کی بھی امان و حمایت میں وہ مکہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مکہ جانے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ وہ تعمیل حکم میں مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کا مکہ پہنچنا' اور آپؓ کی شہادت کی افواہ کا پھیلنا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس سفارت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب آں جنابؓ کی بے شمار فضیلتوں میں سے ایک فضیلت ہے۔ بہرحال حضرت عثمانؓ ابھی مکہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ باہر ہی ان کو اپنے چچازاد بھائی ابان بن سعید بن عاص مل گئے۔ انہوں نے آنجنابؓ کو اپنی پناہ اور حمایت میں لے لیا اور اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قریش کے پاس پہنچ گئے۔ گفت و شنید کا سلسلہ دو تین روز تک چلتا رہا اگرچہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ قریش کسی صورت مصالحت پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تاہم انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب جب تم مکہ میں آ ہی گئے ہو تو ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم کعبہ کا طواف کر لو' لیکن آپؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کی بغیر طواف کی یہ پیشکش قبول نہیں فرمائی۔ (۱)

گفت و شنید میں جو دیر لگی۔ تو اس طرح گویا وہ کیفیت پیدا ہو گئی جسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں "نظر بندی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دریں حالات یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔

---

(۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ جانے کے بعد بعض اصحاب رسولؐ نے کہا کہ "عثمان رضی اللہ عنہ کو خانہ کعبہ کا طواف مبارک ہو"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جب یہ قول پہنچا تو آپؐ نے فرمایا "مجھے یقین ہے کہ اگر عثمان رضی اللہ عنہ عرصۂ دراز تک بھی مکہ میں رہ جائیں تب بھی وہ اس وقت تک طواف نہیں کریں گے جب تک میں طواف نہ کر لوں"۔ (مرتب)

بیعت رضوان

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جب نبی اکرم ﷺ کو پہنچی تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے وہ بیعت لی جو کتبِ سِیَر میں "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور و معروف ہے اور جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۸ میں ہے :

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَافِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ ﴾

"(اے نبیؐ) بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے اور اسے ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ لہٰذا اس نے ان پر قلبی اطمینان و سکون نازل فرمایا اور انعام میں ان کو فتحِ قریب بخشی۔"

بیعت علی الموت

حدیبیہ کے مقام پر کوئی چھوٹا سا درخت تھا جس کے سایہ میں نبی اکرم ﷺ تشریف فرما ہو گئے اور وہاں آپؐ نے فرمایا کہ اب ہر مسلمان مجھ سے بیعت کر کے ایک عہد کرے ـــــ اس بیعت کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بیعت علی الموت تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ " ہر مسلمان میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں لیکن عثمانؓ کے خون کا بدلہ لئے بغیر ہرگز یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ دوسری روایت ہے کہ اس بات پر بیعت لی گئی کہ : "اَنْ لَاَنَفِرَّ" یعنی ہم یہاں سے پیٹھ نہیں موڑیں گے اور راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔ بہرحال اس بیعت کا مقصد یہ سامنے آتا ہے کہ کسی حالت میں پیٹھ نہیں دکھانی اور میدان جنگ سے جان بچا کر نہیں جانا۔ اگرچہ جان بچانے کی چند صورتیں وہ ہیں جن کی سورۃ الانفال میں اجازت دی گئی ہے اور انہیں جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ پینترا بدلنا مقصود ہو یا کسی جنگی حکمت عملی (Strategy) کا تقاضا ہو کہ پیچھے ہٹ جایا جائے۔ مگر یہاں اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ کسی صورت میں بھی یہاں سے نہیں ہٹنا۔ اب یہاں سے کسی جنگی حکمت کے تحت پسپائی (Strategic Retreat) کا امکان بھی باقی نہیں رہا۔ رہا جان بچا کر فرار ہونے کا

معاملہ تو یہ عمل گناہ کبیرہ میں شامل ہے ہی۔ گویا یہ بیعت علی الموت تھی کہ ہر شخص میدان میں ڈٹا رہے گا' صرف موت ہی اسے اس جنگ سے رستگاری دے سکے گی۔

حضرت عثمانؓ کی خصوصی فضیلت

ترجمان وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے شمار فضائل و مناقب مروی ہیں۔ ان کے علاوہ سیرت عثمانیؓ کے متعدد واقعات آنجنابؓ کی فضیلتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک خصوصی فضیلت یہ ہے کہ دو مواقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی کے باوجود حضور ﷺ نے گویا انؓ کو موجود قرار دیا۔ پہلا موقع غزوۂ بدر کا ہے۔ آنجنابؓ کی اہلیہ اور نبی اکرم ﷺ کی لختِ جگر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کافی علیل تھیں' اس لئے ان کی تیمارداری کے لئے حضور ﷺ نے آنجنابؓ کو مدینہ میں چھوڑ دیا تھا اور انہیں اس لشکر میں شامل نہیں فرمایا تھا جو اولاً تو ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے کے لئے نکلا تھا' لیکن بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بدر کے مال غنیمت میں سے وہی حصہ مرحمت فرمایا جو دوسرے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کو مرحمت کیا گیا تھا۔ گویا حضور ﷺ نے آپؓ کو مجازی طور پر اس غزوہ میں شریک قرار دیا جبکہ حقیقی طور پر وہ اس میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح کا دوسرا موقع حدیبیہ کے مقام پر پیش آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چونکہ وہاں موجود نہیں تھے' لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے خود ہی اپنا ایک دست مبارک دوسرے دست مبارک کے اوپر رکھ کر ارشاد فرمایا کہ "یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے اور یہ عثمانؓ کی طرف سے بیعت ہے"۔ یہ درحقیقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بہت بلند مقام ہے اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو اس روز انؓ کو حاصل ہوئی۔

پھر یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے خون عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لئے حدیبیہ کے مقام پر موجود تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی یہ بھی انتہائی اعلیٰ مرتبہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ یہ وہ بیعت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس طرح بیعت رضوان کا یہ عظیم الشان واقعہ اللہ تعالیٰ

نے اپنے کلام قرآن مجید میں ہمیشہ ہمیش کے لئے محفوظ فرما دیا ہے۔

اس بیعت کی ضرورت کیا تھی؟

انتہائی غور طلب بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ بیعت لینے کی ضرورت کیا تھی! حضور ﷺ کے ساتھ جو چودہ یا پندرہ سو افراد آئے تھے ان میں سے کوئی بھی اس بیعت میں پیچھے نہیں رہا۔ صرف ایک شخص جد بن قیس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے اونٹ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس نے بیعت نہیں کی۔ اس کے سوا بقیہ تمام لوگوں نے بیعت کی۔ یہ شخص در حقیقت منافق تھا اور اس کا ذکر سفر تبوک کے ضمن میں بھی آتا ہے کہ اس موقع پر اس کا نفاق بالکل کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ حضور ﷺ کے ساتھ جو اشخاص آئے تھے ان میں جد بن قیس جیسا کوئی دوسرا شخص شاید ہی ہو۔ اگر حضور ﷺ جنگ کا فیصلہ فرما دیتے تو یقیناً ان مومنین صادقین میں سے کوئی شخص بھی کسی صورت میں پیٹھ دکھانے والا نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ بیعت لے رہے ہیں تو اس میں کیا حکمت تھی؟ در حقیقت یہ اس لئے لی گئی کہ بیعت کا یہ اصول اور یہ عمل آنے والوں کی رہنمائی کے لئے سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بحیثیت سنت ہمیشہ ہمیش کے لئے ثبت ہو جائے۔ بیعت رضوان اس بات کی روشن دلیل ہے کہ کسی موقع پر یا کسی اعلیٰ مقصد کے لئے ' جیسے ہجرت و جہاد ' بیعت لینا سنت ثابتہ ہے۔ ورنہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو سکتا تھا کہ نبی اکرم ﷺ بیعت لئے بغیر خون عثمانؓ کے قصاص کے لئے جنگ کا حکم دیتے تو اس سے اعراض کرتا۔ پھر یہی نہیں بلکہ مختلف مواقع پر انہی مخلص و صادق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف امور کے لئے حضور ﷺ کا بیعت لینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ انہی احادیث سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ ' اقامت دین ' اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ اور تکبیر رب یعنی انقلاب محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی جدوجہد کے لئے جو ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئے وہ بیعت ہی کے اصول پر قائم ہو۔ یہی سنت کا تقاضا ہے۔

قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادگی

جب قریش نے ایک طرف یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کسی دھمکی سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں' دوسری طرف ان کے حلیم الطبع اشخاص نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور قریش کے سامنے خون ریزی کے ہولناک نتائج رکھے تو بالآخر ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اگر کوئی مصالحت ہو جائے تو بہتر ہو گا۔ لہٰذا آخر کار انہوں نے مصالحانہ گفتگو کے لئے سہیل بن عمرو کو حضور ﷺ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا' جن کا شمار ان کے بڑے متحمل اور مدبر سرداروں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو خبر ملی کہ اس مرتبہ سہیل بن عمرو[1] گفتگو کے لئے آئے ہیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔

صلح نامہ کی تحریر۔ شرائط اور چند اہم واقعات

قریش کو بیعت رضوان کی خبر پہنچ چکی تھی جس پر ان میں کافی سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اسی لئے انہوں نے سہیل بن عمرو کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجا تاکہ وہ ایسی شرائط پر مصالحت کرلیں جو قریش کے لئے آبرومندانہ ہوں' سبکی کا باعث نہ ہوں۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مصالحت کا عندیہ ظاہر کیا۔ گفت و شنید کے بعد جب طے ہوا کہ صلح نامہ تحریر کرلیا جائے تو نبی اکرم ﷺ نے صلح نامہ تحریر (Dictate) کرانا شروع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاتب کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سہیل بن عمرو نے فوراً ٹوک دیا کہ نہیں!

---

(۱) فتح مکہ کے بعد یہ سہیل بن عمرو بھی ایمان لے آئے اور حضور ﷺ کے صحابی ہونے کے شرف سے مشرف ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ارتداد کا جو فتنہ اٹھا' اس کے اثرات مکہ تک بھی پہنچے لیکن یہ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نہ صرف خود ثابت قدم اور اسلام پر قائم رہے بلکہ چونکہ نہایت شعلہ بیان خطیب بھی تھے' لہٰذا انہوں نے اپنے مؤثر و مدلل خطبات کے ذریعہ مکہ والوں کو اس فتنہ ارتداد سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہم "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے واقف نہیں ہیں' ہم تو ہمیشہ سے "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" استعمال کرتے رہے ہیں لہٰذا یہی الفاظ لکھے جائیں گے' ہم آپ کے الفاظ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ـــــ حضور ﷺ نے فرمایا "ٹھیک ہے' لکھ دو باسمک اللّٰھم کوئی فرق واقع نہیں ہوتا"۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لکھو کہ "یہ وہ صلح ہے جو محمد رسول اللہ (ﷺ) اور قریش کے مابین منعقد ہوئی۔" سہیل بن عمرو نے فوراً دوسرا اعتراض جڑ دیا کہ "محمد رسول اللہ" کے الفاظ نہیں لکھے جاسکتے۔ اس لئے کہ اسی بناء پر تو ہمارا سارا تنازعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ صلح نامہ کے نیچے فریقین کے دستخط ہوں گے تو یہ پوری عبارت گویا دونوں کے مابین متفق علیہ ہوگی' اور اس میں اگر آپؐ کا نام رسول اللہ لکھا ہوا ہے تو گویا ہم نے آپ کو رسول اللہ مان لیا۔ پھر تو ہمارے اور آپ کے مابین کوئی جھگڑا اور کوئی تنازعہ ہی باقی نہ رہا۔ پھر صلح کا کیا سوال! پس آپؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ نہیں لکھا جائے گا"۔ سہیل بن عمرو کا یہ اعتراض قانونی اعتبار سے درست (Valid) تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے وہ کتنے ذہین اور مدبر شخص تھے ـــــ نبی اکرم ﷺ نے اس اعتراض پر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم مانو یا نہ مانو' میں اللہ کا رسول ہوں۔

حضرت علیؓ کا طرزِ عمل

نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "علی! محمد رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھ دو" (ﷺ)۔ حضرت علیؓ نے جواب میں عرض کیا کہ "حضورؐ! یہ کام میں نہیں کر سکتا"۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کی حکم عدولی کر رہے ہیں کہ حضورؐ فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نہیں مٹا سکتا۔ مگر ایسا ہرگز نہیں' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو حضورؐ کا نام لکھنے کے بعد اسے مٹانا سوءِ ادب خیال کرتے تھے۔ بہرحال حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کہاں ہیں وہ الفاظ؟ کیونکہ آپ ﷺ تو اُمی تھے' دنیوی طور پر لکھنا پڑھنا آپؐ نے نہیں سیکھا تھا۔ حضرت علیؓ نے وہ مقام بتایا اور حضور ﷺ نے اپنے دست

مبارک سے وہ الفاظ مٹا دیئے۔ پھر وہاں لکھا گیا کہ یہ معاہدہ محمدؐ بن عبد اللہ بن عبد المطلب اور قریش کے مابین طے پایا۔

معاہدہ کی شرائط

اس معاہدہ کی بعض شرائط نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے بظاہر نہایت سبکی کا باعث اور توہین آمیز تھیں۔ سہیل نے سب سے پہلے تو یہ شرط پیش کی کہ ہم یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ اس سال مسلمان عمرہ کریں۔ اس سال عمرہ کرنے کی اجازت دینے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ پورے عالم عرب میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ محمد (ﷺ) کی بات پوری ہوگئی اور قریش کو جھکنا پڑا اور ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لہٰذا اس سال تو آپؐ کو یہیں سے واپس جانا ہوگا۔ البتہ اگلے سال آپؐ تشریف لے آیئے' ہم تین دن کے لئے مکہ کو خالی کر دیں گے' ہم پہاڑوں پر چلے جائیں گے اور مکہ آپؐ کی disposal پر ہوگا۔ آپؐ وہاں رہئے اور عمرہ کیجئے' مکہ والے وہاں رہیں گے ہی نہیں تاکہ کوئی شخص جذبات سے مشتعل ہو کر کوئی اقدام نہ کر بیٹھے۔ اس تصادم کے امکان کو بھی روک دیا جائے گا۔ البتہ آپؐ کے ساتھ تلواریں اگر ہوں گی تو وہ نیام میں ہوں گی اور نیام بھی تھیلوں میں بند ہوں گے۔ تھیلے احرام کی حالت ہی میں ہاتھ میں رہیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ تلواریں نیام میں ساتھ لٹکی ہوئی ہوں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دس سال تک ہمارے اور آپؐ کے مابین بالکل امن رہے گا' کوئی جنگ نہیں ہوگی۔ تیسری شرط یہ طے ہوئی کہ عرب کے دوسرے قبائل میں سے جو چاہے ہمارا حلیف بن جائے اور جو چاہے آپؐ کا حلیف بن جائے۔ فریقین کے حلیف بھی امن و امان سے رہیں گے اور ان کے مابین بھی جنگ و جدال بالکل نہیں ہوگی۔ بنو خزاعہ کے سردار بدیل بن ورقہ نے وہیں پر اعلان کیا کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرا قبیلہ بنو بکر' جس کو بنو خزاعہ سے پرانی دشمنی تھی' اس نے فوراً دوسرا رُخ اختیار کر لیا کہ ہم اس معاہدہ کی رو سے قریش کے حلیف ہیں۔ معاہدہ کی چوتھی شرط مسلمانوں کے لئے بظاہر بہت توہین آمیز اور دل آزاری کا باعث تھی۔ وہ یہ کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اپنے والی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا تو

مسلمانوں کو اسے واپس لوٹانا ہو گا' لیکن مدینہ سے اگر کوئی شخص مکہ آ جائے گا تو اسے ہم واپس نہیں کریں گے۔ یہ بڑی غیر منصفانہ (Un-Equal) شرط تھی جس پر سہیل بن عمرو کا اصرار تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر بڑے جز بز ہوئے اور ان کے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ ہم یہ صورت کیوں گوارا کر رہے ہیں؟ ہم دب کر اور گر کر کیوں صلح کریں؟ ہم اس وقت چودہ سو کی تعداد میں موجود ہیں اور ہمیں تو شہادت کی موت مطلوب ہے' ہم بیعت علی الموت کر چکے ہیں اور ہم سب کے سب کلمہ حق کے لئے اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے تیار ہی نہیں بے تاب ہیں۔ لہٰذا ہم ان شرائط پر صلح کیوں کریں جو سہیل منوانا چاہتے ہیں؟ یہ بظاہر احوال گر کر اور دب کر صلح کرنے کے مترادف معاملہ تھا ـــــ صحابہ کرامؓ کے یہ جذبات تھے لیکن سب کے سب مہربلب تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب

یہ وہ لمحات ہیں جن کے متعلق ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبات کا کیا عالم ہو گا! یہ وہ وقت ہے کہ دینی حمیت و غیرت کے باعث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب اتنا بڑھا کہ ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مکالمہ کیا جو سیرت کی تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو قدرت کی طرف سے جلالی طبیعت ودیعت ہوئی تھی۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد آپؓ کی اس کیفیت میں کافی اعتدال آ گیا تھا لیکن کبھی کبھار دین کی حمیت کے باعث اس جلالی طبیعت کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ دراصل یہی سبب تھا کہ انہوںؓ نے ذرا تیکھے انداز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع پر گفتگو کی' جس کا انؓ کو ساری عمر تاسف رہا ہے اور انہوںؓ نے اپنے اس انداز گفتگو کے کفارہ کے طور پر نہ معلوم کتنی نفلی عبادات کی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "حضورؐ کیا آپؐ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپؐ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے جواب میں ارشاد فرمایا "یقیناً میں حق پر ہوں اور میں اللہ کا نبی ہوں۔" پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "حضورؐ! پھر ہم اس طرح کا معاملہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟؟؟"

حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے ہوئے فرمایا "اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے"۔ نبی اکرم ﷺ کا تبسم کے ساتھ جوابات کا انداز بتا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس انداز تخاطب سے آپؐ قطعاً ناراض نہیں ہوئے تھے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جواب

ظاہر بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جوابات سن کر حضرت عمرؓ کو حضورؐ سے تو مزید پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی، لیکن طبیعت میں جو ایک تلاطم، ایک طوفان اور ایک ہیجانی کیفیت تھی وہ برقرار رہی۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے جو اُس وقت اس خیمہ میں موجود نہیں تھے۔ انؓ سے بھی اسی نوع کا مکالمہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا "کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اور کیا محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟"۔ انہوں نے فرمایا کہ "کیوں نہیں، یقیناً ہم حق پر ہیں اور حضورؐ اللہ کے رسول ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے پھر وہی بات کہی جو حضورؐ سے عرض کر چکے تھے کہ "پھر یہ کیا ہو رہا ہے اور ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں؟" اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں بعینہٖ وہی الفاظ کہے کہ "بے شک ہم حق پر ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ وہی کرتے ہیں جس کا آپؐ کو حکم ہوتا ہے"۔ یہ ہے مقام صدیقیت ـــــ اور یہ کہ نبی اور صدیق کے مزاج میں بہت قرب ہوتا ہے۔

ایک مخصوص گروہ کی اتہام طرازی اور اس کا ازالہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اس رویہ پر جو بظاہر گستاخانہ معلوم ہوتا ہے ساری عمر پشیمانی اور تاسف رہا اور آپؓ کفارہ کے طور پر ساری عمر متعدد نفلی عبادات کا اہتمام کرتے رہے، لیکن ایک خاص گروہ اس واقعہ کو لے اڑا ہے اور اس کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متہم کرتا اور سبّ و شتم کا نشانہ بناتا چلا آ رہا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) بڑے گستاخ تھے۔ اس خاص گروہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخیاں کرنے اور انہیں متہم کرنے کے لئے اس واقعہ کو بھی نمک مرچ لگا کر خوب اچھالا جاتا ہے۔ مگر وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر اس معنی و مفہوم میں یہ بات لی جائے گی تو گویا بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات تک

محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی زد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی بھی آجائے گی کہ انہوں نے بھی ایک موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سرتابی کی۔ حالانکہ دنیا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ "الامر فوق الادب" یعنی حکم ادب سے بالاتر ہے۔ جب حکم دیا جارہا ہو تو ادب و تعظیم کا معاملہ پیچھے رہ جائے گا' حکم پر بہرصورت عمل کیا جائے گا ـــــ لیکن معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیت میں کوئی خلل تھا اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نیت میں کوئی فتور۔ ان دونوں جلیل القدر اصحابِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے دلوں میں نہ بغاوت و سرتابی کے جراثیم تھے اور نہ ہی گستاخی کا کوئی ارادہ تھا' بلکہ درحقیقت یہ حمیت حق تھی جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر کہ "رسول اللہ" کا لفظ صلح نامہ سے مٹادو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو گئے کہ "میں تو یہ کام کرنے والا نہیں ہوں"۔ اور اسی حمیت حق کے سبب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا انداز گفتگو اختیار کیا۔ ان دونوں حضرات کرام رضی اللہ عنہما کے اس طرز عمل پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کوئی سرزنش فرمائی نہ ہی اظہارِ ناراضگی و ناپسندیدگی فرمایا' بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے بتاؤ کہ "رسول اللہ" کے الفاظ کہاں مرقوم ہیں' اور پھر اپنے دست مبارک سے اسے مٹا دیا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تیکھے انداز میں کئے گئے تمام سوالات کے جوابات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم کے ساتھ ارشاد فرمائے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی علامت ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات گرامیؓ کے جذبات کی صحیح نوعیت سے بخوبی آگاہ تھے۔

ابو جندلؓ کی آمد

اِدھر جذبات کا یہ عالم تھا اُدھر ان سلگتے ہوئے جذبات پر اس واقعہ نے تیل کا کام کیا کہ سہیل بن عمرو کے صاحبزادے ابو جندل رضی اللہ عنہ مکہ میں ایمان لا چکے تھے اور سہیل نے ان کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ سہیل اور قریش کے دوسرے لوگ انؓ کو بہت مارا کرتے تھے تاکہ وہ اس تشدد سے گھبرا کر اپنے آبائی بت پرستی کے دین کی طرف لوٹ آئیں۔ انہیںؓ جب پتہ چلا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام

پر مقیم ہیں جو مکہ سے چودہ پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے تو انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بیڑیاں تڑوائیں اور چھپتے چھپاتے حدیبیہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ابھی اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ اس موقع پر ابو جندل رضی اللہ عنہ وہاں اس حالت میں پہنچے کہ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں، جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ وہ آئے اور نبی اکرم ﷺ کے قدموں میں لیٹ گئے۔ سہیل بن عمرو نے فوراً کہا یہ ہے پہلا معاملہ، صلح کی جو شرائط ہمارے مابین طے ہو چکی ہیں ان کے مطابق آپؐ ابو جندلؓ کو میرے حوالے کر دیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "شرائط ضرور طے ہو گئی ہیں لیکن تم ان کو تو ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت دے دو"۔ سہیل نے کہا "قطعاً نہیں، اسے آپ کو بہر صورت واپس کرنا ہو گا"۔ حضورؐ نے پھر فرمایا "سہیل تم اس کو یہیں رہنے دو۔" اس نے فوراً کہا کہ "پھر ہمیں کوئی صلح نہیں چاہئے، صلح کی شرائط کالعدم سمجھئے، اب تلوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی"۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اچھا تم نہیں مانتے تو ٹھیک ہے، صلح کی شرائط باقی رہیں گی، جنگ سے صلح بہتر ہے"۔ ادھر ابو جندلؓ چیخ رہے ہیں اور اب انہوں نے خیمہ میں موجود مسلمانوں سے استغاثہ کیا کہ "مسلمانو! مجھے کن بھیڑیوں کے حوالہ کر رہے ہو؟" ــــــ اندازہ کیجئے اُس وقت جذبات کا کیا عالم ہو گا! سب کے دل مجروح تھے لیکن جوش سے لبریز تھے۔ سینوں میں دل بے تاب تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذرا سا بھی اشارہ ہو جائے تو تلواریں نیام سے نکل آئیں ــــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اطاعت شعاری کا بڑا کڑا، بڑا شدید اور بڑا نازک امتحان تھا جس سے اللہ تعالیٰ ان کو گزار رہا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کی حضرت ابو جندلؓ کو نصیحت

سہیل بن عمرو کی ضد اور اصرار کو دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ ابو جندلؓ کو سہیل کے حوالہ کر دیا جائے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: ابو جندل صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور دوسروں کے لئے جو انہی حالات میں مظلومانہ طور پر مقید ہیں کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا، ہم صلح کی شرائط طے کر چکے ہیں اور ان کی رو سے ہم پابند

ہیں کہ تمہیں واپس کر دیں۔ چنانچہ سہیل اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

صحابہ کرامؓ کا غیر معمولی طرزِ عمل

اب جبکہ صلح ہو گئی' اس پر دستخط ثبت ہو گئے اور سہیل واپس چلے گئے تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ "اب اٹھو' قربانی کے لئے جو جانور ساتھ لائے ہو ان کی یہیں پر قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو۔" اُس وقت مسلمانوں کے جذبات کا جو عالم تھا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ـــــ ہوا یہ کہ ان میں سے ایک شخص بھی نہیں اٹھا۔ جذبات کی یہ کیفیت تھی کہ گویا ان کے اعصاب و اعضاء بالکل شل ہو گئے اور ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی' ان کے دل اس درجہ بجھے ہوئے تھے۔ ان کا جوش و خروش تو یہ تھا کہ وہ جان نثاری اور سرفروشی دکھائیں اور اللہ کے دین کی راہ میں گردنیں کٹوا کر سرخرو ہو جائیں' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں وارد ہے :

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ ﴾ (الاحزاب : ۲۳)

"اہل ایمان میں کتنے جواں مرد ہیں کہ جنہوں نے جو عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ پس ان میں وہ بھی ہیں جو اپنا ہدیہ جان پیش کر چکے (اپنی نذر اللہ کے حضور میں گزار چکے) اور کتنے ہیں جو منتظر ہیں (کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی جانیں دے کر سرخرو ہو جائیں) اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔

معلوم ہوا کہ اُس وقت حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے جو جذباتی کیفیت صادر ہوئی وہ صرف ان دونوں کی نہیں تھی بلکہ تمام مسلمانوں کی تھی۔ سب ہی دل شکستہ تھے۔ یہ منظر ناقابل تصور ہے کہ نبی اکرم ﷺ حکم دے رہے ہیں کہ "اٹھو! قربانیاں دے کر احرام کھول دو" ـــــ اور کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھ رہا۔ آپؐ نے دوسری مرتبہ حکم دیا کہ "اٹھو' یہیں قربانیاں کرو اور احرام کھول دو" مگر پھر بھی کوئی نہیں اُٹھا۔ صحابہؓ کے ذہن میں تو یہ تھا کہ ہم مکہ جائیں گے' کعبہ کا طواف اور سعی کریں گے اور پھر قربان گاہ میں قربانیاں کریں گے ـــــ جو جانور ساتھ ہیں وہ تو ہدی ہے کعبہ کی ـــــ اب یہاں

پر ہم قربانیاں کیسے کر دیں۔ حضور ﷺ نے تیسری مرتبہ پھر فرمایا "اٹھو' قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو" مگر کسی نے جنبش نہیں کی۔ یہ اس لئے ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اس صورت حال کے لئے ذہناً تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی جانیں دینے اور گردنیں کٹوانے کے لئے تو تیار تھے' لیکن جن شرائط پر صلح ہوئی تھی اسے ان کے اعصاب اور مزاج قبول نہیں کر رہے تھے۔

اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہؓ کا مدبرانہ مشورہ

روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کچھ ملول ہو کر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ سفر میں ایک زوجہ محترمہ کو ساتھ رکھتے تھے۔ سفر کے موقع پر قرعہ اندازی ہوتی تھی کہ اس مرتبہ کون ساتھ جائے گا۔ اِس سفر میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے ساتھ تھیں۔ حضورؐ خیمہ میں تشریف لے گئے اور حضرت ام سلمہؓ سے ذکر کیا کہ میں نے مسلمانوں سے تین مرتبہ کہا کہ "اٹھو' قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو" لیکن کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھا ـــــ اس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ زبان سے کچھ نہ فرمائیے' آپ خیمہ سے باہر تشریف لے جایئے' قربانی دیجئے اور حلق کرا کے احرام کھول دیجئے ـــــ نبی اکرم ﷺ نے اس مشورہ پر عمل کیا' باہر تشریف لائے' قربانی دی' سر کے بال منڈوائے اور بعدہ احرام کھول دیا۔

صحابہ کرامؓ کا ردِّ عمل اور اس کی تاویل

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ سب کچھ دیکھ لیا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے' جو حضرات ہدی کے جانور ساتھ لائے تھے انہوں نے قربانیاں دیں اور تمام صحابہ کرامؓ نے حلق یا قصر کرایا اور احرام کھول دیئے۔

اس صورت حال کی تاویل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ابھی تک ایک حالت منتظرہ طاری تھی۔ وہ اس خیال میں تھے کہ شاید صورت حال بدل جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی وحی آ جائے!! ـــــ جب تک یہ صورت سامنے نہیں آئی کہ نبی اکرم ﷺ نے خود قربانی دینے اور حلق کرانے کے بعد احرام کھول دیا تو اُس وقت تک ان کے

ذہنوں میں صورت حال کی تبدیلی کا ایک امکان برقرار تھا کہ جس کے وہ شاید انتظار میں تھے۔ لیکن جب نبی ﷺ نے احرام کھول دیا تو صحابہ کرامؓ جان گئے کہ یہی آخری فیصلہ ہے۔ چنانچہ حالت منتظرہ ختم ہوگئی اور سب نے احرام کھول دیئے۔ عمرہ کی جو نیت کی ہوئی تھی اسے اگلے سال کے لئے مؤخر کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ سے مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

یہ صلح کن اعتبارات سے فتح مبین تھی!

اس اہم واقعہ کو قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا اور حدیبیہ سے واپسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ "بے شک ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کے لئے تابناک اور کھلی فتح کا فیصلہ فرمایا"۔ صلح حدیبیہ کو رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے ضمن میں ایک نہایت اہم موڑ (Turning Point) کی حیثیت حاصل ہے۔ درحقیقت اس صلح اور معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ کو ایک "طاقت" کی حیثیت سے تسلیم (Recognise) کرلیا۔ سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات میں دراصل یہی بات فیصلہ کن ہوتی ہے کہ اگر کسی فریق کی قانونی و آئینی حیثیت تسلیم کرلی جائے تو اس کے لئے یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس فریق کو بہت سے حقوق و تحفظات حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادہ ہو جانے اور ایک باضابطہ تحریری شکل میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرلینے کا مطلب یہ ہے کہ گویا قریش نے یہ تسلیم کرلیا کہ محمد (ﷺ) عرب کی ایک سیاسی اور عسکری طاقت ہیں جن سے انہوں نے صلح کا معاہدہ کیا ہے۔ یعنی قریش کو تسلیم کرنا پڑا کہ محمد (ﷺ) اب ایک ایسی طاقت ہیں جنہیں تسلیم کئے بغیر اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ اس صورت حال کے پس منظر میں مدینہ منورہ کی واپسی کے سفر کے دوران سورۃ الفتح کی درج ذیل آیات نازل ہوئیں :

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۚ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ ﴾
(آیت ۱۰)

"بے شک جو لوگ (اے محمد ﷺ) آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ (در حقیقت) اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ کے اوپر..."

اور

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ﴾

(آیت ۱۸)

"تحقیق اللہ راضی ہو گیا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے (اے نبیؐ) آپ سے درخت کے نیچے....."

اور

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ، لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ﴾

(آیت ۲۷)

"بے شک اللہ نے سچ کر دکھایا اپنے رسول کو خواب حق کے ساتھ۔ تم لازماً داخل ہو کر رہو گے مسجد حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے اپنے سروں کے بال مونڈتے اور کترتے ہوئے' بے کھٹکے..."

جب یہ آیات نازل ہوئیں اور اہل ایمان کے سامنے ان کی تلاوت کی گئی تو ان آیات نے گویا ان کے زخمی دلوں پر مرہم کے پھاہے کا کام کیا۔ اہل ایمان جس چیز کو اپنے خیال میں شکست سمجھتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس کو فتح مبین قرار دیا۔ اس سے مسلمانوں کے دل مسرت و شادمانی سے باغ باغ ہو گئے۔ صحیح مسلم میں روایت موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے پہلے خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کو بتایا کہ یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے پہلے تو کچھ تعجب کا اظہار کیا لیکن جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا ہے تو ان کے دل بے قرار کو بھی قرار آ گیا اور وہ بھی شاداں و فرحاں ہو گئے۔

حضرت ابو جندلؓ کا دوسرا اقدام

نبی اکرم ﷺ نے معاہدہ کی شرط کے مطابق اور سہیل بن عمرو کے اصرار پر ابو جندلؓ

کو کفار کے حوالہ کر دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہؓ اپنی قید سے دوبارہ نکلے۔ مدینہ منورہ تو اس لئے نہیں گئے کہ انہوںؓ نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ تو معاہدہ کی وجہ سے پابند ہیں لہٰذا آپؐ تو مجھے دوبارہ واپس بھجوا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بحیرہ احمر کا رخ کیا اور ساحل کے قریب جنگل میں پناہ لی۔ اس کے بعد ایک اور صحابی عتبہ بن اسید رضی اللہ عنہ، جو اپنی کنیت ابو بصیر کے حوالے سے زیادہ مشہور ہیں، وہ بھی مکہ والوں کی قید سے چھٹکارا پا کر مدینہ پہنچے۔ ان کے مدینہ پہنچتے ہی مکہ سے دو اشخاص ان کے پیچھے پہنچے اور حضورؐ سے مطالبہ کیا کہ ابو بصیرؓ کو اپنے معاہدے کی رُو سے ہمارے حوالے کیجئے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو بصیرؓ کو واپس جانے کا حکم دیا اور انہیںؓ ان دونوں ایلچیوں کے حوالے کر دیا۔ ابھی یہ تینوں ذوالحلیفہ ہی پہنچے تھے کہ ابو بصیرؓ نے موقع پا کر انہی دو میں سے ایک کی تلوار پر قبضہ کر کے اس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا مدینہ کی طرف سرپٹ بھاگا۔ پیچھے پیچھے ابو بصیرؓ بھی مدینہ پہنچ گئے۔ مکہ والا حضورؐ سے فریاد کر رہا تھا کہ ابو بصیرؓ نے آ کر عرض کیا کہ حضورؐ آپ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا، میں نے تو اب ایک کو قتل کر کے آزادی حاصل کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص پھر کہیں جنگ کی آگ نہ بھڑکا دے، کوئی ہے جو اس کو قابو میں کرے! یہ سننا تھا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ وہاں سے بھاگے اور مدینہ سے نکل کر بحر احمر کے ساحلی جنگل میں جا کر حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے۔ اس کے بعد جب مکہ کے بے کس اور مظلوم مسلمانوں کو پتہ چلا کہ جان بچانے کا ایک دوسرا ٹھکانا بن گیا ہے تو چوری چھپے مکہ سے فرار ہو کر مدینہ کا رخ کرنے کے بجائے یہاں پناہ کے لئے پہنچنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ایک اچھی خاصی جمعیت فراہم ہو گئی۔ اب انہوں نے قریش کے ان تجارتی قافلوں پر جو شام کے لئے بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے حملے شروع کر دیئے اور قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا، اس لئے کہ یہ لوگ مدینہ میں تو تھے نہیں لہٰذا حضور ﷺ کی صلح کی شرائط کے پابند نہیں تھے۔ تجارتی قافلوں کے یہ راستے قریش کی معیشت کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے حملوں اور لوٹ مار کے ہاتھوں مجبور ہو کر قریش کا ایک وفد ان کی طرف سے تحریر لے کر مدینہ آیا کہ معاہدہ کی اس شرط کو ہم خود واپس لیتے ہیں۔ اب مکہ

سے جو بھی آپؐ کے پاس مدینہ آکر آباد ہونا چاہے وہ آسکتا ہے' ہم اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ آپؐ ابو جندلؓ' ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیجئے ــــ حضور ﷺ نے ان کو فرمان بھیجا اور وہ سب کے سب مدینہ آکر آباد ہو گئے اور قریش کے قافلوں کا راستہ بدستور محفوظ و مامون ہو گیا۔

الغرض کہ صلح کی اس شق سے جو اہل ایمان کو سب سے زیادہ شاق گزری تھی خود قریش کو تائب ہونا پڑا۔ گویا ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ کا ایک نظارہ بہت ہی جلد مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ــــ اور نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر حضرت ابو جندلؓ کو واپس کرتے ہوئے جو الفاظ مبارکہ فرمائے تھے کہ : ((یا ابا جندل اصبر واحتسب' فان اللّٰہ جاعلٌ لک ولمن معک من المستضعفین فرجًا و مخرجًا)) "اے ابو جندل! صبر اور ضبط سے کام لو' اللہ تمہارے لئے اور تمہارے ساتھ دوسرے ضعیفوں اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکال دے گا" تو نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ایک حقیقی واقعہ کی شکل میں متشکل ہو کر نگاہوں کے سامنے آگیا۔

صلح حدیبیہ کے ثمرات

اس صلح کے بعد نبی اکرم ﷺ کو یکسُو ہو کر اپنی دعوتی سرگرمیوں پر پوری توجہ دینے کا موقع مل گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اصحابِ صُفہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی حضور ﷺ نے ان کے وفود بنا بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیجنے شروع فرمائے۔ مزید برآں اب تک مسلمان اور مشرکین کا آپس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس صلح کے بعد یہ روک ٹوک اُٹھ گئی تو آمد و رفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات و روابط کی وجہ سے کفارِ مکہ مدینہ منورہ آتے' وہاں طویل عرصہ تک قیام کرتے۔ اس طرح مسلمانوں سے میل جول رہتا اور باتوں باتوں میں اسلام کی دعوت توحید اور دیگر عقائد و مسائل کا تذکرہ اور ان پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ ہر مسلمان اخلاص اور حسن عمل کا پیکر' نیکو کاری' حسن معاملات اور پاکیزہ اخلاق کی زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکہ جاتے تھے' ان کی صورتیں' ان کے اعمال' ان کے اخلاق اور ان کے معاملات یہی مناظر پیش کرتے۔ ان

اوصاف کی وجہ سے مشرکین مکہ کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آتے۔ الغرض اس صلح کے نتیجہ میں اسلام جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا۔ مؤرخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ اس صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ اس سے قبل نہیں لائے تھے۔

خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا قبول اسلام

صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے "فتح مبین" قرار دیا ہے' لیکن یہ اجسام کی نہیں قلوب کی فتح و تسخیر کا معاملہ تھا۔ اس مرحلہ پر اسلام کو اپنی دعوت کی اشاعت کے لئے امن درکار تھا جو اس صلح سے حاصل ہو گیا۔ دعوتِ توحید کی وسعت کو دیکھ کر خود قریش یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ہماری شکست اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی فتح ہے۔ صلح حدیبیہ سے قبل قریش اور اہل ایمان کے مابین ہونے والے معرکوں میں قریش کی صفوں میں ایک جنگجو اور باصلاحیت شہسوار کی حیثیت سے خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ جنگ کے دوران گھڑسوار دستوں کی قیادت انہی کے سپرد رہتی تھی۔ غزوۂ احد کے موقع پر ان ہی کی تدبیر سے قریش کی شکست فتح میں بدل گئی تھی اور مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش نے گھڑسواروں کا ایک دستہ ان کی زیر کمان نبی اکرم ﷺ کا راستہ روکنے کے لئے بھیجا تھا۔ آپؐ کو اطلاع مل گئی اور آپؐ نے راستہ بدل دیا' ورنہ خالد بن ولید تو حضورؐ کا راستہ روکنے کے لئے رابغ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر قیام کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جگہ جگہ پڑاؤ ڈال رکھے تھے۔ خالد بن ولید کو جب پتہ چلا تو وہ بھی اپنے گھڑسواروں کے دستہ کے ساتھ پلٹ کر حدیبیہ پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر خالد بن ولید کی طرف سے ایک انوکھے طرزِ عمل کا مظاہرہ ہوا۔ یہ ایک ایسے پڑاؤ پر پہنچ گئے جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو ڈھائی سو کی نفری فروکش تھی۔ خالد نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح یہ اہل ایمان مشتعل ہو جائیں اور کسی مسلمان کا ایک مرتبہ ذرا ہاتھ اُٹھ جائے۔ قریش کی کچھ روایات تھیں جن سے انحراف خالد کے لئے

ممکن نہ تھا۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احرام کی حالت میں تھے اور ان کی قدیم روایات چلی آ رہی تھیں کہ محرم پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے' اس لئے خالد بن ولید جنگ کی پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے اشتعال انگیزی کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ اپنے گھوڑے لے کر بار بار صحابہؓ کی اس جماعت پر ایسے چڑھ چڑھ کر آئے جیسے ان کو گھوڑوں کے سموں سے کچل دیں گے۔ انہوں نے کئی بار اس عمل کو دہرایا' لیکن جو حکم تھا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا صحابہ کرامؓ اس پر کاربند رہے۔ نہ کوئی ہراساں ہوا' نہ کوئی بھاگا اور نہ ہی کسی نے مدافعت کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ نظم و ضبط کے اس مشاہدہ کا خالد بن ولید پر اتنا گہرا اثر ہو چکا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکے اور ان کا گھائل دل بالآخر مسخر ہوا' جس کا ظہور صلح حدیبیہ کے بعد ہوا اور وہ مشرف بہ ایمان ہونے کے لئے عازمِ مدینہ ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد یہی خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ "سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ" قرار پائے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ جب سوئے مدینہ چلے تو راستہ میں حضرت عمرو بن العاص مل گئے جو قریش کے ایک اعلیٰ مدبر' شجاع و دلیر اور فنون حرب کے بہت ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ یہی وہ صاحب تھے جن کو ۵ نبوی میں حبشہ ہجرت کر جانے والے مہاجرین کی بازیابی کے لئے قریش نے سفیر بنا کر جناب نجاشیؒ کے دربار میں حبشہ بھیجا تھا۔ حضرت خالدؓ نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے؟ بولے: اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ جا رہا ہوں۔ میرے دل نے تسلیم کر لیا ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول برحق ہیں اور اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے۔ حضرت خالدؓ نے کہا: اپنا بھی یہی حال ہے ——— چنانچہ قریش کے یہ دونوں مایہ ناز اور جلیل القدر فرزند بارگاہ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہوئے اور دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ اور اس طرح وہ جوہر جو اُس وقت تک اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا' اب اسلام کی محبت اور اس کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) نے دورِ نبوت اور بعد ازاں دورِ خلافت صدیقی و فاروقی میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ رہتی دنیا تک بھلائے نہیں جا سکتے۔ اول الذکر کا دنیا کے عظیم ترین جرنیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ دورِ

صدیقی میں فتنہ ارتداد کی سرکوبی میں انہوں نے ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح کسریٰ پر ابتدائی کاری ضرب انہیؓ کے ہاتھوں لگی اور انہیؓ کے ہاتھوں قیصر کی سلطنت میں سے شام کا ملک اسلامی قلمرو میں شامل ہوا اور آخر الذکر مصر کے فاتح ہوئے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دو عظیم انسانوں کا قبول اسلام دراصل صلح حدیبیہ ہی کے ثمرات کا مظہر تھا۔

اس صلح حدیبیہ کے ثمرات و فوائد بہت سے ہیں' مختصراً یہ کہ درحقیقت یہ صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ کی تمہید بنی۔ نبی اکرم ﷺ کو ۶ھ سے ۸ھ تک امن وسکون کے جو دو سال ملے اس میں توحید کی انقلابی دعوت نے نہایت سرعت کے ساتھ وسعت اختیار کی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت فراہم ہو گئی۔

بیرون عرب دعوتی خطوط کی ترسیل

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر بھی متعدد سلاطین کو اپنے دعوتی مکتوبات ارسال فرمائے۔ اس سے پہلے آپؐ نے بیرون عرب نہ کوئی نامہ مبارک لکھا اور نہ ہی کوئی ایلچی بھیجا۔ ۷ھ ہجری تک حضورؐ کی تمام دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جزیرہ نمائے عرب کے اندر اندر تھیں' لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ۷ھ ہجری میں حضور ﷺ نے دعوتی سرگرمیاں عرب کی حدود سے باہر بھی شروع فرمائیں اور آپؐ نے مختلف صحابہؓ کو ایلچی بنا کر عرب کے اطراف و جوانب میں تمام سربراہان سلطنت کی جانب بھیجا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

صلح حدیبیہ کے بعد اب حضورؐ کی دعوتی سرگرمیاں دو شاخوں میں بٹ گئیں۔ ایک اندرون ملک عرب اور دوسری بیرون ملک عرب ـــــ آخر الذکر مرحلہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ساتواں مرحلہ ہے۔

ادائے عمرہ

اگلے سال ذیقعدہ ۷ھ میں نبی اکرم ﷺ نے عمرۂ قضا ادا فرمایا۔ آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ جو اصحاب پچھلے سال حدیبیہ میں موجود تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے' سب

کے سب چلیں۔ چنانچہ اس دوران جو لوگ فوت ہو گئے تھے ان کے سوا سب نے آپؐ کی پکار پر لبیک کہا اور عمرے کی سعادت حاصل کی۔ صلح حدیبیہ میں طے شدہ شرط کے مطابق نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جلو میں حالت احرام میں مکّہ تشریف لائے۔ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ باآواز بلند تلبیہ کہتے ہوئے حرم شریف کی طرف بڑھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے اونٹ کی مہار پکڑے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔ ان اشعار کو امام ترمذیؒ نے شمائل میں نقل کیا ہے :

خَلُّوا بنی الكفار عن سبيله
اليوم نضربكم على تنزيله
ضربا يزيل الهام عن مقيله
ويذهل الخليل عن خليله

"کافرو' آج سامنے سے ہٹ جاؤ! آج تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے۔ وہ وار جو سر کو خوابگاہِ سر سے الگ کردے اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جم غفیر تھا اور وہ کعبہ شریف کی دید سے شاد کام ہو رہے تھے اور عمرہ ادا کرنے کی تمنا و آرزو کو پورے جوش و خروش اور چشم تر سے بجالا رہے تھے۔ شرط کے مطابق حضورؐ اور صحابہؓ تین دن تک مکّہ میں مقیم رہے۔ قریش کے تمام بڑے بڑے لوگ مکّہ سے نکل گئے کہ نہ ہم اہل ایمان کو دیکھیں نہ ہمارا خون کھولے اور نہ اس کے نتیجے میں کوئی تصادم اور حادثہ وقوع پذیر ہو۔ لہٰذا وہ سب کے سب پہاڑوں پر چڑھ گئے۔

قریش کی شکست خوردگی

حقیقی نہیں تو معنوی طور پر یہ قریش کی زبردست شکست تھی اور حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ادائے عمرہ سے ان کی ساکھ کو بڑا شدید نقصان پہنچا تھا۔ کیونکہ اُس وقت صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی لیکن پورے عرب کی سیاسی' مذہبی اور معاشی سیادت و قیادت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ گویا باقاعدہ اور تسلیم شدہ نہ سہی لیکن بظاہر احوال درحقیقت (de facto) قریش کو پورے عرب پر ایک

نوع کی حکمرانی حاصل تھی۔ اگرچہ کوئی باضابطہ اعلان شدہ (Declared) حکومت نہیں تھی اور کوئی تحریری معاہدہ یا دستور و آئین موجود نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہاں قبائلی نظام تھا' لیکن قدیم روایات موجود تھیں جس کے مطابق معاملہ چل رہا تھا۔ جیسا کہ آج تک برطانیہ کا کوئی تحریری دستور (Written Constitution) موجود نہیں ہے' بلکہ روایات کی بنیاد پر ان کا معاملہ چل رہا ہے' کم و بیش یہی معاملہ اہل عرب کا تھا' جس کی رو سے گویا قریش عرب کے حکمران تھے ـــــ کعبۃ اللہ کے باعث مذہبی سیادت ان کے پاس تھی۔ معاشی اعتبار سے نہایت خوشحال تھے۔ ان کے قافلوں پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا تھا' اس لئے کہ ہر قبیلہ کا "خدا" بت کی شکل میں بطور یرغمال قریش کے پاس رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ قریش کو پورے عرب پر جو سیادت و قیادت حاصل تھی وہی اسلامی انقلاب کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ لہٰذا یہ وجہ تھی کہ ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے سب سے زیادہ ان ہی کے خلاف اقدامات فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین OO

ایران میں پارلیمانی انقلاب (۲)

آئین سازی اور پارلیمانی جمہوریت کا آغاز

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۱۲)

ــــــ ڈاکٹر ابو معاذ ــــــ

ایران کی پہلی اسلامی حکومت' مرزا کوچک

مرزا کوچک صوبہ گیلان کے دارالحکومت رشت کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام مرزا یونس تھا۔ آپ نے رشت کے سکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد تہران کے دینی مدرسہ میں داخلہ لیا۔ علمی موشگافیوں سے اکتا کر آپ جلد ہی تعلیم ادھوری چھوڑ کر میدان عمل میں اتر آئے۔ تہران میں قیام کے دوران آپ خفیہ تنظیم "اتحاد اسلامی" کے رکن بن گئے جسے سید جمال الدین افغانی نے اپنے استنبول کے قیام کے دوران تشکیل دیا تھا۔ تہران سے تن تنہا واپس وطن لوٹنے کے بعد آپ اپنے چار دوسرے انقلابی نوجوانوں کے ساتھ مل کر سرکاری فوج پر حملے کرنے لگے۔ پھر ان کے ساتھ مزید لوگ بھی ملتے گئے' یہ لوگ مزید گوریلا کارروائیوں کے لئے گیلان کے گھنے جنگل میں چلے گئے۔ ان لوگوں کے سر اور داڑھی کے بال بہت لمبے ہوتے تھے' کیونکہ انہوں نے قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ ایران کو روس اور برطانیہ سے آزاد کرائے بغیر یہ لوگ اپنے بال نہیں کٹوائیں گے۔ اس طرح اپنی چال ڈھال سے یہ لوگ طالبان سے ملتے جلتے تھے۔

مرزا کوچک خان نماز روزے کے پابند تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ انسان کا ہر عمل خدا کی رضا کے مطابق ہونا چاہیے۔ آپ نے عوام کو عصر حاضر کے فرعونوں کے سامنے

پیغمبروں کے راستہ پر چلنے کی تلقین کی تھی۔ گیلان کے جنگلات میں بغاوت کے دوران شاہ کے روسی کمانڈر نے آپ کو تہران سے خط لکھا کہ اگر وہ اپنے ہتھیار ڈال دیں تو انہیں ایک محفوظ' خوشحال اور مرفہ حال زندگی گزارنے کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اس خط میں روسی افسر نے قرآن پاک کے حوالوں سے گمراہ کن استدلال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ جیسے راستباز اور درویش منش انسان کی بغاوت کے باعث غریب عوام زبردست پریشانی کا شکار ہیں' اس لئے کہ اس طرح کے تخریب کارانہ اقدامات آپ جیسے مَردِ کامل کو زیب نہیں دیتے۔ آپ نے جوابی خط میں لکھا کہ الفاظ کی شیرینی دراصل حق کو باطل کے دھندلکوں میں گم کرنے کے کام لائی جاتی ہے اور آپ صرف قابل نفرت بادشاہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے مجھے میرے عظیم مقصد سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ مجھے برطانوی اہلکاروں نے تو ایران کی حکومت کی پیشکش بھی کر رکھی ہے بشرطیکہ میں ان کا آلۂ کار بن جاؤں۔ میں نے انہیں اس لئے دھتکار دیا ہے کہ میں ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہوں۔ یہ اسلام کا ابدی اصول ہے کہ جب کافر مسلمانوں کے مقدس وطن پر قابض ہو جائیں تو وہ جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ انگریز اسلام اور انصاف کے ابدی تصور سے بے بہرہ ہیں' وہ تو صرف کمزور قوموں کو ہڑپ کرنا جانتے ہیں تاکہ انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جاسکے۔ مرزا کوچک نے (روسی انقلاب سے قبل) اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ظلم و استبداد میں پسے ہوئے عوام کی دادرسی اور آزادی چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ وہ میرا جواب تمہیں بھی وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کو اور رسول اللہ ﷺ کا ابوجہل کو تھا"۔

مرزا کوچک ایک منکسر المزاج اور سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ ان کی تقریر سادہ ہوتی تھی اور ان کا مقصد غیر ملکی غلبہ سے آزادی' ناانصافی کا خاتمہ' ہر ایک کیلئے تحفظ اور انصاف کا آسان حصول اور آمریت اور شخصی استبداد کے خلاف مسلح جدوجہد کرنا تھا۔

ان دنوں شمالی ایران میں کئی بڑے جاگیرداروں نے روسی شہریت لے رکھی تھی اور وہ زارِ روس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ مرزا کوچک کا پہلا نشانہ ان لوگوں کی جائیداد تھی۔ آپ کے ہر ایکشن سے عوام کو آزادی نصیب ہوئی اور آپ کی تحریک کو مجاہدین

اور اسلحہ کی کھیپ ملتی رہی۔ ۱۹۱۸ء میں یہ تحریک گیلان کے صوبے میں مکمل کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی اور اب مازندران اور بحیرۂ خزر (Caspean Sea) کے ارد گرد کے دوسرے صوبوں تک پھیل رہی تھی۔ یہاں کی حکومت "اتحادِ اسلامی" کی ایک کمیٹی کے سپرد تھی جس کا سرکاری اخبار "جنگل" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔

زیرِ انتظام علاقے میں فوجی تربیت کے کیمپ قائم تھے جہاں پر دیہاتی نوجوانوں کو جنگی تربیت دی جاتی تھی۔ جونہی ۱۹۱۷ء میں روس میں کمونسٹ انقلاب برپا ہوا اس تحریک کو ایران میں بہت استحکام نصیب ہوا کیونکہ زارِ روس کی حکومت کے خاتمہ کے باعث اب روس کی جانب سے انہیں وقتی طور پر کوئی خطرہ نہ رہا۔ روس کی نئی حکومت نے اپنے توسیعی عزائم جاری رکھے۔ ایک بار پھر ۱۹۲۰ء میں روسی دستے انزلی کی بندرگاہ پر اترنے لگے۔ ان کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ انہوں نے ابتداء میں ایک اس برطانوی اڈے کو نشانہ بنایا جو برطانوی فوجی عرصہ ہوا چھوڑ کے جا چکے تھے۔ تاہم روسیوں کی آمد کے موقع پر ایران سے بہت سے لوگ جو کمیونسٹ انقلاب سے متاثر تھے وہ انزلی میں جمع ہو گئے (جو گیلان کے صوبے میں واقع ہے)۔ ان لوگوں نے اجتماعی طور پر مرزا کوچک خان سے رابطہ قائم کیا کیونکہ آپ اب اس علاقے کے مسلمہ رہنما تھے۔ گزشتہ عہد کے برطانوی اور شاہی روس کے گٹھ جوڑ سے اپنی ازلی نفرت کے باعث مرزا کوچک نے انقلاب کے بعد کے روسیوں پر اعتماد کرتے ہوئے انزلی آنے کی دعوت قبول کرلی۔ آپ نے اعلان کیا کہ روسیوں سے ملنے میں آپ کا یہ مقصد ہے کہ وہ تمام دنیا اور انسانیت کے دشمن برطانیہ کو (جو روس کا بھی دشمن ہے) ایران سے نکال باہر کریں۔ روسیوں نے مرزا کوچک خان کے زیرِ انتظام علاقہ میں بالشویک جمہوری ریاستوں کی طرز پر ریاستیں بنانے کا مطالبہ کیا جو مرزا کوچک خان نے مسترد کر دیا۔ روسیوں نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ مرزا کوچک خان ایرانی کمیونسٹوں کی پارٹی "عدالت پارٹی" کے اشتراک سے حکومت بنائیں۔ یہ تجویز اس لئے مسترد کر دی گئی کہ مرزا کوچک کے بقول ان لوگوں کو ایران کی روایات 'بود و باش' اخلاقی اصولوں اور عوام کے عقائد و افکار کا کچھ علم نہیں ہے۔ مرزا کوچک اپنے مذہبی تصورات کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

پھر مرزا کوچک سے روسیوں کا ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق بالشویک طرز کا نظام گیلان اور دیگر علاقوں میں فی الحال قائم نہیں کیا جانا تھا' اپنے زیر انتظام علاقے میں ایک انقلابی حکومت کا قیام عمل میں تھا۔ تہران کی فتح کے بعد عوام کی منتخب پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لایا جانا تھا جس کی قائم کردہ حکومت کے معاملات میں روس کسی قسم کی مداخلت کا مجاز نہیں تھا۔ اسی طرح کچھ اور شرائط بھی اس معاہدے میں شامل تھیں۔

جون ۱۹۲۰ء میں کوچک خان نے رشت اور انزلی کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا اور اپنے مرکز منجیل سے شمال میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح آپ کی انقلابی حکومت گیلان قائم کر دی گئی جسے روسیوں کا تعاون حاصل تھا اور اس علاقہ میں لوگوں کی جان و مال اور جائیداد کا تحفظ اور اسلامی اصولوں کی پاسداری شامل تھی۔ اس وقت کے تہران میں مقیم برطانوی سفیر کے مطابق مرزا کوچک خان اس قدر مضبوط ہو چکا تھا کہ اگر وہ ۱۹۲۰ء میں حالات کا صحیح ادراک کر کے تہران میں داخل ہو جاتا تو کوئی چیز اس کے مانع نہ ہوتی۔

اس وقت حکومت میں مرزا کوچک خان اور اس کے مذہبی اور قوم پرست ساتھیوں کے علاوہ بورژوا دانشوروں کے طبقے کے نمائندہ احسان اللہ خان اور ایک کمیونسٹ خالو قربان (جسے عسکریت پسند کردوں کی حمایت حاصل تھی) شامل تھے۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور کمیونسٹوں نے مرزا کوچک کے خلاف بغاوت کر دی۔ مرزا ایک بار پھر جنگل میں روپوش ہو گئے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ان تمام لوگوں میں پھر تصفیہ ہو گیا اور مرزا کی قیادت تسلیم کر لی گئی۔ قصہ مختصر یہ کہ رضا خان نے جب گیلان کی جانب پیش قدمی کی تو مرزا جنگل میں چلے گئے اور پھر برفانی طوفان میں گھر کر فوت ہو گئے۔ ان کا سر کاٹ کر تہران لایا گیا' جہاں سے ان کے ایک فدائی نے ان کا سر دوبارہ وہاں سے نکال کر ان کے دھڑ کے ہمراہ گیلان میں سلیمان دارات کے مقام پر دفن کر دیا' جہاں ان کی قبر حریت اور آزادی کی نشانی کے طور پر موجود ہے۔

اپنی وفات کے چوالیس برس بعد ۱۹۶۵ء میں مرزا کوچک خان کے افکار ایک دفعہ پھر انقلابی نوجوانوں کے سامنے آنا شروع ہوئے۔ شہنشاہ ایران کے خلاف سرگرم عمل مجاہدین خلق نے جنگل کی تحریک کی طرز پر اپنے مشن کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے پہلے زیر

زمین اخبار کا نام "جنگل" رکھا۔ ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کے موقع پر مرزا کوچک کو قومی ہیرو کا درجہ دیا گیا اور ان کا ذکر روایتی مذہبی علماء نے بھی احترام سے کیا' جبکہ ان کے پیش رو مرزا کوچک خان کو کمیونسٹ قرار دے کر مطعون کرتے رہتے تھے۔ اس کا اظہار مرزا کوچک نے اپنی زندگی میں اس طرح کیا تھا :

"یہ امر افسوس ہے کہ ایرانی مُردہ لوگوں کا احترام تو کرتے ہیں مگر کبھی زندہ لوگوں کی جدوجہد کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا کرتے۔ ہمارے بعد ایک ایسی صبح طلوع ہو گی جس کے اُجالے میں یہ لوگ جان لیں گے کہ ہم کون لوگ تھے اور کن لوگوں کے حقوق کے لئے لڑ رہے تھے۔ آج ہمیں لوگ رہزن اور ڈاکو کہہ لیں لیکن کل یہ ضرور ثابت ہو جائے گا کہ ہمارا ایک ایک قدم لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے تھا۔ ہم تمام الزامات سنتے رہیں گے اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں گے۔" ؎

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

اور بقول عرفانی ؎

پس زمن آوای عشق پاکِ من
می دہد ای دوستان از خاکِ من
حرفِ عرفانی صدائے تو بود
ہوی و ہایش ہوی و ہائے تو بود

(اے میرے دوستو! میرے بعد میرے سچے عشق کا شور و غل اور ہنگامے میری خاک سے اُبھریں گے۔ میری صدا تیری صدا بن جائے گی اور میری آہ و زاری تیری آہ و زاری بن جائے گی۔)

یہاں ایک چیز بہت اہم ہے اور اس کا ذکر اس لئے ضروری بھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کا جذبہ بھی ریکارڈ میں آ جائے کہ کس طرح انہوں نے اپنی مجبوریوں اور سادگی کے باوجود ایران میں اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔ یہ اس طرح ہوا کہ مرزا کوچک خان کو کچلنے کے لئے انگریزی فوج بھی شمالی ایران بھیجی گئی' اس میں سادہ لوح

مسلمان فوجی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے جن میں سے بیشتر کا تعلق پوٹھوہار سے تھا۔ یہ لوگ گیلان کے جنگلات میں فوجی کارروائی کرکے مرزا کوچک کے ساتھیوں کا صفایا کرنے کے لئے بھجوائے گئے تھے۔ مسلمان سپاہیوں نے مرزا کوچک کا لٹریچر پڑھ کر (اُن دنوں فارسی سمجھنا ہمارے نیم خواندہ لوگوں کے لئے بھی چنداں مشکل نہیں تھا) آپ کے مشن سے واقفیت حاصل کی۔ پھر اپنے مشاہدے اور تجربے سے یہ لوگ گوریلا جنگ لڑنے والے مسلمان انقلابیوں کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوئے تو ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوج سے بھاگ کر مرزا کوچک خان کے دستوں سے جاملے اور اپنے ایرانی بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے لگے۔ ایک بڑی تعداد میں یہ لوگ جنگ لڑتے لڑتے شہید ہوگئے اور کافی تعداد میں اس چند روزہ اسلامی ریاست کے سقوط کے موقع پر گرفتار ہوئے۔ انہیں باندھ کر بغداد لایا گیا اور سب کے سب پھانسی چڑھ گئے "اللّٰھم اغفر لھم وارحمھم"

بنا کردند خوش رسمی بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

(خاک و خون میں لوٹ کر ان لوگوں نے کیسی اچھی رسم کی بنیاد رکھی۔ خدا ان نیک سیرت، مخلص اور جذباتی عاشقوں پر اپنی رحمت کا نزول فرمائے۔)

اس طرح انقلاب کی بنیاد میں اپنا خون شامل کرنے والوں میں کچھ ہمارے سرپھرے لوگ بھی تھے جن کو خراج عقیدت پیش کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔

پہلوی دور

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، قاچاریوں کے عہد میں ایران طوائف الملوکی کا شکار تھا اور بادشاہ کی حیثیت غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھوں ایک کٹھ پتلی کی سی رہ گئی تھی۔ برطانوی اور روسی افواج ملک میں آزادی سے دندناتی پھر رہی تھیں۔ اس زمانے میں ایک مجہول سپاہی رضا خان کو اقتدار نصیب ہوا۔ یہ شخص شمالی صوبہ مازندران میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا اور جب چودہ برس کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوا تو بالکل اَن پڑھ تھا۔ فوج میں آنے کے بعد اس نے کچھ تعلیم حاصل کی اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے کرنل کے عہدے پر فائز ہوا۔

اس نے چھوٹے چھوٹے خود مختار حکمرانوں کو شکست دیتے ہوئے ایک بار پھر ایران میں مرکزی اقتدار قائم کیا۔ تہران پر اپنے قبضہ کے بعد سید ضیاء الدین کو وزارت عظمٰی سے ہٹایا اور قوام السلطنت کو وزارت عظمٰی سونپ کر خود وزیر دفاع بن گیا۔ پھر فوج کی تنظیم نو کی اور اس کی تعداد ڈھائی ہزار سے بڑھا کر چالیس ہزار کر دی۔ آہستہ آہستہ مالیاتی اصلاحات پر توجہ دی اور ملس پاگ کی مدد سے ایران کا ایک متوازن بجٹ بنوایا۔

وہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں فوج کے سپہ سالار اور وزیر دفاع کے عہدوں کے ساتھ وزیر اعظم بھی بن گیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی قبائلی افواج کو غیر مسلح کیا' خود مختار ریاستوں کا قلع قمع کیا' مرزا کوچک خان کی گیلان کی ریاست کو ختم کیا اور پھر خوزستان کی طرف توجہ دی اور وہاں عرب شیوخ کا اثر و رسوخ ختم کیا۔

اسی زمانے میں ترکی میں ری پبلک بنی اور مصطفیٰ کمال پاشا نے وہاں خلافت کا خاتمہ کر کے جمہوریت کی داغ بیل ڈالی۔ اس طرح ترکی کے تجربے سے متاثر ہو کر اس نے ایران میں بادشاہت کے خاتمے اور اسے جمہوریہ بنانے کا عہد کیا' مگر علماء نے اس مسئلہ پر اس کا ساتھ نہ دیا۔

ترکی میں خلافت کے خاتمہ سے علماء کو بہت دکھ پہنچا تھا اور وہاں پر جس طرح مذہبی اور قدیم روایات کی بیخ کنی کی گئی تھی اس سے ایرانی علماء بھی خائف تھے۔ رضا خان نے ایرانی عوام میں تحریک چلائی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملک سے بادشاہت کو ختم کر دیں اور انہیں قم میں جمع کیا مگر علماء نہ مانے۔ مجلس میں ان کے نمائندے موجود تھے اور آیت اللہ مدرس بہت بلند آہنگ پارلیمنٹرین تھے۔ اس لئے علماء کے اصرار پر رضا خان نے بادشاہت کو برقرار رکھنے کا مطالبہ منظور کر لیا۔ بعد کے واقعات میں علماء کا یہ قدم بہت حیرت و استعجاب کا باعث بنا ہے' مگر عموماً علماء (ماسوائے چند مواقع کے) پرانی روایات کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کو احمد شاہ کی ملک سے عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رضا خان نے رضا شاہ پہلوی کے نام سے تاج و تخت پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی آمرانہ حکومت کا آغاز کیا اور اتاترک کے طریق اپنانا شروع کر دیئے۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے فرمایا ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

بادشاہت سنبھالنے کے بعد رضا شاہ نے روسیوں سے معاہدہ کیا اور انگریزوں سے معاہدہ منسوخ کردیا۔ ہمسایہ اسلامی ممالک سے بھی علیحدہ علیحدہ دوستی کے معاہدے کئے۔

ملک میں تعلیم کے فروغ کے لئے آدھے ملکی وسائل وقف کردیئے۔ جدید تعلیم کی علماء نے زبردست مخالفت کی مگر اسے وہ خاطر میں نہ لایا۔ ۱۹۳۵ء میں تہران میں یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ فارسی زبان کی ترویج و ترقی کے لئے کام کیا اور صنعت و حرفت کو فروغ دیا۔ ملک بھر میں ریلوے کا وسیع جال بچھایا اور تیل کے چشموں سے ہونے والی آمدنی میں اپنا زیادہ حصہ مانگا۔

عورتوں کے پردہ کرنے پر پابندی عائد کردی گئی اور پولیس کو حکم دیا گیا کہ جہاں کوئی عورت چادر اوڑھے ہوئے نظر آئے اسے زبردستی نوچ لیا جائے۔

جدید تعلیم اور پردے کے خاتمے کے علاوہ رضا شاہ نے کئی ایسے اقدام کئے جن کے نتیجہ میں ایران مغربیت کی جانب مائل ہوا۔ اس وجہ سے علماء نے سخت احتجاج کیا۔ تمام لوگوں کے لئے رضا شاہ نے یورپین لباس لازمی قرار دیا اور پگڑی پہننے پر پابندی لگادی۔ اب عمامہ صرف لائسنس پانے والے لوگ ہی پہن سکتے تھے۔ علماء نے جب سخت احتجاج کیا تو ان کے وظائف بند کردیئے گئے اور مقامات مقدسہ سرکاری تحویل میں لے لئے گئے۔ پھر علماء کی آواز کو دبا دیا گیا۔

اسی دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی' جس کے نتیجے میں ایران پر اتحادی قابض ہوگئے۔ رضا شاہ کو اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے محمد رضا شاہ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہونے کو کہا گیا اور اسے ۱۹۴۱ء میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہنسبرگ میں جلاوطن کردیا گیا' جہاں وہ ۱۹۴۴ء میں فوت ہوگیا۔ بعد میں اس کے تابوت کو نکال کر تہران کے نواح میں شہر رے میں دفن کیا گیا۔ اسلامی انقلاب سے پہلے وہاں سے تابوت نکلوا کر قاہرہ بھجوا دیا گیا جہاں اسے دفن کیا گیا۔

محمد رضا شاہ پہلوی (۱۹۴۱ـ۷۹ء)

یہ اپنے باپ کی معزولی پر بر سر اقتدار آیا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر اسے صحیح اقتدار ملا تو اس نے کل پرزے نکالے۔ یہ وہی دور تھا جب مختلف ممالک میں آزادی کی تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ چین اور انڈونیشیا کی آزادی کے علاوہ برصغیر کی آزادی کے بعد دو اہم ملک ہندوستان اور پاکستان دنیا کے نقشے پر اُبھرے تھے۔ ایران پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو تسلیم کیا۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں مصدق کے انقلاب (جس کا آگے مفصل ذکر کریں گے) کا واقعہ پیش آیا۔ پھر تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد ملک میں لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ عوام کی آواز کو کچلنے کے لئے جبر واستبداد کا ہر حربہ آزمایا گیا اور ساواک جیسی خوفناک خفیہ سرکاری تنظیم قائم کی گئی۔ آمرانہ شخصی اقتدار کا دور دورہ شروع ہوا۔ امریکیوں کو خصوصی حقوق دیئے گئے اور انہیں ایرانی قوانین کے اطلاق سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ امریکہ سے دفاعی معاہدے ہوئے اور ایران کی مضبوط مسلح افواج وجود میں آئیں۔

ہر چند کہ تعلیم کے فروغ اور نئی سڑکیں بنانے پر توجہ دی گئی لیکن دیہات اور قصبات کے عوام جہالت کی پستیوں میں پڑے رہے۔ شراب نوشی کھلے عام ہونے لگی۔ فحاشی، عریانی اور مغربی بے پردگی کا سیلاب آگیا۔ ایران کو ایک مغربی اور سیکولر ملک کی صورت میں پیش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔ پریس کی آزادی چھین لی گئی۔ اظہارِ رائے کرنے والے حضرات کو قابل گردن زدنی قرار دیا گیا۔ خوشامد اور قصیدہ گوئی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ فارسی سے عربی الفاظ باہر نکالنے کے لئے "فرہنگستان" کا ادارہ قائم کیا گیا۔ عوام کے پیسے کو رنگا رنگ تقاریب میں بہایا گیا۔ اسلامی عظمت پر فخر کرنے کی بجائے ڈھائی ہزار سالہ ایرانی بادشاہت کی یاد میں جشن منا کر اپنا ناطہ قبل از اسلام کی زرتشتی تہذیب سے جوڑنے کی کوششیں ہوئیں۔ مذہبی علماء کی زبان بند کر دی گئی یا وہ جلا وطن کر دیئے گئے۔

ان حالات کے پیش نظر علماء، روشن فکر دانشوروں اور عوام الناس میں بے چینی

اور بے زاری کی لہر دوڑ گئی۔ پھر نوجوانوں نے مجاہدین خلق اور فدائین خلق کے نام سے اپنی اپنی تنظیمیں بنا کر گوریلا کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان کو کچلنے کے لئے جبر و استبداد کا ہر حربہ آزمایا گیا۔

اس صورت حال میں انقلاب اسلامی کی راہ ہموار ہوئی۔ اگست ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق نے بادشاہت کا خاتمہ کرنے میں وقتی طور پر کامیابی حاصل کر لی، مگر اس وقت شاہ مغربی استعمار (امریکہ) فوج اور علماء کی مدد سے واپس آ کر اپنے اقتدار پر متمکن ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں سفید انقلاب کے نام پر جو اصلاحات لانا چاہیں وہ علماء کے لئے ناقابل قبول تھیں۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی کی آواز پر ملک میں ہلچل مچی تو انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔

جمال الدین افغانی کے افکار اور علامہ اقبال کے نظریات کو فروغ حاصل ہوا اور یہ انقلاب کی آواز بن گئے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے اسلام کی وضاحت سرگرم اور متحرک انداز میں کی۔ انہیں روایات کے مطابق ۱۹۷۷ء میں لندن میں زہر دلوا کے مروا دیا گیا۔ آیت اللہ طالقانی جیسے عظیم مذہبی رہنما نے انتہائی خطرناک حالات میں قوم کی بے لوث قیادت کی اور امام خمینی کی ملک سے طویل جلاوطنی کے دوران فکری اور عملی قیادت کی کمی محسوس نہ ہونے دی ـــــ اور پھر اسلامی انقلاب آ گیا۔ اس کا ذکر آئندہ صفحات میں موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد مصدق کے جرأت مندانہ اقدام

ڈاکٹر مصدق ایک آزاد اور خود مختار ایران کے حامی تھے۔ بطور وزیر اعظم ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ بڑی طاقتوں سے ٹکر لئے بغیر ایران کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ مصدق سمجھتے تھے کہ ایران کے کسی ایک طاقت کی جانب جھکاؤ سے اس طاقت کا ملکی معاملات پر اثر ہونا لازمی امر ہے، کیونکہ بالآخر ملک کے سیاستدان دانستہ یا نادانستہ اس طاقت کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ دراصل وہ مرزا کوچک خان کے الفاظ ہی دہرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ایرانی معاشرے سے ان تمام آلودگیوں کا خاتمہ ضروری ہے جو وہاں کی سیاست، معیشت، سماجی اور ثقافتی معاملات میں ابھی تک موجود تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں

ایک ایرانی ہوں اور مسلمان ہوں اور جب بھی ایران اور اسلام کو خطرہ ہو گا تو میں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔

مصدق کو نیشنل فرنٹ کی حمایت حاصل تھی جس میں مختلف طبقات کی نمائندگی موجود تھی۔ اس میں آیت اللہ کاشانی بھی شامل تھے جو روایتی مذہبی رہنما تھے اور وہ فدائین اسلام کی قیادت کر رہے تھے جس کا مقصد روایتی اسلامی نظریات کے خلاف کسی بھی تحریک کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ لوگ برطانوی اور روسی سامراجیت کے مخالف تھے، مگر امریکہ کی روس دشمنی کے باعث سرد جنگ کے اس ابتدائی دور میں ان کا اس وقت فطری طور پر امریکہ کی جانب جھکاؤ تھا۔ ان دنوں برطانیہ کا عملی اور انتظامی کنٹرول ایران کے اس وسیع و عریض ڈھائی لاکھ مربع کلو میٹر علاقہ پر تھا جو تیل کی دولت سے مالا مال تھا اور صرف اَبادان کی ریفائنری برطانیہ کے لئے سالانہ پچیس ملین ٹن صاف تیل مہیا کرتی تھی۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۵۰ء تک کے عرصہ میں برطانیہ نے ۳۲۴ ملین ٹن ایرانی تیل برآمد کرنے کے عوض ایران کو صرف ۴۲۰ ملین ڈالر کی معمولی رقم ادا کی تھی جو تمام آمدنی کا صرف آٹھ فیصد (۸%) تھی۔ جبکہ اس دوران بحرین، سعودی عرب اور عراق کی حکومتیں تیل کی آمدنی کا بالترتیب ۳۵ فیصد، ۵۶ فیصد اور ۶۰ فیصد وصول کر رہی تھیں۔

عوام کی جانب سے جب ایرانی تیل کے قومیائے جانے کی تحریک نے زور پکڑا تو مصدق ایک قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر گیا۔ برطانیہ نے اپنے استعماری مفادات کے تحفظ کے لئے اپنی بحریہ کو اَبادان کے قریب تعینات کر کے ایران کو انتہائی نتائج کی دھمکی دے دی۔ مئی ۱۹۵۱ء میں مصدق نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مہدی بازرگان بھی شامل تھے (جو انقلاب اسلامی کے بعد پہلے وزیر اعظم بنے)۔ اس کمیٹی کے ذمہ تیل کو قومیانے کے عمل کے لئے تفاصیل کی تیاری تھی۔ اس کمیٹی نے ایران کی قومی تیل کمپنی تشکیل دی جس نے برطانوی کمپنی سے کنٹرول سنبھالنا تھا۔ برطانیہ اس کے لئے تیار نہ ہو سکا اور امریکی صدر ٹرومین نے بھی مصدق کو دوبارہ مذاکرات کے لئے کہا۔ مصدق کے اقدامات نے تیل پیدا کرنے والے دیگر ممالک میں بھی بے چینی کی لہر پیدا کر دی۔ اسی کشمکش کے نتیجہ میں مصر کے شاہ فاروق کا تختہ الٹا گیا اور جمال عبد الناصر نے نہر سویز پر قبضہ

کر لیا۔

علماء نے مصدق کے اقدامات کو کمیونسٹ اثرات کے زیر اثر ہونے کا الزام دیتے ہوئے اس پر طرح طرح کے الزامات لگانا شروع کر دیئے۔ اس دوران شیعہ دنیا کے عظیم ترین رہنما حضرت آیت اللہ العظمیٰ بروجردیؒ نے شاہ پرست اراکین مجلس کے ہمراہ پہلوی بادشاہت کے حق میں مدرسہ فیضیہ قم سے ایک جلوس نکالا، جس میں مصدق کی کھلم کھلا مذمت کی گئی۔ حتیٰ کہ علماء کے زبردست دباؤ کے نتیجہ میں آیت اللہ کاشانی بھی مصدق کی حمایت سے دستبردار ہو گئے اور انہوں نے ایک ایسی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کا بے وقت مطالبہ کر دیا جو منشیات کے پھیلاؤ، بدعنوانی اور رقبہ گری کے مسائل کا جائزہ لے جو مسلمان نوجوانوں کو درپیش ہیں۔ اس کا مقصد عوام کی توجہ اس مسئلہ سے ہٹا کر دیگر معاملات کی جانب مبذول کرنا تھا۔

تیل کے مسئلہ سے توجہ ہٹانے کے لئے اب آیت اللہ کاشانی نے حکم دیا کہ ان مغرب زدہ خواتین کے چہروں پر تیزاب پھینکا جائے جو پردے کے بغیر گھر سے نکلتی ہوئی پائی جائیں۔ علماء نے نعرہ لگایا کہ اسلام خطرے میں ہے اور مصدق کا اقتدار ایک کمیونسٹ اقتدار ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کو بدنام کرنے کے لئے کئی دوسری چالیں چلی گئیں۔ آیت اللہ محمود طالقانی کے بقول رات بھر طلبہ اور علماء کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے آیت اللہ بہبانی کے گھر بیٹھ کر علماء کو جعلی خطوط لکھتے رہے۔ یہ خط سرخ سیاہی سے لکھے گئے۔ اور ہزاروں علماء کو ارسال کئے گئے انہیں لکھا گیا کہ بہت جلد ہم تمہاری پگڑیوں کی مدد سے تمہیں ذلیل و رسوا کر کے پھانسی دینے والے ہیں۔ مزید برآں کرائے کے لوگوں سے تہران کی سڑکوں پر اسلام کے خلاف نعرے بھی لگوائے گئے۔

اس کے نتیجہ میں آیت اللہ العظمیٰ بروجردی نے شاہ کو روم میں ایک تار بھیجی جس میں کہا گیا کہ شیعیت اور اسلام کو آپ کی ذات کی اشد ضرورت ہے اور آپ جلاوطنی ترک کر کے واپس تشریف لے آئیں۔ یہ بھی لکھا گیا کہ کیونکہ آپ شیعیت سے وابستہ ہیں اور آپ کے سفر شیعوں اور شیعیت کے تحفظ کے لئے ہیں اس لئے آپ ہوائی سفر سے اجتناب فرمایا کریں۔

(باقی صفحہ ۷۶ پر)

امریکی معاشرے کی موجودہ سیاسی اور اخلاقی حالت

پر سابق امریکی صدر

رچرڈ نکسن کا نوحہ

از قلم : چوہدری مظفر حسین ☆

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کو جو صدور میسر آئے ان میں رچرڈ نکسن منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ امریکہ کا ایک بد قسمت صدر تھا کہ واٹر گیٹ سیکنڈل کی بدنامی اس کی قسمت میں لکھی تھی' پھر بھی وہ امریکہ کا کوئی عام صدر نہیں تھا بلکہ ایک مفکر' مدبر اور اعلیٰ پایہ کا مصنف ہونے کے اعتبار سے ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا' لیکن اس کی یہ ساری خوبیاں واٹر گیٹ سیکنڈل کی وجہ سے گہنا گئیں۔ اس کا شمار امریکہ کے عظیم ترین صدور یعنی واشنگٹن' جیفرسن فرینکلن اور لنکن کی صف میں اس لئے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ لوگ امریکی جمہوریت کے معمار تھے جبکہ نکسن ان کی تعمیر کردہ جمہوریت کی عمارت کو کھنڈروں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا لیکن مروجہ جمہوریت کے ہاتھوں اتنا بے بس تھا کہ اپنے ملک میں جمہوری تہذیب کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا نہیں دے سکتا تھا۔

رچرڈ نکسن نے دس کتابیں لکھیں۔ اس کی آخری کتاب "ورائے امن" (Beyond Peace) ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی' جس کے بارے میں اس نے خود کہہ دیا تھا کہ "غالباً یہ اس کی آخری کتاب ہے"۔ اس کی پہلی تمام کتابیں عالمی سیاست اور امریکہ کی خارجہ پالیسی کے موضوعات سے متعلق تھیں مگر یہ کتاب وسیع تر حلقۂ قارئین

☆ اکیڈمک اینڈ ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس

کیلئے لکھی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ کتاب نکسن کا اپنی قوم کے نام ایک "وصیت نامہ" ہے۔ کتاب کا آخری باب بالخصوص ان قومی عوارض سے بحث کرتا ہے جن میں امریکہ کا جمہوری معاشرہ آج کل مبتلا ہے' بلکہ اسے "جمہوری تہذیب کا نوحہ" کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس باب میں نکسن نے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ دنیا کے ان تمام لوگوں کے لئے سامان عبرت ہیں جو امریکہ کو نمونہ ترقی و کمال خیال کرتے ہیں۔ نیز یہ خیالات اس اعتبار سے بھی بے حد اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ ایک ایسے شخص کے خیالات ہیں جس نے ایک عالمی طاقت کے بااختیار حکمران کی حیثیت سے پوری دنیا کو اس کی بلند ترین چوٹی سے دیکھا ہے اور ایک مقتدر سیاستدان کی حیثیت سے دنیا کے معاملات میں عملاً حصہ لیا ہے۔ اس لئے یہ خیالات اس قابل ہیں کہ ان پر توجہ دی جائے۔

"ورائے امن" کے تیسرے اور آخری باب میں نکسن نے اپنے ملک کے مختلف اداروں مثلاً حکومت' انتظامیہ' امن عامہ' تعلیم' ثقافت' سماجی فلاح و بہبود' عدل و انصاف' ذرائع ابلاغ اور خاندان میں سے ایک ایک کو لیا ہے اور دقت نظر سے ان کا جائزہ لینے کے بعد ان میں پائی جانے والی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو امریکی معاشرہ کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ وہ کہتا ہے :

> "ہمارے شہروں کو گھن لگا ہوا ہے اور اس کی سڑاند ہمارے روحانی' اخلاقی اور تہذیبی عادات و اطوار میں رچ بس گئی ہے جس سے غربت' جرائم اور عوامی سہولتوں کے ناجائز استعمال جیسے عوارض نے جنم لیا ہے"۔ (۱)

اس ضمن میں وہ پیٹ موئنی ہن (Pat Moynihan) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے :

> "پچاس برس پہلے ہم ایک ایسے شہر کے باسی تھے جس کا ایک معاشرتی ڈھانچہ تھا' یہ اپنا ایک انفراسٹرکچر (یعنی ذیلی سہولتوں کا نظام) اور دنیا کا بہترین زمین دوز نظام مواصلات رکھتا تھا۔ عمدہ ترین رہائش گاہیں' شہری سکولوں کا بہترین نظام اور بہترین سلیقہ شعار شہری تھے۔ لیکن اب اسی شہر کے کئی حصے ایسی معاشرتی افراتفری کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں جو ظاہر کرتی ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو معاشرہ کے اچھے شہری بنانے میں ناکام رہتے ہیں۔ اور صورت حال سال بہ سال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے"۔ (۲)

پیٹ موئنی ہن اپنی بات کی تائید میں سٹیٹ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ایڈون ٹورس کے خط کا' جو اس نے اسے لکھا تھا' حوالہ دیتے ہوئے اس کا اقتباس پیش کرتا ہے۔ اس اقتباس میں ٹورس لکھتا ہے :

"زمین دوز ٹرینوں' کاروں' پنساری کی دکانوں' خوردہ فروش اسٹوروں' خود کار لانڈریوں' کیش مشینوں اور عمارتی لفٹوں میں ہر کہیں لوگ عام قتل ہو رہے ہیں لیکن لوگوں کی بے حسی اور خواب غفلت انہیں ایسے جنگ آزما فوجی کی سطح پر لے آئے ہیں جو ایک عرصے کی جنگ کے دوران دشمنوں اور اپنوں کی لاشوں پر بیٹھ کر بڑے اطمینان کے ساتھ جنگی راشن تناول کرتا ہے۔ جس معاشرے میں ظلم اور جور و ستم کا احساس باقی نہیں رہتا' نیستی اس کا مقدر بن جاتی ہے"۔ (۳)

تعلیمی انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے نکسن لکھتا ہے :

"بعض لوگوں کا یہ خیال کہ سکول اس لئے ناکام ہو رہے ہیں کہ ہم ان پر بہت کم خرچ کرتے ہیں' ایک انتہائی لغو اور مہمل مفروضہ ہے۔ ۱۹۹۰ء میں امریکہ میں فی طالب علم اوسطاً پانچ ہزار دو سو سنتالیس ڈالر خرچ کئے گئے اور یہ رقم ۱۹۶۰ء کے مقابلے میں ڈھائی گنا زیادہ تھی اور دنیا کے صنعتی ترقی یافتہ جمہوری ممالک کے مقابلے میں تعلیم کی مد میں سب سے زیادہ رقم خرچ ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود پچھلی تین دہائیوں میں علمی رجحانات کے ٹیسٹ (Scholastic Aptitude Test) کے سکور میں اسی فیصد (۸۰%) کی واقع ہوئی اور کئی ایک جائزوں کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ ریاضی اور سائنس جیسے اہم مضامین میں امریکی طلبہ دنیا کے دیگر ممالک سے پیچھے رہ گئے"۔ (۴)

اس انحطاط کی بنیادی وجہ اس کے نزدیک یہ ہے کہ سکول تعلیم و تربیت کے مراکز کے بجائے اسلحہ کے آزادانہ استعمال کے گڑھ بن چکے ہیں' جس کا سبب یہ ہے کہ ان میں ڈسپلن نہیں رہا اور طلبہ کو نظم و ضبط کا خوگر نہیں بنایا جاتا۔ چنانچہ وہ بڑی دلسوزی کے ساتھ ناصحانہ انداز میں کہتا ہے :

"امریکہ کے پبلک سکولوں کو اگر کوئی کام کر کے دکھانا ہے تو انہیں پھر سے تحصیل

علم کے مہذب مامن بنا ہو گا' بجائے اس کے کہ وہ اسلحہ کے آزادانہ استعمال کے علاقے شمار ہوں۔ اولین بنیادی چیز کلاس روم میں نظم و ضبط کا پایا جانا ہے اور اس کے بعد ذاتی' معاشرتی اور ذہنی نظم کے اوصاف تحصیل علم کے لئے کلیدی عناصر کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اس معیار پر پرکھا جائے تو ہمارے اکثر و بیشتر پبلک سکول کئی عشروں سے اساتذہ پر والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں اور بتدریج انبوہ گردی (Mob Rule) کے سامنے سپر انداز ہوتے جا رہے ہیں"۔ (۵)

یونیورسٹیوں میں تعلیم کا جو حال ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے :

"امریکہ میں دنیا کی چند بہترین یونیورسٹیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر انہیں اپنی پوزیشن کو بحال رکھنا ہے تو انہیں اپنی کمزوریوں کی طرف توجہ دینی ہو گی۔ "پلورلزم" (یعنی مختلف اقوام پر مشتمل معاشروں اور متنوع عناصر کو یکجا رکھنے) کے نام پر ان درس گاہوں کے انتہاپسندوں کا مطالبہ ہے کہ داخلے کی پالیسی اہلیت کے بجائے نسلی نمائندگی کے اصول پر مبنی ہونی چاہئے۔ نصابِ تعلیم' علمی اور عقلی معیارات کی معروضیت کی بجائے نسل اور جنس کی سیاست کی بنیاد پر تیار کیا جانا چاہئے' تقریر کے قواعد و ضوابط آزادانہ علمی مباحثوں کو فروغ دینے کے برعکس ایسے احساسات کو ترقی دینے والے ہوں جو مغربی روایات کے خلاف معاندانہ مزاج رکھتے ہوں۔ جیساکہ ہوور انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر مارٹن نے کہا ہے کہ بائیں بازو کے لبرل خیالات رکھنے والے پروفیسروں کا تناسب بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے یونیورسٹیوں میں یک طرفہ ذہن کی کار فرمائی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے یہ انقلابی آجکل یونیورسٹیوں کے بیشتر شعبوں پر مسلط ہیں اور "سیاسی اصلاح" کی ایک ایسی تحریک کو قوت فراہم کر رہے ہیں جو صداقت کو سزا اور اہلیت کو عقوبت کا مستوجب قرار دیتی ہے اور کوتاہ سسٹم پر شعبوں کو ترقی دیتی ہے۔ ان سب کے نتیجے میں پرلے درجے کی جہالت کیمپس کے اندر سرایت کر رہی ہے"۔ (۶)

نوجوان نسل میں منشیات کا روز افزوں استعمال اور ان کے انسداد میں ... ماہرین صحت کی پیدا کردہ رکاوٹ اور انسداد منشیات کے سلسلے میں حکومت کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"حکومت کے حالیہ اقدامات سے اس الزام کو تقویت ملتی ہے کہ وہ منشیات کے خلاف جنگ میں ہتھیار ڈال رہی ہے۔ گزشتہ سال کے آخر میں سرجن جنرل جاسلین ایلڈرز (Joycelyn Elders) نے یہ اشتعال انگیز تجویز پیش کر کے ملک بھر میں آگ لگادی کہ منشیات کے استعمال کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا جائے۔ انتظامیہ کی طرف سے اس بیان پر تردید نہ آنے کی وجہ سے منشیات کی غیر قانونی فروخت اور استعمال کے خلاف حکومت کی ان بیس سالہ کوششوں کو سخت دھچکا لگا جو یکے بعد دیگرے آنے والی پانچ حکومتوں نے شروع کر رکھی تھیں"۔ (۷)

عوامی کلچر کے نام پر فحاشی کی اباحیت کے نظریہ کے فروغ میں عوامی تفریح کے ذرائع مثلاً سینما اور ٹیلی ویژن کے کردار اور حقیقت کی عکاسی کے نام پر ہر بُرائی کی تشہیر پر وہ بڑے دکھ کے ساتھ کہتا ہے:

"کم از کم غیر محفوظ ہمسائیگی میں رہنے والے بچوں کو گھروں میں تو محفوظ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ جب وہ ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوتے ہیں یا سٹیریو پر پروگرام سن رہے ہوتے ہیں تو بازاروں، گلیوں، محلوں اور سکولوں کے احاطوں میں ہونے والے تشدد اور مار دھاڑ کے مناظر کا سیل بے پناہ ان کے رہائشی کمروں میں آن داخل ہوتا ہے۔ کارٹونوں کے کردار ان کے اندر آگ بھڑکاتے ہیں اور شعر و ادب کے نام پر مسلح ڈاکوؤں اور پولیس افسروں کی فلمیں دکھا کر ان کے دلوں میں تشدد کی ستائش کا جذبہ ابھارا جاتا"۔ (۸)

"ہالی وڈ کے وڈیروں کا دعویٰ ہے کہ امریکہ بیمار ہے اور اس کی بیماری کا آئینہ دکھا کر وہ حقیقت کی عکاسی کر رہے ہیں۔ ان کی اقدار وہی ہیں جو عوام کی اقدار ہیں، چنانچہ تشدد اور جنس پر مبنی فلمیں دھڑا دھڑ بک رہی ہیں اور ہالی وڈ والوں کا کاروبار دولت کماتا ہے۔ لیکن شرافت اور شائستگی کی بنیادی اقدار کی ذمہ داری سے دست کش ہو کر ہالی وڈ نے ان اقدار کے زوال کو معاشرہ میں تیز تر کر دیا ہے اور وہ تشدد کا جشن منا کر گھروں اور معاشرتی بہبود کے اداروں کی ساری کوششوں کو غارت کر رہے ہیں جن کا مقصد تشدد کی اس لہر کے خلاف بند باندھنا ہے جو گلیوں اور محلوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔" (۹)

"جنسی بغاوت نے امریکہ کی خاندانی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ طلاقوں' حرام کاری کی کثرت' ناجائز بچوں کی پیدائش اور بن شوہر بچوں والی ماؤں کی شرح بہت بڑھ گئی ہے' جس کے نتیجے میں نچلے درجے کے شہریوں کا ایک مستقل طبقہ معرض وجود میں آگیا ہے۔ طبقہ امراء اور درمیانے درجہ کے طبقے میں منشیات کے استعمال کے فیشن میں حال ہی میں کچھ کمی رونما ہونے کی وجہ سے بھی اس طرح کا ایک نیا طبقہ ابھرا ہے۔ خود سرشاری میں غرق افراد' اباحیت پسندانہ طریق حیات' انتقام اور ظلم و ستم کے چلن' محنت کی لاحاصلی اور امریکی معاشرے کی اندرونی ناانصافی سے ایک ایسا کاؤنٹر کلچر فروغ پذیر ہے جس میں اہلیت کی ناقدری اور ذاتی جدوجہد کی بے توقیری کا زنگ امریکی معاشرے کو کھائے جا رہا ہے حالانکہ اوصاف حمیدہ ہی افراد کی ترقی اور اخلاقی اصول و ضوابط کے استحکام اور کامیابیوں کے حصول کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہیں"۔ (۱۰)

خاندان کا شیرازہ بکھرنے کی وجہ سے امریکہ میں جرائم میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ نکسن کے نزدیک اس کی وجہ غربت نہیں بلکہ خاندانی نظام کی بربادی ہے' وہ لکھتا ہے :

"معاشرے میں ہر سو پھیلے ہوئے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کا سامنا کریں کہ شہروں کا وہ نچلا طبقہ جہاں خاندانی زندگی میں بدترین شکست و ریخت ہوئی ہے' گلی کوچوں میں متشددانہ جرائم اور منشیات نوشی کا اصل ذمہ دار ہے"۔ (۱۱)

"جرائم کا الزام غربت پر ڈال دینا ذہنی کھوکھلے پن اور اخلاقی فساد کی علامت ہے۔ جس زمانے میں' میں جوان ہوا وہ ملک گیر معاشی بدحالی کا بدترین دور تھا لیکن جرائم بہت ہی کم تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُن دنوں خاندان اور معاشرے تہذیبی معیاروں کو برقرار رکھے ہوئے تھے"۔ (۱۲)

"آتش زن' لیٹرے' ڈاکو اور فسادی اس لئے نہیں آگ لگاتے' لوٹتے اور ڈکیتی اور تشدد کرتے کہ وہ غریب ہیں' بلکہ اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ تہذیبی اعتبار سے گل سڑ گئے ہیں۔ آج کے بدکردار شکاری نوجوان نشانہ ستم بننے والے اپنے

"شکار" کو انتہائی سرد مہری اور نفرت و حقارت سے جور و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔
وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر خوراک کے لئے یہ کام نہیں کرتے بلکہ جوتوں
کے ایک جوڑے کے لئے (یعنی بغیر کسی مطلب و مقصد کے) قتل کرتے ہیں"۔
(۱۳)

نکسن کی یہ پختہ رائے ہے کہ حکومت کے رفاہ عامہ کے پروگراموں کا اکثر و بیشتر فائدہ بد کردار افراد کو پہنچتا ہے۔ اپنی اس رائے کا اظہار کرتے وقت نکسن جذباتی ہو جاتا ہے اور اس کا لب و لہجہ تلخ اور سخت ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے :

"شہروں کے تنزل و ابتذال میں کسی چیز کو براہ راست اتنا دخل نہیں ہے جتنا کہ کرپٹ کرنے، غیر مستحکم کرنے اور انسانیت کی تحقیر و تذلیل کرنے والا رفاہ عامہ کا نظام ہے۔ تشدد اور جرائم پیشہ طبقے کے بدترین لوگ اسی نظام کے پیدا کردہ اور پروردہ ہیں۔ یہ نظام خاص طور پر کچی عمر کے غیر شادی شدہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو ناجائز بچے تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن انہیں پالنے کی اہلیت رکھتے ہیں نہ وسائل۔ رفاہ عامہ کا کوئی بھی معقول اور ہوشمندانہ نظام ناجائز اور حرامی بچوں کی حوصلہ افزائی نہیں بلکہ حوصلہ شکنی کرے گا۔ .. (اس قسم کے بچوں کی پرورش کے لئے) ایک غیر منکوحہ ماں کو (رفاہ عامہ کے نام پر) جو سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں ان پر بیس ہزار ڈالر خرچ ہو جاتے ہیں..... (ان سہولتوں کی بنا پر) سیاہ فام خاندانوں میں شکست و ریخت کی وجہ سے جو آفت آنے والی ہے اس کے بارے میں موئنی ہن نے آج سے تیس برس پیشتر متنبہ کیا تو اس کی کھال اُدھیڑ دی گئی لیکن وہ بالکل درست تھا۔ اسی قسم کا ایک انتباہ سفید فام خاندانوں کی تباہی کے بارے میں وال سٹریٹ جرنل میں چارلس مرے نے شائع کیا تھا اور اس کی کتاب "قدموں تلے سرکتی زمین" (Losing Ground) اس موضوع پر سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے نوٹ کیا کہ ۱۹۹۱ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی کل تعداد کا تیس فیصد حرامی یعنی غیر منکوحہ ماؤں کے بچے تھے۔ اور سیاہ فام عورتوں میں یہ شرح اڑسٹھ فیصد تھی۔ شہروں کے انتہائی اندرونی حصوں میں یہ شرح اسی فیصد (۸۰%) سے بھی بڑھ گئی اور سفید فام عورتوں میں یہ شرح بائیس فیصد تک پہنچ گئی۔ ان غیر منکوحہ ماؤں میں

بیاسی فیصد عورتیں ہائی سکول یا اس سے کم درجے تک تعلیم یافتہ تھیں۔ سفید فام عورتیں، جو غربت کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرتی ہیں، جو بچے جنتی ہیں ان میں سے نصف حرامی ہوتے ہیں"۔ (۱۴)

نکسن اپنے ملک کے نظام عدل وانصاف کی لغویت اور نامعقولیت کا رونا روتا ہے اور اس کی ایک مثال دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ عدل وانصاف کے جمہوری قوانین کس طرح مجرموں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں :

"۱۹۸۴ء کے موسم گرما میں نیویارک شہر کے ایک زمین دوز ریلوے سٹیشن پر دو لٹیروں نے ایک ستر سالہ بوڑھے کو زمین پر گرا کر بری طرح مارا پیٹا اور اس کا گلا دبا کر اس کی جیبیں خالی کر دیں۔ اس مظلوم شخص کی چیخ و پکار سن کر ٹرانزٹ پولیس کے دو افسر اس کی مدد کو دوڑے۔ لٹیرے پولیس افسروں کے رکنے کے احکام کو نظرانداز کرتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان افسروں نے گولی چلا دی جس سے ایک لٹیرا، جو عادی مجرم تھا، لنگڑا ہو گیا۔ اس نے ٹرانزٹ اتھارٹی پر ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔ ریاست نیویارک کی عدالت نے حال ہی میں اس لنگڑا ہونے والے لٹیرے کو تنتالیس (۴۳) لاکھ ڈالر کی ادائیگی کا حکم صادر کیا ہے جس کا بار زمین دوز ٹرینوں کے ان مسافروں پر پڑے گا جو ان لٹیروں کا شکار ہونے سے ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔ اور دوسری طرف ان لیٹروں کا نشانہ بننے والے مظلوم بوڑھے شخص نے اپنا چشمہ ٹوٹنے پر ہرجانے کا جو دعویٰ کیا تھا اسے عدالت نے مسترد کر دیا"۔ (۱۵)

نکسن اس بات پر بھی بہت دکھی ہے کہ ظالموں، مجرموں، لٹیروں اور دہشت گردوں کے لئے عوام میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے میں ابلاغ عامہ کے ذرائع کا کردار کس قدر افسوسناک اور دردناک ہے ــــ وہ اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے :

"ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کرنے والی کیتھرائن پاورز کے خلاف مقدمہ کے سلسلے میں میڈیا کا کردار بڑا حیران کن اور تمام حدود و قیود توڑنے والا تھا اور اس سے بیک وقت مجرم اور مظلوم کے لئے یکساں ہمدردی مترشح ہوتی تھی۔ سوال یہ تھا کہ آیا امریکہ کو اس جنگ میں ملوث ہونا چاہئے تھا یا نہیں۔ اس پر

دیانت دارانہ اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ لیکن جنگ کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں کے حق میں ہماری سوچ اس حد تک تو نہیں جانی چاہئے تھی کہ تشدد کرنے والوں کو بھی معاف کر دیا جائے۔ کیتھرائن پاورز کوئی معصوم بچہ نہیں تھی جسے کسی باغ سے پھول توڑتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ اس خاتون کی رہائش گاہ سے تین رائفلیں' ایک کاربین' ایک پستول' ایک شاٹ گن اور بہت بڑی مقدار میں گولہ بارود برآمد ہوا۔ اس پر ایک نیشنل گارڈز آرمری پر آتشیں بم پھینکنے کا الزام تھا۔ وہ ایک بینک ڈکیتی میں شامل تھی جس میں پولیس کے ایک اہلکار کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا جو نو بچوں کا باپ تھا۔ ان تمام تلخ حقائق کو ہضم کر کے مجرمہ کے بارے میں نرم احساسات کا اظہار ایک سنگ دلانہ رد عمل ہی قرار پاتا ہے"
(۱۶)

نکسن کو افسوس ہے کہ اس بارے میں نیوز ویک کا رد عمل بھی لبرل میڈیا کی اکثریت کے عین مطابق تھا' جس نے لکھا :

"اتنے سال گزر جانے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ زیادہ ہمدردی کس سے کی جائے۔ ان نو بچوں سے جن کا باپ قتل ہو گیا یا اس نوجوان عورت سے جو ۱۹۶۰ء کے عشرے میں گمراہ ہو گئی؟ پاورز کے نفسیاتی صدمہ پر تو میڈیا نے آنسوؤں کی بالٹیاں بہا دیں کہ اسے کس طرح اپنے آپ کو قانون کی گرفت سے بچانے کے لئے بیس سال تک چھپائے رکھنے کے لئے مارے مارے پھرنا پڑا لیکن ان نو یتیم بچوں کی بدقسمتی پر بہانے کے لئے کم ہی آنسو بچے جن کے باپ کو بینک ڈکیتی کے مقابلے کے دوران مار ڈالا گیا"۔ (۱۷)

نکسن کی کتاب سے منقول یہ طویل اقتباسات دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی سچی عکاسی کرتے ہیں جو آج دنیا کی سب سے بڑی سیاسی طاقت ہے۔ کیا امریکہ دنیا کے تمام ممالک میں اسی نمونے کی جمہوریت کو کارفرما دیکھنے کا متمنی ہے؟ ان اقتباسات میں امریکی جمہوریت کی گھناؤنی تصویر دیکھ کر اس امر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ نظام جمہوریت دنیا کے کسی بھی معاشرے کو امن و سلامتی سے بہرہ ور کرنے کی ہرگز اہلیت نہیں رکھتا۔ ایسی آزادی جس کی قیمت امن و سلامتی کی قربانی دے کر چکانی پڑے

بلکہ انسان کو اخلاقی اقدار سے محروم کردے اور غارت گر تہذیب و تمدن ہو وہ انسان کے لئے کس کام کی ہے؟ اس کا آخری نتیجہ سراسر ہلاکت و تباہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جمہوری تہذیب کے اس کڑوے پھل کو چکھنے کے بعد ایسی ناکارہ جمہوریت کو سینے سے لگائے رکھنے کا امریکہ کے پاس کیا جواز ہے؟ نکسن کے نزدیک اس سوال کا فقط ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ اس جمہوریت میں :

"آزادی نے اپنے وسیع ترین معنوں میں' اپنا دروازہ کھول دیا ہے۔ اندر جو کچھ موجود ہے اسے دیکھ کر اگر ہم مایوس ہو گئے تو یہ دروازہ ہمارے لئے بند ہو جائے گا۔"(۱۸)

گویا جمہوریت کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ نکسن کے اپنے الفاظ میں اگرچہ مایوس کن ہے لیکن اسے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی مایوس کن جمہوریت سے منہ موڑ لیا تو آزادی کا یہ دروازہ' جو ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں ان پر کھلا ہے' بند ہو جائے گا۔ گویا ایک نظریۂ حیات کے عملی نتائج کے اعتبار سے جمہوریت نے امریکی معاشرے میں جو گل کھلائے ہیں انہیں نرم ترین الفاظ میں مایوس کن تسلیم کرنے کے باوجود علمی اور فکری سطح پر اسی جمہوریت کو ایک نظریۂ حیات کے طور پر انسانی تاریخ کا آخری نظریہ خیال کیا جا رہا ہے۔ اور اسی نظریہ پر مبنی دنیا میں ایک نیا عالمی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جب روس امریکہ کے حریف کی حیثیت سے ۱۹۸۹ء میں اپنی طاقت' مرتبہ اور مقام کھو بیٹھا اور اس کا شیرازہ بکھرنے لگا تو جاپانی نژاد امریکی مورخ فرانسس فوکویاما (Francis Fukuyama) نے امریکی جریدہ "The National Interest" میں "The End of History" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ بنی نوع انسان کا نظریاتی ارتقاء پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور اس لئے انسانی تاریخ بھی اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہے۔ فوکویاما اپنا موقف مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے :

"ہمارے مشاہدے میں جو کچھ آ رہا ہے وہ محض سرد جنگ کا خاتمہ یا تاریخ کے کسی خاص دور کی رفت گزشت نہیں' بلکہ انسانی تاریخ کا اختتام ہے' یعنی انسان کے

نظریاتی ارتقاء کا نقطہ آخریں اور انسانی طرز حکومت کی آخری شکل کے طور پر مغربی جمہوریت کی جہانگیری"۔[۱۹]

اس مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر جان ٹی۔ رورکے (John T.Rourke) نے اسے ۱۹۹۱ء میں اپنی کتاب "Taking Sides" کے مجموعۂ مضامین میں شامل کیا جس سے اس مضمون کا بہت چرچا ہوا۔ چنانچہ مصنف نے ۱۹۹۲ء میں اسی مقالہ کو ایک کتاب کی صورت میں "The End of Hisotry and the Last Man" کے نام سے شائع کیا جسے دنیا بھر میں بہت دلچسپی سے پڑھایا گیا اور فوکویاما کا موقف ساری دنیا میں بحث مباحثہ اور نقد و جرح کا موضوع بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر اب تک مختلف زبانوں میں ایک ہزار کے لگ بھگ مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

دنیا کی واحد سپرپاور بن جانے کے بعد امریکہ کے سیاسی مدبرین کا یہ خیال ہے کہ اس کرۂ ارض پر بالقوہ اس کی اجارہ داری قائم ہو گئی ہے جسے وہ بالفعل معرض وجود میں لانے کے لئے نئے عالمی نظام کے پُر فریب نام سے موسوم کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کی آج تک یہی خواہش رہی کہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے دنیا کے تمام ممالک اس کی قیادت کو قبول کرلیں۔ چنانچہ اپنے واحد حریف روس کی شکست و ریخت کے بعد اس نے اپنے اس استعماری خواب کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ ۲۷/ فروری ۱۹۷۶ء کو نکسن کی چینی صدر ماؤزے تنگ سے بیجنگ میں ایک ملاقات ہوئی جبکہ ماؤ بستر مرگ پر تھا۔ اس ملاقات کے دوران عالمی قیادت کے بارے میں اس کی ماؤ سے جو گفتگو ہوئی، اس کا ذکر کرتے ہوئے نکسن لکھتا ہے :

> "گفتگو کے دوران میں نے کہا "ہمیں نہ صرف اپنے دو ملکوں کے مابین بلکہ دنیا کے تمام ملکوں کے درمیان امن کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔ اس کا جواب دینے کی ماؤ کی کوشش کا منظر دردناک تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے ہونٹوں سے بمشکل نیم ادا شدہ الفاظ کہے تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی ترجمان ایک دلکش نوجوان خاتون ماؤ کے لاگو کردہ ڈھیلے ڈھالے اور بے ڈھنگ سوٹ میں ملبوس (چینی عورتوں کے لئے اولڈ گارڈ کمیونسٹوں کی بدترین سزا) ماؤ کی بڑبڑاہٹ کو انگریزی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماؤ خود بھی انگریزی جانتا تھا۔ وہ سمجھ

گیا کہ ترجمان اس کے الفاظ کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی۔ اس نے اپنے سر کو سخت غصے میں جھٹکا اور اس سے نوٹ بک چھین کر چینی زبان میں اپنے الفاظ تحریر کیے۔ ترجمان نے ان الفاظ کو پڑھ کر بلند آواز میں انگریزی میں کہا : "کیا صرف امن آپ کی آخری منزل ہے؟" مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے مختصر توقف کے بعد جواب دیا : "ہمیں انصاف کے ساتھ امن کی تلاش کرنی چاہئے"۔ (۲۰)

ماؤزے تنگ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ نکسن کو جتلا دیا کہ کیا امن سے تمہاری مراد تمہارا اپنا من پسند امن ہے جو دنیا کی ایک استعماری طاقت کی حیثیت سے تم دنیا پر مسلط کرنے کے آرزو مند ہو؟ لیکن نکسن کا یہ جواب کہ ہم انصاف کے ساتھ امن کے خواہاں ہیں' بھی اس کے پہلے فقرہ کی طرح ہی مبہم تھا' کیونکہ انسانی تاریخ میں یہ کم ہی دیکھنے میں آیا ہے کہ طاقتور کا نظریۂ انصاف کمزور کے نظریۂ انصاف سے مطابقت رکھتا ہو۔ چنانچہ ماؤزے تنگ سے اپنی اس گفتگو کو تازہ کرنے کے فوراً بعد نظریۂ امن کی وضاحت کرتے ہوئے نکسن نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ سرد جنگ کے زمانے میں ہمارا نظریۂ امن کچھ اور تھا اور سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد ہمارا نظریۂ امن کچھ اور ہے۔ نکسن صاف صاف الفاظ میں لکھتا ہے :

> "میرا وہ جواب سرد جنگ کے ضمن میں اکتفا کرتا ہے لیکن آج ریاست ہائے متحدہ کے لئے یہ ایک محدود منزل مقصود ہے۔ اُس وقت ہماری منزل مقصود مشرق و مغرب کی کشمکش کو ختم کرنا تھا تاکہ ایٹمی جنگ سے بچا جائے اور ظلم و فساد پر انصاف اور آزادی کی بالادستی قائم کی جائے۔ آج کمیونزم سرد جنگ ہار چکا ہے اور مارکسزم لینن ازم کا سیاسی نظریہ قطعاً ناکام ہو چکا ہے۔ روس اور امریکہ کے درمیان ایٹمی جنگ کا خطرہ ٹل گیا ہے اور دنیا میں نہایت حقیقی معنوں میں انصاف کے ساتھ امن قائم ہو چکا ہے"۔ (۲۱)

گویا حریف باقی نہ رہے یا زیردست کے درجے میں آجائے تو زبردست کے نزدیک امن اور انصاف کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر زبردست کو دنیا میں بالادستی حاصل ہو جائے تو اسے یہ حق بھی مل جاتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی مرضی کا امن اور

انصاف قائم کرے۔ چنانچہ اب نکسن دنیا میں عدل و انصاف کے مندرجہ ذیل تین اصول بیان کرتا ہے :

"ایک ایسی دنیا میں جس میں کوئی زبردست دشمن ہمارا مد مقابل نہیں رہا ہم دنیا کے ہر معاملے کو اس کے موقع و محل کے مطابق پرکھیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ اس میں ہماری مداخلت ہماری اقدار سے مطابقت رکھتی ہے؟ کیا اس مداخلت سے ہمارے مفادات پورے ہوتے ہیں؟ اور جو فریق معاملے میں براہ راست ملوث ہیں کیا ان کے مفادات (ہماری مداخلت سے) پورے ہوں گے؟"۔ (۲۲)

یعنی پہلا اصول اپنی اقدار کا تحفظ' دوسرا اصول اپنے مفادات کا تحفظ' اور تیسرا اور سب سے آخری اصول یہ ہے کہ معاملے میں براہ راست ملوث ہونے والوں کے مفادات پورے کرنے کا خیال رکھا جائے۔ چنانچہ انہی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے عراق اور کویت کی جنگ میں "امن و انصاف" قائم کرنے کے لئے دخل اندازی کا جواز پیش کرتے ہوئے نکسن لکھتا ہے :

"کسی بھی جنگ سے ہمارے اتنے اہم مفادات وابستہ نہیں ہوئے جتنے کہ خلیج کی جنگ سے وابستہ تھے۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا تیل کے وسائل تک اپنی رسائی کو محفوظ رکھنے کا مقصد بھی ہمارے نظریاتی منتہائے مقصود سے پیوست تھا کیونکہ ہم نے جمہوری مقصد کے تحت کویت کی آزادی کی حفاظت کی"۔ (۲۳)

لیکن کویت کی آزادی' جمہوری مقصد اور امن و انصاف کے نام پر جو انسانیت سوز ظلم و ستم عراق کے بے گناہ عوام پر ڈھایا گیا' ایسی بربریت کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ امریکہ ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر جاپان میں جو تباہی لایا تھا' اس سے ساڑھے سات گنا زیادہ تباہی عراق پر لائی گئی۔ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل ریمزے کلارک کا کہنا ہے کہ خود مسلمانوں کو بھی معلوم نہیں کہ ان پر کتنی تباہی اور بربادی نازل ہوئی اور عراقی مسلمانوں کے نقصان کی وسعت اور سنگینی سے کتنی کے جو چند لوگ واقف ہیں وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس موضوع پر لاس اینجلز میں ۱۶/ اگست ۱۹۹۵ء کو اپنی تقریر کے دوران کلارک نے جو لرزہ خیز حقائق بیان کئے ان میں سے ایک چھوٹا سا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

"بمباری کا مقصد انسانی آبادی کی لازمی بنیادی ضروریات کو تباہ کرنا تھا۔ پینٹاگون کے مطابق چھ بیس دنوں کی جنگ کے دوران ایک لاکھ دس ہزار ہوائی حملے کئے گئے جن سے پانی کے بڑے بڑے ذخائر (ڈیم)' پانی صاف کرنے کے کارخانے' زمین سے پمپ کے ذریعے پانی نکالنے کے اسٹیشن اور نہروں کو کنٹرول کرنے کا نظام تاراج ہو گئے۔ پہلے ہی چار دنوں کے اندر اندر پانی کی سپلائی کا کوئی ایک مرکز بھی سالم نہ بچا' ماسوائے چند کنوؤں کے جہاں لوگ ہاتھ سے پانی نکالتے تھے۔ جنگ شروع ہونے کے صرف تیں منٹ کے اندر اندر بجلی کا نوے فیصد نظام ناکارہ کر دیا گیا جس سے خوراک پیدا کرنے کے ذرائع تباہ و برباد ہو گئے۔ دو ماہ کے اندر نوے فیصد پولٹری' چار ماہ کے اندر ساٹھ فیصد دودھ اور گوشت مہیا کرنے والے جانور ہلاک کر دیئے گئے۔ اناج پیدا کرنے یا اناج در آمد کرنے کی اہلیت نہ رہی۔ اناج کا کوئی ذخیرہ بھی باقی نہ بچا۔ عراق اپنی خوراک کا چالیس فیصد درآمد کیا کرتا تھا اور ساٹھ فیصد خود پیدا کرتا تھا۔ شدید بمباری کے نتیجے میں آئندہ چار سال میں خوراک کی پیداوار دو تہائی کم ہو گئی۔ صرف بیالیس دنوں کے دوران اٹھاسی ہزار ٹن گولہ بارود برسایا گیا جو ہیروشیما پر گرائے گئے ایٹم بم سے ساڑھے سات گنا زیادہ تباہی لایا۔ اس بمباری کی وجہ سے عراق اپنی آبادی کی بنیادی ضروریات زندگی پوری کرنے سے قاصر ہو گیا"۔ (۲۴)

ریمزے کلارک کے بیان کے مطابق اس خلیجی جنگ کے دوران اور مابعد جنگ پانچ سال کے دوران پانچ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ یونیسف کی رپورٹ کے مطابق پانچ سال سے کم عمر کے جو بچے ہلاک ہوئے ان کی تعداد ساڑھے تین لاکھ سے زائد تھی۔ جنگ کے بعد عراق کے خلاف لگائی گئی اقتصادی پابندیوں کے نتیجے میں بیماریوں کے علاج میں کام آنے والی دواؤں کی درآمد بھی بند تھی جس کی وجہ سے معمر' سن رسیدہ اور مزمن بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی اموات میں بے حد اضافہ ہوا اور عالمی ادارۂ صحت کے اندازے کے مطابق عراق میں فی کس اوسط عمر میں بیس سال کی کمی رونما ہوئی۔ سنگدلی کی انتہا یہ ہے کہ عائد شدہ اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے وہ نئی پیدا ہونے والی نسل بھی برباد ہو گئی جس نے ابھی دنیا میں آنکھ بھی نہیں کھولی تھی۔ حاملہ عورتوں کو ناقص خوراک ملنے

کی وجہ سے دو کلو سے کم وزن کے بچوں کی پیدائش میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ ایسے کم وزن بچے عمر بھر صحت مند زندگی کے قابل نہیں رہتے۔ اس بنا پر عالمی ادارۂ صحت کی رپورٹ میں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ جنگ کے بعد پانچ سال کے دوران پیدا ہونے والی عراقی نسل ایک بیمار اور بونی (Stunted) نسل ہوگی۔ چنانچہ اس بے رحمی اور سفاکی اور گھناؤنے انسانیت سوز ظلم پر بیدار ضمیر ریمزے کلارک پکار اٹھتا ہے ۔

"That is crime against humanity of enormous magnitude"

یعنی (انسانیت کے خلاف یہ ایک بے حد و وسعت جرم ہے)[۲۵]

لیکن نکسن کے نزدیک "کویت کی آزادی کی حفاظت" اور "جمہوریت کی سربلندی" جیسے عظیم مقاصد کے لئے یہ سفاکانہ ظلم اور بربریت بالکل روا ہے۔ خلیجی جنگ کے دوران اور اس کے بعد امریکہ اور مغربی دنیا کے کئی جمہوری ممالک کے میڈیا صدام حسین کی ضد، ہٹ دھرمی اور آمرانہ طور طریقوں کو کوستے رہے۔ لیکن ایک آمر کو سزا دینے کے لئے پانچ لاکھ بے گناہ انسانوں اور ساڑھے تین لاکھ بچوں کا سفاکانہ قتل اور جو بچے ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے، انہیں رحم مادر میں ہی ناکارہ کر دینے کا ظلم عظیم صرف مغربی "جمہوری اخلاق" (Democratic Ethics) میں ہی روا رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ ہے دنیا میں "انصاف کے ساتھ امن قائم" کرنے کی "معصوم خواہش" کی ایک جھلک جو نکسن جیسے "صحیح الفکر" انسان کے ضمیر میں ہلکی سی خلش پیدا یا اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی ٹپکا نہیں سکتی!

ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ نکسن کو اس بات کا اعتراف ہے کہ جمہوریت کے اندر جو کچھ ہے وہ مایوس کن ہے۔ اور یہ جمہوریت باہر کی دنیا کے سامنے "انصاف کے ساتھ امن" کا جو منظر پیش کر رہی ہے وہ دنیائے انسانیت کے لئے دہشت ناک اور ہولناک ہے، لیکن نکسن کے لئے مایوس کن نہیں بلکہ بزعم خویش وہ دنیا کو امن اور انصاف کی برکات سے مستفید کر رہے ہیں!

شہرۂ آفاق مصنف ایلون ٹافلر، جس کی دانشوری کا اعتراف دنیا بھر کے حکمرانوں

مثلاً ریگن ، گورباچوف اور زہاؤ زیانگ نے کیا ہے' بڑی صاف گوئی سے کہتا ہے کہ دنیا کو آج جس تہذیب کا سامنا ہے وہ ہتھیاروں اور جنگ کی تہذیب ہے۔ پھر اس اعتبار سے وہ امریکہ کی غیر معمولی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے بڑے فخر سے لکھتا ہے :

"صدام نے بڑ ہانکی تھی کہ اتحادی ام المحارب (عراق کی جنگ) میں ریزہ ریزہ ہو کر پیوند خاک ہو جائیں گے۔ مغربی میڈیا کے پنڈتوں اور سیاست دانوں نے اس خیال کو خوب اچھالا اور اتحادیوں کے بہت زیادہ نقصانات کی پیش گوئیاں کیں۔ اور بعض لوگوں کا تو یہ اندازہ تھا کہ تیس ہزار آدمی قتل ہو جائیں گے اور بعض فوجی تجزیہ نگاروں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ لیکن عملاً کیا ہوا' صرف تین سو چالیس اشخاص (امریکی) کام آئے' یعنی قریباً ان تخمینوں کا سواں حصہ!"(۲۶)

وہ مزید لکھتا ہے :

"جنرل پیرے گیلاؤس (Gen. Pierre Gallois) نے یہ بات قلم بند کی ہے کہ امریکہ نے خلیجی جنگ میں پچاس ہزار فوجی بھیجے اور بیس ہزار ان کی پشت پناہی کرنے اور ساز و سامان مہیا کرنے پر مامور کئے تھے لیکن عملاً صرف دو ہزار سپاہیوں نے جنگ جیت لی۔"(۲۷)

ایلون ٹافلر نے اپنی کتاب "War and Antiwar" میں عسکری اعتبار سے امریکہ کی عالمی برتری کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امریکہ نے عراق میں دنیا کی پہلی "انفارمیشن وار" لڑی۔ اس نئی طرز جنگ نے دنیا کے تمام روائتی جنگی طور طریقوں کو متروک کر دیا ہے۔ عراق میں اس طریقہ جنگ کے مظاہرہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ کمپیوٹروں میں استعمال ہونے والا سلیکون کا ایک اونس ایک ٹن یورانیم پر فوقیت رکھتا ہے۔(۲۸)

حیاتیاتی طریقہ جنگ (Biological Warfare) میں امریکہ کی محیر العقول ترقی کا ذکر کرتے ہوئے ٹافلر لکھتا ہے کہ اس قسم کی جنگ لڑنے کے لئے ہتھیاروں میں امریکہ کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ دشمن کی افواج کو چشم زدن میں ایسی ایسی خوفناک بیماریوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہوش و حواس جواب دے جائیں' وہ اسہال کے مرض میں مبتلا ہو کر بالکل بے جان ہو کر رہ جائیں۔ صرف ایک کو زکام کی وبائی چھوت لگا کر پورے کے

پورے شہروں کو صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر وبائی لپیٹ میں لایا جا سکتا ہے جس سے ان کے ہوش و حواس مختل ہو جائیں اور وہ بالکل لاچار ہو جائیں۔ بعض ماہرین کا یہ اندازہ ہے کہ امریکہ کے پاس ایٹمی اسلحہ کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اس کے ذریعے پورے کرۂ ارض کو پینتیس مرتبہ مکمل طور پر تباہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تمام تر عسکری برتری کے باوجود امریکہ میں جو خوف و ہراس پایا جاتا ہے اس کا ایک عکس ایلون ٹافلر کی تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھئے :

"نپولین کی مثال' اگر کوئی اور مثال نہ بھی ہو' ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ طاقت و قوت کتنی ناپائیدار اور آنی جانی چیز ہے۔ ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کے روز' مشرق کی جانب آخری کناروں تک اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے بعد تین سال سے بھی کم عرصے میں' واٹرلو کی لڑائی میں اس کی ساری طاقت اور قوت تباہ و برباد ہو گئی اور فرانس کی "یک قطبی" آن بان اور اس کی حیثیت بطور "سپر پاور" ایک مختصر سی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ کیا امریکہ کو بھی اسی قسم کی صورت حال پیش آ سکتی ہے؟ کیا امریکہ کی یک قطبی شان و شوکت بھی تاریخ کی حدت میں سوختہ ہو کر ختم ہو جائے گی؟"(۲۹)

ایک طرف تو ایلون ٹافلر امریکہ کی عسکری برتری کا ایسا نقشہ کھینچتا ہے گویا ایسے تمام امکانات یکسر معدوم ہو گئے ہیں کہ دنیا کا کوئی ملک یا دنیا کی کوئی قوم امریکہ سے ٹکر لینے یا اس کے سامنے آنے کے بارے میں سوچنے کی بھی جرأت کر سکے اور دوسری طرف وہ اپنے دل میں جنگ سے اس قدر خوفزدہ ہے کہ اپنی کتاب "War and Antiwar" کا آغاز اور اختتام ٹراٹسکی کے اس جملے پر کرتا ہے :

"آپ چاہے جنگ میں دلچسپی نہ بھی رکھتے ہوں لیکن جنگ آپ میں ضرور دلچسپی رکھتی ہے"۔

یہی حال نکسن کا ہے۔ وہ ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں حقیقی معنوں میں امن اور انصاف قائم ہو چکا ہے' لیکن دوسری طرف وہ امریکیوں کے خوف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"دوسری جنگ عظیم کے خاتمے نے امریکی عوام میں جذبۂ تفاخر' اختراع اور

> مقصدیت کی چنگاریوں کو بھڑکا کر ملک کو پچاس سال تک (ترقی و تعمیر کی راہ پر) رواں دواں رکھا۔ لیکن اس کے برعکس سرد جنگ کے خاتمے نے امریکیوں کو ذہنی الجھاؤ اور مستقبل کے بارے میں خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا ہے"۔ (۳۰)

سوال یہ ہے کہ دنیا کی واحد عالمی طاقت بن جانے کے بعد امریکہ آخر خوفزدہ کس بات سے ہے؟ نکسن اس صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا واحد سبب "سرابِ آرزو" ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "کمیونزم کو شکست دینے کا کام قومی توانائیوں کو چاٹ جانے والا مشن تھا۔ اس کے پورے پورے معاوضے کی امیدیں قائم کرنا اور یہ توقعات وابستہ کرنا کہ کمیونزم کی شکست کے بعد حالات بہت بہتر اور امریکی آسودہ حال ہو جائیں گے، جائز اور بجا تھا۔ لیکن جب امریکی عظیم امن قائم ہونے کے باوجود اس سے متوقع فوائد حاصل کرنے میں بری طرح ناکام رہے تو اس کے منطقی نتیجے کے طور پر ان کے امیدوں بھرے سینے شق ہو گئے اور انہیں یہ احساس ہوا کہ عظیم امن تو درحقیقت ایک فریب عظیم ہے"۔ (۳۱)
>
> "پینتالیس سال تک امریکیوں کو عالمی امن کی موعودہ سرزمین کی طرف کبھی بہلا پھسلا کر اور کبھی جوش دلا کر ہانکا گیا اور اس سرزمین پر پہنچ کر ان پر منکشف ہوا کہ یہ تو ایک ایسی سیاسی دلدل ہے جس پر اس نئی تہذیب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی جس کا خواب عملاً پورا ہونے کی توقعات انہوں نے کمیونزم کی شکست کے ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں"۔ (۳۲)

شاید انسانی تاریخ کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ امریکی قوم فاتح عالم ہونے اور دنیا کی واحد سپرپاور ہونے کے باوجود عین عروج کے زمانے میں حوصلہ ہار چکی ہے اور مایوسی کا شکار ہے۔ اور جس ارضی جنت کی تلاش میں وہ آج سے پچاس سال پہلے نکلی تھی وہ اس کے لئے ایک سرابِ آرزو ثابت ہوا ہے۔

نکسن اپنی فاتح عالم مگر شکست خوردہ قوم کا حوصلہ بلند کرنے کی فکر میں صورت حالات کا تجزیہ کرتا ہوا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جمہوریت کی صورت میں آزادی کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ اندرون ملک مایوس کن ثابت ہوا اور پوری دنیا میں واحد

سپر طاقت بن جانے کے بعد دنیا میں قیام امن کا جو خواب دیکھا گیا تھا وہ بھی ساتھ ہی چکنا چور ہو گیا۔ چنانچہ جب وہ اپنی داخلی اور خارجی ناکامیوں کے اسباب تلاش کرتا ہے تو اسے داخلی ناکامیوں کے سلسلے میں بنیادی اور سب سے بڑی خرابی یہ نظر آتی ہے کہ ہر خرابی کی جڑ ان کے اپنے اندر پائی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے :

"آج جبکہ ہم حالت امن میں ہیں' جو چیلنج ہمیں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہم دنیا پر یہ ثابت کر دیں کہ ہم ورائے امن بھی اقوام عالم کی رہنمائی کی اہلیت اور عزم رکھتے ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارا دشمن ہمارے اندر موجود ہے کوئی غیر قوم نہیں"۔

اندر کے دشمن پر قابو پانے کے لئے وہ مذہب کی قوت کو بروئے کار لانے کا آرزو مند ہے اور وہ مذہب کو جمہوریت کے استحکام کے لئے ناگزیر خیال کرتا ہے۔ مشہور امریکی مورخ الیکسی ڈی ٹوکوول کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے ۔ (۴۳)

"آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے الیکسی ڈی ٹوکوول نے امریکی زندگی کے بارے میں نہایت بصیرت افروز باتیں کہی تھیں۔ اس نے خاص طور پر امریکی طرز زندگی' قانون' افکار' اخلاق اور قومی خودشناسی کے سلسلے میں مذہبی روایات کے بہت گہرے اور دیرپا اثرات کا ذکر کیا تھا۔ وہ دیگر تمام طریقہ ہائے حکومت کے معاملے میں جمہوری ریاستوں کے لئے مذہب کو بے حد اہم سمجھتا تھا کیونکہ مذہب ہی سے حسنات' مدنیت' اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس' جزائے اُخروی کے لئے ضبط نفس اور دوسروں کی خیر خواہی جیسے اعلیٰ اوصاف جنم لیتے ہیں جن پر جمہوریت کا زیادہ تر انحصار ہوتا ہے۔ نیز مذہبی عقائد ہی انسان کی " کاملیت بے پایاں" کے اس غرور کا تدارک کر سکتے ہیں جس کی طرف جمہوریتیں خاص طور پر لڑھک جانے کا میلان رکھتی ہیں"۔ (۴۴)

نکسن اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ حکومت لوگوں کے دلوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی لیکن مذہب کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ مذہب کی اہمیت کو واضح کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ الیکسی ڈی ٹوکوول کی بات ڈیڑھ سو سال پرانی بات ہے اس لئے شاید آج زیادہ قابل التفات نہ سمجھی جائے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ہمعصر کا قول

پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہے :

"امریکہ کی تجدید کے لئے ہمیں روحانی وسیلے سے کام لینا چاہئے۔ آج سے دو سال پہلے ہنری گرون والڈ نے کہا تھا کہ ہم مذہب کے اس نئے عہد کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں جب مذہب ہماری زندگیوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہو گا۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب' عیسائیت' یہودیت' اسلام اور بدھ مت نے روحانی اقدار پر زور دیا اور صدیوں تک انہیں متاثر کئے رکھا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کسی ایسی حقیقت پر ایمان رکھتا ہے جو اس سے عظیم تر ہو۔ دوستووسکی نے اپنی کتاب "The Possessed" میں سٹیفن ٹراموچ درخوونسکی کے منہ سے یہ بات کہلوائی ہے کہ حیات انسانی کا یہ ایک اہم تقاضا ہے کہ انسان کسی لامحدود ہستی کے سامنے سرنگوں رہنے کے قابل رہے۔ اگر انسانوں کو لامحدود ہستی (کے تصور) سے محروم کر دیا جائے تو وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں رہیں گے اور مایوسی سے مرجائیں گے"۔ (۳۵)

چنانچہ نکسن نے اپنی زندگی میں اپنی قوم کو بار بار تاکید کی کہ اگر وہ سیاست کی اصلاح چاہتے ہیں تو مذہب کے ذریعے اپنی روحانی اصلاح پر توجہ دیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :

"پچیس سال پہلے میں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا کہ ہمیں جس روحانی بحران کا سامنا ہے اس سے نمٹنے کے لئے روحانی حل کی ضرورت ہے۔ یہ بات آج بھی اتنی ہی درست ہے جتنی کہ اس وقت تھی۔"(۳۶)

اندرونی مسائل پر قابو پانے کے لئے جس روحانی اصلاح کی ضرورت ہے وہ تو شاید مذہب کی طرف رجوع کرنے سے کسی حد تک حاصل ہو جائے لیکن عالمی امن کے لئے جس قسم کا انسانیت پرور آفاقی اخلاق درکار ہے وہ کہاں سے آئے گا؟ نکسن جیسا شخص' جس کے خیالات پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے' انسانی اعتبار سے اتنا بے درد ہے کہ اس کا ضمیر عراق کے لاکھوں بے گناہ شہریوں' عورتوں' بچوں اور معذور بوڑھوں کے سفاکانہ قتل پر ذرا سی خلش بھی محسوس نہیں کرتا!!! بلکہ وہ کویت کی آزادی کا بہانہ بنا کر اور اسے اپنے جمہوری مقاصد کی پاسداری کا نام دے کر عراق میں ہر قسم کے ظلم و ستم اور انسانیت سوز بربریت کا جواز پیش کرتا ہے اور ضمیر کے کامل اطمینان سے بل سیغائر کا یہ

مقولہ دہراتا ہے :

"امریکہ کبھی ایسے مقصد کا دفاع اپنی جانوں سے نہیں کرے گا جس کا دفاع وہ اپنے ضمیر سے نہیں کرسکتا۔"(۳۷)

کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی ضمیر کسی غیر قوم کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کے قتل کا دفاع پیش کر سکے؟ مگر نکسن نے ایسا کیا ہے اور بقول علامہ اقبال یہ ایک فساد زدہ خودی (Perverted ego) کی علامت ہے۔ ان کے خیال میں اس فساد کا آغاز یورپ میں لوتھر کی مذہبی اصلاح کی تحریک سے ہوا تھا جس میں عیسائیت کے آفاقی اخلاق کو قومی اخلاق نے بے دخل کر دیا۔(۳۸) چنانچہ یورپ کی فساد زدہ خودیاں باہم دگر حریف جمہوریتوں کی شکل میں دولت مندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھین کر اپنے تقاضے پورے کرتی رہیں۔ امریکہ ایک الگ تھلگ ملک ہونے کی حیثیت سے جمہوریت کے ان اثرات بد سے بچا ہوا تھا۔ نیز شروع شروع میں جن عظیم شخصیات نے امریکہ میں جمہوریت کی آبیاری کی اور اسے نشوونما دی وہ انسانیت دوست لوگ تھے لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جب عالمی سیاست میں امریکہ نے سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تو قوم پرستی انسان دوستی پر غالب آنے لگی اور امریکی قوم کی خودی بھی فساد زدہ ہو گئی' اور امریکہ میں اگرچہ مذہب سے بیزاری کا ابھی وہ رجحان پیدا نہیں ہوا جو یورپ میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا لیکن انسانیت پرور اخلاق پر قوم پرور اخلاق کو بالادستی مل جانے کی وجہ سے ایسے غیر انسانی مذہبی رویے پیدا ہو گئے ہیں کہ نکسن جیسے مذہب پرست انسان کا ضمیر بھی خلیجی جنگ میں ہونے والے انسانیت سوز مظالم کا دفاع پیش کرتا ہے!

آج امریکہ دنیا میں جمہوریت کا سب سے بڑا چیمپئن ہے۔ لیکن اس جمہوریت نے امریکہ کو کیا دیا ہے؟ خود نکسن کے اپنے الفاظ میں "اندر جو کچھ ہے مایوس کن ہے" لیکن اسے چھوڑنا اس لئے ممکن نہیں کہ اس سے نکلنے کے بعد کہیں آزادی کا "دروازہ بند نہ ہو جائے"۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ امریکی معاشرہ ڈرا ڈرا اور سہما سہما ہے اور امامت عالم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ آخر کیوں؟

امریکہ کو جان لینا چاہیئے کہ دنیا میں قیام "امن" کے لئے جس نئے عالمی نظام کا

خواب وہ دیکھ رہا ہے وہ محض فوجی طاقت کے بل بوتے پر قائم نہیں کیا جاسکتا' نہ ہی مختلف اقوام اور ممالک کو معاشی پابندیوں کی بیڑیوں میں جکڑ کر کوئی پائیدار امن یا مستحکم عالمی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔ مجرم ضمیری اور دلوں کا خوف و ہراس ان عظیم مقاصد کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور نکسن اور ایلون ٹافلر کی تحریریں اسی مایوسی کی آئینہ دار ہیں۔

شاید وہ وقت قریب آلگا ہے کہ عالمی مدبرین اسلام کی تہذیب آفریں' انسانیت پرور اور وحدت خیز قوت پر توجہ دیں۔ اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ عالمی مدبرین کی توجہ اس طرف مبذول ہو رہی ہے۔ نکسن اپنی کتاب "Seize the Moment" میں واضح طور پر مسلم تہذیب کی برتری کا قائل نظر آتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"اگرچہ مسلم دنیا سیاسی ارتقاء میں مغرب سے پیچھے ہے (اس وقت دو مسلمان ملکوں میں جمہوری حکومتیں قائم ہیں) ہماری تہذیب ان کی تہذیب سے خلقی اور فطری اعتبار سے ہرگز برتر نہیں۔ کیمونزم کی اپیل کا مقابلہ کرنے میں مسلم دنیا مغربی اقوام سے زیادہ سخت جان اور قوی ثابت ہوئی۔ اور مغرب کی مادیت اور اخلاقی مداہنت (جنسی اباحیت) کو رد کرنے میں اس تہذیب نے جس استقامت کا ثبوت دیا وہ مسلمانوں کے حق میں جاتی ہے"۔ (٣٩)

اسی طرح برطانوی شہزادہ چارلس (پرنس آف ویلز) کھلم کھلا اعتراف کرتا ہے کہ :

"اسلام ہمارے (یعنی اہل مغرب کے) ماضی اور حال کی تمام انسانی جدوجہد اور سرگرمیوں میں حصہ دار رہا ہے۔ اسی کی مدد کی بدولت ہم نے جدید یورپ تخلیق کیا۔ یہ ہماری اپنی وراثت کا ایک لازمی حصہ ہے' اس سے الگ چیز نہیں.... اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ یہ ہمیں آج کی دنیا کو سمجھنے اور اس میں زندگی بسر کرنے کیلئے ایک ایسے طریقہ کی تعلیم دے سکتا ہے جسے کھو کر عیسائیت افلاس زدہ اور پسماندہ ہو گئی ہے"(٤٠)

تمام مغربی ممالک آج لادینی جمہوریت کے جس عذاب میں مبتلا ہیں اس کے بارے میں علامہ اقبال نے اہل مغرب کو پون صدی پیشتر ہی متنبہ کر دیا تھا ۔

زمن دہ اہل مغرب را پیامے
کہ جمہور است تیغ بے نیامے
چہ شمشیرے کہ جانہا می ستاند
تمیزِ مسلم و کافر نداند
نہ ماند در غلافِ خود زمانے
برد جانے خود و جانِ جہانے (۴۱)

(میری طرف سے اہل مغرب کو یہ پیغام دو کہ جمہوریت ایک ایسی تیغ بے نیام ہے جو ہر ایک کی جان نکال لیتی ہے' اسے مسلم و کافر کی تمیز نہیں۔ یہ کسی بھی وقت نیام میں نہیں رہتی' اپنی جان بھی گنواتی ہے اور دنیا جہان کی جان بھی۔)

می کند بند غلاماں پختہ تر
حریت می خواند او را بے بصر
گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید
پردہ بر روئے ملوکیت کشید (۴۲)

(سیاسیات حاضرہ یعنی جمہوری سیاست غلاموں کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط بناتی ہے لیکن بے بصیرت لوگ اسے آزادی کا نام دیتے ہیں۔ حقیقت فقط اتنی ہے کہ لوگوں میں جمہوریت کا غلغلہ دیکھ کر ملوکیت پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔)

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ (۴۳)

(فرنگی جمہوریت پر افسوس کہ اس کی بانگ صور سے مردہ اور بھی زیادہ مردہ ہو گیا)

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (۴۴)
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری (۴۵)

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (۴۶)

مغربی مفکر اور دانشور لادینی جمہوری تہذیب سے مایوس ہو کر اسلام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس کی پیش بینی کرتے ہوئے کہا تھا :

"آج کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے مقام (اور اپنی حیثیت) کا احساس کرے اور اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی معاشرتی زندگی کی از سرنو تعمیر کرے اور دنیا پر اسلامی مقصود کی جزوی تکمیل جو ظاہر ہوئی ہے اسے ترقی دے کر "روحانی جمہوریت" تک لے جائے جو اسلام کا منتہائے مقصود ہے"۔ (۴۷)

کتابیات

(1) *Ali Mazrui, The American Journal of Islamic Social Sciences (Vol 10, No 4) International Institute of Islamic Thought, Washington DC, 1993*

(2) *Alvin Toffler War and Antiwar, Warner Books, A Division of Little Brown And Company, London, 1994*

(3) *Prince Of Wales, The American journal of Islamic Social (Vol 10 No.4) International Institute of Islamic Thought, Washington DC, 1993*

(4) *Muhammad Iqbal, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, (Ed Saeed Shaikh) Institute of Islamic Culture, Abbot Road, Lahore, 1984*

(5) *Ramsey Clarke, Impact International (Vol 25, No 9 Sept 1995) News and Media, Seven Sisters Road, London N4 BL UK, 1995*

(6) *Richard Nixon, Beyound Peace, Random House, New York, 1994*

(7) *Richard Nixon, Seize the Moment, Simon and Schuster, Rockefeller Centre, 1230 Avenue, New York, 1992*

(8) محمد اقبال' کلیات اقبال(فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1973ء

(9) محمد اقبال' کلیات اقبال(اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1973ء

حوالہ جات

(صفحہ نمبر سے پہلے کتابیات کی کتاب کا نمبر دیا گیا ہے)

(۱) ۶ ص ۲۲۰ (۲) ۶ ص ۲۱۹ (۳) ۶ ص ۲۱۹
(۴) ۶ ص ۲۱۳ (۵) ۶ ص ۲۱۳ (۶) ۶ ص ۲۱۷۔۲۱۸
(۷) ۶ ص ۲۲۹ (۸) ۶ ص ۲۲۸۔۲۲۹ (۹) ۶ ص ۲۲۹
(۱۰) ۶ ص ۲۳۵ (۱۱) ۶ ص ۲۲۴ (۱۲) ۶ ص ۲۲۴
(۱۳) ۶ ص ۲۲۴ (۱۴) ۶ ص ۲۲۱ (۱۵) ۶ ص ۲۳۱
(۱۶) ۶ ص ۲۳۲ (۱۷) ۶ ص ۲۳۲ (۱۸) ۶ ص ۲۴۹
(۱۹) ۶ ص ۵۱۴ (۲۰) ۶ ص ۴ (۲۱) ۶ ص ۳۷
(۲۲) ۶ ص ۳۹ (۲۳) ۶ ص ۳۷ (۲۴) ۵ ص ۱۷
(۲۵) ۵ ص ۱۷ (۲۶) ۲ ص ۸۰ (۲۷) ۲ ص ۹۶
(۲۸) ۲ ص ۸۶ (۲۹) ۲ ص ۲۳۸ (۳۰) ۶ ص ۲۴۳
(۳۱) ۶ ص ۲۴۳ (۳۲) ۶ ص ۲۴۳ (۳۳) ۶ ص ۲۴۵
(۳۴) ۶ ص ۴۷ (۳۵) ۶ ص ۲۳۷ (۳۶) ۶ ص ۱۷۴
(۳۷) ۶ ص ۳۸ (۳۸) ۴ ص ۱۲۹ (۳۹) ۷ ص ۲۳۰
(۴۰) ۳ ص ۴۰ (۴۱) ۸ ص ۵۶۰ (۴۲) ۸ ص ۸۳۱
(۴۳) ۸ ص ۶۶۰ (۴۴) ۹ ص ۶۶۰ (۴۵) ۹ ص ۲۶۱
(۴۶) ۹ ص ۳۲ (۴۷) ۹ ص ۱۲۴

حضرت امام شاملؒ کا تابناک کردار

اظہار احمد قریشی

میں خوش قسمت ہوں کہ برخوردار عزیزم عاکف سعید نے مجھے حضرت امام شاملؒ پر ایک یہودی جناب موشے گامر کی ایک اور عمدہ اور جدید کتاب امریکہ سے لا کر دی۔ خداوند کریم کی اس امداد کے لئے میں یہی کہہ سکتا ہوں ؏ اک بندۂ عاصی کی اور اتنی مدارائیں! چنانچہ اب میرے پاس اس سے قبل کی Lesley Blanch کی کتاب سمیت غیر مسلموں کی لکھی ہوئی دو کتابیں ہیں' جن سے میں امام صاحب کی ذات اور ان کے کارناموں کے متعلق مواد لے رہا ہوں۔ یہ مواد پوری طرح چھان پھٹک کر مصدقہ ہے۔ لیسلے بلانچ کی کتاب کے صفحہ ۳۵۷ پر لکھا ہے کہ :

> "حضرت امام شاملؒ کی ذاتی زندگی میں کوئی عیب نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں میں جمہوری اصول کار فرما تھے۔ چنانچہ عوام اپنے امام پر نہ صرف تنقید کر سکتے تھے بلکہ اسے ناکارہ تک قرار دے سکتے تھے"۔

اس کے علاوہ لیسلے بلانچ صاحبہ نے حضرت امام شاملؒ کی درجنوں جگہ پر بہت تعریف کی ہے' جسے میری کتاب "حضرت امام شاملؒ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جناب موشے گامر اپنی کتاب کے باب نمبر ۲۲ میں لکھتے ہیں :

☆ "بعض روسی لکھنے والے جو یہ کہتے ہیں کہ امام شاملؒ شریعت کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے' یہ بالکل غلط ہے ... درحقیقت امام صاحب ایک نیک اور پرہیز گار مسلمان تھے جن کا اسلامی قانون اور اسلامی طرزِ زندگی پر پورا پورا ایمان تھا اور ان کے تمام اعمال ان کے اعتقادات پر اور ان کی فرض شناسی پر مبنی ہوتے تھے"۔

☆ "مسلمان علماء کی پُرجوش اور ہمہ وقت تائید جو امام صاحب کو حاصل تھی یہ ہرگز امام

صاحب کے اقتدار اور اختیار کے بل پر نہیں تھی' بلکہ اس کا سبب ان علماء کا امام صاحب کے نظریات سے کلی اتفاق اور امام صاحب پر مکمل اعتماد تھا اور یہ سب کچھ امام صاحب کے شریعت پر چلنے اور بے داغ زندگی گزارنے کی وجہ سے تھا"۔

☆ "امام صاحب خود ایک بڑے عالم اور صوفی شیخ تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ امام صاحب علماء کی عزت کرتے تھے اور وہ اپنے ہم خیالوں کو یہ یقین کرانے میں کامیاب تھے کہ جملہ معاملات کے فیصلوں میں ان کا بھی دخل ہے۔ چنانچہ علماء سے نہ صرف شرعی امور میں رائے لی جاتی تھی بلکہ وہ ایسے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے تھے جن میں پالیسی اور جنگی حکمت عملی پر بھی بحث اور فیصلے ہوتے تھے"۔

☆ "جناب امام شامل اپنے مرشد جمال الدین صاحب کے ساری عمر تابع فرمان رہے اور اپنی حکومت کے سارے زمانے میں وہ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ یہ امر باعث حیرت ہے' کیونکہ کسی صاحب اقتدار کا خود کو مسلسل اپنے مرشد کی فرمانبرداری اور تابعداری میں رکھنا' مرید اور مرشد دونوں کی اعلیٰ ظرفی اور پختہ کردار کا بین ثبوت ہے"۔

☆ "امام شامل" اپنے مرشد جمال الدین صاحب کی ہر خواہش کو اپنے لئے حکم سمجھتے تھے۔ ۱۸۴۲ء میں امام صاحب نے غازی غموق پر حملہ کیا کیونکہ انہیں خیال ہوا کہ یہ جمال الدین صاحب کی خواہش ہے۔ ایک سال بعد امام صاحب نے "دیوان" قائم کر دیا کیونکہ یہ بھی جمال الدین صاحب کا مشورہ تھا۔ اس کے علاوہ روسی قیدیوں کو رہا کرنے یا نہ کرنے کے متعلق بھی امام صاحب اپنے مرشد کی ہدایت پر عمل کرتے تھے"۔

☆ "جناب مرشد' امام صاحب کے راستہ میں رکاوٹ نہیں تھے بلکہ ان کے مشورے بڑے عقلمندی پر مبنی ہوتے تھے' جن سے امام صاحب کو بڑا فائدہ ہوتا تھا۔ جمال الدین صاحب اپنی تقاریر اور اپنے خطوط میں عوام پر زور دیتے تھے کہ وہ امام صاحب کا کہنا مانیں اور ان کی پیروی کریں۔ اس کے علاوہ جمال الدین صاحب مقامی

حکمرانوں سے اپنے تعلقات کو امام صاحب کے حق میں استعمال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے امام صاحب سے مل کر سلطنت عثمانی سے اپنے ہاں کے جہاد کے لئے مدد حاصل کرنے کی بھی کوشش کی"۔

☆ "جمال الدین صاحب کی تائید کی وجہ سے امام صاحب کی عزت اور قوت بہت بڑھ گئی اور امام صاحب نے اس کو پورا پورا استعمال کیا۔ البتہ امام صاحب کے پاس عزت اور قوت کا ایک اور سرچشمہ بھی تھا۔ وہ یہ کہ وہ خود بھی صوفی شیخ تھے اور اپنے مرشد کے بعد انہی کا درجہ تھا"۔

☆ "امام صاحب مقامی حکمرانوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات ان کے متعلق اپنے تلخ جذبات کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ لیکن ان کا یہ رویہ اس لئے تھا کہ یہ حکمران شریعت پر عمل کرنے اور روسیوں کے خلاف جہاد میں شامل ہونے سے انکار کرتے تھے لیکن جو حکمران یا ان کے خاندان کے لوگ امام صاحب کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے انہیں پوری پوری عزت دی جاتی تھی اور انہیں اہم عہدے دیئے جاتے تھے۔ تاہم امام صاحب حکمرانوں کے بارے میں ذاتی ناپسندیدگی کے باوجود تقریباً تمام حکمرانوں سے معمول کے تعلقات قائم رکھتے تھے"۔

☆ "امام صاحب نے Serfdom یعنی نیم غلامی کی حیثیت ختم کر دی۔ یہ حیثیت چار دیہات کی آبادی کی تھی جو آوارستان کے سابقہ خوانین کے تھے۔ اسی طرح روسی قیدیوں کی بھی (جو مسلمان ہو جاتے تھے) نیم غلاموں کی حیثیت ختم کر دی جاتی۔ امام صاحب روسی علاقے کے مسلمان مالکوں کے بھاگے ہوئے نیم غلاموں کو پناہ دیتے تھے اور انہیں ان کے مسلمان مالکوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ البتہ نیم غلاموں کی آزادی عمومی نہیں تھی۔ مذکورہ بالا چار دیہات کے لوگوں پر ٹیکس کا بوجھ وہی سابقہ ہی رہا۔ فرق یہ واقع ہوا کہ جو رقم یہ لوگ آوارستان کے خان کو دیتے تھے وہ اب بیت المال کو ادا کرنے لگے"۔

☆ "امام صاحب عوام سے اہم معاملات میں مسلسل رابطہ رکھتے تھے۔ امام صاحب

خطوط اور اعلانات بھیجتے تھے جو سب لوگوں کے سامنے پڑھے جاتے تھے۔ وہ ان میں فتوحات کا اور آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے تھے' ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انہیں ثابت قدمی کی تلقین کرتے تھے۔ خاص مواقع پر امام صاحب لوگوں کے نمائندوں سے ملتے تھے اور ان سے مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ اپنی حکمرانی کے آخری سالوں میں بھی' جبکہ امام صاحب کا عوام اور ان کے مسائل سے رابطہ کم ہو گیا تھا' وہ اس قسم کے اجلاس بلاتے رہتے تھے"۔

☆ "ایک روسی ذریعہ کا کہنا ہے کہ امام شامل" بڑے باتدبیر شخص تھے اور سیاست کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام صاحب کا کوئی ماتحت اگر عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتا تھا تو' جیسا کہ اکثر حکمرانوں کا طریقہ ہے' امام صاحب اپنے اس ماتحت پر شک و شبہ نہیں کرتے تھے' بلکہ اپنے اس ماتحت کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح عوامی احساسات کی قدر کرتے تھے"۔

☆ "امام صاحب کے سسٹم میں مساوات بہت تھی اور یہ اسلام ہی کے مزاج کے مطابق تھی۔ اصولی طور پر کسی غریب ترین شخص کے لئے اونچی سے اونچی پوزیشن تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی بشرطیکہ اس میں قابلیت' اخلاص' محنت اور رامنگ موجود ہو۔ عملی طور پر تو صرف ایک نائب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بہت غریب خاندان سے تھا' لیکن امام شامل کے نقطۂ نظر سے اس اصول کی بڑی عملی اہمیت تھی"۔

☆ "پہاڑی لوگوں کی بہت بڑی اکثریت نے خصوصاً چیچن لوگوں نے امام صاحب کا آخری وقت تک ساتھ دیا اور ایسا کرنے میں بہت زیادہ تکالیف برداشت کیں۔ انہیں اپنے گھربار اور کھیت چھوڑنے پڑے اور سنگلاخ پہاڑوں میں جانا پڑا۔ جب بالکل ہی مجبور ہو گئے تب وہ روسیوں کے ساتھ ملے۔

☆ لوگوں کی یہ ثابت قدمی اور یہ کارنامے اس وجہ سے نہیں تھے کہ امام صاحب بہت طاقتور تھے اور آبادی پر ان کا بڑا مضبوط کنٹرول تھا اور نہ یہ وجہ کافی تھی کہ لوگوں

کو روسیوں سے نفرت تھی۔ اصل وجہ امام صاحب کی رہنما کی حیثیت میں ایک مقناطیسی شخصیت تھی اور ان کے پاس بہت سارے ذرائع تھے جن کو کام میں لا کر وہ پہاڑی لوگوں میں وفاداری اور اطاعت کا جذبہ پیدا کر سکتے تھے۔ ان ذرائع میں ایک اہم حیثیت ان کے بے لاگ اور فوری انصاف کی تھی"۔

☆ "امام صاحب ایک مضبوط اور سخت گیر حکمران تھے لیکن وہ بے لاگ انصاف کرنے والے تھے۔ ہر شخص کی شکایت پر کارروائی ہوتی تھی' چاہے بڑے سے بڑے افسروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو"۔

حیرتناک حقیقت نگاری

میں لیسلے بلانچ صاحبہ اور جناب موشے گامر کی قطعی غیر جانبداری اور حقیقت کے واشگاف اظہار کا اعتراف کرتا ہوں۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ ان لوگوں نے مسلمانوں کے امام صاحب کے خلاف مذہبی تعصب کا قطعاً مظاہرہ نہیں کیا اور ایک طالب علم اور طالب حقیقت کے روپ میں نہایت منصفانہ اور قابل قدر تحقیق کر کے لکھا۔ جس شخص نے تیس سال تک غیر مسلموں سے جنگ کی اور دشمن کے پانچ لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اتارے' ان مصنفین نے کمال صاف گوئی سے اس کے متعلق لکھا ہے کہ :

"وہ ایک بے داغ کردار کا انسان تھا۔ وہ ایک نیک اور پرہیزگار مسلمان تھا جس کا اسلامی شریعت پر ایمان تھا اور وہ اس پر عمل کرتا تھا۔ وہ ایک مقناطیسی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے دلوں پر حکمران ہونے کے باوجود اپنے مرشد کے سامنے بچھا رہتا تھا"۔

اُمت مسلمہ کے لئے سبق

امت مسلمہ اپنے اس نامور ہیرو کے ایسے تابناک کردار پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ میں دنیا کی تاریخ سے تو واقف نہیں ہوں' لیکن میرا وجدان ہے کہ اس قسم کے صاف ستھرے' پاکیزہ اور پاکباز عظیم انسان جو سیاست اور اقتدار کی پر خار وادیوں میں اپنے

دامن کردار کو میلا نہ ہونے دیں صرف امت مسلمہ میں ہی ہو سکتے ہیں' جہاں قرآن مجید کی صداقت کے ثبوت میں جناب نبی کریم ﷺ کا کردار ہی پیش کیا گیا تھا اور یہی کردار امت کے لئے واجب التقلید قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے بڑے بڑے ہیرو اپنے سامنے وہی مثال رکھتے ہیں' ہمارے پاس ان حضرات کا کردار بھی اسلام کی حقانیت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

میں نے یہاں تک ہی لکھا تھا کہ میرے محترم عزیز فرخ زمان صاحب نے ۷۱۔۱۹۷۰ء کا ایک واقعہ سنایا کہ وہ اُس زمانے میں امریکن یونیورسٹی بیروت میں پڑھ رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے وہاں کے تاریخ کے استاد لبنانی عیسائی پروفیسر "کے صلیبی" کو کلاس روم میں غازی صلاح الدین کی بے حد تعریف کرتے سنا۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ غازی صلاح الدین ایوبی میرے (یعنی پروفیسر صاحب کے) ہیرو ہیں اور وہ اپنے زمانے کے بھی بہت بڑے ہیرو تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سلطان ایوبی عام بشری کمزوریوں سے مبرا' انتہائی بلند کردار انسان تھے۔ وہ ایک عظیم فاتح اور ایک مطلق العنان حکمران تھے لیکن بطور فاتح یا حاکم بھی ان کا حلم و تدبر' منصف مزاجی اور مذہبی رواداری انہیں اس عہد کی نامور تاریخی شخصیات میں ممتاز ترین پوزیشن دیتی ہے۔

لیجئے میری تحریر کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ایک مزید بلند کردار مسلم ہیرو سامنے آگئے اور میرا وجدان صحیح ثابت ہوا کہ ایسے پاکباز بڑے لوگ صرف مسلمانوں میں ہی ہو سکتے ہیں۔ البتہ ہمیں اپنے ہیروز کی تاریخ پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انصاف اور سچائی پسند غیر مسلموں کا لکھا ہمارے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس امت سے باہر کے بڑے بڑے ذی اقتدار لوگوں میں سے اکثر شراب' عورت' جھوٹ' مکر و فریب' لالچ اور ریاء جیسی تمام خرابیوں میں ملوث ہیں۔ جن میں یہ تمام خرابیاں نہ پائی جاتی ہوں ان میں بھی چند خرابیوں کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ بحیثیت انسان ان کا قد بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

پاکستان کے جو لوگ اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظام کے قیام کے خواہش مند ہیں یا اس مقصد کے لئے کوشاں ہیں ان کو اپنے سامنے ذاتی کردار کا مندرجہ بالا مطلوبہ

معیار رکھنا چاہئے اور اسے حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔ پاکستان کے روز افزوں مصائب کا حل شریعت اسلامی کے نفاذ اور عوام' خاص طور پر با اثر لوگوں اور صاحبان اقتدار کے باکردار ہونے میں ہے۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ خداوند تعالٰی ہم سب کو ان دونوں کی توفیق عطا کرے' آمین ثم آمین!

بقیہ : علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم

اب فوج علماء اور امریکہ کی مدد سے شاہ ملک میں واپس آگیا۔ تہران کے ہوائی اڈہ پر شاہ کا استقبال کرنے والوں میں حضرت آیت اللہ بروجردی بھی موجود تھے۔ ۱۸/ اگست ۱۹۵۳ء کو تہران میں غنڈوں کے غول داخل ہو گئے اور جنرل زاہدی نے ٹینکوں اور توپوں کی مدد سے تہران پر قبضہ کرلیا اور مصدق گرفتار ہوگیا۔ اس تمام عمل پر امریکہ کی سی آئی اے کا کل خرچ تین لاکھ نوے ہزار ڈالر اٹھا۔

اس موقع پر بھی علماء کا کردار مشکوک نظر آتا ہے کیونکہ پہلوی بادشاہت کو اقتدار کی بازیابی میں ان کی ہمدردیاں ایک بار پھر شاہ کے ساتھ تھیں۔ (جاری ہے)

ضرورت رشتہ

جٹ برادری سے تعلق رکھنے والے ۳۱ سالہ بی ایس سی الیکٹریکل انجینئر' ماہانہ آمدنی 15000 روپے' شاہدرہ کے رہائشی کے لئے دینی گھرانے سے موزوں رشتہ درکار ہے۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔

رابطہ ۔ نعیم اختر عدنان' 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

رفیق تنظیم کی ہمشیرہ کے لئے جس کی عمر ۲۸ سال اور خلع یافتہ ہے' موزوں رشتہ درکار ہے۔ تعلیم ایف اے اور فاضلہ قاریہ' مدرسۃ البنات جامعہ صدیقیہ گجرات سے فارغ التحصیل ہے۔

رابطہ کے لئے : ابو عمران' دفتر تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب شمالی

۴۴۔بی حسنین مارکیٹ' سیٹلائٹ ٹاؤن بالمقابل جنرل ہسپتال' مری روڈ راولپنڈی

حالات حاضرہ

امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ کے پریس ریلیز

○

سی ٹی بی ٹی میں شمولیت ایٹمی صلاحیت سے دستبرداری کے مترادف ہے

۱۱ ستمبر= حالات و واقعات کی ترتیب سے اس شبہے کو تقویت ملتی ہے کہ شہباز شریف کے دورۂ امریکہ کے دوران سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حوالے سے سب کچھ طے پا چکا تھا اور اب قومی اسمبلی اور سینٹ میں بحث کے ذریعے محض "لیپا پوتی" کی جا رہی ہے۔ یہ بات امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل اپنے خطاب میں کہی۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کا حکم ہے کہ دشمن کے مقابلے کیلئے زیادہ سے زیادہ جنگی قوت اور سامان حرب فراہم کرو۔ سی ٹی بی ٹی میں شمولیت اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی صریح خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ خداداد ایٹمی صلاحیت کی ناشکری کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ ایٹمی صلاحیت اندرون ملک سائنسی اور ایٹمی ٹیکنالوجی کی ترقی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک خاص وسیلے سے اللہ نے یہ صلاحیت پاکستان کو عطا فرمادی تھی اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا حکومتی فیصلہ درحقیقت کامیاب ایٹمی تجربات کرنے کے "جرم" پر سجدۂ سہو کے مترادف ہوگا۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ حکومتی حلقوں کی جانب سے پھیلایا جانے والا یہ تاثر نہایت مغالطہ آمیز ہی نہیں انتہائی مضحکہ خیز بھی ہے کہ سی ٹی بی ٹی میں شمولیت کے بعد ہم جب چاہیں اس معاہدے سے نکل سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس میں شمولیت کیلئے عالمی طاقتوں کا اس قدر دباؤ ہم پر ہے تو اس سے نکلنا کیونکر ممکن ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ دنیا کے واحد اسلامی ملک کی ایٹمی صلاحیت کا قلع قمع کرنا یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ ہنود کی بھی دلی تمنا اور اولین خواہش ہے۔ انہوں نے کہا سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنا ملی و قومی اعتبار سے حکومت کی بہت بڑی غلطی قرار پائے گا۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسے جال میں بتدریج پھنسنے کے مترادف ہے کہ جس کا نتیجہ بالآخر ایٹمی صلاحیت سے دست کش ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حوالے سے حکومت نے اپنے سابقہ موقف میں مسلسل پسپائی اختیار کی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ہم محض تین لاکھ ڈالر کی امداد کے عوض ملک و ملت کا سودا کرنے کیلئے تیار ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس امر پر گہرے تاسف کا اظہار کیا کہ وہ حکومت جو فارن کرنسی اکاؤنٹس میں جمع شدہ گیارہ ملین ڈالر کی رقوم بغیر ڈکار لئے ہڑپ کر گئی وہ اب آئی ایم ایف کی محض تین ملین ڈالر کی قسط کے عوض پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا سودا کر کے "قومے فروختند چہ ارزاں

فروختند" کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے لندن سے شائع ہونے والے ایک جریدے کے حوالے سے یہ تلخ سوال بھی حکومت کے سامنے رکھا کہ ایٹمی صلاحیت کو معمولی سی رقم کے عوض فروخت کرنے کے بعد ہمارے پاس اور کونسی چیز فروخت کرنے کیلئے باقی رہ جائے گی! انہوں نے کہا کہ کشکول توڑنے اور خود انحصاری کے بلند بانگ دعووں کے باوجود مسلسل سودی قرضوں پر انحصار کی پالیسی اپنانے سے ملک کی آزادی و خود مختاری عالمی مالیاتی اداروں کے پاس گروی رکھی جا چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تین ملین ڈالر کی یہ متوقع قسط ہمارے لئے قرض کے اس بوجھ میں مزید اضافے کے باعث بنے گی جو ملکی معیشت کیلئے پہلے ہی ناقابل برداشت حد تک بڑھ چکا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ حکومت کے نزدیک ڈیفالٹر قرار پانا ہی شاید وہ "کبیرہ گناہ" ہے کہ جس سے ہر قیمت پر بچنا ضروری ہے خواہ اس کیلئے ملکی سالمیت کو داؤ پر لگا دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سودی نظام کو ختم کئے بغیر قرضوں میں جکڑے ہوئے پاکستان کو عالمی مالیاتی استعمار کے چنگل سے نکالا نہیں جا سکتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ میرے ساتھ ملاقات کے موقع پر وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے ایک سال میں سود کے خاتمہ کا یقین دلایا تھا مگر ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود سودی نظام کے خاتمے کے آثار نظر نہیں آتے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وزیر اعظم کے حکم پر راجہ ظفر الحق کی سربراہی میں قائم کردہ انسداد سود کمیشن کی سفارشات کو بھی عملی جامہ پہنانے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے سی ٹی بی ٹی پر بے نظیر کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ سے اظہارِ وفاداری اور نیاز مندی کے حصول میں بے نظیر اور نواز شریف ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبہ کے ضمن میں لازماً اہم کردار ادا کرے گا مگر اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک میں ہم بحیثیت قوم تاحال اسلامی احکامات پر عمل کرنے کیلئے تیار نہیں۔

ہمارے معاشی بحران کا واحد حل بیرونی قرضوں کی واپسی سے انکار ہے

۱۸ ستمبر۔ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کیلئے ہم پر امریکہ کی جانب سے ڈالا جانے والا شدید دباؤ دراصل نیو ورلڈ آرڈر کا حصہ ہے اور ہم اس کے آگے اس لئے بے بس ہیں کہ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک ہماری ہر حکومت کی خارجہ پالیسی کا مرکز و محور یہی نکتہ رہا کہ ہر قیمت پر امریکہ کی حمایت حاصل کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی میدان میں غلط حکمت عملی اختیار کرنے اور بیرونی قرضوں کو اللوں تللوں میں اڑانے کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری جان شکنجے میں آئی ہوئی ہے۔ ہم سودی قرضوں پر ملنے والی بیرونی امداد کے جال میں اس طرح پھنس چکے ہیں کہ ہر سال سود کی قسط ادا کرنے اور ڈیفالٹر ہونے سے بچنے کیلئے مزید

قرض کی بھیک مانگنا ہماری مجبوری بن چکا ہے۔ لیکن اس بھیک کی بدولت جو امداد ملتی ہے اس سے نہ صرف یہ کہ بیرونی قرضوں کا بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے بلکہ اگلے سال سود کی ادائیگی بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ یہ بات امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے جمعہ سے قبل اپنے خطاب میں کہی۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمہ وقت کشکول ہاتھ میں لے کر ترقی یافتہ ممالک یا ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف سے قرض کے حصول کیلئے خوشامد کرنے اور بھیک مانگتے پھرنے سے کہیں بہتر ہیں کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ ہم بالفعل دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری معاشی بدحالی کے حوالے سے ہی ہمیں سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے اور امریکہ کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا اصل سبب ہمارا یہی معاشی بحران ہے۔ اس کا حل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم جرأت سے کام لے کر بیرونی قرضے واپس کرنے سے انکار کر دیں اور صاف کہہ دیں کہ ہمارے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے اور ساتھ ہی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے معاملے میں بھی صاف جواب دے دیں کہ یہ معاہدہ چونکہ ہمارے ملکی و قومی مفادات کے خلاف ہے لہٰذا ہم تمہارے دباؤ میں آکر دستخط نہیں کریں گے۔ اس کے بعد ہم جرأت و ہمت کے ساتھ اللہ کی نصرت کے بھروسے پر معاشی پابندیوں کا مقابلہ کرنا اور ملکی وسائل پر انحصار کرنا ہو گا تاکہ ملکی معیشت کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا جاسکے۔ بصورت دیگر ہماری سسکتی ہوئی ملکی معیشت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جائے گی اور ہم عالمی مالیاتی اداروں کے زر خرید غلام اور نیو ورلڈ آرڈر کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائیں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ سودی قرضوں کی ادائیگی سے انکار کے نتیجے میں دو چار برس سختی کے ضرور آئیں گے لیکن اس کے بعد پھر ہم معاشی طور پر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور کشکول کو فی الواقع توڑ پھینکنے کے قابل ہو سکیں گے۔ ورنہ مسلسل قرض کی بھیک مانگتے رہنا اور عالمی طاقتوں کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہنا ہمارا مقدر رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی میں پاکستان کیلئے اسلام کے عالمی غلبے کے حوالے سے مستقبل میں ایک خاص کردار معین ہے لیکن ہم کم مسلسل کوشش اور کم ہمتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ تاہم قدرت ہمیں خواہی نخواہی ادھر ہی کھینچ کر لے جارہی ہے' جس کی ایک روشن مثال ماضی میں قرارداد مقاصد کی منظوری کی صورت میں سامنے آئی تھی اور تازہ مثال مجوزہ پندرھویں آئینی ترمیم ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ اب ہم پر منحصر ہے کہ غلبہ دین اور قیام خلافت کے عظیم مقاصد کیلئے جان و مال کھپا کر اپنی آخرت کماتے ہیں یا صرف دنیا کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ایران افغان سرحد پر ایرانی فوجوں کی نقل و حرکت پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے اس تنازعہ کو عالمی طاقتوں کی مسلمانوں کے خلاف ایک سازش قرار دیا اور ایران کی

حکومت سے اپیل کی کہ وہ افغان سرحد سے اپنی فوجیں واپس بلا کر خیر سگالی کا مظاہرہ کرے اور اس سازش کو ناکام بنانے میں مدد دے اور اسلامی ممالک کے توسط سے طالبان حکومت کے ساتھ کشیدگی کم کرنے کی کوشش کرے۔ انہوں نے طالبان حکومت سے بھی درخواست کی کہ ایرانی سفارتکاروں کی گمشدگی اور قتل کے حوالے سے ابتداء میں طالبان نے جو غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا تھا وہ اپنی اس غلطی پر غیر مشروط معافی مانگ کر اپنی اخلاقی عظمت کا ثبوت دیں اور ایران کی شکایات دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ مسلمان دشمن طاقتوں کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہ ملے۔ امیر تنظیم نے اس امر پر زور دیا کہ اس معاملے میں دیگر مسلم ممالک بھی اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ایران' افغانستان مصالحت کیلئے اپنا کردار موثر انداز میں ادا کریں۔

بقیہ : عرضِ احوال

کے ریفرنڈم میں تھی کہ اگر آپ کو اسلام چاہیئے تو میں از خود پانچ سال کیلئے صدر قرار پا جاؤں گا۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے کہ اگر آپ کتاب و سنت کو پاکستان کا سپریم لاء بنانا چاہتے ہیں تو اس کی تنفیذ کیلئے میرا من مانا طریق کار بھی قبول کرنا ہوگا۔

—— اس کا یہ منفی پہلو بہت افسوسناک ہوگا کہ اگر لوگ اس پیکج کو اس کے دوسرے جزو کی بنا پر رد کر دیں تو اس سے یہ تاثر پیدا کیا جاسکے گا کہ لوگوں کو قرآن اور سنت کی بالادستی قبول نہیں ہے! اور اس تاثر کا وبال اس شخص پر ہوگا جس نے اس پیکج میں دوسرا جزو شامل کیا ہے!

—— تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان کی مخلصانہ درخواست میاں محمد نواز شریف سے یہ ہے کہ اس پیکج کو SPLIT کر کے اولاً صرف مذکورہ بالا تین اقدامات پر مشتمل بل پاس کروا لیں —— اگر ان کے نزدیک پاکستان کے موجودہ وفاقی اور پارلیمانی نظام میں کوئی پہلو اصلاح طلب ہیں تو انہیں ایک جداگانہ بل کی حیثیت سے سامنے لائیں! —— اس کے بعد بھی اگر کسی طبقے کی جانب سے مجوزہ شریعت بل کی مخالفت ہوتی ہے تو اس طبقے کی اسلام دشمنی بالکل عیاں ہو جائے گی۔ پھر پاکستان اور اسلام کے بہی خواہوں کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ ان اسلام دشمن عناصر کا قلع قمع کرنے کیلئے میدان میں نکل آئیں۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۴۷
شمارہ: ۱۱
رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
نومبر ۱۹۹۸ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر، عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' افریقہ' ایشیا یورپ' جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران' ترکی' اومان' مسقط' عراق الجزائر' مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور54700۔فون. 03۔02۔5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون· 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ' مرکزی انجمن' طابع: رشید احمد چودھری' مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع ان شاء اللہ العزیز حسب پروگرام ۶ تا ۸/ نومبر کی تاریخوں میں کراچی میں ہوگا۔ تنظیم کی تاسیس ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی اور اب ۱۹۹۸ء کا سال ختم ہوا چاہتا ہے۔ گویا تنظیم کے قافلے کو اپنے سفر کا آغاز کئے ۲۳ برس ہو چکے ہیں۔ تنظیم کی تاسیس کے بعد ابتدائی تین سال کو عبوری مدت قرار دیا گیا تھا کہ اس عرصے کے دوران تنظیم کی ہیئت کے معاملے کو حتمی شکل نہیں دی گئی تھی کہ یہ تنظیم بیعت کی بنیاد پر استوار ہوگی یا مغربی طرز کے جمہوری نظام پر استوار کی جائے گی۔ اس معاملے کو کھلا چھوڑنے میں کچھ مصلحتیں پیش نظر تھیں۔ بعض "اکابر" کی شمولیت کے امکان کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہیئتِ تنظیم کے معاملے کو open رکھا گیا تھا ـــــ عبوری مدت کے خاتمے پر رفقائے تنظیم کے سالانہ عمومی اجتماع میں طویل بحث و تمحیص کے بعد بیعت کی مسنون اور ماثور اساس پر تنظیم کی ہیئتِ اجتماعی کو استوار کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" کے مصداق قافلۂ تنظیم نے باقاعدہ اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ اس عبوری مدت کو اگر شمار نہ کیا جائے تب بھی تنظیم اسلامی کی عمر اب ۲۰ سال سے متجاوز ہو چکی ہے۔

اداروں اور جماعتوں کی زندگی میں سالانہ اجتماعات اہم سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس موقع پر تمام رفقاء و ارکان کے سامنے تنظیم کا دفترِ عمل پیش کیا جاتا ہے، سابقہ کارکردگی پر تنقیدی نگاہ ڈالی جاتی اور طے شدہ مقاصد کی روشنی میں آئندہ کے لئے اہداف کا تعین کیا جاتا ہے۔ رفتار اطمینان بخش نظر آئے تو اللہ کا شکر بجالانا واجب ہو جاتا ہے اور اگر کم محسوس ہو تو لائحہ عمل پر بھی از سرِ نو غور کیا جاتا اور اسے بہتر بنانے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر انشاء اللہ خان انشاؔ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"

تحریکی ساتھیوں سے ملاقات اور دعوتی و تحریکی جدّوجُہد کے ضمن میں ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا بھی موقع ملتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان اجتماعات میں شرکت کے ذریعے اپنے اساسی فکر کو تازہ اور اپنی دینی و تحریکی ذمہ داریوں کے شعور کو اجاگر کر کے رفقاءِ تنظیم ایمانی جذبے سے سرشار ہو کر اک ولولۂ تازہ کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ اللہ سے دعا

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

تذکرہ و تبصرہ

حافظ عاکف سعید

مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر اسرار احمد

"تدبر" کے "مکاتیب اصلاحی نمبر" میں شائع شدہ بعض خطوط کے حوالے سے

چند معروضات

"تدبر" کے نام سے ایک سہ ماہی جریدہ جناب خالد مسعود کی زیر ادارت طبع ہوتا ہے جن کا شمار صاحب تدبر قرآن' مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کے ان تلامذہ میں ہوتا ہے جنہیں نہ صرف یہ کہ مولانا مرحوم کے حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک مولانا کا قرب حاصل رہا بلکہ وہی پاکستان کی حد تک اس تراثِ علمی کے بھی امین اور وارث سمجھے جاتے ہیں کہ جس کا آغاز امام حمید الدین فراہی کے فکر قرآنی سے ہوا اور جس کو مولانا اصلاحی مرحوم نے وسعت دے کر تفسیر "تدبر قرآن" کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ "تدبر" کی اشاعت اسی مکتب فکر کے تسلسل کا ایک ادنیٰ مظہر قرار دی جا سکتی ہے۔

مولانا اصلاحی کا انتقال گزشتہ دسمبر میں لاہور میں ہوا۔ ان کی رحلت کے بعد تادمِ تحریر "تدبر" کے جو شمارے شائع ہوئے ہیں وہ سب کے سب مولانا مرحوم کے حوالے سے خصوصی نمبروں پر مشتمل ہیں۔ اِس وقت "تدبر" کا جولائی ۹۸ء کا شمارہ بعنوان "مکاتیب اصلاحی نمبر" ہمارے پیش نظر ہے جو مولانا مرحوم و مغفور کے ان خطوط پر مشتمل ہے جو انہوں نے گزشتہ پچاس برسوں کے دوران اپنے احباب کے نام مختلف مواقع پر تحریر فرمائے۔ چنانچہ ان میں سے قدیم ترین خط ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کا مرقومہ ہے جبکہ ترتیب زمانی کے اعتبار سے آخری خط ۴ ستمبر ۹۰ء کا تحریر کردہ ہے ــــ جریدے کے مدیر نے ان خطوط کو زمانی ترتیب سے مرتب کرنے کی بجائے مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے۔ "تدبر" کے اس مکاتیب نمبر میں "ڈاکٹر اسرار احمد" کے عنوان سے بھی ایک باب باندھا گیا ہے جس میں بدقسمتی سے وہ تمام مکاتیب جمع کر دیئے گئے ہیں جو مولانا مرحوم اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے ۲۵ برسوں پر محیط قابل رشک حد تک خوشگوار اور انتہائی قریبی تعلق کے انقطاع کے بعد ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۸ء کے درمیان مولانا مرحوم نے اپنے حلقۂ احباب کو تحریر فرمائے اور جن میں محترم ڈاکٹر

صاحب کے لئے مولانا اصلاحی مرحوم کے قلم کی تلخی تمام حدود کو پھلانگتی محسوس ہوتی ہے۔
یہ حقیقت ہے کہ مولانا اصلاحی کے ساتھ امیر تنظیم کا رُبع صدی پر محیط قرب جتنا شدید اور محکم تھا' انقطاع تعلق کے بعد عارضی طور پر' اسی درجے میں بُعد اور فصل کا معاملہ ہوا۔ اور ایک عام قاری جو اس دَور کے خطوط کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے محترم ڈاکٹر صاحب اور ان کی تحریک قرآنی کے بارے میں سخت انقباض محسوس کرنے لگتا ہے۔
جریدے کے مدیر نے نہ معلوم کیوں صرف انہی خطوط کو شائع کرنے پر اکتفا کیا جو انقطاع تعلق کے بعد لکھے گئے اور مولانا کے ان خطوط کو مکمل طور پر نظرانداز کرنا مصلحت کا تقاضا سمجھا کہ جو اس سے قبل لکھے گئے اور جن کے ذریعے محترم ڈاکٹر صاحب کے بارے میں مولانا کے غایت درجہ حسن ظن اور نہایت قریبی تعلق کی عکاسی ہوتی ہے۔
یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور ختم نبوت کے بعد کوئی انسان کلیتہً معصوم عن الخطا ہو سکتا ہے نہ کوئی شخصیت مزاجی نقائص اور کمزوریوں سے بالکلیہ پاک ہو سکتی ہے خواہ وہ بعض اعتبارات سے کتنی ہی عظمت کی حامل ہو ـــــ تاہم کسی شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور اس کے مقصد حیات اور شب و روز کی مصروفیات کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھ کر ان کے بارے میں اچھی یا بری رائے قائم کی جاتی ہے ـــــ ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی خوبیوں کو مدنظر رکھو اور اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرو۔ بالخصوص کسی شخص کے انتقال کے بعد تو ہمارے سامنے نبی اکرم ﷺ کی یہ واضح ہدایت موجود ہے کہ "اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ"۔ لہٰذا کسی بھی مسلمان کے انتقال کے بعد اس کی خامیوں یا کمزوریوں کا تذکرہ انتہائی نامناسب ہے۔ آنحضورؐ کی یہ تلقین تو ہر مرنے والے مسلمان کے بارے میں ہے خواہ وہ علم و عمل کے اعتبار سے بلند مقام کا حامل ہو یا نسبتاً پست مقام رکھتا ہو۔ مولانا اصلاحی مرحوم یقیناً ایک بلند پایہ عالم اور ہر اعتبار سے ایک نہایت قابل احترام شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ضمن میں ہم ان حدود کو نظرانداز کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے کہ جن کا تعین مذکورہ حدیث میں ملتا ہے ـــــ تاہم مدیر "تدبر" نے مولانا کے ان متنازعہ خطوط کو افادۂ عام کیلئے چھاپ کر جو "دینی خدمت" سرانجام دی ہے اور اپنی اس حرکت کے نتیجے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد کی شخصیت کو مجروح اور داغدار کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کے دفاع میں کچھ وضاحتیں پیش کرنا ہماری ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اور اس وضاحت کے دوران اپنی جانب سے محتاط رہنے کی بھرپور شعوری

کوشش کے باوجود اگر مذکورہ بالا نبوی ہدایت کو ملحوظ رکھنے میں ہم سے کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ظاہر بات ہے کہ اس کا وبال مدیر موصوف پر ہی آئے گا اور وہی اس کے ذمہ دار ٹھہریں گے۔ اس لئے کہ ان خطوط کی اشاعت کے بعد اپنی پوزیشن کو واضح کرنا اور قارئین کو صحیح صورتحال سے آگاہ کرنا ہماری لازمی ضرورت تھی۔ ان خطوط کے حوالے سے ہم کسی تفصیلی بحث کا دروازہ کھولنا نہیں چاہتے لہٰذا ہم صرف ان وضاحتوں پر ہی اکتفا کریں گے کہ جو ہمارے نزدیک ناگزیر ہیں۔ ہمارے نزدیک جس طرح مولانا کے ان خطوط کو شائع کر کے مدیر موصوف نے کوئی خیر نہیں کمایا اسی طرح اس کے ردِّ عمل میں اس تلخ باب کو ضرورت سے زیادہ کھولنا بھی ہرگز کارِ خیر نہ ہو گا۔

☆ ☆ ☆

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں مولانا اصلاحی مرحوم و مغفور کے جو خطوط "تدبر" کے مذکورہ شمارے کی زینت بنائے گئے ہیں وہ سب کے سب دراصل اُس دَور سے متعلق ہیں جب بعض وجوہات کی بنا پر مولانا مرحوم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے سخت کبیدہ خاطر تھے اور ان کے قلب و ذہن پر غیظ و غضب کے باعث جھنجلاہٹ سی طاری تھی۔ بعض اصولی علمی اختلافات کے ساتھ ساتھ مولانا کے غصے کی آگ کو بھڑکانے اور محترم ڈاکٹر صاحب کے خلاف کان بھرنے میں ان کے بعض شاگردوں کا بھی حصہ تھا کہ جو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مولانا کے قرب اور مشفقانہ تعلق کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہی عناصر ہیں جنہوں نے اب مولانا کے انتقال کے بعد بھی ڈاکٹر اسرار احمد سے اپنے بغض کا اظہار اس صورت میں کیا ہے کہ ان کے بارے میں مولانا کے وہ خطوط "تدبر" میں شائع کر دیئے ہیں جن میں مولانا نے محترم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنے اختلافات کے حوالے سے ان کے بارے میں سخت ترین الفاظ استعمال کئے ہیں ــــــ ان دونوں قابلِ احترام بزرگوں کے تعلقات میں پہلی نمایاں دراڑ اُس وقت پڑی جب ۱۹۷۲ء میں محترم ڈاکٹر صاحب نے انجمن کے قیام کا فیصلہ کیا اور اس کے انتظامی ڈھانچے کو مغربی طرز کی جمہوریت پر اُستوار کرنے کی بجائے اس میں اپنے لئے حق استرداد کو محفوظ رکھا۔ مولانا شدت کے ساتھ جمہوری طرز کی اجتماعیت کے قائل تھے۔ مزید برآں وہ اس بات پر بھی محترم ڈاکٹر صاحب سے شاکی رہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے دل میں تصوف کے لئے نرم گوشہ بھی رکھتے تھے اور قرآن کانفرنس میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کو شرکت کی دعوت دیتے تھے۔ بہرکیف ۱۹۷۲ء کے بعد سے اختلافات کی

یہ خلیج بڑھتی گئی' لیکن مولانا کی جانب سے اس میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب محترم ڈاکٹر صاحب نے بعض احباب کے سوال کے جواب میں ۱۹۷۶ء میں مولانا محترم سے اپنے "وصل اور فصل" کی داستان اور فصل کے اسباب کو ایک مضمون کی صورت میں میثاق میں شائع کیا ___ یہاں ہم دل پر پتھر رکھ کر یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ مولانا اپنی تمامتر خوبیوں اور تبحر علمی کے باوجود مزاجاً مغلوب الغضب انسان تھے' (اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے) اور غصے کی کیفیت میں ان کی سوچ ہی نہیں رویّہ بھی نہایت غیر متوازن ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ان خطوط میں مولانا کا یہ مزاجی عدم توازن پوری شدت کے ساتھ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ان کے قریبی احباب اور بالخصوص وہ احباب جنہیں جماعت اسلامی کے رکن کی حیثیت سے مولانا کی ایک طویل عرصہ تحریکی رفاقت بھی حاصل رہی اور بعد میں جماعت سے الگ ہونے کے بعد بھی جو مولانا کے ساتھ اس توقع کی بنا پر وابستہ رہے کہ شاید وہ خود اب فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کے لئے کوئی تحریکی قافلہ ترتیب دے کر اس کے امیر اور داعی کے طور پر ان کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں گے' اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا کی یہ مزاجی کمزوری ہی ان کی اس ناکامی کا باعث بنی تھی کہ وہ جماعت سے علیحدگی کے بعد کوشش کے باوجود کوئی تحریکی قافلہ ترتیب نہیں دے پائے اور بالآخر اس بھاری پتھر کو چوم کر انہوں نے رکھ دیا اور اس بارِ گراں کو اٹھانے کی کوشش ہمیشہ کے لئے ترک کر دی۔

مولانا کے ان خطوط کو پڑھ کر ایک عام قاری بھی ان کی اس مزاجی کمزوری اور عدم توازن کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا' بلکہ سچی بات یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کے لئے جو پیرایۂ بیان انہوں نے اختیار فرمایا اور جس درجے مبتذل الفاظ استعمال فرمائے ہیں اس سے قاری کے ذہن میں مولانا کا اپنا مقام و مرتبہ سخت طور پر مجروح ہوتا ہے۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک ایسے شخص کے بارے میں جس کے ساتھ مولانا کی ۲۵ برس تک نہایت قریبی رفاقت رہی' جس نے ہمیشہ مولانا سے اپنی علمی استفادے کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا' جن پر مولانا کو اتنا اعتماد تھا کہ اپنا جریدہ "میثاق" خود اس کے حوالے کیا اور جس نے تفسیر تدبر قرآن سمیت ان کی تمام کتابیں اپنے ذاتی اشاعتی ادارے کے تحت شائع کر کے مولانا اور ان کے قرآنی فکر کے ساتھ اپنی شدید ذہنی و قلبی وابستگی کا عملی ثبوت دیا اور جس کی ذہانت' صلاحیت اور غلبہ و اقامتِ دین کی تحریک کے ساتھ اس کی کمٹمنٹ کے خود مولانا

سب سے بڑے معترف رہے ــــــ اور یہ انتہائی قریبی دو طرفہ تعلق ایک دو برس نہیں پورے ۲۵ برس تک قائم رہا ــــــ یکایک مولانا کو اس شخص میں کیا نظر آگیا کہ وہ ان کے نزدیک مبغوض ترین شخص بن گیا؟ ــــــ اور جس کا اپنے خطوط میں ذکر کرتے ہوئے مولانا کا قلم احتیاط کی حدود کو ہی نہیں پھلانگتا' درجۂ ثقاہت سے بھی گر جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اسی مزاجی کمزوری کے سوا جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں' ان کے رویئے کی کوئی اور تاویل ممکن نہیں۔

ہم حیران ہیں کہ "تدبر" کے فاضل مدیر نے محترم ڈاکٹر صاحب کے خلاف مولانا کے اظہارِ بغض پر مبنی وہ "شاہکار" خط کیوں شائع نہ کیا جو مولانا نے کسی مقامی امام مسجد کے استفسار کے جواب میں ۲۶/ اپریل ۷۸ء کو تحریر فرمایا تھا اور جسے خطوط کے اس سلسلے کا "نقطۂ عروج" قرار دینا غلط نہ ہو گا۔ اس لئے کہ اس خط میں انہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب کے خلاف سخت ترین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب محترم ڈاکٹر صاحب کا ہفتہ وار درس لاہور شہر کے مرکزی مقام مسجد شہداء میں اتوار کی صبح ہوتا تھا اور اس میں حاضری عام طور پر پانچ صد سے بھی متجاوز ہوتی تھی۔ اس درس کا چرچا اور اس کی جانب لوگوں کے غیر معمولی رجوع کو دیکھ کر ہمارے روایتی علماء کے ایک حلقے میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی جن کے اپنے درس کے حلقے خانہ ویرانی کا سماں پیش کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب کی مخالفت پر کمر کس لی اور اس "بغضِ معاویہ" کا یہ عجیب و غریب منظر سامنے آیا کہ مولانا مرحوم ان روایتی علماء سے تمامتر علمی اور مسلکی اختلافات کے باوجود' اس مہم میں ان کے ہمنوا ہی نہیں سرخیل بن گے۔ چنانچہ مولانا کا وہ خط ہزاروں کی تعداد میں طبع کروا کے مہم کے انداز میں لاہور شہر میں بڑے پیمانے پر پھیلایا گیا ــــــ "تدبر" کی مذکورہ اشاعت میں مولانا کے اس مشہورِ زمانہ خط کو شائع نہ کرنے کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس خط کے ذریعے خود مکتوب نگار کا شخصی امیج شدید طور پر مجروح ہوتا ہے ــــــ شاید بعض احباب کو یاد ہو گا کہ اس خط کی اشاعت اور تشہیر کے بعد مولانا وصی مظہر ندوی نے 'جن کا دوستانہ رابطہ بیک وقت مولانا اصلاحی اور محترم ڈاکٹر صاحب دونوں کے ساتھ تھا' اپنے ایک مضمون میں مولانا کے اس رویئے پر گہرے تاسف اور رنج کا اظہار کیا تھا اور مولانا کے طرز عمل کو نہایت نامناسب قرار دیتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب کا بھرپور دفاع کیا تھا۔ مولانا ندوی کا یہ مضمون اگست ۷۸ء کے میثاق میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا نے اپنے مذکورہ خطوط میں محترم ڈاکٹر صاحب پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ انہوں نے مولانا کا ایک جعلی خط مولانا کی جانب منسوب کیا۔ گزارش احوال یہ ہے کہ جب مولانا اور ڈاکٹر صاحب کے مابین اختلافات میں شدت پیدا ہو گئی تو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والوں میں ایک محترم شخصیت سردار اجمل خان لغاری نے مصالحت کی کوشش کے ضمن میں مولانا سے بذریعہ خط و کتابت سلسلہ جنبانی کا آغاز کیا۔ اس دو طرفہ خط و کتابت میں مولانا نے ایک خط لغاری صاحب کے نام تحریر کیا جس کی نقل لغاری صاحب مرحوم نے محترم ڈاکٹر صاحب کو بھی بھجوا دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کسی مضمون میں مولانا کے اس خط کا تذکرہ کر دیا تو مولانا نے اس خط کے مندرجات سے صاف انکار کیا اور اس خط کو جعلی قرار دیا۔ مولانا کے اس انکار کے نتیجے میں سردار اجمل خان لغاری مرحوم کی پوزیشن خراب ہوئی تو انہوں نے مولانا کو خط لکھا جس میں اس مصرعے کے حوالے سے کہ ؎ "جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی" تحریر کیا کہ مولانا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' آپ کا وہ اصل خط اب تک میرے پاس محفوظ ہے جسے آپ جعلی قرار دے رہے ہیں۔ اس پر مولانا محترم نے لغاری صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس واقعے کا ذکر جولائی ۸۷ء کے میثاق میں موجود ہے' لیکن اس کے بعد مولانا کی جانب سے لغاری صاحب کی تردید میں کوئی خط یا مضمون سامنے نہیں آیا۔

مولانا نے اپنے ان خطوط میں سے بعض میں اپنے اس ارادے کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب محترم کے خلاف "اسرار نامہ" کے عنوان سے ایک کتابچہ مرتب کروانا چاہتے ہیں تاکہ ان کے بقول "قادیانی طرز کے اس فتنے" کا سدباب کیا جا سکے۔ چنانچہ مولانا کی اس خواہش کو باقاعدہ عملی جامہ پہنایا گیا اور اس "نیک کام" کو سرانجام دینے کی سعادت "تدبر" کے مدیر شہیر خالد مسعود صاحب کے حصے ہی میں آئی۔ یہ کتابچہ بھی اس تشہیری مہم کا اہم آرگن بن گیا جو بعض "فقیہانِ شہر" نے محترم ڈاکٹر صاحب اور ان کے درسِ قرآن کے خلاف بڑی شدّ و مد سے چلائی تھی۔ چنانچہ اس کتابچہ کو بھی ہزاروں کی تعداد میں لاہور شہر میں بڑے اہتمام کے ساتھ پھیلایا گیا ___ قبل ازیں مولانا کے ان مخالفانہ خطوط کا ترکی بہ ترکی جواب دینے سے محترم ڈاکٹر صاحب اس لئے احتراز کرتے رہے کہ مولانا کا ادب و احترام مانع تھا۔ چنانچہ جولائی ۸۷ء کے میثاق میں بھی جبکہ مولانا کے شدید مخالفانہ خطوط منظر عام پر آ چکے تھے' مولانا کے خطوط کا تاسف بھرے لہجہ میں ذکر کرتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب نے "عرضِ

احوال" میں لکھا تھا کہ:

"ان خطوط کے بارے میں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہم فی الحال کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے' البتہ مولانا اصلاحی کی خدمت میں یہ گزارش کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ وہ اب بھی اپنے طرزِ عمل پر نظرِثانی فرمالیں ورنہ اگر بات بڑھی تو قرآن مجید نہ صرف یہ کہ ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ کی رخصت عطا فرماتا ہے بلکہ ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ کا حکم بھی دیتا ہے"۔

لیکن "اسرار نامہ" کی طباعت اور اس کی بڑے پیمانے پر اشاعت کے نتیجے میں وہ پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے دست راست شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے محترم ڈاکٹر صاحب کے دفاع میں ایک مفصل' مبسوط اور مسکت جواب تحریر کیا جس میں ان تمام الزامات کی قلعی کھول دی گئی تھی جو مذکورہ کتابچے میں ڈاکٹر صاحب پر لگائے گئے تھے۔ یہ مدلل اور مبسوط مضمون "اظہارِ حقیقت" کے عنوان سے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا جس کی چند کاپیاں اب تک محفوظ ہیں۔ اگرچہ مولانا اصلاحی نے اپنے کسی خط میں لکھا ہے کہ "اسرار نامہ" کا جواب دینا ڈاکٹر اسرار یا ان کے کسی ارادت مند کے بس کی بات نہ ہو گی لیکن مولانا کا یہ اندازہ نہ صرف یہ کہ غلط ثابت ہوا بلکہ "اظہارِ حقیقت" کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر صاحب اور ان کی قرآنی تحریک کے خلاف یہ ساری منفی مہم بتاشے کی طرح بیٹھ گئی اور مولانا کے شاگردوں میں سے کسی کو اس کا جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔

قارئین! ہم اس "گزارشِ احوالِ واقعی" پر اس لئے مجبور ہوئے ہیں کہ مولانا مرحوم کے ان متنازعہ خطوط کی "تدبر" میں اشاعت کے بعد اپنے دفاع میں اس مختصر سی وضاحت کے سوا ہمارے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اس لئے کہ ان مخالفانہ خطوط کی زد کسی فردِ واحد پر نہیں بلکہ رجوع الی القرآن کی اس تحریک پر اور غلبہ و اقامت دین کی خاطر ترتیب دیئے گئے اس قافلۂ تنظیم پر پڑتی ہے جو بحمد اللہ پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف رواں دواں ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے مجمل ترین انداز میں وضاحت کریں تاکہ وہ تلخ باب کم سے کم وا ہو جسے مولانا مرحوم کے لئے ہرگز سرمایۂ افتخار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ہم ابتدا میں ہی عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے اس وضاحتی مضمون سے اگر مولانا کی ذات پر کوئی حرف آتا ہے اور "اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ" کی نبویؐ ہدایت کو ملحوظ رکھنے میں ہم سے کسی کوتاہی کا صدور ہوتا ہے تو ہم اس پر اللہ کی جناب میں تہہ دل سے استغفار کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے ہاں ہمارا عذر مقبول ہو گا' لیکن اس معاملے کی اصل ذمہ داری بہر صورت مدیر "تدبر" پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اس معاملے کو از سرِ نو چھیڑ کر مولانا کے امیج کو مجروح کرنے کا خود سامان کیا ہے۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان خطوط کی اشاعت کے ذریعے ان کے شاگردِ رشید نے "علمی خدمت" کی آڑ میں جو تخریبی کارروائی کی ہے اس پر خود مولانا مرحوم کی روح بھی مضطرب' بے چین اور ناخوش ہو گی۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ مدیر تدبر کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو گا۔

الحمدللہ کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن اور ان کے پیش کردہ قرآن کے انقلابی فکر کو اللہ نے اس درجے شرفِ قبول سے نوازا ہے کہ ان کی صدائے بازگشت اب آڈیو' وڈیو کیسٹوں اور انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا بھر میں سینکڑوں ہزاروں نہیں' لاکھوں انسانوں تک پہنچ رہی ہے۔ مولویوں کے ایک مخصوص گروہ اور مولانا مرحوم کے تلامذہ نے اس قرآنی تحریک کے خلاف جو شدید مخالفانہ مہم شروع کی تھی وہ بہت جلد اپنی موت آپ مر گئی اور خدمتِ قرآنی کا یہ کام نہ صرف جاری رہا بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے نہایت وسعت پذیر ہوا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مولانا کی جانب سے اس شدّتِ مخالفت اور زُود رنجی میں بھی کمی واقع ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۷۸ء کے بعد اس موضوع پر ان کا کوئی خط "تدبر" میں شامل نہیں ہے۔ ان کی حیاتِ دُنیوی کے آخری سالوں میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ان کی عیادت کے لئے وقفے وقفے سے تشریف لے جاتے رہے۔ اس دوران میں مولانا کی طبیعت اتار چڑھاؤ کا شکار رہی' تاہم عیادت کے حوالے سے مولانا سے ملاقات کا سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ مولانا مرحوم کے جنازے میں بھی امیر تنظیم اپنے متعدد رفقاء سمیت شریک ہوئے۔ مولانا کے لئے دعائے مغفرت پر ہم اس تحریر کو ختم کرتے ہیں۔ اللّٰھم اغفر لہ' وارحمہ' وادخلہ فی رحمتك وحاسبه حسابًا یسیرًا

☆ ☆ ☆

تصویر کا دوسرا رُخ

یادش بخیر، مولانا اصلاحی مرحوم کا ۱۶/اپریل ۷۸ء کا تحریر کردہ وہ "شاہکار" خط اور خالد مسعود صاحب کا مرتب کردہ "اسرار نامہ" جب ایک مخالفانہ مہم کی صورت میں لاہور کی تمام بڑی مساجد اور محترم ڈاکٹر صاحب کے حلقۂ احباب میں پھیلایا گیا تو فطری طور پر ان طالبانِ قرآن میں بھی تشویش کی لہر دوڑ گئی جو بڑے ذوق و شوق سے مسجد شہداء میں امیر تنظیم کا درس سننے کیلئے آیا کرتے تھے۔ اس موقع پر صورتحال کی وضاحت کیلئے مسجد شہداء کے شرکاءِ درس میں سے ایک صاحب کی جانب سے "وہ بھی دیکھا' یہ بھی دیکھ" کے عنوان سے ایک چار ورقہ طبع کرایا گیا جس میں جوابی وضاحت کے علاوہ مولانا کی اپنی تحریروں سے ان اقتباسات کو بھی جمع کیا گیا تھا جن میں مولانا نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں نیک جذبات و توقعات کا اظہار کیا ہے اور جن کے ذریعے اس قریبی تعلق کی شدت کی عکاسی ہوتی ہے جو ۲۵ برس تک دونوں بزرگوں کے درمیان قائم رہا۔ ذیل میں ان اقتباسات کو ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

مولانا کی تحریروں سے ان اقتباسات کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی ہے کہ "تدبر" اپریل ۹۸ء کے شمارے میں شامل ایک مضمون میں محترم ڈاکٹر صاحب پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ "وہ مولانا کے جاری کردہ "میثاق" پر قابض ہو گئے تھے"۔ ہم حیران ہیں کہ "تدبر" کے فاضل مدیر نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد اور خلاف واقعہ ہے' اسے بغیر کسی وضاحتی نوٹ کے اپنے جریدے میں شائع کر دیا۔ مولانا کی زیر نظر تحریروں میں سے ایک تحریر کے ذریعے جو اگست ۶۷ء کے میثاق میں شائع ہوئی تھی' اس امر کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے کہ "میثاق" محترم ڈاکٹر صاحب نے کسی "سازش" کے تحت مولانا سے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مولانا کا جاری کردہ یہ شمارہ مالی پریشانیوں کے باعث انقطاع اشاعت کا شکار تھا' اور محترم ڈاکٹر صاحب خود اپنے لئے "الرسالہ" کے عنوان سے ایک ماہانہ جریدے کا ڈکلریشن بھی حاصل کر چکے تھے لیکن جب مولانا کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے خود اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ محترم ڈاکٹر صاحب "میثاق" کو اپنے شمارے کے طور پر شائع کریں تاکہ اس جریدے کا تسلسل برقرار رہے۔ چنانچہ محترم ڈاکٹر صاحب کے "الرسالہ" کا ڈکلریشن ضائع کر دیا اور مولانا کی خواہش کی تعمیل میں "میثاق" کی ادارت سنبھال لی۔

یہ اطلاع بھی قارئین کیلئے دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ انڈیا کے مشہور دینی سکالر مولانا وحید الدین خان اُن دنوں محترم ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کیلئے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے جب "الرسالہ" کا ڈکلریشن ضائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مولانا موصوف نے "الرسالہ" کے نام سے دہلی سے اپنے جریدے کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ (ادارہ)

---

(۱) دسمبر ۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ڈاکٹر صاحب کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اصلاحی صاحب نے کہا :

"اگرچہ اس شخص نے خود مجھ پر بہت سخت تنقید کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس سے خوشی ہی ہوئی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمام اراکین شوریٰ اس بیان کو پڑھیں' حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے ہماری ہی تحریروں سے مرتب کرکے ایک آئینہ ہماری نگاہوں کے سامنے لا رکھا ہے جس میں ہم اپنی موجودہ صورت دیکھ سکتے ہیں...."

(ماخوذ از "میثاق" لاہور' اگست ۶۶ء' زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی)

(۲) دسمبر ۵۸ء کے مرقومہ ایک "محبت نامے" سے اقتباس جو اصلاحی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو کراچی ارسال کیا جبکہ وہ منٹگمری (ساہیوال) سے جماعت اسلامی کے ایک اور سابق رکن ڈاکٹر عثمانی صاحب کے ساتھ اشتراکِ عمل کے ارادے سے کراچی منتقل ہو گئے تھے:

"آپ کے اس خفیہ اقدام کی اطلاع سیال صاحب سے مجھے ہو چکی تھی۔ بہرحال جو کچھ آپ نے کیا' اچھا کیا۔ خدا کرے آپ کے مقاصد وہاں پورے ہوں اور آپ کو وہاں دلجمعی کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کی فرصت ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ان شاء اللہ آپ کیلئے موجب خیر و برکت ہوگی۔ فرزانوں کے ساتھ نباہ مشکل ہوتا ہے' دیوانے گزارا کر جاتے ہیں۔ آپ دونوں دیوانے ہیں ؏ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو! مجھے جو احساس ہے وہ صرف یہ کہ آپ مجھ سے دور ہو گئے۔ آپ سے ایک قلبی لگاؤ سا ہو گیا ہے' اس وجہ سے اس بات سے تھوڑی سی تکلیف ہے کہ میں نے جتنا ہی کھینچنا چاہا' اُتنے ہی آپ کھنچتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کھنچتے کھنچتے کراچی پہنچ گئے۔ خیر صاحب! جہاں رہو' سلامت رہو اور دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھو..!"

(۳) مئی ۶۲ء میں "میثاق" کے ادارتی صفحات میں ساہیوال میں ڈاکٹر صاحب کی دینی سرگرمیوں اور ان میں اپنے تعاون کا ذکر کرتے ہوئے اصلاحی صاحب لکھتے ہیں (واضح رہے کہ اُس وقت "میثاق" کے مالک بھی اصلاحی صاحب ہی تھے اور مدیر بھی!):

"ہمارے عزیز بھائی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے منٹگمری شہر میں کچھ عرصہ سے ایک حلقہ مطالعہ قرآن جاری کر رکھا ہے۔ اس کے زیرِ اہتمام ہفتہ وار درسِ قرآن بھی ہوتا ہے اور وقتاً فوقتاً اسلامی مباحث پر علمی و تحقیقی لیکچروں کیلئے باہر کے اصحابِ علم کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔ اس دعوت پر دو مختلف وقتوں میں دو لیکچر "تدبر قرآن کے آداب و شرائط" اور "قرآن کا فلسفۂ تاریخ" کے عنوان سے راقم کو بھی دینے کے مواقع نصیب ہوئے۔ ان دونوں لیکچروں میں شہر کے ذہین طبقہ کی ایک اچھی تعداد نے شرکت کی اور تقریروں سے پوری دلچسپی لی۔ یہ تقریریں ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ بھی کر لی گئی ہیں اور حلقہ کی طرف سے افادۂ عام کی غرض سے ان کی اشاعت کی بھی سکیم ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ کی دلچسپی برابر اس حلقہ کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور قرآن

سے استفادہ کرنے والوں کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے نہایت مفید اور بابرکت کام کی بنیاد ڈالی۔ یہ دَور اسلام کی غربت کا دور ہے' اس دَور میں اللہ کے جس بندے سے دین کی جو خدمت بھی بن آئے اس میں اپنا تن من دھن لگادے۔ آج چھوٹی چھوٹی خدمتوں کا بھی ان شاء اللہ وہ اجر ملے گا جو کل بڑی بڑی خدمتوں ہی کیلئے مخصوص تھا' شرط صرف قربانی اور اخلاص نیت کی ہے ـــــ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کے ساتھ ساتھ ایک اور نہایت ہی مفید اور قابل تقلید کام کی بنیاد رکھی ہے ـــــ یہ ہے ایک اسلامی دارالاقامہ کا قیام۔ اس دارالاقامہ کا مقصد ان طلبہ کیلئے اسلامی تعلیم و تربیت کی تمام ضروری سہولتیں مہیا کرنا ہے جو مقامی کالج میں زیر تعلیم ہیں...."

(۴) <u>اگست ۶۶ء</u> میں جب اصلاحی صاحب "میثاق" کو جاری رکھنے میں ناکام ہو گئے اور مجبوراً پرچہ ڈاکٹر صاحب کے حوالے کیا (درآں حالیکہ ڈاکٹر صاحب اپنے لئے "الرسالہ" کے نام سے علیحدہ ڈکلریشن حاصل کر چکے تھے) تو حسب ذیل تحریر لکھی جو "میثاق" بابت اگست ۶۶ء میں شائع ہوئی :

"......اب میں نے بہت سوچ بچار کے بعد رسالے کو کلیتہً برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے حوالہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سلّمہ ایک ذہین' سرگرم' اسلامی ذہن و فکر رکھنے والے نوجوان اہل قلم ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ نہ صرف رسالے کو پابندی کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے بلکہ میں ان کی محنت اور قابلیت سے یہ توقع بھی رکھتا ہوں کہ وہ صوری اور معنوی دونوں ہی اعتبار سے اس کے معیار کو اونچا کریں گے۔ دعا کیجئے کہ میری یہ توقع پوری ہو۔ ڈاکٹر صاحب ابتداء سے نہ صرف اس کے قدر دانوں میں سے ہیں بلکہ برابر اس کے معاونوں میں سے رہے ہیں۔ جس مقصد کیلئے یہ پرچہ نکالا گیا تھا وہ جس طرح مجھے عزیز ہے اسی طرح انہیں بھی عزیز ہے۔ اس وجہ سے مقصد کے معاملے میں بھی کسی رجعت یا انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ بلکہ توقع یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی اس میں ترقی ہوگی۔ جو رفقاء اب تک اپنے قلمی تعاون سے میرا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں وہ ان شاء اللہ بدستور ڈاکٹر صاحب کا بھی ہاتھ بٹاتے رہیں گے۔

اس سلسلے میں یہ خوشخبری سنانے کی سعادت بھی حاصل کر رہا ہوں کہ میری تفسیر "تدبر قرآن" کی پہلی جلد کی کتابت شروع ہو گئی ہے۔ یہ جلد سورۂ فاتحہ' بقرہ اور آل عمران کی تفسیر پر مشتمل ہوگی۔ صفحات کا اندازہ کم و بیش ایک ہزار ہے۔ اپنے امکان کے حد تک کاتب اچھا تلاش کیا گیا ہے اور چھپائی آفسٹ کی ہوگی۔ توقع ہے کہ کتاب اچھی بھی چھپے گی اور جلد بھی۔ یہ خدمت بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں انجام پا رہی ہے۔ دعا کیجئے کہ

اللہ تعالیٰ یہ کام تکمیل کو پہنچائے اور آگے کے کام کیلئے عزم و حوصلہ نصیب ہو۔"

(۵) جولائی ۶۸ء میں "تدبر قرآن" جلد اول کی طباعت کے بارے میں اصلاحی صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی ایک تحریر جو "میثاق" بابت جولائی ۶۸ء میں شائع ہوئی :

"..... لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتاب کے ناشر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ نے کتاب کی طباعت و کتابت اور اس کی تحسین و تزئین پر اتنی فیاضی سے روپیہ خرچ کیا ہے کہ اس میں تجارتی پہلو بالکل نظر انداز ہو گیا ہے۔ ہر مصنف یہ چاہتا ہے کہ اس کی کتاب بہت اچھی چھپے۔ میرے اندر بھی دنیا کی دوسری خواہشوں کی طرح یہ خواہش موجود ہے۔ اس وجہ سے مجھے کتاب کو اس اہتمام سے چھپتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اور میں نے ڈاکٹر صاحب کے ذوق و شوق میں کوئی مداخلت پسند نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب تو بحمد اللہ اچھی چھپ گئی، جو بھی دیکھتا ہے اس کی تعریف کرتا ہے، لیکن کاروباری پہلو سے اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس پر لگی ہوئی ساری رقم اگر واپس آجائے، جس کی کوئی توقع نہیں ہے، تو اس رقم سے دوسری جلد کی طباعت کا انتظام ہو جائے گا....."

(۶) مارچ ۷۱ء : ۱۵ مارچ ۷۱ء کی تحریر جو تدبر قرآن، جلد دوم کے دیباچہ میں شامل ہے :

"تدبر قرآن کی دوسری جلد کی اشاعت کی نوبت بھی آہی گئی، برادر عزیز ڈاکٹر اسرار احمد سلمہ کتاب کے تمام قدر دانوں کے شکریہ اور ان کی تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہایت نامساعد حالات کے اندر نہ صرف یہ کہ کتاب کی طباعت کا انتظام کیا بلکہ اس کیلئے اہتمام بھی وہی کچھ کیا جو پہلی جلد کیلئے کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے مقصود الحمد للہ نہ ان کے سامنے تجارت ہے نہ کتاب کے مصنف کے سامنے۔ مقصود صرف قرآن کی خدمت ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور جلد وہ وقت لائے کہ اس کی بقیہ جلدوں کی اشاعت کی سعادت بھی حاصل ہو۔"

(۷) جولائی ۷۲ء میں ڈاکٹر صاحب کے کتابچے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کی طبع ثانی میں شائع شدہ "تقریظ" از قلم مولانا امین احسن اصلاحی :

"یہ رسالہ، جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ، نے ان حقوق و فرائض کی تشریح کے مقصد سے لکھا ہے جو ایک مسلمان پر قرآن سے متعلق عائد ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں قرآن پر ایمان کے مدعیوں کی کمی نہیں ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ایمان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سلمہ نے قرآن کے دلائل کی روشنی میں ان تقاضوں اور مطالبوں کی تشریح کی ہے اور بیک نظر محسوس ہوتا ہے کہ نہایت خوبی اور جامعیت کے ساتھ تشریح کی ہے۔ اندازِ بیان نہایت دلنشین، دلائل نہایت محکم اور اسلوبِ خطاب نہایت ہی مؤثر اور

دردمندانہ ہے۔ ہر مسلمان جو قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے' اس رسالے میں بہترین رہنمائی پائے گا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں۔ ہماری بہت سی عزیز امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔"

(۸) اگست ۷۲ء میں جامع مسجد خضراء سمن آباد میں دس روزہ تربیت گاہ منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر صاحب نے "مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب" کا سلسلہ وار درس دیا اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے درس حدیث دیا۔ اس کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۱۳/اگست ۷۲ء سے مولانا اصلاحی صاحب نے خطاب کیا اور فرمایا :

> "بھائیو! میں سب سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس اجتماع میں برکت دینے کے لئے نہیں بلکہ برکت لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں.... لیکن میرے عزیز بھائی شیخ سلطان احمد صاحب اور برادر عزیز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مجھے یہ خواہش بھی معلوم ہوئی کہ میں آپ کے سامنے تقریر بھی کروں' تو میں نے ان کی خواہش کی تعمیل ضروری سمجھی...." (ماخوذ از : میثاق اگست ۷۲ء)

بقیہ : عرضِ احوال

ہے کہ اس اجتماع کو تنظیم اسلامی اور اس کے رفقاء کے حق میں زیادہ سے زیادہ مفید اور نفع بخش بنا دے۔ (آمین)

کراچی میں تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے انعقاد کا یہ پہلا موقع ہے۔ اس سے پہلے قریباً تمام مواقع پر اہل کراچی اجتماع میں شرکت کی خاطر طویل سفر کر کے لاہور پہنچتے تھے۔ اس بار رفقاء کراچی میزبانی کے فرائض انجام دیں گے اور پاکستان کے دیگر علاقوں کے رفقاء طویل مسافت طے کر کے کراچی پہنچیں گے۔ کراچی کے حالات اگرچہ قابل اطمینان تو نہیں ہیں لیکن اہل کراچی اب ان حالات کے عادی ہو چکے ہیں اور اِکاّ دُکاّ دہشت گردی کے واقعات ان کے لئے معمول کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ الحمدللہ کہ رفقاء کراچی پوری جانفشانی اور لگن کے ساتھ اجتماع کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس اجتماع کو رفقاء یا تنظیم اور تحریک کے لئے ہی نہیں ملک میں جاری غلبہ و اقامت دین کی وسیع تر جدوجہد کے لئے بھی خیر و برکت کا ذریعہ بنا دے۔ (آمین)

قرآن حکیم کی قوّتِ تسخیر

اظہارِ تشکراور تحدیثِ نعمت پر مشتمل

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کا یہ فکر انگیز خطاب آج سے ساڑھے چھ سال قبل ایک ایسے موقع پر ہوا تھا جب محترم ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ قرآن کے انقلابی فکر پر مبنی دو اداروں یعنی تنظیم اسلامی اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ اجتماعات کا انعقاد حسنِ اتفاق سے ایک ہی تاریخوں میں تھا۔ اس خطاب کے ذریعے جہاں ان دونوں تحریکوں کے قیام کے پس منظر پر عمدگی کے ساتھ روشنی پڑتی ہے وہاں قرآن حکیم کا یہ پہلو کہ یہ کتاب اپنے اندر بے پناہ قوتِ تسخیر رکھتی ہے اور فکری و علمی سطح پر عصائے موسیٰ کی طرح تمام باطل نظریات کا قلع قمع کرنے کی صلاحیت اس کے اندر بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے' بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔ اب تنظیم اسلامی کے بائیسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر چونکہ پھر یہ صورت بن گئی ہے کہ ماہ نومبر کے پہلے عشرے ہی میں مرکزی انجمن اور تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماعات یکجا ہو گئے ہیں تو مناسب خیال کیا گیا کہ اس خطاب کو اس موقع کی مناسبت سے افادۂ عام کے لئے ''میثاق'' میں شائع کر دیا جائے۔ (ادارہ)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا سالانہ اجلاسِ عام ۲۰/ اپریل کی شام کو منعقد ہوا اور اس سے قبل مسلسل چار دن تک تنظیم اسلامی کا سترہواں سالانہ اجتماع جاری رہا۔ یوں سمجھئے کہ تحریکِ قرآنی کے اس قافلے نے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے نام سے محوِ سفر ہے' اپنے زندگی کے بیس برس مکمل کر لئے۔ اسی طرح تنظیم اسلامی کی عمر بھی اب سترہ برس ہو گئی ہے۔ اس عرصے کے دوران جو خیر بھی بن آیا ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق اور اُس کی نصرت و اعانت کے طفیل ہوا' اِس پر اُس منعم کا جتنا بھی شکر

ادا کیا جائے کم ہے۔ احباب جانتے ہیں کہ گزشتہ ایک سال کے دوران متعدد مواقع پر میں چند خاص حقائق کے حوالے سے بعض امور پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کرتا رہا ہوں۔ آج پھر میں چاہتا ہوں کہ انہیں یکجا کر کے اور مرتب انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

تحریک میں تسلسل اور دوام —— ایک لائقِ شکر بات

سب سے پہلا شکر ہم پر اس اعتبار سے واجب ہے کہ ہمارے اس کام میں، جس کے یہ دو نمایاں تنظیمی مظہر ہیں، یعنی انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی، الحمد للہ کہ گزشتہ بیس برس سے تسلسل بھی ہے اور تواتر بھی۔ گو ہماری رفتار کوئی بہت زیادہ تیز نہیں رہی، لیکن اس میں جو تسلسل اور تواتر کا پہلو ہے وہ میرے نزدیک بہت اہمیت کا حامل ہے۔ طوفان کی طرح اٹھنے والی تحریکیں بسا اوقات بہت جلد جھاگ کی مانند بیٹھ بھی جاتی ہیں، لیکن جس کام میں تسلسل اور دوام ہو اور جو پیہم کیا جائے اصل میں وہی پائیدار بھی ہوتا ہے اور اسی کے نتیجے میں کوئی حقیقتاً مؤثر اور وقیع کام سرانجام پا سکتا ہے۔ میں نے حالیہ سالانہ اجتماع کے دوران بھی اس ضمن میں دو الفاظ ایک انگریزی محاورے کے حوالے سے استعمال کئے تھے: (۱) Slow اور (۲) Steady۔ ہمارے اب تک کے کام پر یہ دونوں الفاظ منطبق ہوتے ہیں۔ اس میں یقیناً ہمارے لئے اطمینان بلکہ بشارت کا بہت کچھ سامان موجود ہے اور ہمیں اس پر تہہ دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

اسی طرح شکر کے لائق ایک اور بات یہ ہے کہ ہماری اس اجتماعیت میں اس بیس سال کے عرصے میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا، کوئی بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا۔ انجمنوں اور اداروں کی زندگیوں میں بڑے بڑے طوفان آتے ہیں اور ایسے بڑے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ادارے کی بساط تک لپیٹنے کی نوبت آ جاتی ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر انجمنوں کا نظام بڑا ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے، اس میں بالعموم کچھ سرکردہ شخصیتوں کا ٹکراؤ ہو جایا کرتا ہے اور باہم کھینچ تان عام طور پر جاری رہتی ہے جو نہایت مضر اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ الحمد للہ، ثم الحمد للہ ہمارا یہ ادارہ اس نوع کی خرابیوں

سے بالکل محفوظ رہا ہے۔ یہ قرآن اکیڈمی انجمن کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز رہی ہے اور یہاں آس پاس کے رہنے والے بخوبی واقف ہیں کہ ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ الحمد للہ یہاں کبھی پیش نہیں آیا۔ گزشتہ بیس سال کے دوران مرکزی انجمن کے کسی بھی فنکشن میں، خواہ وہ عمومی اجلاس ہو اور خواہ مجلس منتظمہ کی خصوصی میٹنگ ہو، کبھی کوئی تلخی نہیں ہوئی، کبھی کسی تو تکار کی نوبت نہیں آئی۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے ـــــ شکر کے بارے میں میں نے بارہا اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ جب تک انسان کو پورا شعور حاصل نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر کتنا بڑا فضل اور انعام ہوا ہے، اُس وقت تک اس کے متناسب اور Proportionate شکر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ادراک اور شعور کہ مجھ پر اللہ کا کتنا بڑا احسان اور کتنا عظیم فضل ہوا ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جتنا یہ شعور اور احساس گہرا ہو گا جذبۂ تشکّر بھی اتنی ہی گہرائی سے برآمد ہو گا اور اسی قدر قوت کے ساتھ یہ جذبۂ شکر ایک چشمہ کی مانند قلب کی گہرائیوں سے اُبلے گا۔

کم و بیش اسی طرح کا معاملہ الحمد للہ تنظیم اسلامی کا بھی ہے کہ کوئی بڑا اختلاف اور انتشار وہاں بھی رونما نہیں ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ انسانوں کی جماعت میں کچھ نہ کچھ لوگوں کا اختلاف کرنا یا اِکّا دُکّا لوگوں کا جماعت سے علیحدہ ہو جانا بالکل فطری امر ہے، کوئی بھی جماعت اس سے خالی نہیں رہی، یہاں تک کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعتوں میں بھی ایسے لوگ نکل آتے تھے کہ جو ساتھ چھوڑ جاتے تھے، تو تنظیم اسلامی کے اندر بھی اس طرح کے چند واقعات کا ہونا موجبِ حیرت یا باعثِ تشویش نہیں ہونا چاہئے۔ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں کئی مواقع ایسے آئے کہ بعض لوگ متزلزل ہوئے یا ساتھ چھوڑ گئے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ بات مذکور ہے کہ واقعۂ معراج کے بعد ایسے متعدد مسلمان جو نئے نئے ایمان لائے تھے اور ابھی ایمان میں پختہ نہیں ہوئے تھے، متزلزل ہو گئے تھے۔ اسی طرح حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے شوہر جو صاحب ایمان تھے اور اپنی اہلیہ سمیت حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، وہاں جا کر مُرتد ہو گئے۔ شوہر کے مُرتد ہو جانے کے بعد حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا چونکہ اس کے نکاح میں نہیں رہیں تو پھر حضور ﷺ نے ان کی دلجوئی کے لئے مدینہ منورہ سے نکاح کا پیغام بھجوایا، اس لئے کہ وہ قریش کے ایک بہت بڑے سردار

ابو سفیان (رضی اللہ عنہ) کی صاحبزادی تھیں اور اس حوالے سے ان کا جو مقام و مرتبہ تھا اس کے پیش نظر حضور ﷺ نے مناسب سمجھا کہ ان سے خود نکاح کریں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ حضور ﷺ کی طرف سے مہر بھی حضرت نجاشی رحمۃ اللہ علیہ نے ادا کیا تھا۔ اس لئے کہ بوقتِ نکاح حضور ﷺ مدینہ میں تھے اور حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا ابھی حبشہ ہی میں تھیں' وہ پھر بعد میں مدینہ تشریف لائی تھیں۔

بہرحال میں نے یہ چند مثالیں دی ہیں کہ تحریکوں اور جماعتوں میں کچھ نہ کچھ لوگوں کی تو اس طرح آمد و رفت رہتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے دور میں یہ بہت کم تھی اور آج کے دور میں غلبہ و اقامتِ دین کے لئے جو بھی تحریک اُٹھے گی اس میں یقیناً ایسے واقعات نسبتاً زیادہ ہوں گے' لیکن الحمد للہ تنظیم اسلامی کو قائم ہوئے سترہ برس ہو چکے ہیں' اس میں کوئی بڑا ہنگامہ یا کوئی بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا' کسی بڑی تعداد میں لوگوں کی اس سے علیحدگی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا' اور یہ چیز یقیناً ایسی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ادراک اور شعور کرتے ہوئے کہ ہمارے اس کام کی رفتار گو کم رہی لیکن اس میں دوام' تسلسل اور تواتر رہا ہے' اپنے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر یہ قافلہ اسی دوام اور تسلسل سے چلتا رہے تو میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ پائیدار نتائج کے بر آمد ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

توازن واعتدال ــــ ایک اہم وصف

دوسری بات جس پر ہمیں صمیمِ قلب کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور خاص طور پر میں اپنی ذات کے حوالے سے بار بار اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں' یہ ہے کہ جیسے ہماری تنظیم میں تسلسل اور تواتر موجود ہے اسی طرح یہاں توازن اور اعتدال کا وصف بھی الحمد للہ پایا جاتا ہے۔ یہ وصف اپنی جگہ نہایت ضروری بھی ہے اور اہم بھی۔ اکثر تحریکوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مرحلے کے بعد جب وہ تحریک دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو پہلے مرحلے کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک انسان جب سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھ جائے تو پھر سیڑھی کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں رہتی'

اس لئے کہ جو مقصد اس سے حاصل کرنا تھا وہ حاصل کر لیا۔ الحمد للہ کہ ذاتی طور پر میں اس معاملے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں نے دعوت رجوع اِلی القرآن کا جو کام شروع کیا تھا اس میں ابتدائی چھ سات برس میں نے تن تنہا کام کیا۔ اُس وقت انجمن خدام القرآن کا وجود نہیں تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں یہ انجمن قائم ہوئی۔ پھر ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ تو درحقیت میرے پیش نظر یہ دو کام ہیں جو قریباً متوازی اور متساوی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میری زندگی میں ان میں سے کس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے' بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہو گا کہ ان کا معاملہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلے کام کا عنوان "دعوت رجوع اِلی القرآن" ہے جس کے لئے مرکزی انجمن خدام القرآن وجود میں آئی اور دوسرا کام جس کے لئے تنظیم اسلامی تشکیل دی گئی ہے' غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجہد سے عبارت ہے۔ رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ اب بھی میری توانائیوں کا کافی بڑا حصہ پہلے کام یعنی دعوت رجوع الی القرآن میں کھپ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ میں نے سمجھا ہو کہ اس کام کا تعلق تو میرے جہادِ زندگانی کے ابتدائی مرحلے سے تھا اور اب مجھے تحریک' تنظیم اور انقلاب ہی کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جانا چاہئے۔ الحمد للہ کہ اس معاملے میں میرا طرزِ عمل توازن و اعتدال پر مبنی رہا ہے۔

"اتمامِ نور" اور "غلبۂ دین حق" : گاڑی کے دو پہیّے

اس سال ملتان میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے دوران پہلی مرتبہ میرا ذہن اس حقیقت کی جانب منتقل ہوا کہ قرآن مجید میں دو مقامات پر گاڑی کے ان دو پہیّوں کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ یہ محاورہ کہ گاڑی دو پہیوں پر چلتی ہے اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ اگر ایک پہیّہ جام ہو جائے گا تو گاڑی گھومنے لگے گی' آگے نہیں بڑھے گی۔ اس کے دونوں پہیے چل رہے ہوں تو پھر گاڑی کے لئے ممکن ہو گا کہ وہ ایک خطِ مستقیم میں آگے کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ گاڑی کے جن دو پہیوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کا تذکرہ سورۃ التوبہ میں بھی اور سورۃ الصف میں بھی بالکل ساتھ ساتھ آیا ہے۔ سورۃ الصف کی یہ آیات تو اکثر

حضرات کو یاد ہوں گی اور ان کا مفہوم بھی ذہن میں ہو گا :

﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ ﴾

اور سورۃ التوبہ کے الفاظ یہ ہیں :

﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ ﴾

ذرا غور کیجئے ' قرآن حکیم کے یہ دونوں مقامات اسلوب کے اعتبار سے کتنے مشابہ ہیں ' بلکہ الفاظ بھی کم و بیش بالکل ایک سے ہیں ' صرف پہلی آیت کے بعض الفاظ ایک دوسرے سے کچھ مختلف نظر آتے ہیں ' ورنہ آیت کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یہاں دو مقاصد کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے دو ٹوک الفاظ میں فرمایا کہ یہ دونوں کام اب پورے ہو کر رہیں گے چاہے مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو اور چاہے کافروں کو کتنا ہی ناپسند ہو!! ایک مقصد ہے اِتمامِ نور ' جس کے لئے سورۃ الصف میں الفاظ آئے : "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ" کہ اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی ناپسند ہو۔ اور دوسرا کام یا دوسرا مقصد اگلی آیت میں بیان ہوا ' جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ دینِ حق کو غالب کرے خواہ یہ چیز مشرکوں کو کتنی ہی ناپسند ہو! ـــــ مؤخر الذکر بات سورۃ التوبہ میں بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں آئی ہے ' ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے :

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ ﴾ پہلی آیت میں تھوڑا سا لفظی فرق موجود ہے۔ سورۃ الصف میں فرمایا : "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا" جبکہ سورۃ التوبہ میں "يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا" کے الفاظ آئے۔ یعنی ایک حرفِ ناصب کی جگہ دوسرا حرفِ ناصب آ گیا۔ اسی طرح سورۃ الصف میں "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ" کے الفاظ ہیں جبکہ سورۃ التوبہ میں اسی مفہوم کو "وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ"

کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا' جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ بہرطور اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا' خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناپسند ہو!

گاڑی کے انہی دونوں پہیوں کو سورۃ المائدہ کی اس عظیم آیت میں بھی جمع کیا گیا جو بڑی مشہور ہے اور جس کے بارے میں یہود کے بعض علماء نے کہا تھا کہ اے مسلمانو' یہ آیت جو تمہیں عطا ہوئی ہے اگر ہمیں عطا ہوتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنا سالانہ جشن اور سالانہ عید قرار دیتے۔ اس آیت کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجئے۔ فرمایا ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾ وہی دونوں چیزیں یہاں جمع کر دی گئیں: "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے "دین" کو کامل کر دیا' یعنی وہ دین حق جس کا غلبہ واظہار بعثت محمدیؐ کا اصل مقصد ہے' آج مکمل ہو گیا' "وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ" اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا۔ اس سے مراد نورِ ہدایت کا اتمام اور تکمیل ہے جس کا ذکر سورۃ الصف میں "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ" کے الفاظ میں وارد ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اتمامِ نور یعنی اتمامِ ہدایت ہی درحقیقت اتمامِ نعمت ہے۔ گویا اصل نعمت ہے ہی نعمتِ ہدایت! دنیا کی کوئی شے نعمت نہیں ہے جب تک نعمتِ ہدایت اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ نعمتِ ہدایت کے بغیر دولت' صحت' اولاد' اقتدار غرضیکہ کوئی شے نعمت نہیں ہے' بلکہ یہ سب عذاب کا موجب بن جانے والی چیزیں ہیں' ان کا غلط استعمال انسان کو ہلاکت و بربادی سے دوچار کر دے گا۔ ہاں اگر ہدایت موجود ہو تو پھر اولاد بھی نعمت ہے' پھر دولت بھی ایک عظیم نعمت سے کم نہیں کہ انسان اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا۔ اسی طرح ہدایت اگر موجود ہو تو صحت بھی نعمت ہے کہ انسان اللہ کے دین کے لئے بھاگ دوڑ کرے گا' محنت اور مجاہدہ کرے گا۔ نعمتِ ہدایت کے ساتھ ذہانت بھی ایک نعمت شمار ہو گی کہ اس کا استعمال اللہ کے دین کے لئے ہو گا' ورنہ یہی ذہانت انسان کو Evil Genius بنا دے گی اور انسان کی اخروی تباہی کا ذریعہ بن جائے گی ـــــ تو معلوم ہوا کہ اصل نعمت ہے ہی نعمتِ ہدایت!

ایک قابلِ لحاظ فرق

اب یہ بات نوٹ کیجئے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تو نورِ ہدایت بھی مکمل ہو گیا اور دین حق کا غلبہ و اظہار بھی سرزمین عرب کی حد تک مکمل ہو گیا' گویا گاڑی کے یہ دونوں پہیے مساوی انداز میں ساتھ ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے رہے' لیکن حضورؐ کے دور کے بعد ان دونوں چیزوں کے درمیان ایک فرق واقع ہو گیا۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

دیکھئے اتمامِ نور تو قرآن کی شکل میں ہوا کہ ۲۳ برس میں قرآن حکیم کا نزول مکمل ہوا۔ اس طرح اتمامِ نور ہو گیا اور اس نور کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر لیا گیا' اس میں اب کہیں کوئی تحریف نہیں ہو سکتی۔ لیکن اقامتِ دین کے مرحلہ کی تکمیل کا کام جس کے لئے سورۃ الصف میں "اظہار دین الحقّ علی الدّین کُلِّه" کی اصطلاح آئی ہے' حضور ﷺ کے زمانے میں ایک حد تک مکمل ہو گیا تھا کہ اندرون ملک عرب دین حق کا پرچم لہرانے لگا۔ پھر دورِ خلافت راشدہ میں اس کی توسیع بڑے بھرپور انداز میں ہوئی۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ یہ عمل رُک گیا' بلکہ رفتہ رفتہ دین کی یہ عالیشان عمارت منہدم ہونے لگی' یہاں تک کہ بالکل زمین بوس ہو گئی۔ اب صورت یہ ہے کہ اسلام محض ایک مذہب کے طور پر تو باقی ہے لیکن دین حق اور نظامِ اسلام اپنی صحیح صورت میں زمین کے کسی ایک خطے میں بھی قائم و نافذ نہیں' اور اب غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد ہمیں از سرنو کرنی ہو گی ـــــ تو یہ ہے وہ بڑا فرق جو اس معاملے میں واقع ہوا کہ دونوں کام جو نبی اکرم ﷺ کے دور میں گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ساتھ ساتھ چل رہے تھے' بعد میں ہم آہنگ نہ رہ سکے۔

اِتمامِ نور کے ضمن میں ہماری ذمہ داری

جہاں تک نورِ ہدایت کے اتمام کا تعلق ہے ہم مسلمانوں کے لئے یہ کتنی بڑی سہولت ہے کہ ہمیں پورا یقین اور اعتماد ہے کہ اس "کتاب" میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا

ہے : ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ (ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔ قرآن حکیم اپنی جگہ خود بھی اللہ کی عظیم ترین نعمت ہے اور اللہ کا مزید فضل و کرم ہم پر یہ ہوا کہ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اُس نے لے لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس نعمت کی قدر نہیں ہے اور ہم دنیا کی حقیر سی چیزوں کو اس نعمتِ عظمیٰ پر ترجیح دیتے ہیں۔ بہرکیف پہلے کام یعنی "اتمامِ نور" کے ضمن میں ہمارے ذمے صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ نورِ ہدایت موجود ہے' اسے عام کیا جائے' اس کا افشاء کیا جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ چراغ جلا کر بلندی پر رکھا جاتا ہے' اسے نیچے کہیں چھپا کر نہیں رکھا کرتے۔ چراغ اگر بلندی پر ہو گا تو ماحول کو منور کرے گا' اس کی روشنی پھیلے گی۔ تو نورِ ہدایت کا عام کرنا' اس سے ماحول کو منور کرنا اور اس کا افشاء کرنا ہمارے ذمے ہے۔ یہی بات اس حدیث نبویؐ میں آئی ہے جو حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا : ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) اے قرآن والو' قرآن کو تکیہ نہ بنالینا' اسے محض ذہنی سہارا نہ بنالینا۔ بلکہ : ((وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ)) اس کی تلاوت کیا کرو جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' رات اور دن کے اوقات میں۔ ((وَاَفْشُوْہُ)) اور اسے عام کرو' اسے پھیلاؤ' چہار دانگِ عالم تک اس کا نور پہنچا دو!

اسی بات کا ایک منطقی نتیجہ اور بھی نکلتا ہے جس کا ذکر عظمتِ قرآن کے بیان میں اس طویل حدیث میں آیا ہے جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں : ((وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدٰی مِنْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ)) کہ جو شخص اس قرآن کو چھوڑ کر کہیں اور ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا۔ جب ہدایت و رہنمائی کا اتنا حتمی اور یقینی منبع و سرچشمہ اور اتنا مکمل source (ذریعہ) تمہارے پاس موجود ہے' تو اس کے ہوتے ہوئے ہدایت و رہنمائی کے لئے دائیں بائیں دیکھنا گویا انتہا درجے کی ناقدری ہی نہیں قرآن مجید کی توہین کے مترادف ہے۔ البتہ اس کا یہ مفہوم سمجھنا بھی درست نہ ہو گا کہ قرآن کے سوا اور کچھ پڑھنا ہی نہیں چاہئے! اور چیزوں کا مطالعہ کیجئے' تورات پڑھئے' انجیل پڑھئے' لیکن انہیں منبع و سرچشمۂ ہدایت سمجھ کر نہیں بلکہ محض اپنی

معلومات میں اضافے کے لئے ان کا مطالعہ کیجئے۔ وہ اسی کتابِ ہدایت کے سابقہ ایڈیشن ہیں جس کا تکمیلی ایڈیشن قرآن حکیم ہے۔ اسی طرح دوسرے علوم بھی اپنی معلومات میں اضافے کے لئے پڑھے جاسکتے ہیں' بلکہ دوسرے علوم کو قرآن مجید کے فہم کا ذریعہ سمجھ کر سیکھئے اور پڑھئے' اس لئے کہ انسانی ذہن کا ظرف جتنا وسیع اور کشادہ ہوگا اسی کی مناسبت سے قرآن مجید سے ہدایت اور علم و معرفت کے موتی انسان اپنے دامن میں سمیٹ سکے گا۔ دامن ہی اگر تنگ ہو تو انسان کے حصے میں حکمت و معرفت کے موتی بھی کم ہی آئیں گے۔ گویا ع "پھول کھلے ہیں گلشن گلشن' لیکن اپنا اپنا دامن!" قرآن مجید کے اندر تو ہدایت' علم اور معرفت کی کوئی کمی نہیں' ان کے جواہر سے یہ معدن بھرا پڑا ہے لیکن تمہاری اپنی تنگ دامانی آڑے آجائے تو اس کا کیا علاج؟

واضح رہے کہ دوسرے علوم کے ذریعے سے قرآن مجید کی حقانیت کا مزید مبرہن ہو جانا خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۃ حم السجدہ میں فرمایا گیا : ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ کہ ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور انفس میں بھی' حتیٰ کہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن مجید ہی سراسر حق ہے۔ گویا کہ جتنا انسان کے علم کا دائرہ وسیع ہوگا قرآن مجید کی حقانیت اسی درجے میں مزید مبرہن ہو جائے گی' اسی قدر اس کا اثبات زیادہ ہوگا۔ ان اعتبارات سے دوسرے علوم سے اعتناء کرنے یا ان سے دلچسپی رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ایک بندۂ مومن کے لئے یہ احساس و شعور لازم ہے کہ منبع ہدایت سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں! حضور ﷺ کی یہ وارننگ ہمیشہ اس کے پیش نظر رہنی چاہئے کہ : "وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى مِنْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ"۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اس اعتبار سے تو اتمامِ نور ہو گیا کہ قرآن حکیم کا نزول حضور اکرم ﷺ پر مکمل ہوا اور اللہ نے قیامت تک کے لئے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا' لیکن اس ضمن میں ایک کام ہمارے ذمے باقی ہے اور وہ ہے اس نورِ ہدایت کا عام کرنا' جس کے لئے حدیث میں "وَاَفْشُوْهُ" کا لفظ آیا ہے کہ اسے پھیلاؤ اور عام کرو ـــــ اور یہ افشاء ہر سطح پر ہوگا' عوام کی سطح پر بھی اسے پھیلانا ہوگا اور خواص کی سطح پر بھی' فلسفیوں اور

دانشوروں تک بھی اس کے ابلاغ کا حق ادا کرنا ہو گا اور شریر اور جھگڑالو لوگوں پر بھی مجادلۂ حَسنہ کے ذریعے حجت قائم کرنی ہو گی۔ یہ سب انشاء ہی کی مختلف سطحیں ہیں!

گاڑی کا دوسرا پہیّہ : غلبۂ دین کی جدّوجُہد

اس گاڑی کا جو دوسرا پہیہ ہے یعنی غلبۂ دینِ حق' اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں "وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" کی شان ظاہر ہوئی اور دینِ حق کا غلبہ ملکِ عرب کی حد تک مکمل ہو گیا۔ پھر خلافتِ راشدہ کے دوران کرۂ ارضی کے ایک بہت بڑے رقبے پر دینِ حق غالب و نافذ ہوا اور اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ لیکن پھر اس معاملے میں زوال کا آغاز ہو گیا اور تدریجاً زوال کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ یوں سمجھئے کہ سب سے پہلے قصرِ اسلام کی چھٹی منزل گری' پھر پانچویں منزل منہدم ہوئی' پھر چوتھی اور پھر تیسری' اور اس طرح آج سے قریباً ڈیڑھ دو سو برس قبل پوری عمارت زمین بوس ہو گئی۔ چنانچہ اب اس کی تعمیر از سرِنو کرنی ہو گی۔ بہرکیف اِس وقت صرف اسی نکتے کی جانب متوجہ کرنا مقصود تھا کہ یہ دو کام بالکل متوازی (Parallel) ہیں' قرآن مجید نے دونوں مقامات پر یعنی سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں ان دونوں کو باہتمام یکجا بیان کیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ ان دونوں کو متوازی اور متساوی انداز میں آگے بڑھایا جائے۔ ان میں توازن و اعتدال برقرار رہنا چاہئے۔ اور اس پر بھی میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اُس کے فضل و کرم کے طفیل یہ دونوں چیزیں ہمارے یہاں بالکل متساوی اور متوازی شکل میں چل رہی ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کے تحت قائم ہونے والی قرآن اکیڈمی اور اسی طرح ذیلی انجمنیں اور ذیلی اکیڈمیز جو وجود میں آ رہی ہیں یہ سب درحقیقت ہماری گاڑی کے ایک پہیئے کے مظاہر ہیں جو الحمد للہ نہ صرف یہ کہ ایک تسلسل کے ساتھ رواں دواں ہے بلکہ اس کی رفتار میں بتدریج اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ دوسرا پہیہ تنظیم اسلامی سے عبارت ہے جس کی حرکت کو تیز کرنے کے لئے ہم نے "تحریک خلافت" کا عنوان اختیار کیا ہے۔ لیکن تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت اصلاً ایک ہی کام کے دو گوشے یا دو مرحلے ہیں اور اس

تمام تر کام کا ہدف ایک ہی ہے' یعنی دین حق کا غلبہ و اقامت۔ چنانچہ فی الاصل کام دو ہی ہیں جو ایک دوسرے کے متوازی اور Parallel ہیں۔ ایک ہے رجوع الی القرآن کی دعوت جس کے لئے مرکزی انجمن سرگرم عمل ہے اور دوسرا ہے اقامت دین کی جدوجہد جس کے لئے تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت بر سر عمل ہیں۔

تحریک رجوع الی القرآن کا تسلسل برقرار رہے گا!

ایک اور لائقِ شکر اور قابلِ اطمینان پہلو

تیسری بات جس پر میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں اور جس کا میں نے بارہا ذکر بھی کیا ہے' یہ ہے کہ اس کام کے باقی اور جاری رہنے کا اہتمام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں یہ نظر آ رہا ہے اور مجھے یہ اطمینان حاصل ہے کہ اس کام کا تسلسل ان شاء اللہ برقرار رہے گا۔ یہ بھی یقیناً اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ ورنہ بعض بڑی نامور ہستیاں ایسی ہو گزری ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگیوں میں بڑے بڑے کام کر کے دکھائے لیکن ان کے جانے کے بعد اس کام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ ایک آدمی منظر سے ہٹا اور کام ختم ہو گیا۔ تو میرے لئے یہ بات بڑے اطمینان کی ہے اور اس پر بھی میں جتنا اللہ کا شکر ادا کروں کم ہے اور میرے ساتھیوں کو بھی اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہئے۔ بالخصوص یہ جو بنیادی کام دعوت رجوع الی القرآن کا ہے اس کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ بحمد اللہ اب ایک ایسی نسل ثانی تیار ہو چکی ہے اور کم و بیش چالیس پچاس نوجوانوں پر مشتمل ایک ایسی ٹیم وجود میں آ چکی ہے جو درسِ قرآن کے اس تسلسل کو ان شاء اللہ برقرار رکھے گی جس کا میں نے کبھی ۶۵ء میں آغاز کیا تھا۔ مجھے اطمینان ہے کہ دروس قرآن کے حوالے سے قرآن کا انقلابی فکر اور اس کا صغریٰ کبریٰ ان کے ذہن و فکر کی گرفت میں آ چکا ہے' اس میں جو منطقی ترتیب (Logical Sequence) ہے اسے انہوں نے خوب اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے اور وہ اب اس قابل ہیں کہ اسے بیان بھی کر سکیں۔ ظاہر بات ہے کہ صلاحیت بیان میں نکھار تو وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ اور اس صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے ہی سے پیدا ہوگا۔ لیکن اصل شے بنیادی فکر اور اس کے طرزِ استدلال کا ذہن کی گرفت میں آنا ہے جو الحمدللہ انہیں حاصل ہے۔ اس کے بعد تو پھر اپنی اپنی محنت اور کوشش ہے۔ اس فکر قرآنی کو عام کرنے اور بیان کرنے میں جتنی محنت اور جس درجے پیہم کوشش ہوگی اسی نسبت سے ان کی صلاحیت نکھرے گی۔ چنانچہ گزشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر میرا کوئی درسِ قرآن نہیں ہوا تھا بلکہ درسِ قرآن میرے نوجوان ساتھیوں نے دیا۔ اس سال بھی انہی نوجوان ساتھیوں نے سالانہ اجتماع میں قرآن حکیم کا درس دیا۔

ذیلی انجمنوں اور ان کے تحت اکیڈمیز کا قیام

اسی طرح یہ بات بھی بڑی خوش آئند اور لائق تشکر ہے کہ مرکزی انجمن کی کوکھ سے اب تک کئی منسلک اور ذیلی انجمنیں برآمد ہو چکی ہیں۔ اس سال ۲۰/ اپریل کو مرکزی انجمن کا جو اجلاسِ عام ہوا اس میں پہلی مرتبہ بہت سے حضرات کے سامنے یہ بات آئی ہو گی کہ پاکستان کے کئی شہروں میں مرکزی انجمن کے طرز پر منسلک انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا کہ ہمارے اس اجلاسِ عام میں ذیلی انجمنوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے اور انہوں نے بھی اپنے اپنے علاقے کی انجمن خدام القرآن کا مختصر تعارف کرایا اور خدمتِ قرآنی کے میدان میں اپنی پیش رفت کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر کیا۔ اس سے بڑھ مقامِ شکر یہ ہے کہ ان انجمنوں کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمیز کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ قرآن اکیڈمی کراچی کی نہ صرف یہ کہ تعمیر ایک حد تک مکمل ہو چکی ہے بلکہ وہاں دینی تعلیم کے ایک سالہ کورس کی تدریس کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پہلی مرتبہ کسی کام کا شروع کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن ایک بار محنت کرنے سے جب ایک Pattern اور عملی نمونہ سامنے آجاتا ہے تو اس کام کا کرنا مشکل نہیں رہتا۔ اس اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تشکیل اور قرآن اکیڈمی کے قیام میں محنت بھی زیادہ صرف ہوئی اور وقت بھی بہت لگا۔ لاہور میں مسلسل پانچ چھ برس میں نے فکر قرآنی کی اشاعت کا کام تن تنہا کیا جس کے نتیجے میں

بحمد اللہ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن وجود میں آئی۔ پھر مزید پانچ سال بعد قرآن اکیڈمی کی پہلی اینٹ رکھنے کی نوبت آئی۔ عمارت کی تعمیر بھی مرحلہ وار ہوئی۔ آغاز میں صرف دفاتر یا رہائشی بلاک کی تعمیر عمل میں آئی۔ پھر کئی برس بعد جا کر قرآن اکیڈمی میں دینی تعلیم کے دو سالہ کورس کا آغاز ہوا۔ اس طرح یہ داستان برسوں پر محیط ہے۔ اس لئے کہ یہ کام پہلی بار ہو رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ اس کام کا ایک ہیولیٰ اور ابتدائی خاکہ بن چکا ہے اور اس کے بہت سے مراحل طے ہو چکے ہیں تو قوی امید ہے کہ بقیہ جگہوں پر مرکزی انجمن کی نہج پر جو کام ہو رہے ہیں ان میں اتنا وقت نہیں لگے گا بلکہ تیز رفتاری کے ساتھ انجمن کی تاسیس سے لے کر قرآن اکیڈمی کی تعمیر اور آغازِ تدریس تک کے مراحل طے کئے جا سکیں گے۔ چنانچہ کراچی میں بحمد اللہ کام کی رفتار تیز ہے۔ اب ملتان میں بھی اللہ کے فضل و کرم سے ایک اکیڈمی وجود میں آ چکی ہے' اس سال رمضان میں وہاں میرا دورۂ ترجمۂ قرآن بھی ہوا ہے اور اب اُمید ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال میں وہاں قرآن کالج کا آغاز ہو جائے گا۔ فیصل آباد میں منسلک انجمن موجود ہے۔ وہاں اکیڈمی کے لئے بعض مخیر خواتین نے ایک خاصا وسیع قطعۂ زمین ہمیں ہبہ کیا ہے اور اب وہاں بھی تعمیر کا کام شروع ہوا چاہتا ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ اس سالانہ اجلاس عام کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ ان شاء اللہ العزیز پشاور' رحیم یار خان' حیدر آباد اور اسلام آباد میں بھی بہت جلد ذیلی انجمنوں کا قیام عمل میں آ جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اسی سال کے دوران وہاں اکیڈمیز کا کام بھی شروع ہو جائے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

دورۂ ترجمۂ قرآن : تحریک رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگِ میل

اسی طرح یہ بات بھی بڑی خوش آئند ہے کہ اس سال ماہ رمضان المبارک میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام قریباً گیارہ بارہ جگہوں پر ہوا ہے۔ اس کے ضمن میں تو مجھے کبھی کبھی حفیظ کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ ؎

کیا پابندِ نَے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

یہ بات میں نے بغیر کسی عُجب کے محض امر واقعہ کے طور پر عرض کی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے میرے ذہن کو ادھر منتقل کیا۔ ہم نے جب نمازِ تراویح کے ساتھ بیان القرآن کا آغاز کیا تو شروع میں تراویح کے اختتام پر یا کبھی بیچ بیچ میں پندرہ بیس منٹ یا آدھ گھنٹے کا بیان ہوتا تھا۔ اس کے بعد میرا ذہن اس حقیقت کی جانب منتقل ہوا کہ احادیثِ مبارکہ میں تو رمضان المبارک کے دوگونہ پروگرام کا ذکر ملتا ہے یعنی دن کا روزہ اور رات کا قیام قرآن حکیم کے ساتھ' یہ دونوں بالکل متوازی پروگرام ہیں۔ اس پہلو سے محض نمازِ تراویح ادا کرنے یا ایک آدھ گھنٹے میں خلاصۂ مضامین کے بیان سے تو رمضان المبارک کا حق ادا نہیں ہوتا۔ چنانچہ پھر دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام شروع کیا گیا اور یہ بحمد اللہ آٹھواں یا نواں موقع تھا کہ مجھے دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی سعادت حاصل ہوئی —— اس سال یہ پروگرام پانچ جگہوں پر ہوا۔ ایک جگہ میں نے قرآن کا ترجمہ بیان کیا اور چار دیگر جگہوں پر میرے شاگردوں نے مکمل ترجمہ قرآن بیان کیا۔ مزید برآں دورانِ رمضان نمازِ تراویح کے ساتھ چار پانچ جگہوں پر ویڈیو کے ذریعے یہ پروگرام لوگوں نے دیکھا اور سنا۔ رجوع الی القرآن کی یہ لہر الحمد للہ بڑھ رہی ہے اور اس میں لوگوں کا قرآن سے شغف اور تعلق بڑھ رہا ہے۔ پوری رات قرآن حکیم اور اس کا مفہوم سننے سمجھنے میں جو لذت ہے اس کا اس سے پہلے لوگوں کو تجربہ نہیں تھا۔ "ع "چوں معاملہ نہ دارد سخن آشنا نہ باشد!" جب تک باہم محبت کا رشتہ نہ ہو اس وقت تک گفتگو کے اندر بھی وہ لوچ اور مٹھاس پیدا نہیں ہوتی۔ ہاں جب قرآن پاک سے تعارف ہو جائے اور اس سے ایک تعلق خاطر پیدا ہو جائے تو معاملہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے' پھر پوری رات انسان قرآن پڑھنے پڑھانے یا سننے سنانے میں گزار دیتا ہے اور یہ چیز اس پر ہرگز گراں نہیں گزرتی!

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ الحمد للہ ہمارے اس کام میں پیش رفت ہو رہی ہے اور تین اعتبارات سے معاملہ بہت اطمینان بخش ہے۔ ایک یہ کہ گو ہمارے کام کی

رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں رہی تاہم الحمد للہ 'ثم الحمد للہ اس میں تسلسل اور تواتر موجود ہے' طوفان کے مانند اٹھنے اور بگولے کی طرح رخصت ہو جانے کے مقابلے میں یہ سست رفتاری کہیں بہتر ہے اور "سہج پکے سو میٹھا ہو" کے مصداق توقع ہے کہ اس سے ان شاء اللہ پائیدار نتائج پیدا ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ہمارے اس کام کے بھی دو بڑے بڑے گوشے ہیں اور الحمد للہ کہ ان کے مابین توازن واعتدال برقرار ہے۔ ایک گوشہ رجوع الی القرآن کی تحریک کا ہے' جس کے پیش نظر قرآن حکیم کے نورِ ہدایت کو پھیلانا اور اس کے انقلابی فکر کو عام کرنا ہے۔ اس نور کا اتمام اللہ تعالیٰ نے فرما دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا' اب ہمارا کام اس کا افشاء کرنا ہے۔ یعنی اسے چہار دانگِ عالم تک پھیلانا اور ہر ممکن طریقے سے اس کا ابلاغ کرنا اب ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لئے جہاں عوامی سطح پر قرآن کے ذریعے وعظ و نصیحت کا کام ضروری ہے وہاں دانشوروں اور Intellectuals کے لئے ان کی علمی سطح کے مطابق اس کا ابلاغ بھی اسی قدر ضروری اور لازمی ہے ـــــ دوسرا گوشہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کا ہے کہ قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا محض ایک مشغلہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس تعلیم و تعلّم قرآن کے ساتھ ساتھ اس کا دوسرا پہیّہ بھی متوازی چلنا چاہئے۔ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد اور اس کے لئے تنظیم اور تحریک کا کام بھی متوازن انداز میں آگے بڑھنا چاہئے۔ الحمد للہ کہ یہ دونوں کام بہت حد تک متوازن انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ آئندہ کے تسلسل کے بارے میں بھی مجھے اطمینان ہے کہ یہ کام ان شاء اللہ العزیز جاری رہے گا۔ ویسے بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اب عمر کے جس حصے میں ہوں اس کے بعد تو "نَافِلَةً لَّكَ" کا درجہ رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ۲۶/اپریل کو میری عمر کے ساٹھ برس مکمل ہو رہے ہیں اور مسنون عمر تو کُل اکسٹھ یا ساڑھے اکسٹھ برس ہی بنتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی عمر ۶۳ برس قمری حساب سے تھی' شمسی حساب سے یہ قریبا ۶۱ برس بنتے ہیں۔ میری اس بات کو غلط مفہوم میں نہ لیا جائے کہ معاذ اللہ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ اپنی کوئی مشابہت ثابت کرنا چاہتا ہوں بلکہ میں دیانتاً یہ سمجھتا ہوں اور اپنے ان قریبی ساتھیوں سے اکثر یہ بات کہتا ہوں جو اس عمر کو پہنچے ہوئے ہوں کہ ساٹھ اکسٹھ

برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد آدمی کو یہ سمجھنا چاہئے کہ مسنون عمر تو پوری ہوئی' اب بقیہ زندگی بونس ہے' یہ "نَافِلَةً لَّكَ" کے درجے کی چیز ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ کے دین کی خدمت کے لئے صرف ہونا چاہئے۔

ہماری تحریک اور شجرۂ طیّبہ کی مثال

اس ضمن میں ایک اور نکتہ اشارتاً عرض کئے دیتا ہوں اور اس میں بھی میرے لئے اطمینان کا بہت کچھ سامان مضمر ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ایک پاکیزہ درخت کی جو مثال آئی ہے وہ ہمارے اس کام پر بحمد اللہ بہت حد تک صادق آتی ہے ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾ ___ کسی بھی شجرۂ طیبہ یعنی پاکیزہ درخت کی یہ مثال ہے کہ اس کی جڑ مضبوطی کے ساتھ زمین میں قائم ہو اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ الحمد للہ کہ ہمارے کام کی بھی یہی شان ہے۔ دعوت رجوع الی القرآن کا کام اس پوری تحریک کی جڑ کے مانند ہے جو مضبوطی کے ساتھ زمین میں پیوست ہے۔ اس میں ہماری صلاحیتیں اور ہمارے وسائل بھرپور طور پر صرف ہو رہے ہیں۔ تنظیم اسلامی اس شجرۂ طیّبہ کے تنے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے برگ و بار اور اس کی شاخوں کا مقام تحریکِ خلافت کو حاصل ہے۔ اللہ کو اگر منظور ہوا تو یہ کام ضرور آگے بڑھے گا۔

میں نے اپنا یہ تجزیہ کئی مواقع پر آپ کے سامنے رکھا ہے کہ پاکستان کے استحکام اور اس کے بقا کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہی ہے کہ یہاں وہ صحیح اور مکمل اسلامی نظام قائم ہو جس کا عنوان "نظامِ خلافت" ہے۔ اگر پاکستان اور اہل پاکستان کے لئے اللہ نے کسی خیر کا ارادہ فرمایا ہے تو قوی امید ہے کہ یہ تحریک آگے بڑھے گی اور سرزمینِ پاکستان پر نظامِ خلافت کا قیام و نفاذ ہو گا۔ اس لئے کہ پوری دنیا کے اوپر اسلام کا جو غلبہ ہونا ہے جس کی صریح پیشین گوئیاں حضور ﷺ کی احادیث میں موجود ہیں' ظاہر بات ہے کہ اس عمل کا آغاز کسی ایک خطۂ زمین ہی سے ہو گا' اور اگر یہ اللہ کی مشیت میں ہے کہ اس عمل کا نقطۂ آغاز سرزمینِ پاکستان بنے تو یقیناً غلبہ و اقامتِ دین کی یہ جدوجہد آگے بڑھے گی اور اس

کی شاخیں آسمان سے باتیں کریں گی۔ ہاں ہم میں سے ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ اس جدّوجہد میں اس کا ذاتی حصہ (Contribution) کتنا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے ہاں تو حساب کتاب انفرادی بنیادوں پر ہو گا : ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا﴾ وہاں تو ہر شخص انفرادی حیثیت میں پیش ہو گا۔ ہر شخص کو اس کا اعمالنامہ اس کے ہاتھ میں تھمادیا جائے گا اور حکم ہو گا کہ ﴿اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ یہ تمہاری بیلنس شیٹ موجود ہے' اسے پڑھو اور آج اپنے حساب کے لئے تم خود ہی کافی ہو۔ تو ہم میں سے ہر شخص کو اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ دین کی جانب سے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ انہیں ادا کر رہا ہے یا نہیں!

قرآن حکیم کی بے مثال تاثیر اور قوتِ تسخیر

اب تک جو باتیں میں نے عرض کی ہیں وہ اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر بالخصوص ماہ رمضان المبارک کے دوران مختلف اجتماعات میں بیان کر چکا ہوں۔ آج میں ایک اور اہم بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے حالیہ سالانہ اجلاس کے موقع پر میں بطورِ تحفہ شرکاءِ اجتماع کے سامنے رکھنا چاہتا تھا' لیکن چونکہ وہاں ذیلی انجمنوں کے نمائندگان کی تقاریر زیادہ طویل ہو گئیں تو وقت کی کمی کے پیش نظر میں نے اپنی اس گفتگو کو ملتوی کر دیا۔ چنانچہ وہ تحفہ میں آپ کی خدمت میں اب پیش کر رہا ہوں' اور اس کا تعلق قرآن مجید کی قوتِ تسخیر اور اس پر اعتماد اور توکّل سے ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ بندۂ مومن کے لئے اصل سہارا اللہ کی ذات ہے' اور خواہ کوئی ظاہری اور مادی سہارا موجود نہ ہو اور بظاہر ہر طرف سے مایوسی نظر آتی ہو' ایک بندۂ مومن اللہ ہی پر توکّل کرتا ہے اور اس کی رحمت کی آس لگائے رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں جابجا اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ یعنی اہل ایمان کو تو اللہ ہی پر توکّل کرنا چاہئے۔ لیکن میں آج جان بوجھ کر قرآن حکیم پر اعتماد اور توکل کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں تاکہ لوگ چونکیں' ان کے ذہنوں میں سوال اٹھے اور وہ توجہ سے اس بات کو سنیں کہ قرآن کی قوتِ تسخیر اور اس پر توکل و اعتماد کے

بارے میں وہ کیا بشارتیں ہیں کہ جو خود قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں۔

قرآنِ حکیم کی شان

کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ توکّل کے لفظ کا قرآنِ حکیم کے ساتھ اس طور پر استعمال شاید کچھ غیر مناسب ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ اس بات کو پوری وضاحت سے بیان کروں۔ دیکھئے' قرآن مجید ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ جو تاثیر تجلّیٔ ذاتِ باری تعالیٰ کی ہے وہی تاثیر قرآن مجید کی بھی ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رَبّ العزت میں درخواست کی کہ ﴿رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ﴾ کہ اے پروردگار میں تجھے بچشمِ سر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات سمجھانے کی غرض سے کہ وہ تجلّیٔ ذاتِ حق کا تحمل نہ کر پائیں گے' اپنی ایک تجلی پہاڑ پر ڈالی۔ قرآن حکیم نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے : ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا﴾ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی تجلی ذات کے بالواسطہ مشاہدے کا تحمل بھی نہ کر سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یہی بات قرآن مجید کی عظمت کے بارے میں ایک تمثیل کے پیرائے میں سورۃ الحشر میں آئی ہے : ﴿لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ﴾ یعنی "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے"۔ تو درحقیقت جو تاثیر تجلّیٔ باری تعالیٰ کی ہے وہی ہیبت اور وہی دبدبہ کلامِ باری تعالیٰ کا ہے۔ ان دونوں میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اس حقیقت کو بھی علامہ اقبال نے خوب سمجھا اور بڑی خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ میرے علم کی حد تک اِس دَور میں اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس کے ذہن کی رسائی یہاں تک ہوئی ہو۔ فرماتے ہیں :

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں زندہ و پائندہ و گویاست ایں

کہ میں تم سے صاف ہی کہہ دوں جو کچھ میرے دل میں ہے' یہ کتاب نہیں کچھ اور شے

ہے۔ اسے عام معنوں میں کتاب نہ سمجھو' یہ "چیزے دگر" ہے۔ یعنی جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی' اسی طرح یہ کتاب بھی بیک وقت ان دونوں متضاد صفات کی حامل ہے۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات الحی اور القیوم ہے اسی طرح اس کا کلام بھی زندہ و پائندہ ہے۔ قرآنِ حکیم کے لئے "کتابِ زندہ" کے الفاظ تو اقبال نے اور بھی کئی مقامات پر استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ؎

این کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

بہرحال' حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی قوتِ تسخیر کے بارے میں ہم نے بڑی ناقدری کا معاملہ کیا ہے۔ ہمیں نہ تو قرآنِ حکیم کی عظمت کا ادراک حاصل ہے اور نہ اس کی قوتِ تسخیر پر اعتماد۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ کتنی بڑی نعمت اور کیسی عظیم قوت ہے جو اللہ نے قرآنِ حکیم کی صورت میں ہمیں عطا فرمائی ہے۔

دو آیات —— دو عظیم بشارتیں

اسی ضمن میں سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی دو آیات اور سورۃ القصص کی آیت ۸۵ کے حوالے سے بھی میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سورۂ طٰہٰ کی پہلی آیت حروفِ مقطعات پر مشتمل ہے ﴿طٰهٰ ۝﴾ جبکہ دوسری آیت ﴿مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤى ۝﴾ میں ایک عظیم حقیقت کا بیان ہے۔ یہاں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے کہ اے نبی' ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ ناکام ہوں یا بے مراد ہوں —— یہاں ایک تھوڑی سی تفسیری وضاحت ضروری ہے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ "اے نبی' یہ قرآن ہم نے آپ پر اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں"۔ لفظ "تشقٰی" کا مادہ "ش ق ی" ہے جس سے "شقی" کا لفظ بنا ہے۔ یہ لفظ "سعید" کے مقابلے میں آتا ہے۔ چنانچہ شقی اس کو کہتے ہیں جو بدبخت ہو' ناکام ہو' بے مراد ہو۔ یعنی وہ شخص جس کی جدوجہد لاحاصل رہے' نتیجہ خیز نہ ہو رہی ہو' وہ شقی ہے۔ جبکہ مشقت کا لفظ "ش ق ق" کے مادے سے بنتا ہے۔ یہ دونوں مادے چونکہ ایک

دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اسی قرب کے باعث ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں' شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین نے "لتشقٰی" کا ترجمہ "مشقت" سے کیا ہے۔ تاہم مجھے ان سے اختلاف ہے۔ یہاں درحقیقت یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اے محمد (ﷺ) یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل نہیں ہوا کہ آپ ناکام ہوں' یہ تو کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس قرآن میں جو قوتِ تسخیر اور جو تاثیر مضمر ہے اس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سب کے ہوتے ہوئے آپ ناکامی سے دوچار ہو جائیں۔ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے اور منزل مراد تک پہنچیں گے۔ اس دنیا میں بھی آپ کی جدوجہد کامیابی سے ہم کنار ہو گی اور آخرت میں بھی آپ کے مراتب بلند سے بلند تر ہوں گے۔ شقاوت آپ کے حصے میں نہیں آ سکتی' نہ اس دنیا میں نہ آخرت میں۔ یہ قرآن آپ کی کامیابی کی ضمانت ہے' یہ شقاوت کی ہر اعتبار سے نفی کرنے والا ہے۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس میں ہر اُس شخص کے لئے جو قرآن مجید کی کسی بھی درجے میں خدمت کر رہا ہو' کس قدر بشارت ہے اور اس کی دلجوئی کا کتنا کچھ سامان اس میں مضمر ہے۔ ﴿مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى﴾ اس قرآن کی شمشیر کو ہاتھ میں لو' اس کے حقوق کو ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جاؤ' تم خود اپنی آنکھوں سے اس کی قوتِ تسخیر کا مشاہدہ کرو گے۔ اس کے اندر جو ہیبت پنہاں ہے اور اس میں جو بے پناہ تاثیر پوشیدہ ہے' قدم قدم پر اس کے ظاہر تمہارے سامنے آئیں گے اور تم بچشمِ سران کا مشاہدہ کر سکو گے۔

اس ضمن میں تیسری آیت جس کا میں حوالہ دینا چاہتا ہوں' سورۃ القصص کے آخری حصے میں وارد ہوئی ہے۔ تفسیری اعتبار سے اس آیت کے مفہوم کی تعیین میں بھی کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ فرمایا۔ ﴿اِنَّ الَّذِىۡ فَرَضَ عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ﴾ کہ اے نبی جس ہستی نے آپ پر یہ قرآن لازم کیا ہے' (اس قرآن کی تبلیغ اور اس کے ابلاغ کا فرض جس نے آپ پر عائد کیا ہے) وہ آپ کو لازماً لوٹائے گا ایک اعلیٰ لوٹنے کی جگہ کی جانب ــــــ بعض حضرات نے یہاں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "معاد" سے مراد مکّہ مکرمہ ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اس آیت کا تعلق آپ کے سفرِ ہجرت سے ہے کہ جب آپ ہجرت کے لئے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے تو مشرکینِ مکّہ کے تعاقب سے بچنے کے

لئے کچھ دُور تک آپؐ نے عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک مشکل راستہ اختیار کیا تھا۔ اس لئے کہ اگر آپؐ عام شاہراہ پر سفر کرتے تو تعاقب کرنے والوں کی نگاہ میں آ جاتے۔ چنانچہ آپؐ نے وہ پہاڑی راستہ اختیار کیا جو بالکل غیر مستعمل اور غیر مانوس تھا۔ لیکن تقریباً ایک تہائی سفر طے کرنے کے بعد آپؐ پھر اسی شاہراہ پر آ گئے جو مکّہ سے مدینہ کی طرف جاتی تھی۔ جب آپؐ وہاں پہنچے تو چونکہ وہاں آپ کے لئے ایک دوراہے کی صورت بن گئی تھی کہ ایک راستہ مکّے کو جاتا تھا اور دوسرا مدینے کی جانب' تو دل میں ہُوک سی اُٹھی گویا کہ مکّہ نے پھر اپنی طرف کھینچا' بیت اللہ سے اور حرمِ مکی سے جو محبت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو تھی' اس نے آپؐ کو وقتی طور پر بے چین کیا' اُس وقت دلجوئی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی : ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ﴾ کہ اے نبی' آپ گھبرایئے نہیں' مکّہ اور بیت اللہ سے آپ کی یہ جدائی عارضی ہو گی' ہجر کا یہ معاملہ مستقل نہیں رہے گا' یقیناً وہ رب جس نے آپؐ پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کی دعوت کا فریضہ عائد کیا ہے وہ آپ کو لوٹا کر لے جائے گا لوٹنے کی جگہ یعنی مکّہ مکرمہ!

میرے نزدیک یہ بات اپنی جگہ ایک لطیف خیال کے درجے میں تو صحیح ہے لیکن اگر سورۃ القصص کے زمانہ نزول کو دیکھا جائے اور بعض دیگر قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو اس آیت کی یہ تاویل مطابقِ واقعہ معلوم نہیں ہوتی۔ سورۃ القصص اپنے مضامین اور اسلوب کے اعتبار سے ان سورتوں میں شمار ہوتی ہے جو حضور اکرم ﷺ کے مکی دور کے درمیانی عرصے میں نازل ہوئیں۔ پھر یہ بات بھی بڑی قابل لحاظ ہے کہ فتح مکّہ کے بعد بھی حضور ﷺ نے دوبارہ مکّہ میں قیام اختیار نہیں فرمایا' حالانکہ فتح مکّہ کے بعد اگر آپؐ چاہتے تو وہیں قیام فرماتے' مدینہ مراجعت اختیار نہ فرماتے۔ اس اعتبار سے بھی وہ تاویل خلافِ واقعہ بنتی ہے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ "معاد" سے مراد ہے آپؐ کا مقام' آپؐ کے لوٹنے کی جگہ ' اعلیٰ انجام۔ جیسے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں بشارت کے طور پر فرمایا گیا : ﴿عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ کہ آپؐ کو تو آپ کا رب مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔ اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص قرآن کی دعوت و تبلیغ میں لگا ہوا ہو' لوگوں کو قرآنِ حکیم کی طرف بلانے میں وہ رات دن ایک کر رہا ہو اور پھر وہ ناکام

ہو جائے! نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ﴾ اے نبی، یقیناً آپؐ ایک بہت اعلیٰ انجام سے دو چار ہوں گے، آپ کی جدّوجہد کا ایک بہت اعلیٰ نتیجہ نکلے گا جس سے کہ آپ ہم کنار ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں آیات قرآن مجید کے بارے میں بڑی عظیم بشارتوں پر مشتمل ہیں۔

میری زندگی کے دو عجیب واقعات

اس دوسری آیت کے بارے میں غور و فکر کرتے ہوئے مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ بلکہ چونکہ آج دو چیزوں کا تذکرہ چل رہا ہے یعنی مرکزی انجمن اور تنظیم اسلامی تو اس مناسبت سے دو ہی واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان دونوں کا تعلق ۷۲ء سے ۷۵ء تک کے عرصے سے ہے جب مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور تنظیم اسلامی کے قیام کے لئے میدان ہموار ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک واقعہ دراصل ایک خواب ہے جس کا تذکرہ میں کچھ ڈرتے اور جھجکتے ہوئے کر رہا ہوں کہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کریں کہ اب یہ بھی خوابوں کی دنیا میں آگیا۔ یہ خواب آج سے بیس برس پہلے کا ہے اور اس سے قبل میں نے بعض قریبی احباب کو سنایا بھی ہے۔ جس زمانے میں مَیں تنظیم اسلامی کے قیام کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا اور تقریباً اس کے قیام کا فیصلہ کر چکا تھا میں نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں مر گیا ہوں اور میں اپنے جنازے کا منظر بھی ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے خود کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ میں اپنی موت کے تمام مراحل یہاں تک کہ قبر میں اتارے جانے کا بھی خود مشاہدہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا کہ میری نگاہوں کے سامنے مجھے قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ میں نے اسی وقت بعض بزرگوں سے اس خواب کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک بہت بڑی بشارت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہاری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا ہے اور دوسرا دور اب شروع ہوا چاہتا ہے۔ یعنی ایک عزمِ مصمم کے ساتھ اقامتِ دین کی تحریک کے از سرِ نو آغاز کا جو ارادہ کر لیا ہے یہ درحقیقت اس بات کے مترادف ہے کہ ایک زندگی ختم ہوئی اور ایک بالکل نیا دور اب شروع ہو رہا ہے۔ (واللہ اعلم)

دوسرا واقعہ بھی میری ایک ایسی کیفیت سے متعلق ہے جو بیداری اور نیند کے بین بین تھی۔ واقعے کے سرور اور لذّت کا ابھی تک مجھے احساس ہوتا ہے۔ یہ خواب نہیں تھا بلکہ ایک خاص کیفیت تھی جو نیم غنودگی کی حالت میں مجھ پر طاری ہوئی۔ کچھ "بَیْنَ النَّوْم وَالْیَقْظَة" کا سا معاملہ تھا۔ نیند اور بیداری کے مابین ایک کیفیت میں، مَیں محسوس کرتا ہوں کہ لگاتار ایک آواز میرے کان میں آ رہی ہے۔ کوئی مسلسل مجھے یہ الفاظ قرآنی سنا رہا ہے کہ : ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَادُّكَ اِلٰی مَعَادٍ﴾ اس کے بعد جب میں پوری طرح بیدار ہوا تو ایک عجیب سرور، انبساط اور انشراح کی کیفیت جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، مسلسل کئی روز تک بلکہ کافی عرصے تک مجھ پر طاری رہی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت مجھے تلاش کرنا پڑا تھا کہ یہ آیت قرآنِ حکیم کے کس حصے اور کس سورۃ میں ہے۔ اس لئے کہ میرا معاملہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا باضابطہ مطالعہ تو اگرچہ بحمدِ اللہ زمانہ طالب علمی سے جاری ہے لیکن زیادہ تفصیلی غور و فکر کا اصل موقع مجھے اپنے سلسلہ وار درسِ قرآنِ حکیم کے ساتھ ملا، بالخصوص تفسیری اختلافات اور مختلف آراء کے مابین اپنی آخری رائے میں نے زیادہ تر اپنے مسلسل درس کے دوران ہی قائم کی ہے۔ اور اُس وقت جبکہ میں اِس دلفریب تجربے سے گزرا میرا درس، قرآنِ حکیم کے اس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اگر تو ایسا ہوتا کہ سورۃ القصص انہی دنوں میرے زیرِ درس آئی ہوتی اور اس وجہ سے میرے ذہن پر یہ کیفیت طاری ہوتی تو شاید میں اس کی کوئی دوسری تاویل کرتا۔ لیکن چونکہ یہ بات نہیں تھی للذا اسے میں نے اپنے حق میں بہت بڑی بشارت سمجھا۔ سرور و انبساط کی کیفیت دیر تک مجھ پر طاری رہی اور ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَادُّكَ اِلٰی مَعَادٍ﴾ کی مٹھاس اور حلاوت کا تاثر ایک عرصے تک میرے قلب و ذہن کو فرحت بخشتا رہا۔

ذہن و قلب پر قرآنِ حکیم کا تسلّط اور اس کے مظاہر

قرآنِ حکیم کی قوتِ تسخیر کے ضمن میں میں ایک اصطلاح استعمال کیا کرتا ہوں کہ قرآن اپنے طالب کو possess کر لیتا ہے، اس کے ذہن و قلب کو اپنی گرفت میں لے

لیتا ہے۔ میرے بعض ساتھی یہی لفظ میرے لئے استعمال کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ میں اگر اس کیفیت سے نکلنا یا نکلنے کی غرض سے ہلنا بھی چاہوں تو ہل نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اللہ کے فضل و کرم سے میں جس طرح اِس کام میں لگا ہوں اس طور سے کام اپنے کسی ارادے اور منصوبے کے تحت نہیں ہوا کرتے۔ ایسی کیفیت تو اسی شخص کی ہو سکتی ہے جو کسی عظیم قوتِ تسخیر کے زیر اثر کسی شکنجے میں آ گیا ہو' جکڑا گیا ہو۔ حالانکہ ایسا بھی ہوا کہ کئی کام جو میں نے بِالارادہ شروع کئے' کوشش کے باوجود میں انہیں مکمل نہیں کر سکا۔ مثلاً ایک موقع پر میں نے اپنے ذاتی حالات لکھنے شروع کئے لیکن وہ سلسلہ بیچ ہی میں کہیں رُک گیا۔ خدمت قرآنی کا کام بھی اگر میں محض اپنے ارادے کے تحت کرتا تو اس طور سے ہرگز نہ کرپاتا جیسا کہ اللہ نے مجھ سے کروایا ہے۔ اللہ کی تائید و توفیق قدم قدم پر میرے شامل حال رہی۔ میں نے جب اپنی میڈیکل پریکٹس بند کی تو کوئی ذریعہ معاش تھا نہ کوئی جائیداد میرے پاس موجود تھی۔ لیکن میں نے توفیق الٰہی سے یہ طے کر لیا تھا کہ اب جسم و جان میں جو بھی توانائی کی رمق باقی ہے وہ اسی کام میں لگے گی۔ میرے پاس کرشن نگر میں اپنی رہائش کے لئے بس ایک مکان تھا (جسے بعد میں بیچ کر قرآن اکیڈمی کے سامنے مکان بنوایا) اس کے سوا اور کوئی جائیداد میرے پاس موجود نہیں تھی' لیکن اللہ نے ہمت دی اور میں نے طے کر لیا کہ آئندہ زندگی کا کوئی لمحہ اب تلاشِ معاش میں صرف نہیں ہو گا' سارا وقت اور صلاحیتیں معاد کے حصول میں صرف ہوں گی۔ ظاہر بات ہے کہ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ میرے پاس اگر وسائل ہوتے' جاگیریں ہوتیں اور ان کے بل پر میں یہ فیصلہ کرتا تو معاملہ مختلف ہوتا۔ الحمد للہ میرے چار بھائی ہیں اور بعض نے مختلف مواقع پر مجھ سے تعاون بھی کیا ہے' لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اُس وقت سب بھائیوں کے ساتھ میرے تعلقات کشیدہ تھے۔ چنانچہ ان میں سے کسی کا تعاون مجھے اس وقت حاصل نہیں تھا۔ بڑے بھائی کے ساتھ تو بعد میں بھی اس طرح کے حالات نہیں رہے کہ ان کی جانب سے تعاون کا معاملہ ہوتا' البتہ چھوٹے بھائی اقتدار احمد نے تعاون کیا' لیکن اس کی نوبت بہت بعد میں آئی۔ انہوں نے بعد میں ایک موقع پر جب مجھے یہ پیشکش کی کہ میں آپ کے کام میں شریک ہونا چاہتا اور آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں تو

پہلی بات میں نے ان سے یہ کہی کہ اگر تو صرف بھائی ہونے کے ناطے سے تعاون کرنا چاہتے ہو تو مجھے قبول نہیں' ہاں اگر تمہیں میرے اس مشن کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے اور اس میں تعاون کرنا چاہتے ہو تو سر آنکھوں پر۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن کی قوتِ تسخیر ہی کا اثر تھا کہ کسی قسم کے معاشی وسائل نہ رکھتے ہوئے بھی اور کسی دنیاوی سہارے کے موجود نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی میڈیکل پریکٹس کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا اور دعوتِ رجوع الی القرآن کے کام میں ہمہ وقت مشغول ہو گیا۔ اسے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن ہی نے مجھے possess کر لیا تھا اور میرے ذہن و قلب کو پورے طور اپنی گرفت میں لے لیا تھا!

رسول اور کتاب ــــ ایک حیاتیاتی وحدت

اسی ضمن میں ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں' اگرچہ یہ ایک نازک سا مسئلہ ہے۔ میرے درسِ قرآن سننے والے اکثر حضرات کے علم میں ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مضمون یہ بھی ہے کہ "رسول" اور "کتاب" دونوں مل کر ایک حیاتیاتی اکائی (Organic Whole) کی مانند ایک وحدت بنتے ہیں۔ اور دنیا میں جو بھی خیر وجود میں آتا ہے اور جو بھی انفرادی یا اجتماعی تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ درحقیقت ان دونوں کی مشترک تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اب میں قرآنِ حکیم کے ان دو مقامات کا حوالہ دوں گا جہاں رسول اور کتاب کو ایک وحدت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البیّنۃ میں فرمایا گیا : ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝﴾ "نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا مشرکین میں سے اور اہل کتاب میں سے باز آنے والے جب تک کہ ان کے پاس "بیّنہ" (یعنی واضح دلیل) نہ آ جاتی"۔ اگلی آیت "بیّنہ" کی وضاحت پر مشتمل ہے : ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝﴾ "(یعنی) ایک رسول اللہ کی طرف سے پڑھتا ہوا (اللہ کے) پاکیزہ صحیفوں کو جن میں محکم کتابیں ہیں"۔

گویا کہ "رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ" اور "صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" یہ دونوں مل کر "بیّنہ" بنتے ہیں۔ اس کی دوسری مثال سورۃ الطلاق میں ہے' جہاں فرمایا گیا :

﴿ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

"ہم نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے (یعنی) ایک رسول جو تمہیں پڑھ کر سناتا ہے اللہ کی واضح آیات تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کریں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے!"

تو معلوم ہوا کہ "ذکر" بھی رسول اور کتاب دونوں کا مرکب ہے اور "بیّنہ" بھی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دو اجزاء پر مشتمل کسی مرکب کے ایک جزو کو اگر آپ زیادہ اہمیت دے دیں گے تو دوسرے جزو کی اہمیت اسی نسبت سے کم ہو جائے گی۔ اگر آپ ایک جزو کو زیادہ emphasize کر دیں گے تو اس کا منطقی نتیجہ نکلے گا کہ دوسرا جزو پس منظر میں چلا جائے گا اور ان دونوں اجزاء کی جو مشترک تاثیر ہے وہ برقرار نہیں رہے گی۔ یہی حادثہ اِس اُمت کے اندر بھی پیش آیا اور "رسول" اور "کتاب" پر مشتمل مرکب کے دونوں اجزاء کی اہمیت میں دو اعتبارات سے کمی بیشی کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک انتہا پر منکرینِ حدیث اور منکرینِ سُنّت ہیں جو رسول کی اہمیت کم کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل شے کتاب ہی ہے اور رسول کی حیثیت گویا محض ڈاک کے ہرکارے کی ہے۔ جیسے چٹھی رسان کا کام چٹھی پہنچانا ہوتا ہے جو اصل اہمیت کی حامل ہوتی ہے' اسی طرح رسول کا کام اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے سو وہ اس نے پہنچا دیا' اب اصل شے یہ قرآن ہے' لہٰذا اصل اہمیت اسی کی ہے۔ یہ بات بظاہر بڑی دل کو لگتی ہے' لیکن یہ درحقیقت "کلمۃُ حقٍ ارید بہِ الباطل" والا معاملہ ہے' یعنی بات تو درست ہے' لیکن اس سے جو نتیجہ نکالا جانا مقصود ہے وہ باطل ہے۔ اس لئے کہ اس طرح نبی ﷺ کی ذات کی نفی کی جا رہی ہے' ان کی سُنّت کی حجیت کا انکار کیا جا رہا ہے' اور قرآن کی جو تشریح و توضیح آپ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے فرمائی ہے اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی اسی درجے انتہا پسندانہ ہے۔ یہ بات ڈاکٹر برہان احمد

فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ جو مرکب ہے رسول اور قرآن کا' عام مسلمانوں نے اس میں سے رسول کی ذات کو اتنی زیادہ اہمیت دی ہے کہ دوسرے جزو یعنی قرآن کی اہمیت کی نفی ہو گئی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ جو بھی تربیتی' اصلاحی اور انقلابی کام ہوا وہ رسول ﷺ کی صحبت ہی سے ہوا۔ اس تاثر سے قرآن کی تاثیر کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ بات ذرا باریک بھی ہے اور نازک اور حساس بھی' لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس سے ایک عام مسلمان کو یہ مغالطہ لاحق ہو سکتا ہے کہ شاید اس طرح حضور ﷺ کی توہین کی جا رہی ہے' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ' لیکن دراصل اس معاملے میں توازن کی ضرورت ہے۔

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار!

عوامی سطح پر ہمارے جو دینی تصورات ہیں ان میں عمل سے فرار کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ نبی ﷺ کو اتنا اونچا کرو' اتنا اونچا کرو' کہ خدا کے برابر بٹھا دو۔ تو جب خدا کے برابر بٹھا دو گے تو اب اتباع کا سوال ہی نہیں ہے۔ اب تو حمد ہی ہو سکتی ہے' تعریف ہی ہو سکتی ہے' آپؐ کی شان میں نعت کہی جا سکتی ہے' لیکن آپؐ کا اتباع تو نہیں ہو سکتا۔ اتباع تو کسی انسان ہی کا ہو سکتا ہے' کسی معبود کا تو نہیں ہو سکتا۔ آپ اللہ کا اتباع نہیں کر سکتے۔ اللہ کی اطاعت کریں گے' اللہ کی عبادت کریں گے' اتباع تو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ جو کیا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنا دیا گیا یہ بھی درحقیقت انسان کی وہی چالاکی ہے کہ اگر ہم نے انہیں انسان کی سطح پر رکھا پھر تو ان کی پیروی لازم ہو جائے گی۔ اگر وہ انسان ہی تھے پھر تو ان کا اتباع ضروری ہے' پھر تو ان کے نقشِ قدم پر چلنا لازم ہو گا۔ لہٰذا انہیں اٹھاؤ اور اٹھا کر معبودوں کی فہرست میں شامل کر دو۔ اسے کہتے ہیں "دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار!" چنانچہ یہ یوں ہی نہیں ہوا ہے کہ بس نعتیں پڑھ لیں تو حضور ﷺ کا حق ادا ہو گیا' باقی کہاں ہم کہاں حضور ﷺ کا مقام! ہم سے آپؐ کا اتباع کیسے ممکن ہے؟ یہ کہا اور فارغ ہوئے۔ ع "عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!"

قرآن سے بے اعتنائی کی مختلف وجوہات

اس کے علاوہ متعدد دیگر عوامل ہیں جو قرآن کریم کی اہمیت کو کم کرنے اور اسے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کا سبب بنے ہیں اور یہ ایک منظم سازش کے تحت کیا گیا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اس موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو ماہنامہ میثاق میں شائع بھی ہوا تھا' جس میں انہوں نے دلائل سے یہ بات ثابت کی تھی کہ یہ معاملہ از خود نہیں ہوا بلکہ قرآن کو منظر سے ہٹانے کی اور اس کی تعلیمات کو مسلمانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی دانستہ کوششیں کی گئیں۔ عوام الناس پر ظلم ڈھانے والے اور ان کے حقوق غصب کر کے خود عیاشیاں کرنے والے سلاطین و ملوک اور جاگیردار و سرمایہ دار نہیں چاہتے تھے کہ قرآن کا انقلابی فکر لوگوں کے سامنے آئے۔ ع "چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب!" انہیں اندازہ تھا کہ اگر یہ کتاب اور اس کی روشن تعلیمات لوگوں کی نگاہوں میں آگئیں تو ہم ننگے ہو جائیں گے' لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور ہمارے استحصالی نظام کے بخیے ادھڑ جائیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے بند رکھو' اسے صرف حصولِ ثواب کا ذریعہ بنا دو' گاہے بگاہے ختمِ قرآن یا ایصالِ ثواب کی محفلیں منعقد کر لی جائیں' کچھ کھانے پینے کا سلسلہ ہو جائے' اللہ اللہ اور خیر سلّا! تو یہ سب کچھ در حقیقت ایک سازش کے تحت ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک معاملہ یہ بھی ہوا کہ جب تاثیرِ قرآن کی طرف سے توجہ ہٹ گئی اور ایمان کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ یعنی تاثیرِ صحبتِ محمدی ﷺ ذہنوں میں باقی رہ گیا تو یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ صحبتِ محمدی ﷺ تو ہمیں حاصل نہیں ہے' اب کیا کیا جائے! ـــــ چنانچہ اس کی تلافی کے لئے یہ مراقبے' یہ سارے اوراد و اشغال اور یہ تپسیائیں اور ریاضتیں' غرضیکہ ایک لمبا چوڑا طومار وجود میں لایا گیا۔ یہ سب کچھ محض اس دلیل پر ہوا کہ جو اصل عامل تھا یعنی تاثیر صحبتِ نبویؐ وہ تو ہمیں حاصل نہیں ہے لہٰذا اس کا کوئی نہ کوئی بدل ہونا چاہئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اشغال اور ریاضتیں اور یہ چالیس چالیس برس کی بادیہ پیمائی اور نفس کشی کے یہ مختلف انداز' یہ سب چیزیں ہمارے عوام میں اعلیٰ اقدار

شمار ہونے لگیں۔ لوگوں کی دینداری کو اسی پیمانے سے ناپا جانے لگا اور اس چیز نے ہمارے دینی فکر کو اس کے اصل مرکز و محور یعنی قرآنِ حکیم سے ہٹادیا۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے رسول اور کتاب کے مرکب میں سے کتاب کی قوتِ تاثیر کو منہا کر دیا۔ یہ ہم سب کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اصل فیصلہ کُن شے قرآن ہے!

اب آیئے اس سلسلے کی تیسری آیت کی طرف جو سورۃ بنی اسرائیل کے آخری حصے میں وارد ہوئی ہے:

﴿ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ' وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلاَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًاO ﴾

"(اے نبی ﷺ) ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا اور یہ حق کے ساتھ ہی نازل ہوا ہے' اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔"

یہاں بھی آپ دیکھئے کہ قرآنِ حکیم اور نبی اکرم ﷺ دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ بالخصوص قرآنِ حکیم کا ذکر جس زور دار اور فیصلہ کن انداز میں یہاں آیا ہے وہ بہت قابل توجہ ہے۔ قرآنِ حکیم کیلئے "بِالْحَقِّ" کی تکرار اس کی غیر معمولی اہمیت و عظمت کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کو اسی نکتے کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اصل فیصلہ کن شے یہ قرآن ہے۔ چنانچہ یہی وہ شے ہے جس کیلئے بقا اور دوام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر یہ الفاظ بھی آئے ہیں ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ کہ "اے نبی آپ کا بھی انتقال ہو جائے گا اور یہ لوگ بھی مرجائیں گے"۔ لیکن نوع انسانی کا تسلسل تو قیامت تک باقی ہے' ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اصل شے کونسی شے ہے؟ یہی قرآن' جس کو بقا اور دوام حاصل ہے۔ اصل قوتِ تسخیر اس قرآن میں ہے۔ یہ قرآن لوگوں کو possess کرے گا۔ ان کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر ان کے باطن میں انقلاب برپا کرے گا۔ جو اس قرآن کی راہنمائی سے فائدہ اٹھائیں ان کیلئے بشارتیں بھی اس قرآن میں موجود ہیں اور جو اس سرچشمۂ ہدایت کو رد کر دیں ان کیلئے تنبیہہ اور وارننگ ہے کہ ایک دردناک عذاب ان کا منتظر ہے

﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًاO وَاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًاO ﴾

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اصل تاثیراور قوتِ تسخیراس قرآن میں ہے جس کیلئے الفاظ آئے: ﴿ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ﴾ اور حضور اکرم ﷺ کے بارے میں فرمایا : ﴿ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ کہ اے نبی بشارت دینااور انذار کرنا آپ ﷺ کا کام ہے۔ گویا اصل قوت اور طاقت اس قرآن میں ہے جو اللہ کا کلام ہے!

در بغل داری کتابِ زندہ

قرآنِ حکیم کی قوتِ تسخیر کے حوالے سے ایک آخری بات مجھے مزید عرض کرنی ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات عطا ہوئے ان میں اہم ترین عصا کا معجزہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب اسے زمین پر ڈالتے تھے تو وہ ایک بڑے سانپ یا اژدھے کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ قرآنِ حکیم میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لئے جادوگروں کو جمع کیا تو انہوں نے بھی تقریباً وہی کچھ کر کے دکھادیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بن جاتا تھا۔ جادوگروں نے جب اپنی رسّیاں اور چھڑیاں پھینکیں تو وہ بھی سانپ بن کر جنبش کرنے لگیں۔ اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وقتی طور پر خوف طاری ہوگیا اور تھوڑی دیر کے لئے یہ حقیقت ان کے ذہن سے محو ہوگئی کہ ان کی اپنی بغل میں اللہ کا عطا کردہ ایک عظیم معجزہ یعنی عصا موجود تھا۔ اس کی قوتِ تسخیر کا خیال ان کے ذہن سے نکل گیا۔ تاہم یہ ایک عارضی سی کیفیت تھی جو جادوگروں کے باندھے ہوئے سحر کے زیرِ اثر ان پر طاری ہوئی۔

اس واقعے سے میرا ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوا کہ ہمارے آج کل کے جدید دانشور اور منکرینِ حدیث بڑے شد ومد کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ نبی پر جادو کا اثر نہیں ہوتا' حالانکہ بخاری شریف میں حضور اکرم ﷺ پر جادو کی روایت موجود ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ یہ بات عصمتِ انبیاء کے منافی ہے کہ نبی پر جادو کا کچھ اثر واقع ہو' لہٰذا یہ

حدیث صحیح نہیں ہو سکتی۔ اس طرح کے بے بنیاد استدلال قائم کرکے وہ صحیح بخاری ہی نہیں پورے ذخیرۂ احادیث پر سے عوام الناس کا اعتماد ختم کرنے کے درپے ہیں۔ یہ وہ ہتھکنڈے ہیں جو آج کل منکرینِ حدیث کی جانب سے استعمال ہو رہے ہیں۔ میں اس کا جواب قرآن سے دیتا ہوں۔ قرآنِ حکیم سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادو کا اثر ہوا۔ دوسرے لوگوں کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی وہ چھڑیاں اور رسّیاں دوڑتے ہوئے سانپوں ہی کی صورت میں نظر آئیں۔ یہی تو جادو کا اثر تھا' اسی کا نام نظر بندی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں صراحت موجود ہے : ﴿فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی﴾ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا۔ آپ اس صورت حال کو اپنے اوپر طاری کر کے سوچئے۔ دل میں خیال آیا ہو گا کہ یہی تو میرے پاس اصل ہتھیار تھا' ان جادوگروں نے بھی وہی کچھ کر کے دکھا دیا جو میں عصا کے حوالے سے پیش کرتا ہوں۔ اب تو لوگوں کے سامنے زیادہ سے زیادہ یہ بات آئے گی کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور وہ چھوٹے جادوگر۔ چنانچہ ان پر خوف طاری ہوا۔ ﴿قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی﴾ ہم نے فرمایا اے موسیٰ' مت ڈرو' یقیناً تم ہی سربلند ہو گے' کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ﴿وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا﴾ اور ذرا زمین پر ڈالو تو سہی اس چیز کو جو تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے' یہ عصا ان سب کو نگل جائے گا اور یہ سوانگ جو انہوں نے رچایا ہے اس کی قلعی کھل جائے گی۔ یہی اسلوب اقبال نے بھی مستعار لیا ہے اور اپنے اس شعر میں یہی پیغام امت کو پہنچایا ہے ؎

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

کہ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بغل میں عصا موجود تھا لیکن جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں سے وقتی طور پر جو ایک منظر سامنے آیا اس سے ان پر خوف طاری ہو گیا' آج بعینہٖ وہی حال امّتِ مسلمہ کا ہے کہ اس کے پاس قرآن مجید کی شکل میں سب سے بڑا "ایٹم بم" موجود ہے' لیکن انہیں شعور ہی نہیں کہ اللہ کا کتنا عظیم معجزہ ان کی بغل میں موجود ہے' جس کی قوتِ تسخیر کے سامنے کوئی شے نہیں ٹھہر سکتی! حقیقت یہ ہے کہ بحیثیتِ مسلمان

ہمارے تمام مسائل کا حل اگر کسی ایک شے میں ہے تو وہ اللہ کی کتاب ہے۔ آپ حضرات یہ حدیث متعدد مرتبہ سن چکے ہوں گے جس کے راوی حضرت عمرؓ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ)) (صحیح مسلم) کہ اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت بہت سی اقوام کو بلندی عطا کرے گا اور اس کے ترک کرنے کی پاداش میں بہت سی قوموں کو زوال سے دوچار کرے گا۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ بنی اسرائیل میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ اور سورۃ الطارق میں بایں الفاظ بیان ہوئی ﴿اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ﴾ کہ یہ تو قولِ فیصل ہے‘ فیصلہ کُن کلام ہے‘ کوئی شاعرانہ تُک بندی نہیں ہے۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کی تاثیر اور قوتِ تسخیر —— ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم قرآنِ حکیم پر اعتماد نہیں کرتے۔ قرآن مجید کی عظمت سے اگر ہم حقیقتاً واقف ہو جائیں اور اس کے اندر جو قوتِ تسخیر پنہاں ہے اس کا ہمیں کسی درجے میں اندازہ ہو جائے تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں۔

جہاد بالقرآن —— وقت کی اہم ضرورت

اسی حوالے سے ذہن منتقل ہوا کہ آج سے سات آٹھ سال قبل میں نے جہاد بالقرآن کے موضوع پر دو تقریریں کی تھیں۔ سورۃ الفرقان میں نبی اکرم ﷺ کو جہاد بالقرآن کا حکم بایں الفاظ میں دیا گیا ہے ﴿فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا﴾ کہ اے نبیؐ ‘ان کافروں کی باتوں پر آپ توجہ نہ دیجئے‘ ان کی پیروی کا خیال دل میں نہ لائیے اور ان کے ساتھ جہاد کرتے رہئے اس قرآن کے ذریعے سے بڑا جہاد! —— اپنی توانائیاں اور اپنی قوتیں اس قرآن کے افشاء اور اس کے ابلاغ پر لگا دیجئے‘ کھپا دیجئے‘ لگے رہئے اسی کام میں۔ یہی درحقیقت آپ کی طاقت کا اصل راز ہے‘ آپ کی کامیابی کی اصل ضمانت یہی قرآن مجید ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ﴾۔

جہاد بالقرآن ہی کے موضوع پر بعد میں ‘میں نے ایک اور تقریر کی تھی اور اس میں جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ معیّن کئے تھے۔ اگر آپ اپنے ماحول کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں

گے کہ ہمارے معاشرے میں ایک محاذ تو جدید ملحدانہ نظریات کا ہے۔ اس زہر کا توڑ اسی قرآن مجید میں ہے۔ پھر ہمارے عوام کی ایک عظیم اکثریت مشرکانہ اوہام اور عقائد کا شکار ہے۔ اس کا توڑ بھی یہی قرآن ہے۔ بلکہ اس گمراہی کا توڑ تو اس میں زیادہ نمایاں اور جلی انداز میں ہے۔ اس لئے کہ جب قرآن نازل ہوا تو وہاں یہی گمراہی سب سے زیادہ تھی' لہٰذا اس کی نفی اور تردید بھی سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہوئی۔ باقی جہاں تک جدید باطل نظریات اور ملحدانہ افکار و خیالات کا تعلق ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کے توڑ کے لئے تو قرآنِ حکیم میں غوطہ زنی کرنی پڑے گی' کچھ گہرائی میں اتر کر حکمت و معرفت کے موتی اور ہیرے نکالنے ہوں گے۔ لیکن قدیم جاہلیت کا توڑ تو اس میں گویا بالکل سطح پر (On the Surface) موجود ہے۔ ہمارا تیسرا سب سے بڑا مسئلہ تفرقہ اور فرقہ واریت ہے۔ اس تفرقے کا ایک ہی علاج ہے : ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾۔ جتنا اس قرآن کے قریب آئیں گے اتنی ہی باہمی ہم آہنگی ہو گی۔ یوں بھی سوچا جائے کہ انسان چونکہ حیوانِ ناطق ہے اور عقل رکھنے والا حیوان ہے' لہٰذا انسانوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی اگر ہو گی تو باہم اتحاد بھی ہو گا ورنہ آپ اتحاد کے موضوع پر وعظ کہتے رہئے' اتحاد کے لیکچر دیتے رہئے' اس پر مضامین لکھ کر چھاپتے رہئے' اتحاد نہیں ہو سکتا۔ باہم ذہنی اور فکری ہم آہنگی اگر پیدا ہو گی تو بامعنی اور پائیدار اتحاد جنم لے گا ــــــ اور اس کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اللہ کی رسی یعنی قرآن کو مل جل کر مضبوطی سے تھام لیا جائے ؎

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کُن کہ حبلُ اللہ اوست

ہمارا ایک مرض اور بھی ہے' اور وہ ہے بے یقینی۔ یعنی باطل نظریات کا بھی اگرچہ ذہن پر تسلط نہیں ہے' کوئی گمراہ کن اوہام بھی نہیں ہیں' لیکن جسے یقین کہتے ہیں وہ شے موجود نہیں ہے' اور یقین کی پونجی اگر پاس نہ ہو تو عمل کا کیا سوال؟ ــــــ قرآنِ حکیم میں کچھ لوگوں کا قول نقل ہوا ہے : ﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ﴾ کہ اے محمدؐ جو کچھ تم کہہ رہے ہو لگتا ہے کہ ٹھیک کہہ رہے ہو' بات وزنی معلوم ہوتی ہے لیکن یقین

نہیں آتا' اس پر دل نہیں ٹھکتا! ــــــ اور ظاہر بات ہے کہ عمل تو یقین کے تابع ہے' یقین بدلے گا تو عمل بدلے گا۔ بقول اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

جان لیجئے کہ اس یقین کا سرچشمہ اور منبع بھی یہی قرآن ہے۔ اور یہی ہے کہ جو "شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" ہے۔ یعنی باطنی اور روحانی بیماریوں کا مؤثر اور تیر بہدف علاج یہی قرآنِ حکیم ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر میں نے "جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ" کے موضوع پر اپنے خطابات میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ میری یہ دونوں تقریریں اب کتابی صورت میں شائع ہوتی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے فریضۂ رسالت کی ادائیگی اور غلبہ و اقامتِ دین کے مشن کے لئے جو بے مثال جدوجہد کی اسے دو عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے مسلسل بارہ برس مکے میں قرآن کے ساتھ جہاد کیا اور پھر دس برس مدینے میں یہ جہاد تلوار کے ساتھ ہوا! ــــــ یہ دو ہی تو جہاد ہیں جو محمدِ عربی ﷺ کے جہادِ زندگانی میں سب سے نمایاں ہیں۔ ایک کا عنوان جہاد بالقرآن ہے جو بارہ یا تیرہ برس مکے میں ہوا کہ جس میں شمشیرِ قرآنی کے سوا اور کوئی دوسری شمشیر نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے ہاتھ میں نظر نہیں آتی اور دوسرا جہاد بالسّیف ہے جس کا آغاز ہجرت کے بعد ہوا اور جو آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری سانس تک جاری رہا۔ یہ بات نوٹ کیجئے کہ جہاد بالسیف کے لئے جو طاقت درکار ہوتی ہے' فدائین کی جو جمعیت اور سرفروشوں کی جو جماعت درکار ہوتی ہے' وہ کہاں سے آئے گی؟ ــــــ یہ سرفروش جہاد بالقرآن کے نتیجے میں فراہم ہوں گے۔ قرآنِ حکیم اگر انہیں مسخر کر لے اور ان کے اندر سرایت کر جائے تو یہی لوگ ہیں جو باطل کے مقابلے میں بنیانِ مرصوص ثابت ہوں گے اور باطل نظام کو الٹ کر رکھ دیں گے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس اعتبار سے جہاد بالقرآن گویا جہاد بالسیف سے اہم تر ہے۔ اس لئے کہ پہلی منزل اہم تر

ہوتی ہے۔ پہلی منزل موجود ہو گی تو اس کے اوپر دوسری منزل کی تعمیر ممکن ہو گی۔ جہاد بالقرآن ہو گا تو جہاد بالسیف کا امکان ہو گا!

بھارت کے خلاف ہمارا اصل ہتھیار —— شمشیرِ قرآنی

اس ضمن میں ایک بات میں مزید کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے داخلی طور پر تو پانچ محاذ گنوا دیئے جن کے لئے قرآن ہمارا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار ہے' خارجی اعتبار سے ہمارے لئے اہم ترین مسئلہ بھارت کا ہے۔ آج سے دو یا تین سال قبل میں نے مرکزی انجمن کے سالانہ اجلاس عام ہی میں اس ایشو پر ایک تقریر کی تھی' میں نے عرض کیا تھا کہ بھارت کے مقابلے میں بھی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار قرآنِ حکیم ہے۔ اس لئے کہ فکر اور نظریئے کے میدان میں بھارت کے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہندو قوم کے پاس اپنا کوئی جاندار نظریہ نہیں ہے' نہ مذہب کے میدان میں اور نہ فلسفے کے میدان میں۔ مذہب کے نام پر ان کے ہاں جو ایک تحریک چل رہی ہے وہ محض بعض سیاسی مقاصد کے لئے چلائی گئی ہے' ورنہ دراصل ہندوازم صرف ایک کلچر ہے' کچھ رسومات ہیں اور کچھ ایسی سماجی تقریبات ہیں جن کے حوالے سے وہ کچھ جشن منا لیتے ہیں' باقی کوئی شے ان کے پاس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پورے طور پر مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں' فلسفہ و فکر بھی انہوں نے مغرب سے مستعار لیا ہے اور ان کے تہذیب و تمدن پر بھی مغرب کا رنگ غالب ہے۔ چنانچہ ان کا نظامِ حکومت ہو یا تصورِ قانون سارے کا سارا اور جوں کا توں مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ یہی سبب تھا کہ متحدہ ہندوستان میں دنیاوی اعتبار سے ہندو ہم سے آگے نکل گیا تھا۔ اس لئے کہ اس کے باوجود کہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ مغربی رو کے اندر بہہ گئے تھے لیکن ان میں ایک بڑا موثر طبقہ ایسا بھی تھا جن کے ذہنوں میں مغربی تہذیب کے خلاف ایک ردعمل پروان چڑھا اور انہوں نے اس تہذیب کو ذہناً اور عملاً قبول نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری قوتیں منقسم ہو گئیں۔ علماء دیوبند ڈٹ گئے کہ نہ انگریزی پڑھیں گے نہ انگریزی تہذیب اختیار کریں گے۔ انہوں نے انگریز' انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب سب سے لاتعلقی اور بیزاری کا اعلان کیا۔ گویا مکمل بائیکاٹ کی صورت بن گئی۔ ہندو کے

لئے ظاہر بات ہے کہ ایسی کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ اس کا کوئی تمدن تھا نہ تہذیب' نہ ان کے ہاں اپنے کوئی نظریات تھے نہ افکار' لہٰذا انہوں نے بلا جھجک اور بلا توقف انگریز کی تہذیب' اس کے تمدن' اس کی زبان' ہر شے کو اختیار کر لیا۔ انہیں اس کا اضافی فائدہ یہ ہوا کہ انہیں انگریز کا قُرب بھی حاصل ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ حکمرانوں کا قرب حاصل کرنے کا اس سے بہتر راستہ کوئی نہیں کہ آپ انہی کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ دیں۔ جبکہ مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔

بہر حال یہ تو ایک ماضی کا معاملہ تھا' مجھے اصلاً مستقبل کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بحیثیتِ ملک پاکستان کا اصل مقابلہ بھارت کے ساتھ ہے' بھارت وہ ملک ہے جس کے ساتھ ہماری پیدائشی دشمنی ہے۔ مادی قوت کے اعتبار سے اگرچہ ہم بھارت سے بہت پیچھے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے خلاف نظریاتی طور پر ہمارے پاس بہت بڑی قوت موجود ہے۔ اس فکر کو اگر ہم پھیلا سکیں تو اس شمشیرِ قرآنی سے ہم دشمن کو گھائل کر سکتے ہیں۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے فضل و کرم کی ہے کہ ہمارے اور ہندوستانی قوم کے درمیان زبان کی کوئی لمبی چوڑی خلیج حائل نہیں ہے۔ حالانکہ اگر ہم مغرب کی طرف چلے جائیں' ایران یا عرب ممالک میں جا کر اپنی بات پہنچانا چاہیں تو وہاں اردو زبان ابلاغ کا ذریعہ نہیں بنتی۔ لیکن یہ جو ایک بہت بڑا ملک ہے' پوری نوعِ انسانی کی ۱/۵ تعداد جہاں آباد ہے' آج بھی اس ملک کے کونے کونے میں اردو زبان سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ چاہے وہ تامل ناڈو کا علاقہ ہو' خواہ ملیالم کا علاقہ ہو اور خواہ بنگال کا خِطّہ ہو' ہر جگہ اردو سمجھنے والے موجود ہیں۔ اس بات کو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہی مظاہر میں سے شمار کرتا ہوں جن کی بناء پر میں سمجھتا ہوں کہ اس برِّعظیم پاک و ہند سے اللہ تعالیٰ کو کوئی خاص خدمت لینی ہے' اور مستقبل کی جو بھی اس کی منصوبہ بندی ہے اس میں کوئی نہ کوئی اہم مقام اور اہم رول اس خطے کا ضرور ہے کہ یہیں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ پیدا ہوئے' اسی خطے سے اس عظیم قرآنی تحریک کا آغاز ہوا جو تین سو برس پرانی تحریک ہے' کوئی آج کی تحریک نہیں ہے۔ اس کا آغاز تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمے اور ان کی "الفوز الکبیر" سے ہوا تھا۔ پھر ان کے چاروں بیٹوں (رحمہم اللہ علیہم) کے تراجم

قرآن اور تفسیروں سے یہ تحریک آگے بڑھی۔ اُس وقت سے جو سلسلہ شروع ہوا تو درحقیقت یہی ہے کہ جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ آج ہم بھی اس تحریک میں بقدرِ ہمت اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں اور خدمتِ قرآنی کے اس کام میں اپنی بساط کے مطابق شریکِ عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے شرفِ قبول فرمائے۔ بہرکیف اردو زبان کو ذریعۂ ابلاغ بنا کر اگر قرآن کے فکر و فلسفہ اور قرآن کی حکمت و ہدایت کو ہندوستان میں بسنے والے لوگوں میں بھرپور طریقے سے پیش کیا جاسکے تو اس سے بڑا اور کوئی ہتھیار نہیں! ـــــ شاہ ولی اللہؒ ہی نے ''تفہیماتِ الٰہیہ'' میں یہ بات لکھی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے اونچی ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کرلے گی۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے حق میں تمام شواہد موجود ہیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان کے ساتھ آج تک ہماری قومی جنگ جس نوعیت کی رہی ہے اس میں مادی نقطۂ نظر اور جذباتیت پسندی کو زیادہ دخل رہا ہے' چنانچہ اس کے نتیجے میں ہم خود ہندو قوم اور قرآن کے درمیان اپنے وجود سے ایک آڑ اور حجاب بن گئے ہیں۔ وہ قرآن مجید کی ہدایت کی طرف رجوع کیسے کریں جبکہ وہ ایک دشمن قوم کی کتاب ہے۔ یہ وہ حجاب اور Barrier ہے جس کی وجہ سے نوعِ انسانی کی ایک بہت بڑی تعداد قرآن مجید سے محجوب ہے۔ اگر ہم کسی طریقے سے اس Barrier کو ختم کرکے قرآن کے پیغام اور اس میں مضمر ہدایت کو بیک وقت وقت' اعلیٰ ترین علمی سطح پر بھی اور عوام الناس کی سطح پر بھی پیش کرسکیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہماری سب سے بڑی قوتِ تسخیر یہی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی طرف سے ہم غافل ہیں اور مغربی افکار و نظریات اور تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک نے خود ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ جیسے عارضی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کی ڈالی ہوئی ان رسیوں اور چھڑیوں کو سانپوں کی شکل میں دیکھ کر ڈر گئے تھے' آج ہم بھی اہل مغرب کی ڈالی ہوئی ان رسیوں اور چھڑیوں کے بنے ہوئے سانپوں سے مرعوب اور خوف زدہ ہیں۔ یہ رسیاں چاہے افکار اور نظریات کی ہوں' خواہ تہذیب و تمدن کی ہوں اور خواہ سائنسی ترقی کے روپ میں ہمیں مرعوب کر رہی ہوں' سب انسانی ذہن کی تراشیدہ ہیں۔ اس سے کہیں بڑھ کر وہ قوتِ تسخیر ہے جو قرآنِ حکیم کی

شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ الحمدللہ ہماری یہ تحریک قرآنی جو انجمن خدام القرآن کے نام سے بر سرِ عمل ہے' اسی قرآن کے پیغام اور اس کی ہدایت کو عام کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اور فی الاصل' جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا' میری یہ تقریر اللہ کی جناب میں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کے لئے ہے کہ اس انجمن کو قائم ہوئے بیس برس ہو گئے' اس دوران جو کام اب تک ہم سے ہوا اسی کے فضل سے ہوا۔ تو جہاں ہمیں اپنے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر بجالانا چاہئے وہاں ہمیں اس کام کی اہمیت کا صحیح صحیح شعور بھی ہونا چاہئے اور اس حوالے سے قرآن مجید کی قوتِ تسخیر پر اعتماد اور توکل میں مزید پختگی آنی چاہئے کہ اصل شے یہ ہے' اس پر محنت کرو' اسے عام کرنے اور پھیلانے کے لئے جدوجہد کرو ﴿وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾۔ چاہئے کہ اربابِ ہمت و عزیمت اپنی عزیمتوں اور ہمتوں کے اظہار کے لئے اس میدان کا انتخاب کریں اور اپنی سعی و جہد کا مرکز و محور قرآنِ حکیم کو بنائیں۔

چند عملی نکات

اب میں وہ چند عملی باتیں آپ سے عرض کروں گا جو میں نے انجمن کے سالانہ اجلاس میں بھی کہی تھیں ـــــ پہلی بات یہ کہ اس انجمن میں آپ کی شمولیت (Participation) عملاً بڑھنی چاہئے۔ بطورِ خاص آپ سے یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جیسا کہ میں نے دورانِ تقریر بھی عرض کیا' بہرحال اب میں تو آخرت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ بحمد اللہ بیس برس میں نے اس ادارے کو چلایا ہے اور یہ سب کچھ اُسی کے فضل و کرم سے ہوا۔ اس میں عافیت یہ بھی رہی ہے کہ صدر مؤسس ہونے کے ناطے اس ادارے میں مجھے خصوصی اختیارات حاصل تھے' میرے پاس ویٹو کا حق تھا اور اب بھی ہے۔ لہٰذا کسی بڑے ہنگامے کے کھڑا ہونے یا بحران کے پیدا ہونے کا یہاں کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ لیکن آئندہ اس کا امکان یقیناً ہوگا' اس لئے کہ میرے بغیر کسی صدر کو ویٹو پاور حاصل نہیں ہوگی۔ آئندہ کا نظام طے شدہ دستور کے مطابق چلے گا۔ لہٰذا جن حضرات کو بھی اس کام اور اس قرآنی فکر سے دلچسپی ہے اور جو چاہتے ہیں کہ پچھلے بیس برس میں جو

کام ہوا ہے وہ کہیں غلط رُخ پر نہ پڑ جائے یا غلط ہاتھوں میں نہ چلا جائے تو انہیں چاہئے کہ اس انجمن کے ساتھ اپنی وابستگی کو فعال بنائیں۔ اپنے اوقات کا کچھ حصہ اس کے لئے ضرور نکالیں اور یہ خیال ذہن میں نہ لائیں کہ یہ کام تو خود بخود چل رہا ہے' ہماری اس میں کیا ضرورت ہے! ـــــ جن حضرات کے ذہنوں میں بھی ایسا کوئی خیال تھا انہیں اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے اور اس کام سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کو چاہئے کہ اس کام میں عملی شمولیت کو بڑھانے کی طرف توجہ دیں۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کام کے لئے قبول فرمائے!

دوسری بات ـــــ اور یہ بات مجھے خاص طور پر انجمن کے پرانے وابستگان سے کہنی ہے کہ ان میں وہ بھی ہیں کہ جو میرے دروسِ قرآن اور تقاریر کی مجالس میں پہلی صفوں میں بیٹھے نظر آتے ہیں لیکن مجال ہے کہ انہوں نے تنظیم اسلامی یا تحریک خلافت کی جانب ایک قدم بھی آگے بڑھایا ہو۔ ان حضرات کو اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ یہ سارا کام کیا محض کسی مشغلے کے طور پر ہو رہا ہے؟ ـــــ یہ ہرگز کوئی Cult نہیں ہے! یہ کوئی ہندوؤں کے طریقے پر رشی منی کا کوئی سلسلہ نہیں ہے!! یہ ایک اہم دینی کام ہے' یہ ایک انقلابی مشن ہے۔ اور کوئی بھی ایسا کام کہ جس میں انقلاب کے بیج موجود ہوں لیکن وہ پھلیں پھولیں نہیں' برگ و بار نہ لائیں تو وہ کام اپنی معنویت کھو دے گا۔ محض پڑھنے پڑھانے تک خود کو محدود رکھنا اور اس کے عملی تقاضوں سے گریز کرنا دینی اعتبار نفع بخش نہیں ہے۔ الحمد للہ کہ میری زندگی میں صرف پڑھنا پڑھانا نہیں رہا بلکہ میں نے اللہ کے فضل و کرم سے آگے قدم بڑھایا اور اسی اعتبار سے اس کام میں معنویت برقرار رہی۔ تو جو لوگ بھی اس کام میں ذہنی دلچسپی رکھتے ہیں انہیں چاہئے کہ آگے بڑھیں' تنظیم اور تحریک کی طرف عملاً پیش قدمی کریں اور اس میں شمولیت اختیار کریں۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین و المُسلمات OO

آنے والی صدی اسلام کی ہے!

مسز صغریٰ خاکوانی☆، ملتان

موجودہ صدی اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے طور پر سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی صدی کے ابتدائی عشروں میں مسلم دنیا کے مختلف ممالک کی ایک ایک کر کے غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں اور مسلمانوں نے آزادی کا سانس لیا۔ پھر ہر مسلم ملک میں ابھرتی ہوئی اسلامی تحریکوں نے نئی نسل کو نہ صرف تعلیم اور شعور بخشا بلکہ اسے مذہبی بیداری اور مسلم شناخت کے راستے پر لگا دیا۔ نتیجتاً آج مغرب کی دنیا اسلام کے خوش آئند مستقبل سے لرزہ براندام ہے۔ وہ لوگ خوفزدہ ہیں کہ مسلمانوں کی نسلِ نوجب مجاہد و غازی بن کر اٹھے گی تو استعمار کی سازشوں کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دے گی۔ اس لئے آج اسلامی تحریکوں کا راستہ روکنے کے لئے تمام دنیا کی طاغوتی طاقتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ یہود و ہنود کا یہ گٹھ جوڑ اور امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر اس کی قبیح ترین مثالیں ہیں۔

مغربی میڈیا نے اسلام کے خلاف گھناؤنا پروپیگنڈہ اپنی انتہا کو پہنچا دیا ہے۔ مغربی دنیا نے اسلام کو کبھی بھی ایک نظامِ حیات کے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ ان کے نزدیک اسلام کا تصور نہایت مسخ شدہ ہے جو وحشت و بربریت کے قوانین کا حامل' دہشت گردوں کا مذہب ہے جو ہمیشہ اپنوں پرایوں سے برسرپیکار رہتے ہیں۔ مغرب میں اسلام کا تعارف غلامی' عورتوں پر مظالم' تعددِ ازدواج' مرد کے مقابلے میں عورت کی نصف حیثیت' شکار اور ذبح کی صورت میں حیوانات پر ظلم اور منشیات کی تجارت جیسے عنوانات کے تحت کرایا جاتا ہے۔

آج مغرب کی استعماری قوتیں اور یہودی لابی میڈیا کو اسلام کے خلاف بہت بڑے

☆ نقیبہ اُسرہ قرآن اکیڈمی ملتان

ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے اور غیر اسلامی افکار اور مغربی ثقافتی یلغار سے مسلمان نسل کو مرعوب اور گمراہ کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو رہی ہے۔ آج امریکہ 'آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک مل کر ایک سازش کے ذریعے سودی نظام کے تحت ہمیں معاشی بدحالی کا شکار کر رہے ہیں۔ کمپیوٹر نے انٹرنیٹ سے ملا کر پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) میں بدل دیا ہے۔ نئی صدی میں داخلہ کا غلغلہ ہے۔

اسلام بھی اسی کرۂ ارضی کا حصہ ہے۔ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کی تبدیلیوں سے اسلامی دنیا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اس وقت پوری دنیا میں اسلام کی بیداری کی لہر پیدا ہو چکی ہے اور دنیا کے مختلف ممالک میں لوگ بے راہ روی اور بے عملی کی روش چھوڑ کر تیزی سے اسلام کی جانب مائل اور متوجہ ہو رہے ہیں۔ ہر آنے والے دن میں ہماری تعداد بڑھ رہی ہے' ہمارے حُفّاظِ قرآن کی تعداد بڑھ رہی ہے' ہماری دینی جماعتوں اور تحریکوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انفرادی طور پر ہمارے لوگوں نے قرآن حکیم کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ قرآن کی تلاوت میں دن رات ذوق و شوق سے لگے ہوئے ہیں اور قرآن فہمی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ گھر گھر اور محلّہ محلّہ درس اور وعظ کے سلسلے شروع ہیں۔ یہ محض خوش فہمی نہیں فی الحقیقت خوش قسمتی ہے کہ دنیا میں سب اپنے پرائے آنے والی صدی کو ایک بڑی اسلامی تبدیلی کی صدی گردان رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں شمالی امریکہ کے مسلم عرب جوانوں نے الجزائر کے اسلامی مرکز میں ایک سیمینار منعقد کروایا جس کا اہم ترین موضوع تھا "اسلام کا مستقبل"۔ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے بڑی خوش آئند بات کہی:

"ہمیں اپنے گرد و پیش اسلامی بیداری کی لہروں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خود مغرب اور اس کے حواری آج اس بات سے نہایت خوفزدہ ہیں کہ اسلام آہستہ آہستہ دنیا کا پسندیدہ مذہب کیوں بنتا جا رہا ہے۔ مستقبل میں ایک عظیم اسلامی معاشرے کا قیام یقینی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ دنیا عنقریب دیکھے گی کہ اسلام ہی دنیا کی واحد سپرپاور اور امن کا پیغام بردین ہو گا۔ دوسرے بنیادی مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی انفرادیت سچائی' بڑائی' سادگی اور فطری پن

اسے تمام انسانیت کے لئے پسندیدہ' قابل عمل اور قابل قبول بناتا ہے"۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج مغرب کی خاندانی زندگی بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ ہر شخص صرف اپنے بارے میں سوچ رہا ہے۔ محبت اور ایثار کے انسانی جذبے ناپید ہیں۔ یہ طرزِ عمل اپنے خالق کے بتائے ہوئے ضابطۂ حیات سے مُنہ موڑنے اور من مانی کرتے ہوئے غیر فطری زندگی اختیار کرنے کا نتیجہ ہے۔ آج کی مغربی دنیا تھکی ہاری' لٹی پٹی اور بے سکون ہے۔ مادی ترقی اور تیز رفتاری کی اس دوڑ میں مسلسل مقابلے کی فضا نے انسان کو اعصاب شکستہ کر دیا ہے اور وہ بے منزل اور بے مقصد بھاگ رہا ہے۔ مشرق و مغرب کی بے چینی' بے راہ روی' عریانی' اخلاقی پستی اور مادیت پسندی کا واحد حل اسلام ہے۔

اسی صدی کے ایک ذہین و فطین انسان برناڈ شا کی پیشین گوئی ہے کہ!

"مغربی دنیا اسلام کی طرف آ رہی ہے اور مستقبل میں محمد (ﷺ) کا دین یورپ میں مقبول ہو کر رہے گا۔ در حقیقت یہ دین آج بھی یورپ میں پسندیدہ ہے۔ دراصل قرونِ وسطیٰ میں عیسائی مذہبی طبقے نے اپنی ناواقفیت یا پھر گھناؤنے تعصب کی بنا پر اسلام کی تصویر کو زیادہ سے زیادہ بھیانک بنا کر پیش کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ فرض ہے کہ محمد (ﷺ) کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ان جیسا آدمی اگر آج دنیا کی قیادت سنبھال لے تو وہ یقیناً ساری مشکلات کے حل میں کامیاب ہو سکے گا اور دنیا کو امن و فلاح سے بہرہ یاب کر دے گا۔ آج دنیا ان دونوں چیزوں کی کتنی زیادہ محتاج ہے!!"

۱۵ دسمبر ۹۷ء کے امریکی ہفت روزہ "نیوز ویک" میں ایک مضمون Alien Europe (اجنبی یورپ) کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے ساتھ ایک مسلمان جوڑے کی تصویر دی گئی ہے۔ عورت نے سیاہ رنگ کا برقعہ پہن رکھا ہے جبکہ اس کی پانچ سالہ بچی نے سر پر سفید سکارف باندھا ہوا ہے اور اس نے اپنے ہاتھ میں قاعدہ تھاما ہوا ہے۔ مضمون نگار لکھتا ہے کہ اس طرح کے مسلمان تیزی سے یورپ میں بڑھ رہے ہیں۔ ان کا اپنا کلچر ہے جو یورپ سے مختلف ہے۔ چنانچہ آج کا یورپ اپنے کلچر سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔ مضمون نگار نے اعداد و شمار کے ساتھ مسلمانوں کا یورپی ملکوں

میں تناسب بتایا ہے کہ اٹلی میں ۲ فیصد' جرمنی میں ۵ فیصد' پراگ میں ۱۰ فیصد' بڈاپسٹ میں ۵ فیصد اور سوئٹزرلینڈ میں ۶ فیصد مسلمان ہیں۔ فرانس جو مذہباً کیتھولک ملک ہے وہاں مسلمانوں کی تعداد پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور یہودیوں سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اٹلی میں اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے۔ جرمنی میں ترک مسلمانوں کی تعداد ۲۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہی حال سپین' برطانیہ اور بلجیئم کا ہے۔ غرض وہ یورپ کہ جس نے ایک سو سال تک اپنی کالونیوں کو اپنے کلچر سے نوازا اور ایشیا اور افریقہ سے لاکھوں لوگ "مہذّب اور تعلیم یافتہ" بنانے کو یورپ بھیجے' آج وہی لوگ یورپ کے کلچر کے متوازی اپنے کلچر کا پورا پورا تحفظ کر کے یورپین افراد کو متاثر کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو رہے ہیں۔

نیوزویک کے اس مضمون (اجنبی یورپ) کے وقائع نگار کرسٹوفر ڈکیؔ نے آخر میں جو نتیجہ نکالا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

> "یہ ہمارے شہروں میں بسنے والے مسلمان' ان کو ہم خود یہاں لائے ہیں' اب ان کا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ یہ اپنے دین کو چھوڑنے والے نہیں۔ یہ ایک غالب عنصر ہیں۔ تہذیبوں کے تصادم میں مسلمان تہذیب مارکیٹ کی تہذیب ہے اور مارکیٹ میں وہی چیز مقام بناتی ہے جو اعلیٰ ہو۔ یہ یورپ کے مستقبل کی تہذیب ہے اور یہ یورپ کا آئندہ دین ہے۔ یورپ کا چہرہ بدل رہا ہے اور مستقبل میں یہ چہرہ ایک اسلامی چہرہ ہو گا"۔ (ان شاء اللہ)

امریکہ میں مقیم مسلم خواتین کی انجمنوں کی تعداد میں تقریباً چھ گنا اضافہ ہو گیا ہے اور یہ انجمنیں امریکی معاشرے میں مسلم خواتین سے امتیازی سلوک کے خلاف صف آراء ہیں۔ امریکی معاشرے میں بدکرداری اور اخلاقی پستی جس انتہا کو جا پہنچی ہے وہاں کے لوگ خود اس سے عاجز و بیزار ہیں۔ چنانچہ ایڈز کے خدائی عذاب نے ان کی اس حد تک آنکھیں کھول دی ہیں کہ آج بعض ریستورانوں میں ایسے نوٹس (Notice) لگے عام نظر آتے ہیں کہ "نیم برہنہ اور عریاں خواتین کا داخلہ بند ہے"۔ نیز اخباروں میں ایسی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ ۱۹۹۴ء کے صرف ماہ اگست میں دو ہزار نوجوان طالبات نے بے حیائی اور بدکرداری سے پرہیز کی قسم کھائی ہے۔ لاکھوں والدین نے اپنی بیٹیوں کو حیا کی

نشانی کے طور پر انگوٹھیاں خرید کر پہنائیں اور حلف لیا کہ وہ باعصمت رہیں گی۔ آج ان کے ہاتھوں میں پہنی یہ انگوٹھیاں ان کی شرافت کی دلیل اور خود ان کے لئے باعثِ فخر ہیں۔

امریکہ کی بات ہو رہی ہے تو میں یہاں امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کے پڑپوتے جارج اشقون کے قبولِ اسلام کی ایمان افروز وارداتِ قلبی کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں جو انہوں نے سعودی انگریزی سروس کے سامنے بیان کی تھی۔ فرماتے ہیں :

"میری افغانستان میں بطور صحافی کیمرہ مین کے' مشہور رسالہ "Times" کی طرف سے تعیناتی ہوئی۔ وہاں میں نے عام افغان مجاہدین کے اندر جو اسلامی روح محسوس کی اس نے مجھے متحیر کر کے رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ عین معرکۂ جنگ میں وقت آنے پر نمازوں کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کے لئے ہم یہ عبادت کرتے ہیں۔ جب میں انہیں جوش و جذبے کے ساتھ جہاد کرتے دیکھتا کہ نہتے ہوتے ہوئے بھی وہ ایک بڑی فوجی طاقت کے ساتھ لڑ رہے ہیں تو میں اپنے دل میں کہا کرتا کہ یہ لوگ کمزور اور نہتے ہونے کے باوجود اپنے طاقتور دشمن پر یقیناً فتح و غلبہ حاصل کرلیں گے' اس لئے کہ ان کے دلوں میں وہ ایمان موجزن ہے جس سے روسی فوج محروم ہے۔ میں نے قیامِ افغانستان کے دوران احادیث نبویؐ کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا کہ "وہ اپنے ایمان کی بدولت کامیاب و کامران ہوں گے"۔ اور ہوا بھی یہی کہ ایمان کی قوت سے افغان مجاہدین بالآخر جدید ترین جنگی ساز و سامان سے لیس روسی فوج کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے"۔

"سنڈے ٹیلی گراف" میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۸ء تک برطانیہ میں ۲۰ ہزار لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ان میں ایک سینئر جج لارڈ جسٹس اسکارٹ کا صاحبزادہ اور صاحبزادی اور ممتاز برطانوی شخصیت سر ولیم ویلکنس کا بیٹا میتھیو ویلکنس بھی شامل ہیں۔

برطانیہ کے ایک مشہور و معروف گلوکار اور موسیقار کیٹ اسٹیونز کے قبولِ اسلام کا تذکرہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ انہوں نے جب قرآن پڑھا تو وہ ان کے دل میں اتر تا چلا گیا اور جب سورۂ یوسف پڑھی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔ سورۂ یوسف کے مرکزی کردار حضرت یوسف علیہ السلام کے نام پر اپنا نام یوسف اسلام رکھا۔ وہ اب بھی گاتے ہیں، لیکن اب صحرائی پس منظر میں "طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا" جیسی نعت یا پھر اسلام کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ شاعری بھی ان کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے۔ انہوں نے بوسنیا کے مظلوموں پر بھی بہت دردانگیز گیت لکھے ہیں۔ آج یوسف اسلام، اسلام کے نمائندے کی حیثیت سے تعلیمی، تبلیغی اور تدریسی میدان میں بہت مؤثر اور مفید کام کر رہے ہیں۔

برطانیہ کی بات ہو رہی ہے تو یہاں کی ویلز یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر فار سٹڈیز لندن کے ڈائریکٹر کا ذکر ضروری ہے جو اس بات پر تحقیق کر رہے ہیں کہ برطانوی خواتین اتنی تیزی سے اسلام کیوں قبول کر رہی ہیں۔ اب تک محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام قبول کرنے والی خواتین اکثر متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور ملازمت پیشہ ہیں۔ اسلام قبول کرنے والی خواتین کے خلاف حکومتی کارروائیوں کے باوجود نو مسلم خواتین ملازمتوں سے فراغت تو قبول کر لیتی ہیں مگر اسلام چھوڑنے کا ذکر تک سننا گوارہ نہیں کرتیں۔

اٹلی یورپ ہی کا ایک اہم ترین ملک اور کیتھولک عیسائی فرقے کا گڑھ ہے۔ اس کے دارالخلافہ روم میں، جہاں ویٹی کن سٹی اور پوپ پال کی رہائش گاہ موجود ہے، اسلامک سنٹر کا افتتاح ریاض کے گورنر شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز نے اٹلی کے صدر کے ہاتھوں کروایا اور افتتاح کے موقع پر ویٹی کن سٹی کے ایک نمائندے کی شرکت پوری دنیا کے لئے ایک حیران کن خبر تھی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مؤتمر عالم اسلامی اس قسم کے اسلامک سنٹر ہالینڈ، بلجیئم، جنیوا اور میڈرڈ میں بھی قائم کر چکی ہے۔

فرانس میں ۱۹۹۱ء سے مسلم طالبات اور فرانسیسی حکومت کے درمیان سکارف اور حجاب کا مشہور جھگڑا مدتوں عدالتوں کی رونق اور اخباروں کی زینت بنتا رہا، جس سے عالم

عیسائیت کی اسلام کے لئے تنگ نظری اور بے انصافی سامنے آتی ہے۔ آخر ہیومن رائٹس کمیشن حرکت میں آئی اور عدالت سے مسلم طالبات کو مذہبی آزادی کا حق دلوانے میں کامیاب رہی۔ اب فرانس میں ۱۹۹۱ء والی کیفیت نہیں' یہاں اسلام کا کارواں بڑی تیزی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فرانس کی سرزمین نے مسلمانوں کے لئے اپنی بانہیں پھیلادی ہیں۔ آج فرانس میں اسکارف اور حجاب مسلم خواتین کا امتیازی نشان ہے اور حکومت کے معاندانہ رویّہ کے باوجود خواتین اسلام کے اس عالمی قافلے میں جوق در جوق شریک ہو رہی ہیں۔ میرے سامنے تبلیغی جماعت کی ایک خاتون نے اپنے دورۂ فرانس کا ذکر کرتے ہوئے حلفیہ بتایا کہ ہماری تبلیغ سے متأثر ہو کر صرف ایک دن میں ایک سو خواتین نے برقعے سلوائے تھے اور شرعی پردہ بخوشی اختیار کرلیا تھا۔

جرمنی کی برلن یونیورسٹی کی شعبہ سوشل سٹڈیز کی طالبہ اریکہ سیفرٹ جن کا اب اسلامی نام رقیہ ہے' اپنے قبولِ اسلام کی وجہ یوں بیان کرتی ہیں

"میں اس لئے مسلمان ہوئی کہ یورپی طرزِ زندگی سے میں بیزار ہو چکی تھی۔ یورپی زندگی خصوصاً خواتین کے لئے انسانی فطرت کے قطعاً خلاف ہے۔ یورپ میں عورت کو صرف فیشن کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔ یہاں سیرت سے زیادہ صورت کو اہمیت حاصل ہے۔ یورپین معاشرے میں دولت خدا ہے۔ میرے خیال میں اسلام فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے امتِ مسلمہ کا ایک فرد بننے کا فیصلہ کیا۔ نبی آخرالزمان ﷺ پر نازل کردہ کتاب 'قرآن مجید' میں ہمارے تمام مسائل کا حل موجود ہے"۔

یورپ اور امریکہ کی بات ہو چکی' اب آتے ہیں مشرق بعید کے ممالک کی طرف ـــــ اور جاپان سے شروع کرتے ہیں۔ جاپان میں مختلف اسلامی جماعتیں (تبلیغی جماعت سمیت) دعوتِ دین کا فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔ ان کی رپورٹ کے مطابق جاپانی مَردوں کی نسبت قبول اسلام میں جاپانی پڑھی لکھی خواتین زیادہ مائل ہیں۔ سعودی ڈاکٹر صالح مہدی کے مطابق (جنہوں نے کئی مرتبہ جاپان کا دورہ کیا) "جاپان کا سب سے بڑا مذہب شنٹوازم ہے جس کی پھر کئی شاخیں ہیں' جن میں ایک اومونوکیو ہے۔ یہ فرقہ اسلام

سے بہت حد تک قریب اور توحید پر ہے۔ اس لئے اس فرقہ کے لوگ اسلام سے بہت جلد متأثر ہوتے ہیں اور دعوت و تبلیغ سن کر فوراً اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

ہانگ کانگ میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار ہے' ان میں زیادہ تر چینی مسلمان ہیں۔ اس شہر میں چھ بڑی مساجد اور ایک عظیم الشان اسلامک سنٹر ہے جو وہاں کے لوگوں میں اسلام کے فہم و تعلیم کو عام کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

جنوبی کوریا میں اسلام کی نشرواشاعت کا کام بڑی تندہی سے ہو رہا ہے۔ وہاں اسلام قبول کرنے والے نومسلم اس کام کو آگے بہت بڑھا اور پھیلا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں عائشہ کم کے تاثرات پڑھئے۔ فرماتی ہیں :

> "اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ اس نے قبول اسلام کے بعد مجھے اپنی ساری صلاحیتیں دعوت و تبلیغ کے لئے وقف کر دینے کی توفیق عطا کر دی۔ میں نے کوشش کی کہ ہر تعلیم یافتہ خاتون تک اسلام کا پیغام پہنچا دیا جائے اور میری کوششیں توقع سے کہیں بڑھ کر بار آور ثابت ہوئیں اور خواتین کی بہت بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔ خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹی کی طالبات سے میں نے تسلسل کے ساتھ رابطہ رکھا اور وہ بہت مفید ثابت ہوا۔ میں خواتین کو بتاتی ہوں کہ اسلام عورت کو کیا مقام اور حیثیت دیتا ہے' کس طرح خاندانی نظام کی حفاظت کرتا ہے اور میاں بیوی دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کی تاکید کرتا ہے"۔

فلپائنی اداکار رابن کا قبول اسلام بھی اس ملک کے اخباروں میں نمایاں مقام لے رہا ہے۔ آج کل رابن اسلحہ رکھنے کے جرم میں قید کاٹ رہا ہے۔ رابن کا کہنا ہے کہ "اسلام نے مجھے جذباتی اور روحانی طور پر مزید مستحکم بنا دیا ہے۔ اس سال میں نے جیل میں پہلی بار رمضان کے روزے رکھے"۔ اداکار رابن نے فلپائنی عوام سے کہا ہے کہ وہ اسلام کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔

آخر میں میں مسلمان برادر ملک ترکی کا تذکرہ کرنا ہرگز نہ بھولوں گی' جس میں اسلامی خلافت کے خاتمے کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا سیکولر راہوں پر چل نکلا اور عربی رسم الخط' عربی میں نماز اور قرآن کی تلاوت' یہاں تک کہ عربی میں اذان تک ممنوع قرار دے

دی، لیکن وہ مسلم ترکوں کے دلوں اور نئی نسلوں سے اسلام کو نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسلامی تحریک بتدریج وہاں پھیلتی رہی اور آج کل وہاں ایک مثبت تبدیلی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ ترکی حجاج کی تعداد میں روز بروز اضافہ اور برادر مسلم ممالک کے عوام سے ترکوں کی والہانہ محبت اسلامی انقلاب کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔ استنبول' ترکی کا دار الحکومت ایک نئی سحر کی نوید دے رہا ہے' یہ عظمتِ اسلام کی سحر ہے۔ آج بھی استنبول کی دیواروں پر کبھی کبھار ابھرتی یہ تحریر نہایت امید افزا ہے کہ "ترکی اسلام کا تھا' اسلام کا ہے اور اسلام کا رہے گا"۔ گزشتہ الیکشن میں اسلامی مزاج و فکر رکھنے والی رفاہ پارٹی کی کامیابی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ آج کی سیکولر ذہن رکھنے والی حکومت نے حجاب اور داڑھی کو یونیورسٹی کی سطح پر ممنوع قرار دیا تو طلبہ کے احتجاجی مظاہروں اور ہڑتالوں نے حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور وہ اسلام پسند طلبہ کا یہ مطالبہ ماننے پر مجبور ہو گئی کہ حجاب پہننے والی طالبات اور داڑھی رکھنے والے طلبہ کو بھی ترکی کی یونیورسٹیوں میں داخلہ مل سکتا ہے۔ سیاسی مبصرین ان حالات سے یہ اندازہ لگانے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اب ترکی میں اسلامی تحریک کو روکنا ناممکنات میں سے ہو گا۔

مضمون کی طوالت کے پیش نظر دیگر برادر اسلامی ممالک کا مختصراً ذکر کرتی ہوں۔ الجزائر' سوڈان اور مصر میں آئے دن اسلام پسند عناصر کی سینکڑوں کی تعداد میں اپنوں کے ہاتھوں ہلاکت سے اتنا تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہاں اسلامی تحریکیں کس جذبۂ صادق کی حامل ہیں اور ایثار و قربانی کے کس مقام بلند پر جا پہنچی ہیں' جس کے بعد کامیابی قدم چومتی ہے ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

قرآن حکیم میں اللہ کا وعدہ تکمیلِ ایمان کی شرط کے ساتھ پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے: ﴿وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اور کتبِ احادیث میں ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جن میں دنیا کے خاتمے سے قبل پورے کرۂ ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کی خوشخبری ملتی ہے۔ الغرض دنیا کی موجودہ فرسٹریشن اور اعصابی و اخلاقی

بیماریوں کا علاج اسلام ہے۔ اسلام میں ہی نفرت و جنگ کی آگ کے دہانے پر کھڑی انسانیت کے لئے امن و سلامتی کا پیغام ہے۔ اسلام ہی آج کی پیاسی روحوں کے لئے چشمۂ آبِ حیات ہے اور تپتے صحرا کے مسافروں کے لئے واحد نخلستان۔ بقول علامہ اقبال ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبین خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

(ان شاء اللہ)

سالانہ اجمالی جائزہ رپورٹ

تنظیمِ اسلامی پاکستان

برائے تنظیمی سال ۹۸-۱۹۹۷ء

از : عبدالرزاق' ناظم اعلیٰ

تنظیموں اور تحریکوں کی زندگیوں میں وقتاً فوقتاً رُک کر ماضی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی جائزے کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دیا جاتا ہے۔ تنظیم اسلامی اپنے قیام کے بعد سے ہر سال اپنے سالانہ اجتماع کے موقع پر اس کا اہتمام کرتی رہی ہے۔ آج تنظیم کے تیئسویں (۲۳) سالانہ اجتماع کے موقع پر سال گزشتہ کے دوران ہونے والی سرگرمیوں کا نہایت اجمالی جائزہ پیش خدمت ہے۔

گزشتہ سال کے دوران امراء و ناظمین حلقہ جات نے الحمدللہ اپنے اپنے حلقوں میں تنظیم کے مقاصد کے حصول کیلئے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے بھرپور جدوجہد کی۔ تنظیم کے انتہائی محدود وسائل کے باوجود رفقاء کی محنت کو بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے نتیجہ خیز بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اپنے وسائل کے دائرے میں رہتے ہوئے توسیع دعوت کیلئے مختلف النوع طریقے اختیار کئے گئے۔ رفقاء کی تربیت اور محاسبہ کے عمل کو حکمت و تدبیر سے چلانے کی کوشش کی گئی۔

امیر محترم کی مصروفیات

امیر محترم نے گھٹنوں کی شدید تکلیف کے باوجود ماہ جنوری ۹۸ء میں رمضان المبارک کے دوران قرآن اکیڈمی کراچی میں الحمدللہ دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی جسے ڈیجیٹل وڈیو پر ریکارڈ کیا گیا۔ اس پروگرام کے بعد امیر محترم اپنے گھٹنوں کے آپریشن کے سلسلے میں ۲۰/ فروری کو امریکہ روانہ ہو گئے۔ الحمدللہ کہ گھٹنوں کا آپریشن کامیاب ہوا اور موصوف مناسب آرام کے بعد ۲۱/ مئی کو واپس تشریف لائے۔ ۲۳/ مئی کو مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شریک ہوئے اور رفتہ رفتہ دعوتی معمولات کا آغاز کر دیا۔ جس کا تذکرہ رپورٹ

میں مختلف مقامات پر ہو گا۔

نظامِ مشاورت

بیعت کی اساس پر قائم ہیئت تنظیمی میں مشاورت کی اہمیت دستوری و قانونی جماعتوں کے مقابلے میں بڑھ کر ہوتی ہے۔ الحمدللہ کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر تنظیم اسلامی میں ہر سطح پر مشاورت کا نظام اپنی اصل روح کے ساتھ مقامی تنظیموں اور حلقہ جات کی سطح پر بھی جاری و ساری ہے۔

مرکزی دفتر میں ناظمین کا اجلاس ہر ہفتے باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ نیز ایک ماہانہ اجلاس امیر محترم کے ساتھ ہوتا ہے۔ امراء و ناظمین حلقہ جات کا اجلاس ناظم اعلیٰ کے ساتھ نیز مرکزی ناظمین کے ہمراہ امیر محترم کے ساتھ ہر دو ماہ بعد ہوتا ہے، جس میں پورے پاکستان کی تنظیمی و دعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

مرکزی مجلس مشاورت کا اجلاس ہر چار ماہ بعد منعقد ہوتا ہے جس میں منتخب اراکین شریک ہوتے ہیں (مرکزی مجلس مشاورت کا انتخاب ہر دو سال کے بعد ہوتا ہے۔ اس سال کے دوران نئے انتخابات ہوئے) اس اجلاس میں مرکزی و حلقہ جات کے امراء و ناظمین بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح مرکزی مجلس مشاورت کے اراکین کی کل تعداد چالیس ہو جاتی ہے۔ گزشتہ سال کے دوران مرکزی مجلس مشاورت کے تین اجلاس ہوئے۔ مزید برآں رفقاء کی آراء سے استفادہ کیلئے توسیعی مشاورت کا اہتمام بھی کیا گیا۔

توسیعی مجلس عاملہ کے اجلاس

تنظیم کی پالیسیوں اور لائحہ عمل پر مشورے اور حلقوں کے تنظیمی مسائل پر گفتگو کیلئے دوران سال تین مرتبہ دسمبر ۹۷ء، مئی ۹۸ء اور جولائی ۹۸ء میں مرکز میں توسیعی مجلس عاملہ کے دو روزہ اجلاس ہوئے جن میں پاکستان کے آٹھوں حلقوں کے امراء / ناظمین نے شرکت کی۔ راقم نے بھی مختلف مواقع پر حلقہ جات کے دورے کئے اور مقامی تنظیموں کے امراء اور دیگر ذمہ دار رفقاء سے ملاقاتیں کر کے مقامی مسائل کو حل کرنے کیلئے مشورے اور ہدایات دیں۔

انتظامی ڈھانچہ

تنظیم اسلامی پاکستان کو انتظامی سہولت کے پیش نظر دس حلقہ جات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ان دس حلقوں کے تحت ۳۴ تنظیمیں اور ۷۴ منفرد اسرہ جات ہیں جو پاکستان کے چاروں صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

رفقاء کی تعداد اور موجودہ سال کے دوران اضافہ

تنظیم اسلامی پاکستان میں اس وقت رفقاء کی تعداد ۲۱۸۱ ہے۔ ان میں سے ۸۰۲ ملتزم اور ۱۳۷۹ مبتدی رفقاء ہیں۔ ان میں ۱۵۰ کے لگ بھگ وہ رفقاء شامل نہیں ہیں جو سعودی عرب کے مختلف شہروں میں مقیم ہیں۔ ان رفقاء سے اس وقت رابطہ منقطع کرنا پڑا جب گزشتہ سال سعودی حکومت نے الحسل میں ہمارے ۱۱ رفقاء کے خلاف ایکشن لیتے ہوئے ان میں سے تین کو پہلے قید کیا اور پھر ان تینوں سمیت مزید ۸ رفقاء کو ملازمتوں سے برطرف کرکے پاکستان بھجوا دیا۔ اس سال کے دوران ۲۸۱ رفقاء کا تنظیم میں اضافہ ہوا۔ سب سے زیادہ ۵۴ رفقاء حلقہ سرحد میں بنے۔ اس کے بعد ۵۰' ۵۰ حلقہ پنجاب شرقی اور سندھ بلوچستان میں' ۴۴ حلقہ پنجاب شمالی میں' ۲۴ پنجاب غربی' ۲۳ عرب امارات' ۲۶ گوجرانوالہ ڈویژن میں' جبکہ پنجاب جنوبی میں ۱۹ اور آزاد کشمیر میں ۷ رفقاء کا اضافہ ہوا۔

مبتدی سے ملتزم بننے والے رفقاء کی تعداد

تنظیم اسلامی پاکستان کے تمام حلقوں میں دوران سال مبتدی سے ملتزم بننے والے رفقاء کی تعداد ۶۸ ہے۔

لاتعلق' معتذر اور تنظیم سے معذرت کرنے والے رفقاء کی تعداد

دورانِ سال تمام حلقہ جات سے کل ۱۵۷ رفقاء کو لاتعلق جبکہ ۱۵ کو معتذر قرار دیا گیا۔ ۴۲ رفقاء نے تنظیم سے مختلف وجوہات کے باعث معذرت کی اور ۱۰ رفقاء کا اخراج کیا گیا۔

تنظیمی اجتماعات کی کیفیت

تنظیمی اجتماعات بحمد اللہ قریباً تمام حلقوں میں نظام العمل کے مطابق منعقد ہوتے رہے۔ ان اجتماعات میں رفقاء اپنی سیرت و کردار کی خامیوں کا جائزہ لے کر اور ایک دوسرے کو توجہ دلا کر انہیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مزید برآں اپنی دعوتی سرگرمیوں اور ذاتی رابطوں کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے پیش آمدہ مشکلات و مسائل کو باہمی مشورے سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تربیتی اجتماعات

رفقاء کی فکری و عملی تربیت کیلئے تربیتی اجتماعات کا انعقاد کیا جاتا ہے' جن میں مطالعہ لٹریچر' بنیادی دینی موضوعات پر مذاکرے اور تقاریر ہوتی ہیں' جس سے رفقاء میں فکری پختگی اور مافی الضمیر کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ دوران سال یہ اجتماعات بھی تمام حلقوں میں باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہے۔

دعوتی اجتماعات

عوام کو تنظیم کی دعوت اور نظامِ خلافت کے قیام کیلئے انقلابی طریقہ کار سے متعارف کروانے کیلئے یہ پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام دروسِ قرآن اور کارنر میٹنگز کی صورت میں منعقد ہوتے ہیں جن میں بین الاقوامی حالات کے تناظر میں اسلام کا مستقبل اور پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام جیسے موضوعات پر تقاریر ہوتی ہیں۔ کارنر میٹنگز عموماً ماہانہ بنیادوں پر ہوتی ہیں۔ دوران سال یہ پروگرام بیشتر تنظیموں میں باقاعدگی کے ساتھ ہوئے۔ اکثر حلقہ جات میں کافی رفقاء جامع مساجد میں خطاب جمعہ کی ذمہ داری باقاعدگی سے نبھا رہے ہیں' جس کے ذریعے عوام الناس تک دینی فرائض کا جامع تصور اور پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت اور اس کا طریقہ کار پہنچایا جاتا ہے۔

یک روزہ / دو روزہ / ہفت روزہ پروگرام

ان پروگراموں کا مقصد جہاں رفقاء کی فکری و عملی تربیت اور سیرت و کردار کا تزکیہ ہوتا ہے وہیں ایسے دور دراز علاقوں کے لوگوں تک دین کی انقلابی دعوت پہنچانا بھی ہوتا ہے جہاں یہ دعوت پہلے نہ پہنچی ہو۔ رفقاء ایک امیر کی قیادت میں دس دس پندرہ پندرہ کی تعداد میں جماعتوں کی صورت میں گھروں کے آرام و آسائش کو تج کر نکلتے ہیں۔ مختلف مساجد میں قیام کرتے ہوئے' ذاتی رابطوں' دروسِ قرآن' کارنر میٹنگز اور تقسیم لٹریچر کے ذریعے نظامِ خلافت کے مختلف پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس سال کے دوران ۳۹ ایک روزہ پروگرام' ۱۶ مقامات پر دو روزہ اور ۴ مقامات پر ہفت روزہ پروگرام منعقد ہوئے۔

حلقہ ہائے دروسِ قرآن

رفقاء تنظیم اپنی فکر کی تازگی' ایمان کی آبیاری اور لوگوں کو اسلام کے انقلابی فکر سے

متعارف کروانے کیلئے قرآن مجید کے دروس کا اہتمام کرتے ہیں۔ تنظیم کے نظم کے تحت لازمی اجتماعات کے علاوہ لگ بھگ ۲۲۰ مقامات پر تنظیم کے رفقاء روزانہ / ہفتہ وار / پندرہ روزہ / ماہانہ دروسِ قرآن کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی مساجد میں رفقاء خطبات جمعہ میں قرآن مجید کی انقلابی تعلیمات کو عام کرنے میں مصروف ہیں۔ دورانِ سال یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا۔

علاقائی ریلی پروگرام

تنظیمی سال کے پہلے نصف کے دوران رمضان المبارک کی مصروفیت اور اس کے فوراً بعد امیر محترم کے گھٹنوں کے آپریشن کے باعث ریلی پروگرام منعقد نہ ہو سکے۔ نصف ثانی کے دوران ہر حلقے میں ایک ایک ریلی یا جلسے کا پروگرام طے کیا گیا۔ چنانچہ ۲۳/ اگست کو حلقہ سرحد کے شہر بٹ خیلہ میں ریلی ہوئی جس میں حلقے کے تمام رفقاء شریک ہوئے۔ امیر محترم نے جلسے سے قبل بٹ خیلہ بار کونسل سے خطاب کیا ـــــ اور جلسے کے بعد شام کو بٹ خیلہ پریس کلب میں صحافیوں کے سوالات کے جواب بھی دیئے۔

دوسرا پروگرام حلقہ پنجاب غربی کے تحت ۲۸ تا ۳۰/ اگست قرآن ہال سرگودھا میں منعقد ہوا جس میں حلقے کے تمام رفقاء نے شرکت کی۔ امیر محترم نے خلافت کی حقیقت اور اس کا دستوری و سیاسی' معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ کے موضوعات پر تین خطبات ارشاد فرمائے۔ امیر محترم کی رفقاء سے ملاقات کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں امراء تنا ظیم اور نقباء نے رپورٹیں پیش کیں اور رفقاء نے امیر محترم سے سوالات بھی کئے۔ بعد میں دو صحافی حضرات نے امیر محترم کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔

تیسرا پروگرام حلقہ سندھ بلوچستان کے تحت کراچی میں ۶/ ستمبر کو بعد نماز عشاء گلشن اقبال میں ایک جلسے کی صورت میں ہوا۔ امیر محترم نے "پاکستان میں نفاذ شریعت کا درست طریقہ کار" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

چوتھا پروگرام حلقہ پنجاب شمالی میں ۱۳/ ستمبر کو منعقد ہوا۔ حلقے کے نئے دفتر میں امیر محترم نے رفقاء حلقہ سے ملاقات کی۔ شام کو ہمدرد ہال میں نفاذ شریعت اور عہد حاضر کے تقاضے کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اس کے ساتھ ۱۴/ ستمبر کو ایبٹ آباد میں ایک جلسہ سے بھی خطاب فرمایا۔

پانچواں پروگرام حلقہ پنجاب جنوبی میں ۲۰۔ ۲۱/ ستمبر ۹۸ء کو ہوا۔ ناظم حلقہ نے جلسے کیلئے

وہاڑی شہر کو منتخب کیا تھا۔ چنانچہ ۲۰/ستمبر کو بعد نماز عصر رفقاء حلقہ نے پورے شہر میں ریلی کی صورت میں چکر لگایا۔ بعد نماز مغرب کارپوریشن کے سبزہ زار میں جلسے کا اہتمام تھا۔ امیر محترم نے "نفاذ شریعت اور جاگیرداری و سرمایہ داری کا خاتمہ" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اگلے روز وہاڑی بار ایسوسی ایشن میں وکلاء سے خطاب فرمایا۔

چھٹا پروگرام حلقہ پنجاب شرقی میں ۲۶/ستمبر کو بعد نماز عشاء لاہور میں چوبرجی کوارٹرز کی گراؤنڈ میں ایک جلسہ عام کی صورت میں منعقد ہوا جس میں امیر محترم نے "پاکستان اور نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت" کے عنوان پر مفصل خطاب فرمایا۔ امیر محترم سے قبل مولانا خورشید گنگوہی صاحب معاون تحریک خلافت نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ اسی پروگرام کے تسلسل میں امیر محترم نے ۳/اکتوبر کو ہارون آباد اور ۴/اکتوبر کو بہاولنگر میں جلسہ ہائے عام سے بھی خطاب فرمایا۔

ساتواں پروگرام حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن میں ۱۷/اکتوبر ۹۸ء کو شیرانوالہ باغ میں بعد نماز عشاء منعقد ہوا جس میں امیر محترم نے "انقلابِ محمدی اور جدید دور کے تقاضے" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اگلے روز حلقے کے رفقاء سے ملاقات فرمائی۔ ۱۷/اکتوبر ہی کو گوجرانوالہ چیمبر آف کامرس کے وسیع ہال میں تاجروں سے خطاب فرمایا۔

آٹھواں پروگرام حلقہ آزاد کشمیر کے تحت مظفر آباد کلب ہال میں ۱۹/اکتوبر کو منعقد ہوا' جس میں حلقے کے تمام رفقاء نے شرکت کی۔ امیر محترم نے "عہد حاضر میں نظامِ خلافت" کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔ اگلے روز صبح ۸ بجے رفقاء حلقہ سے ملاقات ہوئی۔ دس بجے چیدہ صحافی حضرات نے امیر محترم کا انٹرویو لیا۔ ساڑھے گیارہ بجے جہاد کونسل کے ارکان سے ملاقات کی اور بعد نماز مغرب مسجد سلطانی مظفر آباد میں سورۃ الحج کے آخری رکوع کا درس دیا۔

رمضان المبارک میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام

اس سال رمضان المبارک کے دوران دورۂ ترجمۂ قرآن کا سب سے بڑا پروگرام قرآن اکیڈمی کراچی کی جامع مسجد میں ہوا جہاں امیر محترم نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ قرآن اکیڈمی لاہور میں ناظم حلقہ آزاد کشمیر جناب خالد محمود عباسی اور قرآن اکیڈمی ملتان میں ڈاکٹر طاہر خان خاکوانی نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ ان حضرات کے علاوہ لاہور' ملتان' راولپنڈی' فیصل آباد' پشاور' سرگودھا' گوجرانوالہ وغیرہ میں بہت سے سینئر رفقاء

نے دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام کروائے۔ علاوہ ازیں تراویح کے ساتھ ہر پارے کے مضامین کا خلاصہ بھی بعض مقامات پر بیان کیا گیا۔ دورۂ ترجمۂ قرآن کے ویڈیو کیسٹس سے بھی متعدد مقامات پر استفادہ کیا گیا۔

منکرات کے خلاف احتجاجی مظاہرے

تنظیم اسلامی قرآنی حکم امربالمعروف و نہی عن المنکر کے حوالے سے امربالمعروف کے ساتھ ساتھ نہی عن المنکر پر بھی پورا زور دیتی ہے۔ معاشرے میں موجود مختلف منکرات اور حکومت اور دیگر اداروں کے خلافِ اسلام اقدامات کے خلاف تنظیم اسلامی وقتاً فوقتاً پُرامن احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کرتی ہے۔ رفقاء پلے کارڈز اور بینرز' جن پر منکرات کے خلاف نعرے درج ہوتے ہیں' اُٹھا کر منظم انداز میں سڑکوں پر گشت کرتے ہیں۔ لاؤڈ سپیکر پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی خلاف ورزی کے بھیانک انجام سے متعلقہ اداروں اور عوام کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ اسی موضوع پر عوام میں ہینڈ بلز بھی تقسیم کئے جاتے ہیں۔ دوران سال پاکستان کے مختلف بڑے شہروں میں منکرات کے خلاف ۲۰ مظاہرے کئے گئے۔

اساتذہ سے خصوصی رابطہ

گزشتہ سال کے دوران امراء / ناظمین حلقہ جات کو اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ سے خصوصی طور پر رابطہ کر کے اپنی دعوت پہنچانے کا ہدف دیا گیا تھا۔ تمام حلقوں کی رپورٹس کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا ہے کہ الحمدللہ تمام حلقوں میں اساتذہ سے رابطہ کا کام ہوا ہے' خصوصاً حلقہ آزاد کشمیر' حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن' حلقہ پنجاب غربی اور پنجاب شمالی میں اس ہدف پر خصوصی محنت کی گئی ہے' جو ان شاء اللہ بار آور ثابت ہوگی۔

کھپت جرائد

تنظیم اسلامی کا نقیب و ترجمان ماہنامہ میثاق اور تحریک خلافت کا ہفت روزہ ندائے خلافت دوران سال الحمدللہ باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے اور تمام حلقوں میں رفقاء تک پہنچائے جاتے رہے۔ میثاق اور ندائے خلافت کی حلقہ جات میں کھپت بالترتیب ۲۱۰۳ اور ۲۱۷۲ رہی۔ میثاق اور ندائے خلافت کے سالانہ خریدار' جن کی تعداد بالترتیب ۱۴۵۰ اور ۴۷۷ ہے' اس کے علاوہ ہیں۔ اسی طرح اعزازی خریدار اور تبادلہ کے حوالے سے جو پرچے

بھجوائے جاتے ہیں وہ بھی ان کے علاوہ ہیں۔

لائبریریاں اور مکتبے

لوگوں کو تنظیم اسلامی کے فکر و مقاصد سے متعارف کروانے کا ایک ذریعہ کتب و کیسٹس کی لائبریریاں بھی ہیں۔ یہ اکثر و بیشتر علاقائی تنظیموں کی سطح پر قائم ہیں جہاں سے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ کتب کے مقابلے میں آڈیو کیسٹس زیادہ جاری ہوتی ہیں۔ دوران سال تمام حلقوں میں قائم لائبریریوں سے کہیں کم' کہیں زیادہ لوگ استفادہ کرتے رہے۔

حلقہ جات میں ہونے والی قابلِ ذکر دعوتی سرگرمیاں

حلقہ جات' تنظیموں اور اسرہ جات میں دوران سال توسیع دعوت اور تنظیمی استحکام کیلئے رفقاء اور ذمہ داران نے جو جدوجہد اور محنت کی اس سب کا احاطہ تحریر میں لانا نہ ممکن ہے اور نہ ضروری۔ اس لئے کہ یہ ساری جدوجہد جس ہستی کو راضی کرنے کیلئے کی گئی ہے اس کے علم میں اپنی تمام تر باریکیوں کے ساتھ آچکی ہے۔ اقامت دین کیلئے جدوجہد کرنے والے اپنی نیتوں اور ارادوں کی پاکیزگی کے تناسب سے اجر کے مستحق قرار پا چکے۔ یہاں دعوتی سرگرمیوں میں سے صرف چند اہم پروگراموں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہو گا کہ الحمدللہ یہ قافلہ نظم و ضبط اور جوش و جذبے سے سرشار اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔

حلقہ سرحد

(i) ناظم اعلیٰ (راقم) نے ۱۹ تا ۲۲/ دسمبر ۹۷ء امیر حلقہ میجر (ر) فتح محمد صاحب کے ہمراہ سرحد میں سواڑی' ڈگر' مینگورہ' بٹ خیلہ' دیر' تیمرگرہ اور باجوڑ کا تنظیمی و دعوتی دورہ کیا۔ تمام مقامات پر رفقاء سے ملاقاتیں اور تنظیمی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ بعض مقامات پر دعوتی نشستوں کا بھی اہتمام کیا گیا۔

(ii) ماہ فروری ۹۸ء میں گاگرہ کے مقام پر خصوصی مبتدی تربیت گاہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ۱۸ رفقاء کے علاوہ ۱۷ احباب بھی مستقلاً شریک رہے' ان میں سے ۸ نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔

(iii) ماہ جون میں پشاور میں دو ہفت روزہ تفہیم دین پروگرام منعقد کئے گئے۔

(vi) خویشگی میں چالیس روزہ قرآن فہمی کورس منعقد کیا گیا جس میں عربی گرائمر' منتخب نصاب اور امیر محترم کے خصوصی خطابات وڈیو کے ذریعے دکھائے گئے۔

حلقہ پنجاب شمالی

(i) ۲۰/اپریل ۹۸ء کو ناظم حلقہ نے ڈائریکٹر اخوت اکیڈمی کی خواہش پر دورۂ افغانستان کے تاثرات بیان کئے جنہیں بہت پسند کیا گیا۔ بعد میں یہ تاثرات من و عن اخوت اکیڈمی کے ترجمان ماہنامہ "منشور" میں طبع بھی کر دیئے گئے۔

(ii) "گداگری ہی غلامی ہے" ملکی حالات کے پس منظر میں ایک ہینڈ بل دو ہزار کی تعداد میں طبع کروا کر تقسیم کیا گیا۔ اسی طرح ایک اور ہینڈ بل "بڑھے چلو کہ منزل قریب ہے" بھی پانچ ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا۔

(iii) یکم جون کو ناظم حلقہ کی قیادت میں ایک وفد وفاقی وزیر مذہبی امور راجہ ظفرالحق سے ملا۔ وفد نے ملک میں سودی نظام برقرار رکھنے اور آئین میں مجوزہ ترامیم نہ کرنے پر انہیں تنظیم کی تشویش سے آگاہ کیا۔

(iv) ناظم اعلیٰ (راقم) کے ہمراہ ناظم حلقہ نے راولپنڈی' اسلام آباد' ایبٹ آباد' چک شہزاد' جاتلان اور جہلم کا دعوتی و تنظیمی دورہ کیا۔ رفقاء سے ملاقاتیں اور بعض مقامات پر دعوتی خطابات بھی ہوئے۔

حلقہ آزاد کشمیر

(i) ناظم حلقہ نے دوران سال جامع مسجد اہلحدیث میں ہفتہ وار بنیادوں پر منتخب نصاب کا درس دیا۔ اس پروگرام میں اکثریت اساتذہ کی شریک رہی۔

(ii) پرنسپل گورنمنٹ کالج ملوٹ سے خصوصی رابطہ قائم کیا گیا۔ موصوف ناظم حلقہ کے ہفتہ وار درسِ قرآن مجید منعقدہ "باغ" میں باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔ موصوف نے اپنے کالج میں بھی ناظم حلقہ کے باقاعدہ خطابات کا آغاز کروایا ہے۔

(iii) گورنمنٹ کالج باغ میں دورۂ ترجمۂ قرآن بذریعہ وڈیو کیسٹس کا پروگرام باقاعدگی سے منعقد ہوا۔ ۲۰ سے زائد لیکچررز نے باقاعدگی سے اس پروگرام میں

شرکت کی۔

(۱۷) مظفر آباد میں تنظیم کے دفتر میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام ویڈیو کیسٹس کے ذریعے باقاعدگی سے منعقد ہوا۔

حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن

(i) ماہ مئی ۹۸ء کے دوران ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں امیر حلقہ نے "طالبان' اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر خطاب کیا۔

(ii) گوجرانوالہ میں مختلف مقامات پر عربی کی کلاسز کا اجراء کیا گیا جن میں عربی کے علاوہ تنظیمی فکر پر مبنی لیکچرز کا بھی اہتمام کیا گیا۔

(iii) سیالکوٹ شہر میں امیر حلقہ نے ماہ جون کے دوران پریس کلب سیالکوٹ میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا' جس میں تنظیم اسلامی کی دوسری دینی جماعتوں کے مقابلے میں امتیازی خصوصیات' طریق انقلاب اور "طالبان کے دیس میں" کے موضوع میں پر گفتگو کی اور صحافیوں کے سوالات کے جواب دیئے۔

(iv) ڈسکہ میں ماہ جون کے دوران ہفت روزہ تفہیم دین کورس کا انعقاد ہوا جس میں ایف اے اور بی اے کے قریباً ۸۰ طلبہ اور ۲۰ کے قریب بڑی عمر کے باشعور احباب نے باقاعدگی سے شرکت کی۔ تنظیم کی مکمل فکر ان تک پہنچائی گئی۔

حلقہ پنجاب شرقی

(i) ۵/ اکتوبر ۹۷ء کو الحمراء ہال نمبر۱ میں امیر محترم نے "کیا پاکستان تدریجی خودکشی کر رہا ہے" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اسی طرح ۱۹/ اکتوبر کو امیر محترم نے الحمراء ہال میں "اسلامی انقلاب کا نبویؐ طریق" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ ان دونوں پروگراموں کے تمام انتظام حلقہ کے رفقاء نے انجام دیئے۔ خصوصی طور پر شہر لاہور میں مختلف مقامات پر تشہیری کیمپ لگائے گئے جہاں کتب بھی فروخت کی گئیں اور ویڈیو کے ذریعے خطاب بھی دکھائے گئے۔

(ii) ۲/ اگست کو الحمراء ہال میں امیر محترم نے "عہد حاضر میں نظامِ خلافت کا دستوری

ڈھانچہ" کے عنوان پر خطاب فرمایا۔ حلقہ کے رفقاء نے پبلسٹی سمیت تمام انتظامات کا اہتمام کیا۔

(iii) تنظیم اسلامی لاہور جنوبی نے دعوت فورم کے عنوان سے دو پروگرام کئے جس میں خصوصی طور پر طلبہ اور دیگر احباب کو دعوت دی گئی۔ مختلف دینی اور تنظیمی موضوعات پر طلبہ کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ یہ پروگرام بہت کامیاب رہا۔

(iv) ہارون آباد میں نقیب اسرہ برادرم منیر احمد صاحب بڑی غیر معمولی محنت کر کے چار مقامات پر ہفتہ وار دعوتی پروگرام منعقد کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہارون آباد میں تھوڑے عرصے میں تنظیم کے کام کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔

حلقہ پنجاب غربی

(i) تنظیم اسلامی فیصل آباد شرقی کے تحت نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کیلئے مقامی ویڈیو سینٹرز کے مالکان سے گفتگو ہوئی اور انہیں آخرت کی جواب دہی سے آگاہ کیا گیا۔ اسی طرح بس اور ویگن مالکان سے بسوں اور ویگنوں میں ریکارڈنگ بند کرنے کے موضوع پر گفتگو کی۔

(ii) ناظم برائے علاقہ جات ڈیرہ اسماعیل خان' بھکر اور لیہ نے تینوں مقامات کے متعدد دورے کئے اور وہاں بھرپور محنت کے ذریعے تنظیم کی دعوت کو پہنچانے کا فریضہ ادا کیا۔

(iii) ماہ اپریل میں ایک خصوصی ہینڈ بل جس میں کسانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا گیا' چار ہزار کی تعداد میں طبع کروا کر شائع کیا گیا۔ اسی طرح ایک اور ہینڈ بل "اب بھی نہ جاگے تو" ایک ہزار کی تعداد میں شائع کر کے تقسیم کیا گیا۔

(iv) ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے ۲۴/ جولائی کو دار ارقم میں دو ہزار مرد و خواتین کو درسِ قرآن دیا۔ اسی طرح ایگریکلچر یونیورسٹی قذافی ہال میں "حقیقت نفاق"' طارق ہال میں "عشق رسول" اور ٹیپو ہال میں "حقوق والدین" کے موضوعات پر لیکچر زدیئے۔

حلقہ پنجاب جنوبی

(۱) امیر حلقہ نے ہر ماہ اپنے حلقے کے مختلف مقامات مثلاً ملتان' شجاع آباد' عبدالحکیم' بورے والا' وہاڑی' سکھر' صادق آباد' ڈیرہ غازی خان' بہاولپور' جھنگ وغیرہ میں دروسِ قرآن اور ترجمۂ قرآن کی نشستوں سے خطاب کیا۔

(۲) دوران رمضان امیر حلقہ نے پچاس دینی موضوعات پر روزانہ دو گھنٹے خطاب کیا۔ یہ پروگرام ریکارڈ بھی کر لیا گیا۔

(۳) ماہ مارچ کے دوران افغانستان سے واپسی پر قرآن اکیڈمی ملتان میں خصوصی اجتماع میں امیر حلقہ نے دورہ کے تاثرات بیان کئے۔ اس کیلئے اخبار میں اشتہار بھی دیا گیا تھا۔ خطاب قریباً دو گھنٹے جاری رہا۔

(۴) یکم جولائی ۱۹۹۸ء سے حلقہ کی امارت میں تبدیلی ہوئی۔ امیر حلقہ جناب مختار حسین فاروقی کی جگہ جناب سعید اظہر عاصم کو حلقہ کا ناظم مقرر کیا گیا۔

حلقہ سندھ بلوچستان

(۱) ۹/ نومبر ۹۷ء آئی بی اے ہال کراچی میں امیر محترم نے "علامہ اقبال اور قرآن" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ حلقہ نے تمام انتظامات کا اہتمام کیا۔

(۲) ۲۰/ مئی سے شروع ہونے والی ۲۰ روزہ قومی صنعتی نمائش میں تنظیم کا اسٹال لگایا گیا جس میں امیر محترم کی کتب اور کیسٹس کے علاوہ دورۂ ترجمۂ قرآن کی سی ڈی بھی نمائش کیلئے رکھی گئی۔ کمپیوٹر کے ذریعے سی ڈی کے Display کا اہتمام بھی کیا گیا۔

(۳) حلقہ کی سطح پر سات مقامات پر عربی کلاسز کا اجراء ہوا جن میں تنظیمی فکر بھی پیش کیا گیا۔

(۴) تنظیم کو متعارف کروانے کے سلسلے میں ایک ہزار کی تعداد میں "کی چین" تیار کئے گئے جو رفقاء کو فروخت کئے جا رہے ہیں تاکہ وہ انہیں اپنے احباب میں تحفتاً پیش کر سکیں۔

(۷) آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی (A.P.N.S) کے ارکان اور ایسوسی ایشن آف اکاؤنٹنگ ٹیکنیشنز آف پاکستان کے ارکان کو تنظیم کے تعارفی خطوط' منشورِ تنظیم کے ساتھ روانہ کئے گئے۔

دورانِ سال کے چند اہم واقعات

دورۂ افغانستان

طالبان کی اسلامی حکومت کی اسلامی اصلاحات کا جائزہ لینے کیلئے تنظیم اسلامی کے چودہ رکنی وفد نے ۲۲ مارچ تا ۳۰ مارچ افغانستان کا دورہ کیا۔ وفد کی قیادت حلقہ سرحد کے امیر میجر(ر) فتح محمد صاحب نے کی۔ وفد میں حلقہ پنجاب شرقی اور حلقہ سندھ بلوچستان کے امراء کے علاوہ تمام حلقوں کے امراء وناظمین شریک تھے۔ مرکز سے چوہدری رحمت اللہ بٹر اور نائب ناظم نشرواشاعت جناب نعیم اختر عدنان شامل تھے۔ وفد نے چار دن جلال آباد اور پانچ دن کابل میں قیام کیا۔ قیام کے دوران وفد نے افغانستان حکومت کے مختلف عہدیداروں سے ملاقاتیں اور تبادلۂ خیالات کیا' جن میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس' وزیر تعلیم' نائب وزیر' گورنر جلال آباد' چانسلر اور وائس چانسلر جلال آباد یونیورسٹی شامل تھے۔ وفد اپنے ساتھ بڑی تعداد میں امیر محترم کی کتاب خطبات خلافت بزبان فارسی لے گیا تھا جو وہاں اہم لوگوں کو ہدیتاً پیش کی گئی۔ دورۂ سے واپسی پر وفد کے بیشتر ارکان نے افغانستان کے حالات کے بارے میں تحریراً اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ان کے یہ تاثرات ہفت روزہ ندائے خلافت کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے۔

آل پارٹیز کانفرنس

۲۸/جون ۹۸ء کو قرآن آڈیٹوریم میں دستورِ خلافت کی تکمیل اور قانونِ شریعت کی تنفیذ کے حوالے سے آل پارٹیز کانفرنس کا اہتمام کیا گیا' جس میں ملک کی اہم دینی جماعتوں کے سربراہ شریک ہوئے۔ جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد' تنظیم الاخوان کے امیر مولانا محمد اکرم اعوان' جمعیت العلماء پاکستان نیازی گروپ کے صدر مولانا عبدالستار نیازی' مرکزی جمعیت اہلحدیث کے امیر پروفیسر ساجد میر' تحریک اسلامی کے امیر مولانا مختار گل اور تحریک جعفریہ کے قائد مولانا ساجد نقوی نے کانفرنس میں دیئے گئے موضوع پر اظہار خیال

کیا۔ آخر میں امیر محترم نے خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ بنگلہ دیش سے مولانا ثمیر الدین صاحب نے بھی اجلاس میں شرکت کی۔

صدرِ مملکت سے تنظیم اسلامی کے وفد کی ملاقات

نائب امیر کی قیادت میں تنظیم اسلامی پاکستان کے ایک چار رکنی وفد (نائب امیر' ناظم اعلیٰ' ناظم نشر و اشاعت اور ناظم حلقہ پنجاب شمالی) نے صدر مملکت جناب محمد رفیق تارڑ صاحب سے ایوان صدر اسلام آباد میں ملاقات کی۔ آئین میں تضادات دور کرنے کیلئے ہماری پیش کردہ آئینی ترامیم اور اس سلسلہ میں ہماری کوشش کی تفصیلات پر مشتمل ایک یادداشت انہیں پیش کی گئی اور ملاقات کے دوران پڑھ کر سنائی گئی۔ ایک روز قبل امیر محترم کی جانب سے امریکہ سے ایک خط بنام صدرِ مملکت بذریعہ فیکس موصول ہوا تھا۔ یہ خط بھی صدر مملکت کو پڑھ کر سنایا گیا۔ ملاقات خوشگوار رہی۔ ہم نے اپنا موقف پوری طرح واضح کر دیا۔

شعبہ تربیت

مبتدی تربیتی کورس : دورانِ سال کل نو(۹) مبتدی تربیتی کورسز منعقد ہوئے جن میں سے تین لاہور میں' دو حلقہ سرحد میں اور ایک ایک حلقہ آزاد کشمیر' حلقہ پنجاب جنوبی' حلقہ پنجاب شمالی اور حلقہ سندھ بلوچستان میں منعقد ہوئے۔ ان کورسز میں ۱۸۸ رفقاء اور ۶۳ احباب نے شرکت کی۔

ملتزم تربیتی کورس : دوران سال دو تربیتی کورسز ملتزم رفقاء کیلئے منعقد ہوئے۔ ان میں سے ایک مرکز لاہور اور دوسرا حلقہ سندھ بلوچستان میں منعقد ہوا۔ ان دو تربیتی کورسز میں کل بیس رفقاء شریک ہوئے۔

خصوصی ریفریشر کورس : دوران سال دو مرتبہ خصوصی ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا گیا جو دونوں مرتبہ مرکز لاہور میں منعقد ہوئے۔ ان کورسز میں کل ۷۸ ملتزم رفقاء شریک ہوئے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد :	۴۷
شمارہ :	۱۲
شعبان المعظم	۱۴۱۹ھ
دسمبر	۱۹۹۸ء
فی شمارہ	-/۱۰
سالانہ زر تعاون	-/۱۰۰

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر، عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' افریقہ' ایشیا، یورپ' جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران' ترکی' اومان' مسقط' عراق، الجزائر' مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت : 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700۔فون 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون ۔ 6305110

پبلشر ناظم مکتبہ' مرکزی انجمن' طابع ۔ رشید احمد چودھری' مطبع مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

ملک کی داخلی صورتِ حال' حسب سابق' کوئی خوش کن منظر نہیں پیش کر رہی۔ کراچی کے بارے میں حکومت کی بار بار کی یقین دہانی کے باوجود کہ وہاں انتظامی معاملات میں فوج کو دخیل نہیں کیا جائے گا' بالآخر فوجی عدالتیں قائم کر دی گئی ہیں' گویا نیم مارشل لاء نافذ کیا جا چکا ہے۔ گو پاکستان کے آئین میں آرٹیکل ۲۴۵ کے تحت اس نوع کے اقدام کی گنجائش موجود ہے' تاہم نواز شریف حکومت کا اٹھایا ہوا یہ قدم سول حکومت کی ناکامی کے برملا اعتراف کے مترادف ہے۔ فوجی عدالتوں کے قیام کے نتیجے میں ممکن ہے کہ وقتی طور پر امن عامہ کی صورتحال کنٹرول میں آجائے اور قتل و غارت گری اور دہشت گردی کے واقعات میں قابل ذکر کمی واقع ہو جائے تاہم کراچی کے مسائل کے کسی مستقل اور پائیدار حل کی اس سے توقع کرنا حقائق سے نظریں چرانے کے مترادف ہو گا ــــ دوسری جانب سینٹ سے پندرھویں ترمیمی بل کی منظوری کے مسئلے پر مقتدر طبقات کا طرزِ عمل قوم کو دو متحارب گروہوں میں تقسیم کرنے اور محاذ آرائی کی فضا کو جنم دینے کا باعث ہے۔ شریعت بل کے مخالفین میں سے اکثر کا موقف ہے کہ وہ شریعت کے نہیں' حکومت کے پیش کردہ بل کے مخالف ہیں۔ وہ اگر مجوزہ شریعت بل کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ شریعت کی آڑ لے کر غیر معمولی اور غیر محدود اختیارات حاصل کرنا دراصل حکومت وقت کے پیش نظر ہے تو اس سوءِ ظن کو بھی پورے طور پر بلاجواز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ موجودہ بل میں یقیناً ایسے جراثیم موجود ہیں کہ جن کے باعث نہ صرف یہ کہ چھوٹے صوبے بجا طور پر شدید اضطراب محسوس کر رہے ہیں بلکہ نفاذِ شریعت کے ضمن میں اٹھائے جانے والے تمام حکومتی اقدامات عدلیہ سے بھی بالاتر قرار پاتے ہیں۔ گویا حکومت کو نہ صرف یہ کہ شریعت کی من چاہی تعبیر کا کامل اختیار بھی ہو گا بلکہ "جسے پی چاہیں وہی سہاگن" کے مصداق حکومت اپنے تئیں جو "قدم" بھی اٹھائے گی اسی کو "شریعت" کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ معاذ اللہ! اس لئے کہ حکومت کا اٹھایا ہوا ہر قدم اور میاں نواز شریف کا ہر فرمان اس درجے "مستند" ٹھہرے گا کہ کسی عدالت میں اس کو

چیلنج بھی نہیں کیا جاسکے گا۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ حکومت' پندرھویں ترمیم کے مخالفین کے اعتراضات کو رفع کرنے اور موجودہ بل میں شامل متنازعہ دفعات کو بل سے خارج کرنے کی بجائے لاٹھی اور دھونس کے ذریعے بل کو سینٹ سے منظور کرانے کے چکر میں ہے۔ یا تو شریعت سے اربابِ اختیار کی دُوری اور بیزاری کا یہ عالم تھا کہ ہمارے بار بار توجہ دلانے اور "ہمارا مطالبہ ہماری اپیل۔ دستورِ خلافت کی تکمیل" کی رٹ لگانے کے باوجود اس جانب ڈیڑھ سال میں انچ بھر پیش رفت کے لئے کوئی تیار نہ تھا' یا اب شریعت کے لئے ان کی بے قراری کا یہ عالم ہے کہ اس بل کی منظوری کے راستے میں حائل ہر رکاوٹ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے عزائم کا اظہار ہو رہا ہے۔ زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ شریعت کے لئے ہلکان ہونے والے ان حکمرانوں کے دَور میں سود اور سودی نظام کے خاتمے کی جانب نہ صرف یہ کہ تاحال کوئی توجہ نہیں ہے بلکہ سود کو مزید فروغ دینے اور عوام الناس کو سود کے پُر فریب جال میں مزید پھنسانے کی خاطر کروڑپتی اور ڈبل کروڑپتی بننے کا لالچ دیا جا رہا ہے اور فروغِ سود کے ان اشتہاروں کی اشاعت پر لاکھوں نہیں' کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہمارے دین کی رُو سے شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ اور سب سے گھناؤنا جرم سود خوری ہے۔ قرآن و حدیث میں سود کی مذمت اور مخالفت میں جتنے شدید اور جس درجے سخت الفاظ وارد ہوئے ہیں کسی اور گناہ کے لئے نہیں ہوئے۔ لیکن معلوم نہیں دین و شریعت کا کون سا تصور ہمارے حکمرانوں کے دماغ میں سمایا ہوا ہے کہ ایک جانب وہ شریعت کا نفاذ بھی چاہتے ہیں اور دوسری جانب سودی نظام کو مزید مستحکم کرنا اور مختلف انعامی سکیموں کے ذریعے سود کو مزید فروغ دینا بھی شدت کے ساتھ ان کے پیش نظر ہے۔ شاید ہمارے حکمرانوں کی پالیسی ہے کہ ع "باغباں بھی خوش رہے' راضی رہے صیاد بھی!" ـــــ بہرکیف یہ پوری صورت حال اور قول و فعل کا یہ تضاد نہایت تکلیف دہ ہے۔

ہماری سوچی سمجھی اور دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ دستورِ پاکستان میں قرآن و سُنّت کو سپریم لاء قرار دینا اپنی جگہ ایک نہایت خوش آئند اقدام ہے۔ جس شخص یا جس

حکومت کے ہاتھوں بھی یہ کام سرانجام پائے گا وہ مسلمانانِ پاکستان ہی کا نہیں پوری ملت اسلامیہ کا محسن ٹھہرے گا۔ لیکن ضروری ہے کہ شریعت کی تنفیذ کا طریق کار نہ صرف یہ کہ اسلام کی عطا کردہ جمہوری اقدار سے ہم آہنگ ہو بلکہ عصری تقاضوں کا بھی اس میں مناسب حد تک لحاظ رکھا گیا ہو۔ دورِ حاضر میں اس کا واحد محفوظ راستہ یہ ہے کہ دستور میں قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی طے کر دینے کے بعد اس فیصلے کا اختیار کہ کوئی قانون قرآن و سنت سے متصادم ہے یا نہیں، کسی فردِ واحد کو نہیں بلکہ اعلیٰ عدالتوں کو دیا جائے کہ جو دستور کے محافظ (کسٹوڈین) کا درجہ رکھتی ہیں ـــــ ہم وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف اور ان کے توسط سے حکومت کے تمام ذمہ داران سے دست بستہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ شریعت بل کے معاملے میں اپنی انا کی قربانی دے کر اور لچک کا مظاہرہ کر کے شریعت کے ساتھ اپنے خلوص و اخلاص کا ثبوت پیش کریں اور نفاذِ شریعت کے طریق کار کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی پیش کردہ اور مولانا عبدالستار نیازی کی قائم کردہ نفاذ شریعت ورکنگ گروپ کی مرتب کردہ سفارشات کو پیش نظر رکھتے ہوئے موجودہ بل میں مزید ترمیم کر کے اسے متفق علیہ بنانے کی سرتوڑ کوشش کریں، تاکہ پاکستان مثبت طور پر اپنی اس منزل کی طرف گامزن ہو سکے جسے بھلائے رکھنے کی پاداش میں گزشتہ نصف صدی سے دربدر کی ٹھوکریں کھانا اس کا مقدر بنا رہا۔ اللّٰھم وفقا لھذا ○○

ملی وسیاسی معاملات کے ضمن میں
تنظیم اسلامی کی مرکزی شوریٰ کی منظور کردہ قرادادیں

۱۱ نومبر = امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی زیر صدارت تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کے دو روزہ اجلاس منعقدہ قرآن اکیڈمی' لاہور میں ملکی اور بین الاقوامی حالات کے حوالے سے درج ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ اتفاق سے یہ قرارداد منظور کرتی ہے کہ

۱) قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کیلئے قومی اسمبلی سے شریعت بل کی منظوری سے ملک کو دستوری و آئینی سطح پر اسلامی ریاست بنانے کی جانب اہم پیش رفت کا آغاز ہو جائے گا۔ تاہم وزیراعظم میاں محمد نواز شریف شریعت بل کو سینٹ سے منظور کرانے کیلئے اس میں مزید ترمیم کریں اور وہ الفاظ اس پیکج سے نکال دیں کہ جن کے حوالے سے اس بات کا خدشہ اور امکان پیدا ہوتا ہے کہ وفاقی حکومت کی جانب سے نیکی کے حکم اور برائی کی روک تھام کے ضمن میں کئے گئے اقدامات کو عدلیہ سے بھی بالاتر حیثیت حاصل ہو جائے گی' تاکہ سینٹ کے وہ ارکان جو محض اس خدشے کے باعث شریعت بل کی مخالفت کر رہے ہیں' ان کی حمایت بھی حاصل کی جاسکے!

۲) مرکزی مجلس شوریٰ سینٹ کے ارکان سے بھی پرُزور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جماعتی سیاست اور گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر قرآن و سنت کی بالادستی کے حامل پندرہویں ترمیمی بل کو منظور کر کے ملک کو اسلامی ریاست بنانے کے عمل میں اپنا کردار ادا کریں' تاکہ پھر اس حوالے سے حکومت پر اتمامِ حجت کیا جاسکے۔

۳) تنظیم اسلامی کی مرکزی شوریٰ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ایٹمی پروگرام پر ہر قسم کے عالمی دباؤ اور امداد کے لالچ کو نظرانداز کر کے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے سے دوٹوک انداز میں انکار کر دے۔ اس لئے کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام عطیۂ خداوندی ہے' چنانچہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنا دفاعی قوت کی بھرپور تیاری کے حکم خداوندی کی صریح خلاف ورزی ہوگی۔

۴) تنظیم اسلامی کی مرکزی شوریٰ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سودی معیشت کے خاتمے کیلئے ٹھوس اقدامات کریں اور اس کے اولین قدم کے طور پر وزیراعظم سود کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف شریعت ایپلیٹ بینچ میں دائر کردہ اپیل فی الفور واپس لیں۔ مزید برآں غیر سودی معیشت کے قیام کیلئے وفاقی وزیر برائے مذہبی امور راجہ ظفر الحق کی سربراہی میں قائم کردہ کمیشن کی سفارشات کو منظر عام پر لا کر فی الفور نافذ کیا جائے تاکہ ملک میں رائج استحصالی نظام کے خاتمہ کا آغاز ہو سکے۔

اندرونِ عرب انقلاب کی تکمیل

فتح خیبر اور فتح مکّہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن)

نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے وقت وہاں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ حضور ؐ نے مدینہ تشریف لاتے ہی انہیں ایک معاہدہ میں جکڑ لیا تھا[1]۔ اس معاہدے کی وجہ سے یہ قبیلے کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے' لیکن وہ پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔ مدینہ میں فروغِ اسلام اور انصار کے دونوں قبیلوں اور مہاجرین کو باہم شیر و شکر دیکھ دیکھ کر صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنا شروع ہوا۔ پھر شعبان ۲ھ میں تحویل قبلہ کے واقعہ نے ان یہودیوں کو سخت برہم کر دیا اور ان کی ناراضگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ چنانچہ اب وہ کھلم کھلا اسلام پر زبانِ طعن دراز کرنے اور

---

(۱) "ابن ہشام" نے یہ پورا معاہدہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے

۱) خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا' اب بھی قائم رہے گا۔ (۲) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی اور ان کے مذہبی معاملات سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ (۳) یہود اور مسلمان دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔ (۴) یہود یا مسلمانوں کو کسی بیرونی فریق سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔ (۵) کوئی فریق قریش کو امان نہیں دے گا۔ (۶) مدینہ پر کوئی حملہ ہو گا تو دونوں فریق ایک دوسرے کے شریک ہو کر جنگ کریں گے۔ (۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی اس صلح میں شریک ہو گا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہو گی۔ (مرتب)

انصار کو دین اسلام سے بدگمان اور برگشتہ کرنے کی مہم زور و شور سے چلانے لگے۔ اس سے قبل یہ کام وہ دھیمی رفتار سے کرتے رہتے تھے۔

بنو قینقاع کا معاملہ

غزوۂ بدر کے متصلاً بعد شوال ۲ھ میں بنو قینقاع کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ یہ پیشے کے اعتبار سے زرگر تھے اور ان کے پاس جنگی اسلحہ بہت تھا۔ دوسرے یہودی قبیلوں کے مقابلہ میں یہ جری، بہادر اور شجاع بھی تھے۔ اسلام کی ترقی کو دیکھ کر وہ زیادہ دیر تک ضبط نہیں کر سکے۔ غزوۂ بدر کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اقدام کیا اور اعلانِ جنگ کی جرأت کی۔ ہوا یہ کہ ایک انصاری کی نقاب پوش بیوی بنو قینقاع کے ایک یہودی کی دوکان میں آئیں تو یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بے تاب ہو گیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا۔ یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو آپ بنفس نفیس ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "اللہ سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ بدر والوں کی طرح تم بھی عذاب میں مبتلا کر دیے جاؤ"۔ جواب میں یہودیوں نے کہا کہ "ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی کس شے کا نام ہے۔ اور ایسا ہی ہے تو ہم اعلانِ جنگ کرتے ہیں، دنیا دیکھ لے گی کہ بہادر کون ہے!"۔ اس طرح ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلانِ جنگ ہو گیا۔ مجبور ہو کر نبی اکرم ﷺ نے ان پر چڑھائی کی۔ وہ قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا۔ بالآخر وہ اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ بھی کریں گے انہیں قبول ہو گا۔ حضورؐ نے نرمی اور رافت سے کام لیا اور فیصلہ فرمادیا کہ وہ اونٹوں پر جتنا سامان لے جا سکتے ہیں لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں، وہ اب مدینہ میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ مال و اسباب لے کر جلاوطن ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں جا کر آباد ہو گئے جو مدینہ سے دو سو میل شمال کی طرف یہودیوں کا ایک بہت مضبوط گڑھ تھا۔ یہ بڑا سرسبز اور زرخیز علاقہ تھا۔

بنو نضیر کا معاملہ

غزوۂ احد کے بعد اسی نوع کا معاملہ ربیع الاول ۴ھ میں یہود کے دوسرے قبیلے بنو نضیر کے ساتھ ہوگیا۔ یہ قبیلہ عرب کے ایک مضبوط قبیلہ "طے" کا حلیف تھا۔ قبیلہ طے کے اشرف نے اس یہودی قبیلہ کے سردار ابو رافع کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ ابو رافع کا لقب تاجر الحجاز تھا، کیونکہ وہ بڑا مالدار تھا۔ کعب اسی اشرف کا بیٹا اور ابو رافع کا نواسہ تھا۔ اس دو طرفہ رشتہ داری کی وجہ سے اس کا یہود اور عرب سے برابر کا تعلق تھا۔ یہ بڑا قادر الکلام شاعر تھا، جس کی وجہ سے اس کا اثر گہرا تھا۔ کعب بن اشرف کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں قریش کے سرداروں کے قتل ہونے کا اسے نہایت صدمہ تھا۔ چنانچہ یہ مکّہ گیا اور مقتولین بدر کے پُر درد مرثیے پڑھے جن میں انتقام کی ترغیب تھی۔ وہ یہ مرثیے بڑے سوز کے ساتھ پڑھتا، خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا۔ الغرض قریش کو مدینہ پر انتقامی طور پر چڑھائی کرنے کی ترغیب میں اس نے نہایت مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ پھر جب وہ مدینہ واپس آیا تو نبی اکرم ﷺ کی شان میں ہجو کے اشعار کہنے لگا اور یہودیوں کو اسلام کے خلاف بھڑکانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی دولت مندی کے بل پر منافقین کو اپنا ہم خیال بنانے لگا اور ضعیف الایمان لوگوں پر اثر انداز ہونے لگا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سازش تیار کی کہ چپکے سے نبی اکرم ﷺ کو قتل کرادے۔ چنانچہ اس نے ایک روز آپؐ کو دعوت میں بلایا اور اپنے چند لوگوں کو مقرر کر دیا کہ وہ یک بارگی حملہ کر کے حضورؐ کو شہید کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنے نبی ﷺ کو اس سازش سے مطلع فرمادیا۔ اس کی فتنہ انگیزی کو دیکھ کر حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ نے بنو نضیر میں غیظ و غضب کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔

مزید برآں وادی نخلہ میں قبیلہ بنو عامر کے جو دو اشخاص قتل ہوئے تھے ان کا خون بہا ابھی تک واجب الادا تھا۔ اس کا ایک حصہ معاہدے کی رو سے یہود کے قبیلے بنی نضیر پر باقی تھا۔ اس کے مطالبہ کے لئے نبی اکرم ﷺ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ انہوں نے تھوڑی سی ردو قدح کے بعد بظاہر حضور ﷺ کی بات تسلیم کرلی۔ لیکن انہوں نے

در پردہ ایک شخص کو مقرر کر رکھا تھا کہ وہ چپکے سے حضورؐ پر بالاخانہ سے پتھر گرا دے۔ اس لئے کہ حضورؐ بالاخانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے گفتگو فرما رہے تھے۔ حضورؐ کو اس سازش کا علم ہو گیا اور آپؐ فوراً مدینہ واپس چلے آئے۔

ادھر قریش کی جانب سے بنو نضیر کے پاس پیغام پر پیغام آ رہے تھے کہ تم محمد (ﷺ) کو قتل کر دو، ورنہ ہمیں جب بھی موقع ملا، جو ضرور مل کر رہے گا، تو ہم تمہارے پورے قبیلہ کو تہ تیغ کر دیں گے۔ یہود خود بھی نبی اکرم ﷺ کی دعوت توحید کا فروغ دیکھ کر انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے ایک سازش کے تحت نبی اکرم ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپؐ اپنے تیس اصحاب کو ساتھ لے کر آئیں، ہم بھی اپنے علماء و احبار کو جمع کر رکھیں گے۔ آپؐ کی دعوت اور آپؐ پر نازل شدہ کلامِ الٰہی سن کر ہمارے علماء تصدیق کر دیں گے تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ اس پر آپ ﷺ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک نیا معاہدہ لکھ کر نہ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ لیکن بنو نضیر اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔

اسی دوران رسول اللہ ﷺ بنو قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کے لئے فرمائش کی۔ انہوں نے تعمیل کر دی۔ اب بنو نضیر کے سامنے گویا ایک نظیر موجود تھی، لیکن اس کے باوجود وہ کسی طرح دوبارہ معاہدہ کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر کار انہوں نے پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر آئیں، ہم بھی اپنے تین عالم لے کر آتے ہیں اور کسی درمیانی جگہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ علماء اگر آپؐ پر ایمان لے آئے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ رسول اللہؐ اس کے لئے تیار ہو گئے، لیکن راستے ہی میں آپؐ کو باوثوق ذریعہ سے اطلاع مل گئی کہ بنو نضیر نے خفیہ طور پر انتظام کر رکھا ہے کہ آپؐ جب مقررہ مقام پر پہنچیں تو یکبارگی اور اچانک حملہ کر کے آپؐ کو شہید کر دیں۔ چنانچہ یہ اطلاع ملنے کے بعد حضور ﷺ راستہ ہی سے واپس چلے گئے۔ آپؐ نے پھر ان کو پیغام بھیجا کہ یا تو تجدید معاہدہ کر لو یا اپنے سرکردہ علماء کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ لیکن بنو نضیر نے صاف انکار کر دیا۔

بنو نضیر کی اس سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ دو مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے جہاں اجناس، پانی اور اسلحہ کا وافر ذخیرہ تھا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ عبداللہ بن اُبَی نے

انہیں کہلا بھیجا تھا کہ ہم (یعنی منافقین) اور بنو قریظہ تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے' لہٰذا تم اطاعت نہ کرنا۔ اس صورت حال کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے ان کو زیادہ مہلت دینی مناسب نہیں سمجھی اور ان کے قلعوں پر چڑھائی کر دی۔ پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ بنو نضیر اس انتظار میں رہے کہ عبداللہ بن ابی اور بنو قریظہ اپنا وعدہ وفا کریں گے' لیکن دونوں دم سادھے تماشا دیکھتے رہے۔ بالآخر بنو قریظہ نے یہ پیش کش کی کہ ہمارے ساتھ بھی بنو قینقاع والا معاملہ کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ کی رافت و رحمت نے یہ پیش کش منظور فرمالی۔ بنو نضیر اپنی گڑھیوں سے اس شان سے نکلے کہ جشن کا گمان ہوتا تھا۔ عورتیں دف بجاتی اور گاتی جاتی تھیں۔ الغرض ان کے قبیلہ کے اکثر لوگ بھی خیبر جا کر آباد ہو گئے۔ خیبر والوں نے ان کے دو معزز سرداروں کا اتنا احترام کیا کہ انہیں خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ درحقیقت غزوۂ خیبر کا دیباچہ ہے۔

بنو قریظہ کا معاملہ

اب مدینہ میں یہود کا صرف ایک قبیلہ بنو قریظہ باقی رہ گیا تھا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر' جو ذوالقعدہ ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا' اس قبیلہ نے غداری کی۔ بنو نضیر کے سرداروں نے خیبر میں بیٹھ کر قریش اور مدینہ کے اطراف کے غیر مسلم قبائل سے سازباز کی اور ان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا جس کے نتیجہ میں بارہ ہزار کا لشکرِ جرار تین اطراف سے مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر چڑھ دوڑا۔ اس سے بڑا لشکر عرب کی تاریخ میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی ترتیب پایا ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے سے جبلِ اُحد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھدوا کر مدافعانہ جنگ کے انتظامات فرمالئے تھے۔ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ صرف انہی اطراف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ کفار و مشرکین اس طریق دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں شدید جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرہ پر مجبور ہونا پڑا۔ اب ان کے لئے ایک ہی چارۂ کار باقی رہ گیا تھا کہ وہ بنو قریظہ کو مدینہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ پر آمادہ کر لیں۔ چنانچہ بنو نضیر کے سرداروں نے بنو قریظہ کو نقض عہد پر آمادہ کر لیا اور وہ پشت سے حملہ کی

تیاریاں کرنے لگے۔

نبی اکرم ﷺ اس صورت حال سے بے خبر نہیں تھے۔ ادھر منافقین کا گروہ بھی مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لئے یہ افواہیں پھیلا رہا تھا کہ بنو قریظہ کی طرف سے حملہ ہوا ہی چاہتا ہے جس کی زد میں پہلے ہماری عورتیں اور بچے آئیں گے جو شہر میں بنو قریظہ کی گڑھیوں کے قریب ہی پناہ گزین تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے دو انصاری صحابہ رضی اللہ عنہما کو بنو قریظہ کے عزائم معلوم کرنے اور ان کو سمجھانے کے لئے بھیجا۔ بنو قریظہ نے ان سے صاف کہہ دیا کہ "لا عقد بیننا و بین محمد" یعنی ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین جو معاہدہ تھا وہ ختم ہوا۔ مزید یہ کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی شان میں بڑے گستاخانہ کلمات کہے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ قبیلہ غطفان کے ایک صاحب نعیم بن مسعود جنہوں نے اسلام قبول کر رکھا تھا لیکن اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا اور وہ غطفان کی طرف سے ان کے لشکر میں شریک تھے' انہوں نے ایک ایسی تدبیر کی کہ بنو قریظہ اور قریش کے درمیان ایک نوع کی بدگمانی پیدا ہو گئی' جس کی وجہ سے بنو قریظہ غداری کے لئے اپنی تمام تیاریوں کے باوجود تذبذب میں رہے اور کوئی اقدام نہ کر سکے۔ اسی دوران ایک رات اللہ کی مدد زوردار آندھی کی صورت میں نازل ہوئی جس نے قریش اور ان کے حلیفوں کے خیموں اور سازوسامان کو تہس نہس کر ڈالا۔ نتیجتاً صبح ہوتے ہی تمام لشکر منتشر ہو گیا اور تمام قبائل بے نیل مرام واپس چلے گئے۔

لشکروں کی واپسی کے بعد نبی اکرم ﷺ ابھی ہتھیار کھول ہی رہے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ ہتھیار اتار رہے ہیں جبکہ ہم نے ابھی تک ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ آپ فوراً تشریف لے جا کر بنو قریظہ کے معاملے کو نمٹایئے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ بنو قریظہ کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اُسی وقت حکم دیا کہ کوئی بھی مسلمان ہتھیار نہ کھولے' سب کے سب جلد از جلد بنو قریظہ کی بستی میں پہنچیں اور کوئی بھی عصر کی نماز وہاں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

بنو قریظہ کا انجام

بنو قریظہ کے قلعے بڑے مضبوط تھے' جن میں وہ محصور ہو گئے۔ قریباً ایک ماہ محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر تنگ آ کر انہوں نے از خود اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرم ﷺ کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ ان کے معاملے میں قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم مقرر کیا جائے' وہ جو بھی فیصلہ کریں گے تسلیم کر لیا جائے گا۔ قبیلہ اوس ان کا حلیف رہا تھا اور ان کے مابین مدتوں سے خوشگوار تعلقات چلے آ رہے تھے' لہٰذا ان کو توقع تھی کہ سعد بن معاذ ان کا لحاظ کریں گے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوۂ احزاب میں ایک تیر لگنے کی وجہ سے شدید زخمی تھے اور حضور ﷺ نے ان کے علاج معالجہ کے لئے مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا اور ان کے زخم کو خود اپنے دست مبارک سے داغا تھا' انہیں ایک ڈولی میں بنو قریظہ کی بستی میں لایا گیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے تورات کی رُو سے یہود کی شریعت کے عین مطابق یہ فیصلہ کر دیا کہ بنو قریظہ کے لڑنے کے قابل تمام مرد قتل کئے جائیں' عورتوں' بچوں اور دیگر مَردوں کو غلام بنایا جائے اور ان کے مال و اسباب کو مال غنیمت قرار دیا جائے[1]۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق ان کے کئی سو جوان قتل کئے گئے اور عورتوں بچوں اور دیگر عمر رسیدہ مَردوں کو غلام بنا لیا گیا' جبکہ ان کا مال و اسباب مال غنیمت قرار دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے آسمانی فیصلہ کیا۔ یہ تورات کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ بنو قریظہ اگر رسول اللہ ﷺ کو حکم تسلیم کر لیتے اور اپنا معاملہ آپؐ کے ہاتھ میں دے دیتے تو یقیناً آپؐ اپنی رأفت و رحمت کی وجہ سے وہی فیصلہ فرماتے جو بنو قینقاع اور

---

(۱) تورات کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے۔

''جب کسی شہر پر حملہ کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے۔ لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں' سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے' عورتیں' جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں' سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گے''۔ (مرتب)

بنو نضیر کے حق میں فرمایا تھا' لیکن مشیتِ الٰہی یہی تھی' لہٰذا ان کی مت ماری گئی اور انہوں نے حضور ﷺ جیسے رؤف و رحیم رسول پر عدم اعتماد کیا۔ چنانچہ حُیَیّ بن اخطب جو ان تمام فتنوں کا باعث تھا' کے جو آخری الفاظ کتب سیرت مطہرہ میں ملتے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے کہ "لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ایک حکم الٰہی تھا جو لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک سزا تھی جو خدا نے بنی اسرائیل پر لکھ دی تھی"۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ پیش آیا ہے' جو بنو قریظہ کے ساتھ ہوا۔

فتح خیبر

خیبر پہلے سے ہی عرب میں یہود کا مضبوط ترین گڑھ تھا۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے بہت سے لوگ بھی وہیں جا مقیم ہوئے۔ اس طرح یہود کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر قریش اور دوسرے عرب قبائل کا مدینہ پر اتنی بڑی تعداد میں لشکر کشی کرنے میں خیبر کے یہودی سرداروں کا سب سے زیادہ عمل دخل تھا۔ بارہ ہزار کے لشکر میں کم و بیش دو ہزار یہودی بھی شامل تھے۔ پھر بنو قریظہ کو نقض عہد اور پشت سے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے لئے آمادہ کرنے میں بھی انہی یہودی سرداروں کی کوششوں کا فیصلہ کن دخل تھا۔ الغرض عرب کے قبائل خصوصاً قریش کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے میں خیبر کے سردارانِ یہود ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔

ذوالقعدہ ۶ھ میں جب قریش سے حدیبیہ کے مقام پر دس سال کے لئے صلح ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو ۶ھ کے اواخر میں آپؐ نے جزیرہ نمائے عرب میں یہود کی اس طاقت کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ فرمایا جو خیبر کے مقام پر مجتمع ہو گئی تھی۔ قبیلہ غطفان جس کا شمار بھی عرب کے مضبوط قبائل میں ہوتا تھا' کی آبادی خیبر سے متصل واقع تھی اور یہ کافی عرصہ سے خیبر کے یہود کے حلیف تھے۔ خیبر کے رئیس ابو رافع سلام نے جو بنو نضیر سے تعلق رکھتا تھا' لیکن بہت بڑا تاجر اور صاحب ثروت ہونے کے باعث خیبر کی سرداری پر فائز تھا' ۶ھ میں خود جا جا کر قبیلہ غطفان اور آس پاس

کے قبائل کو متحد ہو کر اسلام کے خلاف اقدام کے لئے تیار کرلیا تھا اور ایک عظیم لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرلی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ تمام خبریں مل رہی تھیں۔ رمضان ٦ھ میں ابو رافع سلام ایک خزرجی انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے بعد خیبر کا اُسیر نامی ایک یہودی مسند سرداری پر فائز ہوا۔ اس نے بھی ابو رافع سلام کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے پوری تیاری کرلی۔ پھر مدینہ کے منافقین بھی یہودِ خیبر کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے تھے اور ان کی ہمت افزائی کرتے تھے کہ مسلمان تمہاری فوجوں کے آگے نہیں ٹھہر سکیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے کوشش فرمائی کہ یہود خیبر سے کوئی معاہدہ ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ نے صلح حدیبیہ سے پہلے اور بعد میں کئی سفارتی وفود خیبر کے یہود کے پاس بھیجے لیکن وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار دستے مدینہ کے باہر متفرق چھوٹی چھوٹی آبادیوں پر تاخت کرتے اور غارت گری کے بعد بھاگ جاتے۔ بالآخر نبی اکرم ﷺ نے ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے مقصد کے پیش نظر ذوالحجہ ٦ھ میں مسلمانوں کے ایک لشکر کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ لیکن خیبر کا معرکہ ۷ھ کے اوائل میں پیش آیا' کیونکہ اس غزوہ نے کافی طول کھینچا۔ خیبر میں یہود کی بڑی قوت مجتمع تھی' جہاں یکے بعد دیگرے ان کے بڑے مضبوط قلعے تھے۔ چنانچہ ہر قلعہ پر زبردست جنگ ہوئی۔ آخری مضبوط ترین قلعہ (قموص) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ یہود کے بڑے بڑے سردار اِن معرکوں میں مارے جا چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کامل شکست تسلیم کرلی۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب سے یہود کی عسکری قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

فتح کے بعد مفتوحہ علاقہ پر قبضہ کرلیا گیا' لیکن یہود کی درخواست پر زمین ان کے قبضہ میں اس شرط کے ساتھ رہنے دی گئی کہ وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے۔ جب بٹائی کا وقت آتا نبی اکرم ﷺ اپنے کسی صحابیؓ کو بھیجتے' جو آکر غلہ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرکے یہود سے کہا کرتے تھے کہ انتخاب کا حق تمہیں حاصل ہے' جو حصہ چاہو تم لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ "زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر

قائم ہیں"۔

غزوۂ خیبر پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے۔ گویا صلح حدیبیہ اور یہود کا رعیت کی حیثیت قبول کرنا اس بات کی علامات میں شامل ہیں کہ اسلامی طرز حکومت کی بنیاد بھی قائم ہو گئی اور اس کا عملی ظہور بھی شروع ہو گیا ـــــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دَور خلافت کے آغاز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ مرض وفات میں وصیت فرما گئے تھے کہ یہود جزیرہ نمائے عرب میں رہنے نہ پائیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مدعیانِ نبوت' مانعینِ زکوٰۃ اور فتنۂ ارتداد سے کامل طور پر نمٹنے میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے اس معاملہ کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ اگرچہ خلافتِ صدیقی کے دَور ہی میں یہ تمام فتنے ختم ہو چکے تھے' لیکن ساتھ ہی توحید کی اس انقلابی دعوت کی توسیع کے عمل کا بیرون ملک عرب آغاز ہو چکا تھا اور قیصر و کسریٰ سے باقاعدہ لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جزیرہ نمائے عرب سے یہود کے مکمل اخراج کا معاملہ دَورِ خلافتِ صدیقیؓ کے بجائے دَورِ خلافتِ فاروقیؓ کے آغاز میں شروع ہوا اور ایک قلیل عرصہ میں تمام یہود جزیرہ نمائے عرب سے جلاوطن کر دیئے گئے۔ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوئی اور ان کو کامل آزادی دی گئی کہ وہ اپنا جملہ منقولہ ساز و سامان ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب یہود جیسی سازشی قوم کے وجود سے پاک ہو گیا۔

صلح حدیبیہ کی بدولت قریباً دو سال تک قریش اور اہل ایمان کے مابین امن رہا۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے شہروں میں آتے جاتے رہے اور ان کے مابین روابط قائم ہوئے۔ کفار و مشرکین اہل ایمان کی پاکیزہ سیرت و کردار سے متاثر ہوتے رہے۔ اس دوران اسلام کو نہایت فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما جیسے مردانِ شجاعت حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

صلح حدیبیہ کا خاتمہ اور فتح مکّہ

بنو خزاعہ پر بنو بکر کی تاخت

صلح حدیبیہ کے موقع پر ہی بنو خزاعہ نبی اکرم ﷺ کے حلیف بن گئے تھے اور ان کے

حریف بنو بکر قریش کے حلیف ہو گئے تھے۔ ان دونوں میں مدت سے عداوت چلی آ رہی تھی اور ان کے مابین لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں۔ صلح حدیبیہ کے باعث قریش اور مسلمانوں کے درمیان امن قائم ہو گیا تو بنو بکر نے سوچا کہ اب بنو خزاعہ سے انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے صلح حدیبیہ کے قریباً دو سال بعد بنو خزاعہ پر رات کی تاریکی میں اچانک حملہ کر دیا۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ قریش کے چند بڑے بڑے سرداروں نے بھی بھیس بدل کر بنو بکر کا ساتھ دیا اور اس طرح اس حملے کے نتیجہ میں بنو خزاعہ کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی لیکن بنو بکر کے رئیس نوفل کے اکسانے پر وہاں بھی انہیں نہیں چھوڑا گیا اور عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

صلح حدیبیہ کا خاتمہ

نبی اکرم ﷺ مسجد نبویؐ میں رونق افروز تھے کہ بنو خزاعہ کے چالیس افراد فریاد کرتے اور دہائی دیتے ہوئے وہاں پہنچے کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے' اب صلح حدیبیہ کی رُو سے اے محمد (ﷺ) آپ اس کے پابند ہیں کہ ہمارا بدلہ بنو بکر اور قریش سے لیں[1]۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ واقعات سن کر سخت رنج ہوا۔ تاہم حضورؐ نے قریش پر حجت قائم کرنے کے لئے ان کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرائط پیش کیں۔ پہلی یہ کہ مقتولوں کا خون بہا ادا کر دو۔ دوسری یہ کہ اگر تم اس کے لئے تیار نہیں ہو تو بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ

---

(۱) طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ اس وفد کے قائد کا نام عمرو بن سالم تھا اور اس نے ان الفاظ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں فریاد پیش کی تھی۔

لاھم انی شاھد محمدا	اے اللہ! میں محمد (ﷺ) کو
حلف ابینا وابیہ الا تلدا	وہ وعدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور
فانصر رسولَ اللّٰہ نصرا عتدا	ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے۔ اے
وادع عباد اللّٰہ یاتوا مددا	اللہ کے رسولؐ ہماری اعانت کیجئے اور اللہ

کے بندوں کو پکاریئے' سب مدد کے لئے حاضر ہوں گے۔ (مرتب)

تاکہ ہم بنو خزاعہ کے ساتھ مل کر بنو بکر سے بدلہ لے لیں۔ تیسری یہ کہ اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو اعلان کردو کہ صلح حدیبیہ ختم ہوگئی۔

قریش کے جو مشتعل مزاج اور جنگ پسند لوگ (Hawks) تھے' انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے قاصد کی زبانی آپؐ کی شرائط سنتے ہی فوراً کہا کہ ہمیں تو صرف تیسری شرط منظور ہے۔ بس آج سے صلح حدیبیہ ختم!! حضورؐ کے ایلچی یہ جواب سن کر مدینہ واپس چلے گئے۔

تجدیدِ صلح کے لئے ابوسفیان کی کوششیں

قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کے مدبّر اور صلح پسند لوگوں (Doves) کو غلطی کا احساس ہوا۔ ان کو خوب اندازہ تھا کہ اب محمد ﷺ کی طاقت کتنی ہے اور قریش کا حال کیا ہے! ان کی پختہ رائے یہ تھی کہ قریش کسی صورت میں بھی اب اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ کر سکیں۔ اُس وقت ابوسفیان کو قریش کے سردار کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ بہت حقیقت پسند انسان تھے' جذباتی اور مشتعل مزاج نہیں تھے' بلکہ ایک ایسے مدبر انسان تھے جو حقیقی صورت حال کا اندازہ کر کے اس کے مالہٗ وماعلیہ کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ چند جوشیلے لوگوں سے جذبات میں آکر بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے' اگر ہم نے صلح حدیبیہ کی تجدید نہ کرائی تو پھر قریش کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ چنانچہ وہ خود چل کر تجدید صلح کی غرض سے مدینہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں تجدید صلح کی درخواست کی' لیکن بارگاہ رسالت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اب ان کو کوئی ایسی سفارش درکار تھی جو تجدید صلح کی کوشش میں ان کی معاون ہو۔ انہوں نے پہلے حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن دونوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک فرمایا : بھلا میں تم لوگوں کے لئے رسول اللہ ﷺ سے سفارش کروں گا؟ خدا کی قسم اگر مجھے لکڑی کے ٹکڑے کے سوا کچھ دستیاب نہ ہو تو میں اسی کے ذریعے تم لوگوں سے جہاد کروں گا۔ پھر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے' وہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی

عمر اُس وقت پانچ برس کی تھی۔ ابو سفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے حضرت فاطمہؓ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بچہ اپنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا' اور اس بچہ کے یہ کہہ دینے سے نہ معلوم کتنی جانیں بچ جائیں گی۔ جناب سیدہؓ نے فرمایا: بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل؟

بالآخر ابو سفیان ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنی صاحبزادی حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پہنچے۔ حضرت ام حبیبہؓ سابقون الاولون میں سے تھیں اور مہاجرینِ حبشہ میں سے تھیں' جہاں وہؓ اپنے شوہر کے ساتھ گئی تھیں جو ایمان لا چکے تھے۔ وہ شراب کے نہایت رسیا تھے۔ حبشہ جا کر وہ مرتد ہو گئے اور عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ لہٰذا اُم حبیبہؓ ان کے عقد نکاح سے آزاد ہو گئیں۔ نبی اکرم ﷺ کو جب یہ اطلاع ملی تو آپ نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور نجاشیؒ نے حضورؐ کے وکیل کی حیثیت سے نکاح پڑھایا تھا اور ان کا مہر ادا کیا تھا۔ بعدہ وہ ام المومنینؓ کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لے آئی تھیں۔ اب ابو سفیان کی صاحبزادی حضرت ام حبیبہؓ رسول اللہ ﷺ کے حرم میں تھیں۔ ابو سفیان ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کے پاس پہنچے تا کہ بیٹی سے سفارش کرائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ جب وہ ان کے حجرے میں داخل ہوئے تو وہاں نبی اکرم ﷺ کا بستر بچھا ہوا تھا' وہ اس پر بیٹھنے لگے تو حضرت ام حبیبہؓ نے فرمایا کہ ابا جان ذرا ٹھہریئے۔ پھر بستر تہہ کر کے کہا کہ اب تشریف رکھیے۔ ابو سفیان نے فوراً سوال کیا کہ بیٹی! کیا تم نے اس بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا یا مجھے اس بستر کے لائق نہیں سمجھا؟۔ انہوں نے جواب دیا۔ ابا جان آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں' یہ بستر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا ہے اور آپ مشرک ہیں' نجس ہیں' آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے ـــــــ اس بات سے ابو سفیان جتنے خفیف اور خجل ہوئے ہوں گے اور انہوں نے کتنی سبکی محسوس کی ہوگی اس کا ہر شخص اپنے طور پر کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکتا ہے۔ اب انہیں سفارش کا حوصلہ کہاں ہو سکتا تھا' چنانچہ مزید کچھ کہے سنے بغیر مایوس ہو کر واپس ہوئے۔

اب دوبارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور سخت گھبراہٹ اور مایوسی و ناامیدی کی حالت میں کہا: ابو الحسن! مجھے کوئی راستہ بتاؤ۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں نبی اکرم ﷺ

سے تو کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا' لیکن میں تمہیں یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ مسجد نبویؐ میں جا کر یہ اعلان کر دو کہ میں نے قریش کے سردار کی حیثیت سے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ چنانچہ ابو سفیان نے حضرت علیؓ کے ایماء پر ایسا ہی کیا اور مسجد نبویؐ میں جا کر تجدید صلح کا یک طرفہ اعلان کر دیا کہ میں قریش کا سردار ابو سفیان صلح حدیبیہ کی تجدید کرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا' لیکن یہ اعلان کر کے وہ فوراً اپنے اونٹ پر سوار ہو کر واپس مکہ روانہ ہو گئے۔

مکہ پہنچنے پر لوگوں نے پوچھا کہ کیا کر کے آئے ہو؟ انہوں نے تفصیل بتائی۔ لوگوں نے کہا : تو کیا محمد (ﷺ) نے اسے نافذ قرار دیا؟ ابو سفیان نے کہا : نہیں۔ لوگوں نے کہا : ہم نہ اسے تجدید صلح سمجھ سکتے ہیں کہ آرام سے سوئیں' نہ جنگ سمجھ سکتے ہیں کہ تیاری کریں۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

نبی اکرمؐ کی طرف سے غزوے کی تیاری اور اخفاء کی کوشش

اُدھر مکہ والے شش و پنج میں تھے کہ ابو سفیان جو کچھ کر کے آئے ہیں اسے کیا سمجھا جائے! اِدھر نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں تیاریاں کرنے کا حکم دے دیا اور اپنے حلیف قبائل کے پاس قاصد بھیج دیئے کہ تیار ہو کر مدینہ آ جائیں۔ لیکن یہ احتیاط کی گئی کہ یہ اعلان نہیں فرمایا کہ مکہ کا قصد ہے۔ آپؐ نے یہ بات بالکل مخفی رکھی کہ کدھر جانا ہے! لیکن ایک بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ سے اُس وقت ایک خطا ہو گئی ——— ان کے اہل و عیال اُس وقت تک مکہ میں تھے۔ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ حضور ﷺ کا ارادہ مکہ پر چڑھائی کا ہے۔ انہیں خوف لاحق ہوا کہ اب مکہ میں جو خون ریزی ہو گی تو وہاں میرے اہل و عیال کو بچانے والا کوئی نہیں ہے' اللہ جانے ان کا کیا حال ہو گا۔ اس لئے کہ قریش سب سے پہلے تو مکہ میں موجود مسلمانوں یا ہجرت کرنے والوں کے اہل و عیال ہی کو ختم کریں گے۔ ان اندیشوں کے پیش نظر انہوں نے قریش پر احسان دھرنے کیلئے مخفی طور پر ایک خط لکھا' جس میں یہ خبر تھی کہ رسول اللہ ﷺ مکہ پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور آپؐ جلد ہی مکہ کی طرف کوچ کرنے والے ہیں۔ انہوں نے یہ

خط ایک عورت کے حوالے کیا کہ وہ خفیہ طور پر مکّہ جا کر یہ خط سردارانِ قریش کو پہنچا دے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعے اس کی خبر دے دی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت علی اور ان کے ساتھ تین صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ فلاں مقام پر تمہیں ایک ہودج نشین عورت ملے گی، جس کے پاس ایک رقعہ ہے، اسے لے کر آ جاؤ۔ یہ حضرات گھوڑوں پر سوار ہو کر تیزی سے وہاں پہنچے۔ وہ عورت سمجھ گئی اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تمہارے پاس کوئی خط نہ ہو، اگر تم نہیں دو گی تو ہم تمہیں برہنہ کر کے تلاشی لیں گے۔ یہ دھمکی سن کر اس نے بالوں کی چٹیا سے خط نکال کر پیش کر دیا۔ یہ خط لے کر حضرت علی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خط سن کر تمام صحابہؓ کو حضرت حاطبؓ کی جانب سے افشائے راز پر حیرت بھی ہوئی، رنج بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلال میں آ کر بیتاب ہو گئے اور انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں، اس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : اے عمرؓ! جانتے نہیں ہو کہ یہ بدری ہیں اور اللہ تعالیٰ اہل بدر کو مخاطب کر کے فرما چکا ہے کہ تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان کی اگلی پچھلی خطائیں معاف کر چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حاطبؓ سے باز پرس فرمائی تو انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ! مجھ سے اس اندیشہ کے سبب سے یہ خطا ہو گئی ہے، جس پر میں نادم بھی ہوں اور توبہ بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ ان کو معاف کر دیا گیا۔

مکّہ کی طرف کوچ

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر حضورؐ کے ہمرکاب تھا۔ یہ رمضان ۸ھ ہے۔ واقعہ ہجرت کو دس برس اور مسلح تصادم (Armed Conflict) کے مرحلے کو شروع ہوئے صرف چھ سال بیتے ہیں۔ سیرتِ

مطہرہ میں بہت سے غزوات اور سرایا کا ذکر ملتا ہے لیکن ان تمام جنگوں میں جانی نقصان مجموعی طور پر چند سو سے زیادہ نہیں ہوا۔ کفار کی طرف سے جو لوگ قتل ہوئے اور مسلمانوں کی طرف سے جو شہید ہوئے ان کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اگرچہ کئی بار خوں ریزی ہوئی' لیکن اموات (Casualties) کی گنتی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک غیر خونیں (Bloodless) انقلاب تھا۔ سب سے زیادہ خون ریزی اگر ہو سکتی تو فتح مکّہ کے وقت ہوتی۔ اس لئے کہ جو خون کے پیاسے تھے' جو جانی دشمن تھے' وہ سب کے سب مکّہ میں موجود تھے۔ ان میں وہ شخص بھی تھا جس کے دھوکہ سے پھینکے ہوئے برچھے سے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے تھے' یعنی وحشی۔ ان میں وہ خاتون بھی تھی یعنی ہندہ بنت عتبہ' زوجہ ابوسفیان کہ جس نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کا مثلہ بھی کرایا تھا اور آپؓ کا کلیجہ چبانے کی کوشش بھی کی تھی۔ چنانچہ اُس وقت مکّہ والوں کو یہ اندیشے لاحق تھے کہ اب کیا ہوگا! ان پر شدید خوف اور اضطراب طاری تھا۔

اسلامی لشکر مکّہ کی راہ میں

اثنائے راہ میں رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب ملے' جو مسلمان ہو کر اپنے اہل و عیال سمیت مکہ سے ہجرت کرکے آ رہے تھے۔ مزید آگے گئے تو آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی ابوسفیان بن حارث اور پھوپھی زاد بھائی عبد اللہ بن امیہ ملے۔ یہ دونوں مکہ میں آپؐ کو سخت اذیت پہنچایا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے۔ لیکن جب دونوں بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہو کر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے معافی کے طالب ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں معاف فرما دیا۔

ابوسفیان کا قبولِ اسلام

دس ہزار قدسیوں اور جان نثاروں کے جلو میں جب کوکبِ نبویؐ نہایت عظمت و شان کے ساتھ مکّہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوا تو تحقیق کے لئے قریش کی طرف سے ابوسفیان' حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) اور بُدَیل بن ورقہ چھپ

چھپا کر اہل ایمان کے لشکر تک پہنچے۔ ابو سفیان کو مسلمانوں نے پہچان لیا اور گرفتار کر کے دربارِ رسالت میں پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خیمہ میں آکر عرض کیا کہ حضور! اللہ اور اس کے رسول کے اس دشمن کے قتل کا حکم دیجئے تا کہ کفر کے بالکلیہ استیصال کا آغاز ہو جائے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے جان بخشی کی درخواست کی ——— ابو سفیان کا سابقہ کردار اور ان کی اسلام دشمنی سب کے سامنے عیاں تھی۔ ان کا ایک ایک فعل انہیں قتل کا مستوجب ثابت کرتا تھا۔ لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز تھی اور وہ تھی حضور ﷺ کی رأفت' رحمت اور عفو کا جو ہر جو ابو سفیان کو دل ہی دل میں اطمینان دلا رہا تھا کہ خوف کا مقام نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ حَسنہ سے دل پہلے سے گھائل تھا۔ حق کا بول بالا اور اسلام کی فتح و سربلندی نگاہوں کے سامنے تھی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ جگری دوست تھے' ان کی ترغیب اور ان تمام چیزوں نے اس آہنی چٹان کو پگھلا دیا اور وہ بالآخر دولت اسلام سے مشرف ہوئے اور مؤمنِ صادق ثابت ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ——— غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی جو عہد خلافت راشدہ میں جنگ یرموک (شام) کے موقع پر بالکل جاتی رہی۔

یوم المرحمۃ

علی الصبح جب لشکر اسلام مکّہ کی طرف بڑھا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابو سفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو تا کہ وہ افواجِ الٰہی کا جلال اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ نیز مکّہ میں داخل ہوتے ہی اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابو سفیانؓ کے گھر میں پناہ لے گا یا حرمِ کعبہ میں داخل ہو جائے گا تو اس کو امن دیا جائے گا۔

اہلِ ایمان کی فوجیں الگ الگ پرچموں تلے نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتی ہوئی مکّہ کی طرف بڑھ رہی تھیں اور حضرت ابو سفیانؓ ان کو دیکھ دیکھ کر متحیر ہو رہے تھے۔ جب انصار کے قبیلہ خزرج کا لشکر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں گزرا جن کے ہاتھ میں علم تھا اور انہوں نے ابو سفیان کو دیکھا تو بے اختیار پکار اُٹھے .

الیومَ یومُ المَلحمة

الیومَ تستحلّ الکعبة

"آج خون بہانے کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا"۔

مختلف لشکروں کے پیچھے کوکبِ نبوی نمودار ہوا۔ حضرت زبیرؓ بن العوام علمبردار تھے۔ حضرت ابو سفیانؓ کی نظر جب جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضورؐ! آپ نے سنا کہ سعد یہ کہتے ہوئے گزرے ہیں کہ "الیوم یوم الملحمۃ۔ الیوم تستحل الکعبۃ" نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں سعد نے صحیح نہیں کہا بلکہ

الیومَ یومُ المَرحمة

وَالیومَ یومٌ تعظّم فیه الکعبة

"آج کا دن رحمت کا دن ہے اور آج کا دن وہ دن ہے جس میں کعبہ کی تعظیم کی جائے گی"۔

ملحم بنا ہے لحم سے۔ ملحم جانوروں کے ذبح خانہ اور اس مقام کو کہتے ہیں جہاں ذبیحہ کے پارچے یا قیمہ بنایا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی وزن پر رحم اور رحمت کے لفظ سے اس دن کو "یوم المرحمۃ" قرار دیا۔ یعنی رحم، رحمت اور شفقت کا دن ـــــ ساتھ ہی حضور ﷺ نے حکم دیا کہ سعد بن عبادہؓ سے علم لے کر ان کے بیٹے قیسؓ کو دے دیا جائے۔

ایک معمولی جھڑپ

اہل اسلام کے تمام لشکر پُر امن طور پر مکّہ میں داخل ہو گئے۔ یہ تمام لشکر مکّہ کے بالائی حصہ سے داخل ہوئے تھے، جب کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جو لشکر تھا وہ مکّہ معظمہ کے زیریں حصہ سے شہر میں داخل ہونے کے لئے آیا۔ قریش کے ایک گروہ نے اس لشکر پر تیر برسائے۔ چنانچہ تین صحابہ کرامؓ شہید ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر اس گروہ پر حملہ کیا اور یہ لوگ تیرہ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ نبی رحمت ﷺ نے جب تلواروں کی چمک دیکھی اور جھنکار سنی تو تحقیق حال فرمائی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ابتداء مخالفین کی جانب سے ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی"۔

فتح مبین کا اتمام

اللہ کی شان دیکھئے، جس مکّہ میں آٹھ سال قبل حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ ہو گیا تھا اور جہاں سے نبی اکرم ﷺ نے راتوں رات چھپ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی، پھر غارِ ثور میں تین دن پناہ لینی پڑی تھی جس کے دہانے تک کھوجی کفارِ مکّہ کو لے آئے تھے اور جہاں سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر حضور ؐ کو بچایا تھا جب آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ کا اضطراب دیکھ کر ان سے وہ جملہ فرمایا تھا جو توکّل علی اللہ کا شاہکار ہے کہ : "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" اسی مکّہ میں آٹھ سال بعد رمضان المبارک ۸ھ میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ بحیثیتِ فاتح داخل ہو رہے ہیں۔ فرطِ تواضع اور عجز و انکساری کا یہ عالم ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ کی پیشانی مبارک گھوڑے کے ایال کو مس کر رہی تھی۔ زبان مبارک پر ترانہ حمد جاری تھا۔ دنیا نے اس سے قبل ایسا کوئی فاتح کبھی دیکھا تھا اور نہ قیامت تک دیکھ سکے گی۔

بیت اللہ کی بُتوں سے تطہیر

رسول اللہ ﷺ انصار و مہاجرین کے جلو میں مسجد حرام کے اندر تشریف لائے، اس وقت آپؐ کے دست مبارک میں ایک کمان تھی۔ وہ حرم محترم جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جیسے بت شکن نے اللہ واحد کی پرستش کے لئے تعمیر فرمایا تھا، اس کے آغوش میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے۔ لیکن اب رسول اللہ ﷺ کے لئے موقع تھا کہ اپنے جدِّ امجد کی سُنّت کی تجدید فرمائیں۔ چنانچہ حضورؐ ایک ایک بت کو اپنی کمان سے ٹھوکے دے کر گراتے جاتے اور زبان مبارک سے پڑھتے جاتے تھے :

﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل ۸۱)

"حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی"[۱]

---

(۱) صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں. جاء الحق وما یبدئُ الباطل وما یعید "حق آگیا اور باطل کی چلت پھرت ختم ہو گئی"۔ (مرتب)

عین خانہ کعبہ کے اندر بت سے بت رکھے تھے اور اندر دیواروں پر تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب بت نکلوائے جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر جتنی تصویریں تھیں مٹا دیں اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام بت اٹھا اٹھا کر باہر پھینک دیئے۔

چند دنوں بعد اُن تمام بتوں کو بھی پاش پاش کرا دیا گیا جن کے استھان اطرافِ مکہ میں مختلف مقامات پر قائم تھے۔ اس طرح عرب میں اسلام کی انقلابی دعوتِ توحید کی تکمیل ہو گئی۔ شرک اور بت پرستی کا طلسم ختم ہوا اور شرک کی بنیاد پر جو استحصالی نظام قائم تھا اس کا استیصال ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ کا قریش سے خطاب

کعبہ مشرفہ کی بتوں سے تطہیر کے بعد آپؐ نے اس کے اندر نماز ادا کی' پھر دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے اور مسجد حرام میں کھچا کھچ بھرے ہوئے قریش سے خطاب فرمایا۔ مکہ میں داخلہ کے بعد عرب کے بے تاج بادشاہ' سرورِ عالم رحمۃٌ للعالمین ﷺ نے خلافتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو پہلا خطاب فرمایا اس کے مخاطب درحقیقت صرف اہلِ مکہ ہی نہیں بلکہ سارا عالم تھا۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اَلَا كُلُّ مَاْثَرَةٍ اَوْ دَمٍ اَوْ مَالٍ يُدْعٰى فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سَدَانَةَ الْبَيْتِ وَسِقَايَةَ الْحَاجِّ))

"ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا' اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور اس نے تنہا تمام جتھوں کو توڑ دیا۔ آگاہ ہو جاؤ! (اب) تمام مفاخر' تمام انتقامات' خون بہائے قدیم سب میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔"

((يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ' اَلنَّاسُ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ))

"اے قومِ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسبت کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔"

اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۃ الحجرات کی یہ آیت پڑھی

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ﴾

(الحجرات ۰ ۱۳)

" اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ۔ تحقیق اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ (اللہ کا) تقویٰ رکھتا ہو۔ (یعنی اس کے فرامین کی خلاف ورزی سے سب سے زیادہ بچتا ہو۔) بے شک اللہ دانا اور واقف کار ہے۔"

خطبہ مبارک کے بنیادی مطالب و مفاہیم

اس مختصر سے خطبہ میں اسلام کے انقلابی دعوت و پیغام کے چند اہم اصول بیان ہو گئے۔ دین اسلام کا اصل الاصول توحید ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی حاکم نہیں، کوئی مقنن نہیں، کوئی دستگیر نہیں، کوئی خالق و مالک نہیں —— لفظ اللہ میں یہ تمام مفاہیم موجود ہیں۔ ساتھ ہی شرک جیسے اکبرالکبائر کی تردید بھی آ گئی۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا بیان بھی آ گیا۔ پرانی عداوتوں اور انتقام کی پرزور مذمت بھی آ گئی۔ مفاخر قومی و نسبی کی بیخ کنی بھی ہو گئی۔ اور آپ نے جاہلیت کی ان تمام جہالتوں کے متعلق فرما دیا کہ "میں نے ان تمام چیزوں کو پاؤں تلے کچل دیا۔"

ظہورِ اسلام سے پہلے عرب ہی نہیں تمام دنیا میں نسل، قوم اور خاندان کی تمیز کی بنا پر فرق و تفاوت اور امتیازات و مراتب قائم تھے۔ جیسے ہندو دھرم میں چار مستقل ذاتیں تاحال قائم ہیں، ان میں سے کوئی ذات کسی دوسری ذات میں ضم نہیں ہو سکتی۔ یہ مستقل اور دائمی ہیں۔ ان میں شودر کو اچھوت کا درجہ دیا گیا ہے جو غلیظ اور ناپاک جانوروں سے بھی کم تر ہے۔ پوری دنیا پر اسلام کا یہ احسان ہے کہ اس نے دنیا کو کامل انسانی مساوات

کے اصول سے روشناس کرایا اور نبی اکرم ﷺ اور خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم نے اس اصول پر اسلامی حکومت کو عملاً چلا کر دنیا کے سامنے حجت پیش کر دی کہ نسل' رنگ' زبان' وطن' پیشے اور جنس کی بنیاد پر کوئی اونچا ہے نہ نیچا ہے' سب برابر ہیں' سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔

حضور ﷺ کا حلم اور عفو

خطبہ کے بعد فاتح مکہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کی طرف دیکھا۔ جبارانِ قریش سامنے تھے۔ فرمایا کہ تمہارا کیا گمان ہے کہ میں آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ یہ لوگ اگرچہ شقی' بے رحم اور ظالم تھے' لیکن مزاج شناس بھی تھے۔ لہٰذا بے اختیار پکار اُٹھے : اخٌ کریمٌ وابنُ اخٍ کریمٍ "آپؐ شریف اور بامروت بھائی ہیں اور ایک شریف اور بامروّت بھائی کے بیٹے ہیں۔" رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ "آج تم پر کوئی سرزنش نہیں ہے" اور اذھبوا فانتم الطلقاء "جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کی انقلابی دعوت کے دلی دشمن اور اس کے مٹانے کے درپے تھے۔ وہ بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ پر طنز و تعریض کیا کرتے اور حضورؐ پر تضحیک و تمسخر اور استہزا کے تیر برسایا کرتے تھے' حتیٰ کہ دشنام طرازی تک کیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں اور اہل ایمان کو شہید کیا تھا۔ وہ بھی تھے جو پیکر قدسی ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ وہ بھی تھے جو تلاوتِ آیاتِ الٰہی اور وعظ و دعوت کے موقع پر شور و غل اور مذاق و ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو دہکتی آگ' تپتی چٹانوں اور جلتی ریت پر لٹا کر ان کی پیٹھوں اور سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینۃ النبیؐ کے چھوٹے سے شہر کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا ــــــ لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم' رافت

ورحمت اور عفو کا یہ کرشمہ ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں : لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ' آج کے دن تم پر کوئی الزام ہے اور نہ ہی کوئی ملامت ہے۔ میں آج تمہیں زبانی بھی کوئی دکھ پہنچانا نہیں چاہتا کہ پچھلی کوئی بات یاد دلا کر تمہیں شرمندہ و شرمسار کروں ــــــ کون نہیں جانتا کہ بسااوقات جسمانی ایذا سے کہیں زیادہ تکلیف دہ زبانی ایذا ہو جاتی ہے۔ اجرائے وحی کے ابتدائی تین سال تک رسول اللہ ﷺ زبانی ایذاء کا ہدف بنے رہے تھے' جس پر قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کی دلجوئی کے لئے آیات نازل ہوا کرتی تھیں۔ حضور ﷺ چاہے کوئی جسمانی ایذا نہ پہنچاتے لیکن اس موقع پر چند جملے ایسے ارشاد فرما سکتے تھے جو قریش کی ذہنی ایذاء کا سبب بن سکتے تھے۔ لیکن رؤف و رحیم اور کریم رسول ﷺ کی شرافت و مروت نے یہ بھی گوارا نہیں کیا اور قریش کے اس سہمے ہوئے اور خوف زدہ مجمع سے فرمایا تو یہ فرمایا : "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ"

اشتہاری مجرم

سیرت کی کتابوں میں بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اگرچہ اہل مکہ کو امن عطا فرما دیا تھا لیکن چند لوگ ایسے بھی تھے جن کے متعلق یہ حکم تھا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں۔ مختلف روایات میں ان کی مختلف تعداد آتی ہے' البتہ اکثر روایات میں دس لوگوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے چھ خلوص دل سے ایمان لے آئے اور انہیں معافی مل گئی۔ ان ایمان لانے والوں میں وحشیؓ بھی تھے جو اسد اللہ و اسد رسولہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل تھے۔ بعد میں ان ہی کے ہاتھوں مسیلمہ کذاب واصل جہنم ہوا جو جھوٹے مدعیانِ نبوت کا سرخیل تھا۔ صرف چار شخص قتل ہوئے' تین مرد اور ایک عورت۔ مَردوں میں سے ایک نے منافقانہ طور پر ایمان لا کر جنگ میں کہیں چھپ کر ایک انصاری کو قتل کیا تھا۔ ایک وہ تھا جس نے نبی اکرم ﷺ کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ شرارت کی تھی جب کہ وہ ہجرت کر رہی تھیں۔ ان کو اونٹوں سے گرا دیا تھا جس کے نتیجے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ ایک لونڈی تھی جو فاحشہ بھی تھی اور مغنیہ بھی' جو نبی اکرم ﷺ کی ہجو میں نہایت شرمناک گیت گایا کرتی تھی۔

نصرٌ من اللہ و فتح قریب کا کامل ظہور

فتح مکہ کی صورت میں اندرونِ ملکِ عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہو گئی۔ اور سورۃ الصف میں جو غزوۂ احزاب اور سورۃ الاحزاب سے متصلاً بعد نازل ہوئی' ان الفاظ مبارکہ میں جو بشارت دی گئی تھی کہ ﴿ وَ اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ وہ بشارت پوری ہو گئی۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر پختہ ایمان رکھنے والوں اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں اور اللہ کی راہ میں صفیں باندھ کر اس طرح قتال کرنے والوں کو جیسے سیسہ پلائی دیوار ہوں' آخرت میں لغزشوں اور خطاؤں کی مغفرت' دخول جنت اور جناتِ عدن کے پاکیزہ گھروں میں خلود و سکونت کے وعدوں کے ساتھ ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں اصل کامیابی ہے ﴿ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴾ اس دنیا میں بھی نصرتِ الٰہی اور فتح قریب کی نوید جاں فزا سنائی گئی تھی جو فطری اعتبار سے انسان کو بڑی محبوب ہوتی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کی صورت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نگاہوں کے سامنے اس بشارت کا ظہور ہو گیا۔ گویا اس طرح ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ﴾ کا اکمال و اتمام ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہو گئی۔

واٰخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العٰلمین

دُعا

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

دُعا بظاہر ایک دینی اصطلاح ہے اور اہلِ دنیا اسے نیکوں' نمازیوں' صوفیوں اور مولویوں کا وظیفہ گردانتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ غریب' محتاج' سائل اور کمزور لوگوں کا نفسیاتی سہارا۔ یہ بلاشبہ پاکبازوں اور صوفیوں کا وظیفہ ہے اور محتاج اور بے وسیلہ لوگوں کی روحانی ڈھارس' لیکن بات یہاں آکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دُعا وہ وظیفہ ہے جو بندے کو احساس بندگی دلاتا اور رحمت حق کو مہمیز دیتا ہے۔ دُعا وہ نقطۂ اتصال ہے جو بندے کی تمنا اور اللہ کی عطا کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔ دُعا وہ حالت ہے جب بندہ اللہ سے سرگوشی کرتا ہے اور اس کی رحمت بڑی دیر تک کان لگائے رہتی ہے۔ بندہ جو باتیں کسی انسان سے نہیں کہہ پاتا وہ بے تکلّف اپنے مالک و مولا سے بیان کر دیتا ہے۔ بعض اوقات کوئی ضرورت مند' کوئی محتاج' کوئی کارگہِ حیات میں پچھڑ جانے والا' کوئی غریب' کوئی مسکین اور کوئی سفید پوش اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر کسی دولت منداور کسی خوشحال شخص سے اپنی ضرورت بیان کر بھی دے تو دونوں صورتوں میں اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے' خواہ اسے جھڑک یا ٹال دیا جائے یا اسے کچھ عطا کر دیا جائے۔ ٹالے جانے کی صورت میں تو وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا اور عطا کئے جانے کی شکل میں وہ سر جھکانے پر مجبور ہوتا ہے۔ مگر بارگاہ ایزدی سے نہ تو کبھی ڈانٹ پڑتی ہے نہ کسی کو جھڑک دیا جاتا ہے اور حسبِ تمنا عطا کر دینے پر بھی بندے کو پشیمان نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا دراصل مان بڑھایا جاتا ہے کہ بندہ اپنے رب پر مان نہ کرے تو کس پر کرے؟ اس کو عطائے ذاتِ لم یزل پر ناز نہ ہو تو کس پر ہو؟ اس کی حجت دربارِ خداوندی سے پوری نہ ہو گی تو اور کہاں ہو گی؟ ؎

اور جتنے بھی سہارے ہیں سبک کرتے ہیں
عزّتِ نفس بڑھاتا ہے سہارا تیرا

بسااوقات رشتہ دار ضروریات پوری کر دیتے ہیں' احباب آڑے وقت میں کام آجاتے ہیں' محلے دار ڈھال بن جاتے ہیں' دفتری رفقاء مدد کر دیتے ہیں' رحم کھانے والے بھی ہاتھ تھام لیتے ہیں' سخی لوگ ہاتھ کی میل سمجھ کر کچھ دے دیتے ہیں' خدا ترس بندے بھی ہاتھ بٹا دیتے ہیں' آخر اسباب کی دنیا ہے کوئی نہ کوئی حیلہ بروئے کار آجاتا ہے' مگر ان میں سے ہر ایک کبھی نہ کبھی عنوان بدل بدل کر احسان جتاتا اور اپنا آپ دکھاتا ہے۔ رہ گئی ذات باری تعالیٰ' وہ دیتی بھی ہے اور بندے پر خوش بھی ہوتی ہے کہ اس نے مجھے پکارا' اس نے مجھے بلایا' اس نے مجھے یاد کیا اور اس نے مجھ سے مانگا۔ اس کے ہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ؎

آتا ہے فقیروں پہ اسے پیار کچھ ایسا
خود بھیک دے اور خود کہے منگتے کا بھلا ہو

اسی مفہوم کی ایک حدیث بھی ہے "اللہ اس بندے سے ناراض ہوتا ہے جو اس سے نہ مانگے" یعنی لوگ مانگنے پر منہ بناتے اور اکتاتے ہیں جبکہ خدا مانگنے پر خوش' دستِ سوال دراز کرنے پر مسرور اور دعا کرنے پر راضی ہوتا ہے۔ کسی سائل و محتاج کے سوال اور اظہارِ مدّعا پر وہ فرشتوں کی مجلس میں بندے کی عزتِ نفس کا مذاق نہیں اڑاتا بلکہ انہیں گواہ بنا کر کہتا ہے :

"فرشتو! میرے بندے نے مجھ سے سوال کیا میں اس سے بہت خوش ہوں' جاؤ اسے خوشخبری دے دو کہ جو کچھ اس نے مانگا وہ بھی اسے دے دیا گیا اور جو وہ بھولے سے مانگ نہیں پایا وہ بھی عطا کر دیا گیا"۔

ہر شخص کو یہ احساس ہے کہ دنیا میں کسی سے کچھ مانگنا کس قدر اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے' آدمی گلے تک زمین میں گڑ گڑ جاتا ہے' پیشانی پر پشیمانی سے کتنے بڑے بڑے گومڑ نکل آتے ہیں' زبان کس قدر ہکلاتی اور تھتھلاتی ہے' کانوں کی لویں شرم سے تپ جاتی ہیں' آنکھوں کی پتلیاں کس بے بسی سے گردش کرتی دکھائی دیتی ہیں' سانس کے ساتھ آواز بھی بے ترتیب ہو جاتی ہے' دل کی دھک دھک سے سینہ پھٹنے کو جاتا ہے' ماتھے کا عرقِ انفعال ڈوبنے کو کافی ہوتا ہے' بولتے ہوئے ہونٹوں کا کھنچنا اور بھنچنا قیامت سے

کم نہیں ہوتا' خدا کسی کو کسی کا محتاج نہ کرے'ع

شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جنہاں تیں بھارے ہُو

لیکن وہی محتاج انسان جب بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوتا ہے' کھل کر روتا ہے مگر شرمندہ نہیں ہوتا اُلٹا دل کا غبار ڈھل جاتا ہے' گڑگڑاتا ہے مگر ہچکچاتا نہیں' بندہ دھاڑیں مار کر روتا ہے مگر مہربان رب اس کا داغ ندامت ہمیشہ کے لئے دھو دیتا ہے' وہ کہنیاں زمین پر رگڑتا ہے مگر خدا اس کا مان رکھتا ہے' وہ عاجزی سے گال زمین پر ٹیکتا ہے غفور و رحیم خدا اسے حقارت سے نہیں بہت پیار سے دیکھتا ہے' وہ جس قدر بے بسی سے ہاتھ پھیلاتا ہے رؤف و کریم بڑی تیزی سے اس کے قریب آ جاتا ہے' اس کی جناب سے ملتا تو ہے ہی پر مرحلۂ دعا اس عطا سے کہیں بڑھ کر کیف آگیں اور روح افزا ہوتا ہے ؎

کیسے مزے کے دن تھے کہ راتوں کو صبح تک

میں تھا' تری جناب تھی' دستِ سوال تھا

بعض اوقات اللہ تعالیٰ بندے کا ذوق طلب بڑھانے اور آتشِ شوق بھڑکانے کے لئے دعا کی قبولیت میں تاخیر کر دیتا ہے۔ یہ تاخیر بندے کے لئے تعزیر نہیں اس کی دُعا کو اکسیر بنانے کے لئے ہوتی ہے۔ مالکُ الملک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بندہ واقعی مجھے سب کچھ سمجھتا ہے یا ابھی کسی اور سے بھی آس لگائے بیٹھا ہے اور محض میری رحمت کو ٹٹولنے آیا ہے۔ ایک فرمانِ رسول ﷺ کے مطابق تین بار تو اللہ تعالیٰ اپنا رُخِ رحمت اِدھر اُدھر کرتا ہے مگر چوتھی بار اس کا کرم چھلک پڑتا ہے اور بندے کی کشت زارِ آرزو کو سیراب کر دیتا ہے۔ بعض بندے بڑے عجلت پسند اور تھڑدلے ہوتے ہیں' اپنی اس ادا سے وہ رحمت حق کو تو نہیں البتہ خود کو آزمائش میں ڈال لیتے ہیں' ورنہ اللہ تو سیاہ راتوں میں چکنے اور سیاہ پتھر میں بسیرا کرنے والے حقیر کیڑے کی سنتار رہتا ہے' بھلا وہ اشرف المخلوقات انسان کی کیوں نہ سنے؟ انسان خواہ سیہ کار ہو یا نیکوکار' تہجد گزار ہو یا نابکار' پرہیزگار ہو یا رسوائے روزگار' خوش اطوار ہو یا بد کردار' دینے والا منہ دیکھ کر نہیں دیتا' اپنی شانِ کرم دیکھتا ہے۔ اسی لئے تو حضرت علی علیہ السلام اپنی دُعا میں کہتے تھے

"الٰہی تو میرے ساتھ وہ معاملہ فرما جو تیرے شایانِ شان ہے' وہ نہ کر جس کا میں

حقدار ہوں"

مانگنے کی یہ ادا ہو تو دُعا اشارۂ ابرو سے آگے نہیں بڑھ پاتی' اس سے پہلے قبول ہو جاتی ہے۔ بندے پر لازم ہے کہ وہ جلدی نہ دکھائے اپنی دردمندی ظاہر کرے' وہ عجلت افروزی سے زیادہ دلسوزی پر زور دے' وہ آشفتہ سر نہ بنے صحیح معنوں میں گداگر بن کر رہے' وہ ساعتیں شمار نہ کرے' ابرِ کرم کے برسنے کا انتظار کرے۔

شیخ سعدی نے ایک حکایت کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ کسی شخص کو شوق چرایا کہ وہ ولی اور مجذوب بن کر مرجعِ خلائق کہلائے اور یہ سب کچھ چند دنوں میں ہو جائے۔ ڈنڈا ڈیرا اٹھایا اور پہاڑ کی کھوہ کو چل دیا' دو چار روز عالمِ استغراق میں رہا' کچھ وظیفہ کیا' چند دُعائیں پڑھیں اور بیٹھ گیا فتوحات کے انتظار میں۔ بھلا ہفتے بھر میں کیا ہونا تھا؟ اس کا تو خیال تھا کہ بس کوئی دن ہو گا لوگ کھنچے چلے آئیں گے' ڈالیاں دوڑتی اور قابیں اچھلتی آئیں گی' دودھ کے مٹکے پہنچ جائیں گے اور آبِ یخ کی صراحیاں لبالب دھری ہوں گی۔ بھلا کبھی فقر بھی اس مکر سے ہاتھ آیا ہے؟ اور کوئی فقیر اس تدبیر سے بنا ہے؟ وہ شخص طالبِ جاہ تھا' بھوک پیاس سے نباہ نہ کر سکا' وہ خواستگارِ آسائش تھا' آزمائش میں نہ پڑ سکا' فوراً اٹھا پوستین گلے میں حمائل کی' ہاتھ میں کشکول تھاما اور قریب کی بستی میں جا نکلا۔ پہلے ہی در پر صدا دی تھی کہ ایک خونخوار کُتّے سے پالا پڑ گیا' یہ بد کتا جا رہا تھا اور کتا لپکتا آ رہا تھا' یہ پیچھے کو سرکتا' کتا آگے کو مچلتا' تنگ آ کر نام نہاد فقیر نے کتے سے پوچھا کہ میں بے نوا بھکاری ہوں تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ نہ تمہیں جھڑکا' نہ ڈھیلا مارا' نہ ڈانگ اٹھائی' تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں اس موقع پر قدرت نے کُتّے کو قوتِ گویائی بخشی اور وہ بولا "ارے کم ظرف' تم تو گئے تھے آستانِ رب پر بیٹھنے' اس سے ملنے اور اس سے مانگنے' یہ کیا چار دن میں جی بھر گیا' اور آ گئے ہو غیراللہ کے در پر' مجھے دیکھو کئی سالوں سے اپنے مالک کی ڈیوڑھی میں بندھا ہوں' کچھ ڈال دیتا ہے تو کھا لیتا ہوں' نہیں ڈالتا تو اسے بھونکتا نہیں ہوں' کئی دن فاقے بھی کاٹتا ہوں' مگر مالک کا در چھوڑ کر کسی دوسرے کی چوپڑی روٹی پر طمع کی نگاہ نہیں ڈالی' اپنے مالک کی چچوڑی ہڈی پر گزارا کیا ہے' جا یہاں سے چلا جا ورنہ تجھے پھاڑ کھاؤں گا۔ تب اس ملمع ساز کی آنکھ کھلی اور چلتا بنا۔

رب کے حضور حاجات کا پیش کرنا یا دُعا مانگنا کیت نہیں ایک کیفیت ہے' مانگنے کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی عربی ادب کالبید و جاحظ ہو' فارسی لٹریچر کا رومی و سعدی ہو' انگریزی ادبیات کا ملٹن اور آسکر وائلڈ ہو' اردو کا غالب و ابوالکلام ہو۔ نہیں! کیفیت ایک نابلد محض کی بھی ہو سکتی ہے' گونگا بھی اپنے انداز میں ربِّ کریم کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکتا ہے' ہکلانے والا شخص بھی اپنا دل کھول کر رکھ سکتا ہے' کج مج بیان بھی سادگی سے اپنا مدعا پیش کر سکتا ہے' رب کی رحمت محض رازی و غزالی رحمہم اللہ کے لئے نہیں اور نہ ہی اس پر جنید و بایزید رحمہم اللہ کا اجارہ ہے۔ یہ لوگ ہزار مقبولِ بارگاہِ الٰہی سہی' اگر خدا صرف ان کی سنتا رہا تو ہم جیسے خاطی و عاصی کس در پہ جائیں گے؟ جبکہ مریض سب سے زیادہ حاذق حکیم کی طرف لپکتا ہے اور طبیب کا سارا سامان طب مریض کے لئے ہوتا ہے' سخی کا دروازہ خوشحالوں کے لئے نہیں ہمیشہ بدحالوں کے لئے کھلتا ہے' ماں کا دریائے شفقت ہنستے کھیلتے بچے کے لئے نہیں روتے بلبلاتے بچے کے لئے جوش مارتا ہے۔ جس طرح ماں کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کے بچے کی جائے پناہ اس کی گود ہے' اس کا واحد مرکز شفقت اس کا سینہ ہے اور اس کا واحد سہارا اس کی بانہیں ہیں' چنانچہ ماں بھی بچے کے لئے وقف ہوتی ہے اور بچہ بھی دائیں بائیں نہیں جھانکتا لپک کر سیدھا ماں کی جھولی میں آ گرتا ہے۔ یہی کیفیت اگر بندے کی ہو' رب کو یہ یقین ہو کہ میرے بندے کا اس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں اور بندے کا بھی پختہ اعتقاد ہو کہ رب کے علاوہ کوئی لائق بھروسہ نہیں' تو پھر وہ کچھ رونما ہوتا ہے جسے قرآن معجزہ کہتا ہے۔

ایک بچہ جب اپنے باپ سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ سکول جاتے ہوئے تھک جاتا ہے' گرمی اسے ستاتی ہے' دوست اسے طعنے دیتے ہیں اور یہ جانے بغیر کہ اس کے باپ کے پاس وسائل ہیں یا نہیں سائیکل کی مانگ کر بیٹھتا ہے۔ پہلے دن باپ اسے نرمی سے سمجھاتا ہے کہ بیٹا پیسے ہوتے تو ضرور سائیکل لے کر دیتا۔ دوسرے دن کی طلب پر ذرا جھڑکنے کے انداز میں کہتا ہے جان من! مجھے علم ہے تمہیں تکلیف ہوتی ہے مگر میری تکلیف اور مجبوری کا بھی خیال کرو۔ اس سے اگلے دن اکتاہٹ کے انداز میں باپ ڈانٹتے ہوئے بتاتا ہے کہ کیا تمہاری سائیکل کے لئے کسی کی جیب کاٹوں؟ کسی کی دیوار

پھلانگوں؟ کسی سے بھیک مانگوں؟ لیکن جب بچہ بول اٹھتا ہے 'ابا جان! میری فرمائش بے جا سہی اور آپ کی مشکل بجا سہی، مگر کیا کروں مجھے جب بھی کچھ کہنا ہے آپ سے کہنا ہے اور جو مانگنا ہے آپ سے مانگنا ہے' کوئی اور باپ کہاں سے لاؤں کہ اس سے فرمائش کروں؟ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں باپ اپنا دل سینے سے باہر ابلتا ہوا محسوس کرتا ہے' پھر وہ اپنی روز مرہ ضروریات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بیٹے کی دلجوئی کا سامان کرتا ہے۔ یہی کیفیت دراصل بندے کے لئے مطلوب ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی عاجزی' مسکینی' بے بسی' بندگی' حاجت طلبی' اشک ریزی اور خود سپردگی کے باعث ایسے موڑ پر لے آئے تو پھر رحمتِ خداوندی چھلک چھلک پڑتی ہے اور لپک لپک اٹھتی ہے۔ بندہ پہلے اظہارِ بندگی تو کرے پھر شان خداوندی کا نظارہ کرے۔ یہ کیا کہ جھٹ مانگا اور پٹ انتظار میں بیٹھ گیا۔ دُعا جب تک کیفیت نہ بنے' لذت کے سانچے میں نہ بیٹھے اور تمنا کے پیکر میں نہ ڈھلے' پھر وہ دُعا نہ ہوئی محض مدعا بن گیا اور وہ بھی بے رنگ اور بے کیف! بندہ جب اپنے ہاتھوں کو مجسم سوال بنالیتا ہے اور دامن کو کشکول میں بدل دیتا ہے تو پھر ایک آہ سرد اور ایک قطرۂ اشک گرم اس کے سب سے بڑے سفارشی اور قبولیت کے ضامن بن جاتے ہیں۔ دعا لفظوں کے تکرار کا نہیں بندگی کے اظہار کا نام ہے۔ جب انسان یہ کہنے پر آجائے تو پھر خدا عرش معلٰی سے اتر کر آسمان دنیا پر آجاتا اور اپنے بندے کی دُعا سنتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے یہ الفاظ کس قدر وجد انگیز' ذوق آفریں اور روح پرور ہیں کہ

"اللّٰھم اغفر لمن لا یملک الا الدّعاء"

"اے اللہ! اس شخص کو بخش دے جس کے پاس دُعا کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں"۔

پیارے قارئین! خود ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بتایئے کہ اللہ کو منانے اور اس کی توجہ پانے کے لئے اس سے بہتر ذریعۂ اظہار کیا ہو سکتا ہے جو پیرایہ بابِ مدینۃ العلم نے اختیار کیا ہے۔

بندہ مال و زر پر اِترائے' خانوادہ و خاندان کا رعب جمائے' عہدہ و منصب کی جھلک دکھائے' قبیلہ و برادری کا حوالہ سنائے اور اپنے نوافل و اذکار پر سینہ پھلائے اور پھر کہے

مولا! میری بھی سن' یہ عرض گزاری تو نہ ہوئی دنیاداری ہوئی۔ اللہ کی منشاء یہ ہے کہ میرے بندے تو میرے لئے سب رشتے توڑ کر آ' ساری دنیا تیرے ساتھ نہ جوڑ دوں تو پھر کہنا' تو کاسۂ دل ہر تمنا سے خالی کر کے آ' تیرے دل کو شاہ و والی نہ بنا دوں تو پھر کہنا' تو اپنی گردن نیچی کر کے آ' تیری ٹوپی جہاں بھر میں اونچی نہ کر دوں تو پھر کہنا' تو خواہشوں کے آنگن میں جھاڑو پھیر کے آ' میں اس میں بے نیازی کا چاند نہ اتار دوں تو پھر کہنا' تو ایک بار پلکیں بھگو کے آ' تیرے سارے دھونے نہ دھو دوں تو پھر کہنا' تو رشتہ و پیوند کو بھول کے آ میں تجھے کونین میں ارجمند نہ کر دوں تو پھر کہنا' اور تو ایک بار صرف میرا بن کر آ راحت و عظمت دارین تیرے نام نہ کر دوں تو پھر کہنا!!

رحمتِ رب کو پیسہ یا حوالہ درکار نہیں ہوتا بس ایک حیلہ مطلوب ہوتا ہے' اس لئے جہاں دعا کا ساتھ لفظ چھوڑ جاتے ہیں جملے پیچھے رہ جاتے ہیں اور حرف جواب دے جاتے ہیں وہاں کوئی حیلہ کام آ جاتا ہے' خواہ وہ دل کی تیز دھڑکن ہو' جسم کی کپکپی ہو' روح کی بے قراری ہو' آنکھوں کی اشک باری ہو' دامن کا بے ساختہ پھیلاؤ ہو' ہاتھوں کا گدایانہ ارتعاش ہو' لہجے کا اضطراب ہو اور کچھ بھی میسر نہ ہو تو گناہوں کا اعتراف ہی قبولیتِ دعا کا زینہ بن جاتا ہے۔ بندہ بے صبرا نہ ہو' لمحوں میں قطع منازل کا اسے لپکا نہ ہو' ذرا لذتِ انتظار کا آشنا ہو' پھر دیکھے کہ عرش اور فرش کا فاصلہ کیسے گھٹتا ہے' افلاک اور خاک کا کیسے ملاپ ہوتا ہے' اور آقا و بندہ کیسے ہمکلام ہوتے ہیں؟

یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جو کچھ کرتے کماتے ہیں سب کچھ بچوں کے لئے ہوتا ہے' ان کی سہولت' ان کی خاطرداری اور ان کے مستقبل کے لئے۔ ہم گھر میں مٹھائی اور پھلوں کا ٹوکرا لے آتے ہیں' بچوں کے لئے لاتے ہیں مگر جب مانگتے ہیں تو سب کچھ انہیں نہیں دے دیتے' اس لئے نہیں کہ ان کے لئے نہیں لائے بلکہ ان کے لئے جتنا ضروری اور مناسب ہے وہ دیتے ہیں۔ جیب میں ہزاروں روپے ہوتے ہیں لیکن بچوں کو خرچ کے لئے پانچ دس روپے ملتے ہیں' کیوں؟ کیا یہ سب کچھ بچوں کے لئے نہیں؟ بلاشبہ ان کے لئے ہے لیکن دیا اتنا جائے گا جتنا ان کے لئے موزوں ہے۔ اسی طرح بلا تشبیہ و مثال' جو کچھ کائنات میں ہے سب کچھ بندوں کے لئے ہے۔ اللہ نے یہ سب کچھ اپنی سہولت کے لئے

نہیں جوڑ رکھا' انواع و اقسام کے کھانے' شیریں اور یخ پانی' متنوع ملبوسات' نرم بستر' اونچے بنگلے' میٹھی نیند' ذائقے دار پھل' نظر نواز مناظر' جنت نظیر باغات' گنگناتی آبشاریں' ہفت رنگ قوس قزح' کاروبار' تجارت' پیسہ' دولت' برادری' منصب' عہدہ' تاج و کلاہ' لشکر و سپاہ' سریر و تخت' حریر و زر بفت' یہ سب چیزیں بندوں کے لئے ہیں' اللہ ان سب سے بے نیاز ہے۔ بندہ ان میں کچھ بھی مانگے تو ضروری نہیں ہر چیز فی الفور مل جائے۔ بندوں کے لئے جو ضروری ہے وہی دیا جائے گا' جس نے یہ حکمتِ ربّانی پالی گویا اس نے جیتے جی اپنی زندگی جنت بنالی۔ قرآن مجید میں ہے کہ "کئی چیزیں تمہیں بے حد مرغوب ہیں مگر دراصل تمہارے لئے موزوں نہیں اور کئی باتیں جنہیں تم اپنے لئے مکروہ جانتے ہو فی الحقیقت تمہارے حق میں بہتر ہیں"۔ یہ فلسفہ انسان کو وہ شان عطا کر دیتا ہے کہ پھر ع

"شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی"

والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' ورنہ خدا دینے پہ آئے تو اس نے بندوں کو کیا نہیں دیا؟ اور کیا نہیں دے سکتا؟ فرعون کو چار سو سال کی عمر بھی دی اور بادشاہت بھی! قارون کو دولت بھی دی اور رعونت بھی' سکندر کے قدموں میں تین چوتھائی دنیا ڈال دی' قیصر کو روم جیسی سلطنت بخش دی' اور کسریٰ کو تاجِ ایران عطا کر دیا۔ کیا یہ باتیں ان کے حق میں گئیں؟ نہیں۔ ان کے مقابلے میں انبیاء کرام علیہم السلام دکھوں میں گھرے رہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو عمر بھر قوم کی مزاحمت کا سامنا رہا' حضرت لوط علیہ السلام اپنی بیوی کے ہاتھوں تنگ رہے' حضرت یوسف علیہ السلام کی سربازار بولی لگی' حضرت یعقوب علیہ السلام ہجر یوسف علیہ السلام میں آنکھوں کا نور کھو بیٹھے' حضرت زکریا علیہ السلام آرے کی زد میں آئے۔ ساری کائنات میں اللہ کے سب سے پیارے انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم طائف اور صحنِ کعبہ میں لہولہان ہوئے۔ تین سال شعبِ ابی طالب میں محصور رہے۔ تین سو میل سنگلاخ پہاڑیوں کا سفر کیا جب مکے سے مدینہ کو ہجرت ہوئی۔ نواسۂ رسول حسین رضی اللہ عنہ کو میدانِ کربلا میں حرفِ برملا کہنے پر جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ کیا یہ لوگ گھاٹے میں رہے؟ ہرگز نہیں! یہ لوگ دراصل رازِ الٰہی پانے والے لوگ ہیں' تبھی تو اپنی مراد پا گئے۔ دُعا درحقیقت رازِ الٰہی پانے کی تمنا ہے'

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

غلطیوں کی اصلاح کا نبوی طریق کار (۸)

تالیف : علامہ محمد صالح المنجد، مترجم ۔ مولانا عطاء اللہ ساجد

لوگوں کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے نبی اکرم ﷺ کے اختیار کردہ مختلف اسلوب

۲۴) فریقین کے درمیان مداخلت کر کے جذبات ٹھنڈے کرنا، تاکہ فتنہ بڑھنے سے پہلے ختم ہو جائے :

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر یہ پالیسی اختیار فرمائی ہے کہ جب مسلمانوں میں لڑائی کی نوبت آئی تو آنحضرت ﷺ نے مداخلت کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ جب منافقوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ناپاک بہتان لگایا تھا، اس واقعہ کی تفصیل میں مذکور ہے : "اُس دن رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن اُبَی کے بارے میں فرمایا : "اے مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کی چیرہ دستیوں سے میری عزت بچائے، جس نے مجھے میرے گھر والوں کے بارے میں تکلیف پہنچائی ہے؟ اللہ کی قسم! میں اپنے اہل کے بارے میں صرف بھلائی ہی جانتا ہوں (ان کا کوئی گناہ یا غلطی نہیں جانتا) اور ان لوگوں نے جس شخص کا نام لیا ہے اس کے بارے میں بھی صرف بھلائی ہی جانتا ہوں۔ وہ کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر نہیں آیا"۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : قبیلہ بنی عبدالاشھل سے تعلق رکھنے والے صحابی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اُٹھ کر عرض کیا "یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ اگر وہ (میرے) قبیلہ اوس سے ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اور اگر وہ ہمارے برادر قبیلہ خزرج سے ہے تو بھی آپ حکم فرمائیں، ہم تعمیل کریں گے"۔ (یہ بات سن کر) قبیلہ خزرج کا ایک آدمی اٹھا، حضرت حسّان رضی اللہ عنہ کی

والدہ اس کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور اس کی چچازاد تھیں' یہ صاحب خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : ویسے تو وہ نیک آدمی تھے' لیکن (اُس دن) قبیلہ کی حمیت جوش میں آگئی۔ انہوں نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا : "تم غلط کہتے ہو' تم اسے ہرگز قتل نہیں کرسکتے۔ اگر وہ تمہارے قبیلہ سے ہوتا تو تمہیں اس کا قتل ہونا کبھی پسند نہ ہوتا"۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی حضرت اُسَید بن حُضَیر رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا : "تم غلط کہتے ہو' اللہ کی قسم! ہم اسے ضرور قتل کریں گے۔ تم تو منافق ہو جو منافقوں کی حمایت کرتے ہو"۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : چنانچہ دونوں قبیلے اوس اور خزرج غصے میں آگئے حتیٰ کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں لڑپڑیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے تھے۔ آپؐ انہیں سمجھاتے بجھاتے رہے حتیٰ کہ وہ لوگ خاموش ہوگئے (۸۸)۔

اسی طرح ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی عمرو بن عوف کے لوگوں میں صلح کرانے ان کے محلّے میں تشریف لے گئے' حتیٰ کہ اس کی وجہ سے مسجدِ نبوی میں نماز باجماعت میں تاخیر ہو گئی۔ یہ واقعہ صحیحین میں موجود ہے۔ سنن نسائی میں یہی واقعہ حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' وہ فرماتے ہیں : ایک بار انصار کے دو گھرانوں کے مابین کچھ تلخ کلامی ہوگئی' بات یہاں تک بڑھی کہ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کی طرف پتھر پھینکے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان میں صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے۔ نماز کا وقت ہوا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لائے تو بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کے لئے آگے کھڑے ہوگئے...الخ (۸۹)

مسند احمد میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا' اور اس نے عرض کیا ۔ بنو عمرو بن عوف کی آپس میں لڑائی ہوگئی ہے اور انہوں نے ایک دوسرے کی طرف پتھر پھینکے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں صلح کرانے کے لئے روانہ ہوگئے...الخ (۹۰)

۲۵) غلطی پر غصے کا اظہار:

جب اصلاح کرنے والا یا عالم آدمی ایک غلط کام ہوتا دیکھے یا کسی سے غلط بات سنے تو ناراضگی کا اظہار کر سکتا ہے' خاص طور پر جب کہ غلطی کا تعلق عقیدے سے ہو۔ اس کی ایک مثال تقدیر کے بارے میں بحث اور قرآن کے بارے میں اختلاف ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے' انہوں نے اپنے والد حضرت شعیب بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا اور انہوں نے اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے بیان فرمایا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس تشریف لائے تو وہ تقدیر کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ غصہ کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک اس طرح (سرخ) ہو گیا جیسے انار کے (سرخ) دانے نچوڑ دیئے گئے ہوں۔ آپ ؐ نے فرمایا ․ "کیا تمہیں اس کام کا حکم دیا گیا ہے؟" یا فرمایا ․ "کیا تمہیں اس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کی آیات کو باہم ٹکرانے لگو؟ تم سے پہلی اُمتیں بھی اسی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں"۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا ․ مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ میں اس مجلس میں موجود نہیں تھا۔[۹۱]

ابن ابی عاصم نے اپنی تصنیف "کتابُ السُّنّۃ" میں یہ روایت درج کی ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس تشریف لائے تو وہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ کوئی ایک آیت کو اپنے موقف کے حق میں پیش کر رہا تھا' کوئی دوسری آیت سے اپنا موقف ثابت کرنا چاہتا تھا۔ آپ ؐ کا چہرۂ مبارک اسی طرح ہو گیا گویا اس پر انار کے دانے بکھرے ہوئے ہیں۔ فرمایا "کیا تمہیں اس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟ یا تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے؟ اللہ کی کتاب کو باہم مت ٹکراؤ۔ دیکھو' تمہیں جس کام کا حکم دیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور جس کام سے منع کیا گیا ہے اس سے پرہیز کرو"۔[۹۲]

بنیادی مسائل میں غلطی پر تنبیہ کرتے ہوئے ناراضگی کا اظہار کرنے کی ایک مثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ ہے جس سے علم کے ماخذ کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ مسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اہل کتاب میں سے کسی

کے پاس سے ایک کتاب مل گئی' وہ نبی اکرم ﷺ کو پڑھ کر سنانے لگے تو حضور علیہ السلام غضبناک ہو گئے اور فرمایا : "خطّاب کے بیٹے! کیا تم لوگ بھی اس (شریعت) کے بارے میں ٹامک ٹوئیاں مارو گے؟ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' میں تمہارے پاس اجلی اور صاف شفاف شریعت لے کر آیا ہوں۔ تم ان (اہل کتاب) سے کچھ نہ پوچھو' ممکن ہے وہ تمہیں صحیح بات بتائیں اور تم اس کو جھٹلا دو یا وہ غلط بات بتائیں اور تم اسے سچ مان لو۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری پیروی کے بغیر چارہ نہ ہوتا"۔ (۹۳)

دارمی نے بھی یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تورات کا ایک نسخہ لے آئے اور کہا : "اے اللہ کے رسول! یہ تورات کا نسخہ ہے"۔ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھنا شروع کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک متغیر ہونا شروع ہو گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا : عمر' تو گُم ہو جائے' تم رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کی کیفیت نہیں دیکھ رہے؟" عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے رُوئے اَقدس پر نظر ڈالی تو (فوراً) بول اٹھے : "اللہ کی ناراضگی سے اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ ہم اللہ کے رب ہونے پر' اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' اگر موسیٰؑ بھی تمہارے سامنے آ جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرنے لگو' تو سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر وہ زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو ضروری میری پیروی کرتے۔ (۹۴)

اس حدیث کی تائید حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا : حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کے کچھ ورق لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا : یہ تورات کے کچھ ورق ہیں جو مجھے بنو زریق سے تعلق رکھنے والے اپنے ایک دوست سے ملے ہیں۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کی کیفیت تبدیل ہو گئی (یعنی غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے)۔ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ ـــــ جنہیں خواب میں اذان دکھائی گئی تھی ـــــ انہوں نے فرمایا : "کیا اللہ نے تمہاری عقل ختم کر دی ہے؟

کیا تم اللہ کے رسول ﷺ کے چہرۂ مبارک کی کیفیت نہیں دیکھ رہے؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا : "ہم اللہ کی ربوبیت پر، اسلام کے دین ہونے پر، محمد ﷺ کی نبوت پر اور قرآن کی امامت پر راضی ہیں"۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی ختم ہو گئی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا : "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، اگر موسیٰ (علیہ السلام) تمہارے درمیان موجود ہوں، پھر تم ان کی پیروی کرنے لگو اور مجھے چھوڑ دو، تو بہت زیادہ گمراہ ہو جاؤ گے۔ اُمتوں میں سے تم میرے حصہ میں آئے ہو اور نبیوں میں سے میں تمہارے حصہ میں آیا ہوں"۔ (۹۵)

اس واقعہ سے مربّی کا ایسا کردار سامنے آتا ہے جسے حاضرین کی تائید حاصل ہے، جنہوں نے مربّی کے چہرہ کے تاثرات دیکھ کر ایک موقف اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جسے نصیحت کرنا مقصود ہے وہ جب ان تمام امور کو بیک وقت ملاحظہ کرتا ہے تو اس کے دل پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا واقعہ کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو اس میں مندرجہ ذیل مراحل نظر آتے ہیں۔

۱) غلطی سامنے آنے پر جنابِ رسول اللہ ﷺ پر اس کا شدید اثر ہوا اور کلام فرمانے سے پہلے ہی آنحضرت ﷺ کے چہرۂ مبارک پر ناراضگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔

۲) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس چیز کو فوراً محسوس فرمالیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، اور انہوں نے فوراً اصلاح کر کے معذرت کی، اور اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہوئے اس بنیادی اصول کا اظہار فرمادیا کہ انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی مطلوب ہے اور وہ دین اسلام سے خوش ہیں۔

۴) نبی اکرم ﷺ نے جب دیکھا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی محسوس فرمالی ہے اور اس سے رجوع کرلیا تو حضور علیہ السلام کا چہرۂ مبارک خوشی سے دمکنے لگا۔

۵) نبی اکرم ﷺ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بنیادی اصول کی تائید فرمائی اور اس کی تاکید فرماتے ہوئے یہ واضح کیا کہ نبی اکرم ﷺ کی شریعت کی پیروی واجب ہے، اور

علم کے دوسرے نام نہاد مآخذ سے بچنا ضروری ہے۔

غلط کام دیکھ کر آنحضرت ﷺ کے ناراض ہو جانے کی ایک اور مثال صحیح بخاری میں مذکورہ واقعہ ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قبلہ کی طرف (دیوار پر) بلغم لگا دیکھا' حضور ؐ کو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا' حتیٰ کہ آپ ؐ کے چہرۂ مبارک سے اس کا اظہار ہوا۔ آپ ؐ نے اٹھ کر اپنے ہاتھ سے اسے کھرچ دیا اور فرمایا ۔ "جب کوئی نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے باتیں کر رہا ہوتا ہے اور اس کا رب اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کو قبلہ کی طرف ہرگز نہیں تھوکنا چاہئے بلکہ بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے تھوکنا چاہئے"۔ پھر آپ ؐ نے اپنی چادر کا ایک کونا پکڑ کر اس میں تھوکا' اور اس کے ایک حصہ کو دوسرے پر پلٹ دیا اور فرمایا : "یا اس طرح کر لے"۔ (۹۶)

نبی اکرم ﷺ کو جب ایک غلطی کا علم ہوا' جس کے نتیجہ میں ایک خرابی پیدا ہو رہی تھی' تو آنحضرت ﷺ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اس کی مثال صحیح بخاری کی وہ حدیث ہے جو حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ انصاری سے مروی ہے' انہوں نے فرمایا: ایک آدمی نے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا : "یا رسول اللہ! میں تو فلاں شخص کی وجہ سے فجر کی نماز سے پیچھے رہ جاتا ہوں (باجماعت ادا نہیں کر سکتا)' کیونکہ وہ بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے"۔ میں نے نبی اکرم ﷺ کو وعظ کے دوران کبھی اس قدر غصے میں نہیں دیکھا جتنے اس دن ناراض ہوئے۔ پھر فرمایا ۔ "لوگو! تم میں سے کچھ لوگ نفرت پھیلانے والے ہیں' جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے وہ مختصر (قراءت وغیرہ) کرے' ان میں بوڑھے' کمزور اور کام والے بھی ہوتے ہیں۔ (۹۷)

اگر مسئلہ پوچھنے والا آدمی حد سے زیادہ تکلّف کا شکار ہو اور خواہ مخواہ سختی میں گرفتار ہو تو مفتی کا اظہارِ غضب بھی اسی قبیل سے ہے۔ حضرت زید بن خالد جُہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اَعرابی خدمت نبوی میں حاضر ہوا' اور گری پڑی چیز کے بارے میں مسئلہ پوچھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ایک سال تک اس کا اعلان کر' اس کے بعد اس کا ظرف (مثلاً رقم کا بٹوہ وغیرہ) اور بندھن (یعنی کسی چیز سے باندھا گیا ہے) وغیرہ یاد

رکھ۔ اگر اس کا مالک آکر تجھے (نشانیاں) بتا دے (تو ٹھیک ہے' اس کی چیز اسے دے دی جائے)' ورنہ اسے خرچ کر لے"۔ اس نے کہا : "اے اللہ کے رسول! گم شدہ بکری ملے تو؟ فرمایا "وہ تیری ہے' یا تیرے بھائی کی ہے یا بھیڑیئے کی ہے"۔ اُس نے کہا . "اور گم شدہ اونٹ؟" آنحضرت ﷺ کا چہرۂ مبارک غصے سے تمتما اٹھا' فرمایا : "تجھے اس سے کیا غرض؟ اس کی مشک اور اس کے جوتے اس کے ساتھ ہیں' (چشموں سے) پانی پی لے گا اور درختوں سے (پتے وغیرہ) کھا لے گا!"(۹۸)

غلطی واقع ہونے پر یا اس کا علم ہوتے ہی' مربّی کا متوازن ردِّ عمل' جس کا اثر اس کی آواز اور اندازِ کلام میں ظاہر ہو رہا ہو' یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں برائی کے خلاف نفرت موجود ہے اور وہ اس پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس سے حاضرین کے دلوں میں اس برائی سے خوف پیدا ہو جاتا ہے اور مربی کی اس جذباتی کیفیت کا ان کے دلوں پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر غلطی پر پردہ ڈال دیا جائے یا ردِّ عمل ظاہر کرنے میں تاخیر کی جائے تو بعد میں اس پر تبصرہ کرنے سے مطلوبہ تاثیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

بعض اوقات حکمت کا تقاضا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غلط کام اور بڑی غلطی پر مشتمل کلام پر تبصرہ اُس وقت تک متأخر کر دیا جائے جب تک لوگوں کی مناسب تعداد جمع نہیں ہو جاتی۔ اس لئے کہ وہ معاملہ بہت اہم ہوتا ہے' یا سامعین کی تعداد اتنی نہیں ہوتی کہ تبصرہ سے مناسب فائدہ حاصل ہو' یا وہ زیادہ لوگوں تک بات پہنچا سکیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو بار تبصرہ کیا جائے' ایک بار فوری طور پر متعلقہ افراد کے سامنے وضاحت کر دی جائے اور دوسری بار مناسب وقت پر عوام کو بات سمجھا دی جائے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو زکوٰۃ وصدقات کی وصولی کے لئے روانہ فرمایا۔ اپنے فرائض کی انجام دہی سے فارغ ہو کر وہ صاحب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا : "یہ آپ لوگوں کا مال ہے (یعنی زکوٰۃ وصدقات) اور یہ مجھے تحائف ملے ہیں"۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا . "تُو اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھ رہا' پھر دیکھتا کہ تجھے تحائف ملتے ہیں یا نہیں؟"

اسی شام آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ارشاد فرمائی جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے' پھر فرمایا : "امابعد' کیا وجہ ہے کہ ہم ایک شخص کو عامل مقرر کرتے ہیں' تو وہ آکر ہمیں کہتا ہے : یہ مال آپ کی عائد کردہ ڈیوٹی کی ادائیگی سے (زکوٰۃ وغیرہ جمع کر کے) حاصل ہوا ہے اور یہ مجھے تحفہ میں ملا ہے۔ وہ کیوں نہ اپنے باپ کے اور ماں کے گھر میں بیٹھ رہا' پھر دیکھتا کہ اسے تحفے ملتے ہیں یا نہیں؟ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' جو شخص اِس مال میں خیانت کر کے کچھ لے گا وہ قیامت کو اسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے حاضر ہو گا۔ اگر اونٹ ہے تو اسے لے کر حاضر ہو گا' اور وہ اونٹ بلبلا رہا ہو گا' اگر گائے ہے تو اسے لے کر حاضر ہو گا' اور وہ رانبھ رہی ہو گی' اگر بکری ہے تو اسے لے کر حاضر ہو گا' اور وہ ممیا رہی ہو گی۔ میں نے (اللہ کا حکم) پہنچا دیا ہے"۔ حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ نے فرمایا : جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ اتنا بلند کیا کہ ہمیں آپ ؐ کی بغلیں نظر آنے لگیں"۔ (۹۹)

۲۶) غلطی کرنے والے سے بحث نہ کرتے ہوئے اعراض کر لینا تا کہ وہ خود ہی اصلاح کر لے :

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ رات کے وقت اپنی بیٹی فاطمہ اور علی رضی اللہ عنہما کے پاس تشریف لائے اور فرمایا : "تم لوگ نماز (تہجد) نہیں پڑھتے؟" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا : "ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں' وہ جب ہمیں اٹھانا (اور جگانا) چاہے گا' اٹھا دے گا"۔ (۱۰۰) ان کی یہ بات سن کر آنحضرت ﷺ کچھ کہے بغیر واپس پلٹ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ واپس جاتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مار کر فرما رہے تھے : ﴿ وَكَانَ الْإِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴾ "انسان سب سے زیادہ جھگڑالو مخلوق ہے"۔ (۱۰۱)

۲۷) غلطی کرنے والے کو زبانی تنبیہ کرنا :

جیسے رسول اللہ ﷺ نے حضرت حاطب (بن ابی بلتعہ) رضی اللہ عنہ کو عتاب فرمایا تھا' جب آپ ؐ کو معلوم ہوا کہ حاطب رضی اللہ عنہ نے قریش کے کافروں کو پیغام بھیجا ہے کہ مسلمان مکہ فتح

کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ۔ "حاطب! تو نے یہ کام کیوں کیا؟" انہوں نے کہا ۔ "میں اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہوں' اس میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہوا' (بات صرف اتنی ہے کہ) میں چاہتا تھا کہ ان لوگوں پر میرا کوئی احسان ہو' جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ میرے بچّوں اور مال کی حفاظت فرمائے"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ۔ "اس نے سچ کہا ہے' لہٰذا اسے کوئی بری بات نہ کہنا"۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا "اس نے اللہ کی' رسول کی اور مومنوں کی خیانت کی ہے' مجھے اجازت دیجئے کہ اسے قتل کر دوں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "عمر' تجھے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے بدر (کی جنگ میں شریک ہونے) والوں سے فرمایا ہے جو چاہو کرو' تمہارے لئے جنت واجب ہو چکی ہے"۔ حضرت عمر ؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' فرمایا "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں"۔ [۱۰۲]

اس واقعہ میں تربیت کے نقطہ نظر سے عظیم نکات ہیں ۔

۱) نبی اکرم ﷺ نے اس صحابی کو تنبیہ فرمائی جن سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی' چنانچہ فرمایا "تو نے یہ کام کیوں کیا؟"

۲) غلطی کرنے والے سے وہ سبب دریافت کرنا چاہئے جس کی بنا پر غلطی سرزد ہوئی' کیونکہ اس سے اس کے بارے میں اختیار کئے جانے والے موقف پر اثر پڑے گا۔

۳) جن حضرات کے بڑے کارنامے اور فضائل ہیں' وہ بھی گناہوں سے معصوم نہیں۔

۴) مربّی میں اپنے ساتھیوں کی غلطیاں برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے' تاکہ وہ صحیح راہ پر قائم رہ کر اس کا ساتھ دیتے رہیں' کیونکہ مقصد ان کی اصلاح ہے نہ کہ انہیں اپنے پاس سے بھگا دینا۔

۵) تربیت کرنے والے کو اس بات کا احساس کرنا چاہئے کہ کسی ساتھی پر وقتی طور پر انسانی کمزوری کا غلبہ ہو سکتا ہے اور اگر کسی پرانے رفیق سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کا سختی سے مواخذہ نہ کیا جائے۔

۶) اگر غلطی کرنے والا دفاع کا مستحق ہو تو اس کا دفاع کیا جائے۔

۷) غلطی کو بہت بڑی یا معمولی قرار دیتے وقت اور غلطی کرنے والے کے بارے میں

موقف طے کرتے وقت اس کی گزشتہ بڑی بڑی نیکیوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

۲۸) غلطی کرنے والے کو ملامت کرنا :

بالکل واضح غلطی پر خاموشی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا غلطی کرنے والے کو بغیر کسی تمہید کے براہ راست ملامت کی جا سکتی ہے' تاکہ وہ اپنی غلطی کا احساس کرے۔ صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں میرے پاس ایک اونٹنی تھی جو جنگِ بدر کے مال غنیمت میں سے میرے حصے میں آئی تھی۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خُمس میں سے بھی مجھے ایک اونٹنی دی تھی۔ جب میں نے چاہا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو (نکاح کے بعد) اپنے گھر لاؤں تو میں نے بنو قینقاع کے ایک سنار کے ساتھ طے کیا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گا' اور ہم اذخر گھاس لا کر سناروں کے ہاتھ فروخت کریں گے۔ میں اس کے ذریعے اپنے ولیمہ کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔ ابھی میں اپنی اونٹنیوں کے لئے پالان' بورے اور رسیاں وغیرہ جمع کر رہا تھا اور میری اونٹنیاں ایک انصاری کی دیوار کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں جو کچھ جمع کر سکا' لے کر واپس آیا تو دیکھا کہ کسی نے میری اونٹنیوں کے کوہان کاٹ لئے ہیں' اور پیٹ پھاڑ کر جگر نکال لئے ہیں۔ میں نے جب ان کا یہ حال دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا : یہ کام کس نے کیا ہے؟ لوگوں نے کہا : "حمزہ بن عبد المطلب نے کیا ہے' اور وہ اس گھر میں کچھ انصاریوں کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف ہیں"۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ کے پاس حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے چہرے سے میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ آپ نے فرمایا : "کیا ہوا؟" میں نے کہا : "یارسول اللہ! مجھ پر آج جیسی مصیبت کبھی نہیں آئی۔ حمزہ نے میری اونٹنیوں کے کوہان کاٹ دیئے ہیں اور پیٹ پھاڑ دیئے ہیں۔ وہ اس گھر میں ہیں' ان کے ساتھ کچھ لوگ شراب نوشی میں مصروف ہیں"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر طلب فرما کر اوڑھ لی' پھر چل پڑے۔ میں اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ حتیٰ کہ حضور اس گھر تک جا پہنچے جہاں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (اندر آنے کی)

اجازت طلب کی' انہوں نے اجازت دے دی۔ دیکھا کہ وہ لوگ پی رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حمزہ رضی اللہ عنہ کو ان کے اس کام پر ملامت کرنا شروع کر دی۔ دیکھا تو حمزہ کی آنکھیں نشے کی وجہ سے سرخ ہو چکی تھیں۔ حمزہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا' پھر (مشکل سے) نظر اٹھائی تو آنحضرت ﷺ کے گھٹنے پر نظر پڑی' پھر نظر اٹھائی تو آنحضرت ﷺ کے شکم مبارک تک نظر اٹھی' پھر نظر اٹھا کر چہرۂ اقدس کی طرف دیکھا' پھر حمزہ رضی اللہ عنہ بولے : "تم لوگ تو میرے باپ کے غلام ہو"۔ رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ وہ نشے میں ہیں' (لہٰذا ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں)' چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ اُلٹے پاؤں لوٹ آئے اور ہم لوگ بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہی وہاں سے چلے آئے۔[۱۰۳] یہ واقعہ شراب نوشی حرام ہونے سے پہلے کا ہے۔

۲۹) غلطی کرنے والے سے بے اعتنائی :

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حُمَید رضی اللہ عنہ سے روایت کی' انہوں نے کہا : ولید رحمۃ اللہ علیہ میرے پاس اور میرے ایک دوست کے پاس آئے' اور ہمیں کہا : "آؤ چلیں' تم دونوں مجھ سے عمر میں کم ہو اور حدیث مجھ سے زیادہ یاد رکھ سکتے ہو"۔ وہ ہمیں بشر بن عاصم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لے گئے اور انہیں کہا "ان دونوں کو اپنی حدیث سنایئے۔" بشر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا : "ہمیں عقبہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے حدیث سنائی...

ابو النصر لیثی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "بہز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا : وہ ان کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے' انہوں نے فرمایا جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک فوجی دستہ روانہ فرمایا۔ انہوں نے ایک جماعت پر حملہ کیا۔ ان میں سے ایک آدمی الگ ہو کر ایک طرف ہو گیا۔ لشکر کے ایک آدمی نے تلوار سونت کر اس کا تعاقب کیا۔ الگ ہونے والے نے کہا : "میں مسلمان ہوں"۔ تعاقب کرنے والے نے اس کی بات پر توجہ نہ دی اور اس پر وار کر کے اسے قتل کر دیا۔ عقبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ بات رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوئی تو حضور علیہ السلام نے اس کے بارے میں سخت الفاظ ارشاد فرمائے۔ قاتل کو آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی خبر پہنچی (وہ آ گیا)' رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے' قاتل نے عرض کیا "یا رسول

اللہ! اس (مقتول) نے جو بات کہی تھی وہ جان بچانے کے لئے کہی تھی"۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف سے اور اُدھر بیٹھے ہوئے افراد کی طرف سے منہ پھیرلیا اور خطبہ ارشاد فرماتے رہے۔ اُس نے دوبارہ کہا : "یارسول اللہ! اُس نے جو بات کہی تھی وہ جان بچانے کیلئے کہی تھی"۔ حضور علیہ السلام نے دوبارہ اس کی طرف سے اور اُدھر بیٹھے ہوئے افراد کی طرف سے منہ پھیرلیا اور خطبہ ارشاد فرماتے رہے۔ اُس نے تیسری بار کہا : "اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! اُس نے صرف قتل سے بچنے کیلئے یہ بات کہی تھی"۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو آپؐ کے چہرۂ مبارک سے ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ آپؐ نے تین بار فرمایا : ((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَبٰی عَلٰی مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا)) "جو شخص مومن کو قتل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس (کی بات ماننے) سے انکار فرماتے ہیں"۔ (۱۰۴)

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نجران سے ایک صاحب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے اِعراض فرمایا اور ارشاد فرمایا : "تو میرے پاس آیا ہے جب کہ تیرے ہاتھ میں آگ کا انگارہ ہے"۔ (۱۰۵)

مسند احمد میں حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے، انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما) سے روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو سونے کی انگوٹھی پہنے دیکھا تو اُس سے اِعراض فرمایا۔ اُس نے وہ اتار کر لوہے کی انگوٹھی بنوالی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "یہ زیادہ بُری ہے، یہ تو اہلِ جہنم کا زیور ہے"۔ اُس نے وہ بھی اتار دی اور چاندی کی انگوٹھی بنوالی۔ اس پر آنحضرت ﷺ خاموش رہے۔ (۱۰۶)

حواشی

(۸۸) متفق علیہ۔ فتح الباری، حدیث ۴۱۴۱

(۸۹) المجتبیٰ سنن نسائی، کتاب آداب القضاۃ ۸/ ۲۴۳

(۹۰) مسند احمد ۵/ ۳۳۸

(۹۱) سنن ابن ماجہ، ۸۵۔ زوائد میں ہے "یہ سند صحیح ہے، اس کے راوی ثقہ ہیں"۔ صحیح ابن ماجہ میں

ہے "حسن صحیح ہے" حدیث۲۹

(۹۲) السنہ لابن ابی عاصم' تحقیق البانی' حدیث۴۰۶۔ انہوں نے کہا: "اس کی سند حسن ہے"۔

(۹۳) مسند احمد ۳۸۷/۳۔ البانی نے اس حدیث کو اس کے شواہد کے پیش نظر حسن قرار دیا ہے۔ دیکھئے ارواءالغلیل' حدیث۱۵۸۹

(۹۴) سنن دارمی ۴۴۱۔ مقدمہ۔ باب مایتقی من تفسیر حدیث النبی ﷺ وقول غیرہ عند قولہ ﷺ کتاب کے محقق عبداللہ ہاشم یمانی نے فرمایا: اسے احمد نے حسن سند سے اور ابن حبان نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔

(۹۵) ہیثمی نے فرمایا: "اسے طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابوعامر قاسم بن محمد اسدی ہے' اس کے حالات مجھے نہیں ملے' باقی تمام راوی ثقہ ہیں" مجمع ۱۷۴/۱

(۹۶) فتح الباری' ۴۰۵

(۹۷) صحیح بخاری مع فتح الباری' ۱۵۹۷

(۹۸) صحیح بخاری مع فتح الباری ۲۴۳۶

(۹۹) فتح الباری' ۶۶۳۶

(۱۰۰) حضرت علی ؓ کے کلام کی متعدد توجیہات ممکن ہیں۔ دیکھئے فتح الباری ۷ ۳۴۷

(۱۰۱) فتح الباری ۶۲۵۹

(۱۰۲) فتح الباری ۶۲۵۹

(۱۰۳) فتح الباری' ۳۰۹۱

(۱۰۴) مسند احمد ۲۸۹/۵ نیز ملاحظہ فرمایئے سلسلہ احادیث صحیحہ ۳۰۹/۲

(۱۰۵) مجتبیٰ ۱۷۰/۸' صحیح سنن نسائی ۴۷۹۳۔ مسند احمد میں یہ واقعہ حضرت ابو سعید خدری ؓ ہی کی روایت سے بالتفصیل مذکورہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں "نجران سے ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اُس نے سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے اُس سے اِعراض فرمایا اور اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ آدمی نے اپنی بیوی کو یہ بات بتائی۔ اُس نے کہا ضرور کوئی بات ہے' دوبارہ خدمت اقدس میں حاضر ہو۔ اس نے انگوٹھی اور وہ جبہ جو پہنا ہوا تھا' اتار کر حاضری دی۔ اُس نے (پہنچ کر) اجازت طلب کی' تو اجازت مل گئی۔ اس نے سلام عرض کیا۔ آنحضرت ﷺ نے سلام کا جواب دیا۔ اُس نے کہا: یارسول اللہ! جب میں پہلے آیا تھا

تو آپ نے بے اعتنائی فرمائی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : تو ہاتھ میں آگ کا انگارہ پہن کر آیا تھا"۔ وہ آدمی بحرین سے کچھ زیورات لایا تھا۔ اُس نے کہا : "یارسول اللہ! میں تو بہت انگارے لے آیا ہوں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تیرے لائے ہوئے مال کا ہمیں اتنا ہی فائدہ ہے جتنا حرہ (مقام) کے پتھروں کا ہوتا ہے' لیکن یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے"۔ اُس نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں میرا عذر بیان فرمادیجئے' وہ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے کھڑے ہو کر وضاحت فرمادی کہ اس شخص کے ساتھ یہ رویّہ اس کی سونے کی انگوٹھی کی وجہ سے تھا"۔ (مسند ۱۴/۳)

(۱۰۶) مسند ۱۶۳۔ تحقیق احمد شاکر حدیث ۶۵۱۸۔ انہوں نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔

بقیہ : دُعا

جس پر یہ راز کھل گیا اس پر کشادو فلاح کے سارے دروازے کھل گئے' وہ شخص راز پا گیا جسے معلوم ہوا کہ میں کچھ نہیں سب کچھ میرا پروردگار ہے۔ پھر سب کچھ اسی کا ہو جاتا ہے' ارض بھی' سما بھی' بندے بھی اور خدا بھی!

دُعا یہی سلیقہ سکھاتی ہے۔ آیئے ہم سب اللہ کے حضور التجا کریں' بارِ الٰہا' ہم بھی تیرے' یہ کائنات بھی تیری' یہ وسائل رزق بھی تیرے' یہ ذرائع علم بھی تیرے' یہ کیفیات قلب و دماغ بھی تیری' اور یہ ملک بھی تیرے نام کا صدقہ ہے۔ تو ہمیں اپنا بنا لے' کائنات کو ہمارے لئے موم کر دے' وسائل رزق کو سب کے لئے عام کر دے' ذرائع علم سے ہر ایک کو فیض پہنچا اور اس ملک کی لاج اپنے نام کے صدقے رکھ لے' اسے کسی کا محتاج نہ بنا' اس کو وجود بخشا ہے تو اسے شناخت بھی عطا فرما' آمین ۔

تِشنہ لب چڑیا کے منہ میں گر نمی آ جائے گی!
تیرے دریائے کرم میں کیا کمی آ جائے گی!

فکرِ عجم

آیت اللہ خمینی کی جدّ و جہد

بسلسلہ علّامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۱۴)

ڈاکٹر ابو معاذ

فکرِ عجم کے عنوان سے اہم تاریخی معلومات پر مبنی یہ سلسلۂ مضمون گزشتہ قریباً ایک سال سے قسط وار "میثاق" میں شائع ہو رہا ہے۔ توقع ہے کہ مزید کم از کم دس اقساط میں یہ مضمون مکمل ہو سکے گا۔ یہاں یہ وضاحت ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مضمون کے مندرجات کو بحیثیت مجموعی مفید خیال کرنے کے باوجود مضمون نگار کی تمام باتوں سے ہم اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے بیان کردہ بعض افکار سے جزوی اختلاف کے باوجود مضمون کی علمی افادیت کے پیش نظر ہمارے نزدیک اس کی اشاعت مفید مطلب ہے۔ (ادارہ)

ان دنوں آیت اللہ روح اللہ خمینی قم کی اسلامی درسگاہ میں شرع، فلسفہ اور روحانیت کے اُستاد تھے اور ۱۹۶۲ء میں آیت اللہ العظمٰی بروجردی کی وفات کے بعد انہوں نے نئے آیت اللہ العظمٰی کی حیثیت سے شیعہ دُنیا میں شہرت حاصل کی۔ آپ نے یہ بھانپ لیا تھا کہ ملک کا بادشاہ دین کو ریاست سے علیحدہ کر کے تیزی سے مغربیت کی اندھی تقلید کی جانب قدم بڑھا رہا ہے اور یہودیت اور سامراجیت کا مکمل طور پر آلۂ کار بن چکا ہے۔ آیت اللہ خمینی نے انتہائی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آوازِ حق بلند کی۔ اسی دوران ۱۹۶۱ء کی آئینی تبدیلیوں کے نتیجہ میں عورتوں کو ووٹ کا حق عطا ہوا۔ اسی طرح سرکاری عمال کو حلف برداری کیلئے قرآن پاک کی بجائے اپنی پسند کی کسی بھی مذہبی کتاب (جس کا وہ پیرو کار ہو) پر حلف اٹھانے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح جداگانہ انتخابی نظام کو ختم کر کے ایک غیر مسلم امیدوار کو بھی مسلمان ووٹوں کا حصول ممکن بنا دیا گیا۔ عورتوں

اور مردوں کو برابری کے حقوق دیئے جانے کو بھی آیت اللہ خمینی نے تباہی' بدعنوانی اور قحبہ گیری کے دروازے کھل جانے پر محمول کیا۔ ان آئینی تبدیلیوں سے قبل وہ بھی باقی روایتی مذہبی رہنماؤں کی طرح شاہ کے حامی اور مؤید سمجھے جاتے تھے۔ جب شاہ نے ۱۹۶۲ء کے مقامی کونسلوں کے انتخاب میں علماء کے دباؤ پر عورتوں کو ووٹ کے برابر کے حقوق دینے کا قانون واپس لیا تو خمینی نے شاہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ نے قرآنی تعلیمات کی پاسداری کی ہے۔ انہوں نے شاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شاہ کی وفاداری کیلئے لوگوں سے درخواست کی کیونکہ شاہ ان کی نظر میں (اُس وقت) آئین' آزادی اور ملک کے تحفظ کے سرپرست کی حیثیت رکھتا تھا۔

لیکن ۱۹۶۲ء میں اپنے نام نہاد انقلابِ سفید کے ذریعہ شاہ نے جب مذہبی رہنماؤں کی پوزیشن پر کاری ضرب لگانا چاہی اور لوگوں سے زمینیں چھیننا چاہیں تو آیت اللہ خمینی نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے ایک بار پھر عورت کے ووٹ کے حق کی مخالفت کی۔ انہوں نے شاہ سے مطالبہ کیا کہ ۱۹۰۶ء کے آئین کو امام غائب کے ظہور تک اپنی اصلی حالت ہی میں برقرار رہنے دیا جائے۔ عورت کے ووٹ کی مخالفت کے علاوہ خمینی نے عورتوں کے سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں کام کرنے کی بھی مخالفت کی کیونکہ ان کے نزدیک اس سے جنسی بے راہ روی اور فحاشی پھیلنے کا خطرہ تھا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۶۳ء کو عیدِ نوروز کے موقع پر قم کے مدرسہ فیضیہ میں عوام کے پُرجوش اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دیگر مطالبات کو دُہراتے ہوئے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا :

"ایران کی جابرانہ شخصی حکومت نے اسلام کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ حکومت اٹھارہ برس کی لڑکیوں کو زبردستی فوجی ڈیوٹی کے لئے لے جانا چاہتی ہے۔ یہ پاکباز خواتین کو فحاشی کی جانب دھکیل رہی ہے۔ غیر ملکی کفار کا نشانہ اب قرآن حکیم اور علماء اسلام ہیں اور شاہ ان کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ یہ ہمیں تباہ و برباد اور قید کر کے امریکی اور اسرائیلی یہودیوں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ آج کا دن ایران بھر میں یومِ ماتم کے طور پر مناتے ہوئے میں اس حکومت کے خاتمے کی فیصلہ کن جدوجہد کا اعلان کرتا ہوں تاکہ ایک اسلامی اصولوں پر مبنی حکومت

بر سر اقتدار آسکے جسے ایرانی عوام سے ہمدردی ہو۔"

پھر شاہی فوج مدرسہ فیضیہ میں داخل ہو گئی۔ اس کی ظالمانہ کارروائی کے نتیجہ میں ایک درجن افراد مارے گئے اور سو کے قریب لوگ بری طرح زخمی ہو گئے۔ اس کے جواب میں ایران کی تاریخ میں پہلی بار آیت اللہ العظمیٰ نے عوام سے شاہی حکومت کی برطرفی کی تحریری طور پر اپیل کی۔ اب محرم کا مہینہ آنے والا تھا۔ انہوں نے ایران کی ایک لاکھ بیس ہزار مساجد کے ائمہ کو اپنا فرمان ارسال کیا اور پہلوی بادشاہ کی صورت میں یزیدِ وقت کے ظالمانہ اقدام کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں جو محرم کے ماتمی جلوس تہران اور دیگر شہروں میں نکلے ان میں سیاسی عنصر غالب نظر آنے لگا۔ عاشورہ کے موقع پر خمینی نے ایک بار پھر سخت الفاظ میں اپنے مطالبات دُہرائے اور ان کی تقریر نے ملک بھر میں آگ لگا دی۔ اب زبردست مظاہرے شروع ہو گئے۔ قم میں ایک دن میں فوج کے ذریعہ حالات پر قابو پا لیا گیا مگر تہران میں تین دن تک عوام اور فوج کا زبردست مقابلہ جاری رہا۔ مذہبی راہنماؤں کے مطابق اس دوران پندرہ ہزار افراد مارے گئے جب کہ شاہ کے مطابق مرنے والوں کی تعداد چھپّن (۵۶) تھی۔

شاہ نے کمیونسٹ عناصر اور رجعت پسند علماء کے باہمی اتحاد کے الزامات عائد کرتے ہوئے عہد کیا کہ انقلاب کا راستہ روکنے والوں کا صفایا کر دیا جائے گا۔ اس سے پہلے وہ آیت اللہ خمینی پر مصر کے صدر ناصر کے ایجنٹ ہونے کا الزام بھی عائد کر چکا تھا۔ روسی خبر رساں ایجنسیوں نے نہ صرف ان واقعات کے خلاف طرح طرح کی باتیں بنائیں بلکہ اس تحریک کو رجعت پسند علماء کی جدوجہد قرار دیا۔ فرانسیسی رسالے "لی مونڈ" (Le Monde) کے ایک مضمون کے مطابق "اگرچہ علماء کی اکثریت تاجروں اور زمینداروں کے مسائل سے لاتعلق ہے لیکن خمینی اور ان کے پیروکاروں کا رویہ ان سے قطعاً مختلف ہے"۔ اس طرح دراصل آیت اللہ خمینی جو بات کر رہے تھے وہ عوام کے دلوں کی بات تھی۔ ان انقلابی مساعی کے نتیجہ میں جناب خمینی گرفتار کر لئے گئے۔ اس پر تمام آیت اللہ تہران میں جمع ہوئے اور شاہ کو پیغام بھجوایا کہ وہ غیر ذمہ دارانہ اقدام سے گریز کرے۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں انہیں رہا کر دیا گیا اور وہ قم واپس چلے گئے۔

اب خمینی کی تقاریر عوام کے مسائل کے بارے میں عوام کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ انہوں نے ۴ جون ۱۹۶۴ء کو یومِ ماتم منانے کا اعلان کیا لیکن اس کے لئے جو بلیٹن شائع کیا گیا اس پر صرف دو تین آیت اللہ حضرات کے دستخط موجود تھے' کیونکہ مذہبی رہنماؤں کی اکثریت یا تو اس سے قطعی طور پر لا تعلق تھی یا پھر اس کی اشاعت کی مخالف تھی۔ اس طرح ۴ جون کو آیت اللہ خمینی وسیع پیانے پر عوام کو میدان میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس دوران ایک سرکاری بل پاس ہوا جس کے تحت ایران میں مقیم امریکیوں پر ایران کے قانون کی پابندی کی ضرورت باقی نہ رہی اور ایران میں قیام کے دوران انہیں ڈپلومیٹک تحفظ (Diplomatic security) حاصل ہو گیا۔ عوام کے غم و غصہ کی ترجمانی کرتے ہوئے آیت اللہ خمینی نے ۲۶/ اکتوبر ۱۹۶۴ء کے دن (جب شاہ اپنی پینتالیسویں سالگرہ کا جشن منا رہا تھا) ایک تقریر میں اس بل کی سخت مخالفت کرتے ہوئے ملک میں پھیلتی ہوئی بے حیائی اور فحاشی کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی اور صاف لفظوں میں اس حکومت کو امریکی آلۂ کار قرار دیا۔

۴ نومبر ۱۹۶۴ء کو آیت اللہ خمینی کو ساوک نے قُم سے گرفتار کر لیا اور مہر آباد ایئر پورٹ سے خصوصی پرواز پر ترکی پہنچا دیا۔ وہاں سے وہ عراق چلے گئے جہاں چودہ برس تک نجف میں مقیم رہے۔ جلاوطنی کے چند ہی یوم بعد ان کے پیرو کاروں کے ایک گروپ نے (جو فدائینِ اسلام کے نام سے موسوم تھا) ملک کے وزیر اعظم حسین منصور کو قتل کر دیا۔ پھر آخر میں سید جمال الدین کی طرح خمینی کو پیرس جانا پڑا۔ پیرس کے قیام کے دوران بین الاقوامی پریس اور دیگر خبر رساں ایجنسیوں نے خمینی کے پیغامات کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔

چونکہ گزشتہ قاچاری دور میں علماء کو وسیع پیانے پر زمینیں اور جاگیریں دی گئیں تھیں اس لئے وہ بھی جاگیردارانہ طبقہ میں شامل تھے' اور ذاتی مفادات پر زد پڑنے کی وجہ سے ان کی شاہ کے انقلابِ سفید کی مخالفت کو لوگ قدرے شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مزید برآں ملک کے روشن فکر دانشور اس کے باوجود کہ وہ شاہ کے مخالف تھے عورتوں

کے ووٹ کے حق کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ مہدی بازرگان کی تحریک آزادی نے اس لئے آیت اللہ خمینی کا ساتھ دیا تھا کیونکہ یہ لوگ شاہ کے مخالف تھے۔ ان تمام عوامل کے باوجود یہ تحریک بھی دب کر رہ گئی اور اگلے پندرہ برس ڈاکٹر علی شریعتی ' مجاہدینِ خلق ' فدائینِ خلق اور خود جناب خمینی کو اپنے اپنے انداز میں شاہی نظام کے خلاف سخت جدوجہد کرنا پڑی جس کے نتیجہ میں ایران میں انقلاب کی راہ ہموار ہو سکی۔

مجاہدین خلق : راہِ حق کے مجاہد

پہلوی استبدادی نظام نے آزادیٔ رائے کے اظہار کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں اور جمہوری جدوجہد کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ ایسے میں کچھ متدین نوجوان اُٹھے اور انہوں نے فکری تربیت سے مہم کا آغاز کیا۔ اس اجتماعیت کے اراکین پر لازم تھا کہ پہلے وہ قرآن پاک پڑھیں ' اسے سمجھیں ' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نہج البلاغہ کو سمجھیں ' اسلامی اور ایرانی تاریخ کا مطالعہ کریں اور اس کے ساتھ گوریلا جنگ کے لئے عسکری تربیت حاصل کریں۔ ارکان کا انتخاب بڑی مشکل سے ہوتا تھا اور پھر انہیں دو برس تک متواتر مذہبی اور عسکری تربیت دی جاتی تھی۔ اس تحریک کے پانچ بانی اراکین تھے جو تہران یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے ' ان کا قائد ستائیس سالہ حنیف نجاد تھا۔ اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ یہ لوگ مہدی بازرگان کی تحریک آزادی سے متأثر تھے اور آیت اللہ محمود طالقانی نے انہیں مذہبی تعلیم و تربیت کی ضرورت کا قائل کیا تھا۔ حنیف نجاد نے امام خمینی کی ۱۹۶۳ء کی جدوجہد میں بھی حصہ لیا تھا اور جیل میں طالقانی کی رفاقت میں قرآن کے انقلابی پیغام سے گہری واقفیت حاصل کی تھی۔ باقی چار بانی ارکان میں سے سعید محسن (سفید پوش گھرانے کے انجینئر) ' علی اصغر بدیع زادگان (تہران یونیورسٹی میں کیمسٹری کے استاد) اور احمد رضائی (سکول ٹیچر جن کے تین بھائی اور ایک بہن بعد میں ساوک کے ہاتھوں شہید ہوئے) کے نام آتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی مہم کا آغاز وہیں سے کیا جہاں مرزا کوچک خان نے چھوڑا تھا۔ یہ لوگ اسلامی جذبے سے سرشار تھے اور جبر و استبداد ' سرمایہ داری ' استعماریت اور روایتی مذہبی قیادت (شاہ پسند) کے مقابلہ میں میدانِ عمل

میں اترے تھے۔

ان لوگوں کا خیال تھا کہ ایرانی عوام نے کبھی بھی سرفروشی اور قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا۔ ماضی میں انقلابی تحریک کی ناکامی کی وجہ دراصل مناسب مذہبی تربیت کی کمی' راہ عمل اور منزل مقصود کا صحیح تعین نہ ہونا اور قیادت کا فقدان تھا۔ لوگ ایک آدھ وزیر کو قتل کرکے یا اعلیٰ عہدہ پر فائز کسی ایک شخص کو عہدے سے ہٹا کر مطمئن ہو جاتے تھے اور طویل المیعاد مقاصد کے حصول سے بے خبر تھے۔ پہلی تحریکوں میں لوگ مذہبی جذبات تو رکھتے تھے مگر مذہبی نظریات سے قطعاً بے خبر تھے' یہ لوگ فکری اعتبار سے خام تھے۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ اسلام کے بنیادی نظریات کی وضاحت کی جائے۔ مثلاً یہ کہ انسان کیا ہے؟ اسلام کے معاشی پہلو کیا ہیں؟ اسی طرح موجودہ افکار و حالات کی رُو سے کافر اور منافق کی اصطلاحات کی وضاحت کی جائے۔ اسی طرح دُنیا کے آغاز اور اس کے منتہائے مقصود کا علم ہو اور تاریخ کے فلسفے کو بیان کیا جائے۔

گزشتہ تحریکوں میں قیادت اور انتظامی ڈھانچے کا فقدان بھی تھا۔ تحریک میں ایک آدھ قائد ہوتا تھا اور اس کے خاتمے سے تحریک دم توڑ جاتی تھی۔ مرزا کوچک خان اور ڈاکٹر محمد مصدق کی مثال ان کے سامنے تھی۔ اسی طرح ان تحریکوں کی قیادت کو سماجی معاملات' انقلاب کی صحیح غرض و غایت' انقلابی تحریک میں مزاحمت کے پہلو اور اس کی مقصدیت کا علم نہیں تھا۔

دینی تربیت حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں نے فکری اور عسکری تربیت کی جانب توجہ دی اور اردن میں شاہ حسین کے خلاف لڑنے والے فلسطینیوں کے کیمپوں میں ۱۹۷۱ء میں جاکر جنگی تربیت حاصل کی۔ جب ان لوگوں کی تعداد دو سو تک پہنچ گئی تو انہوں نے محمود اصغری زادہ کی قیادت میں تہران میں بجلی کے نظام کو نقصان پہنچایا۔ شاہ کے ایک امریکی فوجی مشیر اور تہران پولیس کے سربراہ کو قتل کر دیا۔ کوکا کولا فیکٹری کی عمارات کو بم سے اڑایا۔ ایک ہوائی جہاز کو اغوا کرنے کی ناکام کوشش بھی کی اور صدر نکسن کی ۱۹۷۲ء میں ایران آمد کے موقع پر متعدد مقامات پر بم دھماکے بھی کئے۔

۱۹۷۲ء میں انہیں اس وقت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا جب تودہ پارٹی (کمیونسٹ پارٹی)

کے قیدی رکن شاہ مراد دلفائی نے ساوک کی حراست میں ان کے بعض اہم ارکان کی نشاندہی کی۔ یہ سب قید ہوئے۔ دو وقتی طور پر بھاگ نکلے اور نوے افراد نے اللہ اکبر' استعمار مردہ باد اور شاہ مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے شاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی حالت میں موت کو قبول کرلیا۔

مجاہدین نے جب تاریخ کا مطالعہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ گزشتہ کئی صدیوں سے مفاد پرست' ابن الوقت اور ہوس کے پجاری علماء نے اسلام کی غلط توجیہات پیش کرکے صحیح توحیدی معاشرے کو قائم ہی نہیں ہونے دیا بلکہ اسلام کی تعلیمات کو توہمات کے خول میں بند کرکے ظالمانہ بادشاہت اور استبدادی نظام کے استحکام میں مدد دی ہے۔ قرآن پاک کی غلط توجیہات سے معاشرے کو گہری نیند سلانے کی کوشش کرتے ہوئے ان لوگوں نے اسلام کی صحیح روح سے لوگوں کی توجہ ہٹائے رکھی ہے۔ اس طرح مجاہدین کی نظر میں آج جو اسلام کی شکل نظر آرہی تھی وہ اُس اسلام سے بالکل مختلف تھی جو رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں جب مہدی رضائی پر گرفتاری کے بعد مقدمہ چلایا گیا تو ان سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کس جہاد کی بات کررہے ہیں؟ جہاد یا تو اپنے نفس کے خلاف ہوتا ہے یا پھر کافروں کے خلاف؟ ہرچند کہ مہدی رضائی کو موت کی نیند سلا دیا گیا مگر حکومت وقت کی اصلیت سامنے آگئی کیونکہ علماء کی شہ پر بادشاہ خود کو ظلّ اللہ' خلیفۃ اللہ اور اسلام کا سرپرستِ اعلیٰ سمجھتے ہوئے حق کی آواز کو دباتے رہے ہیں۔

مجاہدین کے خیال میں حضرت علی علیہ السلام کی پیشین گوئی اب پوری ہو چکی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب قرآنی مطالب کو مسخ کردیا جائے گا' اسلام کا فقط نام باقی رہ جائے گا' قرآن کے کاغذ پر حروف ہی رہ جائیں گے اور اس کی اصل روح ختم ہو جائے گی۔ مجاہدین کے تصورات کے مطابق تاریخ کے مختلف ادوار میں تمام تر کامیاب انقلاب تو پیغمبروں نے برپا کئے تھے۔ انہوں نے کمزوروں (مستضعفین) کو روئے زمین کی حکومت عطا کی تھی۔ انہوں نے تاریک ادوار میں مساواتِ انسانی کا تصور پیش کیا تھا۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے مطابق "ہم نے انبیاء کو واضح دلائل کے ساتھ کتاب اور میزان دے کر بھیجا تاکہ لوگ اٹھ کھڑے ہوں اور انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کریں"۔ خدا کے دشمنوں

نے انبیاء کے راستوں کو مسدود کرنے کی کوشش کی تھی اور اس خوف سے کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت ان کا کہیں ساتھ دینے پر نہ اتر آئے انہوں نے انبیاء کے ساتھیوں کو قتل کرنے یا قید و بند کی صعوبات دینے میں تامل سے کام نہیں لیا تھا۔ علاوہ بریں انبیاء کے مشن کے خلاف غلط پراپیگنڈہ کیا گیا تھا تاکہ لوگوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کر کے انبیاء کو ان سے الگ تھلگ کر دیا جائے۔ موجودہ ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی رجعت پسندانہ سیاسی نظام کو بچانے کے لئے بادشاہوں اور حکومتوں نے علمائے سُوء کی سرپرستی کرتے ہوئے اس امر کی ہر ممکن کوشش کی کہ اسلام کے سماجی انصاف پر مبنی نظام کو قائم ہونے سے روکا جاسکے اور لوگوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا جائے۔ بادشاہِ وقت اور اس کی زیرِ سرپرستی زندگی بسر کرنے والے علماء کو اس بات کا خوف لاحق رہا ہے کہ اگر کہیں اسلام کی صحیح روح بیدار ہونے لگی تو پیشہ ور مُلّا اپنے اثر و رسوخ سے محروم ہو جائیں گے چنانچہ یہ ایک فطری عمل تھا کہ بادشاہ وقت اس بات کا پراپیگنڈہ کرواتا کہ "مجاہدین خلق اور ان کا ساتھ دینے والے علمائے حق مارکسسٹ' دہشت گرد اور گمراہ ہیں' اس لئے وہ قابل گردن زدنی ہیں"۔

مجاہدین نے اس کا جواب یوں دیا کہ مکر و فریب کی آڑ میں شاہ کے اسلام کے سرپرست اعلیٰ ہونے کے تمام دعوے یزید کے دعووں کی طرح ہیں اور انہی دعووں کی آڑ میں تیرہ سو برس قبل خلافت کی بجائے ملوکیت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اور آہستہ آہستہ عالمِ اسلام میں وہ لوگ برسراقتدار آگئے تھے جنہوں نے زمانہ قبل از اسلام کے شاہانِ فارس و روم کے روپ میں جبر و استبداد کا نظام قائم کر دیا تھا۔ مجاہدین خلق نے کہا کہ زبان سے تو شاہ ایران اسلام کی بات کر رہا ہے مگر یہودیوں کو اس لئے پٹرول دے رہا ہے کہ وہ مظلوم فلسطینیوں پر بمباری کر سکیں۔ دوسری جانب وہ ڈھائی ہزار سالہ ایرانی بادشاہت کے جشن مناتے ہوئے سربراہانِ مملکت کو فرانس کی پچاس سال پرانی شراب پیش کر رہا ہے۔ حق گوئی کی پاداش میں جناب خمینی کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنا کر جلاوطنی کی سزا دینے کا نام ہی کیا اسلام ہے؟ شاہ جس اسلام کا نام لے رہا ہے یہ استعماریت کا اسلام ہے۔ استعماری طاقتیں اسلام کے نام پر ہی غلامی کی لعنت مسلط کر کے مسلمان ممالک کے تمام وسائل ضبط

کرنے کے درپے ہیں اور شاہ ایران جیسے کٹھ پتلی حکمرانوں کے تعاون سے غریب مسلمانوں پر غلامی کی لعنت مسلط کر رہی ہیں۔ ہم (مجاہدینِ خلق) کوئی نیا دین تو پیش نہیں کر رہے بلکہ اسلام تو شروع ہی سے انقلابی دین رہا ہے جس نے مظلوموں کی داد رسی کی ہے۔ شاہ مسلمانوں کی بیداری اور انقلابی اسلام سے خوفزدہ ہے اور آج وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمان انقلابی نہیں ہو سکتا' یا تو کوئی شخص انقلابی بن سکتا ہے یا مسلمان رہ سکتا ہے۔ درحقیقت سچا مسلمان تو ہر صورت میں انقلابی ہی ہو گا کیونکہ اسلام جبر و استبداد اور اخلاقی بے راہ روی کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ بدعنوانی کے خلاف جہاد ہی تو اسلام ہے۔ آزادی کی خواہش اور استحصالی قوتوں کا قلع قمع کرنا ہی تو عین اسلام ہے۔

مجاہدین خلق نے برملا کہا کہ اگر شاہ کے استبدادی نظام کا نام اسلام ہے تو خدانخواستہ تمام ایران کافر ہو چکا ہے۔ اگر محنت کش عوام کا خون چوسنا' کسانوں اور مزدوروں کی محنت کے ثمرات کو لوٹنا' یہودیوں اور امریکیوں کے اشارے پر ناچنا' قلعوں اور محلات میں زندگی گزارنا' پرائیویٹ ہوائی جہازوں کی ملکیت (جب کہ غریب عوام روٹی کو ترستے ہوں) اور نہتے طلبہ اور مزدوروں کو گولیوں سے اڑانا' مجاہدین کی ماؤں' بہنوں' بچوں اور عزیز و اقارب پر ظلم و ستم کا بازار گرم کرنا' بھوکے اور مظلوم عوام کے کروڑوں ڈالر ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کی تقاریب میں پانی کی طرح بہانے کا نام ہی اسلام رہ گیا ہے تو ہم ایران کے تمام عوام کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم غیر مسلم ہیں اور صرف بادشاہ' اس کے تنخواہ دار علماء اور حاشیہ بردار مفاد پرست لوگ ہی مسلمان رہ گئے ہیں جو اس کے فرعونی نظام کے تحفظ کے لئے کوشاں ہیں۔ ہمارے لئے یہ امر باعث سعادت ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں تو ہم بادشاہت کے دشمن ہیں۔

مجاہدین خلق نے جب ایران میں زور پکڑا تو شاہ کی خفیہ تنظیم ساواک نے ظلم و استبداد کی انتہا کر دی' جس کی نظیر قرونِ مظلمہ میں بھی نہیں ملتی۔ مجاہدین کے سامنے شہادت سے کم گویا کوئی منزل ہی نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ اس تحریک میں دی جانے والی قربانیوں کے نتیجہ میں امید کی کرنیں پھوٹنا شروع ہو گئیں اور یوں محسوس ہونے لگا کہ عہد غلامی کی تاریک رات اپنے اختتام کے قریب پہنچ رہی ہے۔ مجاہدین کے تصورات کا

سرچشمہ خدا کا ابدی پیغام اسلام تھا' جس کے سماجی پہلو آہستہ آہستہ روشن ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ ایران کے نوجوان ان کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ اب مجاہدین نے اسلام کو استعماریت' استحصال اور جبر و استبداد کے خلاف ایک انقلابی نظریہ کے طور پر اپناتے ہوئے انسان کی سماجی و معاشی زندگی کے مسائل کی جانب توجہ دینا شروع کر دی۔ ان لوگوں نے حضرت علیؓ' مرزا کوچک خان' اپنے شہید ساتھیوں' مہدی رضائی اور فاطمہ امینی کو ماڈل کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارکسسٹ اشتراکی نظریات ایران میں غیر مقبول ہونا شروع ہو گئے۔ اس کا اثر یونیورسٹیوں اور دانشوروں کے طبقات پر بھی پڑنے لگا۔ اسلامی نظریات کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایران میں اسلام کے ساتھ جذباتی اور سماجی تعلق ابھی تک معاشرے میں بہت گہرا تھا۔ حکومتِ وقت اس تنظیم کو ختم کرنے میں ناکام رہی اور اسکی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔

اس دوران کچھ روایتی علماء نے ایک فتویٰ بھی جاری کر دیا جس کے مطابق مجاہدینِ خلق کافر قرار دے دیئے گئے۔ اس کے جواب میں مجاہدین نے یہ موقف اختیار کیا کہ گزشتہ کئی برسوں سے منافق اور بد نیت علماء نے بادشاہ کو اللہ کا عکس (ظِلّ اللہ) قرار دینا شروع کیا ہے اور بادشاہ خود کئی بار یہ دعویٰ کر چکا ہے کہ وہ خدا کا سب سے بڑا مقرب ہے اور اسے حضرت عباس علمدار اور حضرت امام مہدی کا تحفظ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ کافی عرصہ سے پیشہ ور علماء نے عوام میں انقلابی روح کو کچلے رکھا ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ نے جُبّہ و عمامہ میں ملبوس لوگوں کو حرص و ترغیب اور مالی منفعت کا لالچ دے کر خریدنا شروع کر رکھا ہے' جنہیں اسلام کی روح کا قطعاً کوئی علم نہیں ہے۔ اس طرح شاہ نے انقلابیوں اور عوام کے درمیان خلیج کو وسیع تر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بادشاہ تو مجاہدین کی شہادت کے بعد ان کے مُردہ جسموں سے بھی خائف ہے' اسی لئے تو انہیں ورثاء کے سپرد کرنے سے بھی انکار کر رہا ہے۔ اسے تو یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں ان کی قبریں بھی انقلابیوں کی جدوجہد کا نشان نہ بن جائیں۔ اس لئے ان پر کیمونسٹ' کافر' چور' ڈاکو' دہشت گرد اور غدار ہونے کے بے معنی الزامات عائد کر رہا ہے۔

(جاری ہے)

قانونِ تحفّظِ ناموسِ رسالت

ریکارڈ کی درستی کیلئے ایک وضاحت

جناب محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مؤقر ماہنامہ "میثاق" باقاعدگی سے پڑھتا ہوں اور میں اس سے استفادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ اسلام کیلئے آپ کی خدمات اور اسلامی تعلیمات کی ترویج کے سلسلے میں آپ کی مساعی جمیلہ کا معترف ہوں اور بارگاہ ایزدی میں دست بہ دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان بے لوث خدمات کا اجر عظیم عطا فرمائے' آمین ثم آمین۔ میری دعا ہے کہ آپ کے جاری کردہ علمی چشموں سے لاکھوں بلکہ کروڑوں تشنگانِ علم سیراب ہوتے رہیں۔

ماہنامہ "میثاق" اگست ۱۹۹۸ء کے شمارے میں قانونِ تحفظ ناموسِ رسالت کے سلسلہ میں جناب کی ایک تقریر نظر سے گزری جو کہ اس شمارے میں مزین قرطاس کی گئی ہے۔ آپ نے نہایت خوبصورت انداز میں اس قانون کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس کے حق میں نہایت عمدہ دلائل دیئے ہیں۔ میں آپ کو اس کاوش پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں ـــــ میرا اور آپ کا کچھ دنوں کیلئے مجلس شوریٰ میں ساتھ رہا ہے۔ میں آپ کی خداداد صلاحیتوں کا ہمیشہ معترف اور مداح رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ہمت عطا فرمائے۔

میں اس موضوع کے سلسلہ میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں' اپنی نمائش و نمود کیلئے نہیں' بلکہ ریکارڈ کی درستی کیلئے۔ وہ یہ ہے کہ قانون تحفظِ ناموسِ رسالت ۱۹۸۷ء میں نہیں بلکہ ۱۹۸۶ء میں قومی اسمبلی اور سینٹ ہر دو ایوانوں میں' مَیں نے پیش کیا تھا۔ اُس وقت مَیں وزیر مملکت برائے قانون' انصاف اور پارلیمانی امور تھا۔ اس کا مسوّدہ میں نے خود بنایا تھا۔ یہ واحد قانون ہے جس کیلئے جج کا مسلمان ہونا لازمی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی سزا شروع میں وہی رکھی گئی تھی جو تعزیراتِ پاکستان میں قتل کی سزا ہے' یعنی سزائے موت اور عمر قید۔ بعد میں وفاقی شرعی عدالت نے اس کی سزا صرف سزائے موت قرار دی۔

میں نے دونوں ایوانوں میں یہ قانون پیش کرتے ہوئے اس قانون کے حق میں مدلّل

تقریر کی تھی۔ بحیثیت ایک مسلمان یہ بل پیش کرنا میں اپنا دینی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس قانون کے سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل اور دونوں ایوانوں میں اُس وقت موجود علماء کرام کی رہنمائی سے میں نے ہر ممکن استفادہ کیا۔ اس قانون کا مسودہ' دونوں ایوانوں میں اس کا پیش کرنااور اس کے حق میں میرے دلائل آج بھی ایوانوں کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔

ہمشیرہ مرحومہ و مغفورہ نثار فاطمہ صاحبہ بڑی نیک خاتون تھیں۔ وہ اسلام کی شیدائی تھیں۔ ہم ایک ساتھ قومی اسمبلی کے ممبران تھے۔ میرا برادرانہ رشتہ ہمیشہ ان سے قائم رہا اور اکثر دینی مسائل پر ہمارے درمیان تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ انہوں نے اور کئی دیگر ممبران نے اس بل کی تائید میں تقریریں کی تھیں لیکن اس بل کے پیش کرنے اور اس کو ایوانوں میں پائلٹ کرنے کا اعزاز مجھ ناچیز کو اللہ تعالیٰ نے بخشا تھا ـــــ میں یہ وضاحت صرف ریکارڈ کی درستی کیلئے کر رہا ہوں' اس کا کوئی کریڈٹ نہیں لینا چاہتا ہوں۔ مجھے تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خوشنودی درکار ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!

اِس قانون کے پاس ہونے کے بعد ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مختلف پلیٹ فارموں سے مدلّل طریقے سے اس کا دفاع کرتا رہا ہوں اور اسے ایک مقدس فریضہ سمجھتا ہوں۔ چند ماہ بیشتر اس قانون کے خلاف بعض حلقوں نے جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا تھا' اس وقت میں نے کئی مقامات پر نہ صرف اس کے حق میں تقریریں کیں بلکہ کراچی کے مختلف علمائے کرام اور دینی حلقوں نے جو اس قانون کے تحفظ کیلئے فرنٹ بنایا تھا ان کیلئے مدلل مسودہ اس قانون کے حق میں تیار کرنے کا شرف بھی مجھے ہی حاصل رہا ہے ۔ یہ مسودہ مختلف سفارت خانوں اور قونصل خانوں کیلئے تیار کیا گیا تھا۔

آپ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد کیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام کی خدمت' قانونِ تحفظ ناموسِ رسالت کا دفاع کرنے اور اس ملک میں نفاذِ اسلام کے سلسلے میں کوشش کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

آپ کا خیر اندیش

میر نواز خان مروت

اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل

مؤتمر العالم الاسلامی' کراچی

مِلّت کے غمگسار، مولانا افتخار فریدی مرحوم

بھارت سے معصوم مُراد آبادی کا مکتوب

۲ نومبر ۹۸ء

محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدّ ظلّہ،

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کو یہ خبر دیتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ حضرت مولانا افتخار فریدی صاحب مدظلہ، ۲۵/ اکتوبر ۹۸ء کو مُراد آباد میں رحلت فرما گئے۔ اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون

ان کے حالات زندگی اور خدمات پر ایک مضمون قلمبند کیا ہے جو میثاق میں اشاعت کے لئے روانہ کر رہا ہوں۔ میثاق برابر مل رہا ہے۔

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر وعافیت ہوں۔

دعاؤں کا محتاج
معصوم مُراد آبادی
دہلی (بھارت)

ملک و ملت کے غم میں اپنی ہڈیاں گھلانے والے مرد مجاہد مولانا افتخار فریدی گزشتہ ۲۵/اکتوبر ۹۸ء کو مُراد آباد میں رحلت فرما گئے۔ ان کی موت ایسا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ نام و نمود سے بے پروا، ایک بڑے مشن اور مقصد کے تحت زندگی گزارنے والے مولانا فریدی کے بعد دور دور تک ان کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا۔ ان کی ذات ایک ادارے سے بھی بڑھ کر تھی۔ انہوں نے جن لوگوں کی ذہنی پرورش کی وہ کبھی اپنے مقصد سے بھٹک نہیں سکتے۔ ان کے مشن کی راہ میں کبھی کوئی موسم، آفت ناگہانی، بے سروسامانی مانع نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ ان کی جسمانی معذوری اس درجہ کی تھی کہ اگر وہ تمام عمر بیٹھ کر گزارتے تو ان پر کوئی حرف نہ آتا۔ لیکن اپنی اکلوتی ٹانگ سے سینکڑوں ٹانگوں کا کام لینے کا

ہنر خدا نے انہیں بطور خاص ودیعت کیا تھا۔ اپنے متعلقین اور عقیدت مندوں کو متحرک اور مستعد رکھنے کا ان کا طریقہ بڑا انوکھا اور متاثر کرنے والا تھا۔ وہ زندگی کے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہ کرنے کے اصول پر کاربند تھے اور شاید اسی لئے کام میں عجلت کے طرفدار تھے۔

میں نے انہیں ہمیشہ متحرک، چاق و چوبند اور سرگرم پایا۔ سینکڑوں واقعات ہیں جو ملک و قوم اور انسانیت کے تئیں ان کی درد مندی، جاں سوزی اور فکر مندی کے گواہ ہیں۔ عمر کے آخری حصہ میں جبکہ ان کے اعضاء جواب دے چکے تھے اور بیماری نے ان کی یادداشت کو بھی متاثر کردیا تھا، وہ اس حالت میں بھی گھر سے نکلنے اور اپنے مشن پر روانہ ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ دنیا میں ان کے نزدیک سب سے کم تر درجہ کی چیز ان کی اپنی ذات تھی اور سب سے اعلیٰ چیز وہ مقصد تھا جس کے تحت انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ انسانوں کو اپنے مالک حقیقی سے جوڑنے کا ان کا جو مشن تھا وہ اس کی تبلیغ میں کہیں نہیں چوکتے تھے۔ وہ شہر میں جہاں بھی جاتے ان کی محبوب سواری رکشہ ہی ہوتی تھی کہ اس پر وہ آسانی سے اپنی بیساکھیوں سمیت بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اپنی منزل پر پہنچ کر رکشہ والے کا نام پوچھتے، اگر وہ مسلمان ہوتا تو نماز کی تاکید ضرور کرتے اور غیر مسلم ہوتا تو اس سے اپنے مالک کو یاد کرنے کے لئے کہتے۔ ان سے جو بھی ملنے آتا اسے وقت کا امر ضرور بتاتے۔ وہ قوم کی زبوں حالی اور بے عملی پر اکثر آنسوؤں سے رویا کرتے تھے۔

مولانا افتخار فریدی مجاہد آزادی تھے، مبلغ تھے، مؤلف تھے اور مصلح بھی تھے۔ وہ ۲۵ نومبر ۱۹۱۶ء کو مراد آباد کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے بچپن میں تحریک خلافت اپنے عروج پر تھی اور ان کے چچا اس میں گرفتار ہو گئے تھے۔ مولانا فریدی ۹ سال کی مختصر عمر میں ہی اپنی دائیں ٹانگ سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ شاہی اور مدرسہ امدادیہ میں حاصل کی۔ آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی اس لئے وہ ایک پرائمری اسکول سے درجہ چہارم پاس کرنے کے بعد کانگریس اور جمعیت علماء ہند کی سرگرمیوں میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے مراد آباد میں مسلم نوجوان آزاد پارٹی قائم کی اور اسی زمانے میں مراد آباد میں مسلم پبلک لائبریری کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۶ء میں مراد آباد میں مجلس احرار کی شاخ قائم کی اور اس کے رضا کاروں کو سابق فوجیوں سے تربیت دلوائی۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے مراد آباد سے اردو ہفت روزہ "کانگریس" جاری کیا جس نے انگریزوں کے خلاف مورچہ کھولا۔

۱۹۴۰ء میں رام گڑھ میں کانگریس کے کل ہند اجلاس میں شرکت کی۔ وہیں فارورڈ بلاک کے کیمپ میں مولانا کی ملاقات سبھاش چندر بوس سے ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں انہیں دوسری جنگ عظیم کے خلاف نعرے لگانے کے جرم میں امروہہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ انہوں نے سات ماہ مُراد آباد، بریلی اور چونار گڑھ کی جیلوں میں گزارے۔ انگریز حکومت نے ان پر سو روپے کا جرمانہ بھی عائد کیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب کانگریس کے بیشتر لیڈر اور کارکن گرفتار ہو گئے تو مولانا فریدی کسی طرح روپوش ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دوران انہوں نے خفیہ طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور چوری چھپے بلیٹن چھپوا کر انہیں تقسیم کرتے رہے۔

آزادی سے قبل جہاں ایک جانب وہ پوری طرح کانگریس، جمعیت علماء ہند اور مجلسِ احرار سے وابستہ رہے، وہیں آزادی کے بعد انہوں نے تبلیغ کو اپنا مشن بنالیا۔ بطورِ مجاہد آزادی انہوں نے حکومت سے کوئی آسائش یا سہولت طلب نہیں کی۔ بزرگانِ دین اور اکابرین ملت سے ان کی وابستگی بہت قریبی تھی۔ ایک موقع پر جبکہ میں ان کے اخبار "کانگریس" پر ایک تحقیقی مضمون لکھ رہا تھا تو انہوں نے ۱۵/ مئی ۱۹۸۶ء کو اپنے ایک خط میں مجھے تاکید کی تھی کہ

> "میں حضرت شیخ الہند، شیخ الاسلام، مفتی اعظم، مولانا الیاس، مولانا یوسف، حضرت رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث، امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، سید سلیمان ندوی، خانوادۂ دیوبند، سید احمد شہید اور شاہ ولی اللہ سے متعلق رہا ہوں۔ میرے بارے میں جو شائع کریں اسی نسبت سے کریں"۔

خدا پر ان کا ایمان اور عقیدہ بڑا مستحکم تھا۔ ایک انگریز محقق جو دہلی میں اسلام پر ریسرچ کر رہا تھا ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے دیگر سوالوں کے علاوہ فریدی صاحب سے یہ بھی پوچھا کہ ایمان کی حلاوت کیا ہے؟ فریدی صاحب نے سوال کیا: آپ نے آم کھایا ہے؟ جواب اثبات میں آیا تو انہوں نے اس کی حلاوت پوچھی۔ انگریز محقق لفظوں میں اسے بیان نہیں کر سکا۔ پھر فریدی صاحب نے فرمایا: جب آپ آم کی حلاوت بیان نہیں کر سکتے تو ایمان کی حلاوت کیا پوچھتے ہیں؟ انگریز قائل ہو گیا۔

مولانا افتخار فریدی ۱۹۴۳ء میں ہی تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو گئے تھے اور آزادی کے بعد تو انہوں نے خود کو اس کے لئے وقف کر دیا۔ وہ ۱۹۶۵ء تک اس سے جڑے رہے اور انہوں نے کالج اور یونیورسٹیوں میں اس کام کی بنیاد ڈالی۔ بندرگاہوں پر بھی کام کیا۔ پورے

ملک کے علاوہ پاکستان' بنگلہ دیش' برما' شام' عراق' سعودی عرب وغیرہ کے تبلیغی سفر کئے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد ان کا مشن غیر مسلموں میں تبلیغ کرنا تھا جس میں وہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کے ساتھ سرگرم رہے۔

اسی دوران انہوں نے کئی اہم اور منفرد کتابیں بھی ترتیب دیں جن میں وصایا' عورت' دل کی باتیں' ارشادات و مکتوبات مولانا الیاس صاحب' تبلیغی کام' دو خطروں کا علاج وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور برصغیر کے تمام علمی اور مذہبی جریدے ان کے ہاں آتے تھے۔ اپنی ذاتی لائبریری کو انہوں نے کئی برس قبل جامع الہدیٰ مراد آباد میں منتقل کر دیا تھا اور اس کے فروغ کے لئے دائرۂ صفہ کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔

تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک موقع پر اپنے ماہنامے "میثاق" (لاہور) نومبر ۸۰ء میں ان کا تعارف یوں کروایا تھا:

> "مراد آباد (بھارت) کے محترم افتخار فریدی صاحب کا زیادہ عملی لگاؤ تو اگرچہ جماعت تبلیغ سے ہے لیکن دین کے ساتھ ان کا ذہنی اور قلبی تعلق جماعتی اور گروہی نسبتوں سے وسیع تر بھی ہے اور عمیق تر بھی' وہ ایک حد درجہ دردمند دل کے ساتھ ساتھ ایک نہایت فعال اور متحرک شخصیت کے بھی مالک ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ اوائل عمر ہی میں کسی حادثے میں ایک پوری ٹانگ سے محروم ہو گئے تھے' خدمت دین کے لئے ان کے جوش و خروش اور جذبہ و امنگ میں ہرگز کوئی کمی نہیں آئی' بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس جسمانی معذوری کی تلافی بھی اپنے جذبۂ عمل سے اس حد تک کر دی ہے کہ ہم ایسے سب ہاتھ پاؤں سلامت رکھنے والے لاکھوں لوگ ان پر رشک کرنے پر مجبور ہیں ؎
>
> ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!"

تُو میرا شوق دیکھ! مرا انتظار دیکھ!!

محترم المقام مفکر اسلام حضرت مولانا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدّ ظلکم العالی

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

اللہ کریم سے دعا ہے کہ آپ کو اپنی عافیت میں رکھے' آمین۔ آپ کی صلاحیت' فکری گہرائی' تنظیمی تجربہ' وسیع المشربی اور عالم اسلام کے مسائل و واقعات پر گہری نظر سے پوری اسلامی برادری واقف ہے اور آپ کی قائدانہ صلاحیت کی معترف بھی۔ اور علوم قرآن کے سلسلے میں آپ کی شخصیت مسلّم و مصدَّق ہے۔ آپ ایسے ملک کے شہری ہیں جس کے تعلقات ہمارے ملک سے اکثر خراب ہی رہتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ آپ جیسی عظیم شخصیت سے بھرپور استفادہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ آپ کی تالیفات مشکل سے مل پاتی ہیں' بعض سعودی احباب کے ذریعہ آپ کی تصنیفات ملی ہیں جو ہماری پبلک لائبریری میں رکھی ہیں۔

میں مؤقر ماہنامہ "میثاق" کا پرانا قاری ہوں' ہر ماہ اس کا شدید انتظار ہوتا ہے۔ اس کا بغور مطالعہ کر کے تقاریر و خطابات کے ذریعہ آپ کے فکر و منہج کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں جب تک ندوۃ العلماء میں مقیم رہا پابندی سے میثاق کا قاری بن کر استفادہ کرتا رہا' لیکن اب اپنے علاقہ میں منتقل ہونے کے بعد میثاق کے مطالعہ سے محروم ہو گیا ہوں۔ بعض ہندوستانی جرائد کا مطالعہ کر کے میثاق کی محرومیت کا احساس زائل کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں' اسی ناکام کوشش کے نتیجے میں یہ خط خدمتِ عالیہ میں اس امید پر ارسال کر رہا ہوں کہ میرے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے میثاق ارسال فرمائیں گے۔

والسلام

احوکم فی الدین والعقیدۃ

ذکاء اللہ الندوی

سدھارتھ نگر' یوپی (بھارت)

تنظیم اسلامی کا ۲۳ واں سالانہ اجتماع

منعقدہ کراچی

—— مختار حسین فاروقی، ناظم حلقہ پنجاب وسطی ——

تنظیم اسلامی پاکستان کا قافلہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی قیادت میں گزشتہ رُبع صدی سے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا امسال نومبر ۹۸ء کے مہینے میں کراچی کے عروس البلاد میں خیمہ زن ہوا۔ جون ۹۸ء میں فیصلہ ہوا تھا کہ اس دفعہ رفقائے تنظیم کا اجتماع کراچی میں منعقد کیا جائے۔ کراچی کے رفقاء کی دیرینہ خواہش تھی کہ کبھی تمام رفقائے تنظیم کراچی میں جمع ہوں اور وہ ان کی میزبانی کا شرف حاصل کریں۔

کراچی، تنظیمی اعتبار سے حلقہ سندھ و بلوچستان میں شامل ہے جس کے امیر جناب نسیم الدین صاحب ہیں جو بجا طور پر اس منصب کے اہل ہیں۔ جون ۹۸ء سے نومبر ۹۸ء تک کئی ایسے نازک مرحلے بھی آئے جس میں کراچی کے رفقاء کی امیدوں کے چراغ حوادث زمانہ کے بے رحم تھپیڑوں اور سیاسی آندھیوں اور طوفانوں کے ہاتھوں بجھتے بجھتے بچے۔ یہ ہمارے باہمت ساتھیوں کا خلوص اور اور جذبۂ وفا ہی تھا جس نے "تندیِ بادِ مخالف" میں بھی گھبرانا تو درکنار اس فیصلے پر نظر ثانی کو بھی اپنے "فقرِ غیوّر" کے منافی سمجھا۔

تنظیم اسلامی کا اجتماع کراچی میں گلشن اقبال میں ایک کھلی جگہ پر ہونا قرار پایا تھا، مگر انتظامیہ کی طفل تسلیوں اور اپنی مصلحتوں کے پیش نظر حکومت نے اجازت کو معلق رکھا، یہاں تک کہ حتمی تاریخ سے دو روز قبل جبراً اجتماع کو ختم کرنے کا حکم صادر فرمایا، جس سے رفقائے تنظیم کو اپنے مشن کی صداقت کی ایک اور دلیل مل گئی۔

"اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل" نامی کتاب میں امیر محترم نے یہ بات صفحہ ۶۴ پر لکھی ہے کہ تنظیم اسلامی کی انقلابی دعوت کو نہ زمین غذا دینے کو تیار ہے نہ فضا۔ یعنی عام مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے ذہنوں میں دین کا جو محدود اور جامد مذہبی تصور صدیوں کے تعامل کے باعث راسخ ہو چکا ہے وہ فی الواقع اس بنجر اور سنگلاخ زمین کے مانند ہے جو کسی حرکی اور انقلابی تصور کو غذا دینے سے نہ صرف انکاری ہے بلکہ اس کے فروغ کی راہ کا سب سے

بڑا تھر ہے اور دوسری جانب مادہ پرستانہ افکار و نظریات ' سیکولر نظامِ ریاست و سیاست اور مخلوط اور اباحیت پسندانہ معاشرت و ثقافت جو اِس وقت پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے' یقیناً اس فضا اور آسمان کی مانند ہے جو اسلام کے حقیقی اور جامع تصور کے "شجرۂ طیبہ" کو پنپنے کی اجازت دینے سے انکاری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلام کا عالمی غلبہ تقدیر مبرم ہے اور ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے علی الرغم پورا ہو کر رہے گا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جیسے ہر چہار طرف افق پر زمین اور آسمان باہم ملے ہوئے اور بغلگیر نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح محدود مذہبی تصور اور عالمی سیکولر تہذیب بھی ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور ہم آغوش ہیں۔ اس لئے کہ سیکولرازم کا اصل الاصول ہی یہ ہے کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے' چنانچہ جامد مذہبی تصور سے وہ کامل رواداری برتتا ہے اور جملہ مذاہب کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو اپنے پہلو میں جگہ دیتا ہے۔ اسے اگر کوئی خطرہ اور اندیشہ ہے تو اسلام کے اس جامع تصور سے ہے جو پوری زندگی پر اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اگر جنگ ہے تو صرف ان فنڈامنٹلسٹ قوتوں سے جو اسلام کو دین اور دنیا اور عبادت و سیاست ہر دو دائروں پر حکمران کرنا چاہتی ہیں۔ رہا دین کا محدود تصور جو اسے مدرسہ و خانقاہ اور عبادات و رسومات تک محدود کرتا ہے' اور جو Politico-Socio-Economic System سے بحث نہ کرے تو اس کی تو وہ ہر وقت سرپرستی کرنے پر آمادہ اور تیار ہے۔

ان حالات میں تنظیم اسلامی پاکستان کا اجتماع اگر گلشن اقبال میں منعقد ہو جاتا تو سوچنے کی بات ہوتی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ انہوں نے ٹوکا اور روکا تو صحیح اور بروقت ـــــ اور کسے روکا؟ ـــــ صرف اسی جماعت کو روکا جو پاکستان میں اسلامی انقلاب کا واقعی اور حرکی تصور مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر عام کر رہی ہے۔ طورخم سے کیماڑی تک کسی اور جماعت کا اجتماع درہم برہم نہ کیا جانا یقیناً تنظیم اسلامی پاکستان کیلئے حقانیت کی ایک مثبت دلیل ہے۔

رفقائے تنظیم کے اجتماع کے انتظامات کو حکومتی اہلکاروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے خود اپنے ہاتھوں سمیٹنا بھی نظم اور تنظیم کا ایک عمدہ مظاہرہ تھا (اس میں وقتی جذبات اور ہیجان کے اِکا دُکا مظاہرے کو انسانی فطری جذبہ (Human Factor) ہی قرار دیا جائے گا) جس نظم و ضبط کے ساتھ وہاں کئے کرائے انتظامات کو بعجلت سمیٹا گیا ہے وہ تنظیم اسلامی کے نظامِ تربیت کا کریڈٹ ہے' جو رفقائے تنظیم کو بالعموم اور رفقائے کراچی کو بالخصوص

حاصل ہوا ہے۔

مزید برآں گلشن اقبال سے انتظامات کو رول بیک کر کے قرآن اکیڈمی میں از سرِ نو آغاز کر کے کم سے کم وقت میں سارے انتظامات کر دینا جبکہ دل بہرحال ٹوٹے ہوئے تھے اور رفقاء تھکے ہوئے تھے اور امیر حلقہ و ناظم اجتماع تو فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرح چارپائی پر ہی کمان کر رہے تھے۔ ان حالات میں اجتماع کو مؤخر کرنا یا ملتوی کر دینا قرین قیاس اور مصلحت کے قریب ہوتا' مگر رفقائے نے حد درجہ ایثار کر کے اس مہم کو سر کیا۔ یہ اس نقشہ کا عکس تھا جو یومِ اُحد کی شام پیش آیا تھا۔ قرآن پاک میں آیا ہے :

"وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہا جبکہ وہ (نڈھال اور) زخم خوردہ تھے —— جنہوں نے یہ کام بخوبی انجام دے دیا ان کے لئے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا (ان کیلئے بھی) بہت بڑا اجر ہے"۔ (آل عمران : ۱۷۲)

رفقائے کراچی نے یقیناً بڑا اجر کمایا۔ اس لئے کہ ایک فی کروڑ کی نسبت سے سہی یومِ اُحد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے کردار کا نقشہ پیش کیا۔

قرآن اکیڈمی کے انتظامات نہایت کافی تھے اور یقیناً سہولت کے ساتھ کفایت کرتے اگر مرکز اور ناظمین اجتماع کے اندازہ سے بڑھ کر لوگ تشریف نہ لاتے۔

کراچی کے مخصوص حالات ' غیر یقینی صورتحال ' دور دراز کا سفر اور زرِ کثیر کا خرچ —— اس کے باوجود ہمارے اندازے سے زیادہ رفقاء نے امیر تنظیم کی پکار پر لبیک کہا تو یہ بجائے خود ایک اچھی اور امید افزا علامت ہے رفقائے تنظیم کے مقصد سے عشق اور لگن کی۔

اجتماع کے دوران رفقائے تنظیم کا نظم و ضبط اور ہر کام میں سلیقہ و شعار کا مظاہرہ بھی یقیناً نہایت اہم اور ہماری صحیح فکر اور مناسب تربیت کا آئینہ دار ہے۔ اجتماع کے دوران انتظامی معاملات کا کوئی مجموعی بحران اور انتشار دیکھنے کو (کم از کم راقم کو) نہیں آیا۔ رفقاء کا باہمی اعتماد' رواداری' اخوت اور سلیقہ شعاری کی کیفیت نے باہمی کمزوریوں کو بہت حد تک دبا دیا تھا۔

اجتماع کے روحانی اور باطنی پہلوؤں کا جائزہ اس رپورٹ کا لازمی حصہ نہیں ہے۔ تاہم امیرِ محترم کا خطابِ جمعہ رفقائے تنظیم کے فکر کو ایک نئی جہت عطا کرنے والا تھا۔ جمعہ کی رات کا خطاب دل کشا و ایمان افروز ہی نہیں چشم کشا بھی تھا اور ان شاء اللہ جہاں جہاں تک یہ آواز پہنچے گی آنکھوں کو خیرہ اور دلوں کو مسحور کرتی جائے گی۔ رفقاء کے نام خطاب اگرچہ

بقول امیر محترم "قندِ مکرر" قسم کی شے تھی اور رفقائے تنظیم کو پہلے سے سنی ہوئی ہونے کی نسبت لوحِ دماغ پر ثبت اور از بر تھی، تاہم یہ "باطنی تجربہ" اسی خطاب کے دوران اکثر کو ہوا کہ ـ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

کی سی کیفیت پورے خطاب کے دوران طاری رہی۔

سفر کراچی اور اجتماع کے اوقات انہی مشاہدات کے دوران اس تیزی سے گزرے کہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اس اجتماع سے رفقاء حوصلہ، ولولہ اور جذبۂ تازہ لے کر لوٹے ہیں اور پہلے سے زیادہ لگن ہمت اور محنت سے اس فکر کو اپنے ماحول میں پھیلانے کی سعی کریں گے، ان شاء اللہ ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق ارزانی عطا فرمائے، آمین۔

مستقبل کے حالات کسی کو معلوم نہیں اور مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اس مختصر سے قافلے کو ابھی کہاں کہاں اجتماع کرنے سے روکا جائے گا اور کس کس طرح سے اس کے راستے میں کانٹے بوئے اور بچھائے جائیں گے اور کہیں کس موقع پر کسی کی امان لے کر اپنی دعوت کو آگے بڑھانے کی مہلت میسر آئے گی، مگر ایک بات طے ہے اور موجبِ اطمینان و سکون ہے کہ حالات و واقعات اسی صراطِ مستقیم اور سواء السّبیل کے سنگ ہائے میل ہیں جو ہمیں بتائے گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سیدھے راستے پر چلائے رکھے اور ہمارے دلوں کو ہدایت پانے کے بعد ٹیڑھا نہ کر دے۔ آمین یا رَبَّ العالمین

اللّٰھم الھمنا رُشدنا واَعذنا من شرور انفسنا وسیّئاتِ اعمالنا۔
اللّٰھم لا تکلنا الیٰ انفسنا طرفةَ عین

ضرورت رشتہ

سالانہ اجمالی جائزہ رپورٹ
شعبہ نشرواشاعت تنظیم اسلامی پاکستان
برائے تنظیمی سال ۹۸۔۱۹۹۷ء

گزشتہ شمارے میں تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کی مناسبت سے تنظیم کی کارکردگی کی "سالانہ اجمالی جائزہ رپورٹ" شائع کی گئی تھی، لیکن تنظیم اسلامی کے شعبہ نشرواشاعت اور حلقہ خواتین کی رپورٹیں بوجوہ شامل اشاعت نہ ہو سکی تھیں۔ مذکورہ دونوں شعبوں کی اجمالی رپورٹیں ذیل میں ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہیں۔ (ادارہ)

- ہفت روزہ ندائے خلافت کی تیاری و اشاعت شعبہ کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ماہ جنوری سے ستمبر تک ۴۰ شمارے باقاعدگی سے شائع کئے گئے۔
- شعبہ کی دوسری اہم ترین ذمہ داری امیر محترم کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز تیار کر کے اخبارات کو بھجواتا ہے۔ حسب معمول یہ ذمہ داری بھی ادا کی جاتی رہی۔
- امیر محترم کے خطبہ جمعہ کی تلخیص کی تیاری بھی شعبہ کے رکن ادا کرتے ہیں جو ندائے خلافت میں شائع کی جاتی ہے۔
- عرصہ زیر نظر رپورٹ میں شعبہ کی طرف سے ایک اہم پیش رفت ہوئی۔ امیر محترم کے بعض خطاباتِ جمعہ کی تلخیص کو معمولی ردّوبدل کے ساتھ مضمون کے طور پر اخبارات کو جاری کیا گیا۔ اس سلسلہ کا آغاز فروری ۹۸ء سے کیا گیا تھا۔ روزنامہ نوائے وقت ان مضامین کو اہتمام سے شائع کرتا رہا ہے۔
- ندائے خلافت میں تنظیم اسلامی کی مرکزی ٹیم کے انٹرویوز کا سلسلہ بھی متعارف کرایا گیا۔ اس سلسلے میں شعبہ کو مرزا ندیم بیگ کی خدمات حاصل رہیں۔ موصوف ندائے خلافت کے آخری صفحہ "مسلم اُمہ، خبروں کے آئینے میں" کیلئے بھی تعاون کرتے ہیں۔
- مختلف اخبارات و جرائد کے لئے امیر محترم کے انٹرویوز کا سلسلہ پہلے سے بہتر انداز میں چلایا جا رہا ہے۔ چنانچہ روزنامہ خبریں، مشرق پشاور، روزنامہ جنگ، ہفت روزہ زندگی میں

یہ انٹرویوز شائع ہوئے۔

- تنظیم اسلامی کی سیکنڈ لائن کو متعارف کرانے کی غرض سے مرزا ندیم بیگ کی خصوصی کوششوں سے روزنامہ "خبریں" کے زیراہتمام' لبرٹی فورم میں نائب امیر ڈاکٹر عبدالخالق' ناظم اعلیٰ جناب عبدالرزاق اور ناظم تربیت چوہدری رحمت اللہ بٹر نے شرکت کی' جس کی باتصویر کوریج مذکورہ اخبار میں شائع ہوئی۔
- ندائے خلافت کے مدیر جناب عاکف سعید صاحب کے بعض ادارتی مضامین اخبارات کو بھجوائے گئے جو کسی نہ کسی اخبار میں لازماً شائع ہوئے۔ تنظیم اسلامی' تحریک خلافت اور انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام منعقد کئے جانے والے سیمینارز اور کانفرنسوں کی پریس کوریج کے لئے باضابطہ قومی پریس سے رابطہ کر کے' ان کانفرنسوں کی اخبارات میں اشاعت کے لئے بھرپور بھاگ دوڑ کی جاتی رہی ہے۔
- قرآن آڈیٹوریم لاہور میں منعقدہ "تکمیلِ دستورِ خلافت اور تنفیذِ شریعت کانفرنس" کی ندائے خلافت میں شائع شدہ تفصیلی رپورٹ روزنامہ "نوائے خلافت" میں بھی شائع ہوئی۔
- حلقہ لاہور کے زیرِ اہتمام اجتماعاتِ عام اور مظاہروں کے پروگراموں کے لئے بھی یہ شعبہ بھرپور طریقے سے حلقہ کی معاونت کرتا رہا ہے۔
- وقتی مسائل اور بین الاقوامی حالات پر امیر تنظیم اسلامی کے موقف اور ردِ عمل پر مبنی بیانات پریس ریلیز کی صورت میں اخبارات کو بھجوائے جاتے رہے۔
- مختلف قومی ایام اور دینی حوالے سے امیر محترم کی کتب سے مضامین کی تلخیص تیار کر کے اخبارات کو بھجوائی جاتی رہی' جو کافی حد تک اخبارات کے صفحات کی زینت بنی۔
- شعبہ کے نائب ناظم دورۂ افغانستان کے موقع پر تنظیم کے وفد میں شامل تھے' اس دورہ کی مکمل روداد میثاق کے لئے مرتب کی گئی۔
- حلقہ جات' تنظیموں اور منفرد اُسرہ جات کی طرف سے ارسال کردہ رپورٹیں "ندائے خلافت" میں قابل اشاعت بنانے کے لئے' انہیں ایڈٹ کرنا بھی شعبہ کی ذمہ داری ہے۔ یہ رپورٹیں اکثر و بیشتر ندائے خلافت میں شائع کی جاتی رہیں۔

(مرتب : نعیم اختر عدنان)

رپورٹ تنظیم اسلامی حلقہ خواتین

تنظیم اسلامی پاکستان کی اجتماعیت میں خواتین بھی بڑھ چڑھ کر شریک سفر ہیں اور اقامت دین کی جدوجہد میں بقدرِ استطاعت اپنا حصہ ادا کر رہی ہیں۔

تنظیم اسلامی حلقہ خواتین کو قائم ہوئے پندرہ برس ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۸۳ء میں چند خواتین نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت سمع وطاعت کی تھی۔ شروع میں رفیقات کی تعداد میں سست رفتاری سے اضافہ ہوتا رہا اور کوئی باقاعدہ نظم کافی عرصے تک قائم نہیں ہوا۔ ۱۹۹۰ء سے باقاعدہ نظم قائم ہوا اور اُسروں کی تقسیم عمل میں آئی۔ ناظمہ صاحبہ 'نائب ناظمہ اور نقیبات کا باقاعدہ تقرر عمل میں آیا اور اس کے بعد سے رفیقات کی تعداد میں ماشاء اللہ مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اِس وقت حلقہ خواتین میں رفیقات کی کل تعداد ۸۴۱ ہے۔ اس تعداد میں اندرونِ ملک و بیرونِ ملک مقیم تمام رفیقات شامل ہیں۔

حلقہ خواتین لاہور

یہاں رفیقات کی تعداد ۲۴۲ ہے اور ۱۸ اُسرے قائم ہیں۔ یہاں الحمدللہ تمام اُسروں میں باقاعدگی سے مقررہ نصاب کے مطابق پروگرام ہو رہے ہیں۔ تمام نقیبات کا مرکز سے مسلسل رابطہ ہے اور الحمدللہ نہایت احسن طریقے سے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے اپنے اُسرے چلا رہی ہیں۔

نقیبات اور رفیقات کی تربیت کے لئے ہر تین ماہ بعد علیحدہ علیحدہ پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں' جن میں ان کی دینی و روحانی تربیت کے پروگرام ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عام خواتین کے لئے بھی مختلف دروس کے پروگرام ہوتے ہیں۔ رمضان المبارک کی آمد سے قبل استقبال رمضان کے پروگرام بھی تمام اُسروں میں منعقد کئے جاتے ہیں۔

لاہور کے علاوہ پنجاب کے دوسرے شہروں اور سرحد میں بھی کچھ اُسرے قائم ہیں جن کی مختصر رپورٹ حسب ذیل ہے۔

- ملتان میں ۲۳ رفیقات ہیں۔ یہاں کی نقیبہ ایک انتہائی باصلاحیت خاتون ہیں اور اپنے اُسرے کو نہایت احسن طور پر چلا رہی ہیں۔ اُسروں کے پروگرام نصاب کے مطابق ہو رہے ہیں۔

- فیصل آباد میں ۱۳ رفیقات ہیں' یہاں کی نقیبہ بھی اپنی بھرپور گھریلو مصروفیت کے باوجود اپنی ذمہ داری پورے طور پر نبھا رہی ہیں۔ یہاں مہینہ میں دو پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔
- راولپنڈی اسلام آباد میں ۱۶ رفیقات ہیں۔ یہاں اُسرے کے باقاعدہ پروگرام نہیں ہوتے' البتہ نقیبہ صاحبہ اپنے طور پر دروس اور ترجمۃ القرآن کے پروگرام کرتی رہی ہیں۔
- سرگودھا میں ۱۲ رفیقات ہیں۔ یہاں کی نقیبہ بہت محنت اور لگن سے کام کر رہی ہیں' لیکن یہاں بھی اُسروں کے باقاعدہ پروگرام منعقد نہیں ہوتے۔ البتہ دروس اور ترجمہ قرآن کی کلاسیں باقاعدگی سے ہو رہی ہیں۔

• پنجاب کے دیگر شہروں میں ۴۸ منفرد رفیقات ہیں۔ ان کا مرکز سے براہ راست رابطہ رہتا ہے' لیکن اکثریت غیر فعال رفیقات کی ہے جو کبھی کبھار رابطہ کرتی ہیں۔ اس تعداد میں تین رفیقات کوئٹہ کی بھی شامل ہیں لیکن وہ بھی غیر فعال ہیں۔

- پشاور میں بھی ایک اُسرہ قائم ہے اور یہاں حلقہ خواتین کو ایک انتہائی باصلاحیت رفیقہ کا تعاون حاصل جو یہاں کی نقیبہ بھی ہیں۔ اُسرے کے پروگرام بخوبی ہوتے ہیں اور مرکز تک رپورٹس اور اعانت بھی بروقت باقاعدگی سے موصول ہوتی ہیں۔ یہاں ۱۶ رفیقات اُسرے میں شامل ہیں۔

حلقہ خواتین کراچی

حلقہ خواتین کراچی میں باقاعدہ نظم قائم ہے۔ یہاں کی مقامی ناظمہ اور نائب ناظمہ کا تقرر ۱۹۹۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ اُس وقت سے ان دونوں محترم خواتین نے اپنی بھرپور صلاحتیں تنظیم اسلامی کے لئے وقف کی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے' ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور مزید ہمت و توفیق سے نوازے آمین۔

الحمدللہ کراچی کی رفیقات کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس سال کے دوران یعنی جنوری سے لے کر تادم تحریر ۴۸ رفیقات کا اضافہ ہوا ہے اور اب یہاں رفیقات کی تعداد ۲۱۴ ہو گئی ہے۔ یہاں دو اُسروں کا اضافہ ابھی حال ہی میں ہوا ہے اور اب ۸ اُسرے قائم ہیں۔ اکثریت اُسروں سے منسلک ہے جبکہ چند رفیقات منفرد ہیں۔ کراچی کے دگرگوں حالات کے باوجود یہاں اُسروں کے پروگرام باقاعدگی سے مقررہ نصاب کے

مطابق ہو رہے ہیں۔ اس کے [illegible] کے علاوہ عربی گرامر' ترجمۃ القرآن اور تجوید کی کلاسیں بھی باقاعدگی سے ہو رہی ہیں۔

یہاں رفیقات کی تربیت کے لئے ہر چار ماہ بعد پروگرام منعقد کیا جاتا ہے۔ اس سال کے دوران تین پروگرام رفیقات کے لئے منعقد کئے گئے۔ ان پروگراموں میں ان کے لئے آئندہ کے اہداف کا تعین کیا جاتا ہے کہ وہ ان اہداف کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اپنے اندر مزید بہتری پیدا کریں اور دوسروں کے لئے نمونہ بنیں۔

اسی طرح نقیبات کی تربیت کے لئے تین پروگرام منعقد کئے گئے جن میں نقیبات نے اُسروں کی رپورٹس پیش کیں اور اپنی کارکردگی کی تفصیل بیان کی۔ اس طرح کے ایک پروگرام میں بڑے پیمانے پر دعوتی پروگرام کی خاطر دروس قرآن کے لئے باصلاحیت رفیقات کی تربیت کا پروگرام رکھا گیا۔ ایک اور پروگرام میں نقیبات کو نظام العمل کے حوالے سے ان کی ذمہ داریاں' اوصاف اور نظام العمل کی روشنی میں تنقید کے آداب بتائے گئے۔

الحمدللہ کراچی میں حلقہ خواتین کافی منظم طور پر کام کر رہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی طرح قائم و دائم رکھے اور تمام رفیقات' نقیبات اور ناظمہ صاحبہ کو مزید توفیق عطا فرمائے' آمین۔

بیرون پاکستان

لندن میں ۱۰۳ رفقیات ہیں۔ یہاں کی ناظمہ صاحبہ نہایت محنت اور لگن سے کام کر رہی ہیں۔ انہوں اپنے گھر میں ہی حلقہ خواتین کا آفس قائم کیا ہوا ہے جہاں فون' فیکس اور کمپیوٹر کی سہولت موجود ہے اور یہ سب ان کی ذاتی دلچسپی سے ہی ممکن ہوا ہے۔ یہاں ۸ اُسرے قائم ہیں اور پروگرام باقاعدگی سے ہو رہے۔

امریکہ میں ۵۶ رفقیات ہیں اور یہاں بھی اُسرے قائم ہیں۔

کینیڈا میں ۴۴ رفیقات ہیں اور دو اُسرے قائم ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا کی ناظمہ مسز عبدالغفور صاحبہ نے بھی اپنی پوری صلاحیتیں تنظیم کے لئے وقف کی ہوئی ہیں۔ تمام رفقیات سے فرداً فرداً رابطہ ہے اور رپورٹس پر فوری محاسبہ کر کے رفیقات کو روانہ کرتی ہیں۔ مڈل ایسٹ میں ۶۶ رفیقات ہیں لیکن پابندیوں کی وجہ سے آج کل رابطہ بالکل منقطع ہے اور اکثریت پاکستان شفٹ ہو چکی ہے' لیکن سوائے چند ایک کے کسی کا مرکز سے رابطہ نہیں ہے۔

مرکزی دفتر حلقہ خواتین

حلقہ خواتین کا مرکزی دفتر لاہور میں ہے۔ یہاں ناظمہ صاحبہ کی زیر نگرانی ہفتے میں دو دن منگل اور بدھ کو کام ہوتا ہے۔

رفیقات سے رابطے کے لئے انہیں خطوط روانہ کئے جاتے ہیں۔ جو خطوط آفس میں موصول ہوتے ہیں ان کے بروقت جواب دینے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ رفیقات کی رپورٹس اور اعانتوں کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے۔ باقاعدہ بیت المال کا نظام قائم ہے اور اس کی علیحدہ ناظمہ ہیں' جو اپنی ذمہ داری نہایت احسن طور پر پوری کر رہی ہیں۔ مرکز کی جانب سے رفیقات کی ماہانہ رپورٹس ہر چار ماہ بعد محاسبہ کر کے روانہ کی جاتی ہیں تاکہ رفیقات کی کارکردگی ان کے سامنے بھی رہے۔

ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی گرمیوں کی چھٹیوں میں طالبات و خواتین کے لئے قرآن اکیڈمی لاہور میں دینی تربیتی کورس منعقد کیا گیا' جس میں ۶۰ طالبات نے داخلہ لیا اور ۴۰ نے یہ کورس مکمل کر کے اسناد حاصل کیں۔ اس کورس میں تجوید' عربی گرائمر' ارکانِ اسلام اور احادیث کے مختصر نصاب شامل تھے۔ مرکزی نائب ناظمہ کی کوشش اور ہمت سے یہ پروگرام نہایت احسن طور پر انجام پذیر ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ (آمین)

یہ تھی حلقہ خواتین کی کارکردگی کی مختصر رپورٹ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مزید ترقی دے اور ہمارے ایمان میں پختگی عطا فرمائے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(مرتبہ : بیگم شیخ رحیم الدین)